TAJALLY
DEOBAND U. P.

ایڈیٹر: عامر عثمانی

3/-

سالانہ
20/-
روپیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ تجلّی دیوبند

ایڈیٹر عامر عثمانی

چھبیسویں سال کا چوتھا اور پانچواں شمارہ

فہرست، اگست و ستمبر سنہ ۱۹۷۴ء

امریکہ۔ انگلینڈ۔ نائجیریا۔ کینڈا۔ فرانس۔ انڈونیشیا اور ملیشیا سے بذریعہ بحری ڈاک دو پونڈ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک ۵ پونڈ۔ بحرین افریقہ۔ سعودی عرب قطر وغیرہ سے بذریعہ بحری ڈاک ایک پونڈ اور دس شلنگ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک تین پونڈ۔

اس دائرے میں سُرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا دی پی کی اجازت دیں۔ آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ دی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

وی پی سترہ روپے کا ہوگا۔ منی آرڈر بھیج کر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

سالانہ قیمت بیس روپے ۲۰/-

اس شمارے کی قیمت تین روپے ۳/-

اسلامی پریس۔ دیوبند

احوال و واقعی

پچھلی اشاعت میں "نو سو کی چوری" کا عنوان آپ دیکھ چکے۔ کہانی لمبی تو نہیں مگر ایسی پہلو دار ضرور ہے کہ کوئی افسانہ نگار اس پر اچھا خاصا طویل افسانہ لکھ سکتا ہے مگر ہم سادگی اور اختصار سے کام لیں گے۔ مقصد بیان نہ کسی کی رسوائی ہے نہ اپنے نقصان کا نوحہ۔ بیان کا محرک بس یہ خیال ہے کہ ممکن ہے یہ واقعہ پڑھ کر ہمارا کوئی اور بھائی شکار ہونے سے بچ جائے۔

۷ رجون کی صبح میں ایک صاحب زادے تشریف لائے۔ پتلے دبلے۔ عمر ۲۵، ۲۶ سال رہی ہوگی۔ قد چھوٹا۔ رنگ سیاہی مائل گندمی۔ ہونٹ باریک۔ پیشانی تنگ۔ مجموعی چہرہ تقریباً چوچ نما تھا۔ لباس وہی پتلون اور بوشرٹ۔ فرمایا کہ سردار جعفری کا لڑکا ہوں۔ علی جاوید جعفری نام ہے۔ اردو بلٹز میں کام کرتا ہوں۔ جالندھر یا شاید کسی اور مقام کا نام لیا) کسی مشاعرے میں گیا تھا لوٹتے ہوئے سہارنپور ٹھہرا۔ وہاں سے آپ کی ملاقات کا شوق لے آیا ہے۔

ہمارے لئے اجنبی ملاقاتیوں کی آمد و رفت کوئی غیر معمولی چیز نہیں۔ خاطر تواضع کی۔ اتفاق سے گرمیوں کی تعطیلات میں چند ایسے عزیز بھی آئے ہوئے تھے جو جواں سال ہیں اور شعر و سخن کا ذوق رکھتے ہیں۔ وہ ان سے گھل مل گئے اور پھر اسی شام میں ایک شعری نشست کا انعقاد ہوا۔ غریب خانے کے صحن یا دالان میں ایسی نشستیں بعض شوقین اعزا سال میں دو چار بار کرتے ہی رہتے ہیں۔

رات کو تین بجے یہ نشست برخاست ہوئی اور جاوید میاں کو ہم نے مردانہ مکان میں لٹایا۔ یہاں اور کوئی نہ تھا۔ خود ہم اندر سوئے۔ سیچوئیشن کچھ ایسی ہے کہ مردانے اور زنانے کے درمیان پردے کی دیوار ہے اور اس کے علاوہ ایک دروازہ جسے بند کر لیا جائے تو باہر سے اندر نہیں آیا جا سکتا۔ اگر قلب میں ادنیٰ سا بھی وسوسہ ہوتا کہ صاحبزادے کیا ذہن لئے ہوئے ہیں تو یہ دروازہ اندر سے بند کر لیا جاتا مگر کوئی وجہ ایسے وسوسے کی نہیں تھی۔ گرمیوں میں ہماری عادت یہ ہے کہ کرتہ اتار کر کھونٹی پہ ٹانگ دیتے ہیں۔ اس میں ہمیشہ ایک بغلی جیب ہوتی ہے جس میں بہت کچھ سما جاتا ہے آج اس میں کم و بیش تیرہ سو روپے تھے۔ ان روپوں کو کاغذ کی مطلوبہ رقم جمع کرنے کے سلسلے میں بینک جانا تھا مگر مصروفیات میں بینک کا وقت گذر گیا۔ سوچا کہ کل داخل کر دیں گے۔ دن کا بڑا حصہ صاحب زادے کی معیت میں گذرا اور مختلف قسم کی ضروریات میں جیب سے کچھ پیسے نکالتے ہوئے یہ رقم موصوف کی نظروں میں یقیناً آ گئی۔ تقریباً ساڑھے تین سو تو خرچ ہو گئے تھے باقی جیب ہی میں تھے۔

ہماری عادت ہے خواہ کسی وقت سوئیں صبح طلوع آفتاب سے قبل آنکھ ضرور کھلتی ہے۔ آج بھی کھلی۔ پونے پانچ بج رہے تھے۔ کرتہ پہنا۔ پہنتے ہی منکشف ہو گیا کہ جیب خالی ہے۔ اس میں صرف رقم ہی نہ تھی اور بھی بہت سے کاغذات تھے اس لئے خاصی وزندار تھی۔ بے وزنی کا احساس ہوتے دیر کیا لگتی۔ قدم بڑھا کر مردانے میں پہنچے۔ وہاں فقط آتو بول رہا تھا۔ صاحب زادے زینے کا دروازہ اور نیچے کے پھاٹک کی کھڑکی کھول کر واپس تشریف لے جا چکے تھے۔

داستان ختم ہو گئی۔ شکر کا پہلو یہ ہے کہ اسی دن جیب میں تقریباً سات ہزار کے ڈرافٹ بھی موجود تھے۔ پانچ ہزار کا ڈرافٹ تو تنہا ایک ہی کرم فرما نے سعودی عرب سے بھیجا تھا۔ بینک کا وقت نکل گیا تو بغیر کسی منطقی وجہ کے ہم نے ان ڈرافٹوں کو جیب سے نکال کر یونہی ایک کھلی الماری میں رکھ دیا۔ یہ الماری ہمارے اداری کمرے میں ہے جو مردانے سے متصل

ہے۔ صاحب زادے کو اگر علم غیب ہوتا تو اس الماری تک
پہنچنے اور ڈرافٹ اٹھانے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔
لیکن مشیّتِ ایزدی کو ڈرافٹوں کی چوری منظور تھی ہی نہیں
شاید اسی لئے اس نے ہمارے دل میں ڈالا تھا کہ انھیں
جیب سے الگ کردیں۔ صاف ظاہر ہے کہ جو سات ہزار کے
نقصان سے بچ گیا ہو وہ نوسو ساڑھے نوسو کے نقصان پر
ملول کیا ہوگا۔

بہرحال صاحب زادے اپنی آمد کو یادگار بناکر تشریف
لے گئے۔ پچھلے ماہ یہ تفصیل بیان کرنا اس لئے خلاف مصلحت
معلوم ہوا تھا کہ ہم نے واقعہ کے کچھ روز بعد جناب سردار
جعفری کو ایک خط لکھا تھا۔ وہ ایک آل انڈیا شہرت کے
بڑے شاعر ہیں۔ غالباً پدم شری کا خطاب بھی پائے
ہوئے ہیں۔ ہم نے سوچا تھا کہ اگر واقعی وہ ایسے صاحبزادے
کے والد ہیں تو یہ کوئی شریفانہ بات نہ ہوگی کہ ان کا
نام نامی ایسے گھٹیا سلسلے میں لایا جائے۔ خط میں ہم نے
واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ ان سے صرف اتنا دریافت
کیا تھا کہ کیا واقعی وہ اس نام کے کسی بیٹے کے باپ ہیں
اور اگر ہیں تو یہ بیٹا کیا ۱۰ ر جون میں بمبئی پایا جا رہا تھا
یا باہر گیا ہوا تھا۔ یہ خط کل ۲۹ ر جولائی کو واپس آگیا
ہے اور ڈاکخانے کا نوٹ یہ ہے کہ مکتوب الیہ کا پتا
نہیں چلا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ سچائی کیا ہے۔ بعض
خطوط سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک ذات شریف
اپنے آپ کو جاں نثار اختر کا لڑکا بتا کر چھوٹا موٹا
کھیل کچھ اور مقامات پر بھی کھیل چکے ہیں۔ کون جانے وہ
یہی صاحب زادے ہوں یا کوئی اور بلند اختر۔ بہرکیف
قدرت کا سبق ہم سب کے لئے اس طرح کے حوادث میں
یہ ہے کہ زود اعتباری سے بچو۔ عقل استعمال کرو اور
دوسروں کو یہ موقع مت دو کہ وہ تمھیں حلوے کی طرح
حلق سے اُتار لے جائیں۔ اللہ تعالیٰ مذکورہ صاحبزادے
کو نیک توفیق دے۔ ہمارے معاملے میں انھوں نے
جس جرأت کا ثبوت دیا ہے اس سے اندازہ ہوتا
ہے کہ عادی مجرم ہیں ورنہ کسی نومشق کے لئے یہ جسارت
بڑی مشکل ہے کہ ایک قدم زنانے میں رکھ کر کھونٹی
سے کرتا اُتار لے۔ اگر انھیں نیک توفیق نہ ملی تو ڈر ہے
کہ انجام بھیانک ہوگا۔ وہ جس کے بھی صاحب زادے
ہوں ان کے والد صاحب کی خدمت میں گذارش ہے
کہ اصلاح کی طرف توجہ فرمائیں۔ ابھی پانی شاید سر سے
نہیں گذرا ہے۔

کاغذ کی کہانی

کوٹے کا کاغذ ہمیشہ ہی ملا کرتا تھا مگر اب کی اس
نے بھی ایک چھوٹی سی کہانی کو جنم دیا۔ گورنمنٹ نے
ایک تجارتی کارپوریشن کلکتہ اور بمبئی میں قائم کی ہے۔
ہمارے کوٹے کے کاغذات میں کلکتہ کا پتا دیا گیا تھا۔
دہلی والے نیوز پرنٹ ڈیلر کے واسطے سے نصف سے کچھ
زیادہ روپیہ کلکتہ روانہ کیا گیا۔ متوقع یہی تھا کہ کاغذ دہلی
بھیجا جائے گا مگر خلاف توقع ہمارا ویگن دیوبند بھیج دیا گیا۔

اگر کاغذ رموں کی شکل میں ہوتا تب تو یہ اچھا
ہی تھا کہ دیوبند ہی میں مل جائے مگر اب رم نہیں ریل دیئے
جا رہے ہیں اور سائز بھی مطلوبہ سائز کے خلاف ہے۔
لہٰذا ریلوں کو بہرحال دہلی ہی میں کٹنا تھا۔ اب اگر کارپوریشن
کاغذ کی طرح بلٹی بھی دیوبند ہی کے کسی بینک میں
بھجوا دیتی تو بلٹی فوراً وصول کر کے ہم ویگن کو جوں کا توں
دہلی واپس کرا دیتے اور زیر باری فقط ساڑھے چار سو
روپے کی ہوتی مگر بلٹی کو دہلی سے وصول کرکے دیوبند لانے
تک ویگن یوں ہی بند کھڑا نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ ریلوے
گودام کے انچارج صاحب نے قاعدہ بیان فرمایا کہ ویگن روکے
رکھنے کا جرمانہ ایک سو ساٹھ روپے فی یوم ادا کرنا پڑتا ہے۔
اب سوائے اس کے کیا چارہ تھا کہ اسے خالی کرا کے ریل پلیٹ
فارم پر رکھدیئے جائیں۔

چند روز بعد بلٹی آئی۔ کرایہ کے علاوہ کچھ ڈیمارج
بھی ادا کرکے مال چھڑایا گیا۔ اب لطف یہ تھا کہ مال گاڑی کا

لوڈنگ بھی اِن تاریخوں میں بند تھا۔ کاغذ دوبارہ بلٹی بنواکر دہلی بھیجا جاسکتا تھا۔ لوڈنگ کھلنے کے انتظار میں وہ دہلی پڑا رہے تو کم وبیش ساٹھ روپے یومیہ حرجانہ الگ دیجئے اور نگرانی الگ کرائیے۔ مجبوراً ٹرانسپورٹ کے ٹرکوں کا سہارا لیا گیا اور دو کی جگہ پانچ خرچ کرکے یہ بلا ٹلی۔

بلا تو فی الحال ٹل گئی لیکن یہ اندازہ فرمالیجئے کہ نصف رقم داخل کرنے کے وقت جو بھاؤ کارپوریشن نے بتایا تھا اب کاغذ روانہ کرتے وقت اس میں مجموعاً کم وبیش چار ہزار روپے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ریٹ بڑھ گئے ہیں۔ کہنا ٹھیک ہی ہوگا۔ اپنے دیس میں رواں دو سالوں میں جو فصلِ بہار سب سے زیادہ لہلہائی ہے وہ گرانی ہی کی فصلِ بہار ہے۔ اللہ اپنا فضل کرے۔ ہمیں نہ کسی سے شکایت ہے نہ نوحہ و ماتم کرنے کی فرصت۔ جو کچھ بیان ہوا حکایتہً ہوا۔ حکومت بے چاری خود گوناگوں مشکلات کے جال میں ہے اور ہمارے اپنے اعمال بھی چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ ؎

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز!

آگے کا نقشہ

الحمد للہ کاغذ کی فکر تو فی الحال ختم ہوئی۔ مگر تاخیر اتنی ہوگئی ہے کہ یہ شمارہ بھی ہم دو ماہ پہ مشتمل کر رہے ہیں۔ اگست اور ستمبر۔ اس کے بعد سے ہمیں اُمید ہے کہ ہر شمارہ پابندیِ وقت کے ساتھ آسکے گا بشرطیکہ بجلی کے امراضِ روحانی کو اللہ نے کچھ افاقہ دیا۔ تمام شہروں کا حال یکساں نہیں اس لئے تمام شہروں کے باشندے دیوبند کے "مسئلۂ برق" کو ٹھیک طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ یہاں آنکھ مچولی چلتی ہے۔ بڑا دلچسپ کھیل۔ کتابت شدہ کاپیوں کو نمی دے کر پریس میں داب دینے کو رکھا جاچکا ہے۔ ابھی داب کا آغاز ہی ہوا تھا کہ بجلی غائب۔ کاپی بے چاریوں کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے۔ اب یہ مشکل ہی ہے کہ سارے حروف نقص کے بغیر پلیٹ پر منتقل ہوجائیں۔ کچھ سطریں پھیکی ہیں۔ کچھ مرحوم ہی ہوچکی ہیں۔ سنگ ساز مسودے لے کر پلیٹ ٹھیک کرے تو شاید ٹھیک ہوجائے لیکن بسا اوقات وہ اٹکل سے ٹھیک کرتا ہے اور بعض اوقات تو ٹھیک ہی نہیں کرتا۔ رونا بھی مشکل اور ہنسنا بھی۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ "طلاق نمبر" کی تصحیح میں ہم نے غیر معمولی اہتمام کیا تھا مگر چھپنے کے بعد مطالعہ کیا تو اچھی خاصی غلطیاں موجود۔ اِن غلطیوں کی تصحیح کا اب بظاہر کوئی نتیجہ نہیں لیکن طلاق نمبر چونکہ ایک اہم نمبر ہے اور بے شمار حضرات اسے محفوظ رکھیں گے اس لئے ہم ذیل میں "تصحیح الاغلاط" کا گوشوارہ پیش کئے دیتے ہیں۔ اس کے مطابق قلم سے غلطیاں درست کرلی جائیں۔ نمک کھانے کے بعد آیا مگر آتو گیا اسے بھی غنیمت ہی جانئے۔

تصحیح الاغلاط تجلّی طلاق نمبر:-

صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
۲۲	۱	۲۹	لبتّہ	بتّہ
۲۹	۲	۱۹	خالی جگہ	اگر
〃	〃	۲۱	بہر	ہر
۳٦	۱	۲۰	یہ	×
۴۱	۱	۳۴	بلا شبہ اور	بلا شبہ صرف اور
۵۸	۲	۳۱	مالک	غالب
۷۴	۲	۹	قوالحافظہ	قویّ الحافظہ
〃	〃	۲۸	متعست	مُتَعَنِّت
〃	〃	۲۹	پائی جائے	پایا جائے
۹۹	۲	۲۹	......	اور اس
۱۱۹	۱	۷	بیان میں ہے	بیان ہوا ہے
۱۲۴	۱	۲۳	مخالفت	ممانعت
۱۳۲	۱	۴	چھوڑ	چھوڑ کر

صفحہ ۱۴۱ پر کالم ۲ میں کچھ حروف مٹ گئے ہیں۔ صحیح عبارت یوں ہے:-

"طاؤس کا بھی ـــ باوجود ان کے زہد و ورع اور کثرتِ تحدیث کے تفقہ اور اجتہاد میں یہ درجہ تسلیم نہیں کیا گیا۔"

پرچے کی قیمت کا مسئلہ

تجلی محض ایک کاروبار ہی نہیں مشن بھی ہے اسی لئے اس کے معاملے میں ہم صرف کاروباری مصالح کو سب کچھ نہیں سمجھتے بلکہ ایسے اقدامات بھی کر گذرتے ہیں جنھیں کوئی بھی کاروباری ماہر حماقت اور خودکشی کے سوا کوئی نام نہیں دے سکتا۔ ان اقدامات کا ذرا بھی احسان قارئین کی گردن پر نہیں۔ یہ تو ہمارا اور اللہ کا معاملہ ہے۔ جو کچھ جس نیت سے جب جب ہم نے کیا ہے وہ تمام کا تمام فردِ عمل میں درج ہوتا رہا ہے۔ نیکی کا اجر اور بدی کی یاداشت ملکر ہی رہتی ہے۔ البتہ قارئین ہی کا کچھ احسان ہماری گردن پر ہے کہ وہ ہر طرح کے بدلتے سدلتے حالات میں ہمارا ساتھ دیئے چلے جا رہے ہیں۔ کہاں یہ راگ رنگ اور لذت و رامش کا عہدِ زریں اور کہاں تجلی جیسا خشک اور مولویانہ پرچہ۔ قدرت کا اعجاز ہے کہ یہ اب تک نہ صرف زندہ ہے بلکہ اپنے ایڈیٹر کی آخری سانس تک زندہ رہنے پر مُصِر بھی ہے مشیت کا رویہ یہی یقین دلا رہا ہے کہ ابھی اس کا وقتِ موعود دور ہے۔ اس کا مرض الموت ہنوز شروع نہیں ہوا۔

اب آپ یہ بتائیے کہ ہم قیمت کے مسئلے پر مغز زنی نہ کریں تو کیا کریں۔ تجلی والے کاغذ کی جو مستند قیمت پچھلے سال تھی وہ ڈھائی سے ضرب کھا گئی ہے۔ فالتو مد میں جو خرچ ہوا وہ الگ۔ مطبع کا سامان بھی گیہوں اور گھی وغیرہ کی حرص میں چوکڑیاں بھر کر صفِ اول میں پہنچا۔ کاریگروں کی اجرت۔ دفتری کارکنوں کا معاوضہ۔ محصول ڈاک۔ کون سی شے ہے جو ترقی پذیر نہیں۔ تجلی کی قیمت اگر اضافۂ لاگت کے تناسب سے بڑھائیں تو لوگوں کے لئے خریدنا مشکل ہو جائے لہذا قابلِ عمل صورت یہی معلوم ہوتی ہے کہ تھوڑی سی قیمت بڑھائیں اور تھوڑے سے صفحات گھٹائیں۔ عام شمارہ اب تک ڈیڑھ روپے کا چل رہا تھا۔ اب اسے دو روپے کا ہو جانا چاہیئے اور سالانہ چندہ بجائے پندرہ کے بیس روپے۔ زیر نظر شمارے کی قیمت صفحات کے تناسب سے تین روپے رکھی گئی ہے۔ آگے انشاء اللہ دو روپے رہے گی۔ ہمیں امید ہے کہ جس طرح گذرے ہوئے چوبیس سالوں میں ہمارے دینی بھائیوں نے برابر قدر افزائی فرمائی ہے اسی طرح اب بھی وہ حوصلہ بڑھاتے رہیں گے اور ہولناک آندھیوں کی زد پر جلتا ہوا یہ ننھا چراغ فی الحال نہ بجھے گا۔ بقائے دوام تو بہرحال خدا کے سوا کسی کو نہیں۔

نہایۃ التحقیق (اردو شرح) مسند ابوبکر صدیق رضؓ

یعنی جو کلام مبارک حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ سب کا سب یکجا

خوشی کی بات ہے کہ ایک مستند اور دقیقہ رس عالم نے مسند احمد بن حنبل کی اردو شرح کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے اور اسی سلسلے کی پہلی کڑی نہایۃ التحقیق کے نام سے آپ کے سامنے ہے۔ یہ بڑے سائز کے ۲۷۵ صفحے پر مشتمل ہے۔ اور قیمت صرف بیس روپے۔ بڑی اہم بات یہ ہے کہ فاضل شارح نے شروع کتاب میں ایک طویل مقدمہ دیا ہے جو تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے اس میں انھوں نے اردو خواں طبقے کیلئے فن حدیث کی باریکیوں اور اصطلاحوں اور اصولوں کو پوری تحقیق کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے۔ بلند پایہ کتابوں کا نچوڑ۔ فن حدیث کی معلومات کا بیش بہا خزانہ۔ امید ہے شائقین اس تحفۂ نادرہ سے فائدہ اٹھائیں گے۔ قیمت۔ بیس روپے (مجلد بائیس روپے)

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

صلی اللہ علیہ وسلم

اے کہ تو وادیٔ ظلمت میں ہے مینارۂ نور — میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور
تجھ کو معلوم تو ہوگا کہ مرا آئینہ — ہو چکا میرے ہی اوہام کی بوچھار سے چور
تجھ کو معلوم تو ہوگا کہ مری دنیا میں — روشنی کی نہیں کوئی بھی کرن پاس نہ دور
تحفۂ نعت بھی لاؤں تو کہاں سے لاؤں — زہر سے پاک نہ سینہ نہ تخیّل نہ شعور

اے کہ توڑا ہے ترے فقر نے شاہی کا غرور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

صرف الفاظ کے موتی ہیں مرے دامن میں — ہے مگر تیری محبّت کا تقاضا کچھ اور
صرف ایمان کے دعوے ہیں مرے ہونٹوں پہ — ہے مگر تیری اطاعت کا تقاضا کچھ اور
ہیں مرے شوق کی معراج درود اور سلام — ہے مگر تیری شریعت کا تقاضا کچھ اور
دل عقیدت کی تب و تاب سے خالی تو نہیں — ہے مگر عشق کی غیرت کا تقاضا کچھ اور

نہ غلامی کا سلیقہ ہے نہ جینے کا شعور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

میں نے تجھ سے کبھی پیمانِ وفا باندھا تھا — وہ مگر قصۂ ماضی کے سوا کچھ بھی نہیں
بجھ گئی شمعِ جنوں، سرد ہوا سوزِ یقیں — موجِ عصیاں کے تھپیڑوں سے بچا کچھ بھی نہیں

یاد تو آج بھی ہے نعرۂ تکبیر کی گونج　　ایسی یادوں کا مگر ذکر ہی کیا کچھ بھی نہیں
جنس اخلاص کو طوفانِ ہوس لے ڈوبا　　اب کوئی قول، قسم، عہدِ وفا کچھ بھی نہیں

میری نظروں سے ہوئی اپنی حقیقت مستور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

ہر نئے قرن ہیں، دل اور زباں کے مابین　　فاصلے اور بڑھے، اور بڑھے، اور بڑھے
حسنِ کردار کی پونجی تو گھٹی روز بروز　　جن سے سر کار نے روکا تھا وہی طور بڑھے
اب مرے ہاتھ میں نیزہ ہے نہ تلوار نہ ڈھال　　کیوں نہ پھر اہلِ ستم کا ستم و جور بڑھے
میں تو اک جامِ سفالیں کا بھی حقدار نہیں　　کس لئے میری طرف ساغرِ بلور بڑھے

خونِ انصاف مشیت کا نہیں ہے دستور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

میں کسی اور کو الزام نہیں دے سکتا　　اپنی تاریخ کو خود قتل کیا ہے میں نے
تو نے جس زہر سے بچنے کی ہدایت کی تھی　　اپنے ہاتھوں سے وہی زہر پیا ہے میں نے
دل کی دنیا ہے تصاویرِ بتاں سے آباد　　صرف ہونٹوں سے ترا نام لیا ہے میں نے
کھا چکی زنگ مرے ذوقِ عمل کی شمشیر　　راستہ خود ہی تباہی کو دیا ہے میں نے

نہ مقدر کی خطا ہے نہ زمانے کا قصور
اے کہ تو وادیِ ظلمت میں ہے مینارۂ نور
اے کہ توڑا ہے ترے فقر نے شاہی کا غرور
میں تہی دست ہوں کیا پیش کروں تیرے حضور

عامر عثمانی

تفہیم القرآن (القیامۃ)

کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟[۵۳] کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں[۵۴]۔ مگر انسان چاہتا یہ ہے کہ آگے بھی بد اعمالیاں کرتا رہے[۵۵]۔ پوچھتا ہے "آخر کب آنا ہے وہ

---

[۵۳] اُوپر کی دو دلیلیں، جو قسم کی صورت میں بیان کی گئی ہیں، صرف دو باتیں ثابت کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا کا خاتمہ (یعنی قیامت کا پہلا مرحلہ) ایک یقینی امر ہے۔ دوسرے یہ کہ موت کے بعد دوسری زندگی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کے ایک اخلاقی وجود ہونے کے منطقی اور فطری تقاضے پورے نہیں ہو سکتے، اور یہ امر ضرور واقع ہونے والا ہے، کیونکہ انسان کے اندر ضمیر کی موجودگی اس پر گواہی دے رہی ہے۔ اب یہ تیسری دلیل یہ ثابت کرنے کے لئے پیش کی گئی ہے کہ زندگی بعدِ موت ممکن ہے۔ مکہ میں جو لوگ اس کا انکار کرتے تھے وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو مرے ہوئے سینکڑوں ہزاروں برس گذر چکے ہوں، جن کے جسم کا ذرہ ذرہ خاک میں مل کر پراگندہ ہو چکا ہو، جن کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو کر نہ معلوم زمین میں کہاں کہاں منتشر ہو چکی ہوں جن میں سے کوئی جل مرا ہو، کوئی درندوں کے پیٹ میں جا چکا ہو، کوئی سمندر میں غرق ہو کر مچھلیوں کی غذا بن چکا ہو، ان سب کے اجزائے جسم پھر سے جمع ہو جائیں اور ہر انسان پھر وہی شخص بن کر اُٹھ کھڑا ہو جو دس بیس ہزار برس پہلے کبھی وہ تھا؟ اس کا نہایت معقول اور انتہائی پر زور جواب اللہ تعالیٰ نے اس مختصر سے سوال کی شکل میں دیا ہے کہ "کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو کبھی جمع نہ کر سکیں گے؟" یعنی اگر تم سے یہ کہا گیا ہوتا کہ تمہارے یہ منتشر اجزائے جسم کسی وقت آپ سے آپ جمع ہو جائیں گے اور تم آپ سے آپ اسی جسم کے ساتھ جی اٹھو گے، تو بلا شبہ تمہارا اس کو ناممکن سمجھنا بجا ہوتا۔ مگر تم سے تو کہا یہ گیا ہے کہ یہ کام خود نہیں ہو گا بلکہ اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا۔ اب کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے ہو کہ کائنات کا خالق، جسے تم خود بھی خالق مانتے ہو، اس کام سے عاجز ہے؟ یہ ایسا سوال تھا جس کے جواب میں کوئی شخص جو خدا کو خالقِ کائنات مانتا ہو، نہ اُس وقت یہ کہہ سکتا تھا اور نہ آج یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا بھی یہ کام کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی بے وقوف ایسی بات کہے تو اس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ تم آج جس جسم میں اس وقت موجود ہو اس کے بے شمار اجزاء کو ہوا اور پانی اور مٹی اور نہ معلوم کہاں کہاں سے جمع کر کے اُسی خدا نے کیسے یہ جسم بنا دیا جس کے متعلق تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ پھر ان اجزاء کو جمع نہیں کر سکتا؟

[۵۴] یعنی بڑی بڑی ہڈیوں کو جمع کر کے تمہارا ڈھانچہ پھر سے کھڑا کر دینا تو درکنار، ہم تو اس بات پر بھی قادر ہیں کہ تمہارے نازک ترین اجزائے جسم حتیٰ کہ تمہاری انگلیوں کی پوروں تک کو پھر ویسا ہی بنا دیں جیسی وہ پہلے تھیں۔

[۵۵] اِس چھوٹے سے فقرے میں منکرینِ آخرت کے اصل مرض کی صاف صاف تشخیص کر دی گئی ہے۔ ان لوگوں کو جو چیز آخرت کے انکار پر آمادہ کرتی ہے وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ فی الواقع وہ قیامت اور آخرت کو ناممکن سمجھتے ہیں، بلکہ اُن کے اس انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ آخرت کو ماننے سے لازماً اُن پر کچھ اخلاقی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، اور انھیں یہ پابندیاں ناگوار ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ اب تک زمین میں بے نتھے بیل کی طرح پھرتے رہے ہیں اُسی طرح آئندہ بھی پھرتے رہیں۔ جو ظلم، جو بے ایمانیاں، جو فسق و فجور، جو بدکرداریاں وہ اب تک کرتے رہے ہیں، آئندہ بھی ان کو اس کی کھلی چھوٹ ملی رہے، اور یہ خیال کبھی ان کو یہ ناروا آزادیاں برتنے سے نہ روکنے پائے کہ ایک دن انھیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ان اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔ اس لئے دراصل اُن کی عقل اُنھیں آخرت

قیامت کا دن[٥٦] ؟" پھر جب دیدے پتھرا جائیں گے[٥٧] اور چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند سورج ملا کر ایک کر دیئے جائیں گے[٥٨] اُس وقت یہی انسان کہے گا "کہاں بھاگ کر جاؤں ؟" ہرگز نہیں، وہاں کوئی جائے پناہ نہ ہوگی، اُس روز تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھیرنا ہوگا۔ اُس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا[٥٩] بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے[٦٠] ـــــــــ

پر ایمان لانے سے نہیں روک رہی ہے بلکہ ان کی خواہشاتِ نفس اس میں مانع ہیں۔

٥٦ یہ سوال استفسار کے طور پر نہیں بلکہ انکار اور استہزاء کے طور پر تھا۔ یعنی وہ یہ پوچھنا نہیں چاہتے تھے کہ قیامت کس روز آئے گی، بلکہ مذاق کے طور پر یہ کہتے تھے کہ حضرت! جس دن کی آپ خبر دے رہے ہیں آخر وہ آتے آتے رہ کہاں گیا ہے؟

٥٧ اصل میں بَرِقَ الْبَصَرُ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کے لغوی معنی بجلی کی چمک سے آنکھوں کے چُندھیا جانے کے ہیں لیکن عربی محاورے میں یہ الفاظ اسی معنی کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ خوف زدگی، حیرت، یا کسی اچانک حادثہ سے دوچار ہو جانے کی صورت میں اگر آدمی ہک دک رہ جائے اور اس کی نگاہ اُس پریشان کن منظر کی طرف جم کر رہ جائے جو اسکو نظر آ رہا ہو تو اس کے لئے بھی یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اسی مضمون کو قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے۔ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ "اللہ تو انھیں ٹال رہا ہے اُس دن کیلئے جب آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی" (ابراہیم ۴۲)

٥٨ یہ قیامت کے پہلے مرحلے میں نظامِ عالم کے درہم برہم ہو جانے کی کیفیت کا ایک مختصر بیان ہے۔ چاند کے بے نور ہو جانے اور چاند سورج کے مل کر ایک ہو جانے کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف چاند ہی کی روشنی ختم نہ ہوگی جو سورج سے ماخوذ ہے بلکہ خود سورج بھی تاریک ہو جائے گا اور بے نور ہو جانے میں دونوں یکساں ہو جائیں گے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمین یکایک اُلٹی چل پڑے گی اور اُس دن چاند اور سورج دونوں بیک وقت مغرب سے طلوع ہوں گے۔ اور ایک تیسرا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ چاند یک لخت زمین کی گرفت سے چھوٹ کر نکل جائے گا اور سورج میں جا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ اس کا کوئی اور مفہوم بھی ہو جس کو آج ہم نہیں سمجھ سکتے۔

٥٩ اصل الفاظ ہیں بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ۔ یہ بڑا جامع فقرہ ہے جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں اور غالباً وہ سب ہی مراد ہیں۔ ایک معنی اس کے یہ ہیں کہ آدمی کو اُس روز یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ اپنی دنیا کی زندگی میں مرنے سے پہلے کیا نیکی یا بدی کما کر اُس نے اپنی آخرت کے لئے آگے بھیجی تھی اور یہ حساب بھی اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا کہ اپنے اچھے یا بُرے اعمال کے کیا اثرات وہ اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آیا تھا جو اس کے بعد مدتہائے دراز تک آنے والی نسلوں میں چلتے رہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسے وہ سب کچھ بتا دیا جائے گا جو اسے کرنا چاہئے تھا مگر اُس نے نہیں کیا۔ اور جو کچھ نہ کرنا چاہیئے تھا مگر اس نے کر ڈالا۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ اس نے پہلے کیا اور جو کچھ بعد میں کیا اس کا پورا حساب تاریخ وار اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ چوتھے معنی یہ ہیں کہ جو نیکی یا بدی اس نے کی وہ بھی اسے بتا دی جائے گی اور جس نیکی یا بدی کے کرنے سے وہ باز رہا اُس سے بھی اسے آگاہ کر دیا جائے گا۔

٦٠ یعنی آدمی کا نامۂ اعمال اس کے سامنے رکھنے کی غرض درحقیقت یہ نہیں ہوگی کہ مجرم کو اس کا جرم بتایا جائے، بلکہ ایسا کرنا تو اس وجہ سے ضروری ہوگا کہ انصاف کے تقاضے برسرِ عدالت جرم کا ثبوت پیش کئے بغیر پورے نہیں ہوتے۔ ورنہ ہر انسان خوب جانتا ہے کہ وہ خود کیا ہے۔ اپنے آپ کو جاننے کے لئے وہ اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ کوئی دوسرا اُسے

بتائے کہ وہ کیا ہے۔ ایک جھوٹا دنیا بھر کو دھوکہ دے سکتا ہے لیکن اسے خود تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک چور لاکھ حیلے اپنی چوری چھپانے کے لئے اختیار کر سکتا ہے۔ مگر اس کے اپنے نفس سے تو یہ بات مخفی نہیں ہوتی کہ وہ چور ہے۔ ایک گمراہ آدمی ہزار دلیلیں پیش کر کے لوگوں کو یہ یقین دلا سکتا ہے کہ وہ جس کفر یا دہریت یا شرک کا قائل ہے وہ درحقیقت اسکی ایماندارانہ رائے ہے، لیکن اس کا اپنا ضمیر تو اس سے بے خبر نہیں ہوتا کہ ان عقائد پر وہ کیوں جما ہوا ہے اور ان کی غلطی سمجھنے اور تسلیم کرنے سے دراصل کیا چیز اسے روک رہی ہے۔ ایک ظالم، ایک بد دیانت، ایک بدکردار، ایک حرام خور، اپنی بداعمالیوں کے لئے طرح طرح کی معذرتیں پیش کر کے خود اپنے ضمیر تک کا منہ بند کرنے کی کوشش کر سکتا ہے تاکہ وہ اسے ملامت کرنے سے باز آجائے اور یہ مان لے کہ واقعی کچھ مجبوریاں، کچھ مصلحتیں، کچھ ضرورتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کو یہ علم تو بہر حال ہوتا ہی ہے کہ اس نے کس پر کیا ظلم کیا ہے، کس کا حق مارا ہے، کس کی عصمت خراب کی ہے، کس کو دھوکا دیا ہے، اور کن ناجائز طریقوں سے کیا کچھ حاصل کیا ہے۔ اس لئے آخرت کی عدالت میں پیش ہوتے وقت ہر کافر، ہر منافق، ہر فاسق و فاجر اور مجرم خود جانتا ہوگا کہ وہ کیا کر کے آیا ہے اور کس حیثیت میں آج اپنے خدا کے سامنے کھڑا ہے۔

ایک وضاحت

ایک صاحب نے لکھا :۔ " آپ نے نظریۂ ارتقاء نمبر میں تفسیر ماجدی پر جو تنقید کی ہے اس میں الانعام آیت ۷۰ کے ضمن میں آپ نے فرمایا کہ " شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ میں کُلّ عدلٍ کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے عفی اللہ عنہ"۔

ہمارے پاس تاج کمپنی لاہور کا مطبوعہ نسخہ ہے اس میں شاہ صاحبؒ کا ترجمہ اس طرح ہے۔ " اگر بدلہ دے سارے بدلے قبول نہ ہوں اس سے"۔ مولانا محمود الحسنؒ کے ترجمے میں ہے " اگر بدلے میں دے تو قبول نہ ہوں اس سے"۔ مولانا اشرف علیؒ کا ترجمہ ہے " اور (یہ کیفیت ہو کہ) اگر دنیا بھر کا معاوضہ بھی دے ڈالے تب بھی اس سے نہ لیا جائے"۔ مولانا مودودی کا ترجمہ ہے " اگر وہ ہر ممکن چیز فدیہ میں دے کر چھوٹنا چاہے تو وہ بھی اس سے قبول نہ کی جائے۔

ہم نے چند صاحب علم لوگوں سے وضاحت چاہی کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کُلّ عدلٍ کا جو ترجمہ کیا ہے وہ پورا ہے یا چھوٹ گیا۔ ان سب کی رائے ہے کہ نہیں چھوٹا ہے۔

آپ سے استدعا ہے کہ اس کا جواب عنایت فرمائیں کہ کُلّ عدلٍ کا ترجمہ مندرجہ بالا ترجمہ میں ہے کہ نہیں ہے۔"

● جواب یہ ہے کہ جو ترجمہ آپ نے نقل فرمایا اس میں کسی لفظ کا ترجمہ نہیں چھوٹا ہے۔ " سارے بدلے " کُلّ عدلٍ ہی کا ترجمہ ہے لیکن ہمارے سامنے جو موضح القرآن ہے (مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند) اس میں ترجمہ یہ ہے :۔

" اور اگر بدلہ دے گا وہ نفس چھٹا یا گناہ کا نہ لیا جاوے گا اس سے "

اس میں " سارا بدلہ " کے الفاظ نہیں ہیں۔ خدا جانے یہ تفاوت کیوں۔ گمان ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کا اصل ترجمہ وہی ہوگا جو آپ نے نقل کیا۔ ہمارے پیشِ نظر نسخے میں یہ سہو کتابت کی نذر ہو گیا۔

شطرنج کی بحث

مراسلہ اور اس کا جواب

نظام پور ۔ ۱۷ر جون ۶۶ء

محترمی! السلام علیکم ۔ تجلّی مارچ و اپریل ۶۶ء کے شمارے میں آپ کا جواب پڑھا۔ مجھے آپ کا مدعا سمجھنے میں اس وجہ سے دشواری پیش آئی کہ آپ اگست ۶۵ء کے تجلی میں قولِ صحابی پر لفظ "حدیث" کا اطلاق کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو صؔ۲۷ و صؔ۲۹) بہرحال شطرنج کھیلنے کی ممانعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی موجود ہیں ملاحظہ فرمائیے:۔

عن عبد اللہ بن عمرو ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن الخمر والمیسر والکوبۃ والغبیراء وقال کل مسکر حرام۔ (رواہ ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب پینے اور جوا کھیلنے اور کوبہ اور غبیراء سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

نواب قطب الدین صاحب دہلوی رحؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

"قاموس میں لکھا ہے کہ کوبہ کہتے ہیں نرد اور شطرنج اور چھوٹے طبل یعنی نقارہ اور بربط کو اور یہ سب ممنوع ہیں جو چیزان میں سے یہاں مراد رکھیں صحیح ہے اور غبیراء ایک قسم شراب کی ہے کہ چینے سے بنتی ہے حبشی بنایا کرتے ہیں۔"

(مظاہر حق جلد سوم، صؔ۱۳۱، کتاب الحدود باب بیان الخمر)

نیز صؔ۵۴۰ پر کتاب اللباس، باب التصاویر میں لکھتے ہیں:

"ہدایہ میں لکھا ہے کہ مکروہ تحریمی ہے کھیلنا نرد کا اور شطرنج کا بموجب فرمانے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ جو کوئی کھیلے شطرنج یا نردشیر پس گویا کہ ڈبویا ہاتھ اپنا سور کے لہو میں[۱] ۔ انتہی۔ اور جامع صغیر میں حدیث نقل کی گئی ہے کہ ملعون ہے وہ شخص کہ کھیلے شطرنج اور دیکھنے والا طرف شطرنج کے مانند کھانے والے گوشت سور کے ہے[۲]۔"

---

[۱] من لعب بالنردشیر فکانما صبغ یداہ فی لحم خنزیر ودمہ۔ (رواہ مسلم) [۲] ملعون من لعب بالشطرنج والناظر الیھا کالآکل لحم الخنزیر۔

یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات ہیں جن میں شطرنج کھیلنے کی ممانعت اور اس کی برائی بیان کی گئی ہے۔

اب آگے چلیے۔ حضرت علیؓ کے قول کے متعلق آپ نے جس رائے کا اظہار کیا ہے بہت کچھ محلِ نظر ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اسے صحیح ترین قول قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں :-

قال علی رضی اللہ عنہ۔ الشطرنج من المیسر، ومر علی رضی اللہ عنہ علی قوم یلعبون بالشطرنج فقال۔ ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون؟ قال احمد۔ اصح ما فی الشطرنج قول علی رضی اللہ عنہ۔ (المغنی ج ۱۲ ص ۱۰)	حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا شطرنج جوے میں داخل ہے۔ آپ کا گذر ایسے لوگوں پر ہوا جو شطرنج کھیل رہے تھے تو فرمایا، یہ کیا مورتیاں ہیں جن پر تم معتکف ہو؟ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں۔ شطرنج کے بارے میں سب سے زیادہ صحیح قول حضرت علیؓ کا ہے۔

آپ نے لکھا ہے "ہمیں حیرت ہے کہ ذی علم ہو کر آپ نے قولِ صحابی کو محض اس لئے قولِ رسول ؐ کے درجے میں رکھ دیا کہ وہ مشکوٰۃ میں ذکر ہوا ہے۔ حالانکہ ایسی غلط فہمی کا کوئی منطقی جواز موجود نہیں تھا۔"

اس اعتراض کا جواب مشکوٰۃ کے مشہور شارح ملا علی قاری حنفیؒ کی زبانی سنیئے :-

قولہ "الشطرنج" فی القاموس الشطرنج بالکسر ولا یفتح اولہ، لعبۃ معروفۃ، والسین لغۃ فیہ۔	حضرت علیؓ کا قول۔ الشطرنج قاموس میں ہے۔ شطرنج ش کے زیر سے، نہ کہ زبر سے مشہور کھیل ہے۔ س سے (سطرنج) بھی بولا جاتا ہے۔
"ما یسر الاعاجم" ای قمارھم حقیقۃ او صورۃ، والتشبہ بھم منھی عنہ۔	میسر الاعاجم یعنی عجمیوں کا جوا خواہ حقیقتاً ہو خواہ شکل و صورت کے اعتبار سے اور ان سے مشابہت ممنوع ہے۔
وقولہ فی الحدیث الآتی۔ "الا خاطئ" ای عاص، وھو باطلاقہ یشمل ما یکون بالشرط وغیرہ۔ والحدیث وان کان موقوفا لکنہ مرفوع حکما فان مثلہ لا یقال من قبل الرائی وسیاتی عنہ ما یعضدہ انہ مرفوع حقیقۃً۔ (مرقاۃ)	بعد والی حدیث میں حضرت ابو موسیٰؓ کے قول "خاطئ" کا مطلب ہے گنہگار اور اس میں شرط بدکر کھیلنا اور بغیر شرط کھیلنا شامل ہے۔ یہ حدیث اگرچہ موقوف ہے، لیکن حدیث مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ ایسی بات محض رائے کی بنا پر نہیں کہی جا سکتی اور عنقریب انھی (حضرت ابوموسیٰ) سے ایک روایت آئے گی جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہ حدیث واقعی مرفوع ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

حضورؐ سے منسوب قول یا فعل کو مسنون کہنے پر آپ کا اعتراض بہت عجیب ہے کیونکہ اس کی یہی تعریف تجلی میں کی جا چکی ہے۔

"مسنون وہی چیز ہوگی جس کا انتساب حضورؐ کی ذات بابرکات سے ثابت ہو جائے۔" (تجلی، اکتوبر ۶۲ء صفحہ ۳۰)

حدیث ابوموسیٰؓ کے ترجمے کی تصحیح کا بہت بہت شکریہ واقعی اس میں "اور گنہگار" کے الفاظ زائد ہیں جس کیلئے میں آپ سے اور قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل جس وقت میں نے آپ کو خط لکھا اس وقت مشکوٰۃ کا عربی نسخہ مراجعت کے لئے سامنے موجود نہ تھا۔ میں نے نور محمد کارخانۂ تجارتِ کتب والوں کے شائع کردہ ترجمہ سے روایت نقل کر دی مگر افسوس کہ یہ ترجمہ غلط نکلا۔ دینی کتب و رسائل میں اس قسم کی بے احتیاطیاں عموماً پائی جاتی ہیں۔

تجلی کے زیرِ بحث شمارے ہی کو لیجئے۔ اس کے صفحات ۳۵، ۴۹، ۵۲ اور ۶۲ پر سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۴۰ یوں لکھی گئی ہے:-

وَمَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ۔ حالانکہ قرآن میں "و" نہیں ہے۔

ص۳۶ پر وَلٰکِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ چھپا ہے جبکہ صحیح وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ ہے۔

ص۱۱۹ پر وَمَا لَکُمْ مِّنْ وَّلَایَتِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ چھپا ہے

حالانکہ صحیح مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ہے (ملاحظہ ہو سورۂ انفال - ۷۲)

اسی طرح صـــ۱۲۲ پر وَ اَنَا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ چھپا ہے جب کہ صحیح وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ ہے (الاعراف - ۱۲۷)

بہرحال ان اغلاط کی نشاندہی سے میرا مقصد اپنی غلطی کے لئے سندِ جواز حاصل کرنا نہیں ہے۔ مجھے یقیناً احتیاط سے کام لینا چاہیئے تھا اور میں اس اصلاح کے لئے آپ کا ممنون شکریہ ادا کرتا ہوں۔ فقط۔ محمد خالد جمیل

(بھوانی ضلع تھانہ)

تجلّی

(۱) ابوداؤد کی منقولہ روایت میں لفظ کوبہ ہے۔ جب قاموس کی تشریح کے مطابق اس کے متعدد معنی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ یہاں لازماً "شطرنج" ہی مراد لی جائے نرد کیوں نہ مراد لی جائے۔ یہ تو ہوتا نہیں کہ اگر کسی لفظ کے کئی معنی آتے ہیں تو جہاں بھی وہ لفظ استعمال ہو اس کے سارے ہی معنی مراد لئے جائیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوبہ کے متعدد محتمل معنوں میں ایک معنی "شطرنج" بھی ہیں۔ مگر برابر کا احتمال موجود ہے کہ یہاں قائل کی مراد شطرنج نہ ہو نقارہ یا نرد ہو۔ جب دو طرح کے احتمال موجود ہیں تو اس سے خاص شطرنج کی حرمت پر استدلال کیسے کیا جا سکتا ہے۔

ویسے بھی ہم حضرت قطب الدین دہلویؒ کی اس رائے کو درست نہیں سمجھتے کہ نقارہ حرام ہے۔ اس کی حرمت کے لئے کوئی شافی دلیل موجود نہیں جب کہ حلّت کے لئے متعدد دلائل موجود ہیں۔ نقّارہ محض اعلان ہے۔ جہاد میں تو اس کا استعمال بعض مواقع پر ضروری ہو جاتا ہے۔ شادی بیاہ کے اعلان میں بھی اس کا استعمال جائز ہے۔ یہ آلاتِ موسیقی میں سے نہیں ہے۔ اسے حرام کہنا غلو اور تشدّد ہے۔

ہدایہ کی عبارت نقل کر کے آپ نے حاشیہ پر جو حدیث پیش کی اس میں "شطرنج" کا ذکر ہے ہی نہیں فقط "نردشیر" کا حکم بیان کیا گیا ہے نردشیر اور کھیل ہے۔ اس پر عموماً جوا کھیلا جاتا ہے۔ لہٰذا اس حدیث کے حوالہ سے "شطرنج" کی حرمت نکالنا درست نہیں۔

جامع صغیر کی منقولہ روایت میں بے شک لفظ شطرنج ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ روایت درایت کے خلاف ہے لحم خنزیر کی حرمت قرآن کی نص صریح سے معلوم ہوئی ہے۔ کوئی بھی شے اس جیسی حرام و نجس نہیں مانی جا سکتی جب تک کہ اس کی حرمت و نجاست ایسی ہی قوی نص سے ثابت نہ ہو۔ یہ آپ کی منقولہ روایت گویا یہ بتا رہی ہے کہ شطرنج کھیلنا خنزیر کا گوشت کھانے کے برابر ہے اور شطرنج کھیلتے کسی کو دیکھنا ایسا ہے جیسے خنزیر کا گوشت کھانے والوں کو دیکھا جائے۔ اس قسم کی مبالغہ آرائی کو "وعظ" کے خانے میں رکھ سکتے ہیں قانونِ شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

نیز اس طرح کی مبالغہ آرائیوں کی نسبت حضورؐ کی طرف درست بھی نہیں مانی جا سکتی۔ حضورؐ کا عام طریقہ یہ تھا کہ جو امور و اشیاء شدید طور پر حرام و ممنوع ہوں ان کا حکم وضاحت کے ساتھ متعدد بار بیان فرماتے تھے۔ کیسے ممکن ہے کہ شطرنج "لحم خنزیر" جیسی شدید ممانعت و کراہت رکھتی ہو اور صحاح ستہ میں حضورؐ کی دو چار حدیثیں بھی ـــــ بلکہ ایک حدیث بھی اس کے سلسلہ میں منقول نہ ہو۔ عقائدِ شرعیہ کے لئے آپ کمزور بنیادیں پسند کریں تو شوق سے کریں ہم بہرحال اپنے عقائد کو ضعیف روایات اور خلافِ درایت تصورات کے حوالے کرنا نہیں چاہتے۔

(۳) المغنی سے جو روایت آپ نے نقل کی اس کے بارے میں ہم پھر وہی کہیں گے جو پہلے کہہ چکے ہیں۔ شطرنج نہ وضعاً جوا ہے نہ عادۃً۔ یہ بطورِ قمار نہیں کھیلی جاتی بلکہ اپنی ذاتی دلچسپی اور کشش کے لئے کھیلی جاتی ہے۔ اس پر اگر کبھی کوئی جوا کھیلے تو یہ ایسا ہوگا جیسے جواری لوگ سکّہ اُچھال کر ہار جیت کر لیتے ہیں۔ سکّے اصلاً جوے کا آلہ نہیں اس لئے ان کے ذریعہ اگر کچھ لوگ جوا کھیل لیتے ہوں تو بجائے خود سکوں کا عام استعمال حرام نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح شطرنج پر اگر کچھ

لوگ پیسوں کی بازی لگالیں تو اس سے بجائے خود شطرنج آلۂ قمار نہیں بن جاتی۔ حضرت علی پر اللہ کی رحمتیں ہوں۔ ان کی خبر پر تو لازماً اعتماد کرنا ہوگا کہ ان سے جھوٹ کی توقع نہیں کی جاسکتی لیکن رائے کے معاملہ میں وہ حرف آخر نہیں ہیں۔ انھوں نے اگر واقعی شطرنج کو جوے کے خانے میں رکھا ہو تو یہ ایک خلاف واقعہ بات ہے۔ یا تو انھیں شطرنج کھیلنے والوں کا تجربہ نہیں تھا کہ یہ لوگ محض تفریحاً کھیلتے ہیں پیسوں کی ہار جیت نہیں کرتے یا پھر انھیں کسی نے غلط اطلاع دیدی تھی کہ شطرنج جوا ہے۔ حقائق و واقعات کسی صحابی کے بارلنے سے نہیں بدل سکتے۔

اور شطرنج کھیلنے والوں کو دیکھ کر منقولہ روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے جو کچھ فرمایا وہ بھی کسی قانونِ شرعی کی وضاحت نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے شطرنج نہیں دیکھی تھی۔ دفعتاً پہلی بار دیکھی تو طعن و تحیّر کے ملے جلے جذبے سے ارشاد فرمایا کہ ارے بھئی یہ کیا مورتیاں سی ہیں جن پر تم جھکے پڑے ہو؟ بظاہر ان کے کلمات آیتِ قرآنی کی تلمیح ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو بتوں کی پرستش کرتے دیکھ کر یہی فقرہ کہا تھا۔ اس کے جواب میں مخاطبین بولے تھے کہ ہم نے تو اپنے آبا و اجداد کو ان ہی بتوں کی پوجا کرتے پایا ہے۔

صاف ظاہر ہے یہ شرکِ مبین کا معاملہ تھا۔ مورتیوں کی عبادت کی جارہی تھی۔ عقائد میں توحید کا نام و نشان نہ تھا۔ مگر شطرنج نہ پوجا ہے نہ اصطلاحی اعتکاف۔ اس کا عقائدِ دینیہ سے کوئی تعلق ہی نہیں اور اس کے مہرے اوّل تو "مورتی" کے ہم معنی ہوتے نہیں دوسرے ان پر جھکاؤ پرستش کے لئے نہیں ہوتا تفریح کے لئے ہوتا ہے۔ لہٰذا واقعتہً اگر حضرت علیؓ نے شطرنج کھیلنے والوں کو مخاطب کر کے حضرت ابراہیمؑ والا فقرہ دہرا دیا تھا تو اس کا یہ مطلب کوئی احمق ہی لے سکتا ہے کہ شطرنج کا کھیل بھی مورتیوں کی پوجا کی طرح ممنوع و حرام ہوگیا۔ حضرت علیؓ شطرنج کو ناجائز سمجھتے ہوں یہ الگ بات ہے۔ انھیں رائے قائم کرنے کا

حق تھا لیکن تنہا ان کی رائے قوانینِ شریعت میں حجت نہیں ان کی بہتیری آرا ہیں جن سے فقہاء نے اختلاف کیا ہے اور ائمۂ اصول اس پر متفق ہیں کہ حلال و حرام کا فیصلہ اللہ اور رسولؐ کرتے ہیں نہ کہ کوئی صحابی۔ امام احمدؒ نے اگر حضرت علیؓ کے اس قول کو صحیح ترین قول قرار دیا ہے تو ہم اس کی تردید نہیں کرتے۔ لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ قولِ علیؓ کی حیثیت قولِ نبیؐ کی نہیں ہے۔ نہ ہم یہ یقین کرسکتے ہیں کہ شطرنج کے بارے میں جو رائے حضرت علیؓ نے ظاہر کی وہ رسول اللہؐ سے سن کر ظاہر کی ہوگی کیونکہ رسول اللہؐ دین کے معاملہ میں کبھی ایسی رائے ظاہر نہیں فرماسکتے جو خلافِ واقعہ ہو۔ شطرنج کا "میسر" یعنی جوا ہونا خلافِ واقعہ ہے۔

(۴) یہ بہت غلط بات ہے کہ دورانِ بحث آپ مرقاۃ جیسی ضخیم کتاب سے عبارت نقل فرمائیں تو حوالہ نہ دیں کہ کس باب میں یا فلاں ایڈیشن کے کس صفحے پر یہ عبارت آئی ہے۔ "مظاہر حق" کی نقل میں تو آپ نے جلد اور صفحہ سب لکھدیا۔ پھر مرقاۃ کی نقل میں اس سے گریز کیوں فرمایا؟

خیر۔ جواب سنئے۔ ملا علی قاری یا صاحب القاموس یا کوئی اور بزرگ اگر شطرنج کو "میسر الاعاجم" قرار دیں تو یہ محض ایک رائے ہے۔ قرآن یا حدیث نہیں۔ یہ رائے سراسر غلط ہے کیونکہ واقعے کے خلاف ہے۔ شاید اسی لئے انھیں یہ کہنا پڑا کہ "خواہ حقیقتاً ہو یا صورۃً" —— اس سے خود ظاہر ہے کہ کہنے والوں کے نزدیک بھی شطرنج کا قمار ہونا امرِ واقعہ نہیں بلکہ ایک مجازی اور سطحی اطلاق ہے۔ دوسری اقوام سے جس تشبّہ کی ممانعت حدیث میں آئی ہے وہ اس طرح کا تشبّہ ہرگز نہیں۔ اگر ایسے تشبّہ بھی حرام ہونے لگیں تو ہاکی، فٹ بال، ٹینس، کیرم، لوڈو، کرکٹ سب حرام قرار پاجائیں۔ پھر ایک قیاسی تشبّہ سے جو ہلکے درجے کی حرمت و کراہت ثابت ہوسکتی ہے اس کا انکار ہم نے کب کیا ہے۔ کیا ہم شطرنج کی قصیدہ خوانی کرتے آرہے ہیں۔ ہم نے اپنے جو الفاظ اپریل میں نقل کیے انھیں پھر دہرا لیجئے:-

"حدیث میں شطرنج کی ممانعت آئی ہو یہ ہمارے

علم میں نہیں۔ تاہم لہو و لعب کی جو اقسام حدیث
کی رو سے ممنوع و مکروہ ہیں ان میں بہرحال
یہ داخل ہے۔"

کیا تشبیہ والے قول سے اس سے زیادہ بھی کچھ ثابت ہو سکتا ہے؟

آپ در اصل غلو اور تشدد کی رو میں بہہ رہے ہیں۔ خواہ مخواہ شطرنج کو لحمِ خنزیر جیسا باور کرانے پر مصر ہیں۔ یہ حرکت جذباتی ہے۔ قانون کی متین اور بے لاگ بحث سے اس کا جوڑ نہیں۔ ماضی میں کچھ لوگ اگر غلو سے کام لے گئے ہیں تو ضروری نہیں کہ آپ اور ہم بھی ان کی پیروی کریں۔

حدیث کے لفظ خاطی کا ترجمہ عاصی یعنی گناہگار مان لیا مگر کیا ہماری مذکورہ عبارت سے یہ واضح نہیں کہ شطرنج کا "گناہ" ہونا ہمیں بھی تسلیم ہے۔ جو چیز حدیث کی روشنی میں "ممنوع و مکروہ" ہوگی وہ گناہ و خطا نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگی۔ ہاں یہ بات ماننے کو ہم ہرگز تیار نہیں کہ اس کی حرمت لحمِ خنزیر یا "مورتی پوجا" جیسی ہو۔ آخر صاحبِ مرقاۃ نے بھی تو خاطی کا ترجمہ عاصی کر کے یہ نہیں کہا کہ یہ گناہ زبردست کبیرہ گناہ ہے۔ شرک یا اکلِ خنزیر یا شربِ خمر جیسا ہے۔ آپ خواہ مخواہ بات کو طول دیئے چلے جا رہے ہیں۔ آپ کو شاید یہ بھی یاد نہیں رہا کہ خبرِ واحد سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یقین کا فائدہ نہیں دیتا جبکہ قرآن سے ثابت شدہ امور یقینی و قطعی ہیں۔ کیسے ممکن ہے کہ قرآن نے صریحاً جن اشیاء کو حرام و نجس کہا ہو ویسی ہی حرمت و نجاست کسی ایسی چیز کے لئے بھی ثابت ہو جائے جس کی حرمت قوی ترین ذرائع سے معلوم نہ ہوئی ہو۔

(۵) ہم نے اگر یہ کہا تھا کہ ـــــ "مسنون وہی چیز ہوگی جس کا انتساب حضورؐ کی ذات بابرکات سے ہو ثابت ہو جائے۔" تو بالکل درست کہا تھا۔ آپ نے شاید منطق نہیں پڑھی اس لئے "عام خاص من وجہ" اور "عام خاص مطلق" کا فرق نہیں سمجھے اردو میں سمجھئے کہ دودھ تو لازماً سفید ہوگا لیکن ہر سفید چیز دودھ نہیں ہوگی۔ یا کاجل کا رنگ سیاہ ضرور ہوگا لیکن ہر سیاہ چیز کاجل نہیں ہوگی۔ ٹھیک یہی معاملہ "سنت" کا ہے۔ اصطلاحِ فقہ میں جس چیز کو مسنون کہا جاتا ہے وہ لازماً وہ ہوتی ہے جو حضورؐ کی ذات بابرکات سے منسوب ہو۔ لیکن ہر وہ چیز جو حضورؐ کی ذات بابرکات سے منسوب ہو لازماً سنت نہیں ہوگی۔ مثلاً حضورؐ نے ایک بار اپنے اوپر شہد حرام کر لیا تھا یا ایک بار آپ نے کھڑے ہو کر بھی پیشاب کیا تھا یا ایک بار آپؐ نے ایک غریب صحابی کی آمد پہ ناخوشگواری محسوس فرمائی تھی یا ایک بار آپ نے یہ فرمایا تھا کہ نر اور مادہ کھجوروں کا پیوند بے کار ہے، یا آپ بھولے سے چار کے بجائے پانچ یا تین رکعات پڑھ گئے تھے۔ یہ سب امور و افعال آپ کی طرف بہ دلائل تو یہ منسوب ہیں لیکن کیا یہ سنت بھی ہیں؟

علاوہ اس کے وہ چیزیں بھی سنت نہیں ہیں جن کا تعلق امورِ عادیہ یا خاص زمانے اور خاص احوال سے ہو۔ مثلاً آپ روم کی چادر یا فارس کا لباس پہن چکے ہیں۔ مگر روم و فارس کے ملبوسات کا استعمال مسنون نہیں قرار پایا۔ اسی طرح آپ نے متعدد چیزیں کھائی ہیں اور یہ سب مسنون نہیں ہیں۔

تو میرے محترم! اس تصریح کے بعد آپ اکتوبر ۶۷ء کا تجلی بھی پڑھیں اور اپریل ۷۲ء کا بھی۔ کوئی تضاد کہیں نظر نہ آئے گا۔ ہم اسی لئے ہانکے پکارے کہے چلے جاتے ہیں کہ اجتہاد و تفقہ کی منزل بہت دور ہے۔ چند ادھر ادھر کی عبارتیں ڈھونڈ لانا تفقہ نہیں کہلاتا اور عافیت اسی میں ہے کہ اپنے علم و فہم کا مناسب اندازہ کرنے کے بعد زبان کھولی جائے۔ ہمارا تو خیال ہے آپ نے مرقاۃ بھی نہیں دیکھی۔ اگر دیکھتے تو تفصیلی حوالہ کیوں غائب ہو جاتا۔ ڈر ہے کہ المغنی اور ہدایہ اور ابوداؤد کی بھی براہِ راست زیارت آپ نے نہ فرمائی ہو۔

(۶) اپنی ترجمے کی غلطی پر معذرت چاہتے ہوئے آپ نے خواہ مخواہ یہ کوشش کی ہے کہ صاحبِ تجلی کی بھی کچھ خطائیں

شمار کرا کے اپنا بار ہلکا کرلیں۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ تجلی کے صفحات سے اعراب و الفاظ کے سہو و خطا کی جو مثالیں آپ نے ڈھونڈی ہیں ان کا تعلق صاحب تجلی سے نہیں بلکہ کاتب اور پریس سے ہے۔ حالانکہ آپ کے جس قصور کی نشاندہی ہم نے کی تھی اس کا تعلق کاتب اور پریس سے نہیں خود آپ سے ہے اور آپ کے اس اعتراف کے بعد کہ "میں نے کارخانۂ تجارت کتب والوں کے شائع کردہ ترجمہ سے روایت نقل کردی تھی" اگرچہ یہ صفائی تو ہوگئی کہ ترجمہ میں لفظ "گناہگار" کا اضافہ آپ نے نہیں کیا لیکن دوسرا یہ الزام آپ پر عائد ہوا کہ عبارتیں لیتے تو آپ کہیں اور سے ہیں اور حوالہ دیتے ہیں کہیں اور کا۔ علمی دیانت کا تقاضا تھا کہ آپ کارخانہ تجارت کتب کے شائع کردہ اردو ترجمۂ مشکوٰۃ کا حوالہ دیتے مگر آپ نے حوالہ ٹانک دیا "بیہقی" کا۔ گویا کام تو چلا رہے ہیں اردو کتب سے مگر رعب ڈال رہے ہیں عربی حوالوں کا۔ اسی لئے ہمیں شبہ ہوا ہے کہ مرقاۃ وغیرہ بھی آپ نے براہ راست نہیں دیکھیں۔ فرمایا جائے کہ آپ کا یہ قصور کیا اسی نوعیت کا تھا جس نوعیت کی غلطیاں آپ نے تجلی کی کتابت میں چھانٹی ہیں؟

آئندہ کے لئے بڑے ادب سے گذارش ہے کہ اگر میدانِ بحث میں کودنا ہی آپ کے لئے ضروری ہو تو پہلے موضوع کے محققانہ مطالعہ کی واجبی زحمت فرمالیا کریں ہمارے گوناگوں انتقادات پر نظر ڈالئے۔ آپ محسوس کریں گے کہ دوسروں کی علمی غلطیاں یونہی ثابت نہیں کردی جاتیں بلکہ تحقیق و تدقیق میں خون پسینہ ایک کیا جاتا ہے۔ اُمّہاتِ کتب دیکھی جاتی ہیں۔ بینائی، دماغ اور وقت کو بے دریغ صرف کیا جاتا ہے تب کہیں جاکر تہہ کے موتی برآمد ہوتے ہیں۔ آپ بھی یہی روش اختیار کریں تو ہوسکتا ہے کہ کوئی اہم اور قابل قدر تحریر آپ کے قلم سے نکل ہی جائے۔

تازہ نمک پاشی

ناظرین کو یاد ہوگا کہ ڈاکٹر ذاکر مرحوم نے عہدۂ صدارت ہند سنبھالتے ہی ہندو دھرم اور جین مت کے دو مذہبی پیشواؤں کی بارگاہ میں حاضری دی تھی اور ان کے قدم چھوئے اور آشیرباد حاصل کی تھی۔ اس گتھی کو انکے رفیق طریق محمد مجیب صاحب وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایک تازہ تقریر نے اب کھولا ہے۔

"یہ اسلئے کہ ذاکر صاحب اپنے فرقہ کی تنگ نظری کو ختم کرنا چاہتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان ہندوؤں کے تہذیبی اقدار کی عزت نہ کریں۔"

سبحان اللہ! ایسے مجرم کو وکیل ایسا ہی ملنا تھا۔ واللہ اعلم ان بزرگ کے ذہن میں تنگ نظری کی تعریف کیا اور کچھ ہے بھی یا سرے سے بے معنی لفظ بول دینے کی عادت ہی ہے؟ — مولانا ابوالکلام سے بڑھ کر ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار کون ہوا ہے۔ کیا انھوں نے کوئی حرکت اسکے قریب قریب بھی کی تھی۔ انھوں نے نہ کبھی کیا نہ قدوائی بھی اس کے قریب نہیں گئے تھے؟ حکیم اجمل خاںؒ۔ ڈاکٹر انصاریؒ۔ ڈاکٹر سید محمودؒ۔ حافظ ابراہیم۔ عبدالمجید خواجہ۔ شفیق الرحمٰن قدوائیؒ۔ مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور بیسیوں نہیں بچاسیوں اور سیکڑوں بڑے سے بڑے نیشنلسٹ مسلمانوں میں کسی ایک نے بھی اپنی ذات اور اپنی ملت کو اس درجہ ذلیل اور رسوا کیا تھا۔ شری چھاگلا جی کو مبارک ہو وہ دانستہ یا نادانستہ دہلی میں اپنا ایک ایسا جانشین چھوڑ آئے ہیں جو اسلامی تہذیب کو منھ چڑانے اسلامی غیرت و حمیت کو حیرت ٹھینگا دکھانے، ملت کے دل پر کچوکے دینے سے کسی وقت بھی باز نہیں رہتا!

(صدق جدید)

تبلیغی جماعت • طاق عدد اور حدیث • وہی پرانا راگ • یا رسول اللہ کا نعرہ • بدعات و توہمات • بدعتی یا فاسق کے پیچھے نماز • لڑکیوں کی تعلیم • داڑھی کی بحث • مولویوں کی بدعملی • ڈاک خانے کے فارموں کی خرید فروخت • ذبیحہ کا ایک مسئلہ • تلک یعنی جہیز کی رسم • عورتوں کی ملازمت اور تعلیم وغیرہ • احباب کے تقاضے اور خواہشات • میلاد کا قیام • سیرت النبی کے جلسے۔

تجلّی کی ڈاک

تبلیغی جماعت

سوال :- از: عبدالرشید۔ فیض پور۔ ضلع جلگاؤں۔

ابھی پچھلے جمعہ کو ایک تبلیغی جماعت مالی گاؤں سے آئی تھی۔ اُس کے امیر نے جو بیان دیا اُسمیں تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے ایک جہاد کے موقعہ پر اپنا سارا سرمایہ حضورؐ کے سامنے پیش کر دیا حتیٰ کہ اپنے جسم کا لباس اُتار کر ٹاٹ کا کرتہ پہن لیا۔ اس ادا کو پسند کر کے کائنات کے تمام ملائکہ نے اُس دن ٹاٹ کے کپڑے پہنے۔ خود جبرئیلؑ بھی یہی لباس پہن کر حضورؐ کے پاس پیغامِ وحی لائے۔

(۲) یہ تبلیغی کام اللہ چلا رہے ہیں وہیں سے اس جماعت کو تصدیق حاصل ہے۔ (۳) گشت والا عمل ایک لاکھ ۲۴ ہزار پیغمبر والا عمل ہے۔ براہِ کرم ان سوالات پر آپ تبصرہ فرمائیں۔

جواب :-

موجودہ تبلیغی جماعت کا جو طریقِ کار ہے اس کا نتیجہ لامحالہ یہی ہوتا ہے کہ بے علم یا کم علم، اَن گھڑ اور غیر تربیت یافتہ لوگ واعظ و مبلّغ بن جائیں۔ پھر تصوف کا جو مزاج اس جماعت کے اکابر میں رچا ہوا ہے اس کا ثمرہ بھی بہرحال یہی ہوتا ہے کہ ضعیف، غیر منطقی اور نشہ آور قسم کی روایات اور کہانیاں اس جماعت میں خصوصی دلچسپی کا مرکز بن جائیں۔ جماعتِ تبلیغی کے موجودہ ارباطین میں شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کا نام نامی آپ نے سنا ہی ہوگا۔ ان کی ہی متعدد کتابیں اس جماعت کے اصاغر کا وظیفہ ہیں اور ان کتابوں میں غیر مستند روایات خاصی تعداد میں ہیں۔

تینوں سوالات کا جواب علی الترتیب یہ ہے:-

(۱) قابلِ اعتبار روایات سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اپنا سب کچھ حضورؐ کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ لیکن یہ نہیں معلوم ہوا کہ تن کے کپڑے اُتار کر ٹاٹ کا لباس پہن لیا ہو۔ یہ عین ممکن ہے کسی کمزور روایت میں ایسا کچھ بھی

آگیا ہو مگر یہ عقل و قیاس کے خلاف ہے۔ یوں کہ ٹاٹ بہرحال ایک قیمت رکھتا ہے اور دورِ رسالت کے مدینے میں تو یہ اس سے کہیں زیادہ بیش قیمت تھا جتنا آج ہم تصور کرتے ہیں۔ اگر اس روایت کو صحیح فرض کر لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ عین اس وقت جب حضورؐ کو غزوے کیلئے زیادہ سے زیادہ مالی امداد درکار تھی حضرت ابوبکرؓ نے خواہ مخواہ ایک رقم ٹاٹ کا لباس حاصل کرنے میں صرف کی۔ حالانکہ اس کا فائدہ سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ تن پر جو پرانا لباس ہے وہ پیش کردہ مال میں بڑھ جائے۔ ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ اس استعمال شدہ جوڑے سے کہیں زیادہ مفید وہ رقم ہو سکتی تھی جو حضرت صدیقؓ ٹاٹ کا لباس خریدنے پر صرف کرتے لہذا کیسے مان لیا جائے کہ انھوں نے مفید کو چھوڑ کر غیر مفید راستہ اختیار کیا ہوگا۔

اور چلئے یہ مان ہی لیجئے کہ اُس دن موصوف نے ٹاٹ کا لباس زیب تن کیا مگر یہ کہاں سے معلوم ہو گیا کہ جملہ فرشتوں نے بھی ان کی تقلید میں اس روز ٹاٹ کا جوڑا زیب تن فرما لیا۔ فرشتوں کے بارے میں تو یہ تصور رہی کرنا سادہ لوحوں کا کام ہو سکتا ہے کہ وہ انسانوں کی طرح تن پوشی کے لئے قمیصیں اور پاجامے یا تہبند پہنتے ہوں گے ان کے نورانی جسموں پر کوئی عضو قابلِ ستر یعنی چھپانے کے قابل ہے بھی یا نہیں اسی کا علم نہیں۔ نہ ان کے یہاں دو جنسوں کا ثبوت ملتا ہے کہ انسانوں کی طرح جنسی تعلقات رکھتے ہوں۔ نہ ایسی صورت میں یہ متوقع ہے کہ ان کے اجسام میں وہ آلات و اعضاء بھی موجود ہوں گے جنھیں چھپانا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

دراصل تصوف کے خمیر میں ہے ہی مبالغہ پسندی اور منطق دشمنی۔ گاؤں والے بڑے خوش ہوئے ہوں گے یہ سُنکر کہ سُبحان اللہ جبریلؑ بھی ٹاٹ پہنے اتر رہے ہیں اور سارے فرشتے ٹاٹ لٹکائے پھر رہے ہیں۔

(۲) آپ نے سُنا ہوگا مرزا غلام احمد قادیانی کے ارادتمند بھی یہی خوش فہمی رکھتے ہیں کہ مرزا صاحب کی نبوت اور مہدیت کی تصدیق اللہ اور رسولؐ کے یہاں سے کھلم کھلا ہو چکی ہے۔ نیز اسی طرح ہر فرقے اور گروہ میں آپ اسی نوع کی خوش فہمیاں کافی مقدار میں دیکھ سکتے ہیں لہذا تبلیغی جماعت والے کیوں نہ خوش فہمیوں کی فصل بوئیں اور خیال ہی خیال میں جنت کے میوے نوش کریں۔

بزرگوں کے بہت سے خواب بھی اس سلسلے میں چلتے ہیں۔ فلاں صاحب نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہؐ تشریف فرما ہیں اور ان بزرگ کی کمر پر تھپکی دے کر فرما رہے ہیں کہ بے شک تبلیغی جماعت ہی وہ واحد جماعت ہے جو چودھویں صدی میں راہِ ہدایت اور صراطِ مستقیم پر قائم ہے۔ جاؤ اور زیادہ سے زیادہ اسے پھیلاؤ۔

ایک بڑا مغالطہ یہ ہے کہ عوام سمجھتے ہیں جب خواب میں رسول اللہؐ نے فرما دیا تو اس سے بڑھ کر تصدیق اور کیا ہوگی۔ عقیدہ یہ ہے —— اور صحیح ہے کہ شیطان حضورؐ کی شکل میں نہیں آسکتا لیکن اس کا صحیح مطلب عوام نہیں سمجھتے۔ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جو شکل و صورت واقعۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی اسے اختیار کرنا شیطان کی طاقت سے باہر ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے اور واقع بھی ہوتا ہے کہ شیطان حضورؐ سے ملتا جلتا میک اپ کر کے وارد ہوا اور کہہ دیا کہ میں رسول ہوں۔ یا اپنے چیلوں کو صحابہ کا بھیس بدلوا کر ان سے کہلوا دیا کہ یہ رسول اللہ ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو لوگ قابلِ اعتماد روایات کے ذریعہ حضورؐ کی شکل و ہیئت کو جان چکے ہیں اور ان میں یہ صلاحیت ہے کہ کتابوں میں لکھے ہوئے نقشے کو ایک زندہ پیکر سے مطابقت دے سکتے ہوں اور ان کا حافظہ بھی اس حد تک قوی ہو کہ یہ کتابوں میں پڑھا ہوا نقشہ ہر وقت مستحضر رہ سکے وہی تسلی بخش طور پر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو بزرگ خواب میں جلوہ فرما ہیں وہ واقعۃً رسول اللہؐ ہیں یا شیطان خبیث دعویٰ کا دے رہا ہے۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ خوابوں میں حضورؐ کی زیارت کے جتنے قصے معروف و معلوم ہیں ان میں سب

قابلِ اعتماد نہیں ہیں کیونکہ کسی شخص کا عابد و زاہد اور پیر و مرشد ہونا اس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ حضورؐ کے صحیح خد و خال بھی ذہن میں محفوظ رکھتا ہو اور حالتِ خواب میں اپنی قوتِ تمیزی سے ٹھیک ٹھیک کام لے سکے۔ آثار و قرائن کا جہاں تک تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ ابلیس ہم سے زیادہ عیار ہے اور ہماری کمزوریاں جانتا ہے۔ جب وہ دھوکا دینے آئے گا تو کیوں نہ کچھ خوشبوئیں اور روشنیاں ساتھ لائے گا۔ کیوں نہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ وغیرہ کے میک اپ میں چند چیلوں چانٹوں کو ساتھ لگا لے گا۔ اب بزرگ صاحب خوش ہیں کہ سبحان اللہ فضا مہک رہی تھی، انوار بکھر رہے تھے اور صحابہؓ بھی تشریف فرما تھے۔

اسی طرح کے امکانات و احتمالات کے باعث علمائے حق اس پر متفق ہیں کہ خواب یا کشف و الہام کو حجت نہیں مانا جا سکتا۔ یہ شریعت کے تابع ہیں اس پر قاضی اور امیر نہیں۔

خلاصہ یہ کہ کام تو ایک تبلیغی جماعت ہی کا کیا روس اور چین کے کمیونسٹوں کا بھی اللہ ہی چلا رہا ہے۔ اسرائیل کا کام بھی اللہ کی تکوینی اجازت کے بغیر تو نہیں چل سکتا۔ بلیک مارکیٹیوں، ناجائز منافع خوروں، غنڈوں اور عیاشوں سے زیادہ تو تبلیغی جماعت کے کام کو فروغ نہیں پھر کیا کوئی کہے گا کہ اللہ کے علاوہ کسی حاکمِ کائنات کی مرضی سے یہ سب ہو رہا ہے۔ نہیں۔ پتہ پتہ تو اسی ایک مالک الملک کی اجازت کا تابع اور فرمان کا مطیع ہے۔ کس کا کتنا کام چل رہا ہے یہ حق و باطل کا معیار نہیں۔ واحد معیار قرآن و سنت ہیں اور قرآن و سنت نے تاکید و اصرار کے ساتھ بتایا ہے کہ دین کے معاملے میں مضبوط بنیادوں پر جمو۔ کمزور روایات اور توہمات و تخیلات کے پیچھے مت چلو اور خام و ناقص باتوں کی تبلیغ مت کرو۔

(۳) گشت والے عمل ہی کے بارے میں نہیں دوسرے کتنے ہی اعمال اور اوراد و معمولات کے بارے میں تبلیغی جماعت کے یہاں اسی طرح کی گل افشانیاں مقبول ہیں۔ مبالغے کے بغیر کام بھی تو نہیں چلتا۔ خیر سے کچھ روایات بھی پچھلے صالحین کی گھڑی ہوئی موجود ہیں جنھیں "حدیث" کے نام پر پیش کر کے غلو کا شوق بخیر و خوبی پورا ہو جاتا ہے۔ پھر کیوں نہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے جب کہ عوام بے علم ہیں، سادہ دل ہیں، زود اعتبار ہیں اور قبوری شریعت نے ان کے مزاجوں کو ویسے ہی اتنا فاسد کر دیا ہے کہ اب مکھی مچھر سب انھیں ہضم ہو جاتا ہے۔ باقی صد ادب!

طاق عدد اور حدیث

سوال:۔ از:۔ اشفاق احمد اعظمی۔

ماہ دسمبر کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ ایک سوال کا جواب نظر سے گذرا جو بہت حد تک غیر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ سائل نے پوچھا یہ تھا "بہت سے مسلمان چندہ دیتے وقت بھوٹ عدد کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ ہندوؤں کی کوئی نقل ہے یا اس کی کوئی حقیقت ہے؟" تو آپ نے جواب عنایت فرمایا کہ "شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔"

حالانکہ بخاری شریف کی ج ۲ صفحہ ۹۴۹ پر ایک روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے هُوَ وِترٌ یحب الوتر اور مشکوٰۃ شریف میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے (ان اللہ وتر یحب الوتر) اور اسی کے تحت یہ قول کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طبقاتِ ارض و سماء طاق تخلیق کئے۔ اور اسی طرح تسبیحاتِ صلوٰۃ سبحان ربی الاعلیٰ وغیرہ طاق بار پڑھنا مروی ہے۔ اور بہت سی تسبیحات ہیں جن کو طاق ہی مرتبہ پڑھنا ثابت ہے۔ نیز استنجا بھی اسی زمرے میں ہے۔

کیا اس حدیث کے موجود ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ "شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں"۔ ایک جید مفکر اور کہنہ مشق مفتی کے لئے زیب دے گا؟ ہاں اگر زیب دے گا تو ان کے لئے لازمی ہے کہ مذکورہ حدیث کی ایسی توجیہ پیش کریں جو عقل و نقل کی کسوٹی پر صحیح اترے۔ اور اگر لائقِ زیب نہیں تو وہ اپنے عنایت کردہ فتوے سے اسی طرح رجوع

کریں جس طرح جواب دیا گیا ہے۔

جواب ۲:-

کاش آپ اپنی ذہانت کو حقیقت پسندانہ انداز میں استعمال فرما لیتے تو سوال و جواب کی نوبت ہی نہ آتی۔

آپ نے یہ تو دیکھ لیا کہ بخاری میں فلاں حدیث آئی ہے مگر یہ مطلق نہ فرمایا کہ یہ کس باب اور کس فصل میں آئی ہے۔ کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ امام بخاریؒ اسے کتاب الدعوات کے باب لِلّٰہِ تعالیٰ مائۃ اسم غیر واحدٍ میں لائے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایسی حدیث نہیں جس کا مفہوم ہر جگہ چسپاں کیا جا سکتا ہو بلکہ اس کا تعلق محض دعاؤں سے ہے اور اصلاً اس کا جوڑ اللہ تعالیٰ کے ۹۹ ناموں سے ہے۔

آپ نے بخاری کے حاشیہ پر تمثیل میں سات طبقاتِ ارض و سما اور تسبیحات صلوٰۃ اور استواطرح کا ذکر دیکھ لیا اور بغیر فکر و تدبر کئے اسی کو نقل کر دیا حالانکہ بے لاگ انداز میں سوچتے تو فوراً ہی آپ کے ذہن میں عبادات و احکام اور حیات و کائنات کی کتنی ہی مثالیں ایسی آجاتیں جن میں اللہ نے وتر (طاق) کا عدد پسند نہیں فرمایا۔

سب سے پہلے اشرف المخلوقات انسان ہی کو لے لیجئے۔ اس کی پیدائش کا مدار اللہ تعالیٰ نے ایک جوڑے پر رکھا اور قرآن میں یہاں تک فرمایا کہ وَمِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ (اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے) اس سے معلوم ہوا کہ صرف انسان ہی میں نہیں حیوانات و نباتات تک میں اللہ کو جوڑے پسند ہیں نہ کہ وتریت۔ پھر آپ دیکھ سکتے ہیں کہ آدمی کے منہ پر دو کان لگائے۔ دو آنکھیں۔ دو ہاتھ۔ دو پاؤں۔ دو گردے۔ ناک ایک لگائی تو سوراخ اس میں بھی دو کر دیئے۔ اگر بات یہی ہوتی کہ ہر معاملہ میں اللہ کو وتریت یعنی طاق عدد رکھنا پسند ہوتا تو کیا اس کے لئے کچھ دشوار تھا کہ انسانی جسم کا ہر عضو فقط ایک یا تین بنا تا۔

عبادات و احکام پر نظر ڈالئے۔ دن کی پانچ فرض نمازوں میں فقط ایک نماز مغرب تو تین رکعات ہے باقی چاروں جفت رکعات پر مشتمل ہیں۔ سونے چاندی، نقد، زمین، سب کی زکوٰۃ میں دس فی صدی، بیس فی صدی، چالیس فی صدی کی شرحیں آخر وتر تو نہیں جفت ہی ہیں۔

اذان و اقامت میں ہر فقرے کو جفت ادا کرنے کا حکم دیا گیا حالانکہ متذکرہ حدیث اگر اتنی ہی عام ہوتی جتنی آپ سمجھ بیٹھے ہیں تو کیا رکاوٹ تھی کہ یہ فقرے یا تو اکہرے رکھے جاتے یا تہرے کر دیئے جاتے۔ روزے تیس بھی ہیں اور ۲۹ بھی۔ حالانکہ اگر اللہ کو ہر معاملے میں۔۔ یا کم سے کم عبادات ہی کے معاملے میں بلا تخصیص وتر عدد پسند ہوتا تو اس کے لئے کیا مشکل تھا کہ چاند کو انتیس (۲۹) دنوں میں مقید کر دیتا اور قمری مہینہ ہمیشہ ۲۹ یا ۳۱ دن کا ہوا کرتا۔ سال کی مدت بھی قرآن میں بارہ مہینے بیان ہوئی اور آپ جانتے ہی ہیں کہ بارہ کا عدد طاق نہیں جفت ہے اس سے ثابت ہوا کہ ارض و سما کے طبقات کا سات ہونا فقط ایک تکوینی راز ہے جس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ اللہ کو وتر پسند ہے یا جفت۔ اگر اس سے تعلق ہوتا تو اسے کون روک سکتا تھا کہ تمام ہی نوامیس فطرت اور تمام ہی مظاہر کائنات اور جملہ احکام و عبادات میں طاق عدد کا التزام فرماتے۔

آپ سیرت کا مطالعہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر کو جن لوگوں نے قبر میں اتارا ان کی تعداد چار تھی نہ کہ تین یا پانچ حالانکہ اگر عند اللہ وتر کی محبوبیت والی حدیث اتنی ہی وسیع المصداق ہوتی جتنی آپ نے سمجھ لی ہے تو کیا وجہ تھی کہ صحابہؓ اس اہم موقعہ پر وتر کو بھول جاتے۔

ہمارے جواب کا تعلق چندے سے تھا۔ آپ کو علم ہی ہوگا کہ مختلف غزوات کے مواقع پر اللہ کے رسول صحابہ کرامؓ سے مالی اسباب کے تعاون کی اپیل فرماتے رہے ہیں۔ اس اپیل پر بے شمار صحابہؓ نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق

توجہ بھی دی ہے۔ کیا کسی تاریخ میں آپ نے دیکھا کہ نقد، یا ساز و سامان پیش کرتے ہوئے کسی معروف صحابی نے وتر کا پہلو ملحوظ رکھا ہو۔ کئی مثالیں ایسی موجود ہیں کہ سو اونٹ بطور "چندہ" پیش کئے گئے۔ ان میں ایک کم یا زیادہ کرکے ۹۹ یا ایک سو ایک کا عدد نہیں بنایا گیا حالانکہ صحابہؓ سے بڑھ کر اللہ اور رسولؐ کی پسند کا لحاظ رکھنے والا کون ہو سکتا ہے۔

ہمارے جس جواب پر آپ معترض ہوئے ہیں وہ چندے ہی سے متعلق تو ہے۔ ہم پھر دہراتے ہیں کہ اس معاملے میں طاق عدد کا خیال رکھنا بعض حضرات کا اپنا قیاس تو ہو سکتا ہے شریعت اس کے لئے کوئی بنیاد نہیں دیتی۔ جس حدیث کو آپ نے بنیاد بنایا ہے وہ دعاء تسبیح سے یا اللہ کے اسماءِ حسنیٰ سے مخصوص ہے۔

یاد رکھئے۔ قرآن و حدیث کی صحیح تشریح و تفہیم جہاں بڑا کارِ ثواب ہے، وہیں غلط تشریح بڑا کارِ عذاب بھی ہے فقاہت کو اسی لئے قرآن اور حدیث میں بڑی نعمت کہا گیا ہے۔ احادیث کا صرف مطالعہ کر لینا ہر شخص کو فہم حدیث کا اہل نہیں بنا دیتا۔ عطاری اور حکمت میں فرق ہے۔ عطاروں کے پاس بے شک دواؤں کا ذخیرہ موجود ہوتا ہے مگر اس ذخیرے کا صحیح استعمال حکما ہی کرا سکتے ہیں۔ کسی فقہی حکم کے بارے میں آپ جلد بازانہ طور پر یہ فیصلہ ہرگز نہ دیں کہ او ہو یہ تو فلاں حدیث کے خلاف ہے۔ ایسا کرنا اپنے کو بھی اور دوسروں کو بھی بھٹکانے کے ہم معنی ہوگا۔

مانیں نہ مانیں آپ کو یہ اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جائیں گے

وہی پرانا راگ

سوال ۲:۔ (نام ندارد) کیموہ (کشمیر)

(۱) خبردار کریں کہ خلیفہ یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ جائز ہے یا نہیں؟ (بمذہب حنفی) حکم فرمائیں۔ تاکید ہے۔ مہربانی اس کا جواب مطابق قرآن و حدیث فرمائیں۔

(۲) اور یہ بھی فرمائیے کہ عورتوں کو زیارتِ قبور کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) جہر سے آمین کہنا جائز ہے یا نہیں؟

(۴) بزرگانِ دین کی روحیں حاضر و ناظر ہیں یا نہیں؟

ہمیں اُمید ہے کہ آپ ہمارے مسائل کو ضرور حل کرکے جواب فرمائیں گے۔

جواب ۲:۔

اس طرح کے سوالوں کا جواب ہم پچاس بار دے چکے مگر زندہ ہیں تو ہزار بار اور دیں گے۔ نئے نئے قارئین ہمارے پچھلے جوابوں سے باخبر نہیں اور ہمارے جوابات ابھی کتابی شکل میں آئے نہیں لہٰذا حوالہ بھی نہیں دے سکتے کہ وہاں دیکھ لو۔ برادرانِ اسلام ہمارے پیارے بھائی ہیں۔ انھیں سادہ لوحی اور کم علمی کی بنا پر لوگ بہکائیں تو ہم بار بار ٹوکیں گے۔

(۱) یا عبد القادر شیئاً للہ کا وظیفہ ایسا کھلا شرک ہے کہ اگر کہیں سچی اسلامی حکومت قائم ہو تو وہ ایسا وظیفہ پڑھنے والوں اور ایسا نعرہ لگانے والوں کو مرتد قرار دے کر ان سے توبہ کا مطالبہ کرے گی اور توبہ نہ کریں تو گردن اڑا دے گی۔ غلط قسم کی تعلیمات کے کوڑے کرکٹ میں اگر قرآن و حدیث کے آب دار موتی چھپا نہ دیئے گئے ہوتے تو بے وقوف سے بے وقوف مسلمان بھی ایسے وظیفوں کے چکر میں نہیں آسکتا تھا۔ مگر غلط قسم کی پیری مریدی اور بگڑے ہوئے تصوف نے سادہ دل اور خدا پرست مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھاپا مار کر ان کی عقل خراب کر دی۔ وہ بیچارے کیا کریں جب فلاں حضرت اور فلاں شاہ صاحب اور فلاں قطب الاولیاء اور فلاں واعظ گل افشانی فرما رہے ہیں۔ قرآن کی آیاتِ ناطقہ سے کچھ سروکار نہیں۔ حضورؐ کے ثابت شدہ ارشادات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لائیں گے ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ کمزور روایات جن کا حسب نسب یکسر مشتبہ۔ منطق وہ لڑائیں گے جس کا سر پیر نہیں۔ دلائل سے زچ ہو گئے تو غضب ناک ہو کر چیخیں گے

وہابی۔ بدعقیدہ۔ منکرِ اولیاء وغیرہ وغیرہ۔

اے کشمیری بھائیو! یاد رکھو قیامت کے دن جب حساب کتاب ہوگا تو ہمارے اور تمھارے سب کے عقائد و اعمال بس قرآن اور احادیثِ قویہ ثابتہ کی کسوٹی پر جانچے پرکھے جائیں گے اور اسی اعتبار سے جنت و دوزخ کی تقسیم ہوگی۔ وہاں نہ بڑے پیر صاحب کام آئیں گے نہ چھوٹے۔ سیدنا حضرت شاہ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ صاف کہدیں گے کہ اے اللہ میری کچھ خطا نہیں میں تو زندگی بھر میں پڑا تھا اور زندگی بھر میں نے توحید کی تعلیم دی۔ یہ شیطان نے بہکا سکھا کر سارا فساد پھیلایا ہے۔ کم عقل اگر شیطان کے بھرّے میں آکر مجھے دستگیر اور حاجت روا اور نہ جانے کیا کیا سمجھنے لگے تو میرا اس میں کیا قصور۔ میری تو مغفرت فرمائیے ان کا آپ جو چاہیں بنائیں۔

اور یہ بھی یاد رکھو۔ اگر شاہ صاحب رحمۃ اللہ نے کوئی قول یا فعل ایسا کیا ہوگا جو قرآن و سنت کے خلاف ہو تو ان سے بھی باز پرس ہوگی۔ خدا کی عدالت میں سب بندے مسئول ہیں۔ انبیاء تک اس کے خوف سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

(۲) قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اللہ کے سچے رسول ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔ اب آپ دیکھ لیجئے کہ کیا گنجائش رہی بحث کی۔

قبروں کی زیارت تو آج مردوں کیلئے بھی فتنہ بن گئی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے قبروں پر حاضری کی ترغیب فقط اس مقصد سے دی تھی کہ موت کو یاد رکھو تاکہ زندگی میں خدا کی نافرمانی سے ڈر لگا رہے۔ حسابِ آخرت اور مراحلِ قبر فراموش نہ ہو جائیں۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا تھا کہ اپنے مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کیا کرو۔ بس۔ اس کے علاوہ کسی بھی مقصد کے لئے قبروں پر حاضری کی تعلیم قرآن و حدیث میں نہیں ملتی۔ مگر تصوف کی نادر سائنس نے ایک پوری شریعت ایجاد کر لی ہے جس میں قبروں اور مُردوں سے بڑھ کر کوئی شے دلچسپی اور عقیدت کا مرکز ہے ہی نہیں۔ فلاں بزرگ کے مزار کی یہ برکات ہیں۔ فلاں بزرگ کی درگاہ میں دعا بہت جلد مقبول ہوتی ہے۔ فلاں بزرگ فوراً مرادیں بر لاتے ہیں۔ فلاں قبر شریف سے فیوض و برکات کی نہریں جاری ہیں۔ اس طرح کے خوشنما دعوے ہر طرف گونج رہے ہیں۔ عرسوں کی ریل پیل ہے۔ قوالیاں چل رہی ہیں۔ مزاروں پر دست بستہ عرض معروض ہو رہی ہے۔ سیکڑوں کتابیں لکھدی گئی ہیں جن میں مغالطہ دینے والا ظاہر فریب مواد خوب جمع کیا گیا ہے۔

شاید اسی لئے حرمین شریفین کی حکومت نے یہ شدّت اختیار کی کہ قبروں کو چوما چاٹا تو دُرّے لگیں گے۔ ٹھیک کیا اس نے۔ جو جائز چیز ناجائز اور حرام کا کھلا دروازہ بن گئی ہو اسے پابندیوں میں جکڑنا ہی اچھا۔ پچھلے بزرگ اور اولیاء اپنا اپنا وقت پورا کر کے دنیا سے جا چکے۔ ان کی عقیدت و محبت یہ ہے کہ ہم بھی ان کی طرح دین پر عمل کریں نہ یہ کہ اپنے دل سے ان کیلئے طرح طرح کی مافوق الفطرت کرامتیں اور صلاحیتیں گھڑیں۔ انکی روحیں دنیا میں نہیں بھٹک رہی ہیں۔ وہ تو نہ جانے کہاں آرام و راحت کے بستر پر محوِ استراحت ہوں گی۔ شاعرانہ تخیلات اور وہم پرستانہ تصورات کے ذریعہ ان کی روحوں سے رابطہ قائم کرنا اور مدد چاہنا اور مرادیں مانگنا اسلام نہیں اسلام سے دُوری ہے۔ اس معاملے میں کسی بھی انسان کا کہا نہ ماننا چاہیئے خواہ اس کا کرتہ ٹخنوں تک ہو اور عمامے کے پیچ پورا گنبد بنا رہے ہوں۔ کتنے ہی عابد زاہد لوگ ایسے گذرے ہیں اور آج بھی ہیں جنھوں نے کم علمی یا کم عقلی کی رو میں بہت غلط عقیدے پھیلائے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ عورتیں کجا اب تو مَردوں تک کا قبروں پر حاضری دینا دین و ایمان کے لئے خطرہ بن گیا ہے۔

(۳) آمین آہستہ یا زور سے کہنا اختلافی مسئلہ ہے۔ دونوں فریق حق پر ہیں۔ احناف کو چاہیئے اپنے مسلک پر عمل کرتے رہیں اور زور سے کہنے والوں کو گمراہ تصور نہ کریں

اور شوافع وغیرہ کو چاہئیے کہ اپنے مسلک پر عمل کرتے رہیں اور آہستہ سے کہنے والوں کو کاٹنے نہ دوڑیں۔ بس اس کے سوا کوئی راہِ عافیت نہیں۔

(۴) حاضر و ناظر فقط اللہ ہے۔ بزرگانِ دین کی روحیں غالباً تو نہیں ہیں کہ دنیا کے خاکدان میں چکراتی اور منڈلاتی پھریں۔ جن لوگوں نے بھی مسلمانوں کو روحوں کے چکر میں پھنسایا ہے انھوں نے دراصل ایک ایسی بھول بھلیاں میں پھنسا دیا ہے کہ اس سے نکلنا ہی مشکل۔ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور اس عقیدے کے ثبوت میں انھوں نے کتابوں کا اتنا بڑا ڈھیر لگا دیا ہے کہ ہماری "روحانی" کتابوں کا ڈھیر اس سے آدھا تہائی بھی نہ ہوگا مگر دونوں کا علم کلام اور طریق استدلال بہت مشابہ ہے۔ مفروضات ہی مفروضات کا ڈھیر۔ پیاز جیسا کہ چھلکے پر چھلکا اُتارے جائیے مغز ندارد۔ جن مسلمانوں کو عجوبہ پرستی کا شوق ہے وہ تو اپنا شوق پورا کئے جائیں مگر جنھیں دین و ایمان عزیز ہے اور چاہتے ہیں کہ آخرت خطرے میں نہ پڑے ان کے لئے عافیت اور سلامتی کا واحد راستہ یہ ہے کہ صرف ان عقائد پر جمیں جو قرآن سے یا مضبوط ترین حدیثوں سے صاف صاف ثابت ہوں۔ کسی کتاب میں اگر انھیں روحوں وغیرہ کے چکر سے متعلق کچھ حدیثوں کے حوالے یا بزرگوں کے اقوال نظر آئیں تو ان پر بھی آنکھیں بند کرکے بھروسہ ہرگز مت کریں۔ بے شمار حدیثیں اور اقوال پچھلے زمانوں میں گڑھے گئے ہیں۔ ان میں سے کتنے ہی کتبِ قدیمہ میں درج بھی ہو گئے ہیں۔ ان کا فقط درج ہوجانا ان کے صحیح ہونے کا ثبوت نہیں۔ تصدیق کے لئے کسی مستند عالم کا دروازہ کھٹکھٹائیے اور مستند عالم اسی کو سمجھئے جو خدا کی کتاب اور پیارے پیغمبرؐ کے مسلّمہ ارشادات کو ہر دوسری چیز پر فوقیت دیتا ہو۔ دین کا علم ان دو سرچشموں کے سوا کہیں نہیں ہے۔ تمام بزرگ، اولیاء، اقطاب اور شیوخ اللہ اور رسولؐ ہی کے غلام ہیں۔

یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ یا عبد القادر شیئاً للہ جیسے نعرے اور وظیفے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کسی بھی مذہب میں جائز نہیں ہیں۔ یہ فقط تصوف کا ذاتی مذہب ہے جس کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔

جامی نشانِ منزلِ مقصود می دہد
اے سالکانِ راہِ طلب این تہ ہمین

یا رسول اللہؐ کا نعرہ

سوال:۔ از:۔ ماسٹر یم۔ م۔ شیخ۔

دسمبر ۶۳ء کے ماہنامہ تجلی میں مولانا حقانی صاحب کی کتاب "شریعت یا جہالت" پر تبصرہ بغور پڑھا۔ بار بار پڑھنے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ آپ نے جو کچھ بھی اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے صحیح ہے۔

مگر ساتھ ہی اس کے میں مندرجہ ذیل دو باتوں پر واضح طور پر معلومات چاہتا ہوں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ ان باتوں کا واضح جواب دینے میں کوئی پس وپیش نہ کریں گے اور نیاز آگیں کو زیادہ دیر انتظار کرنے کا موقع نہیں دیں گے۔

سوال نمبر (۱) یہ ٹھیک ہے کہ یا رسول اللہ کہنے والے غلطی پر ہیں کیونکہ "یا" صرف حاضر و ناظر کے لئے ہی آتا ہے اور حاضر و ناظر صرف خدا ہی ہے مگر متعدد کتابوں میں "رسول اللہ" کو "حیاۃ النبیؐ" کہا گیا ہے۔ یہ لفظ کہاں تک صحیح ہے۔ اگر "حیات النبیؐ" صحیح ہے تو پھر "یا رسول اللہؐ" کہنا میرے خیال میں درست ہوگا۔ اور اگر "یا رسول اللہؐ" کہنا درست نہیں تو پھر "حیاۃ النبیؐ" بالکل غلط ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

سوال نمبر (۲) قرآن شریف میں متعدد جگہ رسول اللہؐ کو "یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ" "یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ" وغیرہ وغیرہ کہا گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ آیات، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہیں اور آں حضرتؐ بھی اُس وقت دنیا میں موجود تھے اس لئے اللہ تعالیٰ

نے اُن سے حاضر و ناظر ہی گفتگو کی ہے مگر بقول آپ کے
آج رسول اللہ ﷺ دنیا میں موجود نہیں تو نعوذ باللہ قرآن
پڑھنے پر ہمیں بھی "یَاَیُّھَا النَّبِی اور یَاَیُّھَا المُزَّمِّل"
وغیرہ کی بجائے اور کچھ پڑھنا چاہیئے؟

جواب:-

"حیات النبی ﷺ" ایک علمی مسئلہ ہے۔ یہ بات تو قابلِ
اعتماد حدیثوں سے ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے
اجسامِ مبارکہ کو مٹی نہیں کھاتی۔ لیکن ان مدفون جسموں کو
کسی طرح کی زندگی بھی میسر ہو یہ ثابت نہیں ہے۔ البتہ
صرف سید الابرار خاتم الانبیاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کے بارے میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے معلوم
ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے جسم مبارک کو ایک طرح کی زندگی بھی
میسر ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ مندرجہ ذیل تفصیلات کو
ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیئے:-

ایک یہ کہ حدیثوں ہی میں بہت سے ایسے بھی دلائل
موجود ہیں جن کی بنا پر بعض اہلِ علم "حیات النبی ﷺ" سے انکار
کرتے ہیں اور جن حدیثوں سے "حیات النبی ﷺ" ثابت کیجاتی
ہے ان کے کچھ اور معنی لیتے ہیں۔ اس طرح یہ مسئلہ ایسا مسئلہ
نہیں رہا ہے جس پر تمام امت کا اتفاق ہو۔

دوسرے یہ کہ حیات النبی کو ثابت کرنے والی
روایات کا علمی و فنی درجہ بس اتنا ہی ہے کہ ان سے ایک
گمانِ غالب حاصل ہوتا ہے جسے ظن کہتے ہیں یقینِ کامل
حاصل نہیں ہوتا۔ ایسی روایات پر بھروسہ تو کیا جائے گا
مگر اسی حد تک کہ وہ کسی یقینی عقیدے کے خلاف نہ پڑتی
ہوں۔

تیسرے یہ کہ جس قسم کی حدیثیں یقین کا فائدہ دیتی ہیں
ان سے اور قرآن سے جو عقیدہ اور نظریہ صاف طور پر
ثابت ہو رہا ہو اس کے خلاف نہ تو کوئی روایت قبول
ہو گی نہ عقلی دلیل۔

ان تینوں باتوں کو کئی بار پڑھ کر اچھی طرح ذہن میں
بٹھا لیجئے اور پھر ہماری معروضات سنئے:-

قرآن کی بہت سی آیات سے بالکل واضح اور قطعی طور
پر مندرجہ ذیل امور ثابت ہیں:-

ایک یہ کہ صرف خدا ہی وہ ہستی ہے جو ہر وقت ہر جگہ
موجود ہے اور نہ صرف پکار کو سنتا ہے بلکہ دل ہی دل میں
مانگی جانے والی دعاؤں کو بھی سنتا ہے اور قلب و ذہن کی
ہر ہر کیفیت سے باخبر ہے۔

دوسرے یہ کہ تمام انبیاء و اولیاء اس کے بندے ہیں اور
بشر ہیں۔ ان میں کوئی فوق البشر طاقت و صلاحیت نہیں۔
ان سے جن معجزات یا کرامات کا ظہور ہوتا ہے وہ اسی وقت
ہوتا ہے جب اللہ اسے مناسب سمجھے اور ارادہ فرمائے۔

تیسرے یہ کہ اللہ کے سوا کسی اور ہستی میں کوئی بھی ایسی
صلاحیت فرض کر لینا شرک ہے جو اللہ سے مخصوص ہو۔
اللہ اپنی ذات ہی میں یکتا نہیں صفات میں بھی یکتا ہے۔
ہر وقت ہر جگہ موجود ہونا اور ہر دعا، پکار، فریاد،
گذارش کو سُن کر اس کے بارے میں فیصلہ کرنا تنہا
اس کا کام ہے۔ یہ وصف کسی اور میں نہیں ہو سکتا اور
جو لوگ اس وصف کو کسی اور میں تسلیم کریں گے وہ مشرک
ہوں گے۔

یہ تینوں باتیں جب قطعی اور اٹل ہو گئیں تو اب کسی
بھی دلیل سے ان کے خلاف عقیدہ نہیں رکھا جا سکتا۔ ہر
استدلال رد کیا جا سکتا ہے مگر قرآن کو رد نہیں کیا جا سکتا

جب یہ آپ سمجھ گئے تو اب حیات النبی کے مسئلے پر
غور کیجئے۔ بعض روایات سے زیادہ سے زیادہ جو کچھ
ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی قبر شریف
میں ایک طرح کی زندگی حاصل ہے۔ یہ زندگی بعینہٖ دنیا والی
زندگی نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتی۔ آپ
کو معلوم ہو گا کہ قرآن میں شہداء کو بھی زندہ جاوید
کہا گیا ہے لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے شہید ہونے والے صحابہؓ
کا ترکہ ان کے وارثوں میں بٹوایا اور ان کی بیواؤں کی
شادیاں کرائیں۔ صاف ظاہر ہے کہ شہداء کو اگر ٹھیک

وہی زندگی حاصل ہوتی جسے دنیاوی زندگی کہا جاتا ہے تو نہ ترکہ بٹتا نہ ان کی بیویاں بیوہ کہلاتیں۔ لہذا ثابت ہو گیا کہ یہ زندگی کسی اور نوع کی ہے جس کی حقیقت کو ہم دنیاوی زندگی پر قیاس نہیں کر سکتے۔ اسی طرح حضور ؐ کو ان کی قبر میں زندہ مان لینے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دنیا والی زندگی سے متصف ہیں۔ یہ زندگی تو اسی دن ختم ہو گئی جب صحابہؓ نے آپ ؐ کو دفن کیا اور حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے فرمایا کہ ان محمدا قد مات (بے شک محمد ؐ موت کے آغوش میں چلے گئے) اب جو زندگی ہے وہ اور طرح کی ہے جس کی حقیقت کو پوری طرح سمجھنا ہم انسانوں کے لئے ممکن نہیں اور دنیا والی زندگی پر اسے قیاس کیا ہی نہیں جا سکتا۔

یہ تو ہوئی مسئلے کی علمی نوعیت۔ اب ایک منٹ کو چلئے مان لیجئے کہ حضور ؐ کو وہی زندگی حاصل ہے جسے ہم سب "زندگی" کہتے ہیں۔ یعنی فرض کر لیجئے کہ حضور ؐ اسی طرح زندہ ہیں جیسے آپ اور ہم فی الحال زندہ ہیں۔ تو اس سے بھی حاضر و ناظر کا واہی اور مشرکانہ عقیدہ جواز نہیں پاتا نہ "یا رسول اللہ" کی گنجائش نکلتی ہے۔

موٹی سی بات ہے کہ آپ زندہ سلامت اپنے گھر بیٹھے ہیں۔ ہم بھی یہاں دیوبند میں زندہ ہیں۔ تو کیا ہم یہاں حلق پھاڑ کر آپ کو صدا دیں تو آپ سن لیں گے؟ ظاہر ہے نہیں سن سکیں گے حالاں کہ ہمارا آپ کا جسمانی فاصلہ سینکڑوں میل کے دائرے سے نہیں بڑھتا۔ پھر یہ کیسے تصور کر لیا کہ جو رسول ؐ ہم سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ہے وہ یہاں سے ہماری صدا سن لے گا۔

اس سے ثابت ہوا کہ "حیات النبی" کے عقیدے کو درست مان کر بھی اُن خرافات کا جواز پیدا نہیں ہوتا جو قبر پرستوں نے گھڑلی ہیں۔ رہی آپ کی وہ منطق جو آیاتِ قرآنیہ کے تعلق سے پیش فرمائی ہے تو اگرچہ یہ ان بچوں کی منطق ہے جن کے ابھی مونچھیں نہ نکلی ہوں مگر بدعتی حضرات اسی طرح کی منطق بازی سے سادہ دل عوام کو ورغلاتے ہیں اس لئے اس کا بھی جواب ہم دیئے دیتے ہیں۔

قرآن میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کا کلام ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں انبیاءؑ سے بھی خطاب ہے، صحابہؓ سے بھی۔ کہیں شیطان کو بھی مخاطب بنایا گیا ہے۔ کہیں اللہ ضمیر متکلم میں کلام کر رہا ہے۔ کہیں کسی پیغمبر کی گفتگو بیان کی گئی ہے۔ بندوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کلام کو ایک بھی حرف بدلے بغیر پڑھا کریں۔ یاد رکھا کریں ہر مسلمان یہ بھی جانتا ہے کہ یہ کب نازل ہوا۔ لہذا کوئی غلط عقیدہ یا تصور اس کی تلاوت سے پیدا نہیں ہوتا حضور ؐ تو بہت بعد میں مبعوث ہوئے۔ حضرت عیسیٰؑ اور موسیٰؑ اور دیگر انبیاءؑ تو ان سے قبل گذر چکے۔ یہاں تک کہ حضرت آدمؑ سب سے مقدم ہیں۔ قرآن میں فقط یا ایہا المزمل ہی نہیں یا آدمؑ بھی ہے۔ یا عیسیٰ اور یا موسیٰ اور یا ابراھیم بھی ہے۔ اگر کسی مکار نے آپ کو یہ بہکا دیا ہے کہ یاایہا المزمل اور یاایہا المدثر اور یاایہا النبی کی تلاوت کے حکم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور ؐ زندہ اور حاضر و ناظر ہیں تو پھر یہ بھی ثابت ہو گا کہ سارے نبی، سارے صحابہ زندہ ہیں۔ بلکہ قرآن میں تو فرعون اور کفار سے بھی کتنی ہی جگہ خطاب ہے۔ انھیں بھی حاضر و ناظر ماننا ہو گا۔

کم عقلی کی کوئی حد ہونی چاہیے۔ حاضر و ناظر کی منطق تو کم عقلی کی حدوں سے گذر کر مالیخولیا کے دائرے میں جا چکی ہے۔ آپ خدا کے لئے واہیات لوگوں کی صحبت اور واہیات کتابوں کے مطالعے سے بچیں ورنہ سر میں جتنا مغز ہے کل سڑ جائے گا اور آپ کو پتا بھی نہ چلے گا کہ زہر یلا لٹریچر اور گندے دلائل آپ کے دین و ایمان کو کس طرح اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ رہے ہیں۔

خوب سمجھ لیجئے۔ کوئی پتھر پاس ہو تو اس پر کیل سے کندہ کر لیجئے کہ خدا کے سوا کوئی حاضر و ناظر نہیں اور یا رسول اللہ کا نعرہ اس عقیدے کے ساتھ لگانا کہ حضور

شمن رہے ہیں شرک کی بدترین قسم ہے۔

بدعات و توہمات

سوال: - از:- علی محمد کشمیر۔

کشمیر میں بعض مقامات پر درود بصیغۂ خطاب ہی پڑھتے ہیں۔ ہمارے گاؤں کی مسجد شریف میں درود کے ساتھ مانگا مانگی بہت ہوتی ہے۔ جب کوئی درود کے ساتھ مانگا مانگی پر اعتراض کرتا ہے تو کچھ حضرات بغیر کسی علمی دلیل کے جواب دیتے ہیں کہ جائز ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر اوراد اور درود ختم کر کے دل کھول کر مسجد میں غیر اللہ سے دعا مانگی جاتی ہے۔ تو یہ لوگ حضرت پیر رحمۃ اللہ علیہ کا فرمودہ پیش کرتے ہیں "بلاد اللہ ملکی تحت حکمی۔ ووقتی قبل قلبی قد صفالی" (ترجمہ) اللہ کے سارے شہر اور ملک میرے حکم کے تحت ہیں۔ اس سے پہلے میرا دل زاہد اور نور کا مشعلہ تھا۔ (قصیدہ غوثیہ)

اسی طرح شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کبریت شریف میں فرماتے ہیں کہ حضورؐ خدا کے قریب اتنے ہوئے کہ دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا۔ کسی نا معلوم لغت میں "تخت گاہ کو قاب قوسین" کہا گیا ہے۔ یہ بھی مان لیں کہ حضورؐ خدا سے ابرو کے برابر نزدیک پہونچ گئے مگر تخت گاہ سمجھ میں نہ آیا۔ ہمارا ایمان خدا اور اس کے رسولؐ پر ہے۔ لہذا اُن ہی کی طرف رُخ کر کے قرآن اور حدیث کے مطابق جواب چاہتے ہیں۔

جواب: -

درود بصیغۂ خطاب پر ہم بارہا لکھ چکے۔ جو رسمیں چل نکلتی ہیں۔ خواہ وہ عبادات کے شعبے کی ہوں یا سماجیات کے دائرے کی وہ دلیل کی مار سے بہ آسانی ختم نہیں ہوتیں کیونکہ وہ دلیل سے بے نیاز محض رسم وعادت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا رواج ایک طویل مدت کا رہینِ منت ہوتا ہے لہذا طویل مدت تک ہی ان کے خلاف آواز اٹھائی جاتی رہے تو شاید وہ رفتہ رفتہ ختم ہو سکیں۔

رہا وہ شعر جو آپ نے نقل کیا تو در اصل اس طرح کی بہت چیزیں یار لوگوں نے گھڑ گھڑ کر حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کر دی ہیں اور نسلاً بعد نسلٍ وہ منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ اب بے چارے کم علم اور سادہ لوح مسلمان کیسے اس فریب کو سمجھیں۔ خصوصاً جب احمق قسم کے صوفیاء اور بے مغز قسم کے واعظوں اور مولویوں نے بھی ایسی لغویات کی ہمت افزائی متعدد وجوہ سے کی تو عوام کیسے بہ آسانی ان کے چکر سے نکل سکتے تھے۔

متعدد وجوہ کی تفصیل یہ ہے کہ کہیں تو دنیا کمانا اس کا مقصود ہوتا ہے۔ سادہ لوح ایسی باتوں سے خوب بیوقوف بنتے ہیں اور واعظ یا مولوی یا پیر صاحب کے معتقد ہو کر نذرانہ نفصلانہ گذرانتے ہیں اور کہیں ازراہِ کم عقلی یہ واعظ و مولوی حضرات خود ہی ان واہی چیزوں کو درست سمجھتے ہوئے بڑے اخلاص سے عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔

اگر کسی شخص کو اصرار ہی ہو کہ واقعی حضرت شاہ صاحبؒ نے ایسا فرما دیا تھا تو اس سے پوچھئے کہ پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت نے پوری دنیا پر اسلام کا جھنڈا نہ لہرا دیا اور کافر حکومتیں کیوں موج اڑاتی رہیں۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جب جب جہاں جہاں دینِ خداوندی کو غالب کرنے کا موقعہ ملتا رہا انھوں نے اس سے غفلت نہیں برتی۔ ویسے بھی عام عقل کی بات ہے کہ زید کو جتنے حصۂ زمین پر بھی پوری قدرت حاصل ہو گی وہاں وہ وہی نظام قائم کرے گا جو اسے دل سے پسند ہے۔ شاہ صاحبؒ کو اگر واقعی سارے ممالک پر حکمرانی کا منصب حاصل تھا تو پھر یا تو یوں مانئے کہ وہ دل سے اسلام کے شیدائی نہیں تھے بلکہ خدا نخواستہ کفر کا غلبہ انھیں محبوب تھا اسی لئے انھوں نے کافر سلطنتوں کو نہیں مٹایا یا پھر یوں مانئے کہ ان کے قول کا کچھ اور ہی مطلب ہے۔ ہمیں تو قرآن و حدیث میں کہیں یہ نہ بتایا گیا کہ اللہ کے سوا بھی کسی ہستی کو پوری دنیا پر حقِ حکمرانی حاصل ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ

ب بھی ہمارے نزدیک گمراہی میں مبتلا ہیں جو حضور صلی اللہ
لیہ وسلم کے بارے میں یہ عقیدہ رکھیں کہ انھیں پورے عالم
رِ غلبہ واقتدار حاصل ہے۔ مالک الملک تنہا خدا کی ذات
ہے۔ وہ کائنات میں اپنے تمام احکام فرشتوں کے ذریعہ
افذ کرتا رہتا ہے اور اولیاء تو اولیاء انبیاء تک اسکے
نظ بندے ہیں۔ بے اختیار۔ بے قدرت۔ سراسر اسکے
ناج۔

اور یہ جو مرنے کے بعد بزرگوں کے تصرفات اور کرامات
غیرہ کے عقیدے رائج ہوگئے ہیں یہ اُس عجمی تصوف کے
رگ وبار ہیں جس نے اسلام کا حلیہ خراب کر کے رکھدیا ہے۔

"تخت گاہ" آپ کی سمجھ میں نہیں آیا مگر کیا یہ سمجھ
ں آگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے اس قدر
ریب پہنچ گئے ہوں کہ دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا ہو!

سورۂ نجم میں دنیٰ فتدلیٰ قاب قوسین او ادنیٰ
ے الفاظ آئے ہیں۔ ان پر گفتگو کرتے ہوئے ہم شرح وبسط
سے ثابت کر چکے ہیں کہ یہ حضورؐ کا اور اللہ کا فاصلہ بیان
ہیں ہو رہا ہے بلکہ حضورؐ کا اور جبریلؑ کا فاصلہ بیان ہو رہا
ہے۔ مگر اس زبردستی کو کیا کیجئے کہ کچھ حضرات نے پہلے بھی
یت کا غلط مطلب نکالا اور کچھ لوگ آج بھی اس پر جمے
وئے ہیں۔ حالانکہ ذرا عقل سے سوچئے اللہ کے بارے میں
ام مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ لامحدود ہے۔ اس کا
سم نہیں ہے۔ وہ کوئی ایسا وجود نہیں جس کی طرف اشارہ
رکے یہ کہدیا جائے کہ اللہ وہ نظر آرہا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن
ہے کہ اس میں اور کسی اور وجود میں کمان دو کمان کا فاصلہ
صور کیا جاسکے۔ جب بھی آپ کسی بھی دو چیزوں کا فاصلہ
یان کریں گے اس کا لازمی مطلب ہوگا کہ ان دونوں میں
ر چیز ایک ایسا جسم رکھتی ہے جو محدود ہے۔ خدا جب محدود
ہی نہیں تو مذکورہ فاصلے کے کیا معنی۔ خدا تو کہتا ہے
میں بندے کی رگِ گلو سے بھی زیادہ اس کے قریب
ہوں۔ ایسی بے جسم وجہت بالاتر ہستی کے بارے میں یہ
صور کرنا کہ وہ فلاں جگہ تشریف فرما ہوگی اور کوئی انسان
اس سے کمان بھر کے فاصلے پر پہنچ جائے گا آخر کون سی
عقل اور منطق سے مطابقت رکھتا ہے۔

خدا نے حضرت موسیٰؑ پر اپنی تجلّی کا ایک پرتو ڈالا
تھا۔ اسی کو خدا کے دیدار سے تعبیر کرلیا جاتا ہے۔ اس
معنی میں اگر یوں کہا جائے کہ شبِ معراج میں حضورؐ اللہ
کی بعض مخصوص تجلیات سے بہت قریب ہوگئے تھے تو
اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن آیتِ قرآنیہ بہر حال اس سے
بھی غیر متعلق ہی ہے۔

خلاصۂ جواب یہ ہے کہ اگر آخرت کی فلاح درکار
ہو تو کسی ایسے عقیدے اور عمل سے واسطہ نہ رکھئے جو اللہ
اور رسولؐ کی مستند تعلیمات سے ثابت نہ ہو۔ درود شریف
حالانکہ بے حد مفید و متبرک چیز ہے کیونکہ قرآن وحدیث
سے اس کی افادیت وفضیلت ثابت ہے لیکن اسے بھی اسی
طریق اور اسی محل میں استعمال کرنا چاہئیے جس کا ثبوت
آثارِ صحابہ یا اقوالِ ائمہ سے ملتا ہو۔ مسجدوں میں بلند
آوازوں سے درود کے وظیفے اور دعاؤں کا شور بدعات
کے قبیل سے ہے جب کہ دعا خدا ہی سے مانگی جارہی
ہو۔ لیکن دعا کسی اور سے مانگی جائے تو یہ شرکِ مبین ہے
خدا کی پناہ۔

وہ جوابات
جن کے سوالات حذف کردیئے گئے

اُردو خطبۂ جمعہ

اس موضوع پر ہم بارہا لکھ چکے۔ ہماری سوچی سمجھی
قطعی رائے آج بھی یہی ہے کہ خطبۂ جمعہ صرف عربی میں
ہونا چاہئیے۔ عربی خطبے سے قبل یا بعد اگر مقامی زبان
میں خطبہ دینا ہے تو وقت ایسا رکھنا چاہئیے کہ نمازی اسے
سننے پر مجبور نہ ہوں۔ حاضرین جمعہ جب شروع کی سنتیں
پڑھ چکیں اس کے بعد اُردو خطبے کا مطلب یہ ہے کہ وہ

سماعت پر مجبور ہیں۔ ابھی جماعت تو ہوئی نہیں اس لئے جا نہیں سکتے۔ یہ ٹھیک نہیں۔

مقامی زبانوں میں خطبے کا جو مفاد ہے اسے سبھی سمجھتے ہیں۔ مگر نقصان کا پہلو یہ ہے کہ جتنا کچھ اللہ اور رسولؐ نے فرض و واجب قرار دیا ہے اس میں ایک اور واجب کا اضافہ ہو گیا۔ غیر عربی خطبہ جب ایسے وقت مقرر کیا گیا کہ نمازی اس کی سماعت پر لامحالہ مجبور رہوں تو یہ عملاً واجب ہی کے درجے میں آگیا۔ یہ نقصان بہت زیادہ ہے۔ عبادات کا دائرہ اللہ اور رسولؐ کے کھینچے ہوئے دائرے سے بڑھنا نہ چاہیئے۔

وعظ اچھی چیز ہے۔ نمازِ جمعہ کے بعد اعلان کیجئے کہ بھائیو سنتوں سے فارغ ہو لو پھر وعظ ہو گا۔ اب کوئی مجبور تو نہیں۔ جنھیں سننا ہو گا رک جائیں گے۔ بادلِ ناخواستہ سننے والوں سے کوئی اچھی توقع وابستہ کرے یہ نادانی کی بات ہے۔ اب جو رکے گا وہ وہی ہو گا جو خوشی اور رضا سے سنے گا۔ یہ اثر بھی قبول کر سکتا ہے۔

بدعتی یا فاسق کے پیچھے نماز

حضورؐ نے فرمایا ہے کہ نماز ہر نیک و بد کے پیچھے ہو جاتی ہے لہذا کوئی شخص امام کے کردار و عقائد کا حال جانے بغیر اس کے پیچھے نماز پڑھ لیتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے۔ یا مثلاً مسجد میں کوئی متقی آدمی نماز پڑھانے والا نہ ہو۔ ہاں بدعتی یا فاسق موجود ہو تو بمجبوری اس کے پیچھے بھی نماز ہو جائے گی۔

البتہ جو لوگ جانے پہچانے بدعتی یا فاسق ہوں انھیں امام بنانا چونکہ ایک طرح پر فسق و بدعت کی حوصلہ افزائی اور تکریم ہے اس لئے ان کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے اگر کوئی غیر فاسق یا غیر بدعتی نماز پڑھانے کا اہل حاضر مسجد ہو۔

لڑکیوں کی تعلیم

اسلام کا اصولِ معاشرہ یہ ہے کہ مرد روزی کمائیں اور عورتیں گھر سنبھالیں۔ احکامِ شریعت کی پابندی دونوں پر فرض ہے لہذا عورتوں کے لئے دو طرح کی تعلیم ضروری ہوئی۔ ایک وہ جس سے انھیں شریعت کا ضروری علم ہو۔ دوسرے وہ جس سے وہ گھر داری کو سلیقے سے چلا سکیں۔ بس۔ اس دونوں طرح کی تعلیم کو عورتوں کے لئے ضروری تو قرار دیا گیا لیکن یہ بھی شرط رکھدی گئی کہ وہ اسلامی معیارِ حیا اور معیارِ اخلاق کے دائرے میں رہ کر ہی کچھ کر سکتی ہیں۔ اس سے باہر نہیں۔

اب یہ جو آج کل کالج اسکولوں میں مردوں کیساتھ عورتوں کو پڑھایا جارہا ہے اس کا تو کوئی جواز اسلام میں ہے ہی نہیں۔ نہ اس کا جواز ہے کہ وہ ایسے اداروں میں ملازمت کریں جہاں ان کا واسطہ مردوں سے پڑتا ہو یا جہاں وہ اسلامی پردے کو نہ نبھا سکیں۔

زمانے کے تقاضوں کی جو بات بہت سے حضرات کہتے ہیں ان سے گذارش ہے کہ فتویٰ بھی پھر آپ زمانے ہی سے لیجئے مولویوں اور مفتیوں کو خواہ مخواہ کیوں زحمت دیتے ہیں۔ اسلام کا اپنا ایک مزاج اور معیار اور تصورِ حیات اور نظامِ معاشرت ہے۔ وہ بہرحال زمانے کے غلط رجحانات کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے گا۔

داڑھی کی بحث

جس مولوی نے یہ کہا ہے کہ حضورؐ نے کبھی اپنی داڑھی کا کچھ بھی حصہ نہیں کاٹا وہ جاہل ہے۔ حضورؐ نے داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے مگر یہ بھی ہدایت کی ہے کہ داڑھی کی مناسب اصلاح کرتے رہو۔ یہ نہ ہو کہ وحشت زدوں کی سی صورت بنائے رہو۔ ایک مٹھی داڑھی بالکل کافی ہے۔ اس سے زیادہ ہو تو شوق سے کٹوا دیجئے۔

مولویوں کی بدعملی

اگر بعض مولوی اپنی اولاد کو غلط تعلیم دیتے ہیں اور غیر اسلامی لباس پہناتے ہیں تو بتائیے ہمارے پاس کونسا

...دا ہے جس کے زور سے انھیں ٹھیک کر دیں۔ آخرت میں
...غلط کار مولویوں کو بڑے سخت حساب کتاب سے گذرنا
...گا۔

آپ اگر ان کی دیکھا دیکھی یہی سب کریں گے تو آپ بھی
...اسے نہ بچ سکیں گے۔ خیریت اسی میں ہے کہ برائی میں
...ں کی پیروی نہ کریں۔

...کخانے کے فارموں کی خرید فروخت

ڈاکخانے سے منی آرڈر اور وی پی فارم پہلے مفت ملا
...تے تھے لیکن اکھٹے ہزار پانسو لینے پر ان کی ایک قیمت
...ر تھی۔ جس کا جی چاہے پیسے دے اور بہ آسانی لے آئے۔

اب دوسری بہت سی چیزوں کی طرح ان کی بھی یا تو
...ہے یا خرابیِ انتظام کے باعث یہ بر وقت اور بہ آسانی
...یں مل پاتے لہذا نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ ضرورتمند حضرات
...ضابطہ طور پر انھیں حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ
...بے ضابطگی کسی نہ کسی درجے میں کہیں نہ کہیں وقوع پذیر
...رہی ہے۔

ایسے بے ضابطہ طریقے پر زید یا بکر فارم خریدتا ہے۔ با
...ضابطہ نہیں بلکہ ذاتی رسوخ و تعلق کی بنا پر اسے ضابطے
...صحیح قیمت پر فارم مل جاتے ہیں اور وہ انکی تجارت
...تا ہے۔ مثلاً جو فارم اسے پانچ پیسے کا پڑا ہے اسے دس
...ندرہ پیسے میں بیچتا ہے تو یہ تجارت ایک پہلو سے حلال
...ایک پہلو سے حرام ہے۔ حلال تو اس لئے کہ جو چیز
...رے ضرورت مندوں کو حسب ضرورت ٹھیک قیمت
...پر نہیں آ رہی تھی اس خرید و فروخت کے واسطے سے
...آ گئی اور زید نے ایک خریدکردہ چیز کو کچھ نفع لیکر فروخت
...۔ یہی تجارت ہے اور تجارتی نفع حلال ہوا کرتا ہے۔

اور حرام اس لئے کہ اس کاروبار میں قانون شکنی اور
...بنی بے ضابطگی اور حکومت سے چوری کا عنصر بھی شامل ہے
...قانون شکنی کو اس وقت تک جائز نہیں سمجھتے جب تک
...دن ہمارے کسی دینی مقصد یا جائز حق کی راہ نہ روکے۔

فارموں کا ذخیرہ یا تو کچھ رشوت دے کر حاصل ہو سکتا
ہے یا تعلقات سے ناجائز فائدہ اٹھاکر۔ ناجائز فائدہ
اس معنی میں کہ یہ فارم حکومت تجارتی مقاصد سے نہیں
چھاپتی اور ان کی قیمت بھی لاگت سے زیادہ نہیں رکھتی
لہذا انھیں محکمہ کے کسی فرد سے تجارتی مقاصد کے لئے
تجارتی سطح پر حاصل کرنا قانون سے فریب اور بددیانتی
کہلائے گا۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ اس طرح کی تجارت کسی دیندار
وصالح مسلمان کے لئے مناسب نہیں اور نیت اگر یہی ہے
کہ حاصل شدہ نفع کو تعمیر مسجد یا امام ومؤذن کے وظیفے پر
خرچ کر دے گا تو یہ اور بھی برا ہے۔ مسجد میں تو خاص طور
پر ایسا پیسہ لگانا چاہیئے جس کی حلّت ذرا بھی مشتبہ نہ ہو۔
اور امام ومؤذن چونکہ مسجد ہی کے خادم ہیں اس لئے انھیں
بھی گندہ یا مشکوک پیسہ نہیں دینا چاہیئے۔ لوگوں کا عجب
حال ہے کہ جس آمدنی کو وہ خود بھی اشتباہ سے خالی نہیں
سمجھتے اس کے لئے خرچ کی وہ یہ صورت نکالتے ہیں کہ تعمیر مسجد
یا امام ومؤذن کی تنخواہ میں خرچ کر دو۔ گویا نجس یا مشتبہ پیسے
کے لئے سب سے زیادہ موزوں انھیں اللہ کا گھر یا اس گھر کے
خادم ہی نظر آئے۔ استغفراللہ۔

ذبیحہ کا ایک مسئلہ

گوشت سپلائی کرنے کا کنٹریکٹ خواہ حکومت سے
ہو یا کسی نجی ادارے سے۔ اگر کنٹریکٹر مسلمان ہے تو اسے لازماً
یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ذبح کرنے والا بسم اللہ کہکر ذبح کرے
سائل کا یہ کہنا کہ روزانہ ہزاروں بکرے ذبح کرنے پڑتے ہیں
اس لئے بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر ذبح کرنا شدید دشوار ہے
عجیب بات ہے۔ اگر ان کلمات کو زبان سے ادا کرنا کوئی
ایسا کام ہوتا جس کے لئے ذبح کرنے والوں کو الگ سے وقت
دینا پڑتا تب تو یہ عذر قابلِ فہم ہو سکتا تھا کہ سارا وقت
تو ذبح کرنے میں گذر جاتا ہے مزید وقت بسم اللہ پڑھنے
کے لئے کہاں سے لائیں۔ لیکن یہ کلمات تو چھری چلاتے

ہوئے ادا کئے جاتے ہیں اور ان پر کوئی فاضل وقت اسی طرح خرچ نہیں ہوتا جس طرح ذبح کرتے ہوئے سانس لیتے رہنے میں کوئی فاضل وقت خرچ نہیں ہوتا۔ ذبح ہاتھ کا عمل ہے اور الفاظ زبان کا۔ کیا ایک ہی وقت میں یہ دونوں اعضاء کام نہیں کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی کسی بات کو اہم ہی نہ سمجھے تو وہ دس حیلے بہانے تراش سکتا ہے۔ بسم اللہ وغیرہ کی کوئی اہمیت تو دل میں رہی نہیں پھر اس کا التزام دشوار کیسے نہ معلوم ہو۔ افسوس ہے کہ مسلمان خدا سے کتنی دور جا پہنچا ہے اور آخرت کی بھلائی کے لئے اسے زبان ہلانا بھی پہاڑ محسوس ہونے لگا ہے۔

یہ گفتگو حلال طریقِ ذبح کے تعلق سے تھی۔ اصولی حکمِ شرعی تو یہ ہے کہ ایک مسلمان اگر ذبح کرتے وقت زبان سے بسم اللہ اللہ اکبر پڑھنا بھول جائے تب بھی ذبیحہ حلال ہوگا کیونکہ اس کے مسلمان ہونے کی بنا پر فرض کر لیا جائیگا کہ اس نے خدا کے سوا کسی نام پر یہ فعل انجام نہیں دیا ہے نیز "اللہ اکبر" کا اضافہ بھی ضروری نہیں۔ صرف لفظ "بسم اللہ" کافی قرار پاسکتا ہے۔ مگر یاد رکھئے۔ بھول جانا اور بات ہے لیکن جان بوجھ کر بسم اللہ ترک کرنا اور اس کے تلفظ کو ایک مصیبت سمجھ لینا بالکل دوسری بات ہے۔ یہ دوسری بات بہت سخت ہے اور آخرت میں اس پر شدید پکڑ ہو سکتی ہے۔

غیر جائز طریقِ ذبح کا معاملہ یہ ہے کہ جب کنٹریکٹ ملٹری سے ہے اور یہ معلوم ہے کہ وہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں یہ گوشت استعمال کریں گے تو مسلمان کنٹریکٹر کے لئے جائز نہیں کہ وہ مرغوں اور بکروں کی گردنیں اڑاتا رہے۔ یہ طریق ذبح غیر جائز ہے اور یہ کنٹریکٹر گویا جان بوجھ کر بعض مسلمانوں کو حرام گوشت کھلا رہا ہے۔

اگر حکومت کی طرف سے ایسی کوئی ہدایت نہیں کہ کس طرح ذبح کرو تب تو غیر جائز طریقے پر ذبح کرنا کنٹریکٹر کا ایسا گناہ ہوا جسے وہ اپنی مرضی سے اختیار کئے ہوئے ہے

لیکن اگر حکومت کی طرف سے ایسی کوئی پابندی عائد کی جائے کہ جانوروں کی گردنیں اڑائی ہوں گی تو ایک مسلمان کے لئے یہ کنٹریکٹ ہی سرے سے غیر جائز ہے۔ ہاں اگر معاملہ ملٹری کا نہ ہوتا جس میں مسلمان بھی ہیں بلکہ سارا گوشت غیر مسلموں ہی کے استعمال میں آتا تب اس میں کوئی حرج نہ تھا کہ جانوروں کی گردنیں کاٹی جائیں یا بجلی کے جھٹکے دیئے جائیں۔

تلک یعنی جہیز کی رسم

اللہ کا شکر ہے کہ تلک کی وبا ابھی ہمارے آس پاس کے اضلاع میں نہیں پہنچی۔ اس وبا کے خلاف علمائے اسلام اور دردمند عوام اور مسلم و غیر مسلم ہر طرح کے شہری جہاں بھی کوئی اجتماع، جلسہ، میٹنگ، سیمینار منعقد کریں مبارک ہی مبارک ہے۔ لعنت ہے اس مرد پر، اس کے سرپرستوں پر اور اس کے تمام ہم خیالوں پر جو لڑکی والوں سے جہیز یا تلک یا جوڑا گھوڑا یا کسی بھی عنوان کی آڑ میں نقد یا ساز و سامان طلب کرتا ہے۔ ایسے تمام لوگ شریعتِ اسلامیہ کے باغی، ملتِ اسلامیہ کے دشمن اور قابلِ صد ہزار ملامت ہیں۔ انکا سماجی بائیکاٹ کیا جائے اور دیہاتی محاورے میں حقہ پانی بند کر دیا جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ بہت بڑے اجرِ آخرت کے مستحق ہوں گے وہ لوگ جو اس ملعون و مردود رسم کی بیخ کنی میں اپنی توانائی صرف کریں گے۔

ویسے دوسری بہت سی فضول رسمیں بھی شادی بیاہ کا جزو بنا لی گئی ہیں۔ ان سب کو رفتہ رفتہ ختم کرنا چاہیئے۔ باجا گاجا اور رنڈی کی سجاوٹ تو خیر حرام ہیں ہی بہت سی وہ جزئیات بھی حرام ہیں جو فی ذاتہ جائز کہی جاسکتی ہیں۔ مثلاً بہت لمبی چوڑی اور مکلّف دعوتیں۔ ان میں فی نفسہٖ کوئی حرمت نہیں۔ آپ کسی خاص خوشی کے موقعہ پر شوق سے اپنے ارمان پورے کر سکتے ہیں لیکن شادی بیاہ، ختنہ اور ولادت وغیرہ ایسی خوشیاں ہیں جو خاص نہیں عام ہیں۔ ان میں جو روش اختیار کی جاتی ہے وہ بہت جلد سماج میں ذلت و عزت کا معیار بن جاتی ہے لہٰذا غریب

لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی عزت کی خاطر قرض لیں اور مروجہ معیار پر ضیافتیں کریں۔ یہ بڑا فتنہ ہے اور فتنے کو اللہ نے قتل سے بھی زیادہ قبیح قرار دیا ہے۔ سادگی، توسط و اعتدال، نمود و نمائش سے پرہیز اور ایسے شور و شغب سے اجتناب جو ہمسایوں کی نیندیں خراب کرے۔ یہ ہیں اسلامی ہدایات کے پاکیزہ مظاہر۔ لوگ شادیوں میں لاؤڈ اسپیکر لگا لگا کر ریکارڈ بجاتے ہیں۔ فلمی ریکارڈ بجانا بجائے خود تو گناہ ہے ہی مگر مزید قباحت کا اضافہ یہ پہلو کر دیتا ہے کہ محلہ بھر گونج رہا ہے۔ دماغی کام کرنے والے پریشان ہیں۔ نیندیں اچٹ گئی ہیں۔ کان کے پردے پناہ مانگ رہے ہیں۔ لعنت ہے وہ جشن مسرت جو پڑوسیوں کو خوشی دینے کے بجائے عذاب و کلفت دے۔

اس سے زیادہ ہم کیا کہیں۔ اصلاح کا کام کرنے والوں پر اللہ سلامتی اور استقامت نازل فرمائے۔

عورتوں کی ملازمت اور تعلیم وغیرہ

عورتوں کے لئے دو طرح کی تعلیم ضروری ہے۔ ایک وہ جس سے انھیں اپنے مذہبی و اخلاقی فرائض سے آگاہی ہو دوسری وہ جس سے امورِ خانہ داری کے بہتر نظم و انتظام کا درس ملے۔ یہ دونوں طرح کی تعلیمیں انھیں گھر میں مل سکتی ہیں اگر والدین سلیقہ مند اور ذی فہم ہوں۔

رہی وہ تعلیم جسے آج کل "تعلیم" کہا جاتا ہے یعنی اسکولوں کالجوں کی سندیں حاصل کرنا، ڈاکٹری یا اور کوئی پیشہ سیکھنا یا سینے پرونے کاڑھنے کی ٹریننگ وغیرہ۔ تو یہ سب زوائد میں ہیں۔ ان کے سلسلہ میں اسلام کا بنیادی نقطۂ نظر سمجھ لینا چاہئے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کے ذمہ روزی کمانا اور گھر سے باہر کی سرگرمیوں میں حصہ لینا نہیں ہے۔ یہ ذمہ داریاں مرد کی ہیں۔ عورت گھر سنبھالنے، بچوں کی پرورش کرنے اور بیوی کی حیثیت سے جو گھریلو فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں انھیں ادا کرنے کے لئے مامور ہے۔ نیز عفت و عصمت کے سلسلہ میں اسلام کا اپنا ایک معیار ہے جو کبھی بدلا نہیں جا سکتا۔ زمانے کے عام تقاضوں اور رواجوں کے تحت اگر عورت کو اسکول کالج کی تعلیم دلانا بھی ضروری خیال کیا جائے تو بہر حال اسلامی معیارِ عفت و عصمت کو لازماً ملحوظ رکھنا ہوگا۔ جہاں تک ہمارا مطالعہ ہے آج کے وہ گنے چنے اسکول کالج بھی جو صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہیں ایسی فضا اور ماحول سے محروم ہیں جس میں یہ امید کی جا سکے کہ اسلامی معیار کا تحفظ ہو سکے گا۔ پھر ان اسکول کالجوں کے بارے میں تو کچھ کہنا ہی نہیں جہاں مرد و زن کی مخلوط تعلیم رائج ہے۔ وہ تو سمجھئے کہ اسلامی معیارِ حیا اور معیارِ عصمت کی قتل گاہیں ہیں۔

ڈاکٹری، دایہ گیری، نرسنگ، نوکری ان سب چیزوں کا شرعی حکم اسی بنیادی سوال سے بندھا ہوا ہے کہ آیا ایسا ماحول موجود ہے جس میں عورتیں یہ خدمات اسلامی معیارِ عصمت کا تحفظ کرتے ہوئے ادا کر سکیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو پھر یہ سب چیزیں ممنوع و مکروہ۔ اور اگر ہے تو ان میں فی ذاتہ کوئی حرمت نہیں۔

عورت کی کمائی مختلف نوعیتوں کی ہو سکتی ہے مثلاً ایسے گھریلو کام جو اسلامی پردے کے ساتھ انجام پا سکتے ہیں۔ اجرت پر سلائی کرنا۔ کاڑھنا۔ بچوں کو پڑھانا۔ اور کوئی محنت کرنا۔ عورتیں اگر اپنے شوہر کی غربت کی بنا پر اس طرح کے کام کریں تو یہ بالکل حلال ہیں اور ان سے کمائی ہوئی روزی حلال و طیّب روزی ہے۔

احباب کے تقاضے اور خواہشات

تجلی کے وسیع حلقے میں بہتیرے حضرات ہیں جو اپنی صواب دید کے مطابق یہ چاہتے ہیں کہ ایڈیٹر تجلی فلاں فلاں خدمت بھی انجام دے۔ مثلاً بعض کی خواہش ہے کہ عام فہم درسِ حدیث کا سلسلہ برابر قائم رکھا جائے۔ بعض چاہتے ہیں کہ ہلکے پھلکے اصلاحی مضامین ضرور آنے چاہئیں بعض کا خیال ہے کہ ایڈیٹر تجلی بحثیں بہت کرتا ہے اسے اپنے

قلم کو لگام دینی چاہیئے۔ از راہِ کرم یہ مخلصین بعض سائل
کا نام بھی لیتے ہیں جن کی روش انھیں مرغوب ہے۔ ایسے
تمام حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ کی خواہشات
کا قلبی احترام کرنے کے باوجود ہم معذور ہیں کہ انھیں پورا
نہ کر سکیں۔ دراصل ہمارے دوست یہ بنیادی نکتہ نظر انداز
کر رہے ہیں کہ ہر کارے ہر مردے۔ دنیا میں اللہ نے
جہاں چاند سورج، سمندر، پہاڑ، درخت، ہوا، بارش سب
کا وظیفۂ حیات جدا جدا رکھا وہیں انسانوں میں بھی سب
کے میدانِ کار اور فرائض الگ الگ ہی رکھے ہیں۔
صلاحیتوں کی تقسیم میں فرق کیا ہے۔ مزاج و مذاق رنگا
رنگ بنائے ہیں۔ ڈاکٹری کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ایک
شخص اگر انجنیری یا آرٹ میں ٹانگ اڑانے لگے تو وہ
نہ گھر کا رہے گا نہ گھاٹ کا۔ اسی طرح اگر نشتر سے ترکاری
کاٹنے کا کام لیا جائے تو اسے نشتر کا غلط استعمال
کہیں گے۔

ہم سے اللہ جو کام لے رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے
خودستائی یا تعلّی کی ادنیٰ آمیزش کے بغیر ہم عرض کریں گے
کہ ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک نظر ڈال کر
بتائیے کیا اور بھی کوئی دینی و علمی پرچہ ہے جو دین و ملت سے
تعلق رکھنے والے متعدد موضوعات پر نقد و نظر اور جرح
تعدیل کا وہ بے لاگ فریضہ انجام دے رہا ہو جو تجلی
دے رہا ہے۔ کیا فتنوں کے آگے سینہ سپر ہونا اور باطل
فاسد افکار کے سیلاب پر بند باندھنے کی کوشش کرنا کوئی
آسان اور بے قیمت عمل ہے؟ جو ہلکی پھلکی چیزیں آپ
چاہتے ہیں وہ تو اور دس جگہ آپ کو مل جائیں گی۔ مگر تجلی
اللہ کے فضل و کرم سے جو کچھ ہدیۂ خدمت کر رہا ہے وہ
اور کہیں نہ ملے گا یا ملے گا تو بہت کم اور تشنہ۔ اگر اپنے
کام کی معنوی قدر و قیمت اور منفعت اور اثر پذیری کا
ہمیں احساس و شعور نہ ہوتا تو عام فہم درسِ حدیث یا
درسِ قرآن یا ہلکے پھلکے اصلاحی مضامین بہت تھے۔ انھیں
پیش کرنے میں ہمیں اُس بے شمار محنت، کنج کاوی، مغز
پاشی اور مشقت سے نجات مل جاتی جو نقد و نظر کے
کارِ سخت کا لازمہ ہے۔ جس کے بغیر تجزیہ و تحلیل اور علمی
انتقاد کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔ مقصد خدمتِ دین و ملت
ہے۔ ساری ہی خدمات تو ایک شخص انجام نہیں دے سکتا
اپنی پسند کے سادہ، عام فہم اور نیم علمی مضامین آپ دوسری
جگہ پڑھیں۔ بہتیرے رسالے ایسی چیزوں سے معمور ہیں۔ اِس
سطح کی کتابیں بھی کافی ہیں۔ ہم بہرحال ہم اپنی مخصوص راہ
چلے جائیں گے اور اسی پر چلتے چلتے ایک دن آپ کو یہ
خبر ملے گی کہ:-

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

کھینچ تان کر چسپاں کیا جا سکے تو غالب کا ایک شعر یہاں
یاد آگیا ہے:-

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

ویسے اس بات سے شاید آپ انکار نہ کر سکیں کہ
"مسجد سے میخانے تک" کا کالم آپ کو تجلی ہی نے دیا ہے۔
ہمارے اپنے نقطۂ نظر سے ملّا مکّی کی بکواس خواہ کتنی ہی لغو
ہو لیکن ہزاروں ہزار حضرات جس بُری طرح اس بکواس پر
فریفتہ ہوئے ہیں کیا وہ ہماری خطا معاف کر دینے کے لئے
کافی نہیں۔ ہم خشکی پھیلاتے ہیں مگر ملّا آپ کو "تری" دیتا
ہے۔ ایں ہم غنیمت است۔

ایک بات اور ——— لکھا گیا کہ "آپ زیادہ
وقت بحث و مباحثہ میں خرچ کرتے ہیں حالانکہ قوم کی تعمیر
کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔"

جواب یہ ہے کہ تعمیر و تخریب کا اگر صحیح تصور کسی کے
ذہن میں ہو تو وہ ایسی کچی بات نہیں کہہ سکتا۔ طوفان
اُمنڈ آئے یا آگ لگ جائے یا گولہ باری ہونے لگے تو
افکار و عقائد کی محبوب متاع کو بچانے کی کوشش کرنا عین
تعمیر ہے نہ کہ کھیل کود۔ ہمارے ملک میں بہتیری جماعتیں اور
ادارے اور افراد اپنے اپنے انداز میں تعمیر و اصلاح کا کام
انجام دے رہے ہیں۔ جماعتِ تبلیغی، جماعتِ اسلامی، مدارس

ربیہ، علماء وخطباء۔ یہ سب اپنی اپنی صواب دید کے مطابق
بچھ نہ کچھ کر ہی رہے ہیں لیکن اتنا ہی ضروری کام یہ بھی ہے
کہ دینی افکار اور علمی حقائق کے خلاف کونے آنتر سے جو فتنے
سر اُبھاریں، خرمنِ عقائد پر جو بجلیاں کڑکیں، کشورِ شریعت
پر جو قلمی یا زبانی حملہ ہو اس کا بھرپور دفاع کیا جائے۔ آپ
کو شاید معلوم نہیں ہمارے علماءِ سلف میں بے شمار حضرات
"متکلم" کے لقب سے مشہور ہیں یعنی انھوں نے
وقت کے باطل افکار سے زبان اور قلم
کے ذریعہ طویل جنگ کی۔ بحث و مباحثہ سے لبریز ان کی
ضخیم کتابیں لائبریریوں میں محفوظ ہیں اور نہ جانے کتنی
ایسی ہلکیں کہ وہ دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ ایمان و اسلام
صلاً عقائد و افکار ہی کا تو نام ہے۔ ایمان کا محل اور مسکن
قلب و ذہن ہیں۔ فکر و عقیدہ درست نہ ہو تو عبادتوں
کی مثال ایسی ہی ہے جیسے زمین میں ناکارہ قسم کا بیج ڈال
کر توقع کی جائے کہ عمدہ فصل ہاتھ آئے گی۔ آج قرآن و
سنت کے افکار و عقائد پر اندر اور باہر دونوں طرف سے
جس قدر مسلسل سنگباریاں ہو رہی ہیں اور جیسے جیسے فتنے آئے
دن اُٹھتے رہتے ہیں انھیں نظر انداز کر دینا یہ معنی رکھتا ہے
کہ ہم نے اپنی محبوب متاعِ دین کی بربادی بخوشی منظور
کر لی۔ یہ تو بڑی سخت بات ہے۔ ہم تنہا کوئی بڑا کارنامہ
انجام نہ دے سکیں یہ الگ بات ہے لیکن اپنی استطاعت
کے مطابق تو ہمیں دفاع کرنا ہی چاہیئے۔ نتائج اللہ کے
ہاتھ ہیں۔ دنیا کا ٹھیکہ دار کوئی نہیں۔ ہر شخص سے آخرت
میں حساب اس کی طاقت و صلاحیت کے مطابق ہوگا۔
ہم خدا کی بارگاہ میں اس طرح حاضر ہونا چاہتے ہیں کہ جب
مالک الملک دریافت فرمائے کہ اے بندے! دنیا میں کیا
کر کے آیا ہے۔ تو ہم سجدے میں گر کر عرض کر سکیں کہ اے آقا!
غلام کی بے توفیقیاں اور بے عملیاں تو تیرے علم ہی میں ہیں۔
ان کی سزا جو بھی دے برحق ہے لیکن یہ بھی تجھے معلوم ہے کہ
جو قلم تو نے عطا فرمایا تھا اسے تیرا غلام تیرے ہی دین کی
حقیر سی خدمت میں گھس آیا ہے۔

میلاد کا قیام

مروّجہ میلاد بجائے خود بدعت ہے۔ اس میں قیام
بدعت در بدعت۔ جو لوگ اصلاحی کام کر رہے ہیں ان کے
لئے اصلاحی مقاصد سے بھی یہ طرزِ عمل جائز نہیں ہے کہ
میلادوں میں شرکت کریں اور قیام کے وقت اس وجہ
سے قیام میں شریک ہو جائیں کہ دوسروں کی دل شکنی نہ ہو۔
رواداری، نرمی، فراخ دلی اچھے اوصاف ہیں لیکن اصول و
عقائد کے معاملہ میں استقامت، ثبات اور پختگی ضروری ہے۔

سیرت النبیؐ کے جلسے

جماعت تبلیغی والے ہوں یا کوئی اور سیرت کے جلسوں
میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ میلاد والی تاریخوں کو ضروری
قرار نہ دیا جائے۔ خاص طور پر جماعتِ تبلیغی کے بارے
میں آپ کی یہ شکایت کہ وہ بڑی مبالغہ آرائی کرتے
ہیں سادہ لوحی ہے۔ بریلوی حضرات کچھ کم مبالغہ آرائی نہیں
کرتے اور اب تو دیوبندیوں میں بھی یہ روگ گھس آیا ہے
خلاصہ یہ کہ حمام میں تقریباً سبھی ننگے یا نیم برہنہ نظر آ رہے
ہیں۔

جماعت تبلیغی یا علمائے بریلی سے جو شخص یہ توقع کرتا
ہے کہ وہ کشف و کرامت اور غلو اور افسانہ طرازی کئے بغیر
دین کے حقائق اور احکام بیان کر سکیں گے وہ خوابوں کی
دنیا میں رہتا ہے۔ یہ دونوں مکتبِ فکر اپنے خمیر ہی میں علم نما
جہل کو شامل کئے ہوئے ہیں لہٰذا ان سے معیارِ علم و تفقہ
کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

جن جلسہ ہائے سیرت کے بارے میں آپ کو وثوق
سے معلوم ہو یا گمان غالب ہو کہ ان میں عقیدتِ رسولؐ
کی آڑ میں مشرکانہ اور توہم پرستانہ خیالات نشر کئے جائیں
گے ان کے لئے چندہ مت دیجئے۔ دیں گے تو شریک گناہ
ہوں گے۔

راہِ وفا میں جانبازی کا دعویٰ کام نہ آیا تنہا
لاحاصل، بے مصرف نکلا لفظوں کا سرمایہ تنہا

ہم نے ماضی کی تصویریں آنکھوں کے پردوں پر ڈھونڈیں
آئینے کو آگے رکھ کر اکثر جی بہلایا تنہا

اب یہ دنیا شوق سے مجھ پر پتھر پھینکے تیر چلائے
مَیں تو خود میں گوشہ نشیں ہوں پھرتا ہے اک سایا تنہا

ہنگاموں کی اس دنیا میں تنہائی نایاب ہے، لیکن
جب بھی کوئی وقت پڑا ہے ہم نے خود کو پایا تنہا

مشقِ ستم فرمانے والے کاش کبھی اتنا بھی سوچیں
ضبط کا پیمانہ جب چھلکا کیا میں ہوں گا رسوا تنہا

جب تلک چھلکے بادۂ عشرت، جام کے حصہ دار ہزاروں
لیکن پینی ہی پڑتی ہے غم کی صہبا تنہا تنہا

آخر آخر ہوش و خرد بھی ان کی نظر کے گھائل نکلے
پہلے پہلے ہم سمجھے تھے دل ہی ان پر آیا تنہا

یارو تم نے بستی بستی انسانوں کی بھیڑ تو دیکھی
دیکھ سکو تو یہ بھی دیکھو ہر انساں ہے کتنا تنہا!

بوالہوسو! وہ پیکرِ عفت بام پہ کیا بے پردہ آتا
آئینے نے اکثر جس کو پردہ کرتے دیکھا تنہا

کیسے کیسے طعن سُنے ہیں کم ظرفی کے بے صبری کے
لرزا تھا میری پلکوں پر پانی کا اک قطرا تنہا

کس کا سورج کیسے تارے، کافی ہے اربابِ نظر کو
دریا کی اِک بوند اکیلی، صحرا کا اک ذرّہ تنہا

دل نے کتنے شوق سے عامرؔ یہ سودا منظور کیا ہے
ساری عمرِ وفا کی قیمت ان کا بس اک جلوا تنہا

عامر عثمانی

تفسیر ماجدی

(۸)

سلسلہ کیلئے دیکھئے
تجلّی نقد و نظر نمبر

(۵) آیت ۱۴۲ کی تفسیر میں "شمال ومغرب" اور "جنوب ومشرق" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اگر واؤ کاتب کا اضافہ نہیں بلکہ محترم مفسر ہی کے قلم سے نکلا ہے تو اس کی صحت میں ہمیں شک ہے۔ محاورہ بغیر واو کے ہے۔

(۶) آیت ۴۷ کے نوٹ میں ایک انگریزی کتاب کا نام دے کر صفحہ کی علامت (ص) دی گئی لیکن صفحہ کے ہندسے رہ گئے۔

(۷) آیت ۴۸ کی تفسیر میں ایک دلچسپ بحث ہے۔ آیت یہ ہے:-

"وَاِذْ زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ الآیہ۔ اور جس وقت خوشنما کر دکھایا شیطان نے ان کی نظروں میں ان کے عملوں کو اور بولا کہ کوئی بھی غالب نہ ہوگا تم پر آج کے دن لوگوں میں سے اور میں تمھارا حمایتی ہوں۔ پھر جب سامنے ہوئیں دونوں فوجیں تو وہ اُلٹا پھرا اپنی ایڑیوں پر اور بولا میں تمھارے ساتھ نہیں ہوں۔ میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے۔ اور اللہ کا عذاب سخت ہے۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اس کا تعلق غزوۂ بدر سے ہے جب اہلِ ایمان کی مدد کو فرشتے نازل ہوئے تھے۔

سوال یہ ہے کہ کیا واقعۃً شیطان کسی شکل میں مجسم ہو کر کفار کے سامنے آیا تھا اور ان سے مکالمہ کیا تھا یا محض قلوب میں وسوسہ اندازی کی تھی اور یہ سب اسی کی تمثیل و تعبیر ہے؟-

ممدوح مفسر کا غالب رجحان یہ ہے کہ یہ تمثیل ہی ہے گفتگو زبان و الفاظ کی مدد سے نہیں ہوئی بلکہ جو وسوسۂ شیطانی کفار کے قلوب میں گذرا اسی کو قولِ شیطانی کی حیثیت سے بیان کر دیا گیا ہے۔

اپنے اس رجحان کی تائید میں ممدوح نے دو نقلیں پیش کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "حسن بصری تابعی اور اصم تابعی اور دوسرے محققین سے بھی منقول ہے کہ شیطان مجسم ہو کر سامنے نہیں آیا تھا بلکہ اس نے وسوسہ اندازی ہی کی تھی۔"

ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی تکلف نہیں کہ یہ رائے بھی قابلِ اعتناء ہے اور کتنے ہی مفسرین اس کے قائل رہے ہیں۔ خصوصاً قرآن کا یہ فقرہ کہ وَاِذْ زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ اسی طرف رہنمائی کرتا نظر آتا ہے کہ

ذکر شیطان کی وسوسہ اندازی کا ہے نہ کہ بالمشافہ گفتگو کرنیکا۔ لیکن پوری آیت پر نظر کی جائے تو زیادہ قوت کے ساتھ یہ خیال سر ابھارتا ہے کہ یہ فقط غائبانہ وسوسہ اندازی کا معاملہ نہیں بلکہ منھ در منھ بات چیت کا معاملہ ہے۔ اور اس خیال کے لئے نقل بھی موجود ہے۔ جس روح المعانی سے ممدوح مفسر نے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہاں وسوسے کو مجازاً قول کہدیا گیا ہے اسی روح المعانی میں متعدد مفسرین کا یہ بیان بھی موجود ہے کہ ابلیس سراقہ بن مالک الکنانی کی شکل میں متمثل ہو کر آیا تھا اور پھر منھ در منھ مکالمے کی تفصیل نقل کرنے کے بعد یہ بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ روایت حضرت ابن عباسؓ اور کلبی اور سدّی سے منقول ہے۔

ہم سمجھتے ہیں انسان کے بس سے باہر ہے کہ اس بحث میں کوئی قطعی بات کہہ سکے۔ دونوں امکان برابر کے درجے میں ہیں۔ نہ یہ مشکل کہ ابلیس انسانی شکل میں آکر چرب زبانی کر جائے نہ یہ مشکل کہ اس کی وسوسہ اندازی کو مجازاً مکالمے کی صورت دیدی جائے۔ ممدوح مفسر نے معلوم نہیں کیوں شکل اوّل کو ناقابلِ اعتناء قرار دے کر شکل ثانی ہی کو ننانوے فیصد قطعیت دیدی ہے۔ حالانکہ ان کے مرشد اور ہمارے ممدوح مولانا اشرف علیؒ اپنی بیان القرآن میں صرف تزیّن والے فقرے کو وسوسہ اندازی پر محمول فرما کر باقی مکالمے کو منھ در منھ والا مکالمہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:۔

"اور وسوسہ سے بڑھ کر یہ کیا کہ بالمشافہہ ان سے کہا کہ ......"

اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ بھی حضرت ابن عباسؓ والی ہی روایت پر مطمئن ہیں کہ ابلیس آدمی کے روپ میں آیا تھا۔ شاہ عبد القادرؒ کا بھی یہی خیال ہے کہ بدر کے دن شیطان انسانی روپ میں جلوہ گر ہوا تھا۔

خیر۔ ممدوح مفسر نے جو پسند کیا۔ کیا۔ لیکن بحث کا ایک اور پہلو بھی ابھی ہے۔ شیطان کے اس قول پر کہ "میں تو خدا سے ڈرتا ہوں" انھوں نے یہ نوٹ دیا:۔

"جتنا علم شیطان کو اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدے کی بنا پر اللہ کی عظمت و قوت کا ہے اتنا تو انسان کو بھی نہیں ہو سکتا اور یہ خوف اسی علم سے پیدا ہوا اس لئے اس کا یہ کہنا محلِ اشکال نہیں اور نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ شیطان میں بھی خوفِ خدا کی بنا پر ایمان کی جھلک موجود ہے۔ مقصود و مطلوب جو کچھ ہے وہ خوفِ ایمانی ہے محض خوفِ طبعی نہیں چاہے وہ کسی درجہ کا بھی ہو۔"

گذارش یہ ہے کہ آیت میں مذکورہ مکالمے کو جب ممدوح مجازاً و تمثیل قرار دے رہے ہیں۔ یعنی فی الحقیقت ابلیس نے کفار سے یہ باتیں نہیں کیں بلکہ جو شیطانی وساوس کفار کے اذہان و قلوب میں گذرے انھیں گفتگو کی شکل میں بیان کر دیا گیا ہے تو پھر اس اشکال کا کیا موقعہ رہا جسے انھوں نے حل فرمایا ہے۔ اشکال صرف اسی صورت میں پیدا ہوتا تھا کہ شیطان نے واقعی اپنے منھ سے کہہ ڈالا ہو کہ میں تو خدا سے ڈرتا ہوں۔ واقعی کہنا ممدوح مانتے ہی نہیں پھر اشکال کیسا اور کفر و ایمان کی بحث کیوں۔

حضرت حکیم الامۃ نے بھی اس اشکال کا ذکر کیا ہے اور اسے ان الفاظ میں حل فرمایا ہے کہ "چونکہ نرا خوف بدون ایمان کے مقبول نہیں اسی لئے شیطان کا خدا سے ڈرنا اگر واقعی بھی ہو کچھ محلِ اشکال نہیں۔"

حکیم الامۃؒ کا اشکال رفع کرنا برمحل اور بامعنی ہے کیونکہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ شیطان نے بالمشافہہ (منھ در منھ) گل افشانی کی تھی۔ مگر ممدوح مفسر تو اسے تسلیم نہیں کرتے پھر اشکال کیسے پیدا ہوگا۔

مزید یہ سوال بھی ہے کہ شیطان کو اللہ کی عظمت و قوت کا جو علم ہے وہ تو بہت پہلے سے ہے۔ اس علم سے غزوۂ بدر کے دن دفعتاً خوف پیدا ہو یہ تو عجیب ہی بات ہے۔ یہ خوف تو پہلے سے موجود ہونا چاہیئے تھا۔ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ خوف اس علم کی بنا پر پیدا نہیں ہوا جس کی طرف ممدوح نے رہنمائی فرمائی بلکہ اس مخصوص صورتِ حال کے نظارے سے پیدا ہوا جو غزوۂ بدر میں یکلخت اس کے سامنے آئی۔ اس نے

دیکھا کہ یہ تو فرشتے مسلمانوں کی مدد کو آگئے ہیں اور فتح و ظفر کے جو خواب بدنصیب دیکھے اور دکھلائے تھے ملیامیٹ ہوئے جا رہے ہیں۔ تب وہ ڈرا اور بھاگا۔

پھر یہ ڈر اپنی ذات کے لئے بھی نہیں تھا۔ اپنے بارے میں تو وہ جانتا ہی ہے کہ اللہ نے قیامت تک کی چھوٹ دے رکھی ہے۔ کس کی مجال ہے اس پر ہاتھ ڈال سکے۔ ڈر کفار کے بارے میں تھا کہ نزولِ ملائکہ کے باعث ان کی کم بختی صاف نظر آگئی تھی۔

اور کیا واقعی ڈرتا بھی ؟

ہم تو کہتے ہیں کہ یہ بھی ملعون نے جھوٹ بولا۔ جھوٹ اور فریب تو اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ قرآنی بیان کے مطابق وہ پہلے تو انسان کو کفر پر ابھارتا ہے اور جب وہ اس کے بھرّے میں آکر عاقبت تباہ کر بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ بھائی صاحب میں تو تم سے بری ہوں مجھے تو اللہ کا ڈر ہے (کَمَثَلِ الشَّیْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اکْفُرْ فَلَمَّا کَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ...

کیا یہ صریح دروغ بافی اور چال بازی نہیں۔ اللہ سے وہ ڈرتا تو اس وقت ڈرتا جب حکمِ سجدہ دیا گیا تھا مردود اس وقت ہی نہیں ڈرا بلکہ دیدہ دلیری اور ڈھٹائی کی حد کر دی تو اب کسی موقعہ پر کیوں ڈرنے لگا۔ جھوٹا اور مکار ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ خوفِ ایمانی تو کیا اس میں خوفِ طبعی بھی نہیں۔ وہ آتش کا پرکالہ ہے۔ اس میں اللہ نے اپنی حکمتِ تکوینی کے تحت ڈرنے کا جذبہ پیدا ہی نہیں کیا۔ سبحانہ تعالیٰ یخلق ما یشاء و کیف یشاء

بہرحال آیت کو مجاز پر محمول کرنے کی صورت میں تو شیطان کے ایمان و کفر کی بحث پیدا ہی نہیں ہوتی اور حقیقت پر محمول کیجئے تو اشکال کا صحیح حل یہ نہیں ہے کہ اس کا خوف طبعی تھا ایمانی نہیں تھا۔ بلکہ یہ ہے کہ اس نے جھوٹ بولا۔ جیسے منافقین حضورؐ سے کہتے تھے کہ ہم گواہی دیتے ہیں آپ اللہ کے رسول ہیں۔ بات اگرچہ فی نفسہٖ سچی تھی مگر وہ اسے سچ نہیں مانتے تھے بلکہ دکھاوے کے لئے کہتے تھے اس لئے اللہ نے فرمایا کہ یہ بدبخت جھوٹے ہیں۔ قسموں کی آڑ لے کر لوگوں کو راہ راست سے روکتے ہیں۔ اسی طرح شیطان کا یہ کہنا سراسر جھوٹ ہی تھا (اور اگر بعض اقوال کے مطابق آخرت میں وہ ایسا کہے گا تب بھی جھوٹ ہی ہوگا) کہ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔ جھوٹی بکواس میں ایمان کی جھلک کہاں۔

ایک شبہ یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ متعدد حدیثوں میں شیطان کے ڈرنے کا ذکر ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ ہی کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ شیطان ان سے ڈرتا اور جان چھڑاتا ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ایسے تمام مقامات پر ڈر اندیشے کے مفہوم میں ہے۔ اپنی اسکیموں کے فیل ہونے کا اندیشہ۔ اپنی چالوں کے بیکار جانے کا اندیشہ۔ پریشانی۔ مایوسی۔ ذہنی اذیت۔ جھلاہٹ۔ غصہ۔ طرارہ وغیر ذلک۔ یہ سارے جذبے جذبۂ خوف سے الگ ہیں۔ خوف تو اس مردود کے خمیر ہی میں نہیں۔ ممدوح کا یہ فرمانا کہ:۔

"ہو سکتا ہے کہ شیطان اسی سے ڈرا ہو کہ کہیں یہیں اور ابھی میری خبر نہ لے لی جائے۔"

بس زیبِ داستاں قسم کی چیز ہے ورنہ شیطان کو بھلا یہ ڈر کیوں ہونے لگا جب کہ یومِ ازل میں خود باری تعالیٰ نے اس کی درخواست کے جواب میں فرما دیا تھا کہ جاؤ قیامت تک مزے کرو۔

یہیں کتابت کی ایک موٹی غلطی بھی ہے

"اللہ تعالیٰ سے محض طبعی خوف کا ہونا ممکن نہیں۔"

ممکن کے بجائے "مطلوب" لکھا گیا ہوگا۔ مولانا دریا بادی ایسا لکھتے ہیں کہ بڑے سے بڑا افلاطون کاتب بھی شاید ہی ان کی چار سطریں ٹھیک کتابت کر سکے۔ حکیم عبدالقوی صاحب (منیجر صدق جدید) پہلے ان کے مسودے نقل کرتے ہیں پھر کاتب کو دیتے ہیں۔ ہم اگر مولانا کے دورِ شباب میں بولنا سیکھ گئے ہوتے تو ضرور انھیں مشورہ دیتے کہ قلم سے انصاف کیجئے۔ تحریر اللہ کی نعمت ہے اور اس نعمت کی درگت بن جاتی ہے اگر حروف کیڑوں

ٹکوڑوں کی شکل اختیار کر جائیں۔ اب کسی مشورے اور گذارش کا موقع نہیں کہ مولانا عمر کی اُس منزل میں پہنچ چکے ہیں جب زبانِ حال یہ شعر دہراتی رہتی ہے:-

احباب مجھ سے قطعِ تعلق کریں جگر
اب آفتابِ زیست لبِ بام آگیا

اللہ تعالیٰ ابھی اس آفتاب کو بہت دنوں ضیا پاشی کا موقعہ دے اور ان کا غنیمت سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے۔

---

(۸) آیت ۲۵ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

"اے نبی مومنین کو قتال پر اُبھاریئے۔"

یہاں ممدوح مفسر نے اس پر تو کوئی لب کشائی نہیں کی کہ اللہ نے یہاں اے رسولؐ کیوں نہ کہا اے نبی کیوں کہا۔ مگر مومنین پر یہ نوٹ دیا:-

"آیت میں مومنین کا لفظ بھی قابلِ غور ہے — مسلمین نہیں آیا ہے۔ یعنی قتال کے لئے قتال فی سبیل اللہ کے لئے دعوت محض زبان سے کلمۂ شہادت پڑھ لینے والوں کو نہیں دی جارہی ہے بلکہ ان لوگوں کو دی جارہی ہے جنکی زندگیوں میں ایمان مع اپنے لوازم و مقتضیات کے رچ چکا ہے۔ اسلامی جہاد کا نام لینے والوں کے لئے پہلے خود مومن ہونا شرط ہے۔"

ہم اس نوٹ کے بارے میں ادب کے ساتھ یہ کہیں گے کہ فکرِ صحیح اور اصولِ شرعی سے اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ صرف جذباتی انشا نبیہ ہے۔

ائمۂ تفسیر کے یہاں یہ بات مسلّم ہے کہ جس مقام پر لفظ مسلم اور مومن دونوں مذکور ہوں وہاں تو انھیں اپنے الگ الگ مفاہیم پر محمول کرنا ضروری ہے لیکن جہاں ان میں سے صرف ایک ہو وہاں بالکل ضروری نہیں کہ اس کے وضعی معنی مراد لئے جائیں بلکہ وہ مومن و مسلم دونوں پر صادق آسکتا ہے۔

قرآن میں پچاسوں جگہ یا ایھا الذین آمنوا آیا ہے۔ ایک بھی ثقہ مفسر یہ رائے نہیں رکھتا کہ اس کے مخاطب صرف وہی اہل ایمان ہیں جو زہد و تقویٰ کے بلند درجے پر فائز ہوں جنھیں اولیا کہا جاسکے اور جن کا اسوہ مکمل طور پر دین و شریعت کی تصویر ہو، بلکہ تمام ہی ان لوگوں کو مخاطب مانا جاتا ہے جو اسلام قبول کر چکے ہوں خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ ولی ہوں یا فاسق یعنی اصطلاحِ شرعی میں جو بھی آدمی مسلمان ہے وہ اس خطاب میں داخل ہے۔ یہاں مومنین سے مراد فقط وہ لوگ نہیں ہیں جن کی زندگیوں میں ایمان مع اپنے لوازم و مقتضیات کے رچ چکا ہے۔

قرآن سامنے ہے۔ اس میں دسیوں جگہ لفظِ مسلم بول کر مومن اور لفظ مومن بول کر مسلم مراد لیا گیا ہے۔ اللہ جب فرماتا ہے کہ ولکن کان حنیفاً مسلماً (اور ابراہیم تو تمام جھوٹے مذاہب سے بیزار تھا اور مسلم تھا) تو مسلم کا مطلب ہوتا ہے پکا مومن نہ کہ فقط کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان کہلانے والا۔ حضرت یوسفؑ جب دعا کرتے ہیں کہ توفنی مسلماً تو وہاں بھی مسلم کا مفہوم وہی ہوتا ہے جو اصطلاحاً مومن کا ہے۔ اسی طرح دسیوں مثالیں قرآن میں موجود ہیں اور مومن بول کر تمام مومن و مسلم مراد لینا تو اور زیادہ معلوم و مسلّم ہے۔ یا ایھا الذین آمنوا کہہ کر جتنے بھی احکام دیئے گئے ہر ہر فرد امت کو دیئے گئے خواہ وہ گنہگار مسلم" ہو یا "صالح مومن"۔

جب یہ صورت حال ہے تو کسی بھی آیت میں لفظ مسلم یا لفظ مومن کو مخصوص و محدود معنی میں لے بیٹھنا اور دوسرے کو اس کے اطلاق سے خارج کر کے نکتہ سنجی کرنا آخر کیسے معقول ہو سکتا ہے۔ ممدوح نے جو نکتہ اخذ کیا وہ اسی مفروضے پر تو مبنی ہے کہ اللہ نے لفظِ مومن استعمال کیا تو مسلم اس سے خارج ہو گئے۔ یہ مفروضہ غلط ہے لہذا اس پر مبنی نکتے کا غلط ہونا بھی ظاہر و باہر ہے۔

اس استدلال سے ہٹ کر خود نکتے کے مالہٗ و ماعلیہ پر غور کیجئے۔ کیا اللہ کی یہ مراد تھی کہ جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں ان میں سے نبی صرف ان افراد کو تلاش کرے جو سراپا

اسلام بن چکے ہوں اور مخصوص طور پر ان ہی کو جہاد کے لئے اُبھارے۔ ایسا تو عقل و نقل کے کسی بھی قرینے سے ثابت نہیں آیت کا مقصود تمام مسلمانوں کو جہاد کی تلقین ہے۔ جہاد مٹھی بھر لوگوں کا تو کام نہیں ہے۔ اس میں لشکر حصّہ لیتے ہیں اور کوئی بھی لشکر روایتی صالحین اور مثالی اولیاء کا مجموعہ نہیں ہوا کرتا۔ اس میں ہر معیار کے افراد شامل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی یہ تصور کرتا ہے کہ صحابہؓ نے جو جہاد کئے ہیں ان میں فوج مومن کا فرد فرد اُسی معیار کا تھا جس معیار کو ممدوح نے شرکتِ جہاد کی شرط قرار دیا ہے تو وہ خوابوں کی دنیا میں رہتا ہے۔ مجاہدین میں ایسے بے شمار افراد ہوا کرتے تھے جو ابھی ابھی ایمان لائے تھے اور دورِ جاہلیت کے نہ جانے کتنے تصورات لاشعوری طور پر ان سے چپکے ہوئے تھے۔ نیز ان میں سے ہر ایک مثالی قسم کا عابد و زاہد بھی نہیں تھا۔

اور جہاد کا دروازہ بند تو نہیں ہو گیا۔ مگر ممدوح کی عائد کردہ شرطا سے بنا ہی کر رہی ہے۔ کیا وہ جنگیں جو صلیبی جنگوں کے نام سے مشہور ہیں اور طویل زمانے تک لڑی گئی ہیں مسلمانوں کے حق میں جہاد نہیں تھیں۔ کیا آج اگر عرب مسجدِ اقصٰی کی حرمت پر کٹ مریں اور صیہونی تحریک کی کھلی اسلام دشمنی کا استیصال کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں تو اسے جہاد نہ کہہ سکیں گے۔ حالانکہ اسوۂ وکردار کا وہ معیار تو اب خواب ہوا جس کا عنوان تقوٰی ہے:

صحیح بات یہ ہے کہ جہاد کا مدار دو چیزوں پر ہے:-

حسنِ نیت اور بنیادی احکام دین سے واقفیت۔

حسنِ نیت کی شرط تو ہمہ گیر ہے۔ یعنی ہر ہر لشکری پر لازم، چاہے وہ کمانڈر ہو چاہے معمولی سپاہی۔ جہاد ہو رہا ہو اور بعض شرکاء کی نیت درست نہ ہو تو ان کے حق میں یہ جہاد نہ ہوگا۔ دوسری شرط صرف سربراہوں کے لئے ہے۔ جو افراد قیادت و سیادت کا منصب سنبھالے ہوئے ہوں انھیں اس شرط سے متصف ہونا چاہیئے۔

حسن نیت میں یہ بھی آ گیا کہ مجاہدین دیانت کے ساتھ اپنے موقف کو برحق تصور کرتے ہوں۔ یہ بھی آ گیا کہ ان کا مقصود صرف مالِ غنیمت یا صرف ناموری یا صرف قومی عصبیت نہ ہو۔

حسن نیت رکھنے والے اہل حضرات جب مطمئن ہو جائیں کہ جہاد کا وقت آ پہنچا ہے تو پھر دعوتِ جہاد جملہ مسلمانوں کو دی جائے گی صرف اولیاء و اتقیاء کو نہیں۔ ایک چور یا زانی یا تارکِ صلوٰۃ مسلمان بھی اسی طرح مدعو ہوگا جس طرح نکوکار افراد۔ اسے بھی ثواب جہاد ملے گا اگر حسن نیت سے اس نے دعوت قبول کر لی ہے۔ بعید نہیں کہ یہ ثواب اس کی ساری بداعمالیوں کا تدارک کر دے۔ حدیثیں اس پر گواہ ہیں۔

نعوذ باللہ یہودی اپنے ناپاک عزائم کے مطابق مدینے یا مکّے پر حملہ آور ہو جائیں تو ایسے وقت میں یہ شرط عائد نہیں کی جا سکتی کہ جہاد کا نام وہی مسلمان لیں جو اصطلاحاً مومنِ کامل کہے جا سکیں۔ یہ وقت تو وہ ہے کہ فساق و فجار کو بھی نعرۂ جہاد لگاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہونا چاہیئے۔ اور ریب و گمان کی ادنٰی آمیزش کے بغیر پورے وثوق و یقین کے ساتھ مان لینا چاہیئے کہ نفیرِ جہاد بج چکی۔ حرمین کی حرمت لہو کی بھینٹ مانگ رہی ہے۔ میدانِ دغا میں کود و اور مٹ جاؤ یا حملہ آور کو مٹا دو۔ اس وقت یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ ہائی کمانڈ مومنینِ کاملین اور صلحاء و اتقیاء پر مشتمل ہے یا عام دنیادار مسلمانوں پر۔ اس وقت تو ایک فاسق کی قیادت بھی واجب القبول ہو گی اگر قرائن و حالات یہ اطمینان دلا رہے ہوں کہ اس جنگ کی حد تک یہ فاسق مخلص ہے اور حرمین کا احترام اور دین کی کچھ غیرت اس میں بھی پائی جاتی ہے

ہمارا خیال یہ ہے کہ ممدوح مفسر نے یہاں جہاد اور دعوتِ اقامتِ دین کو ایک ہی مفہوم میں لے کر اظہارِ خیال فرما دیا۔ دعوتِ اقامتِ دین تو بے شک ایسے ہی لوگوں کو زیبا ہے جو حتی الوسع اسلامی کردار کا نمونہ ہوں اور خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت کی کہاوت ان پر صادق نہ آئے۔ لیکن دعوتِ جہاد الگ چیز ہے۔

مناسب موقعہ پر اس کی توفیق اگر کسی دنیا دار کو بھی مل جائے تو خوش نصیب۔

خلاصۂ کلام یہ کہ آیت میں مومنین سے مراد تمام وہ افراد ہیں جو داخلِ اسلام ہو چکے تھے۔ محض وہ افراد نہیں جو طاعت و تقویٰ کے معیارِ کامل پر پورے اترتے تھے۔

---

(۹) آیت ۳۸ کے تحت ایک نوٹ ہے:-

"مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ خطائے اجتہادی جب نبی معصوم تک کے لئے جائز ہے تو شیوخ غیر معصوم کے متعلق امتناعِ خطا کا اعتقاد کس درجہ غلو ہے قبیح ہے۔"

بات بالکل برحق۔ خطائے اجتہادی انبیاء سے بارہا صادر ہوئی ہے۔ قرآن اس کے نظائر سے خالی نہیں ہے لیکن خیال آتا ہے کہ بے چارے مولانا مودودی نے تو اتنی صراحت کے ساتھ شاید کہیں بھی انبیاء سے خطاءِ اجتہادی کے صدور کی بات سپردِ قلم نہیں کی اور کچھ زیادہ ہی محتاط اور مرموز الفاظ سے کام چلایا۔ مگر اس کے خلاف دیگر الزامات کے ساتھ عصمتِ انبیاء کے انکار کا الزام بھی زور شور سے اچھالا گیا۔ حلقۂ دیوبند تک اس جرم سے بری نہیں۔ جسے دیکھو ایک بانس کا جھنڈا اٹھائے لئے چلا آرہا ہے کہ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔ ہمیں اس سلسلے میں ایک مفصل مضمون بھی لکھنا پڑا (انبیاءؑ و صحابہؓ بنیادی عقائد کی روشنی میں) اور بعض اور دردمندوں نے بھی اس رکیک اور مغالطہ انگیز الزام کے رد میں اپنا بہت سا وقت خرچ کیا۔

حالانکہ دوسرے علماء و شیوخ کے یہاں اس طرح کی باتیں پہلے سے موجود تھیں جن کا نمونہ حکیم الامتؒ کا مذکورہ اقتباس ہے۔ ہونی بھی چاہئیں تھیں۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کی ذات و صفات شاعری کا موضوع نہیں ہیں کہ بے پر کی اڑائے جاؤ۔ واقعہ واقعہ ہے اور سچائی سچائی۔ انبیاءؑ بشر ہی تھے اور بشر کے خمیر میں سہو و خطا ہے۔ حدود و قیود بے شک برحق۔ انبیاء دوسرے انسانوں کی طرح غلطیاں نہیں کر سکتے اور اجتہاد کی جو خطا ان سے صادر ہوتی ہے اس پر اللہ ٹوک بھی دیتا ہے۔ لیکن انبیاء کو اس معنی میں معصوم کہنا کہ وہ نادانستہ خطاؤں اور اجتہاد و رائے کی لغزشوں سے بھی بالاتر تھے از قسمِ شاعری ہے، حقائق کی ترجمانی نہیں۔

خوش نصیب ہے مودودی کہ اسے ایک ایک صداقت بیانی پر ہزار ہزار گالیاں ملی ہیں۔ ہمارے بس میں ہو تو ان گالیوں کو اس سے ہم چھین لیں کیونکہ ناحق طور پر پڑی ہوئی ہر گالی مظلوم کے حق میں بہ لحاظِ آخرت سونے سے بھی بڑھ کر قیمتی ہے۔

شکر ہے سورۂ انفال کا تبصرہ ختم ہوا۔ اب بس سورۂ توبہ باقی ہے۔ اللہ نے توفیق دی تو اس پر بھی تبصرہ آہی رہا ہے۔

تین طلاقوں کے بارے میں آیات اور احادیث اور صحابہؓ کے فتوے

قرآن

سورہ البقرہ میں ارشاد کیا گیا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (طلاق تو بس دو ہی بار ہے۔ اس کے بعد یا تو میاں بیوی کو رجوع کر کے روک لیا جائے بھلے طریقے سے یا بھلی طرح چھوڑ دیا جائے)

تمام مستند مفسرین آیت کی شانِ نزول یہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام سے قبل اہلِ عرب میں دستور یہ تھا کہ جتنی بار چاہے بیوی کو طلاق دو اور رجوع کر لو۔ طلاق کا کوئی عدد ایسا نہ تھا جس کے بعد رجوع نہ ہو سکے اللہ نے قانون بیان فرمایا کہ رجوع صرف دو طلاقوں تک ہو سکتا ہے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ۔ (دو کے بعد اگر تیسری بھی دیدی، تو اب یہ عورت طلاق دینے پر حلال ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ کسی اور سے نکاح نہ کرلے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ مَرَّةٌ (ایک مرتبہ) اور مَرَّتَيْنِ (دو مرتبہ) کا استعمال عرب میں ایسے مواقع پر بھی ہوتا ہے جب کوئی فعل الگ الگ کیا جائے اور ایسے مواقع پر بھی ہوتا ہے جب اوقات کا فرق نہ ہو۔ اس کی مثالیں بھی ہم قرآن سے دے آئے۔ یہاں ایک اور مثال ذہن میں آئی۔ معجزہ شق القمر کے بارے میں بخاری میں تین مختلف صحابیوں سے روایت منقول ہے۔ پہلی عبداللہ ابن مسعود کی روایت کے یہ الفاظ ہیں۔

قال انشق القمر على عهد النبي صلى الله عليه وسلم شقتين۔

ابن مسعود نے فرمایا کہ رسول اللہ کے زمانے میں چاند دو برابر کے ٹکڑوں میں شق ہو گیا تھا۔

دو برابر کے ٹکڑے ہو جانے کے لئے ایک روایت میں فرقتین آتا ہے۔ ایک میں فلقتین مگر مسلم کی ایک روایت میں مرتین ہے۔ اب اس سے بعض اناڑیوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ شق قمر کا معجزہ دو بار صادر ہوا ہے جیسے کہ قرآن کی مذکورہ آیت میں ہمارے دوست یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ دو الگ الگ طلاقوں کا حکم بیان ہو رہا ہے۔ مگر مستند اور معروف محدثین اور ائمہ مجتہدین میں کوئی ایسا نہیں جس نے یہ یقین کیا ہو کہ شق قمر دو بار ہوا بلکہ مرتین سے مراد شقتین ہی لیتے ہیں یعنی دو ٹکڑے۔ اب دیکھ لیجئے شق قمر کا فعل اور واقعہ ایک ہی ہے گویا مَرَّةً واحدة۔ مگر اثر فعل کی مشاہداتی کیفیت کے اعتبار سے بعض اہلِ زبان نے اس کے لئے مرتین کا لفظ استعمال کر لیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو لوگ مرتین کے واحد معنی یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ فعل دو مرتبہ الگ الگ واقع ہو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

ایک اور استدلال یہاں ابن قیم وغیرہ سے منقول ہے اسے بھی دیکھ لینا چاہیئے۔ استدلال یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا الطلاق مرتان یعنی طلاق دو بار ہے مرةً بعد مرةٍ (ایک کے بعد ایک) پھر فرمایا گیا کہ فَاِنْ طَلَّقَهَا یعنی ایک کے بعد ایک طلاق دینے کے بعد اگر تیسری بار طلاق دی تو یہ عورت حلال نہ ہوگی جب تک کسی اور سے نکاح نہ کرلے۔ اس ترتیب اور نظم کلام سے ظاہر ہوا کہ عورت کو حرام کرنے والی وہی تیسری طلاق ہو سکتی ہے جو اس وقت دی جائے جب پہلے ایک کے بعد ایک طلاق دی جا چکی ہو۔ گویا تیسری طلاق کو اس وقت آنا چاہیئے جب دو طلاقیں الگ الگ واقع کی جا چکی ہوں۔

یہ استدلال بڑا ظاہر فریب ہے اور ظلم ہوگا اگر اس کے پیش کرنے والوں کی ذہانت کو داد کا تحفہ نہ دیا جائے لیکن تحفہ پیش کرنے کے بعد ہم ادب کے ساتھ گذارش کریں گے کہ بزرگو! اگر یہی بات ہے تو پھر یہ بھی تو ثابت ہوا کہ طلاق سے رجوع ایک طلاق کے بعد نہیں ہو سکتا بلکہ دو طلاقوں کے بعد ہو سکتا ہے۔ اللہ نے فرمایا

اق دو بار ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جو بھی حکم آرہا ہے وہ
سی وقت موثر اور قابلِ عمل ہو سکتا ہے جب ایک کے بعد ایک
ر کے دو طلاقیں واقع کر دی جائیں تو اس کے بعد جس طرح تیسری
طلاق کا حکم بیان ہوا ہے اسی طرح فامساك بمعروف بھی بیان
ہوا ہے۔ یہ نہیں فرمایا گیا کہ ایک طلاق کے بعد بھی رجوع کر سکتے ہو بلکہ
یہ فرمایا گیا کہ طلاق دو بار ہے اس کے بعد یا تو رجوع ہے یا چھوڑ دینا
ہے۔ لہٰذا جس دلیل سے آپ یہ واجب کر رہے ہیں کہ تیسری طلاق
اسی وقت واقع ہو سکتی ہے جب دو طلاقیں اس سے قبل دو مرتبہ
دی جا چکیں۔ اسی دلیل سے یہ بھی واجب ہوتا ہے کہ رجوع اس وقت
کیا جائے جب ایک کے بعد ایک کر کے دو طلاقیں دی جا چکیں
پھر کیا وجہ ہے کہ آپ یہ قول نہیں کرتے بلکہ تمام علمائے امت
کی طرح یہ مانتے ہیں کہ رجوع ایک طلاق کے بعد بھی اسی طرح درست
ہے جس طرح دو طلاقوں کے بعد۔ پس اگر اپنے استدلال کی صحت پر آپ
کو بھروسہ ہے تو پھر اس استدلال سے جو کچھ نتائج برآمد ہوں ان سب
کو صدق دل سے قبول فرمائیے۔ یہ کیا کہ طلاق کے معاملہ میں تو قبول ہیں
پیش پیش ہیں لیکن رجوع کے معاملہ میں قبول سے صاف انکار۔
ثابت ہوا کہ یہ استدلال ہی درست نہیں۔ اگر درست ہوتا
تو اس سے یہ غلط نتیجہ کیسے برآمد ہو سکتا تھا کہ فقط ایک طلاق کے بعد رجوع
ممکن نہیں دو ہی کے بعد اجازت ہوگی۔
ہمارے بزرگ اگر یہ کہیں کہ ایک طلاق کے بعد رجوع کا جواز
ہم کسی اور خارج از قرآن دلیل سے مثلاً حدیث یا آثارِ صحابہ یا قیاس سے
نکالتے ہیں تو ہم بھی عرض کریں گے۔ کہ پھر حضور کو ہم نیاز مندوں کے اس
طرزِ عمل پر خفگی کیوں ہے کہ تین اکٹھی طلاقوں کے وقوع کا ثبوت ہم حدیث
آثار اور قیاس سے فراہم کرتے ہیں۔
علاوہ اس کے آپ کے استدلال اور آپ کے دعوے میں
ایک تضاد اور ہے۔ آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ مجلسِ واحد میں تین طلاقیں
پڑتی ہی نہیں لیکن آپ کا استدلال تقاضا کر رہا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی
بیوی سے یوں کہے کہ "تجھ پر طلاق، تجھ پر طلاق، تجھ پر طلاق" تو تینوں کو پڑ جانا
چاہیئے کیونکہ تیسری طلاق اسی وقت واقع کی گئی ہے جب دو طلاقیں ایک
کے بعد ایک کر کے ڈال دی گئیں۔ یہ عین وہی ترتیب ہے جو آپ نے قرآن
سے اخذ کی۔ اس ترتیب کے پائے جانے پر بھی آپ کا یہ کہے جانا کہ ایک

ہی طلاق پڑی واضح کرتا ہے کہ آپ کا استدلال محض ایک مغالطہ
ہے جسے آپ فریقِ ثانی کے خلاف بطورِ حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ دو
اور دو چار اگر حساب کا صحیح فارمولا ہے تو اپنے اور بیگانہ دونوں کے لئے
صحیح مانئے ایسا نہ کیجئے کہ جب وصول کریں تو چار وصول کریں اور جب
ادا کریں تو کہدیں کہ دو اور دو تین ہوتے ہیں۔!
اے بزرگانِ کرام اور مقالہ نگارانِ عظام! واحد سچائی یہ ہے
کہ قرآن طلاقوں کی ترتیب نہیں تعداد بیان کر رہا ہے۔ وہ یہ بیان کر رہا
ہے کہ کتنی طلاقوں تک مرد کو حقِ رجوع رہتا ہے اور کتنی طلاقوں کے بعد
نہیں رہتا۔ طلاق تو مرد کا حق ہے جیسے وہ نکاح کے ذریعہ حاصل کرتا
ہے۔ اسے وہ الگ الگ استعمال کرے یا دفعتاً کر ڈالے اس کی
مثال ایسی ہے جیسے آپ اپنے تین روپوں کو تین مختلف وقتوں میں صرف
کریں یا ایک ہی وقت میں ایک ہی سودا خرید ڈالیں۔ دونوں صورتوں میں
یہ روپے آپ کی ملک سے خارج ہو جائیں گے۔ فرض کیجئے آپ اپنے
جائز طور پر کمائے ہوئے ہزار روپے گناہ کے کاموں میں صرف کر دیتے
ہیں یا ان کے انار پٹاخے خرید کر گھر پھونک تماشا کر گذرتے ہیں تو یہ حلال
کام نہیں ہوا۔ اللہ اور رسول نے اس سے روکا ہے لیکن ممنوع ہونے
کی وجہ سے یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ تاخت شدہ رقم یا اس کا
کوئی حصہ اب بھی آپ کی ملک رہا۔ رقم تو گئی۔ اس پر آپ کا حقِ تصرف
بھی ختم ہوا۔ بس اسی طرح تین طلاقیں دفعتاً دے ڈالنا بے شک ممنوع
ہے۔ گناہ ہے۔ لیکن جب دے ڈالیں تو آپ کا حق ختم ہو گیا۔ یہ بات
اللہ کے رسول نے آپ ہی کی فلاح کے لئے بتائی تھی کہ طلاق میں جلد
بازی مت کرو۔ سوچ سمجھ کر دو اور ایک سے زائد دینی ہیں تو ایک
ایک ماہ بعد دو تاکہ تمہیں سوچنے سمجھنے کا اور رجوع کا موقعہ رہے۔
یہ ایسی ہی ہدایت تھی جیسے اللہ اور رسولؐ یہ ہدایت فرماتے ہیں کہ فضول خرچی
مت کرو۔ پیسہ غلط کاموں میں مت اڑاؤ۔ اب اگر آپ ہدایت کو
نظر انداز فرما کر کھٹا پٹ تین طلاقیں پھونک دیتے ہیں تو اس کا کیا مطلب
کہ رجوع یا مزید کسی طلاق کا حق آپ کے پاس پھر بھی باقی رہے۔ فضول خرچی
کی راہ میں جو پیسہ آپ نے اڑا دیا وہ تو ہاتھ سے نکل گیا۔ اب اس پر آپ کا حق کہاں
دونوں معاملات یکساں ہیں اور ان میں فرق کرنا سوائے خطا پر اصرار
کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اب آیئے قرآن کے دوسرے مقام کی طرف۔ قرآن کی ۶۵ ویں سورت الطلاق ہے اس کا آغاز ہی اس طرح پر ہوا ہے کہ "اے نبی اگر تم بیویوں کو طلاق دو تو اس طرح پر دو"۔ ظاہر ہے کہ نبی کو خطاب کر کے تمام ہی مسلمانوں کو تعلیم دی جا رہی ہے۔ ارشاد ہوا کہ طلاق اس طرح دو جس سے عدت کے شمار میں خرابی واقع نہ ہو۔ مفسرین نے اس کی تفسیر یہ بتائی کہ نہ تو حالت حیض میں دو نہ اُس طہر میں جس میں تم نے بیوی سے صحبت کر لی ہو۔ پھر زمانۂ عدت میں انھیں گھر دں سے مت نکالو وغیر ذلک۔ ان آیات کو جس کا جی چاہے کسی مترجم قرآن میں دیکھ لے۔ ہدایات دینے کے بعد اللہ فرماتا ہے۔ جو شخص اللہ کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرے گا اپنے ہی اوپر ظلم کریگا پھر فرماتا ہے۔ لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا (شاید اس کے بعد اللہ (موافقت) کی کوئی صورت پیدا کرے)

اب یہاں ہم مولانا مودودی کے الفاظ مستعار لیں گے۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"یہ دونوں فقرے ان لوگوں کے خیال کی بھی تردید کرتے ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ حیض کی حالت میں طلاق دینے یا بیک وقت تین طلاق دیدینے سے کوئی طلاق سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی اور ان لوگوں کی رائے کو بھی غلط ثابت کر دیتے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاق ایک ہی طلاق کے حکم میں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر بدعی طلاق واقع ہی نہیں ہوتی یا تین طلاق ایک ہی طلاق رجعی کے حکم میں ہیں تو یہ کہنے کی آخر ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے کہ جو اللہ کی حدود، یعنی سنت کے بتائے ہوئے طریقے کی خلاف ورزی کرے گا وہ اپنے نفس پر ظلم کرے گا، اور تم نہیں جانتے شاید اس کے بعد اللہ موافقت کی صورت پیدا کر دے؟ یہ دونوں باتیں اسی صورت میں بامعنیٰ ہو سکتی ہیں جبکہ سنت کے خلاف طلاق دینے سے واقعی کوئی نقصان ہوتا ہو جس پر آدمی کو پچھتانا پڑے اور تین طلاق بیک وقت دے بیٹھنے سے رجوع کا کوئی امکان باقی نہ رہتا ہو۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جو طلاق واقع ہی نہ ہو اس سے حدود اللہ پر کوئی تعدی نہیں ہوتی جو اپنے نفس پر ظلم قرار پائے اور جو طلاق بہرحال رجعی ہی ہو اس کے بعد تو لازماً موافقت کی صورت باقی رہتی ہے۔ پھر یہ کہنے کی کوئی حاجت نہیں ہے کہ شاید اس کے بعد اللہ موافقت کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ (تفہیم القرآن جلد پنجم ص۵۶۵)

یہ تقریر کلام شرح و تبصرہ سے بے نیاز ہے۔ لیکن ڈر ہے کہ ہمارے بعض کم تعلیم یافتہ قارئین اس کے بعض الفاظ کا مطلب نہ سمجھیں۔ اس لئے ہم کچھ وضاحت بھی کئے دیتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ یہ ہدایت فرما رہا ہے کہ اول تو تمہارے لئے یہ مناسب ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی طلاق دو تاکہ رجوع اور مصالحت کا امکان باقی رہے دوسرے ایسے اوقات میں طلاق دو کہ عدت کا شمار ٹھیک ٹھیک ہو سکے۔ مثلاً حیض میں دو گے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ عورت کی مدتِ عدت بڑھ جائے اور طہر میں جماع کے بعد دو گے تو یہ بات مشتبہ ہو جائے گی کہ عدت کا شمار طہروں یا حیضوں کے اعتبار سے ہو یا حمل کے اعتبار سے کیونکہ عین ممکن ہے اس جماع سے عورت حاملہ ہو جائے اور حاملہ کی عدت معلوم ہی ہے کہ وضع حمل ہے۔

بہرحال اس سے صاف ظاہر ہے کہ جن حالتوں میں طلاق دینے سے اللہ منع کر رہا ہے ان حالتوں میں اگر طلاق دی جائے تو وہ پڑ جائیگی نہ پڑے تو ان نقصانات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جن سے بچانے کے لئے اللہ ہدایات دے رہا ہے۔ کسی برائی سے روکنے کا مطلب ہی یہ ہوا کرتا ہے کہ اگر اس کا ارتکاب کیا گیا تو وہ اثرات پیدا کر کے رہیگی۔ قتل ناحق کو منع کیا گیا۔ نہ منع کیا جاتا اگر قانونِ فطرت یہ ہوتا کہ تلوار یا بندوق صرف ایسے ہی لوگوں کو قتل کر سکے گی جو واقعی مستوجب قتل ہوں اور جن لوگوں کو ناحق قتل کیا جا رہا ہے وہ قتل ہو ہی نہیں سکتے۔ اللہ تعالےٰ کا ہدایات دینا ہی اپنی جگہ دلیل ناطق ہے اس بات کی کہ خلافِ ہدایات طریقوں سے طلاق دینا غلط نتائج پیدا کرے گا۔ یعنی طلاق واقع ہو جائیگی یہ الگ بات ہے کہ حکم الٰہی کی نافرمانی کا گناہ سر پر رہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ (جس نے اللہ کی حدوں سے تجاوز کیا اس نے اپنے ہی نفس پر ظلم کیا) یہاں مسئلہ طلاق کے سلسلے میں یہ کلیات فرمائے گئے ہیں اور اللہ نے جو حدیں قائم کی ہیں وہ یہی تو ہیں کہ عورت بیچاری پر ایسے وقت

نہ پڑے کہ عدت کا صحیح شمار نہ ہو سکے اور ایسے انداز میں بھی نہ پڑے کہ رجوع
مصالحت کا امکان ختم ہو جائے۔ کوئی شخص سورہ بقرہ کا حوالہ دے کر زیادہ سے
یہی تو کہہ سکتا ہے کہ اللہ نے الگ الگ طلاق دینے کی ہدایت فرمائی اور حدیث کے ذریعہ
الگ الگ کی تفصیلی شکل بھی معین کی جا سکتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان ہدایات
خلاف طلاق دینے سے خود بیان قرآنی کے مطابق اللہ کی حدوں سے
تجاوز ہو جاتا ہے یعنی طلاق پڑ جاتی ہے۔ اسی بات کو صاحب تفہیم نے
الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اگر خلاف ہدایت طریقے سے طلاق واقع ہی
نہ ہو تو "اس سے حدود اللہ پر کوئی تعدی نہیں ہوتی" طلاق اگر نہ پڑے
تو تعدی ہوا ہی کہاں۔ ظلم تو ایک ایجابی شے ہے۔ نہ پڑنے کی صورت میں
تو یہی عدم اور سلب ہی سلب ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ "فقد ظلم نفسہ کا تعلق متعدد
امور سے ہے نہ صرف طلاق لغیر العدۃ سے اور صحیح مفہوم یہی ہے کہ حدود
الٰہی کی خلاف ورزی کرنے والا گنہگار اور عذاب الٰہی کا مستحق ہو گا۔ ظلم
نفس کا لفظ قرآن مجید میں بالعموم اللہ کی نافرمانی کر کے اپنے نفس کی
حق تلفی کرنے اور اسے ہلاکت میں ڈالنے کے مفہوم میں آیا ہے اور یہی مفہوم
یہاں بھی ہے۔ اس سے کسی قانونی حکم کا استخراج صحیح نہیں۔"

(یہ مولانا حامد علی کے الفاظ ہیں) ان حضرات کی پہاڑ جیسی غلطی
یہ ہے کہ صرف تین طلاقوں کے پڑنے نہ پڑنے میں بحث کرتے ہیں لیکن یہ
نہیں کرتے ہیں کہ حالت حیض میں یا اس طہر میں جس میں صحبت کر لی گئی ہو ایک
طلاق پڑ جاتی ہے۔ حالانکہ اگر تین اکٹھی خلاف سنت ہونے کی وجہ سے
نہ پڑیں تو مذکورہ دونوں حالتوں میں طلاق دینے کی مخالفت تو عین
قرآن سے اجمالاً اور قول رسول سے صریحاً طے پا چکی ہے۔ پھر یہ حضرات
شیعوں کے فرقۂ امامیہ کا مسلک کیوں قبول نہیں کر لیتے کہ کوئی طلاق
نہیں پڑے گی۔ ایسا کر لیں تو ہمیں اُن سے بحث ہی نہ رہے۔ مگر یہ حضرات
تو یہ مانتے ہیں ـــــ اور ماننے بغیر چارہ بھی نہیں ہے کہ باوجود
خلاف سنت ہونے کے طلاق پڑ جائے گی۔ اور تین طلاقوں کے وقوع
پر استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ یہ خلاف سنت ہیں اس لئے نہیں پڑیں گی
اس قسم کی معقولیت ہے!

دوسری بات یہ ہے کہ فقد ظلم نفسہ کا تعلق متعدد
امور سے بھی مگر سب سے پہلے اور قطعاً منصوص طور پر اس امر سے بہرحال
کہ ہدایت کے مطابق طلاق دو ورنہ اپنا ہی نقصان کرو گے۔ اس

جبکہ مردوں کے لئے بطور ہدایت صرف تین امور بیان ہوئے ہیں (۱) عورتوں
کو ان کی عدت کے لئے طلاق دو (۲) عدت کا ٹھیک ٹھیک شمار کرو۔
(۳) مطلقہ کو گھر سے نہ نکالو الا یہ کہ وہ فحش کی مرتکب ہو۔

ہم کب کہتے ہیں کہ آیت کا مذکورہ فقرہ ان تینوں
ہی سے متعلق نہیں ہے لیکن تینوں سے متعلق ہونے کی بنا پر یہ مطلب
آخر کیسے نکل آیا کہ نافرمانی کرو گے تو بس گنہگار تو ہو گے عمل مؤثر نہ ہو گا۔
کیا کوئی بدبخت عدت میں بے قصور عورت کو گھر سے نکالدے تو آپ یوں
کہیں گے کہ چونکہ یہ حرکت ظلم و گناہ ہے اس لئے ہم عورت کو گھر سے نکلا ہوا
نہیں مانتے! اخراج کا عمل بہرحال متحقق ہوا اسی طرح تین طلاقیں متحقق
ہو جاتی ہیں۔

اور آیت کا جو مفہوم یہ حضرات بیان کر رہے ہیں وہ سر آنکھوں
پر۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ تین اکٹھی طلاقیں دینا گناہ ہے۔ لیکن یہ اگر واقع
نہ ہوں تو حق تلفی کس کی ہوئی اور حدود الٰہی سے تجاوز کہاں ہوا۔ یہ بڑی
عجیب بات ہے کہ تین اکٹھی طلاقیں واقع کرنے کو اللہ اور رسول منع کریں
حالانکہ ان حضرات کے دعوے کے مطابق یہ واقع ہی نہ ہو سکتی ہوں تو کیا
اللہ اور رسول عبث اور لایعنی ہدایات بھی جاری کر سکتے ہیں (نعوذ
باللہ من ذلک)

خلاصہ یہ کہ صاحب تفہیم نے قرآن سے بالکل صحیح استدلال کیا
اور یہی استدلال صحابہ و ائمہ سے چلا آ رہا ہے۔

یہاں ہمیں ضمناً ایک اور بات تفہیم القرآن کے تعلق سے کہنی ہے۔
مولانا مودودی نے مفسرین سلف کی طرح مرجوح اور اختلافی اقوال
بھی ذکر کئے ہیں۔ ان ہی میں ایک یہ بھی ہے کہ "سعید بن المسیب اور بعض دوسرے
تابعین کہتے ہیں کہ جو شخص سنت کے خلاف حیض کی حالت میں طلاق دیدے
اس کی طلاق سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی۔ یہی رائے امامیہ کی ہے۔"
اس کے لئے صاحب تفہیم نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ ہماری تحقیق یہ ہے
کہ سعید بن المسیب کی طرف اس رائے کی نسبت مشکوک ہے۔ مصنف
عبدالرزاق میں ان کا مسلک یہ بیان ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص قبل از صحبت
منکوحہ کو تین طلاق دے تو تینوں ہی پڑ جائیں گی اور حلالہ کے بغیر تجدید تعلق
ممکن نہ ہوگی۔ اس روایت کی سند قوی ہے۔ (عن معمر عن قتادہ
عن سعید بن المسیب) بے شک بات غیر مدخولہ کے تعلق سے کہی گئی
ہے لیکن ایک وقت کی تین طلاقوں کے وقوع پر تو ان کا اتفاق و اعتراف

سامنے آگیا۔ اگر کسی بھی صورت میں اکٹھی تین پڑ سکتی ہیں تو کیسے مان لیں ان کے نزدیک مدخولہ پر ایک بھی نہیں پڑے گی۔ کاش حوالہ مل جاتا تو دیکھتے کہ سند کیسی ہے۔

رسول اللہؐ کے فتوے

سید الانبیاء رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مبارکہ کو اصطلاحاً "فتوی" نہیں کہا جاتا، ان کی تعلیمات دین کا تمام نامی تو "شریعت" ہے۔ لیکن یہاں ہم چونکہ صحابہ وغیرہ کے فتاوی پیش کر رہے ہیں اس لئے اسی عنوان کے تحت احادیث کو بھی لے لیتے ہیں۔ حدیثوں اور فتووں کا کافی تذکرہ دوران بحث میں تو آہی چکا ہے لیکن ضروری معلوم ہوا کہ یہ علٰحدہ علٰحدہ الگ کر کے ترتیب کے دھاگے میں پرو دیئے جائیں تاکہ جو لوگ پوری بحث نہ پڑھ سکیں وہ بھی ایک نظر میں دیکھ لیں کہ اکٹھی تین طلاقوں کو ایک قرار دینے سے نہ صرف صحابہ بلکہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بھی مخالفت کس درجے میں ہوتی ہے۔ اختصار کے خیال سے ہم صرف اردو ترجمے پر اکتفا کریں گے اور اصل کا حوالہ ساتھ ساتھ دیدیں گے تاکہ جس کا جی چاہے اصل اور ترجمہ ملالے۔

حضور رسالت مآبؐ کا فیصلہ نمبر (۱)

صحابی رسولؐ معاذ بن جبل بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی شخص بدعت کے طریقے سے ایک یا دو یا تین طلاقیں دے گا اس کی بدعت ہم اس پر لازم کر دیں گے۔ (دارقطنی ص ۴۲۲ و ۴۲۴)

طلاق کا مسنون طریقہ حضورؐ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اُس طہر کے زمانے میں دو جس میں صحبت نہ کی ہو۔ اگر تین دینی ہوں تو ایسے ہی تین طہروں میں دو۔ حالتِ حیض میں طلاق دینا بدعت ہے اور طہر میں صحبت کے بعد طلاق دینا بھی بدعت ہے۔ ایک وقت میں دو یا تین طلاقیں دینا بھی بدعت ہے۔ حضور فرماتے ہیں کہ جو شخص ہماری نصیحت کو نظر انداز کرتے ہوئے طلاق دینے میں بدعت کا طریقہ اختیار کرے گا۔ اس پر ہم اس کی بدعت لازم کر دیں گے یعنی طلاق کا حکم جاری کر دیا جائے گا۔ چنانچہ صحیح احادیث میں واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے غلطی سے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں ایک طلاق دیدی تو حضورؐ نے اسے جاری کر دیا۔ البتہ ایک طلاق چونکہ رجعی ہوتی ہے اس لئے رجوع کا بھی حکم دیدیا۔ اسی لئے تمام اہلِ سنت بھی اس پر متفق ہیں کہ چاہے حیض میں طلاق دو چاہے اُس طہر میں جس میں صحبت کرلی ہو طلاق پڑ جائے گی۔ بھلا جب کوئی شخص ایک وقت میں تین طلاقیں دے بیٹھے تو ان کے نہ پڑنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ حضورؐ جس حکم کو جاری کر دیں وہ تو عین شریعت ہے۔ تین طلاقیں اکٹھی دینا بدعت ہے اور حضورؐ انھیں جاری کر رہے ہیں پھر کیسے ہماری یہ مجال ہے کہ اس اجراء اور نفاذ کو رد کر سکیں۔ ہمارے فتوے اور رائے سے رسول اللہؐ کا حکم تو مسترد نہیں ہو سکتا۔

حضور پُر نورؐ کا فیصلہ نمبر (۲)

صحابی رسولؐ حضرت رکانہ بیان کرتے ہیں:-

انھوں نے اپنی بیوی سُہیمہ کو طلاقِ بتّہ دی پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ عرض کر کے کہ میں نے طلاقِ بتّہ دی ہے اللہ کی قسم کھائی کہ میری نیت ایک ہی طلاق کی تھی۔ حضورؐ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ کیا واقعی تم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہو؟ رکانہ نے عرض کیا بے شک یا رسول اللہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک ہی کا ارادہ تھا اب رسول اللہؐ رجوع کی اجازت مرحمت فرمادیتے ہیں۔

(یہ حدیث ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، حاکم، ابن حبان اور دارقطنی سب نے روایت کی ہے ہم نے اس کے الفاظ مشکوٰۃ شریف سے نقل کئے ہیں۔ ملاحظہ ہو باب الخلع والطلاق فصل ثانی)

تفصیلی گفتگو اس حدیث پر ہو چکی جو اس گفتگو کو نہ دیکھے وہ بھی بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ حضرت رکانہ نے تین طلاقیں نہیں دی تھیں بلکہ طلاقِ بتّہ دی تھی یعنی یا تو یوں کہا تھا کہ تجھ پر طلاق بتّہ یا لفظ طلاق جوش میں تین بار زبان سے نکال گئے تھے تین کا عدد نہیں بولا تھا۔ اب انھیں پچھتاوا ہوتا ہے غم ہوتا ہے کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ تین اکٹھی طلاقیں بھی شرعاً تین ہی ہوتی ہیں لہٰذا کیا کریں

سمجھ میں آیا کہ میں نے تین کا لفظ تو بولا نہیں کیونکہ میری نیت تین کی تھی ہی نہیں۔ چلو رسول اللہ ص سے عرض حال کریں شاید کوئی گنجائش نکلے۔ یہی سوچ کر دوڑے آتے ہیں اور قسم کھاتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول ص! میری نیت ایک ہی کی تھی حضور ص کے علم میں ہے کہ میرے صحابی کم سے کم مجھ سے جھوٹ نہیں بولتے۔ مگر بہر حال انسان ہیں۔ دو دفعہ تو قسم کھلواؤ۔ آپ پھر قسم کھلواتے ہیں۔ گنجائش اس لئے ہے کہ طلاق بتہ کے الفاظ طلاق مغلظہ کے لئے صریح نہیں۔ اگر صریحاً تین طلاقیں دی گئیں ہوتیں تو نہ تو رکانہ دوڑے آتے اور قسمیں کھاتے نہ حضور ص نیت پر قسم لیتے۔ ثابت ہوا کہ رجوع کی اجازت تین طلاقوں پر نہیں ملی ایک پر ملی اور نیت اگر تین کی ہوتی تو تین ہی پڑ جاتیں رجوع کی اجازت نہ ملتی۔ اگر یہ نہ مانا جائے تو نعوذ باللہ یہ ماننا ہوگا کہ صحابی کا قسم کھانا اور رسول اللہ کا دوبارہ قسم لینا فضول ہی تھا۔ کارآمد تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب نیت پر فیصلے کا مدار ہو۔

رسول اللہ کا فیصلہ نمبر (۳)

حضرت عمر کے صاحبزادے عبداللہ اپنی بیوی کو غلطی سے حالت حیض میں ایک طلاق دے بیٹھتے ہیں۔ حضور ص اس پر ناراض ہو کر رجوع کا حکم صادر فرماتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں عبداللہ ابن عمر حضور ص سے دریافت کرتے ہیں۔

> یا رسول اللہ! اگر میں نے تین طلاقیں دی ہوتیں تو فرمائیے کہ کیا رجوع کرنا میرے لئے جائز ہوتا؟ حضور ص نے جواب دیا نہیں۔ اس صورت میں بیوی تجھ سے جدا ہو جاتی اور تیرا یہ فعل (تین طلاقیں ایک دم واقع کرنا) گناہ ہوتا (دارقطنی، بیہقی، طبرانی مصنف ابو بکر ابن ابی شیبہ۔ مصنف عبدالرزاق۔ فتح الباری، تفہیم القرآن۔ الگ الگ جلد اور صفحات کا حوالہ اس لئے ضروری نہیں کہ سبھی محوّلہ کتابوں میں طلاق کی بحث ہر شخص نکال سکتا ہے)

بالکل واضح ہے کہ ایک ہی وقت کی تین طلاقوں کے بارے میں سوال و جواب ہوا ہے۔ اگر طریق سنت سے دی ہوئی طلاقوں کی بات ہوتی تو حضور ص یوں کہتے کہ یہ طریقہ خدا کی نافرمانی اور گناہ کا موجب ہوتا۔ جو حضرات اس ثابت شدہ حدیث کے بارے میں قیل و قال کرتے ہیں وہ سوائے اپنی بے خبری یا کج فکری ظاہر کرنے کے اور کوئی خدمت انجام نہیں دیتے۔ مولانا حامد علی صاحب نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کی حیثیت ہم دلائل سے واضح کر آئے ہیں۔

رسول اللہ کا فیصلہ نمبر (۴)

> حضرت عائشہ رض بیان فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں۔ مطلقہ نے کسی اور شخص سے نکاح کر لیا۔ اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ صرف نکاح سے یہ پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہو سکتی، جب تک کہ دوسرا شوہر اس سے اسی طرح ہم بستر نہ ہولے جس طرح پہلا شوہر ہو چکا ہے۔
>
> بخاری شریف۔ کتاب الطلاق۔ باب من جاز الطلاق الثلث
>
> مسلم شریف۔ کتاب النکاح۔ باب لا تحل المطلقہ ثلاثاً لمطلقہا

آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ جب کوئی شخص ایک ساتھ تین طلاقیں دے ڈالتا تھا تو اسے ان ہی الفاظ میں بیان کیا جاتا تھا کہ "فلاں شخص نے تین طلاقیں دیں" ایسا کوئی لفظ بولنا ضروری نہیں سمجھتے تھے جس سے واضح ہو کہ تین الگ الگ دی گئیں یا ایک ساتھ۔ ہاں الگ الگ اوقات کی طلاقوں کا بیان ہوتا تو الفاظ سے اس کی طرف اشارہ کرتے۔ اس طرح بلا ریب یہاں بھی واقعہ یہی بیان ہو رہا ہے کہ کسی شخص نے بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دی تھیں اور حضور ص نے انھیں واقع مانا بخاری و مسلم کی روایات کا پایہ تو سب کو معلوم ہی ہے۔ جس روایت پر یہ دونوں استاد فن متفق ہوں وہ صحت کے درجۂ اعلیٰ میں سمجھی جاتی ہے۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں اور عینی عمدۃ القاری میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے جتلا بھی دیتے ہیں کہ تین طلاقوں سے مراد یہاں ایک ہی وقت کی تین طلاقیں ہیں۔ اس احتمال کے لئے کوئی قرینہ نہیں کہ ممکن ہے یہ تینوں الگ الگ وقتوں میں دی گئی ہوں اس طرح بات بالکل صاف ہو گئی کہ حضور کا فیصلہ اکٹھی تین طلاقوں کے تین ہی ہونے کا تھا نہ کہ ایک ہونے کا۔

رسول اللہ کا فیصلہ نمبر (۵)

عامر الشعبی کہتے ہیں کہ میں نے فاطمہ بنت قیس سے گذارش کی کہ اپنی طلاق کا واقعہ مجھ سے بیان کیجئے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میرے شوہر نے یمن جاتے وقت مجھے تین طلاقیں دی تھیں اور رسول اللہ نے انھیں تین ہی قرار دیا تھا۔

(ابن ماجہ:۔ باب من طلق ثلاثا فی مجلس واحد)

یہ حدیث مسلم شریف میں ۲۴ سندوں سے بہ الفاظ مختلف روایت ہوئی ہے۔ حاصل سب کا یہی ہے کہ فاطمہ بنت قیس کو اکٹھی تین طلاقیں دی گئیں اور حضورؐ نے انھیں تین ہی مانا۔ ۲۴ میں دو روائتیں ایسی ہیں جن سے ظاہر بینوں اور کم علموں کو دھوکا لگتا ہے کہ تینوں طلاقیں اکٹھی نہیں دی گئی تھیں لیکن ہم تفصیل سے بتا آئے ہیں کہ یہ غلط فہمی ہے مسند احمد میں لفظاً بھی یہ وضاحت ہے کہ تین طلاقیں اکٹھی دی گئی تھیں۔ دار قطنی کی روایت میں بھی یہی وضاحت ہے۔ مفصل گفتگو ہم اس پر پیچھے کر آئے۔ "نہ مانوں" کی گردان کا تو کوئی علاج نہیں۔

رسول اللہ کا فیصلہ نمبر (۶)

صحابی رسول حضرت عبادہ بن صامت بیان کرتے ہیں کہ ان کے باپ نے اپنی زوجہ کو ہزار طلاقیں دے دیں پھر حضور کی خدمت میں آکر مسئلہ پوچھا تو حضورؐ نے جواب دیا کہ تین تو عورت پر پڑ گئیں باقی ۹۹۷ ظلم کے خانے میں رکھی گئیں۔ اللہ چاہے تو اس ظلم کو معاف کرے چاہے تو عذاب دے۔

(مصنف عبد الرزاق۔ دار قطنی) دار قطنی میں ہے طلق بعض آبائی۔ ابن قیم نے مصنف سے طلق جدی... فانطلق ابی نقل کیا ہے اور ابن الہمام نے مصنف ہی سے ان اباہ طلق فانطلق عبادۃ نقل کیا ہے۔ مولانا مودودی بھی ایسا ہی نقل کرتے ہیں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ واقعہ عبادہ بن صامت کے والد کا ہوگا۔ بہر حال معاملہ بالکل ظاہر ہے کہ ایکدم ہزار طلاقیں دی گئیں تو حضورؐ نے تین کو واقع مان لیا اور فاضل کو مسخر قرار دیا جو گناہ ہے۔

رسول اللہ کا فیصلہ نمبر (۷)

حضرت علیؓ کے صاحبزادے حضرت حسنؓ نے اپنی بیوی عائشہ خثعمیہ کو ان لفظوں میں طلاق دی اذھبی فانت طالق ثلاثا (چلی جا تجھ پر تین طلاقیں ہیں) عائشہ چلی گئی بعد میں حضرت حسن کے علم میں آیا کہ عائشہ کو ان سے چھوٹ جانے کا بڑا غم ہے تو آپ شدت اثر سے رو پڑے اور حسرت سے کہا۔

اگر اپنے والد ماجد علیؓ کے ذریعہ اپنے جد امجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ مجھ تک نہ پہنچا ہوتا کہ جو بھی آدمی اپنی زوجہ کو اکٹھی یا الگ الگ تین طلاقیں دے وہ بغیر حلالہ کے اسے پھر نکاح میں نہیں لاسکتا تو یقیناً میں خثعمیہ کو لوٹا لیتا۔ (دار قطنی ص۴۳۷)

اندازہ کیجئے حضرت علیؓ اور حسنؓ سے زیادہ قابل اعتماد راوی کہاں ملیں گے۔ نواسہ اپنے نانا صلے اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ و فتوی نقل کر رہا ہے۔ اگر بعض حضرات کے اس دعوے میں ذرا بھی صداقت ہوتی کہ زمانِ رسالت میں تین اکٹھی طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں تو یہ حدیث ہی آپ کے سامنے کب آتی۔

رسول اللہ کا فیصلہ نمبر (۸)

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا جب کسی شخص نے اپنی زوجہ کو تین طلاقیں دے دیں تو اب وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ مطلقہ کسی اور سے نکاح کر کے ہمبستر نہ ہو لے۔ (دار قطنی)

گویا بارگاہِ رسالت سے ایک عام ضابطۂ شرعی کا اعلان ہو گیا۔ تین طلاقیں کسی بھی شکل میں ہوں ایک ساتھ یا الگ الگ حضورؐ نے کوئی قید نہیں لگائی۔ قید لگانے والے سوچیں کہ انھیں کلام وحی میں اضافے کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا۔ اس طرح کی روایات کی صداقت میں جس طرح کی باتیں کی جاتی ہیں ان پر ہم گفتگو کر آئے اور آئندہ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ ایک دو مبہم روایات کی بات ہوتی تو گمان کیا جاسکتا تھا کہ شک کی گنجائش موجود ہے لیکن اتنی روایات اور پھر صحابہ کے فتوے اور جملہ معروف محدثین و فقہا اور مجتہدین و اساتذہ کا اتفاق ایسی گنجائش

کی نفی کرتاہے۔ مقابلہ میں فریق ثانی جو مواد پیش کر رہا ہے اس کا
حال آپ نے دیکھ ہی لیا حدیث کی حد تک تو اس کے پاس بس وہی
ایک ابن عباس والی روایت ہے جسکے مضمون میں صریحاً اضطراب
اور ٹکراؤ ہے۔ پھر حضرت عباسؓ کا اس کے خلاف فتویٰ دینا تو گویا
عام محاورت کے اعتبار سے مدعی سست گواہ چست والا مضمون
ہے یعنی خود ابن عباس تین کو تین مان رہے ہیں۔ فتوے دے رہے
ہیں مگر فریق ثانی ان کی روایت کو دانتوں سے پکڑے بیٹھا ہے حالانکہ
ابن عباس کے تمام شاگردان کا یہی مسلک بیان کرتے ہیں کہ تین تین
ہوتی ہیں ایک نہیں۔ فقط ایک شاگرد بعض مواقع پر اس کے خلاف
حکایت کرگزرتے ہیں۔ پھر ان ہی کی دوسری حکایات و روایت سے
یہ اندازہ ہوتاہے کہ یہی حکایت کا تعلق عام بیویوں سے نہیں بلکہ ان بیویوں
سے تھا جنھیں صحبت سے قبل طلاق دیدی گئی ہو۔ لہٰذا انھیں غلط گو
کہنے کے بجائے یہ کھلی گنجائش نکل آتی ہے کہ فریق مذکور کو کم فہمی یا غلط فہمی
کا مرتکب سمجھا جائے۔ اس طرح اجماع امت کی بنیاد بننے والی متعدد
احادیث کے بالمقابل اس فریق کے پاس ایک بھی حدیث ایسی نہیں
رہتی جو اس کے دعوے اور مسلک کی تائید کرتی ہو۔ اسی لئے اس کا
دعویٰ التفات کا مستحق نہیں اور اجماع میں اس دعوے سے کوئی رخنہ
نہیں پڑا۔ واضح رہے کہ ہم سب کے شیخ حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ
بھی ازالۃ الخفاء میں مذکورہ ابن عباس والی روایت کو طاؤس
والی سند سے "اشکال قوی" کا مورد گردانتے ہیں اور اس کے سلسلہ
میں وہ علماء متبحرین کی ایسی تاویلیں نقل کرتے ہیں جو مسلک جمہور سے
مطابقت اور فریق ثانی کے مسلک سے منازعت و مخالفت رکھتی ہیں
(اوجز المسالک ص۳۳)

صحابہؓ کے فتوے

فتویٰ عبد اللہ ابن مسعودؓ (۱)

"ایک شخص حضرت عبد اللہ ابن مسعود کی خدمت میں
حاضر ہوا اور کہا کہ میں نے اپنی زوجہ کو آٹھ طلاقیں دے
ڈالی ہیں۔ ابن مسعود نے دریافت کیا کہ دیگر حضرات
اس بارے میں کیا کہہ رہے ہیں؟ اس شخص نے جواب
دیا کہ وہ تو کہتے ہیں کہ تمہاری بیوی تمہارے ہاتھ سے
گئی! ابن مسعود بولے لوگوں نے صحیح کہا۔ بات اسی
طرح ہے۔"

(موطا امام مالک) امام مالک نے حسب عادت یہاں کوئی سند
بیان نہیں کی لیکن ابوبکر ابن ابی شیبہ اور بیہقی اور عبد الرزاق نے اسے
حضرت علقمہ کے واسطے بیان کیا ہے۔ امام مالک کی روایت میں ابن مسعود
نے فتوے کا ایک اصول بھی بیان کیا ہے کہ کوئی شخص اگر غلط طریقہ
اختیار کرکے اپنے آپ کو مخمصے اور شبہات کی دلدل میں پھنسائے تو
اس کے نتائج خود اسی کو بھگتنے ہوں گے مفتی کا منصب نہیں کہ خود کو ان
میں پھنسائے اسے تو ظاہر کے مطابق فتویٰ دینا چاہیئے (ومن لبّس
علی نفسہ لبسا جعلنا لبستہ بہ لاتلبسوا علی انفسکم
ونتحملہ عنکم۔

ابن مسعودؓ کے جواب سے یہ بھی نشاندہی ہو رہی ہے کہ اس وقت
کے دیگر اہل افتاء بھی تین کے وقوع ہی کا فتویٰ دیتے تھے۔

فتویٰ عبد اللہ ابن عمرؓ (۲)

حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ عبد اللہ ابن عمر سے جب کسی ایسے
شخص کے بارے میں سوال کیا جاتا جس نے بیوی کو تین طلاقیں دیدی ہوں
تو وہ جواب دیا کرتے کہ اگر تم ایک یا دو طلاقیں دو تو یہ وہ معاملہ ہے جس میں
رسول اللہ نے مجھے رجوع کا حکم دیا تھا لیکن اگر تین دو تو عورت حرام
ہو جائے گی اور حلالے کے بغیر حلال نہ ہوگی۔

(بخاری شریف۔ کتاب الطلاق۔ باب من قال لامرأتہ انت علی حرام)

مسلم شریف میں مزید الفاظ یہ ہیں۔

"تین طلاق سے عورت جدا ہو جائے گی اور تم گنہگار ہوگے
کیونکہ تم نے اُس طریقہ سے فرار کیا جسکی ہدایت اللہ
نے عورتوں کو طلاق دینے کے معاملہ میں دی تھی۔"

ابن ابی شیبہ اور دار قطنی بھی اس ٹکڑے کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے
ہیں (فتح القدیر مع ہدایہ جلد ۲ ص۱۴۳) دار قطنی میں یہ روایت چار مختلف
سندوں سے موجود ہے۔

اگر مسلم اور دیگر کتب مذکورہ کے اس زائد ٹکڑے کو ملحوظ رکھا جائے

اور نہ ملحوظ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں تو یہ ایک بالکل سامنے کی بات بن جاتی ہے کہ حضرت ابن عمر کے بیان کے مطابق رسول اللہ ان تین طلاقوں کا بیان فرما رہے ہیں جو غیر مسنون طریقہ پر وقت واحد میں دیدی جائیں۔ اگر مسنون طریقہ پر دی گئیں تو خدا کی نافرمانی اور گناہ کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

لیکن غور کیجئے تو خود بخاری والا متن بھی اسی صورت واقعہ پر صاف دلالت کر رہا ہے۔ اس لئے کہ الفاظ یہ ہیں لو طلقت مرۃ او مرتین (اگر تم نے ایک یا دو طلاقیں دی ہیں تو یہ وہ معاملہ ہے جس میں رسول اللہ نے مجھے رجعت کا حکم دیا تھا) بہت سے بہت اس کا ترجمہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ "اگر تم نے ایک بار یا دو بار طلاق دی ہے" ورنہ ترجمہ کر کے کہا جا سکتا ہے کہ یہ فقرہ مختلف وقتوں کی طلاقوں کے لئے ہے لہٰذا جب اس کے بعد ابن عمر یہ کہتے ہیں کہ اگر "تیسری طلاق دی" تو ان کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ "اگر تیسرے وقت میں تیسری طلاق دی"۔ گویا حکم رسول کا تعلق تین الگ الگ وقتوں میں دی ہوئی طلاقوں سے ہو گیا ایک وقت کی طلاقوں سے نہیں۔

چنانچہ مولانا حامد علی صاحب نے دوسروں کی نقل میں یہی بات لکھی بھی ہے۔ ان کے الفاظ ہیں کہ "طلقتہا ثلثا کا مفہوم تین بار طلاق بھی ہو سکتا ہے"۔

لیکن ہم افسوس کے ساتھ کہیں گے کہ اصلاً جس نے بھی یہ احتمال آفرینی کی وہ یا تو عربی زبان جانتا ہی نہیں یا جان بوجھ کر مغالطہ دے رہا ہے۔ حدیث کا لفظ ہے ثلٰث نہ کہ ثالث۔ حضرت ابن عمر کا مفہوم یہی ہوتا کہ دو وقتوں میں دو طلاقیں دینے کے بعد تیسرے وقت میں تیسری طلاق دو گے تو ان کے الفاظ یوں ہوتے فان طلقتہا ثالثا دو کے بعد پھر اگر تیسری دو گے لیکن وہ "تیسری" نہیں بلکہ "تین" (ثلٰث) کہہ رہے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ اوقات کا وہ فرق ان کے پیش نظر نہیں جسے زبردستی ان کے منہ میں ڈالا جا رہا ہے۔

اللہ کے لئے آزادی

حضرت بلال رضی اللہ عنہ خلیفۂ رسولؐ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مومن کا سب سے افضل عمل اللہ کے راستے میں جہاد ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ اے بلالؓ تم چاہتے کیا ہو؟ حضرت بلالؓ نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اللہ کے راستے میں جہاد کروں، یہاں تک کہ شہید ہو جاؤں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ یہاں اذان کون دے گا۔ حضرت بلالؓ نے کہا کہ (ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے) میں رسول اللہؐ کے بعد اب اذان نہیں دوں گا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ نہیں تم یہیں رہو اور اذان دیا کرو۔ حضرت بلالؓ نے کہا کہ اگر آپ نے اسی لئے مجھے آزاد کیا ہے کہ میں آپ کا ہو جاؤں تو ایسا ہی ہو گا۔ اور اگر آپ نے اللہ کے لئے آزاد کیا ہے تو مجھے اللہ کیلئے چھوڑ دیجئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میں نے تم کو اللہ کے لئے آزاد کیا اے بلالؓ!

اس کے بعد حضرت بلالؓ شام کی جانب کوچ کر گئے اور ان کی آخری اذانیں ان ایام میں ہوئیں جب حضرت عمرؓ شام گئے تھے۔ تو ان سے اذان کی درخواست کی گئی تو انھوں نے اذان دی۔ اس پر صحابہ کرامؓ اس طرح روئے کہ ایسا کبھی نہیں روئے تھے اور حضرت عمرؓ سب سے زیادہ روئے۔

حضرت بلالؓ ملک شام میں انتقال فرما گئے اور دمشق کی سرزمین میں دفن ہوئے۔

تین اور تیسری کا فرق واضح ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چل گیا کہ مرۃً
اور مرتین کہنے سے ان کی مراد الگ الگ اوقات نہیں بلکہ محاورے
کے مطابق یہ الفاظ واحد اور اثنین (ایک اور دو) کے مفہوم میں
بولے گئے ہیں۔

فتویٰ حضرت علیؓ (۳)

وکیع اعمش سے اور اعمش حبیب سے اور حبیب ابو ثابت
سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا
کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دے دی ہیں۔ حضرت علیؓ نے
جواب دیا کہ یہ بیوی تین طلاقوں کے ذریعہ تجھ سے جدا ہوگئی اور
بقیہ کو اپنی دوسری بیویوں میں بانٹ دے (۱) فتح القدیر
معہ ہدایہ جلد ۲ ص۳۳۰ کتاب الطلاق (۲) تفہیم القرآن
جلد ۵ ص۳۳۵ بحوالہ سنن وکیع بن الجراح (۳) سنن کبریٰ جلد ہفتم
ص۳۳۵ (۴) شرح معانی الآثار جلد ۲ ص۳۴)

ابراہیم محمد بن شریک بن ابی نمر سے روایت کرتے ہیں کہ ایک
شخص حضرت علیؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے اپنی بیوی کو عرفج
کے درختوں کے برابر طلاقیں دے دی ہیں حضرت علیؓ نے فرمایا ان
میں سے تین لے لو باقی کو چھوڑ دو۔ (مصنف عبدالرزاق)

مصنف عبدالرزاق ہی میں تین ممتاز صحابہ علیؓ، ابن مسعود
اور زید بن ثابت کا یہ فتویٰ نقل کیا گیا ہے کہ اگر صحبت سے قبل
منکوحہ کو تین طلاقیں عدد کی صراحت کے ساتھ بیک لفظ دے دیں
(یعنی تجھ پر تین طلاق) تو تینوں ہی پڑ جائیں گی اور حلالہ کے بغیر یہ عورت
دوبارہ زوجیت میں نہ آسکے گی۔ اور اگر الگ الگ فقروں میں تین دی
ہیں تو پہلی ہی طلاق سے وہ جدا ہو جائے گی اور بقیہ دو بیکار جائیں گی
اب گویا حلالہ کے بغیر بھی دوبارہ اس سے نکاح ممکن ہے۔

ہم بتا ہی چکے ہیں کہ غیر مدخولہ (جس سے صحبت نہ ہوئی ہو) چونکہ
بحکم شریعت ایک ہی طلاق سے جدا ہو جاتی ہے حق رجوع مرد کو نہیں
رہتا اس لئے مزید طلاقیں اب اس پر پڑیں گی کیسے۔ طلاق تو بیوی
پر پڑتی ہے۔ ایک ہی طلاق نے اسے زوجیت سے نکال دیا۔ البتہ
اکٹھی تین دیں تو دیکھ لیجئے تین جلیل القدر صحابی جن میں حضرت علیؓ
بھی شامل ہیں، یہی کہہ رہے ہیں کہ تینوں پڑ جائیں گی۔ اس طرح
متعدد روایات سے حضرت علیؓ کا مسلک و فتویٰ معلوم ہو جانے
کے بعد اس کی گنجائش نہیں رہتی کہ اگر سندوں میں کسی طرح کا ضعف
بھی ہو تو انھیں رد کر دیا جائے۔ متعدد ضعیف روایات ایک
دوسرے کو تقویت دیتی ہیں اور جب یہی مضمون قوی روایات اور قرائن
اور دلائل عقلیہ سے ثابت ہو رہا ہو تو اصولِ فن کے مطابق ان تقویت
یافتہ روایات سے شہادت اور کمک کا کام لیا جاسکتا ہے۔

فتویٰ حضرت عثمانؓ (۴)

معاویہ بن ابی یحییٰ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عثمانؓ
کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دیدی ہیں
آپ نے جواب دیا بانت منک بثلاث (تیری بیوی تین طلاقوں کے
ذریعہ تجھ سے جدا ہوگئی)

(۱) فتح القدیر مع ہدایہ جلد ۳ ص۳۳۰ (۲) تفہیم القرآن
جلد ۵ ص۳۳۵ بحوالہ سنن وکیع بن الجراح)

مصنف عبدالرزاق میں یہی واقعہ دوسری سند سے
موجود ہے (قال ابراھیم واخبرنی ابوالحویرث عن عثمان بن حفاظ
ابن حزم نے المحلی ایک اور سند سے (وکیع عن جعفر بن برقان عن
معاویۃ بن ابی یحییٰ) اسی واقعہ کو بیان کیا (جلد ۱۰ ص۱۷۲)

مصنف عبدالرزاق میں ایک اور واقعہ دو ایسی سندوں سے
بیان کیا گیا ہے جن میں ایک سند تو اعلیٰ درجہ کی ہے۔ اس واقعے سے بھی
ثابت ہے کہ حضرت عثمان بلا کسی ریب و تامل کے یہی یقین رکھتے تھے اور
اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے کہ جتنی بھی طلاقیں شوہر کے قبضے میں ہیں وہ
اگر ایک ساتھ دیدی جائیں تو واقع ہو جاتی ہیں۔ اعلیٰ ترین سند یہ ہے
عبدالرزاق عن معمر عن الزھری عن ابن المسیب قال:۔ قضیٰ
عثمان الخ کیا کسی منصف مزاج ماہر فن میں جرأت ہے کہ ان میں سے
ایک بھی راوی پر انگشت نمائی کرسکے۔ یہ سب صحاح ستہ کے راوی
ہیں۔ جن لوگوں کی عادت یہ بن گئی ہے کہ اپنے خلاف پڑنے والی حدیث
کو ضعیف ثابت کرنے کے لئے راویوں کے خلاف ایک آدھ مجمل جرح
اٹھا لاتے ہیں اور تعدیل کو دبا جاتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ یہ شوشہ
چھوڑ سکتے ہیں کہ عبدالرزاق میں تشیع تھا۔ بلکہ یہ بھی بعید نہیں کہ وہ
یہ کہہ بیٹھیں کہ عبدالرزاق شیعہ تھے۔ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ اگر

کتبِ فن میں کبھی راوی کے بارے میں کسی بزرگ نے یہ کہہ دیا کہ فلاں راوی میں فی الجملہ تشیع تھا۔ یا تشیع کی بو باس تھی۔ تو بعض فنکاروں نے بالکل غلط طور پر اس کا ترجمہ پیش فرما دیا کہ فلاں راوی شیعہ تھا حالانکہ اساتذۂ فن نے بار بار جتلایا ہے کہ خبردار اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لینا شیعہ ہونا اور بات ہے اور فی الجملہ تشیع ہونا اور بات ہے چنانچہ بعض حضرات نے امام ابوحنیفہ تک میں تشیع کا قول کر دیا ہے۔

عبدالرزاق حضرت معمر کے اتیا زی شان رکھنے والے جلیل القدر شاگرد ہیں۔ معمر کی روایات ان سے زیادہ شاید ہی کسی کو یاد ہوں۔ امام اوزاعی امام ابن جریج اور امام ثوری سے انھوں نے کافی استفادہ کیا ہے۔ ان کے تشیع کا صدود اربعہ ان کے اس قول سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مجھ میں یہ جراءت نہیں کہ حضرت علی کو حضرت صدیق و حضرت عمر پر ترجیح دوں۔

رہے معمر زہری اور ابن المسیب تو یہ تو بخاری و مسلم سب کے یہاں اعلیٰ درجۂ ثقاہت پر فائز ہیں۔ اس طرح حضرت عثمان کا فتویٰ اور مسلکِ ثبوت کے رخ سے قطعاً بے غبار ہو جاتا ہے۔

فتویٰ حضرت عمرؓ (۵)

اگرچہ سیدنا حضرت عمر کے فتوے کی نقل ضروری نہیں تھی کیونکہ ان کے بارے میں فریق ثانی بھی تسلیم کرتا ہے کہ انھوں نے تین طلاقوں کے نفاذ کا آرڈر جاری فرمایا لیکن اس غلط فہمی کی اصلاح کے لئے کہ یہ آرڈر سیاسی و سرکاری تھا فتویٰ نہ تھا طحاوی میں ان کا یہ فتویٰ موجود ہے کہ صحبت سے قبل منکوحہ کو تین طلاقیں دیدی جائیں تو تینوں پڑ جاتی ہیں۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ تین پڑنے کی بات "سرکاری" نہیں شرعی ہے پھر دار قطنی نے جو روایت نقل کی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ صحبت کی ہو نہ کی ہو دونوں صورتوں میں حضرت عمر تین کے وقوع کا فتویٰ دیتے ہیں۔

علاوہ ازیں حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعری کو جو خط تحریر فرمایا تھا اس میں یہ الفاظ ہیں۔ جس نے تین بار انت طالق کہا تو تینوں طلاقیں ہیں (کما اخرجہ ابونعیم۔ سعید بن منصور)

فتویٰ حضرت عمرو بن العاصؓ (۶)

کسی شخص نے حضرت عمروؓ سے دریافت کیا کہ اگر کوئی آدمی صحبت سے پہلے اپنی منکوحہ کو تین طلاقیں دے ڈالے تو اس کا حکم شرعی کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ ایک طلاق دینے سے تو منکوحہ بائنہ ہو جائے گی (یعنی ایسی جدا کہ رجوع نہیں کر سکتے البتہ دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں بشرطیکہ عورت راضی ہو) اور تین طلاقوں سے ایسی حرام ہو جائے گی کہ حلالے کے بغیر حلال نہ ہوگی۔

(موطا امام مالک۔ طحاوی۔ مباحث طلاق)

سنن ابوداؤد میں بھی اور سنن سعید بن منصور میں بھی حضرت عمرو کے ساتھ ساتھ علاوہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا فتویٰ نقل کیا گیا ہے کہ غیر مدخولہ پر ڈالی گئیں تین طلاقوں کو وہ مغلظہ قرار دیتے تھے کہ حلالے کے بغیر حلال ہی نہ ہو۔

سعید بن منصور کا نام چونکہ عام طور پر شہرت یافتہ نہیں اس لئے چند تعارفی الفاظ حوالۂ قلم ہیں۔

یہ پہلی صدی ہجری کے علماء میں ہیں ۲۲۹ھ میں کہ میں انتقال فرمایا۔ پورا نام ہے سعید بن منصور بن شعبہ مروزی کنیت ہے ابوعثمان۔ بعض دیگر محدثین کے علاوہ امام مالک سے استفادہ کیا۔ امام مسلم امام ابوداؤد اور امام احمد جیسے اکابر سے کافی روایت کرتے ہیں۔ ان پر جرح بھی یقیناً کی گئی ہیں لیکن تعدیل بھی کی گئی ہے۔ امام احمد اور ابوحاتم جیسے اساتذہ ان کی توثیق کرتے ہیں ان کی بے شمار روایات "ثلاثی" ہیں یعنی محض تین واسطے۔ ایسی سندیں محدثین کے یہاں بڑی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔

اس تفصیل کا منشاء یہ نہیں کہ مروزی پر کلام نہیں کیا جا سکتا مگر یہ منشا ضرور ہے کہ جب دیگر قوی شواہد موجود ہیں تو ان کی روایات نظر انداز بھی نہیں کی جا سکتیں۔ امام مالک سے بڑھ کر شاہد اور مؤید اور کون چاہیئے۔

فتویٰ حضرت ابن عباسؓ (۷)

(۱) ابوداؤد شریف میں "تطلیقات ثلثہ" کے زیر عنوان حضرت ابن عباسؓ کا ایک تفصیلی ارشاد نقل کیا گیا ہے۔ انھوں نے آیت قرآنی والمطلقات یتربصن الآیۃ کی شانِ نزول بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس آیت کے نزول سے پہلے یہ تھا کہ کوئی شخص چاہے تین ہی طلاق دے چکا ہو مگر وہ رجعت کا حق رکھتا تھا۔

اس آیت نے قانونِ شرعی کی اطلاع دی کہ طلاقیں تو بس دو ہی ہیں جن سے رجوع ہو سکتا ہے۔ تین سے رجوع نہیں ہو سکتا۔

قابلِ غور یہ ہے کہ آیاتِ طلاق نازل ہونے سے قبل تو اس کی بحث ہی نہ تھی کہ طلاقِ سنت کیا ہے اور طلاقِ بدعی کیا ہے۔ یہ سب تو بعد میں سامنے آیا کہ تین الگ الگ طہروں میں طلاقیں دینی چاہئیں۔ لہٰذا ابن عباس جس زمانے کا حال بیان کر رہے ہیں اس وقت دو تین چار جتنی بھی طلاقیں دی جاتی ہوں گی الگ الگ وقتوں میں بھی دی جاتی ہوں گی اور بیک وقت بھی۔ ایسی کوئی وجہ موجود نہ تھی کہ ایک ہی وقت میں متعدد طلاقیں دے ڈالنے کو آدمی گناہ سمجھے اب اگر ابن عباس یہ کہتے ہیں کہ آیت نے اس طریقے کو منسوخ کر کے حقِ رجعت دو طلاقوں میں محدود کر دیا اور تین طلاقیں مغلظہ بن گئیں تو گویا وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ تین طلاقیں خواہ الگ الگ وقتوں میں دی گئی ہوں یا ایک ہی وقت میں قرآن نے حقِ رجعت منسوخ کر دیا۔ یہ مطلب کسی طرح نہیں نکالا جا سکتا کہ نسخ صرف اس صورت میں ہے جب الگ الگ وقتوں میں دی گئی ہوں۔

(۲) ابوداؤد ہی میں واقعہ بیان ہوا ہے کہ ایک شخص نے بیان کیا کہ وہ بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے آیا ہے۔ ابن عباس چپ رہے۔ اس نے دوبارہ کہا۔ ابن عباس ناخوشگوار لہجے میں بولے تم میں سے ایک شخص حماقت کے گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے اور چیختا ہے کہ اے ابن عباس اے ابن عباس! حالانکہ اللہ نے پہلے ہی فرما دیا ہے کہ جو شخص اللہ سے ڈرے گا کوئی نہ کوئی راہ کھل جائے گی۔ تو اللہ سے نہیں ڈرا اب میرے پاس تیرے لئے کوئی گنجائش کہاں دھری ہے۔ تو نے خدا کی نافرمانی کی اور تیری بیوی تجھ سے جدا ہو گئی۔ (تفسیر ابن جریر میں بھی یہ روایت موجود ہے)

(۳) کسی نے بیوی کو سو طلاقیں ٹھونک دیں اور ابن عباس سے اس کے متعلق فتویٰ پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ تین طلاقوں سے تو عورت جدا ہو گئی اور باقی موجبِ عذاب بنیں کہ ان کے ذریعہ اللہ سے تمسخر کیا گیا۔

(موطا امام مالک۔ دارقطنی۔ طحاوی۔ بحوث طلاق۔)

اسے ابن عباس کے چھ شاگرد نقل کرتے ہیں۔

(۴) طحاوی ایک اور واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک بھتیجے صاحب نے چچا کے بارے میں ابن عباس کو بتایا کہ وہ دفعتاً تین طلاقیں دے بیٹھے ہیں۔ ابن عباس نے جواب دیا کہ تیرے چچا نے خدا کی حکم عدولی کی اور شیطان کا پیرو بنا لہٰذا اللہ نے اس کے لئے کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑا۔

(۵) کسی صاحب نے صحبت سے قبل ہی منکوحہ کو تین طلاقیں جھاڑ دیں پھر جی چاہا کہ دوبارہ نکاح کر لیں۔ اب فتویٰ پوچھنے نکلتے ہیں۔ واقعہ کے راوی ابن بکیر بیان کرتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عباس کے پاس گیا۔ دونوں صحابیوں کا جواب ایک ہی تھا۔

"اے شخص تو نے خود ہی اس گنجائش کو ختم کر دیا ہے جو تجھے حاصل تھی۔"

یعنی بجائے ایک کے تین دے بیٹھا۔ اب کیا پوچھتا پھرتا ہے۔

(موطا امام مالک۔ سنن ابی داؤد)

فتویٰ حضرت ابوہریرہؓ (۸)

اوپر کی روایت نمبر ۵ سے اور ابن عمرو بن العاص کے فتوے کے ہم رشتہ ابوہریرہؓ کا فتویٰ علم میں آ چکا۔ مزید توثیق موطا اور طحاوی میں بیان شدہ روایت سے ہوتی ہے جو اسی کے مثل ہے۔

فتویٰ حضرت انسؓ (۹)

ایک وقت میں دی گئی تین طلاقوں کے سلسلہ میں حضرت انس بھی یہی فتویٰ دیتے تھے کہ اب حلالہ کے بغیر کوئی صورت تجدیدِ تعلق کی نہیں (طحاوی)

فتویٰ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ (۱۰)

امام بیہقی اپنی سنن میں سند کے ساتھ قیس بن ابی عاصم کا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ میرے سامنے ایک شخص نے مغیرہ سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا جس نے فرطِ غضب میں بیوی کو اکٹھی سو طلاقیں دے ڈالی ہوں۔ مغیرہ نے جواب دیا کہ تین سے تو بیوی حرام ہو گئی اور ۹۷ فالتو رہیں۔

حافظ ابن قیم نے بھی اغاثۃ اللہفان میں یہ روایت نقل کی

ہے اور سکوت اختیار فرمایا ہے کوئی رد و قدح نہیں کی۔

فتویٰ حضرت عمران بن حصین رض (۱۱)

ابوبکر ابن ابی شیبہ سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ صحابی رسول ص عمران بن حصین رض سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جس نے ایک ہی مجلس میں بیوی کو تین طلاقیں دیدی تھیں انھوں نے جواب دیا کہ یہ شخص گناہگار بھی ہوا اور اس کی بیوی بھی اس پر حرام ہو گئی۔

اس اثر کو علامہ ترکمانی نے بھی الجوہر النقی میں روایت کیا ہے اور ابن قیم اسے بیہقی کے حوالے سے اغاثہ میں بھی نقل کرتے ہیں انھوں نے سند نقل نہیں کی مگر رد و قدح بھی مطلق نہیں کی جس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ سند ان کے نزدیک صحیح تھی اور روایت انھوں نے قبول فرمالی۔

فتویٰ حضرت عبدالرحمن بن عوف رض (۱۲)

اور دار قطنی نے صحابی رسول حضرت عبدالرحمن بن عوف کے صاحبزادے ابوسلمہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ان کی ماں تماضر بنت الاصبغ کو حضرت ابن عوف نے تین طلاقیں ایک جملہ میں دیں یعنی "تجھ پر تین طلاق" کہکر اپنے سے جدا کیا (ملاحظہ ہو دار قطنی جلد دوم ص۴۳۸)، یہ اگرچہ حضرت ابن عوف کا عمل ہے اصطلاحاً اسے فتویٰ نہیں کہتے مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ تو فتوے سے بھی زیادہ قوی گواہی ہے اس بات کی کہ وہ اکٹھی تین طلاقوں کے سلسلہ میں وہی رائے رکھتے تھے جو باقی صحابہ کی تھی۔ رائے کیا یوں کہیے کہ مسلّمہ یہ تو دراصل قطعی قانون شرعی تھا کہ تین اکٹھی دو گے تو تین ہی پڑیں گی۔ اسی کے مطابق صحابہ کے فتوے بھی تھے اور ان کا تعلق اجتہاد سے نہیں علوم و مسلّم قانون سے تھا۔

ام المومنین حضرت عائشہ رض کا فتویٰ (۱۳)

حضرت عائشہ رض سے مروی حدیثوں ہی سے سلیم الطبع اندازہ کر سکتا ہے کہ ان کا فتویٰ کیا ہوگا۔ ان کا فتویٰ یہی تھا کہ اکٹھی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں۔ اسے جصاص نے احکام القرآن میں ابو ولید الباجی مالکی نے المنتقی میں ابن ہمام نے فتح القدیر میں، ابن عبدالبر نے استذکار میں اور نہ جانے کتنے اہل علم نے اپنی اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ یہاں تک کہ شیعی فقہ کی کتاب الروض النضیر میں بھی بحر کے حوالہ سے جن صحابہ کا نام لیا گیا ہے ان میں حضرت عائشہ رض کا نام موجود ہے۔

نواسۂ رسول ص حضرت حسن رض بن علی رض کا فتویٰ (۱۴)

اس فتوے کا اندراج ہم "رسول اللہ کے فتاویٰ" میں کر چکے لیکن کیا اسے خود حضرت حسن کے مذہب کا آئینہ دار نہیں کہیں گے؟ جو حاصل فتوے کا ہے وہی اس کا ہے۔ وہاں ہم نے دار قطنی کے حوالہ سے نقل کیا تھا یہاں بیہقی اور طبرانی کے حوالہ سے پیش خدمت ہے۔ اس کی سند کو حافظ ابن رجب صحیح قرار دیتے ہیں اور دار قطنی والی سند کو خود دار قطنی نے حسن قرار دیا ہے۔

حرف آخر

محدود وقت میں تحقیق کا جو حق ادا کرنا تھا وہ ہم نے ادا کر دیا۔ بعید نہیں کہ ہم سے بھی نادانستہ کچھ لغزشیں ہوئی ہوں۔ ہماری کسی بھی لغزش کی نشاندہی کوئی صاحب فرمائیں تو سر اور آنکھوں پر۔ لیکن ہماری لغزشوں کا حاصل یہ بہرحال نہیں ہو سکتا کہ اجماعی مسئلہ غیر اجماعی بن جائے اور حدیث و آثار کا سارا ذخیرہ دریا برد ہو جائے۔

مولانا اکبرآبادی، مولانا محفوظ الرحمن اور مولانا سید احمد مدیر زندگی تینوں کو سوچنا چاہیئے کہ اجماع سے ان کا انکار کیا اب بھی اپنی جگہ قائم ہے یا اس کا بے بنیاد ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے۔ سوچنے کے آغاز میں یہ دعا ضرور پڑھ لینی چاہیئے اللّٰھمّ ارنا الحقّ حقًّا و ارنا الباطل باطلًا۔

طالبِ حق کبھی ضدّی نہیں ہوتا

فتاویٰ عبدالحئی مولانا عبدالحئی رحؒ کا مشہور مجموعۂ فتاویٰ ایک جلد میں۔ مکمل نظر ثانی کے بعد
قیمت ——— بیس روپے ۲۰/-

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ مولانا منظور نعمانی کی مقبول کتاب۔ اس میں وہ عام فہم زبان میں قرآنی مطالب بیان کرتے ہیں۔
قیمت ——— چھ روپے ۶/-

آداب زیارت قبور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا محمد سلطانؒ کے فرمودات۔ قیمت ۶۵ پیسے

معارف سلیمان نمبر مولانا سید سلیمان ندوی کے احوال و کوائف اور تذکرہ و تعارف پر یہ نمبر بہت شاندار ہے۔ قیمت ——— پانچ روپے ۵/-

الحج مولانا اشرف علیؒ کے خلیفہ شاہ مسیح اللہ کی نادر تصنیف۔ موضوع نام سے ظاہر ہے
قیمت ڈیڑھ روپیہ ۱/۵۰

صفائی معاملات جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں مولانا اشرف علیؒ نے معاملات کی صفائی کے شرعی طور طریق بیان فرمائے ہیں۔ بڑے کام کا رسالہ ہے۔ قیمت صرف ۶۰ پیسے

معجزہ کیا ہے؟ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی ایک فکر انگیز تصنیف۔ معجزے کے تمام پہلوؤں پر علم و تفقہ کی روشنی ہیں۔ مجلد ڈھائی روپے ۲/۵۰

شہدائے بدر شہدائے بدر کے مختصر حالات و کوائف۔
قیمت ۱/-

فن اسماء الرجال از:- مولانا تقی الدین مظاہری۔ علم الحدیث کا مدار راویوں کے حالات پر ہے اور ان حالات کو سمجھنا فن اسماء الرجال پر منحصر ہے۔ لہٰذا حدیث رسولؐ سے دلچسپی رکھنے والے تمام ہی مسلمانوں کے لئے یہ کتاب بنیادی فوائد کی حامل ہے۔ قیمت ——— ایک روپیہ پچھتر پیسے ۱/۷۵

مکتبہ تجلی دیوبند (یوپی)

عبدالکریم پاریکھ

کامیاب نکاح

کامیاب نکاح وہ ہے جس میں حدود شریعت کو پامال نہ کیا گیا ہو، خوشی خوشی سب کام پوری سادگی سے انجام پائے۔ دلھن گھر آئی اس کے ماں باپ پر جہیز تلک سے متعلق کوئی اعتراض نہ ہوا، ہنسی خوشی ہر چھوٹے بڑے نے نئی دلھن کا استقبال کیا۔ آنے والی نے اپنی ساس اور خسر کو ماں باپ کی جگہ سمجھا۔ شوہر کو اپنا سرتاج مانا۔ اِدھر دولھا نے اس دولھن کو پاکر اپنا بقیہ آدھا ایمان پورا کرلیا رشتۂ حیات میں منسلک اس نئی شریکِ حیات کا محافظ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگ گیا۔ دلھن نے نند اور دیور کو اپنا بھائی بہن مانا گھر کے کام کاج کو اپنے سر لیا۔ دھوبی، درزی کے گھر جانے والی رقم کو حتی الامکان روک لیا۔ گھریلو اخراجات میں اصلاح اور کفایت شعاری سے بچت بھی اچھی خاصی کرلی۔ پھر ایک مسلم عورت اپنے فرائض کی ادائیگی میں نماز و تلاوت سے خدا کی برکت کے نزول کا سبب بنی۔

دلہن نے آتے ہی گھر میں نہایت ہی سلیقے سے رکھ رکھاؤ قائم کردیا۔ میاں جب گھر میں آئے ہنسکر مسکراکر اس کا استقبال کیا، ہر طرح کی زینت و آرائش صرف اپنے شوہر کے لئے کہ دولھا کو دنیا میں صرف اپنی دلہن ہی خوبصورت اور خوب سیرت معلوم ہوئی۔ اولاد کی پرورش، تعلیم و تربیت میں وہ سلیقہ کہ محلہ پڑوس میں اس گھر کے بچے مثالی بچے کہے جانے لگیں۔ شوہر کے گھر آنے پر کوئی شکوہ شکایت مطلق نہیں۔ محلہ پڑوس میں کسی سے بھی لڑائی جھگڑا مول نہیں لیا۔ نئے ماں باپ اور نئے بھائی بہن اس دلہن پر ایسے فدا کہ میکہ بھلی جانے تو نیا گھر سونا اور سسرال آجائے تو پرانے گھر کے لوگ ویرانی محسوس کریں۔ اچھا گھر سنسار وہ ہے جہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی کام میں مصروف ہو۔ یا پھر نماز میں مشغول کوئی تلاوت کر رہا ہو، کوئی اچھی کتابیں پڑھ رہا ہو۔ یہ سب کام میاں بیوی اور گھر کے سارے لوگ ایک دوسرے کے تعاون سے جاری رکھے ہوئے ہوں۔

نیا گھر بساکر دوسرے رشتہ داروں سے نبھاؤ اور بناؤ کو وسیع پیمانے پر قائم کردیا گیا ہو خیر خیرات اجر آخرت اور رضائے الٰہی کی نیت سے جاری ہوں۔ مساکین کو کھانے کھلائے جائیں گو غربت ہو تنگدستی ہو تو سالن میں کچھ زیادہ پانی ڈال لیں مگر راہِ خدا میں کچھ نہ کچھ اس کے غریب اور بے سہارا بندوں کو دیئے جائیں تو بہ استغفار انابت الی اللہ۔ یہ سب کام ہوں تو چغلی غیبت کا موقع ہی نہ آئے گھر کو شمع نبوت سے ایسا روشن کردیا جائے کہ اندھیرے کا نشان باقی نہ رہے۔ یہ تمام باتیں نکاح کی کامیابی کا ثبوت ہیں۔ ایک اچھے خاندان کی بہترین خوبی یہ ہے کہ افراد کا باہمی ربط وضبط ہو گھر کے افراد کے درمیان محبت و چاہت ہو، ایکدوسرے کے دم ساز ہوں کوئی بھی سنگدلی کا مظاہرہ نہ کرے اور نہ کوئی کسی پر زیادتی کرے۔

دینِ حنیف اپنے ماننے والوں کو بنیان مرصوص دیکھنا چاہتا ہے۔ یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار۔ اس مضبوط دیوار کا سنگِ بنیاد وہ خاندان ہے جو عورت مرد باہم مل کر وجود میں لے آتے ہیں۔ خاندان کی اساس عورت مرد کے تعلقات خراب ہونے سے درہم برہم ہو جاتی ہے ابلیس لعین کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی کامیابی نہیں ہوسکتی کہ

میاں بیوی میں رنجش پیدا کردے اور بس باقی تمام کام رفتہ رفتہ میاں بیوی خود ہی کر ڈالتے ہیں لیکن کامیاب نکاح والے گھر کے افراد ابلیس کو اس محاذ پر دفن کرکے رہتے ہیں۔ آپکی کامیاب گھریلو زندگی کا نسخہ خود قرآن پاک میں رب اعلیٰ نے ارشاد فرمایا۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اللہ کی نافرمانی سے بچو جس کے نام پر سوال کرتے ہو اور قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے بچتے رہا کرو۔

آدمی کے لئے پورا آدمی بن جانے کے بعد۔ اسکی بیوی بڑا اہم مقام رکھتی ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ ہر طرح اپنی زوجہ کی دین اور دنیا کی مسرتوں کا پورا خیال رکھے۔ حدیث شریف میں اچھا آدمی اسی کو کہا گیا ہے جو اپنے اہل وعیال کے لئے خیر ہی خیر ہو۔

شوہر کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنی بیوی کی زینت آرائش کا زیور خود ہی بن کر دکھائے، اس کی دلچسپی میں تعاون کرے۔ گھریلو کام کاج میں جتنا ہو سکے ہاتھ بٹائے۔ بیوی کو نوکر چاکر کی طرح نہیں بلکہ گھر کی ملکہ اور خود اپنا آدھا وجود تسلیم کرے۔ گھر میں رہتے وقت خود بھی اپنے آپ کو اچھے لباس میں بیوی کی توجہ کا مرکز بنائے۔ جو لوگ باہر تو بہت بن سنور کر جاتے ہیں اور گھر پر پھٹی لنگیاں اور میلی بنیانیں پہن کر رہتے ہیں انھیں کامیاب ازدواجی زندگی کیلئے اپنے لباس کا خیال ضرور رکھنا چاہیئے یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ بیوی جب باہر جائے تو بہترین لباس میں جائے اور گھر میں سر جھاڑ اور منھ پہاڑ بیٹھی ہو، ایسی بہن کامیاب نکاح کا لطف حاصل نہیں کر سکتی۔ اسی طرح جو بھائی اپنے دوست احباب میں خوب بن سنور کر جائے اور گھر میں اپنی زوجہ کی کشش سے لاپرواہ ہو وہ بھی اس مسرت سے محروم رہے گا۔

بازار سینما اور ناٹک میں نظر آنے والے مرد عورت اپنی زینت وکشش میں بازاری حد تک آرائش کرتے ہیں۔ گھریلو زندگی والے جب ان دائروں میں اپنے جوڑے کا تصور کرتے ہیں تو انھیں بڑی مایوسی ہوتی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ ہم گھریلو فضا کو نہایت ہی صاف ستھری اور پاکیزہ رکھیں پھر دیکھئے بازار کی زینت اور گھر کی زینت کا مقابلہ ہو تو سکون قلبی انشاء اللہ ہر مومن کو گھر میں میسر ہوگا۔

حقیقی کشش طہارت پاکیزگی ستھرائی اور سلیقہ مندی میں پائی جاتی ہے۔ ملت کے بھائی بہنوں کا خیال اس طرف آئے تو انشاء اللہ گھر کو جنت بناتے دیر نہ لگے گی۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کا ایک مصداق یہ بھی ہے کہ ہم اگر ہر قدم پر اللہ کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھیں گے اور اسلام کے بتائے ہوئے پاکیزہ طور طریق اپنائیں گے تو ہمارے دلوں کو سکون و اطمینان میسر ہوگا۔ ذکر اللہ صرف اللہ ہو کی ضربوں یا تسبیحوں اور مناجاتوں یا صرف نماز روزے کو نہیں کہتے بلکہ ہر شعبۂ زندگی میں، تجارت میں، ملازمت میں، تعلقات میں، رہن سہن میں، تنگی میں، فراخی میں، اللہ کی فرماں برداری کرنا اصلی ذکر اللہ ہے۔ خدا کو یاد رکھو انشاء اللہ دل کو اطمینان، ذہن کو سکون اور روح کو آسودگی حاصل ہوگی۔ میاں بیوی کے درمیان گہری محبت، رفاقت، وابستگی اور غمخواری اللہ کو بیحد پسند ہے۔ آپ کبھی اس سے غافل نہ ہوں۔

مدیر زندگی کا مراسلہ اور اس کا جواب

(تاریخ ندارد)

محترمی و مکرمی　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

بیک مجلس یا بیک کلمہ تین طلاقوں کے مسئلے پر رامپور میں آپ نے جو گفتگو کی تھی میں برابر اس پر غور کرتا رہا اور اب طلاق نمبر کے مطالعہ کے بعد بھی اس پر غور کیا۔ آپ نے میرے دونوں مقالوں پر اجمالاً جو کچھ لکھا ہے اس کو بغور پڑھنے کے بعد بھی مجھے اپنے موقف میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں اس خط میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں اس پر آپ غور فرمائیں اور میرا یہ خط تجلی میں شائع کر دیں تاکہ قارئینِ تجلی بھی میری توضیح سے واقف ہو سکیں۔

(۱) میں نے سمینار والے مقالے میں جو کچھ لکھا ہے اسکی دو باتوں پر آپ نے اعتراض کیا ہے۔ ایک یہ کہ جب میں کہتا ہوں کہ احادیث نبویؐ اور آثار صحابہؓ نے پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں تو پھر کس بنیاد پر میں یہ بھی کہتا ہوں کہ:۔

"اگر طلاق دینے والے نے اس خیال کے تحت تین کی صراحت کے ساتھ طلاق دی ہے کہ اس کے بغیر طلاق واقع ہی نہیں ہوئی تو ایسی تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جانا چاہئیے۔"

اس پر آپ نے جو اعتراض کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ قانون سے ناواقفیت دین و دنیا کے کسی قانون میں عذر معتبر نہیں اور اگر اس طرح کی مفروضہ جہالت جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے تسلیم بھی کر لی جائے تو لوگوں کا جہل کسی فعل کی تاثیر میں آخر رکاوٹ کیسے بن سکتا ہے۔ اس بات کو سمجھانے کے لئے آپ نے مثال دی ہے کہ اگر کوئی شخص بھولے سے بھری ہوئی بندوق داغ دے اور گولی کسی انسان کے سینے میں لگ جائے تو وہ زخمی ہو ہی جائے گا۔ بھولے سے داغی ہوئی گولی بے اثر نہیں رہے گی۔

میں پہلے یاد دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ احادیث نبویؐ اور آثار صحابہؓ کے حوالے سے جو بات میں نے لکھی ہے اس کا تعلق علم و فہم کے ساتھ طلاق دینے سے ہے۔ میں نے اپنے مقالے کے آخر میں صراحت کے ساتھ یہ لکھا ہے:۔

"میں اوپر مقالے میں واضح کر چکا کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالے تو تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں"۔۔۔ (زندگی طلاق نمبر ص ۲۰)

میں نے مزید صراحت ان الفاظ میں کی ہے:۔

"جو لوگ یہ جان کر اور سمجھ کر کہ بیک دفعہ بیک کلمہ تین طلاقیں دے ڈالنے سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، تین طلاقیں دے ڈالیں۔ ایسے لوگوں کی دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک قرار دینا میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی شخص تین طلاقیں دینے کی نیت سے میں نے طلاق دی۔ میں نے طلاق دی۔ میں نے طلاق دی ہے تو تین طلاقیں ہوں گی ان کو ایک قرار دینا میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔" (ایضاً صفحہ ۲)

ان صراحتوں سے معلوم ہوا کہ میری وہ دونوں عبارتیں

جنھیں آپ نے اپنے تبصرے میں نقل کیا ہے' دو صورتوں سے متعلق ہیں اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس یاددہانی کے بعد اب میں آپ کے اعتراض کے سلسلے میں عرض کرتا ہوں۔

میں نے احادیث اور فقہ کا جو مطالعہ کیا ہے اس سے یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ طلاق' بندوق کی گولی نہیں ہے۔ بیک دفعہ تین طلاقیں دینے والے جاہل مطلق کی طلاقوں کو بندوق کی گولی سے تشبیہ دے کر معارضہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ بندوق کی گولی کا حال تو یہ ہے کہ اگر کوئی پاگل بھی کسی شخص کے سینے پر تین گولیاں داغ دے تو تینوں اس کے سینے میں پیوست ہو جائیں گی۔ لیکن اگر وہ اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالے تو ایک بھی واقع نہیں ہوگی اور اس پاگل کے الفاظِ طلاق ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے۔

دوسری مثال:۔ زید سویا ہوا ہے اور بھری ہوئی بندوق اس کی بغل میں رکھی ہوئی ہے نیند میں اس کا ہاتھ لبلبی پر پڑ جاتا ہے۔ گولی نکلتی ہے اور اس کی بیوی کو زخمی کر دیتی ہے اور یہی زید نیند میں اپنی بیوی کو ایک' دو' تین طلاقیں دے ڈالتا ہے۔ کیا یہ تین طلاقیں اس کی بیوی پر واقع ہو جائیں گی؟ نہیں! ایک بھی واقع نہ ہوگی۔

تیسری مثال:۔ زید نے ناواقفیت میں گنّے کا ایسا رس پی لیا جس میں نشہ پیدا ہو گیا تھا اور اس نشے میں اس نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی یہ طلاق بھی واقع نہ ہوگی۔

چوتھی مثال: زید نے جان بوجھ کر شراب پی لیکن اس سے اس کے سر میں شدید درد پیدا ہوا اور اس نے درد کی شدت میں اپنی بیوی کو طلاق دی' یہ طلاق بھی واقع نہ ہوگی۔

پانچویں مثال:۔ کسی نے زید کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق دے کر اس کو مجبور کیا کہ بکر پر گولی چلا دے' اس نے حالتِ اکراہ میں گولی داغ دی' بکر زخمی ہو گیا۔ گولی اپنا کام کر گئی۔ اس زید کو کسی نے مجبور کیا کہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے' اس نے حالتِ اکراہ میں طلاق کی نیت اور قصد کے بغیر محض مجبوراً اپنی بیوی کو لفظاً طلاق دیدی تو کیا یہ الفاظِ طلاق اپنا کام کریں گے؟ مالک و شافعی واحمد رحمہم اللہ کا جواب یہ ہے کہ الفاظِ طلاق بے اثر رہیں گے اور طلاق واقع نہ ہوگی اور اگر حالتِ اکراہ میں کنایۃً اس نے طلاق دی ہے یعنی منھ سے الفاظِ طلاق نہیں نکالے ہیں بلکہ کاغذ پر لکھ دیئے ہیں تو فقہ حنفی کا جواب یہ ہے کہ طلاق واقع نہ ہوگی۔

ان مثالوں سے واضح ہوا کہ طلاق بندوق کی گولی نہیں ہے۔ بندوق سے گولی نکل کر اپنا کام کرتی ہے خواہ بندوق چلانے والا کسی حال میں ہو لیکن لفظِ طلاق ہر حال میں اپنا کام نہیں کرتا۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو یہ مسئلہ یقیناً قابلِ غور ہے کہ اگر کوئی شخص یہ جان کر تین طلاقیں دے ڈالے کہ جب تک وہ تین کا لفظ استعمال نہ کرے گا طلاق واقع ہی نہ ہوگی اور وہ حلفیہ بیان دیتا ہے کہ اس کی نیت تین طلاق دینے کی نہ تھی تو کیا اس کے لفظ کو بندوق کی گولی مان کر اس کو نافذ کر دیا جائے یا یہ مان کر کہ وہ صرف طلاق دینا چاہتا تھا' تین کے لفظ کو بے اثر مان کر اس کی نیت کے مطابق ایک طلاق واقع ہونے کا فیصلہ کیا جائے؟ میں نے بھی غور کیا تھا اور آپ کا معارضہ سُن کر اور پھر تجلی میں پڑھ کر بھی غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تین کی صراحت کو غلط فہمی اور دھوکے پر مبنی سمجھ کر طلاق دینے والے کی نیت کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ فریب خوردہ کے ساتھ رعایت دین و دنیا کے ہر قانون میں موجود ہے۔

حضرت عمرؓ کے فیصلے کی نظیر

ہمیں کتب فقہ میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ ایک چالاک عورت نے اپنے بھولے بھالے شوہر کو دھوکہ دیکر اس سے طلاق کے الفاظ کہلوائے اور حضرت عمرؓ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دیدی ہے اور اب انکار کر رہا ہے۔ اس کے شوہر نے وہاں پہنچکر

اصل واقعہ سنایا تو انھوں نے عورت کو سزا دی اور وقوعِ طلاق کا فیصلہ نہیں کیا۔ ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں یہ واقعہ بایں الفاظ منقول ہے:۔

"ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا میرا کوئی نام رکھو اس نے اس کا نام طَیَبہ رکھا عورت نے کہا یہ تو تم نے کچھ بھی نہ کہا۔ شوہر نے کہا تو اب تمھیں اپنا کوئی نام بتاؤ اس نے کہا "میرا نام خلیۃ طالق" رکھو، شوہر نے کہا "تو خلیۃ طالق ہے" اس کے بعد وہ عورت حضرت عمرؓ کے پاس گئی اور کہا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دیدی ہے۔ اس کے پیچھے اس کا شوہر پہنچا اور اس نے پورا قصہ سنایا۔ اس کی بات سُن کر حضرت عمرؓ نے عورت کے سر پر ضرب لگائی (دُرّہ مارا) اور شوہر سے کہا اس کا ہاتھ پکڑلے اور عورت کے سر پر ضرب لگائی۔"

(فتح القدیر۔ جلد ۳۔ مطبوعہ مصر صہ ۴۷)

شوہر نے بیوی سے مخاطب ہو کر اس کو "خلیۃ طالق" کہا۔ یہ وہ الفاظ ہیں جن سے طلاق بائن پڑجاتی ہے اور یہی اس عورت کا مقصد تھا۔ حضرت عمرؓ نے دھوکہ دے کر کہلوائے ہوئے الفاظ طلاق کو طلاق تسلیم نہیں کیا۔ شوہر نے نادانی میں دھوکا کھاکر وہ الفاظ کہہ دیئے تھے۔ اس کی نیت طلاق دینے کی نہ تھی۔ شاید عورت کو یہ خوش فہمی تھی کہ خواہ جس طرح بھی ہو شوہر کے منھ سے وہ اپنے لئے طلاق کا لفظ نکلوا دے تو طلاق واقع ہوجائے گی۔ حضرت عمرؓ کے دُرّے نے اس کو بتادیا ہوگا کہ اس کا خیال غلط تھا۔ لفظِ طلاق بندوق کی گولی نہیں ہے۔

نادانی کی وجہ سے دھوکے میں الفاظ طلاق منھ سے نکالنے کی ایک مثال امام ابن الہمام نے خلاصہ کے حوالے سے لکھی ہے:۔

"عورت نے شوہر سے کہا تم مجھے یہ الفاظ سناؤ "عدت گذار مجھے تین طلاق" شوہر نے ایسا ہی کہا تو اگر شوہر الفاظ کا مطلب نہیں جانتا تھا اور اس کی نیت بھی طلاق دینے کی نہ تھی تو قضاءً اس عورت پر تین طلاق پڑجائے گی، لیکن اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان یہ طلاق واقع نہ ہوگی۔" (ایضاً۔ صہ ۴۶)

جہالت کی وجہ سے دھوکا کھاکر شوہر نے جو الفاظ طلاق منھ سے نکالے اس کی وجہ سے قاضی کی عدالت میں تو تین طلاق واقع ہوجائے گی لیکن دیانۃً طلاق واقع نہ ہوگی یعنی فی الحقیقت واقع نہ ہوگی لیکن قاضی وقوعِ طلاق کا فیصلہ دے گا۔ سوال یہ ہے کہ اسی طرح کا واقعہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا جس کا ذکر ابھی اوپر گذرا، اور انھوں نے وقوعِ طلاق کا فیصلہ نہیں کیا اور اسی کے ثبوت میں ابن الہمام نے یہ واقعہ نقل کیا ہے تو پھر فریب ہی کے اس واقعہ میں جس کا ذکر خلاصہ کے حوالہ سے کیا گیا ہے قاضی یہ فیصلہ کیوں نہیں کرے گا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی؟ اب اگر ہم یہ فیصلہ کریں کہ ایسی طلاق قضاءً بھی واقع نہ ہوگی تو حضرت عمرؓ کے فیصلے کے پیشِ نظر اس کو بالکل بے اساس اور بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ قاضی ظاہر الفاظ پر فیصلہ کرتا ہے کیونکہ دل کا حال اسے معلوم نہیں لیکن اگر قرینہ موجود ہو تو شوہر کے بیان پر فیصلہ کرنے میں کوئی شرعی مانع موجود نہیں ہے۔

اسی طرح کی ایک اور مثال کتبِ فقہ میں موجود ہے، فتاویٰ عالمگیریہ میں "ذخیرہ" کے حوالے سے لکھا گیا ہے:۔

"اور جب کسی نے اپنی بیوی سے کہا "انت طالق" لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ یہ قول قولِ طلاق ہے تو اس کی بیوی پر قضاءً طلاق پڑجائے گی اور اسکے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان طلاق واقع نہ ہوگی۔"

(جلد ۱، مطبوعہ مصر، صہ ۳۵۳)

اس صورت میں بھی کہنے والے کا عدمِ علم حقیقۃً اور دیانۃً وقوعِ طلاق سے مانع بن گیا ہے۔ وہ طلاق کے صریح الفاظ "انت طالق" بولتا ہے اور اس کے معنی بھی جانتا ہے

لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ اصلاحی طور پر انھیں الفاظ سے بیوی کو طلاق دی جاتی ہے۔ اس جہل کی وجہ سے اس کی بیوی پر دیانۃً طلاق واقع نہ ہوگی۔

کتب فقہ ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن صورتوں میں دیانۃً طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ان میں مفتی تو عدم وقوع کا فتویٰ دے گا ابتداءً قاضی کے پاس مقدمہ دائر ہوجائے تو وہ وقوع طلاق کا فیصلہ کرے گا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو "انت طالق" کہے اور پھر بیوی سے یہ بیان کرے کہ میری نیت اس جملے سے یہ تھی کہ تو اس قید یا پابندی سے آزاد ہے جو میں نے تجھ پر لگا رکھی تھی تو فقہاء کہتے ہیں کہ اس صورت میں صرف قضاءً طلاق واقع ہوگی دیانۃً نہ ہوگی اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ شامیؒ نے لکھا ہے:-

"یعنی اس کی نیت خود اس کے اور اس کے بلند و برتر رب کے درمیان صحیح ہے کیونکہ اس نے اس چیز کی نیت کی جس کا احتمال لفظ طلاق میں موجود ہے پس مفتی اس کو یہ فتویٰ دیتا ہے کہ طلاق واقع نہیں ہوئی لیکن قاضی اس کی تصدیق نہیں کرے گا اور اس کے خلاف وقوع طلاق کا فیصلہ کر دیگا کیونکہ طلاق دینے والے کا بیان ظاہر لفظ کے خلاف ہے اور کوئی قرینہ بھی موجود نہیں ہے۔"

(شامی، جلد ۲، مطبوعہ مصر ص ۶۶۶)

علامہ شامی کی یہ عبارت اس لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتی ہے کہ اگر کوئی قرینہ موجود ہو تو قاضی بھی طلاق واقع نہ ہونے کا فیصلہ کرسکتا ہے۔

اب میں ایک ایسی مثال پیش کرتا ہوں جس میں نادانی و جہل کی وجہ سے دی ہوئی طلاق کے بارے میں فقہاءِ احناف کے ایک گروہ کا فیصلہ یہ ہے کہ طلاق قضاءً بھی واقع نہ ہوگی وہ مثال یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے شوہر سے اپنے لئے طلاق کے الفاظ کہلوائے اور شوہر کو ان الفاظ کے معنی معلوم نہیں ہیں۔ اس صورت میں مشائخ اوزجند کا فیصلہ یہ ہے کہ طلاق بالکل واقع نہ ہوگی نہ دیانۃً اور نہ قضاءً (بحر الرائق ج ۳، مطبوعہ مصر ۲۵۷) بحر الرائق پر علامہ شامی نے جو حاشیہ لکھا ہے اس میں تاتارخانیہ کے حوالہ سے یہ صراحت کی ہے کہ اوزجند میں یہ واقعہ پیش آیا اور قاضی امام محمود اوزجندی نے شہر کے دوسرے فقہاءِ احناف سے اس مسئلے میں مشورہ کیا اور سب نے بالاتفاق یہ طے کیا کہ اس صورت میں طلاق بالکل واقع نہ ہوگی یعنی اگر مقدمہ قاضی کے پاس جائے تو وہ بھی وقوع طلاق کا فیصلہ نہ کرے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مشائخ اوزجند نے شوہر کی جہالت اور فریب خوردگی کو قضاءً بھی "عذر معتبر" تسلیم کیا۔ یہ تفصیل اس بات کی وضاحت کے لئے پیش کی گئی ہے کہ "جہل" فقہ حنفی میں دیانۃً تو عذر معتبر ہے ہی بعض حالات میں قضاءً بھی اس کو عذرِ معتبر تسلیم کیا گیا ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ میں مسئلہ زیر بحث میں جس نتیجے تک پہنچا ہوں وہ فقہی نقطۂ نظر سے بالکل بے اساس و بے بنیاد نہیں ہے۔

تجلی

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

جناب کے مراسلے میں دو شقیں تھیں۔ میں نے انھیں الگ الگ کر دیا ہے تاکہ ہر شق کا جواب بلافصل پڑھا جاسکے پہلی شق کا جواب درج ذیل ہے دوسری اس کے بعد نقل ہوگی۔

جو عربی عبارتیں آپ نے بعض کتب سے نقل کی تھیں انھیں میں نے حذف کر کے صرف ترجمہ باقی رہنے دیا ہے۔ کیا کرتا۔ آپ نے ان کی نقل میں ایک تو اردو رسم الخط اختیار فرمایا دوسرے قلم کو شکستگی کی طرف مائل کر دیا۔ مراسلہ اشاعت کے لئے نہ ہوتا تب تو مضائقہ نہ تھا لیکن اشاعت کا حکم دیتے ہوئے بھی آپ نے خوش خطی کا اہتمام نہیں کیا تو میرے لئے مشکل پیدا ہو گئی۔ ہو سکتا ہے آپ کو عالم فاضل کاتب میسر ہوں۔ میرے کاتب محض حرف شناس ہیں وہ آپ کی عربی تحریر کی ایک سطر بھی صحیح نہیں لکھ

سکتے۔ کیا فائدہ کہ وہ ستمنی کو جمنی اور عُیَیْنَۃ کو عینک لکھ مارتے اور میں اپنی اور آپ کی قسمت پر نوحہ کرتا۔ حرج متن کے حذف سے کچھ ہوا نہیں۔ آپ کی صحتِ نقل اور صحتِ ترجمہ پر مجھے کوئی کلام نہیں کرنا لہٰذا صرف ترجمہ بھی پورا کام دیگا۔

جواب یہ ہے کہ آنجناب نے اپنے ذہنِ عالی کو متعدد مثالیں وضع کرنے کی تکلیف اور اپنے دستِ گرامی کو فتح القدیر وغیرہ کے ورق اُلٹنے کی زحمت بے کار دی۔ خود "طلاق نمبر" میں ایسی متعدد چیزیں موجود تھیں جنھیں پیش کر کے آپ وہی اعتراض فرما سکتے تھے جو مثالوں کے ذریعہ فرمایا ہے۔ مثلاً آپ فرما سکتے تھے کہ دیکھو میاں عامر تم خود حدیث بیان کر رہے ہو کہ رکانہ نے اپنی زوجہ کو طلاقِ بتّہ دی یعنی تین طلاقیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے قسم کھائی کہ میری نیت ایک ہی طلاق کی تھی۔ رسول اللہؐ نے رجوع کی اجازت مرحمت فرمادی تو اس سے معلوم ہوا کہ طلاق گولی کے مانند نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو تین طلاقیں نکاح کو قتل کر چکی ہوتیں اور رجوع کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

یا مثلاً آپ کہہ سکتے تھے کہ تم نے طلاق نمبر میں یہ خیال ظاہر کیا ہے اور پہلے بھی کر چکے ہو کہ کوئی شخص لفظ طلاق کو تین بار دہرائے اور پھر قسم کھائے کہ تکرار سے میری نیت تین کی نہیں تھی بلکہ جوش اور روانی میں لفظ طلاق متعدد بار نوکِ زبان پر آگیا تھا تو یہ فتویٰ دینا ممکن ہوگا کہ ایک ہی طلاق پڑی ۔۔۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طلاق اور گولی میں فرق ہے۔ اگر طلاق گولی جیسی ہوتی تو جتنی بار بھی لفظِ طلاق زبان پر آیا اتنی ہی گولیاں نکاح کے جسم میں پیوست ہو گئی ہوتیں، ایک کا فتویٰ کیسے دیا جا سکتا۔

فرمائیے کیا یہ تقریر اعتراض ٹھیک وہی نہیں ہے جس کی خاطر آپ نے مثالیں وضع کرنے اور کتابیں اُلٹنے کی کلفت اُٹھائی ہے؟

مجھے معاف کیا جائے اگر میں یہ کہوں کہ طلاق نمبر کو آپنے غور سے نہیں پڑھا یا پھر دورانِ مطالعہ آپ مجھ نالائق سے خفا رہے اس لئے آپ کا ذہنِ مبارک میری ناچیز معروضات کو پوری طرح سمجھنے کے بجائے شوشے نکالنے اور نکتے پیدا کرنے کی طرف میلان فرماتا رہا۔

بہر حال جواب سنئے۔ تشبیہ و تمثیل جب دی جاتی ہے تو بعض مضمرات اور قیدیں اس میں آپ سے آپ ایسی موجود ہوتی ہیں جن کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ مثلاً آپ یوں کہیں کہ زید شیر کی طرح جست کرتا ہے تو یہ بات خود بخود طے ہے کہ شیر سے آپ کی مراد زندہ اور آزاد شیر ہے۔ وہ شیر نہیں جو مردہ پڑا ہے یا پنجرے میں قید ہے۔ اسی طرح جب آپ یوں کہتے ہیں کہ فلاں کا چہرہ چاند جیسا حسین ہے تو آپ کا اشارہ اس چاند کی طرف ہوتا ہے جو آسمان پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہو۔ نہ کہ اس چاند کی طرح جو ابتدائی یا آخری تاریخوں میں کمتاب، زرد اور مدقوق سا نظر آرہا ہو۔

یا مثلاً جب آپ یوں کہتے ہیں کہ گولی آدمی کو مار ڈالتی ہے تو بغیر کسی تشریح کے متعدد قیود اس قول میں مسلّم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ گولی مٹی یا ریت یا مٹھائی کی نہ ہو بلکہ سیسے اور لوہے کی ہو۔ دوسرے یہ کہ اسے پستول یا بندوق وغیرہ ہی کے لئے بنایا گیا ہو۔ تیسرے یہ کہ وہ پستول میں رکھ کر چلائی گئی ہو۔ چوتھے یہ کہ پستول کے گھوڑے کا دباؤ شدید ہو۔ پانچویں یہ کہ جس شخص کے یہ گولی لگے وہ بلٹ پروف پہنے ہوئے نہ ہو۔

ٹھیک اسی طرح میری تشبیہ و تمثیل پر غور فرمائیے۔ بہت معمولی قابلیت کا آدمی بھی طلاق نمبر کو توجہ سے پڑھ کر بہ آسانی معلوم کر سکتا ہے کہ میں نے طلاق کو اُس صورت میں گولی سے تشبیہ دی ہے جب اس کے ساتھ نیت بھی جمع ہو۔ زید اگر یوں کہتا ہے کہ فلاں نے فلاں کے گولی ماردی تو آپ ایک منٹ کو بھی یہ گمان نہیں کرتے کہ گولی انگلیوں میں پکڑ کر کنکری کی طرح ماری گئی ہوگی بلکہ خود بخود یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اُسے پستول یا بندوق وغیرہ میں بھر کر چلایا گیا ہوگا۔ حالانکہ کہنے والے نے اس کی طرف کوئی مجمل سا اشارہ بھی نہیں کیا۔

اسی طرح میں اگر اپنی طویل بحث میں نیت کی طرف کوئی اشارہ بھی نہ کرتا تب بھی یہ طے تھا کہ تمثیل اُس طلاق کی پیش

کی جا رہی ہے جس کے پہلو میں نیت بھی موجود ہو۔ لیکن میں نے تو نہ صرف اشارے کئے ہیں بلکہ صریحاً بھی جتلا دیا ہے کہ طلاق کی تاثیر نیت پر منحصر ہے۔ طلاق نمبر کے صفحہ ۵۷ پر یہ الفاظ پڑھیئے:۔

"عمل اور نیت دونوں جمع ہیں۔ اب تیسرا کونسا عنصر ہے جس کا انتظار کیا جائے گا۔ کہیں قرآن یا حدیث میں کیا کوئی تیسرا عنصر بھی بیان ہوا ہے جس کی شمولیت کے بغیر طلاق کی دھار رشتۂ نکاح کو کاٹ ڈالنے میں کند رہ جاتی ہو؟"

کیا یہ عبارت صاف طور پر نہیں بتا رہی ہے کہ طلاق کی تاثیر میں نیت میرے نزدیک شرطِ لازم ہے اور گولی سے جس طلاق کو میں نے تشبیہ دی ہے وہ وہی ہے جو نیت سے مربوط ہو۔

نیز جب خود میں حدیثِ رکانہ میں یہ دکھلا رہا ہوں کہ ایک کی نیت ہونے کی بنا پر طلاقِ بتّہ کو حضورؐ نے تین قرار نہیں دیا بلکہ ایک مان لیا تو اس سے بھی بلا ابہام ثابت ہوا کہ میں تاثیرِ طلاق کے لئے نیت کو لازمی سمجھتا ہوں۔

جب یہ بات صاف ہوگئی تو اب آپ اپنی دی ہوئی مثالوں پر نظر ڈالئے اور فیصلہ فرمائیے کہ کیا ان میں ایک بھی مثال ایسی ہے جس میں فعل کے ساتھ نیت جمع ہو۔

پہلی مثال پاگل کی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ پاگل "مرفوع القلم" ہوتا ہے۔ اس کی عقل، شعور، ادراک، احساس، قوتِ ارادی سب معطّل ہو چکے۔ اس کے کسی بھی فعل و قول کو ایک باشعور اور صاحبِ ارادہ آدمی کا فعل و قول نہیں مانا جاتا۔ اس کی دی ہوئی طلاق اس گولی کے مانند ہے جو کسی نے مٹھی میں بھر کر پھینک ماری ہو۔ اس سے تو چڑیا بھی نہیں مرتی۔

دوسری مثال سوئے ہوئے آدمی کی ہے۔ سویا ہوا آدمی بڑبڑاتا ہے یا ہاتھ پیر چلاتا ہے تو کوئی ہوشمند ان افعال کو قصد و نیت سے مربوط نہیں کہہ سکتا۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ سوتے میں آدمی کی زبان پر بہ آوازِ بلند وہ باتیں آ جاتی ہیں جنھیں وہ بیداری میں راز بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سوتے آدمی کے قول و فعل کا تعلق نیت سے نہیں ہوتا۔

تیسری مثال حالتِ نشہ کی ہے۔ شاید آپ بھول گئے نشہ کہتے ہی شرعاً اس حالت کو ہیں جب منطقی شعور اور عقلِ سلیم مفلوج و مختل ہو کر رہ جائیں۔ نشہ کی حالت میں آدمی کیچڑ میں لوٹتا ہے۔ نالی کا کیڑا بن جاتا ہے۔ اول فول بکتا ہے کیا آنجناب کا تفقہ یہ فیصلہ دے گا کہ یہ سب وہ قصد و نیت کے تحت کرتا ہے؟

چوتھی مثال بھی نشہ ہی سے متعلق ہے مگر آپ نے اسے پیش کرنے میں احتیاط نہیں برتی۔ شراب پی کر اگر کسی کو نشہ نہ ہو مگر سر میں درد ہو جائے تو بالکل غلط ہے کہ اس کی دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ کسی بھی درد و کرب کا صرف وہ اسٹیج وقوعِ طلاق میں مانع ہو سکتا ہے جب آدمی کا منطقی شعور اور قوتِ فیصلہ جامد ہو کر رہ جائے۔ طلاق نہ پڑنے کا فیصلہ صرف ایسی ہی حالتوں میں دیا جا سکتا ہے جب کسی بھی وجہ سے یہ باور کرنا ممکن ہو کہ اس کے پیچھے نیت نہیں پائی جا رہی ہے۔

پانچویں مثال جبر کی ہے۔ بیوقوف سے بیوقوف لوگ بھی جانتے ہیں کہ جان کے خوف یا عذاب و ایذا کی شدت میں جو افعال کئے جائیں وہ قصد و نیت کا ثمرہ نہیں ہوا کرتے۔ قرآن ہی میں اللہ نے فرمایا ہے کہ جان کے خوف سے جو شخص کلمۂ کفر زبان پر لے آئے وہ قابلِ معافی ہے بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جبر و خوف کی بنا پر زبان سے ادا کئے جانے والے الفاظ قلب کے ارادے اور نیت سے مربوط نہیں ہوتے۔ اگر کوئی اپنے ارادے اور نیت سے ایک فعل کر سکتا ہو تو کسی کو جبر یا دھمکی کی ضرورت ہی کیا پڑے گی۔ یہ چیزیں استعمال ہی ایسے مواقع پر کی جاتی ہیں جب کسی آدمی سے اس کی نیت اور مرضی کے خلاف کچھ کرانا ہو۔

انصاف کیجئے۔ آپ کی پانچوں مثالیں کیا ایسی ہی حالتوں سے متعلق نہیں جن میں فعلِ طلاق نیت کی پشت پناہی سے محروم ہے۔ اور مجھ گناہگار نے جس طلاق کو گولی سے تشبیہ دیکر آپ کو دکھ پہنچایا ہے وہ صرف وہی طلاق ہے جو نیت کے ہم رکاب ہو۔

میرے بہت ہی محترم دوست! میں داد دوں گا کہ آپ اپنی کسی رائے سے اختلاف کرنے والوں کی صریح و جلی باتوں کو بھی نظر انداز کر دینے میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ جو نہج آپ نے تعریض کا اختیار فرمایا ہے وہ اگر میں نالائق بھی اختیار کرلوں تو آپ دو قدم بھی نہ چل سکیں گے۔ مثلاً آپ نے فرمایا:۔

"بندوق سے گولی نکل کر اپنا کام کرتی ہے خواہ
بندوق چلانے والا کسی حال میں ہو"

میں اس پر کہہ سکتا ہوں کہ آپ غلط فرماتے ہیں۔ وہ آدمی جس کی طرف گولی گئی ہے اگر بکتر بند ہو یعنی بلٹ پروف پہنے ہوئے ہو تو گولی محض جھک مارے گی۔ یا بندوق کی لبلبی کا اسپرنگ خراب ہو تو گولی گز بھر جا کر پھُس ہو جائے گی اور آپ ہرگز نہ کہہ سکیں گے کہ وہ اپنا کام کر گئی۔

یہ یقیناً کج بحثی ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ کا علمِ کلام اس سے مختلف کوئی چیز نہیں ہے۔ بندے نے شیر کی تشبیہ پیش کی آنجناب بجائے زندہ کے مردہ شیر اٹھا کر لے آئے اور مثالیں پر مثالیں پیش فرما رہے ہیں کہ دیکھئے شیر تو بلی سے بھی گیا گذرا ہے۔ طلاق جس کے پیچھے نیت نہ ہو مردہ شیر کے مانند ہے۔ میں طلاق کو گولی کہتا ہوں مگر یہ گولی نیت کے پستول سے چلے تب مؤثر ہوتی ہے۔ آپ نے مذکورہ پانچ مثالوں کے علاوہ اور جو نظائر کتبِ فقہ سے پیش کئے ان میں بھی کوئی ایسی نظیر نہیں ہے جس میں فعلِ طلاق کے ساتھ نیت بھی موجود ہو اور طلاق نہ پڑی ہو۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں پورے دفترِ فقہ سے زیادہ نہیں صرف ایک نظیر ایسی لاکر دکھلائیں جس میں ابن قیم اور ابن تیمیہ کے علاوہ کسی معروف و مستند فقیہ نے ایسی کسی طلاق کو بے اثر مانا ہو جس کے ساتھ طلاق دینے والے کی نیت بھی جمع ہو۔

ضرورت نہیں تھی کہ اس توضیح کے بعد میں آپ کی پیش فرمودہ باقی نظائر پر کلام کروں لیکن بعض مغالطوں کا ازالہ کرنے کے لئے ان پر بھی کچھ عرض کرتا ہوں۔

حضرت عمرؓ کے ایک فیصلے کی جو نظیر آپ نے دی ہے ہر شخص بغیر خوردبین کے بھی دیکھ سکتا ہے کہ اس میں نیتِ طلاق کی پرچھائیں تک نہیں۔ احمق شوہر نے میاں مٹھو کی طرح کچھ الفاظ دہرا دیئے ہیں۔ نیت تو کیا اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں کہ طلاق پڑ جائے گی۔ لہٰذا اس نظیر کو پیش کرنا سراسر بے محل ہوا۔ البتہ یہاں میں اس کی نشاندہی ضرور کروں گا کہ آپ فقہاء پر بے سوچے سمجھے معترض ہو جاتے ہیں۔ غور سے سنیئے۔

ابن ہمام نے خلاصہ سے جو جزئیہ نقل کیا ہے اس پر آپ نے استفہامی انداز میں اعتراض فرما دیا۔ یعنی عورت نے شوہر سے کہا تم مجھے یہ الفاظ سناؤ — "عادت گذارہ تجھے تین طلاق"۔ — شوہر نے ایسا ہی کہا تو اب چاہے شوہر ان الفاظ کا مطلب نہ جانتا ہو اور اس کی نیت بھی طلاق کی نہ ہو مگر قاضی یہی فیصلہ دے گا کہ تین طلاقیں پڑ گئیں۔

اس فقیہانہ رائے کو پوری طرح سمجھے بغیر آپ کھٹ سے حضرت عمرؓ والا وہ فیصلہ اٹھا لائے جو انھوں نے دھوکے باز عورت کے سلسلہ میں کیا تھا اور اس فرق کو نہ دیکھ سکے جو اس فیصلے پر پہلے معاملے کو قیاس کرنے سے روکتا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے جس فیصلے کو آپ نظیر بنا رہے ہیں وہ انھوں نے قاضی کی حیثیت سے نہیں صرف امیر المومنین کی حیثیت سے دیا تھا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں اور نہ جانتے ہوں تو اب جان لیں کہ یہ دونوں حیثیتیں الگ الگ ہیں اور خلفائے راشدین نے کبھی انھیں خلط ملط نہیں کیا۔ وہ خود اپنا مقدمہ لے کر قاضی کی عدالت میں جایا کرتے تھے۔ اگر امیر المومنین ہونے کی بنا پر وہ لازماً قاضی بھی ہوتے تو کہیں اور مقدمہ کیوں لے جاتے۔ حضرت عمرؓ نے مذکورہ معاملہ میں جو بھی فیصلہ نافذ کیا وہ اُس امیر المومنین کی حیثیت سے

نافذ کیا جس کی ذمہ داریاں اور فرائض بعینہ وہ نہیں ہوتے جو قاضی کے ہوتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ جب فقہاء یوں کہتے ہیں کہ "قضاءً تین طلاق واقع ہو جائیں گی" تو گویا وہ یہ کہتے ہیں کہ عند اللہ تین واقع نہ ہوں گی۔ "قضاءً" کی تخصیص کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ فلاں فیصلہ معاشری نظام کو اختلال سے بچانے کے لئے ضروری ہے ورنہ اُخروی لحاظ سے بات کچھ اور ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص نام و نمود یا خالص کاروباری مفاد کی خاطر حج کرے تو قاضی کا فیصلہ بہر حال یہی ہوگا کہ فریضۂ حج اس کے ذمے سے ساقط ہوگیا لیکن عند اللہ اس حج کی کچھ بھی قدر و قیمت نہ ہوگی۔ اب دیکھئے کہ ابن ہمام خلاصہ کے حوالے سے یہی تو فرما رہے ہیں کہ تین طلاقیں مذکورہ صورت میں حقیقتہً واقع نہ ہوں گی لیکن قاضی کو یہی فیصلہ دینا پڑے گا کہ وہ واقع ہوگئیں۔ کیوں دینا پڑے گا یہ بھی سمجھ لیجئے۔ ایک تو یوں کہ قانون افعال سے بحث کرتا ہے نیتوں سے نہیں۔ دوسرے یوں کہ اس معاملے میں ایسے قرائن پائے جا رہے ہیں جن کی موجودگی میں یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ شوہر کی نیت تین طلاقوں کی نہ ہوگی۔ یقیناً معاملات کی تمام مفروضہ اور ممکنہ اشکال کے قوانین وضع کرتے ہیں۔ ممکن بہر حال یہ بھی ہے کہ ایک شخص اس قدر احمق ہو کہ نہ تو عدّت کے معنی سمجھے نہ طلاق کے اور بیوی اسے لٹو کی طرح نچائے۔ اسی لئے فقہاء نے ایسی شکل بھی فرض کر ہی لی لیکن کسی چیز کا ممکن ہونا ہی تو یہ معنی نہیں رکھتا کہ اسے امرِ واقعہ مان لیا جائے۔ ایک لاکھ مسلمانوں میں ۹۹ ہزار نوسو آدمی تو یقیناً عدت و طلاق کا مفہوم جانتے ہیں لہٰذا قاضی کیوں نہ یہ سمجھے کہ شوہر جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے علم اور نیت کے ساتھ تین طلاق کے الفاظ دہرائے ہیں۔ اگر یہ اتنا ہی گدھا تھا کہ عدت و طلاق کا مفہوم نہیں جانتا تھا تب بھی قدرتاً اسے اتنا تو سوچنا ہی چاہئے تھا کہ بیوی کیا بکواس کر رہی ہے — یہ خواہ ممکن ہو مگر قرینِ قیاس نہیں ہے کہ اس نے الفاظ کو سمجھا بھی نہیں اور بیوی کا ایسا غلام ہوا کہ انھیں دہرا بھی دیا۔

لہٰذا قاضی یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہے کہ شوہر جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے علم اور نیت کے ساتھ الفاظ دہرائے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ اسے جھوٹ نہ سمجھتے ہوئے بھی اجتماعی مصالح کا تقاضا یہی ہے کہ تین طلاق کا فیصلہ دیا جائے۔ آخر کیا حضورؐ نے تنبیہ نہیں فرمائی کہ نکاح و طلاق اور رجوع تین چیزیں ایسی ہیں جن سے ٹھٹول اور مذاق بھی سنجیدگی ہی کے ہم معنی ہے۔ شوہر صاحب اگر الفاظ کا مفہوم سمجھے بغیر بیوی کے آگے طوطا بنے ہوئے ہیں تو اس ٹھٹول کو انگیز کرتے ہوئے قاضی کا یہ فیصلہ دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ الفاظ بیکار گئے اور طلاقیں نہیں پڑیں۔ یہ تو احمقوں کی حوصلہ افزائی اور ٹھٹول کی پشت پناہی ہوگی۔ حکمت کا کھلا تقاضا یہی ہے کہ تین طلاقوں کا فیصلہ دے کر لوگوں کو سبق دیا جائے کہ طلاق کھلونا نہیں۔ مذاق کا موضوع نہیں۔ ہاں عند اللہ اس لئے تین طلاقیں نہیں پڑیں گی کہ اللہ کا علم ظاہری قیاس و استدلال سے تعلق نہیں رکھتا۔ وہ تو عالم ذاتِ الصدور ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میرا فلاں بندہ اس قدر کوڑھ مغز ہے کہ واقعتہً اسے عدت اور طلاق کا مفہوم نہیں معلوم تھا اور بیوی کی احمقانہ ناز برداری نے اسے اُلّو بنا کر زبان سے الفاظ نکلوا دیئے۔ نیت اس کی طلاق دینے کی نہیں تھی لہٰذا وہ رجوع بھی کر لے تو نافرمان اور باغی نہیں ہے۔

ان تین باتوں کو نظر میں رکھئے اور پھر حضرت عمرؓ کے فیصلے پر توجہ فرمائیے۔ آپ نے محض رواروی میں یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں کہ "حضرت عمرؓ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا" — حضرت عمرؓ کبھی مسندِ قضا پر فائز نہیں ہوئے۔ انھوں نے کسی عدالت میں بطور قاضی اجلاس نہیں کیا۔ الفاظ کے غلط استعمال کی کوئی حد ہونی چاہئے۔ گفتگو ایک دقیق آئینی مسئلہ میں ہو رہی ہے۔ آپ شاعری فرما رہے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ حضرت عمرؓ حاکمِ وقت تھے نہ کہ قاضی۔ ان کے آگے اسی حیثیت میں قضیہ لایا بھی گیا تھا۔ ان پر کسی قاضی کی طرح یہ قانونی پابندی

عائد نہ تھی کہ نیتوں کی طرف توجہ نہ کرو۔ انھوں نے بیوی
اور شوہر کا بیان سنا۔ شوہر ساری کہانی سناتا ہے اور
عورت اس کی تردید نہیں کرتی۔ یعنی وہ نہیں کہتی کہ یہ
جھوٹ بول رہا ہے میں نے اس سے یہ نہیں کہا کہ میرا
نام "خلیۃ طالق" رکھو بلکہ اس نے خود اپنی مرضی سے
یہ الفاظ مجھے کہے۔ جب عورت تردید نہیں کرتی تو ثابت
ہو جاتا ہے کہ مرد کی نیت طلاق کی نہیں تھی۔ یہاں نیت کا
معاملہ واضح ہو گیا جب کہ خلاصہ والے جزئیے میں اسکے
برعکس قرائن پائے جا رہے ہیں۔ فقہاء جب وہاں بھی
یہ مانتے ہیں کہ عند اللہ تین طلاقیں نہیں پڑیں تو یہاں
تو اور بھی زیادہ یقینی ہے کہ عند اللہ طلاق واقع نہیں
ہوئی۔ پھر کیا ایک حاکم وقت اور سربراہِ مملکت اور اصلاحِ
معاشرہ کے ذمہ دار کی حیثیت میں حضرت عمرؓ کو عقل، نقل
انصاف، اخلاق، سیاست ہر لحاظ سے وہی فیصلہ کرنا
چاہئے تھا جو انھوں نے کیا؟ انھوں نے بالکل ٹھیک
کیا کہ عند اللہ جو بات درست تھی اسے ہی درست مانا اور
ظالم عورت کو ظلم کی سزا دی۔ وہ کسی قاضی کی طرح اس کے
پابند نہیں تھے کہ ذاتی علم اور مشاہدے کو فیصلہ کی بنیاد
نہ بنا سکیں۔ ان کا فیصلہ کسی عدالت میں بطور نظیر بھی پیش
نہیں ہونا تھا کیونکہ عدالت میں عدالتی نظائر کام آتے ہیں
حکام کے انتظامی یا سیاسی یا اصلاحی اقدامات اور فیصلے
کام نہیں آتے۔ امیر المومنین وقت کے سب سے بڑے حاکم
سہی لیکن منصب قضاء اپنے حیطۂ عمل میں خود سب سے بڑا
منصب ہے جس کے آگے امیر المومنین بھی بے بس ہو سکتے ہیں
اور ہوئے ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ایک یہودی کے
مقابلے میں حضرت علیؓ زرہ کا مقدمہ ہار گئے تھے اور حسن
جیسے بیٹے کی شہادت رد کر دی گئی تھی۔ حالانکہ عدالت کے
دائرے سے باہر کون تھا جو یہ کہہ سکے کہ حسنؓ کی بات
ناقابلِ اعتبار ہے۔ وہ حدیثِ رسولؐ بیان کرتے ہیں تو
مجال نہیں کہ شک کیا جا سکے لیکن عدالت کے قانون نے
ان کی گواہی قبول نہیں کی۔

آپ فقہاء یعنی متقدمین سے مجتہدانہ اختلاف کرنے
سے پہلے منصبِ امارت اور منصبِ قضاء کے باریک فرق
کو سمجھیں۔ پھر ان پر معترض ہوں۔ اگر انھوں نے یہ کہا ہوتا
کہ مذکورہ جزئیے میں عند اللہ بھی تین طلاقیں پڑ جاتی ہیں
تب یقیناً آپ حضرت عمرؓ والے فیصلے کا حوالہ دے کر فقہاء
کو غلط قرار دے سکتے تھے کیونکہ فریب خوردہ احمق شوہر کی
طلاق کو حضرت عمرؓ کا طلاق نہ ماننا یہ ثابت کرتا ہے کہ
ان کے نزدیک عند اللہ یہ واقع نہ ہوئی ہوگی۔ اگر واقع ہو جاتی
تو محال تھا کہ وہ ایک ایسی چیز کو غیر واقع قرار دیتے جو خود ان کے
نزدیک عند اللہ واقع ہو چکی ہو۔

یہ گفتگو میں نے آپ کے اس مفروضے کو صحیح مان کر کی ہے
کہ حضرت عمرؓ نے واقعۂ مذکورہ میں طلاق تسلیم نہیں کی لیکن
اگر میں یہ عرض کروں کہ آپ کا مفروضہ ہی غلط ہے تو مجھے
نہیں معلوم کہ آپ کیا جواب دیں گے۔ جتنا کچھ آپ نے
فتح القدیر سے نقل کیا اس میں تو یہ کہیں بھی نہیں کہ حضرت عمرؓ
نے طلاق کو واقع نہیں مانا۔ خلیّۃ اور طالق تقریباً ہم معنی
الفاظ ہیں اور طالق تو قطعاً صریح ہے لہٰذا ان الفاظ سے
ایک طلاقِ رجعی واقع ہو سکتی ہے۔ خلیّۃ اور طالق کے درمیان
عطف نہیں اس لئے ہر لفظ سے الگ الگ طلاق فرض نہیں
کی جا سکتی۔ تاہم بحث سے بچنے کے لئے یہ مان بھی لیجئے کہ ہر لفظ
ایک طلاق کا موجب بن رہا ہے تو زیادہ سے زیادہ دو طلاقیں
واقع ہوئیں۔ دو بھی ایک طلاق کی طرح رجعی ہوتی ہیں لہٰذا
حضرت عمرؓ کے متذکرہ طرزِ عمل اور فیصلے کا مطلب یہ بھی ہو
سکتا ہے کہ انھوں نے رجوع کرا دیا۔ رجوع کے متعلق معلوم
ہے کہ زبان ہی پر اس کا انحصار نہیں بلکہ مرد کوئی بھی فعل ایسا
کر لے جو زن و شوہر کے مابین مخصوص ہو اس سے رجعت
ہو جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اس کا ہاتھ پکڑ لے۔ اس کا یہ
مطلب تو یقیناً ہے کہ یہ مکارہ تیری زوجیت سے بچ کر بھاگنے
کی حق دار نہیں مگر یہ مطلب یقینی نہیں ہے کہ انھوں نے طلاق
کا وقوع نہیں مانا۔ طلاقِ رجعی کی صورت میں عورت کے لئے

ممکن نہیں ہوتا کہ رجعت کی راہ روک سکے۔ مرد کو مکمل اختیار ہوتا ہے کہ رجوع کرلے خواہ عورت چاہے یا نہ چاہے۔

حاصل یہ کہ آپ نے ایک ایسا دعویٰ کیا جس کا کوئی ثبوت آپ کی نقل میں موجود نہیں۔ پھر بھی از راہِ رعایت اس دعوے کو تسلیم کرتے ہوئے بھی میں نے تجزیہ پیش کردیا کہ ابن ہمام کے پیش کردہ جزئیہ سے آپ کا اختلاف غلط فہمی یا کم فہمی پر مبنی ہے۔

آگے جو دو نظیریں آپ نے عالمگیری اور شامی سے پیش کیں ان کے لئے بھی میری اوپر کی تقریرِ کلام کافی ہے۔ عالمگیری والی مثال میں نہ علم ہے نہ نیت اور شامی والی مثال میں علم ہے مگر نیت نہیں۔ گویا "نیت" کا نہ پایا جانا دونوں مثالوں میں مشترک ہے، لہٰذا میں پھر وہی بات دہراؤں گا کہ آپ نے طلاق نمبر کو سمجھ کر نہیں پڑھا۔ میں نے صرف اس طلاق کو گولی سے تشبیہ دی ہے جس کی پشت پر نیت کارفرما ہو۔ اور نیت نہ پائے جانے کی صورت میں میں نے بھی برابر یہ تسلیم کیا ہے اور حدیث سے اس کی مثالیں دی ہیں کہ طلاق نہ واقع ہونے کا فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔

شامی کی نظیر پیش کرنے کے بعد آپ نے اس کی وضاحت کے ذیل میں ایک اور جزئیہ نقل کیا جو آپ کی دانست میں میرے اس دعوے کو رد کرتا ہے کہ قانون میں جہالت کا عذر معتبر نہیں۔

اس کے جواب میں پہلی بات تو یہ عرض ہے کہ نادر و نایاب قسم کی جزئیات فقط مستثنیات کا درجہ رکھتی ہیں قانونی اصول و کلیات ان سے مسترد نہیں ہوا کرتے۔ "طلاق نمبر" میں طلاق کی عام قانونی حیثیات زیرِ بحث ہیں۔ کسی خاص واقعے اور مقدمے پر گفتگو نہیں۔ لہٰذا وہاں جو کچھ کہا جائے گا کلیات اصول ہی کے رُخ پر کہا جائے گا۔ دین اور دنیا دونوں کے قوانین میں ماہرینِ قانون نے یہ بات ضروری سمجھی کہ لوگوں کا جہل معتبر نہ مانا جائے۔ اگر عذرِ جہل کا اعتبار ایک ضابطہ مان لیا جاتا ہے تو نظامِ عدالت درہم برہم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کوئی معقولیت نہیں کہ کسی خاص زمانے اور خاص شہر میں پیش آنے والے ایک نادر قسم کے مقدمے کا جو فیصلہ کچھ فقہاء نے کر دیا تھا اسے ایک مسلّم ضابطے اور اصول کے استرداد میں استعمال کیا جائے۔ کوئی بھی نظیر اسی وقت کارآمد ہوا کرتی ہے جب وہ صریح طور پر کسی بنیادی اصول کے خلاف نہ ہو۔ آپ نے ڈھونڈ کر جو نظیر پیش کی وہ بنیادی اصول کے خلاف ہے لہٰذا اس کا حوالہ ایسی بحث میں بالکل فضول ہے جو فروعات کے گرد نہیں اصول و کلیات اور اساسی ضوابط کے گرد گھوم رہی ہے۔

دوسری بات یہ عرض ہے کہ آپ کے پیش کردہ جزئیہ میں ایک عنصر "فریب" کا بھی بڑھا ہوا ہے۔ یقینی بات ہے کہ یہی عنصر فقہاء کے اس خاص فیصلے کا محرک اور داعی بنا جسے آپ مستدل بنا رہے ہیں۔ دیکھ لیجئے۔ عالمگیری سے جو مثال آپ نے پیش کی اس میں یہ طے کر دینے کے باوجود کہ شوہر "انتِ طالق" کے مفہوم و مصداق سے ناواقف ہے فقہاء نے فیصلہ یہی دیا ہے کہ قضاءً طلاق پڑ جائے گی۔ گویا فقط جہالت کو قاضی عذر تسلیم نہیں کرے گا۔ پھر مشائخ اوزجند کے فیصلے کا اس سے مختلف ہونا کیا واضح قرینہ اس بات کا نہیں ہے کہ "فریب" والا عنصر اس کی بنیاد بنا ہے۔ انھوں نے اسی لئے طلاق کو قضاءً بھی واقع نہیں مانا کہ سارا قضیہ دھوکے بازی کی بنیاد پر کھڑا ہے اور مجرم صریحاً عورت ہے نہ کہ شوہر۔

طلاق نمبر میں جتنی بھی شکلیں زیرِ بحث آئی ہیں آپ ایک بھی ان میں ایسی نہیں دکھلا سکتے جس میں الفاظِ طلاق کہلوانے میں بیوی کے کسی مکر و دغا کا شمول ہو۔ وہاں صرف اور صرف ان صورتوں سے بحث ہے جن میں شوہر اپنے ہی کسی صحیح یا غلط جذبے اور جوش میں طلاق دیتا ہے۔ لہٰذا آپ کا ایسے واقعات ڈھونڈ کر لانا جو صریحاً عورت کے مکر اور دھوکے کا شاخسانہ ہوں قلم درازی تو کہلائے گا فقاہت نہیں۔

اور اگر آپ یہ فرمائیں کہ اس نظیر سے کم سے کم یہ تو ثابت ہو گیا کہ طلاق گولی نہیں ہے تو میں کہوں گا کہ یہ محض طوطے والی گردان ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ یہاں بھی فعل کے

ساتھ نیت کا وجود نہیں ہے جب کہ گولی کے مشابہ میں اسی طلاق کو کہتا ہوں جو نیت سے مربوط ہو۔

آپ سمجھنا چاہیں یا نہ سمجھنا چاہیں۔ میں تفہیم کیلئے ایک مثال اور دوں گا۔

شراب میں کھٹائی کا بہت سا محلول آمیز کر دیجئے، اس کی صلاحیتِ نشہ آوری ختم ہو جائے گی۔ اس کے باوجود یہ کلیہ پھر بھی اپنی جگہ اٹل رہے گا کہ "شراب نشہ لاتی ہے"۔

علاوہ اس کے بعض بلا نوش ایسے ہوتے ہیں جنھیں بوتل کی بوتل چڑھا جانے کے بعد بھی وہ نشہ نہیں ہوتا جو ہوش و خرد کو پوری طرح معطل کر دے۔ پھر بھی اس کلیہ پر حرف نہیں آتا کہ "شراب نشہ آور ہے۔"

گویا کوئی کلیہ کسی خارجی سبب کی بنا پر کچھ دیر کو معطل تو ہو سکتا ہے مگر مردہ نہیں ہو سکتا اور جب بھی یہ سبب زائل ہوگا کلیہ بحال ہو جائے گا۔ "قانون سے بے خبری قانون کے نفاذ و اثر میں مانع نہیں ہوا کرتی" یہ ایک کلیہ ہے جسے ماہرین نے ایک اہم ترین اساس کے طور پر قبول کیا ہے۔ حضرت عمرؓ والے واقعے یا اوزجند والے واقعے میں فریب کا عنصر سبب بن گیا ہے اس کلیہ کے تعطل کا۔ یہ گویا کھٹائی ہے جو شراب میں مل گئی ہے۔ اس وقت اگر حضرت عمرؓ یا مشائخ اوزجند یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ طلاق نہیں پڑی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بنیادی کلیہ ہی مسترد ہو گیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس خارجی سبب نے اسے وقتی طور پر معطل کر دیا۔ جہاں جہاں یہ سبب پایا جائے گا تعطل بھی پیدا ہوگا۔ جہاں نہیں پایا جائے گا کلیہ اپنا کام کرے گا۔

فقہاء کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اپنی فروعی آراء کلیات کی روشنی میں مرتب کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ جب جو جی میں آئے کہہ گذریں اور یہ نہ سوچیں کہ فلاں رائے ہم کس اصول اور ضابطے کی بنیاد پر قائم کر رہے ہیں۔

مگر آنجناب نے جو رائے قائم کی ہے اس کے پیچھے کوئی صحیح یا غلط کلیہ اور اصول ہے ہی نہیں۔ اس کی مثال ایک ایسی ٹہنی کی ہے جو کسی بھی شجر سے وابستہ نہ ہو۔ اسی لئے خطا معاف میں اسے بے سرو پا سمجھتا ہوں۔ آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں چاہے اس سے بھی بڑھ کر بے تکی آراء قائم کرتے رہیں لیکن یہ محض خوش فہمی ہے کہ آپ کی زیرِ بحث رائے کی کوئی نہ کوئی بنیاد فقہاء کے یہاں موجود ہے۔ جتنی امثلہ آپ نے پیش فرمائیں ان میں ایک بھی نہیں جس میں مجرد بے خبری کو قانون کی تاثیر کا حاجب اور مانع تسلیم کر لیا گیا ہو۔

یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ آپ اس شوہر کو جو ازراہِ جہالت تین طلاق کو تین نہ سمجھتا ہو ایسا ہی فریب خوردہ تصور فرما رہے ہیں جیسا وہ شوہر جسے بیوی نے دھوکا دیکر الفاظِ طلاق منھ سے نکلوا لئے ہوں۔

اے پیارے دوست! تفقہ کی سطح اتنی نہ گرائیے۔ رعایت اور کرم کا مستحق قانونِ شرعی میں وہ شخص تو یقیناً ہو سکتا ہے جسے بیوی یا کوئی بھی دوسرا فرد دھوکا دے کر نقصان پہنچا دے۔ اسے بلاشبہ "فریب خوردہ" کہیں گے مگر جو شخص ذرائع علم موجود ہونے کے باوجود جاہل رہ گیا ہو وہ اگر کسی اور کے بہکائے بغیر اپنی مرضی اور ارادے سے جہالت کا مظاہرہ کرتا ہے تو حقیقتاً وہ فریب خوردہ نہیں جہالت زدہ ہے۔ اس کے بارے میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی نے دھوکا دے کر اس سے یہ کام کرا لیا۔ ایسے مواقع کے لئے اہلِ علم و ادب کی زبان میں غلط فہمی یا نادانستگی یا بے خبری جیسے الفاظ مستعمل ہیں اور آپ ایک ہزار بار بھی اسے "فریب خوردہ" کہہ کر اسی رعایت کا مستحق ٹھیرانا چاہیں جو پہلی قسم کے فریب خوردہ کے لئے موزوں ہے تو کون ہوشمند اسے قبول کرے گا۔ دوسرا مسئلہ کی دوسری شق اور اس کا جواب انشاء اللہ اگلی صحبت میں ملاحظہ فرمائیے۔

قرآن اور تعمیر سیرت تعلیمات قرآنی کا نچوڑ تصوف اور ادب صالح کا دلکش مجموعہ ڈاکٹر میر ولی الدین کے قلم سے۔ قیمت ــــ چھ روپے۔

جائزہ تراجم قرآنی دنیا میں کب اور کس زبان میں قرآن کے تراجم ہوئے۔ اس کی تحقیق و تفصیل مترجمین اور شارحین کے نام۔ بہت عمدہ اور معلومات افزا کتاب ہے۔ قیمت ــــ چھ روپے

غنیۃ الطالبین مصنفہ :- شیخ عبد القادر جیلانیؒ قیمت :- مجلد ــــ تیس روپے۔

تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات قاہرہ کے ایک فاضل بیرسٹر عبد اللہ عنان کی تالیف نئے اسلوب میں۔ تاریخ اسلام کے بعض وقائع پر علم و تحقیق کی روشنی۔ قیمت ــــ ساڑھے سات روپے

اسلام اور ترقی مولانا اشرف علیؒ کے افادیت سے لبریز ارشادات۔ قیمت - ۶۰ پیسے

تذکرہ مولانا عبد اللطیف نعمانی ملک و ملت کی ایک ممتاز شخصیت مولانا عبد اللطیف نعمانی شیخ الحدیث مفتاح العلوم مئو۔ ۱۳۹۲ھ کی دینی، علمی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی کے زندۂ جاوید کارنامے اور اہل علم و رہنمایان ملک و ملت کے خراجہائے عقیدت۔ قیمت ــــ پانچ روپے۔

تاریخ الفخری تاریخ اسلامی کی ایک مشہور اور مستند کتاب کا ترجمہ اردو، فارسی اور فرنچ زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ آپ کی خدمت میں اردو ترجمہ حاضر ہے۔ قیمت ــــ گیارہ روپے۔

سفر مصر و حجاز امیر شریعت مولانا منت اللہ بہاری کے قلم سے ایک بصیرت افروز معلومات افزا سفرنامہ۔ قیمت ــــ ڈھائی روپے۔

آنکھوں کی ٹھنڈک اللہ کے سوا کوئی حاضر و ناظر نہیں جو مسلمان اس غلط خیال کا شکار ہیں کہ رسول اللہ صلعم بھی حاضر و ناظر ہیں۔ ان کے خیال کی مدلل تردید قرآن و حدیث کے روشن دلائل۔ فقہاء و مجتہدین کے مستند حوالے۔ قیمت مجلد ــــ آٹھ روپے۔

مناجات مقبول (کرمی) عکسی مولانا اشرف علیؒ کی مقبول عام اور مفید ترین کتاب پرانے اور نئے اضافوں کے ساتھ۔ قیمت ــ چھ روپے (مجلد ــ سات روپے)

رمضان کیا ہے؟ مولانا محمد عبد اللہ دہلویؒ کے رشحات قلم۔ رمضان کے موضوع پر خوبتر کتاب۔ قیمت مجلد ــــ تین روپے۔

تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے شاندار ماضی میں دین کی تبلیغ و تعلیم کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ مسجدیں، راستے، بازار کہیں بھی ہوں مسلمان بنے رہے۔ دنیا کے کاروبار نے انھیں دین سے غافل نہیں کیا۔ انشاء :- قاضی اطہر مبارک پوری۔ ڈیڑھ روپیہ

التشرف احادیث تصوف کی معرفت مولانا اشرف علیؒ کی معروف کتاب۔ قیمت ــ سولہ روپے۔

مکتوبات خواجہ معصوم سرہندیؒ معارف و اسرار ہدایات و نصائح اور نکات و لطائف سے لبریز خطوط اردو لباس میں مطالعہ کی بہترین چیز۔ قیمت ــــ چھ روپے۔

امت مسلمہ کی رہنمائی حضرت عمرؓ کی تعلیمات میں مولانا تقی امینی کی ایک تازہ تصنیف انفرادی و اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں حضرت عمرؓ کے اصلاحی فرمودات و اقدامات، دور رس حکمتوں سے لبریز۔ قیمت ــــ دو روپے۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔ پی)

از:- حافظ ابو محمد امام الدین رام نگری

جماعت اسلامی کے خلاف

جمعیۃ العلماء کی فتنہ پردازی کا دورِ جدید

اخبار الجمعیۃ دہلی جو جمعیۃ العلماء کا ترجمان ہے، میرے پاس نہیں آتا۔ کبھی کبھی کوئی پرچہ مل جاتا ہے۔ جمعیۃ العلماء اور دار العلوم دیوبند نے ایک بار جماعتِ اسلامی کے خلاف فتوے، رسائل اور مضامین کی مہم جاری کی تھی جو دار العلوم اور جمعیۃ العلماء کی ذلت و رسوائی پر ختم ہوئی۔ اس دور کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ دیوبند کے دار الافتاء کا قلم جماعتِ اسلامی کے خلاف فتویٰ نویسی کے لئے وقف کر دیا گیا تھا۔ کسی کو مذاق سوجھا اس نے حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ کی ایک کتاب کی کچھ عبارتوں کے متعلق استفتاء مرتب کرکے دیوبند بھیج دیا۔ اس میں کتاب کا نام درج نہ تھا۔ مفتی صاحب نے مولانا کی کتاب کی عبارتوں کو جماعتِ اسلامی کی کتاب کی عبارت سمجھا اور فتوے میں مصنف کو بدمذہب و بد اعتقاد اور سب کچھ بنا کر رکھ دیا۔ شعر کی زبان میں:-

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

مستفتی نے استفتاء، فتویٰ اور کتاب کا نام سب کچھ اخبار دعوت دہلی میں شائع کرا دیا۔ کیا گزری ہوگی حضرت مولانا محمد طیب صاحب دامت برکاتہم اور مفتی صاحب پر؟ کچھ بھی نہیں۔ یہ تو ہم اور آپ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن حقیقتِ حال کچھ اور ہے یہ بزرگانِ کرام اتنے عالی مقام ہیں کہ ان کے خلاف بڑی سے بڑی بات ان کے قدم بھی چھو نہیں سکتی۔ پھر ان کے دامنِ تقدس کا کیا کہنا' بایں ہمہ جماعتِ اسلامی بھی ریت کی دیوار نہ تھی کہ قلمی اور کاغذی گولی باری سے ڈھیر ہو جاتی۔ دعوت میں گاہ گاہ اور ماہنامہ تجلی دیوبند میں دار العلوم دیوبند کے اکابر و شیوخ کے دامن کی دھجیاں اترتی اور بکھرتی رہیں۔ انجام کار جماعتِ اسلامی کے خلاف چلائی ہوئی مہم ناکامی پر ختم ہو گئی' جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے الجمعیۃ میرے پاس نہیں آتا۔ ماہنامہ دار العلوم برسوں سے خاموش ہے اور اس کے مقام و وقار کا یہی مقتضیٰ بھی ہے۔ لیکن الجمعیۃ کے دو شمارے سامنے آ گئے تو دیکھا جمعیۃ العلماء نے فتنۂ خوابیدہ کو بیدار کر دیا ہے۔ گڑے مُردوں کو اکھیڑ کر کفن کے بجائے جبہ و دستار سے آراستہ کرکے کھڑا کر دیا گیا ہے۔ بعض جو کتابچے ختم ہو گئے تھے ان کو الجمعیۃ بکڈپو نے دوبارہ شائع کر دیا ہے۔ اور اس شان سے گویا ان کے ردّ و جواب میں کسی نے کبھی قلم ہی نہیں اٹھایا۔ کتابیں اور کتابچے یہ ہیں:- ایمان و عمل۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ۔ اس کا رد راقم الحروف کے قلم سے تجلی میں شائع ہو چکا ہے۔ مکتوبات ہدایت۔ یہ مکتوبات مولانا ابو اللیث کے خطوط کے جواب میں شیخ الاسلامؒ کے تحریر کردہ ہیں۔ مولانا ابو اللیث امیر جماعت کی حیثیت سے چاہتے تھے کہ باہمی گفتگو کے ذریعہ مفاہمت ہو جائے لیکن مرحوم نے اختلاف ہی میں دین و ملت کی فلاح سمجھی اور ملاقات سے انکار کر دیا۔ "جماعتِ اسلامی پر تبصرہ حصہ اول و دوم"۔ مولانا عبید اللہ رحمانی علیہ الرحمۃ رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند

و نائب امیر شریعت بہار و اڑیسہ۔ اس کے حصہ اول کا رد راقم الحروف کتابی صورت میں شائع کر چکا ہے۔ چند کاپیاں اب بھی مکتبے میں کہیں دبی پڑی ہیں۔ تجلی میں نہیں آیا ہے۔ میں چاہوں گا کہ مولانا عامر عثمانی چند سطوں میں سہی اسے شائع کر دیں۔ اس کتابچہ سے مقدسین ملت کی حق پسندی کی حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔ "جماعتِ اسلامی کا دینی رخ" مولانا عبد الصمد رحمانی' حصہ اول و دوم اس کے حصہ اول کا رد و جواب بھی راقم الحروف تجلی میں لکھ چکا ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے خلاف کتابی صورت میں مفتی مہدی حسن کا لکھا ہوا فتویٰ دار العلوم کے ۲۴ علماء و مشائخ کی تصویب و توثیق کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ راقم الحروف نے اس کا رد و جواب تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر "فتویٰ دیوبند کا تحقیقی جائزہ" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس وقت تک پاکستان وی پی جاتے آتے تھے۔ چھ مہینے کے اندر ایک ہزار کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ ایک ہزار دوبارہ چھپا۔ مدت ہوئی اس کو ختم ہوئے۔ یہ جماعت کا ایک المیہ ہے کہ جماعت کے خلاف پروپگنڈہ ہوتا رہتا ہے' غلط فہمی پھیلتی رہتی ہے۔ تحریک و دعوت کو نقصان پہنچتا رہتا ہے لیکن ذمہ دارانِ جماعت اس نقصان کو محسوس ہی نہیں کرتے اگر جوابی لٹریچر شائع ہوتا رہتا تو جمعیۃ العلماء کو ان پٹی ہوئی کتابوں کو از سرِ نو شائع کرنے کا حوصلہ نہ ہوتا۔ حد یہ ہے کہ ٹونک اور ندوۃ العلماء کے مفتیوں نے جماعت کے لٹریچر کے حق میں جو فتوے دیئے ہیں وہ بھی کتابی صورت میں جماعت اسلامی کے یہاں سے شائع نہیں ہوئے۔ میں جمعیۃ العلماء کو دعوت دوں گا کہ وہ ۲۴ اکابر دیوبند کے دستخطی فتوے کو شائع کر دے اور ایڈیٹر تجلی سے درخواست کروں گا کہ وہ میرا جائزہ بالاقساط شائع کر دیں' اختصار کے ساتھ سہی تاکہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ حق کی مخالفت کرنے والوں کا رشتہ علم و فضل' فہم و فقاہت اور تقویٰ و حق پرستی سے کس طرح منقطع ہو جاتا ہے۔ فتویٰ مذکور اتنا ذلیل ہے کہ اس نے دار العلوم کے کنگرۂ وقار کو زمیں بوس کر دیا ہے۔ بہار کے سیرت کے جلسے میں میں مدعو تھا حضرت مولانا عبد الشکور لکھنوی علیہ الرحمۃ کے مدرسے کے استاد مولانا ..... بھی مدعو تھے انھوں نے کہا۔ میں نے مدراس کے سفر میں تمہارا جائزہ دیکھا شرم سے میرا سر جھک گیا کہ دار العلوم دیوبند کا ایسا فتویٰ! میں اعلان کرتا ہوں کہ الجمعیۃ بکڈپو کو اس فتویٰ کی اشاعت کا ہرگز حوصلہ نہ ہوگا۔

صاحب زادے عزیز احمد قاسمی بی۔ اے بھی بڑوں کے ساتھ بچھڑوں کی طرح اچھل کود کر رہے تھے۔ شاید دورِ جدید کی مہم کے وہی سربراہ بنائے گئے ہیں اس لئے حضرت شیخ الاسلام کے رسالے "ایمان و عمل" کو کسی بزرگ نے نہیں صاحب زادے نے اپنے مقدمے سے مزیّن و مشرف فرمایا ہے جو پروپگنڈے کے افتتاح کے طور پر ادارۂ الجمعیۃ کے پیش لفظ کے ساتھ ۲۱ رجون کے الجمعیۃ میں شائع ہوا ہے اور اعلان کیا گیا ہے کہ نئی نسل کے نوجوانوں کو مودودیت سے محفوظ رکھنے کے لئے "ایمان و عمل" بالاقساط الجمعیۃ میں شائع ہوگا۔ مقدمہ نگار نے مولانا مودودی کی تحقیر و تذلیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ علیہ الرحمۃ کے فتوے کو سند بنایا گیا ہے جس میں ممدوح نے تحریر فرمایا ہے کہ "مولانا مولوی سید ابو الاعلیٰ مودودی کسی بھی امام کے قائل نہیں ہیں۔ آزاد خیال آدمی ہیں اس لئے ان کا اتباع شرعاً ناجائز ہے۔" مولانا مودودی کی آزاد خیالی کے ثبوت میں مقدمہ نگار نے ممدوح کی یہ عبارت نقل کی ہے "جس مسئلے میں مجھے تحقیق کا موقع ملتا ہے' چاروں اماموں کے مذہب پر نظر ڈالتا ہوں اور جس کی تحقیق کو قرآن و حدیث کی منشاء سے زیادہ قریب پاتا ہوں اس کی پیروی کرتا ہوں۔" اس عبارت کو نقل کر کے مقدمہ نویس نے لکھا ہے "یہ اجماع کے خلاف ہے اس کو اتباعِ نفس کہا گیا ہے۔"

یہ ہیں دار العلوم دیوبند کے نونہال' نہ جانے ناواقفیت کی بنا پر مولانا مودودی کے طریقۂ کار پر یہ رائے دائمی ہے یا از راہِ تلبیس و فریب۔ قرآن و حدیث مطابق چاروں ائمہ

ین سے کسی کے اتباع کو اتباعِ نفس کیسے قرار دیا جاسکتا
ہے؟ اتباعِ نفس اسے کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے ذاتی
غراض کے لئے کبھی کسی امام کی پیروی کرے اور کبھی کسی امام
لی۔ اس کے پیشِ نظر نفسانی آسانیاں ہوں۔

مولانا مودودی کے طریقۂ کار کو مقدمہ نگار نے
نباع نفس قرار دیا ہے اسے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح
لی رائے کی روشنی میں دیکھئے۔ تفہیمات میں تحریر فرماتے ہیں:

"میرے دل میں ایک خیال ڈالا گیا ہے اور اس کی
فصیل یہ ہے کہ ابوحنیفہ اور شافعی کے مذہب امت میں
ب سے زیادہ مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ پیرو بھی انھیں
ونوں کے پائے جاتے ہیں اور تصنیفات بھی انھیں مذاہب
لی زیادہ ہیں، فقہاء، مفسرین، متکلمین اور صوفیہ یادہ شافعی
ہب کے ہیں اور حکومتیں اور عوام زیادہ تر حنفی مذہب کے
یرو ہیں۔ اس وقت جو امرِ حق ملاء اعلیٰ کے علوم سے مطابقت
کھتا ہے وہ یہ کہ دونوں کو ایک مذہب کی طرح کر دیا جائے۔
ونوں مذاہب کو حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعوں سے
قابلہ کر کے دیکھا جائے۔ جو کچھ ان کے موافق ہو اسے باقی
کھا جائے اور جس کی کوئی اصل نہ ملے اسے ساقط کر دیا جائے
پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں اگر وہ دونوں مذہبوں
یں متفق علیہ ہوں تو وہ اس قابل ہیں کہ انھیں دانتوں سے
کڑ لیا جائے اور اگر ان دونوں میں اختلاف ہو تو دونوں قول
سلیم کئے جائیں اور دونوں پر عمل کرنے کو صحیح قرار دیا جائے۔"

(الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر، صہ ۱۰۲)

دیکھئے مولانا مودودی کا طریقہ شاہ صاحب کے الہام سے
س قدر مطابق ہے۔ مولانا کے معترضین شاہ صاحب کے الہام
و غور بار بار پڑھیں حضرت شاہ صاحب کا الہام مظہر ہے
ہ حنفی اور شافعی مذاہب میں احادیث کے خلاف بے اصل
یزیں بھی ہیں جو ساقط کر دینے کے لائق ہیں پھر رد و قبول
ی یہ ہدایت شاہ صاحب علمائے وقت ہی کو دیتے ہیں۔
جتہد کی شرط نہیں لگاتے شاہ صاحب کی ہدایت پر عمل
ہ ہوسکا اور مولانا مودودی شاہ صاحب کی ہدایت کے مطابق

کام کرتے ہیں اور چاروں مذاہب پر نگاہ ڈال لیتے ہیں
تو یہ طریقہ بجائے خود صحیح کیوں نہیں ہے۔ آپ مولانا مودودی
کو اس لائق نہیں سمجھتے تو اپنی لیاقت اپنے پاس رکھیں عالمِ اسلام
تو ان کو اسلام کا جلیل القدر عالم اور شارح مانتا ہے یہی
مولانا کی اتباع کی بات تو سرے سے استفتا اور فتویٰ ہی
بے اصل ہے۔ جماعتِ اسلامی کی تشکیل کے اجتماع میں
مولانا محمد منظور نعمانی، مدیر الفرقان اور رکن مجلسِ شوریٰ
دارالعلوم دیوبند بھی موجود تھے، مولانا مودودی کو
امیرِ جماعت منتخب کیا گیا۔ اور انھوں نے بحیثیت امیر
تقریر کی تو انھوں نے واضح طور پر اعلان کر دیا کہ فقہی
مسائل کی تحقیق کے سلسلے میں مجھ پر کوئی پابندی عائد نہ
کی جائے اور فقہی مسائل میں ارکان کے لئے میری پیروی
ضروری نہیں۔" (ملخصاً) مولانا کی یہ تقریر جماعتِ
اسلامی کی روداد حصہ اول میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جب
مولانا نے ارکانِ مجلس کو فقہی مسائل میں اپنے اتباع سے
آزاد کر دیا ہے تو عام مسلمانوں کا کیا ذکر؟ مولانا نے تو
ایک بار عام اعلان کر دیا تھا کہ جماعت سے متعلق امور
میں مجھ سے استفسار کیا جائے فقہی مسائل علماء سے دریافت
کر لئے جایا کریں۔ دیوبندی اکابر و اصاغر کو جان لینا
چاہئے کہ جماعتِ اسلامی والے تفسیر و حدیث اور فقہ
کسی میں اپنے کو مولانا مودودی کا متبع نہیں مانتے۔

فقہی امور میں مولانا مودودی کی رائے غلط ہو
سکتی ہے۔ مثلاً مقدمہ نگار نے لکھا ہے کہ مولانا مودودی
بندوق کے شکار کو تیر کے شکار پر قیاس کر کے جائز
قرار دیتے ہیں جو تمام فقہاء کے نزدیک ناجائز ہے۔ یہ
مولانا کی اپنی رائے ہے وہ کسی کے لئے اپنی رائے کا ماننا
ضروری قرار نہیں دیتے۔ کوئی نہ مانے ان کی رائے! انکار و
اختلاف تو مانے ہوئے مجتہدین و مفسرین و محدثین
سے کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ ہمارے علماء نے تو انکو
بدعقیدہ اور خارجی بنا کر رکھا ہے۔ جماعت اسلامی
والے مولانا مودودی کے مخالفین و معترضین کے حملوں کا

دفاع اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ان کے مقلد اور متبع ہیں۔ دفاع اس لئے کرتے ہیں کہ اعتراض اعتراض نہیں معاندانہ افترا و بہتان ہوتے ہیں مقصود مسلمانوں کو ان سے بدظن کرنا ہوتا ہے اور ان کو تنقید کی آڑ بناکر اقامتِ دین کی تحریک و دعوت کو سبوتاژ کرنا۔ ادھر ہوا یہ ہے کہ کلکتہ میں جماعتِ اسلامی نے بنگلہ دارالاشاعت کے قیام اور ہفت روزہ اخبار کے اجرا کا پروگرام بنایا تو جمعیۃ العلماء کی طرف سے اس کی مخالفت کی گئی کہ جو ناکام ہوکر رہ گئی۔ اس کے بعد کیرالہ میں جماعتِ اسلامی کے اجتماع کو ناکام بنانے کے لئے جمعیۃ العلماء نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا وہاں سے بھی ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ اور ایسے ہی دوسرے ناپاک محرکات ہوں گے جو جماعتِ اسلامی کے خلاف نئی مہم چلائی گئی ہے۔

ہمارے نزدیک یہ بڑی تکلیف دہ بات ہے کہ جماعتِ اسلامی والے اکابرِ دیوبند کا احترام کرتے ہیں اور جمعیۃ العلماء نے شیخ الہند مولانا عبدالصمد رحمانی حضرت مفتی کفایت اللہ مرحومین کو قبروں سے باہر لا کھڑا کیا ہے تاکہ جمعیۃ العلماء کے موجودہ سربراہوں کے جُبّہ و دستار محفوظ رہیں۔ دھجیاں اُڑیں تو مرحومین کے کفن کی اُڑیں یہ ان بزرگوں پر کتنا بڑا ظلم ہے۔ شیخ الاسلام کے صاحبزادے مولانا اسعد اور ان جیسے دوسرے حضرات کیوں میدان میں نہیں آتے۔ ان کے علم و قلم کی داد دینے کے لئے ایڈیٹر تجلّی ہی موجود ہیں۔

تجلّی

اخبار الجمعیۃ کے کچھ تازہ تراشے بعض حضرات نے ہمیں بھی بھیجے تھے اور لکھا تھا کہ ان کا نوٹس لیں۔ ان تراشوں کا تعلق اسی "ایمان و عمل" سے تھا جس کا تذکرہ اوپر آیا ہے۔ ہم نے سب کو جواب لکھ دیا تھا کہ بھائی مولانا حسین احمد رحمۃ اللہ علیہ کی اس کتاب پر تجلّی نے اُسی زمانے میں جب یہ شائع ہوئی تھی تنقیدی نمبر نکالا تھا۔ یہ نمبر ہند و پاک میں

خاصا پھیلا۔ تقریباً چھ ہزار کاپیاں تو پاکستان ہی گئی ہونگی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا مودودی پر کئے گئے اعتراضات کی غلطی واضح ہوگئی اور کسی کو جواب کی جرأت نہ ہوئی۔ تجلّی کے اس نمبر کا خلاصہ بھی کسی صاحب نے پاکستان میں "حقیقت" کے نام سے چھاپ دیا تھا۔ اب لمبا سال بعد جمعیۃ علمائے ہند والے اگر پھر سے اس فتنے کو کھڑا کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی زوال آمادہ نیکنامی اور بڑھتی ہوئی نامقبولیت نے انھیں پریشانی میں ڈال رکھا ہے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کریں۔

ویسے انگریز کا طریقہ تھا کہ جب مسلمانوں میں فروعی مسائل کے اختلافات کا بازار کچھ سرد ہوتا دیکھتا تھا تو کسی نہ کسی فریق کو اُبھار دیتا کہ کیوں ٹھنڈے پڑے ہو۔ خرچہ ہم سے لو اور گرما گرمی شروع کردو۔ کیا بعید ہے کہ مسلمانوں کے افتراق و انتشار کے خواہاں کسی مہاجن نے یہی ٹکنک آج بھی استعمال کی ہو اور گڑے مُردے اُکھاڑنے کی مزدوری جمعیۃ کو اچھی خاصی مل جائے۔

ہمیں بہرحال ان لغویات سے اب دلچسپی نہیں۔ ہمارا کام علم و تحقیق کی خدمت ہے نہ کہ پروپیگنڈوں کی جواب دہی میں وقت ضائع کرنا۔ جو ضرورت سمجھے تجلّی کے فائلوں سے جب چاہے ہر جمعیتی اعتراض کا شافی کافی جواب نکال کر پمفلٹ وغیرہ کی شکل میں شائع کرسکتا ہے۔

ہمارا تو خیال یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کی پگڑی اُچھالنے والی اس جماعتِ صالحین سے سب سے پہلے یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ ایک سے زائد بار انگریزی اخبار کے نام پر جو ہزاروں ہزار (بلکہ لاکھ سے اوپر) روپیہ وہ جمع کرچکی ہے وہ کن مقدس حضرات کے کھاتے میں درج ہے۔ دوسروں کے ایمان و عمل پر لکھنوی نزاکتوں کا نشتر آزمانے والے پہلے اپنی دیانت کا حساب تو قوم کے آگے رکھیں۔

اسلام اور نظام اسلام

ایک ہندو دوست کا مکتوب اور اس کا جواب

میرے محترم جناب مولانا صاحب مدیر تجلی! آداب نیاز میں خاندانی ہندو ہوں مگر یہ فیصلہ نہیں کرسکا ہوں کہ میرا مذہب کیا ہے۔ میں نے تاریخ اسلام اور کچھ مذہبی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ سیرۃ النبیؐ کی بعض کتب عقیدت اور لگن سے مطالعہ کی ہیں۔ بلاشبہ حضرت محمد صاحب کو میں عظیم الشان اور جلیل القدر انسان سمجھتا ہوں۔ کاش اُن کی حیاتِ مبارکہ کا عرصہ کچھ اور طویل ہوجاتا۔ تو اخلاق روحانیت اور معیشت و معاشرت کی دنیا میں ایسا انقلاب عظیم رونما ہوسکتا تھا جس کے دور رس اثرات اقصائے عالم میں ہمہ گیر حیثیت سے قائم رہتے۔

میرے محترم! مذہب اسلام کے اعلیٰ نظریات مجھے تسلیم ہیں لیکن میرے ذہن ناقص میں کچھ شکوک بھی ہیں۔ چونکہ میں آپ کی ذہانت، معاملہ فہمی، جودتِ طبع، قابلیت اور معلومات کی وسعت کا معترف ہوں اور آپ کے رسالہ تجلی کو بالاستیعاب اور تواتر کے ساتھ پڑھتا ہوں اسلئے اس معاملہ کو آپ سے رجوع کررہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ میری خاطر سے اپنے وقت کا کچھ حصہ اور تجلی کے دو تین کالم صرف فرمائیں گے۔

بلاشبہ مذہب اسلام ایک مکمل، مرتب اور منظم "نظامِ فکر" ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ ایک قابلِ عمل نظام بھی ہے؟ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات اور دینِ فطرت ہے، اس میں انسانیت کے تمام مسائل کا حل موجود ہے وہ ایک ایسا صالح قانون رائج کرنا چاہتا ہے جس سے [illegible] حیات، مکروہاتِ دنیوی، اخلاقی ذمائم اور تصادم و تقابل کی تمام حشر سامانیاں امن و امان اور عدل و مساوات میں تبدیل ہوسکتی ہیں۔

ایک نظریہ کی حیثیت سے میں ان تمام خصوصیات کا قائل اور معترف ہوں۔ لیکن کیا عملی حیثیت سے بھی اسلام کی اعلیٰ اقدار انسانی فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوسکتی ہیں؟

تقریباً چودہ سو سالہ اسلامی دور میں صرف "قرنِ اول" میں یہ اسلامی نظام قائم رہ سکا۔ بعد میں عمر ابن عبدالعزیزؒ نے اپنے سہ سالہ دورِ حکومت میں اس کو نشأۃ ثانیہ دینی چاہی تو پھر طبائع انسانی نے اسے قبول نہیں کیا اور بالآخر اُنھیں مسموم کردیا گیا۔

رسول اللہؐ نے بعثت کے بعد تیرہ سال مکہ میں بسر کئے وہاں کوئی نظامِ شریعت وجود میں نہیں آیا تھا۔ پھر دس سال کی مدتِ قیام مدینہ کی ہے، یہ بھی کشمکش کا دور رہے۔ اسلامی ریاست میں قرار واقعی امن و سکون اور جمعیت کا حسب دل خواہ سامان نہیں تھا اور ابھی احکام خدا بھی بہ صورتِ قرآن نازل ہو رہے تھے۔ غرضکہ دورِ نبویؐ میں صرف اساسِ اسلام قائم ہوسکی۔

رسول صاحبؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ پہلا خلیفہ ایک عالی دماغ، مدبّر اور بہترین صلاحیتوں کا مالک اُنھیں میسر آگیا ورنہ اسلام کی متزلزل بنیادوں پر کسی عمارت کا قیام ممکن ہی نہ تھا۔ (یہ ایک علیحدہ مبحث ہے کہ اہلِ بیت رسول حضرت صدیقؓ سے راضی اور مطمئن کیوں نہیں ہوئے) حضرت صدیق رضی نے اپنی جانشینی

کے لئے ایک بہترین ہستی کو نامزد کیا (کیونکہ مسلمانوں کے یہاں غالباً خلافت اور امارت کے تعین کا کوئی واضح تصور نہیں ہے)

حضرت عمرؓ کے تدبر اور "دُرّے" کے طفیل ایک عظیم سلطنتِ اسلامیہ قائم ہو گئی لیکن اس کے ساتھ ہی دولت و ثروت اور تموّل میں بھی غیر معمولی اور غیر مناسب اضافہ ہو گیا اور بہت سا "موادِ خام" بھی مسلمانوں کے زمرہ میں شامل ہو گیا۔ میرا مطلب اُن نو مسلموں سے ہے جن کے معتقدات کے اجسام میں روحِ اسلامی جذب نہیں ہو سکی تھی۔ بہرطور شہادتِ عمرؓ ایک حادثۂ فاجعہ اور ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔ اس کے بعد غیر محسوس طور پر مادیت کو فروغ اور روحانیت و تقویٰ میں انحطاط رونما ہونے لگا۔ (حضرت علیؓ کی پارٹی تو خلافتِ اول کے وقت ہی سے اپنی حق تلفی محسوس کر کے عملی طور پر کاروبارِ حکومت سے الگ تھلگ رہتی تھی) عہدِ عثمانی میں وہ مسلمان جن کو میں نے "موادِ خام" کہا ہے خصوصیت سے مادیت کی افراط اور روحانی اقدار کی تفریط کا شکار ہونے لگے اور وہ فتنۂ عظیم رونما ہوا جس نے اسلامی نظامِ فکر کو بھی تہ و بالا کر دیا یعنی حضرت عثمانؓ معصوم اور مظلوم شہید کر دیئے گئے۔

حضرت علیؓ برائے نام خلیفہ ہوئے انھوں نے پھر زہدِ خشک، کامل تقویٰ، مادیت کی تفریط اور روحانیت کی افراط کے عملی درس دینا شروع کئے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اُن کی صدائے حق پر معدودے چند مخلصین اور بلوائیوں (منافقین) کے علاوہ لبیک کہنے والے کتنے تھے؟ خود اُن کے بھائی بند بھی علیؓ کے احتساب کی شدت سے دل برداشتہ ہو کر امیر معاویہ سے مل گئے تھے۔

معاف فرمایئے گا مسلمانوں نے غالباً قرابتِ رسولؐ اور علیؓ کی ذاتی عظمت و رفعت کا لحاظ کر کے انھیں بہ طور تبرک چوتھا خلیفہ تسلیم کر لیا ہے لیکن ایک مورخ کا دماغ تو اُن کی خلافت کے تسلیم کرنے میں متأمل ہی رہے گا۔

حضرت علیؓ کی شہادت اور امام حسنؓ کی امیر معاویہؓ کے حق میں دست برداری اور مفاہمت کے بعد (جس کے معاوضہ میں معتدبہ وظیفہ اور جاگیر حاصل کی گئی۔ حالاں کہ خلافت کا معاملہ اُن کی میراث یا ذاتی ملکیت کا مسئلہ نہیں تھا) تو جو کچھ بھی ہوا اُس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے بجا اور درست ہے۔ واقعۂ کربلا۔ بنو اُمیہ کا زوال اور بربادی اور دو شیعہ مسلمانوں (نصیر الدین محقق طوسی ہلاکو خاں کے ایڈی کانگ اور ابن علقمی آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کا وزیر اعظم) کی سازش سے نام نہاد خلافت کے ڈھانچہ کی شکست و ریخت وغیرہ یہ طویل تاریخی بحثیں اور جدال و قتال اور باہمی آویزشوں کی المناک اور عبرت خیز داستانیں ہیں۔

اس پس منظر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً اسلامی نظامِ عمل اور ضابطۂ حیات میں کچھ ایسی کمی (جس کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی) ضرور موجود رہی ہے جس کے باعث ہر دور میں اندرونی خلفشار اور بے اطمینانی قائم رہی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک مختصر مدت کے علاوہ حکومتِ الٰہیہ یا اسلامی نظامِ فکر و عمل مسلمان حکومتوں کے لئے کیوں قابلِ عمل اور کشش کا باعث نہیں ہو سکا؟

آج بھی بہت سی اسلامی حکومتیں ہیں مگر نظامِ اسلامی کہاں کہاں رائج ہے؟؟ سعودی عرب اور لیبیا کے علاوہ کہیں بھی تو نہیں۔ اور پھر لیبیا کے نظام اسلامی کی عمر ہی کیا ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ معمر قذافی کے بعد کیا حالات رونما ہوں۔ اب رہا سعودیہ حکومت کا معاملہ تو تاریخ کے لحاظ سے اس پر ابھی تین نسلیں بھی نہیں گذری ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حکم اکثریت ہی پر لگایا جاتا ہے۔

آج کل ہندوستان کے بعض مخلص اور ہمدردِ انسان ملک کے موجودہ انتشار اور اضطراب اور آثارِ انقلاب کو محسوس کرتے ہوئے بنی نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے نظامِ اسلامی اور اُس کی خصوصیات وغیرہ پیش کر کے اہلِ ملک کو دعوتِ فکر دینا چاہتے ہیں لیکن گذشتہ تاریخ اور حقیقت پر مبنی مثالوں کے ہوتے ہوئے اور کوئی

واضح لائحۂ عمل نہ ہونے کی صورت میں اُن کی یہ ساعی کیسے بارآور ہوسکتی ہیں۔ یہ سلطانی جمہور کا زمانہ ہے اور اسلام میں حکومت کے لئے ایک ہی امیرالمومنین کا ہونا لازمی شرط ہے اور پھر امیر کے تعین و تقرر کے لئے بھی واضح احکام نہیں ہیں۔ حد یہ کہ خلافتِ راشدہ کو بھی نہ تو ریشی حکومت کہہ سکتے ہیں نہ جمہوری اور نہ آمریت۔ "مسلمانی در کتاب" تسلیم مگر مدبر اور مبصر تو گذشتہ تاریخی تجربات اور حال کے واقعات پر تنقیدی نگاہ ڈال کر ہی کسی مستقبل کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اس وقت ممالک عرب سیاسی طور پر متحد ہو رہے ہیں۔ رابطۂ اسلامی۔ اسلامی کانفرنس اور اسلامی سکریٹریٹ وغیرہا کا قیام ایک روشن مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے مگر بات نہیں آجاتی ہے کہ کیا ان ممالک میں اسلامی نظام اور شرعی قوانین بھی نافذ ہوں گے؟ یا عہد جدید سے باعزت سمجھوتا کر کے کوئی ایسا خاکہ بنایا جائے گا یا بنایا جاسکتا ہے جو زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں اور عصرِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے؟

بطور دفع دخل مقدر یہ بھی عرض کر دوں کہ میں پرسنل لا وغیرہ میں ترمیم جیسی خرافات کا قائل نہیں ہوں بلکہ میں تو ہر مذہب کے لئے اُس کا پرسنل لا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہر معیاری مذہب انسانیت کی فلاح کے لئے ہی تو وضع ہوا ہے۔ میں وحدتِ ادیان کے نقطۂ نظر کو بھی فتنہ سمجھتا ہوں مذاہب کے ملغوبہ کا تصور بھی میرے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ میری تحریری استدعا بھی دینی انسانیت اور شرافت کا واسطہ دے کر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ) خالصاً لوجہ اللہ ہے اور اس میں تلبیس و تلویث کا شائبہ تک نہیں ہے۔ آپ کے جواب سے نہ صرف میرے بلکہ دوسرے ہندو اور مسلمان بھائیوں کے بھی اس قسم کے شکوک دور ہو سکتے ہیں۔ مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ آپ جواب سے ضرور معزز فرمائیں گے۔ میں غیر مسلم بھی ہوں اور مجھے اپنی کم مائیگی بے بضاعتی، عدم معلومات، انشا کی خامیوں اور استدلال کی کمزوریوں کا بھی اعتراف ہے۔ مجھے یہ بھی آرزو نہیں ہے کہ میرا یہ ژولیدہ مضمون تجلّی میں شائع ہو۔ البتہ جواب کے لئے جو حوالہ ضروری ہوگا اس کی طرف جناب خود اشارت فرما دیں گے

سپردم بتو مشکل خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

جواب کے لئے ٹکٹ اس لئے ارسال ہیں کہ میرے سوالات مہمل اور ناقابل توجہ ہوں تو آں جناب مجھے مطلع فرمادیں۔ اور اگر تجلّی کے ذریعے جواب ملنے کی سعادت مجھے حاصل نہ ہو سکے تو آنجناب میری تسکین کے لئے کچھ اشارات ہی تحریر فرمادیں۔ یا پھر بدرجۂ مجبوری کسی ایسی معیاری کتاب کا حوالہ تحریر فرمادیں جس کے مطالعہ سے یہ الجھنیں دور ہو سکیں۔ اگر آنجناب تجلّی کے ذریعہ جواب دینے کا فیصلہ فرمائیں تو پھر ذاتی طور پر مجھے جواب دینے کی زحمت نہ فرمائیں میں اس خاموشی کو رضامندی سمجھ کر مطمئن ہو جاؤں گا۔ اس صورت میں مرسلہ ٹکٹ تجلّی کے لئے کسی کام میں لے آئیں۔ والسلام۔

زحمت دینے کا معذرت خواہ
منموہن لال سکسینہ (رام پور)

تجلّی

جناب محترم! آداب و نیاز

مختصر جواب خط سے دے چکا ہوں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اُس دین میں علانیہ داخل ہو جانے کی توفیق اور جرأت عطا فرمائے جسے آپ دوسرے تمام دینوں کے مقابلہ میں برحق اور بہتر تصور فرما چکے ہیں۔

آپ کے مراسلے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنجناب کو فی نفسہٖ اسلام کے دینِ حق ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہا ہے بلکہ الجھن صرف اس بارے میں ہے کہ یہ دین کیا ایک سیاسی و اجتماعی نظام کی حیثیت سے بھی قیام کی اہلیت و استعداد اپنے اندر رکھتا ہے یا یہ صلاحیت اس میں نہیں پائی جاتی۔

تو اس الجھن کے سلسلہ میں ناچیز کی گذارش یہ ہے کہ

اگر اس کا کوئی جواب آپ کو کہیں سے نہ ملے۔ یا اگر ملے تو یہ ملے کہ ایک سیاسی و اجتماعی نظام کی حیثیت سے یہ دین زیادہ عرصہ تک قیام و ثبات کی اہلیت نہیں رکھتا تب بھی آپ کے لئے معقولیت اور عافیت کی واحد راہ یہی ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا آخری رسولِ برحق مان کر خود کو اسلام کا حلقہ بگوش بنالیں کیونکہ مرنے کے بعد جب تمام انسان دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور میدانِ حشر میں حساب کا دفتر کھلے گا اُس وقت ہر شخص سے اس کی ذاتی اور شخصی حیثیت میں حساب لیا جائے گا اور ایسے سوالات نہیں پوچھے جائیں گے جو اس کے فکر و شعور کی دسترس سے باہر رہے ہوں۔ مثلاً آپ سے یہ دریافت نہیں کیا جائے گا کہ آپ کے نزدیک اسلام سیاسی و اجتماعی اعتبار سے ایک قابلِ عمل نظام تھا یا نہیں تھا۔ نہ یہ پوچھا جائے گا کہ تاریخ اسلام کی منطقی و سیاسی توجیہہ و تعبیر آپ نے کیا کی تھی بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ مطالعے اور غور و فکر کے بعد آپ جب محمدِ عربیؐ کی عظمت و جلالت اور صدق و دیانت پر مطمئن ہو گئے تھے تو پھر کیوں آپ نے صاف صاف ان کی وہ حیثیت تسلیم کی جسے تسلیم کرانا ہی ان کی رسالت کا ماحصل تھا۔ آنجناب بفضلہ تعالیٰ ذی علم بھی ہیں اور ذی فہم بھی۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ محمد عربیؐ نے اپنی پوری حیاتِ رسالت میں جو دعوت مخلوقِ خدا کو دی وہ یہی تھی کہ اے لوگو! خدا ایک ہے اور میں اس کا آخری رسولؐ ہوں۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ محمدؐ کو آخری رسولؐ مان لینے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ جو بھی تعلیمات و ہدایات آپؐ نے دی ہیں انھیں برحق مان کر حتی الوسع ان پر عمل کیا جائے۔ عمل میں کوتاہی قابلِ معافی ہو سکتی ہے لیکن عقیدہ بہر حال اس حد تک بنیادی شے ہے کہ اگر وہی نہ ہو تو کسی مفید ثمرے کی امید کی ہی نہیں جا سکتی۔ "محمدؐ ایک عظیم انسان تھے" ۔۔۔ "ان کی جلالتِ شان میں شبہ نہیں" ۔۔۔ "ان کی سیرت بے داغ اور کردار اعلیٰ درجہ کا تھا" ۔۔۔ اس طرح کے فقرے جو لوگ

استعمال کرتے ہیں انھیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ محمدؐ کی پوری تعریف نہیں ہے بلکہ یہ سرے سے کوئی تعریف ہی نہیں ہے اگر ان فقروں کو استعمال کرنے والا محمدؐ کی رسالت پر ایمان نہیں لایا! آخر اس کا کیا منطقی اور نفسیاتی جواز ہو سکتا ہے کہ محمدؐ نے پہلے یومِ رسالت سے آخری سانس تک جو دعوت دی اسے تو کھلے دل سے قبول نہ کیا جائے اور زبان سے یہ کہا جائے کہ محمدؐ عظیم تھے، جلیل تھے، صاحبِ کردار تھے وغیرہ ذلک۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ یا بعض دیگر غیر مسلم حضرات اگر وقتاً فوقتاً محمد عربیؐ کے کردار و سیرت وغیرہ کی خوب خوب تعریف کرتے ہیں تو انھیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ تعریف انھیں کچھ فائدہ پہنچانے والی نہیں ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ آخرت میں اس سے نقصان ہی پہنچے۔ نقصان اس لئے کہ اگر اس طرح کی مدح سرائی اور ثنا خوانی محض نمائشی نہیں ہے بلکہ سچے دل سے ہے تو پھر اس سوال کا کوئی جواب ہی آخرت میں بن نہیں پڑے گا کہ تم نے انھیں خدا کا آخری رسول کیوں نہیں مانا؟ تم نے انھیں اس دعوے میں سچا کیوں نہیں سمجھا کہ "میں خدا کا رسول ہوں"؟ اگر تمہارا خیال یہ تھا کہ اپنی تمام تر صفاتِ حمیدہ کے باوجود محمدؐ اس دعوے کی حد تک "جھوٹے" ہیں تب تو تمہاری ساری ثنا خوانی ہی محض تمسخر بن کر رہ جاتی ہے کیونکہ محمدؐ کی تو ساری حیاتِ رسالت ہی فقط اسی دعوے کے گرد گھومی ہے۔ یہی دعویٰ اس کا محور و مرکز رہا ہے۔ اسی کی بنیاد پر ان کے کردار و سیرت کی پوری عمارت اٹھی ہے۔ اگر اس دعوے میں وہ سچے نہیں تھے تو حاصل اس کے سوا آخر کیا نکلا کہ ان کی ساری حیاتِ رسالت نعوذ باللہ مکر و کذب کا دام فریب تھی اور حسنِ کردار کے سارے پردے ایک "جھوٹ" کے چہرے پر نقابِ خوش رنگ بنا کر ڈالے گئے تھے۔

اور اگر تم اس دعوے کے معاملہ میں انھیں سچا تصور کرتے تھے تو پھر کیا عذر تھا کہ تم نے ان کی رسالت کا اقرار نہیں کیا اور اقرار کے بعد وہ کردار اختیار نہیں کرسکے جو ایک سچے اقرار کا لازمی اور قدرتی نتیجہ ہونا چاہیئے تھا؟

خطامعاف! میں نے آپ کی اصل الجھن پر براہِ راست گفتگو کرنے کے بجائے ایک ناصحِ مشفق کا پارٹ ادا کر ڈالا ہے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ آپ کی الجھن تو بس ایک اکیڈمک قسم کا علمی و فکری موضوع ہے جس سے آخرت کی نجات و مغفرت کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ کی یہ الجھن سلجھ جائے تب اور نہ سلجھے تب، دونوں حالتیں اخروی ثمرے کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ ایسی صورت میں اسے بنیادی اہمیت دینے کی کوئی وجہ نہیں اور اہمیت دیئے جانے کے قابل اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہم اور آپ اب جس دوسری دنیا کے کنارے کھڑے ہیں اور چار و ناچار ہمیں بہت جلد جس میں داخل ہو جانا ہے وہاں ہماری عافیت اور تحفظ اور آرام و راحت کا کیا سامان ہونا چاہئیے۔ آپ نے اپنے مراسلے میں جن گراں قدر خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات بہرحال آپ مانتے ہوں گے کہ مدّت کے بعد ایک بار پھر زندہ ہونا ہے اور خالقِ کائنات کی عدالتِ خاص میں حاضر ہو کر اپنے زندگی بھر کے اعمال و افکار کا حساب دینا ہے۔ اگر اس پر آپ کو یقین ہے تو پھر آپ سوچ لیجئے کہ موجودہ زندگی کے چند غنیمت لمحوں میں کونسا طرزِ عمل ہے جسے فوراً اختیار کرنا آپ کے لئے مفید ہوگا۔ یہ بات سن کر آپ کو شاید خوشی ہو کہ وہی محمدِ عربی ﷺ جن کی عظمت و جلالت پر آپ مطمئن ہو چکے ہیں یہ فرما گئے ہیں کہ جب کوئی غیر مسلم اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس کی پچھلی تمام خطائیں اور لغزشیں کالعدم ہو جاتی ہیں۔ یعنی زمانۂ کفر میں اس نے جو بھی بُرے کام کئے تھے ان کی معافی اور آگے کو جو بھلے کام کرے گا انکی قبولیت کا وعدہ۔ گویا پچھلے غیر مسلم انسان کے اندروں سے ایک نیا انسان جنم لیتا ہے جو سادہ ورق کی طرح داغ دھبّوں سے پاک ہے اور اس کا پچھلا جسم حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا ہے۔ اندازہ کیجئے کتنا بڑا اور زرّیں موقعہ ہے جو اللہ نے اپنے ان بندوں کے لئے مہیا فرمایا ہے جو ناسمجھی یا غفلت کی بنا پر راہِ ہدایت سے دُور رہ کر زندگی گذار رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مذہب و ملت بدلنے کی راہ میں اکثر کس طرح کی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ لیکن جو آدمی ذہن و قلب کی پوری آمادگی کے ساتھ اس حقیقت کو تسلیم کر چکا ہوگا کہ دنیا کے سارے علائق، سارے رشتے، سارے ہنگامے چند ہی روز بعد اس کا ساتھ چھوڑ دینے والے ہیں اور ایک نئی اور نرالی دنیا میں اسے دائمی زندگی گذارنی ہے وہ یقیناً پوری توجہ اس نکتہ کی طرف مبذول کر دے گا کہ اس آنے والی دنیا میں چین سے رہنے اور کرب و اندوہ سے بچنے کا کیا ذریعہ ہے۔ یہ ذریعہ اختیار کرنے کے سلسلہ میں اسے چاہے کتنے ہی فوری اندیشوں اور صدموں کا سامنا کرنا پڑے وہ ان سے ڈر کر یہ کھلا خطرہ مول نہیں لے گا کہ دوسری دنیا میں عذاب و آفت کا شکار رہے۔

نصح و تذکیر کا فریضہ ادا کرنے کے بعد اب میں آپ کی الجھن کے سلسلہ میں کچھ عرض کروں گا۔ "اسلام ایک مرتب، مکمل اور منظم نظامِ فکر ہونے کے ساتھ ساتھ کیا ایک قابلِ عمل نظام بھی ہے؟" اس سوال کا جواب خود آپ کے مراسلے میں موجود ہے۔ آپ نے تسلیم کیا ہے ـــ اور تسلیم کئے بغیر چارہ بھی نہیں ہے کہ یہ نظام قرنِ اول میں اپنی پوری شوکت اور آن بان اور خصوصیات کے ساتھ قائم ہوا تھا۔ مدّتِ قیام خواہ مختصر ہی رہی ہو لیکن کیا نفسِ قیام ہی اس حقیقت کا بیّن اور اٹل ثبوت نہیں کہ یہ ایک قابلِ عمل نظام ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی سمجھئے جیسے آدمی اگر ایک بار بھی چاند پر جا اترا تو اب چاہے وہ ہزار سال بھی چاند پر نہ جائے لیکن یہ بحث کھڑی نہیں ہو سکتی کہ آدمی کا چاند پر جانا ممکن ہے یا نہیں ہے۔ امکان کا حتمی فیصلہ

تو ہو چکا۔ ایک بار آدمی کا چاند پر جا کر لوٹ آنا قطعی طور پر یہ اطمینان دلا دیتا ہے کہ دوبارہ جب بھی یہی تکنک استعمال کی جائے گی اور درمیان کی تمام رکاوٹوں کو صحیح طور پر دور کرتے ہوئے عزم سفر کیا جائے گا دوبارہ اور سہ بارہ بھی آدمی چاند پر جا کر لوٹ آئے گا۔

اگر کم و بیش تیس سالوں تک نظام اسلام کے کامیاب قیام کی نظیر ہمارے سامنے موجود نہ ہوتی تب بھی علمی یا نظری اعتبار سے یہ کہنے کا جواز نہیں تھا کہ اسلامی نظام کا قیام خارج از امکان ہے کیونکہ اسلامی نظام جن اجزاء و عناصر اور اعضاء و جوارح کے مجموعے کا نام ہے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ اس کا عملی دنیا میں ظہور و وقوع ناممکن ہے۔ لیکن جب کہ نظیر بھی سامنے موجود ہے تو بحث امکان اور عدم امکان کی نہیں اٹھتی بلکہ صرف اس کی اٹھتی ہے کہ یہ نظام آخر اتنے کم عرصے تک کیوں قائم رہا۔ اس کی عمر طویل کیوں نہ ہوئی۔ اسے دوبارہ لوٹلنے کی کوشش کو ناکامی کا سامنا کیوں ہوا۔؟

اس بحث کے سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اگرچہ قرنِ اول میں قائم شدہ اسلامی نظام تیس ہی سالوں میں محدود رہا لیکن اس کے خاتمے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ نظام کی پوری عمارت ہی زمیں بوس ہوگئی بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جو معیار اسلام کو مطلوب تھا یہ اس سے کچھ نیچے اتر آیا۔ اس میں کچھ ایسے تغیرات آ گئے جنھوں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک صحت مند انسان دفعتاً مریض یا زخمی ہو جائے۔ ظاہر ہے مرض یا جراحت اس کی توانائی کم کر دیں گے۔ اسکے جسم کی طاقت اور آب و تاب زوال پذیر ہو جائے گی۔ اور اس کا یہ انحطاط تمام ان افراد کو کھل کھیلنے کا موقعہ دے گا جو اس کی نگرانی اور نگہداشت میں پرورش پا رہے تھے۔ اس طرح حالات تیزی سے دگرگوں ہوں گے، ماحول کے جغرافیے اور چہرے مہرے میں تبدیلی ہوگی اور نظم و ضبط کے قلعے میں انتشار و پراگندگی کے فتنے شگاف ڈال دیں گے۔

یہ نتیجہ ہوگا اس حادثے کا کہ جو صحت مند اور قوی فرد مکمل توجہ اور کنٹرول کے ساتھ ایک در و بست کو قائم رکھے ہوئے تھا وہ کارکردگی اور گرفت کی واجبی قوت و صلاحیت سے محروم ہو گیا مگر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مریض یا زخمی ہو جانا مر جانے کے مرادف ہے۔

اسی طرح قرنِ اول میں قائم شدہ معیاری نظام اسلام پر جو زوال آیا اس کے معنی موت اور فنا کے نہیں۔ چنانچہ آپ مسلمانوں کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کر کے دیکھیں یقیناً آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ مسلمان بادشاہوں نے اسلامی نظام سے مکمل انحراف اور دامن کشی کی راہ صدیوں تک بھی نہیں اختیار کی اور اس نظام کے مکمل خاتمے اور انہدام کا آغاز اگر ہوا ہے تو خلافتِ عثمانیہ کے مکمل خاتمے سے ہوا ہے جو ابھی زیادہ دنوں کا واقعہ نہیں۔ کم و بیش تیرہ سو سالوں تک جہاں جہاں بھی مسلمان بادشاہ حکمراں رہے ہیں انھوں نے اپنی بادشاہت کے استحکام اور اپنے نفس کی پیروی میں خواہ کیسا ہی برا کردار اختیار کیا ہو لیکن اسلامی نظام کے پورے تانے بانے کو انھوں نے توڑ کر نہیں پھینکا اور دیوانی و فوجداری دونوں طرح کی عدالتوں میں اسلامی قوانین ہی کو غالب حد تک سربراہی کا منصب ملا رہا۔

اس تجزیہ کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ مکمل طور پر معیاری نظام اسلام تو بے شک تیس ہی سالوں کے دائرے میں محدود رہا مگر معیار سے کچھ فروتر نظامِ اسلام اتنا قلیل المیعاد نہیں۔ اس کے بے شمار اثرات و ثمرات تو ہمارے اپنے ملک کی اُن مرحوم مسلمان بادشاہتوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں جنھیں ختم ہوئے ہنوز تین صدیاں بھی نہیں گذریں اور جو اصلاً اسلامی حکومتیں تھیں ہی نہیں بلکہ فقط مسلمان حکومتیں تھیں۔

اب اس کے بالمقابل اگر آپ دنیا کے کسی بھی اور منضبط نظامِ فکر یا نظریۂ سیاست و اجتماعیت کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کا حال یہ ہو کہ وہ تیس سال تو درکنار پندرہ سال بھی اپنے معیارِ مطلوب پر قائم رہ کر فکر و عمل کی مکمل ہم آہنگی کا

ثبوت دے چکا ہو۔ سوشلزم، نازی ازم، کمیونزم یا کسی بھی ازم کو آپ لے لیں۔ ان کے نظریاتی و اصولی اجزاء اول تو اتنے واضح، قطعی اور بے غبار نہیں کہ ان کی تشریح و تعبیر پر ان کے ائمہ نے ایسا اتفاق کیا ہو جیسا اتفاق اسلام کے ائمہ نے اسلامی نظام کے بنیادی اصول و عقائد پر کیا ہے۔ دوسرے ان کی حیثیت محض اضافی ہے یعنی جب چاہے انھیں موم کی ناک کی طرح کسی بھی رُخ پر موڑ دیا جائے۔ علاوہ اس کے ان کی پشت پر کوئی ایسا حجّ نہیں جسے حرفِ آخر قرار دیا جا سکے اور انسانی فطرت پوری آمادگی کے ساتھ اس کی بارگاہ میں سرِ تسلیم خم کر دے لہٰذا یہ سب نظام جہاں جہاں قائم ہوئے ہیں یا فی الحال قائم ہیں وہ بس انسانی فکر کے تغیر پذیر اسباب اور نفس و خواہش کے مرغوبات کی ترجمانی اور نمائندگی کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ پہلے سے کھینچے ہوئے کسی مخصوص اور متعین نقشے کے مطابق انھیں بنایا گیا ہو اور ان کے بعض اصول و مبانی ہر حال میں ناقابلِ تغیر ہوں۔

میرا مقصد اس اپنی و آں سے یہ بتانا ہے کہ دوسرے جو بھی نظام دنیا میں رائج رہے ہیں یا آج بھی رائج ہیں وہ اس لئے کامیاب نہیں ہیں کہ اصولی و فکری اعتبار سے وہ فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہیں اور مخلوقِ خدا کے مابین عدل کا فریضہ زیادہ بہتر طور پر ادا کر رہے ہیں بلکہ اس لئے کامیاب ہیں کہ انھوں نے انسان کو ایک ایسا جانور تصور کر لیا ہے جس کے لئے حلال و حرام کی کوئی قید نہیں۔ جس کے اندر روحانی و اخلاقی تقاضوں کی کوئی پیاس نہیں۔ جسے سو پچاس سال سانس لینے کے بعد ہمیشہ کے لئے فنا ہو جانا ہے اور کسی ایسی عدالت میں کبھی حاضری نہیں دینی ہے جہاں اس سے زندگی بھر کے اعمال و افکار کا محاسبہ ہو اور محاسبہ کے بعد سزا و جزا کے مراحل پیش آئیں۔ جب انسان کو اس طرح کا جانور فرض کر لیا گیا تو اب اس کی ضرورت ہی نہ رہی کہ انسان کے اندر حرص و ہوس اور طغیانِ شہوت کے جو قوی میلانات موجود ہیں ان کے آگے مناسب دیواریں کھڑی کی جائیں اور اجتماعی نظام ایک فولادی قسم کے اخلاقی قلعے میں محفوظ رہے۔ اس کے بجائے لوگوں نے وقتاً فوقتاً اپنے دل سے کچھ اخلاقی قدریں گھڑیں، کچھ سوشل ضابطے تراشے اور جب جب ضرورت دیکھی ان میں من مانی تبدیلیاں بھی کیں۔ ان کو کسی ایسی دشواری کا سامنا نہیں تھا جس سے اسلامی نظام کو سابقہ پیش آتا ہے۔ اسلام اخلاق و روحانیت کی جن اقدار و اصول کو ایک بار حرفِ آخر قرار دے چکا انھیں اب کوئی بھی نہیں بدل سکتا۔ ان سے بغاوت و انحراف ممکن ہے مگر ان میں اصلاح اور تبدیلی کا سوال پیدا نہیں ہوتا لہٰذا انسان کے اندر کا دیوِ ہوس جب اسلامی نظام کی پابندیوں سے گھبرا کر سرکشی پر آمادہ ہوتا ہے تو اسلام اس کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکتا، اس کی خاطر اپنے بنیادی تفکر اور اصول و اقدار کو نہیں بدلتا بلکہ جنگ کرتا ہے اور جنگ کے نتیجے دونوں ہی ہو سکتے ہیں۔ ہار یا جیت۔ اگر اسلام ہار گیا تو اب جو نظام اس کی جگہ لے گا اسے اسلامی نظام نہیں کہیں گے۔ اس کے برخلاف دوسرے ازموں کا حال یہ ہے کہ مثلاً سرمایہ دارانہ نظام والے کسی ملک میں دفعتاً کمیونزم غالب آجائے تو اصطلاحی عنوان کے اعتبار سے اگرچہ پہلے نظام کی جگہ دوسرے نظام نے لے لی مگر بنیاداً کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔ بنیاد سرمایہ داری کی بھی اُسی بے لگام اور فاسد مادّہ پرستی پر ہے جس پر کمیونزم کی ہے لہٰذا مادّہ پرستانہ نظام جوں کا توں قائم رہا۔ دنیا میں جتنے بھی ازم چل رہے ہیں ان میں وہ بنیادی اور جوہری تضاد نہیں ہے جو اسلام اور غیر اسلام میں ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی نقیض اور ضد ہیں۔ ان میں جڑ سے پھنگل تک کوئی توافق اور ہم جنسی نہیں۔ مگر دوسرے تمام نظام آدمی کو محض ایک مادّی وجود سمجھنے، حیات بعد الممات کے فکر سے بے نیاز ہونے اور مستقل اخلاقی و روحانی اقدار سے بے تعلق ہونے کی بنا پر ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان پر اسلامی نظام کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

پہلے شخصی حکومتوں کا دور تھا۔ اب حاکمیتِ جمہور کا

دُور ہے ۔ یہ دونوں ہی دَور اسلام کے نزدیک یکساں طور پر باطل ہیں کیونکہ وہ فقط اور فقط حاکمیتِ الٰہ کا علمبردار ہے ۔ حکومت کے سربراہ کو امیرالمؤمنین کہا جائے یا صدرِ مملکت یا وزیراعظم اور ظاہری اختیارات کسی ایک شخصیت میں مرکوز ہو جائیں یا ایک پارٹی اور گروہ کے افراد میں تقسیم رہیں یہ سب ثانوی درجے کی چیزیں ہیں ۔ اصل اور اولین اہمیت اس بات کی ہے کہ حاکمیت کا حق خدا کے لئے تسلیم کیا جائے اور اسی کے نازل کردہ قوانین پر سلطنت کا کاروبار چلے ۔ حکومت کا کام قوانینِ الٰہیہ کا نفاذ و اجراء ہو ۔ اور تغیر پذیر حالات کی مطابقت سے وہ جو بھی نئے قاعدے اور ضابطے بنائے وہ لازماً قانونِ خداوندی ہی سے مطابقت رکھتے ہوں اور ان کا سرچشمہ اور ماخذ حاکمیتِ الٰہ کے تصور کے علاوہ کوئی تصور نہ ہو ۔ اسلام نے ۔ یا دوسرے الفاظ میں خالقِ کائنات نے اپنے آخری رسولؐ کے ذریعے ایک نظام کا ڈھانچا کھڑا کر کے دکھا دیا جس میں حاکمیتِ الٰہ کا تصور پوری طرح کارفرما تھا ۔ پھر مشیت نے یہ ڈھانچا درہم برہم کر دیا تاکہ وہ دیکھے کہ خدا اور رسولؐ پر ایمان لانے والے اسی نوع کا نظام پھر سے قائم کرنے کے لئے کیا کچھ قربانیاں دیتے اور کیا کچھ جدوجہد کرتے ہیں ۔

آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ محمد عربیؐ اگر کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو دنیا کے حق میں زیادہ بہتر ہوتا ۔ یا اسلام نسبتاً زیادہ قوت اور وسعت کے ساتھ دنیا پر چھا جاتا ۔ اللہ نے اور خود محمد عربیؐ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ تکوینی اُمور میں اللہ جو بھی فیصلہ کرتا ہے وہ دوسرے تمام فیصلوں سے بہتر اور زیادہ مصالح کا حامل ہوتا ہے ۔ محمدؐ جس کارِ خدمت کے لئے مبعوث کئے گئے تھے وہ اُس آخری حد تک تکمیل کو پہنچ گیا جس حد تک اس کا پہنچنا دنیا کے لئے باعثِ خیر ہو سکتا تھا ۔ اللہ کی تکوینی مصالح کے تحت اب انھیں مزید زندہ رہنا نہیں تھا لہٰذا اللہ اور تقدیرِ الٰہی پر ایمان رکھنے والے ہر شخص کو لازماً یہ مان لینا چاہئے کہ محمدؐ کو جس وقت دنیا ہی کارِ خدمت سے فارغ کر کے زیرِ زمین پہنچا دیا گیا وہی وقت اس کام کے لئے بہترین تھا ۔

یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ دنیا کو خالقِ کائنات نے امتحان گاہ بنایا ہے آرام گاہ نہیں ۔ دنیا کو چھوڑ کر باقی تمام کائنات اللہ نے ایسی بنائی جس کے نظم و نسق اور دروبست میں دخل انداز ہونا کسی کے بس کی بات نہیں ہے ۔ چاند سورج ستارے ایک طے شدہ نظم کے ساتھ اپنا اپنا کام کر رہے ہیں ۔ اور فرشتہ نام کی جو مخلوق پیدا کی وہ بھی ایسی پیدا کی جو انسان کی طرح خود مختار و آزاد نہیں ہے ۔ جسے یہ استعداد نہیں دی گئی کہ اللہ کے کسی فرمان کو جی چاہے مانے جی چاہے رد کر دے ۔ اس کے برخلاف انسان کو یہی استعداد عطا کی گئی اور دنیا کو اس کے حوالے کر دیا گیا کہ وہ جیسا چاہے نظام یہاں قائم کرے ۔ اچھی یا بری جیسی چاہے زندگی گذارے اور اللہ کی نازل کردہ ہدایات پر عمل پیرا ہو یا نہ ہو ۔ یہ بات قرآن میں بایں انداز کہی گئی کہ اگر اللہ چاہتا تو صفحۂ ہستی پر ایک بھی کافر نہ ہوتا ۔ سارے بندے ایمان قبول کر لیتے اور ہر طرف زہاد و عباد ہی کی بھیڑ نظر آتی لیکن وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اپنے اختیار سے بھلائی کی راہ اختیار کر کے اُخروی نعمتوں کا حقدار بنتا ہے اور کون برائی کی راہ اختیار کر کے اپنے اختیار سے عذاب مول لیتا ہے ۔

جب یہ صورتِ حال ہے تو نہ تو اس پر حیرت کرنی چاہئے کہ اللہ کا پسندیدہ نظام دنیا میں اس قدر کم مدت کیوں قائم رہا نہ یہ شبہ کرنے کی گنجائش ہے کہ اس نظام میں قیام و ثبات کی گنجائش ہی نہیں ہے ۔ اسلامی تاریخ کا جتنا گہرا مطالعہ آپ کریں گے یہ حقیقت واضح ہوتی چلی جائے گی کہ خامیاں اور نارسائیاں خود انسانی عمل اور فکر میں ہیں نہ کہ اسلامی نظام کے اجزائے ترکیبی میں ۔ ناچیز کا مشورہ ہے کہ اس موضوع پر آپ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریریں پڑھیں ۔ وہ اس دَور میں نظامِ اسلامی کے سب سے بڑے داعی ہیں اور اسی دعوت کی بنیادوں پر ایک جماعت قائم کرنے کے علاوہ علمی و فکری سطح پر بھی انھوں نے اس سلسلہ میں

(باقی صفحہ ۱۱۲ پر)

از:- مُلّا ابن العرب مکّی

مسجد سے میخانے تک

دو دن ہوتے ہی کیا ہیں۔ ہوا کا ایک جھونکا یہ جا اور وہ جا۔ تجلّی کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے۔ موسم بھی اتنا واہیات رہا کہ دل و دماغ سب توبہ بول گئے۔ اب تیسرے ہی دن سے صوفی شعبان سر پر سوار ہیں کہ چلو دلّی۔

"نہیں جا سکوں گا۔ ایک حرف نہیں لکھا گیا۔ کم سے کم تین دن اور ٹھیریئے۔" میں نے بہت لجاجت سے عرض کیا تھا مگر انھوں نے اور بھی لجاجت سے کہا۔

"دیکھو یار۔ زندگی کا آج کل کچھ بھی اعتبار نہیں ہے۔ ہم یا تم کسی بھی وقت دارِ فنا سے دار البقا کی طرف سدھار سکتے ہیں۔ بس چلے ہی چلو۔ لکھنا تو زندگی بھر کا ہے لکھتے رہنا۔"

ان کا ارشادِ گرامی اصولاً حرف بہ حرف درست تھا مگر اب تک میری کھوپڑی کوئی ایسا بہانہ نہیں تراش سکی تھی جو زوجہ کو مطمئن کر دے کہ دلّی کا فوری سفر برحق ہے۔ وہ یوں ہی جل بھن رہی تھی کہ دو دن میں میں نے دو صفحے بھی نہیں لکھے حالانکہ اس نے پنکھا بھی جھلا تھا، سر میں تیل بھی ڈالا تھا، قلمی آم بھی منگا کر کھلائے تھے، میٹھی میٹھی باتیں بھی کی تھیں۔

"آفت یہ ہے صوفی صاحب ..... اوہ اچھا ذرا ٹھیریئے۔" دفعتاً میری سمجھ میں ایک ترکیب آئی۔ "آپ ایسا کریں پہلی گاڑی سے دلّی تشریف لے جائیں اور وہاں سے تار دیں کہ مولوی قمر الحسن سخت بیمار ہیں فوراً پہنچو۔ تار دینے والے کی جگہ بدر الحسن لکھیے گا۔ یہ صاحبزادے ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ اب ایک اور چکر پھیلے گا۔"

"آپ اگر چکروں سے گھبرانے لگے تو بہت چلی تصوف کی گاڑی۔ لوگ اب اتنے چالاک ہو گئے ہیں کہ چکر دیئے بغیر ان کی اصلاح مشکل ہے۔"

"چلو میاں تم بھی سقراط کے دادا ٹھیرے۔"

پھر یوں ہی ہوا۔ اگلے روز دلّی سے میرے نام تار آگیا میں نے زوجہ کو دکھلایا۔ میری آواز بھرّائی ہوئی تھی۔

"بڑے عمدہ آدمی ہیں مولوی قمر الحسن۔ میرے تو بہت ہی مشفق ہیں۔"

میں نے ایسے دلگداز لہجے میں کہا جیسے موصوف کی بیماری کی اطلاع پا کر دل کے ایک ہزار ٹکڑے ہوتے جا رہے ہوں۔ زوجہ ایک منٹ تار کو گھورتی رہی پھر مجھے گھورنے لگی۔

"آپ کی زبان سے پہلی بار یہ نام سن رہی ہوں۔ کون ہیں یہ قمر الحسن؟"

"مولوی ہیں مغل خاندان سے ہیں۔ ان کے دادے تلوار سے شیر کا شکار کھیلا کرتے تھے۔"

"اور پر دادے غلیل سے ہاتھی کا شکار کھیلتے ہوں گے۔" اس نے گرہ لگائی۔ آنکھوں میں پھر ہونٹوں پر تبسم بھی آیا۔

"اب زیادہ تو میرے علم میں نہیں۔ بہرحال عیادت کے لئے مجھے ضرور جانا چاہیئے۔ حالت کچھ نازک ہی ہوگی ورنہ عزیزی بدر الحسن تار نہ دیتے۔"

"بہت دنوں آپ کا اعتبار کر کر کے بیوقوف بن چکی ہوں۔ ایسے تار تو لایئے میں دس دلوا دوں۔ میری بلا سے دلّی جایئے بمبئی جایئے۔ بھتّارات صاف کہہ گئے ہیں کہ پچھلے مہینے کی تنخواہ نہیں ملے گی۔"

"اللہ رازق ہے۔ تمہارے بھیا کی خاطر میں اپنے
[illegible]اتی فرائض سے تو دستبردار نہیں ہو سکتا۔ انھیں بتانا
[illegible]بیمار پرسی کس قدر ثواب کا کام ہے۔ یہ تار بھی دکھا
[illegible]ینا۔"

"تو آپ ان سے کہے بغیر ہی چلے جائیں گے؟"
"مجبوری ہے۔ وہ سنا ہے جیب میں بیڑیاں لئے پھر
رہے ہیں مجھ بیکس و نامراد کے لئے۔"
اس کی مسکراہٹ تو غائب ہو گئی مگر غصہ نہیں ابھرا۔
[illegible]مل سے انداز میں میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔
"سچ بتائیے دلی کیوں جا رہے ہیں؟"
"سچ تو نہ بتاؤں گا — پرایا راز ہے مگر تفریحاً
نہیں جا رہا۔ بہت ضروری کام ہے۔ بس گیا اور آیا۔"
"پھر آخر یہ تار کا ناٹک رچانے کی کیا ضرورت تھی۔"
"حضور کے ڈر سے۔ آخر تم کب یقین کرو گی کہ
تمہاری خاطر تار تو کیا چیز ہے آسمان کے تارے بھی
[illegible]ڈ کھلا سکتا ہوں — مائی ڈیری ڈیری ہنی مون
[illegible]ارلنگ۔"
اس نے تضحیک کے طور پر نچلا ہونٹ آگے کو بڑھایا۔
ساتھ ساتھ سر بھی ہلا۔ پھر بے دلی کے سے انداز میں بولی۔
"آپ جائیں آپ کا خدا جانے۔ بھلا کونسی گاڑی
سے جائیں گے؟"
"یہی گیارہ والی سے۔ ابھی ساڑھے نو بجے ہیں۔"
"کھانا کھا کر جائیں گے یا ساتھ لے جائیں گے؟"
"ہٹاؤ بھی۔ راستے میں چائے پانی کر لیا جائے گا۔
ابھی تو بھوک نہیں ہے۔"
"جب میں مر جاؤں تو یہ بھی کر لیجئے گا۔ بڑی چائے
[illegible]بھی ہے اسٹیشنوں پر۔ سیر بھر پتے اور پتی کا کھولن۔"
یہ کہہ کر وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی تھی اور پھر
دلی کا سفر میں نے ناشتہ دان ہی کے ساتھ کیا تھا۔ چائے
[illegible]سے بھرا تھرماس بھی عطا ہوا تھا۔

میرے دلی والے سائنٹسٹ بزرگ کا اصلی نام جو کچھ
بھی ہو آپ نعیم فرض کر لیجئے۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش
ہوئے۔ پھر میں نے حاضری کا مقصد بیان کیا تو فرمایا:۔
"کھڑکپور کے ارجمنٹ میں تیس ہزار خرچ آئے تھے۔
اب اسی کام پر ستر ہزار سے کم صرف نہ ہوں گے۔"
"خرچ کی پروا مت کیجئے۔ سیٹھ اپ ایسا ہونا چاہیئے
کہ دنیا دنگ رہ جائے۔"
"اگر سرمایہ وافر ہے تو جو چاہو ہو جائے گا۔ دولتمند
معتقدین کے لئے محدود پیمانے پر ایک جنت بھی بن سکتی ہے۔"
"پھر تو مزا آ جائے گا۔ صوفی شعبان یہی چاہتے ہیں کہ
ان کی درگاہ مرجع خلائق بن جائے۔ ڈیڑھ دو لاکھ تک
خرچ کرنے کو تیار ہیں۔"
"کیا نام ہے درگاہ کا؟" انھوں نے سوال کیا۔
"درگاہ پلپلی شاہ۔ دراصل نام تو مرحوم شاہ صاحب کا
معشوق علی تھا مگر عالم جذب میں کبھی کبھی شاعری کرتے تو
تخلص پلپلی لگاتے۔ بس یہی تخلص شہرت پا گیا۔ نام تو کم
ہی لوگوں کو یاد ہے۔"
"کتنی پرانی ہے؟"
"مغلیہ دور سے چلی آ رہی ہے۔ آپ دیکھ ہی چکیں گے۔
فرمائیے کب چل رہے ہیں؟"
"تم بھولے نہ ہو گے کہ ایڈوانس کے بغیر ہم کسی کام
میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔"
"یقیناً نہ ڈالنا چاہیئے۔ میں پہلے ہی طے کر چکا ہوں
صوفی شعبان مجھ سے قبل دلی آ چکے ہیں انھیں جلد آپ کی
خدمت میں لاؤں گا۔"
پھر میں صوفی صاحب کی تلاش میں نکلا۔ انھوں نے شاہ
نظام الدین کا پتا دیا تھا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ چیلی قبر
کی طرف کہیں قوالی میں گئے ہوئے ہیں۔ میں پرچہ لکھ کر چھوڑ
آیا کہ عشاء کی نماز جامع مسجد میں پڑھیئے۔ ابھی رات دور
تھی۔ میں نے سوچا میاں چھٹن سے مل آؤں۔ یہ مولوی
رکاب الدین مرحوم کے بڑے لڑکے ہیں۔ بمشکل بس پکڑی

اور بارہ ٹوٹی کے بس اسٹینڈ پر اترا۔ اسٹینڈ سے ایک فرلانگ پیدل چلنا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں سامنے پکچر ہاؤس سے ہجوم برآمد ہو رہا ہے۔ یقیناً شو ختم ہوا ہوگا۔ ہجوم میں صوفی شعبان بھی نظر آئے۔ مجھے حیرت ہوئی مگر فلم کے بورڈ پر نظر پڑی تو حیرت دور ہو گئی۔ "قوالی کی رات" نامی فلم چل رہی تھی۔

جب ان کے پہلو میں پہنچ کر میں نے دفعتاً سلام کیا تو اُچھل پڑے۔ چہرے پر کچھ خفت کے سے آثار بھی اُبھرے مگر چند ہی منٹ کے تبادلۂ خیال کے بعد یہ عارضی کیفیات ختم ہو گئیں۔ قریبی ہوٹل میں بیٹھ کر ہم نے چائے پی۔

"سچی بات ہے نام دیکھ کر ہم سے نہیں رہا گیا ورنہ تم جانتے ہی ہو سنیما پر ہم لعنت بھیجتے ہیں۔" انھوں نے جھکے ہوئے لہجے میں معذرت فرمائی تھی۔

"کیسی رہی فلم؟" میں نے پوچھا۔

"فلم ولم ہم کچھ نہیں جانتے۔ قوالیوں میں مزا آ گیا۔ سبحان اللہ یہ فلم والے بھی کیسے کیسے طرز نکالتے ہیں بس سُنے جاؤ سر دُھنے جاؤ۔"

"ہیروئن کیسی تھی؟"

"چھوڑو میاں۔ اجنبیہ عورتوں کی طرف ہم توجہ نہیں کرتے۔ کئی عورتیں کام کر رہی تھیں پتا نہیں کونسی ہیروئن ہوگی۔"

"خیر نعیم صاحب سے میں نے بات کر لی ہے — وہی جنکی خدمات حاصل کرنی ہیں۔"

"جگ جگ جیو۔ کیا بات رہی؟"

بس کام بنا بنایا سمجھیے۔ البتہ اخراجات اندازے سے کچھ زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔"

"دیکھا جائے گا۔ کب ملوا رہے ہو نعیم صاحب سے؟"

"عشاء بعد اُدھر ہی چلیں گے۔ اب کچھ دیر گھوم پھر لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔"

"کیوں خواہ مخواہ وقت خراب کرتے ہو۔ اس سے تو اچھا ہے ہرے بھرے شاہ کے مزار پر ہو آئیں۔"

"وہاں بھلا کیا کرنا ہے؟"

"تم کیا سمجھتے ہو وہ کوئی معمولی ہستی تھے؟"

"میری معلومات ان کے بارے میں ناقص ہو سکتا ہے وہ قطب العالم رہے ہوں مگر ہمارے مسائلِ پیچیدہ ان کے بس میں کیسے آ جائیں گے۔"

"خیر یہ تو نہ کہو۔ خواجہ طوفان کے بڑے صاحبزادے میاں ارمان نے میونسپلٹی کا پانچ ہزار غبن کر لیا تھا۔ مقدمہ چلا۔ ثبوت سارے خلاف تھے۔ ایک مجذوب نے انھیں تلقین کی کہ درگاہ ہرے بھرے شاہ میں جاؤ وہیں تمھیں دلی مراد ملے گی۔ بس وہ بھاگے آئے تھے۔ پھر مقدمہ جیت گئے۔ کوئی ان کا بال بھی بیکا نہ کر سکا۔"

"ماشاء اللہ۔ بلکہ حاشا کلاّ۔ مگر مائی ڈیر صوفی یا آپ نے نہ غبن کیا نہ ڈاکہ ڈالا نہ ہمیں چاند سا بیٹا چاہیے بھلا درگاہ ہرے بھرے شاہ میں کیا مانگیں گے۔"

"تم تو منطقیں چھانٹتے ہو۔ دراصل ہمارے ہم زلف برادر الہ جی صاحب کی ایک بیوہ پھوپی ہیں وہ ایک معاملہ میں آج کل پریشان ہیں۔ انھوں نے بڑے اصرار سے ہم سے کہا تھا کہ دہلی جا رہے ہیں تو ہرے بھرے شاہ کو ان کا اسلام عرض کر کے مدد کی درخواست پیش کر دیجیے ہم نے وعدہ کر لیا تھا۔"

"تب تو مجبوری ہے۔ چلیے۔"

ہم نے رکشا کی۔ چند منٹ بعد ایک سنیما کے آگے گذر رہے تھے کہ صوفی صاحب نے میرا شانہ دبایا اور آواز میں بولے :-

"میاں وہ تو دیکھو۔"

میں نے پہلے ان کی طرف دیکھا پھر ان کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے سنیما ہاؤس کے بورڈ پر نظر ڈالی جلی حرفوں میں لکھا تھا۔

"قوالی باز حسینہ"

نیچے ایک مصرعہ بھی دیا تھا۔

"ہر روز حسینوں کا دیدار نہیں ہوتا"

مصرعہ کے نیچے یہ الفاظ تھے:-

"پچاسواں ہفتہ۔ صرف بالغوں کے لئے۔"

"کیا خیال ہے۔" صوفی صاحب بولے "آؤ دیکھ ڈالیں۔"

"کمال کرتے ہیں۔ کیا ہرے بھرے شاہ نہیں جانا۔"

"پھر دیکھی جائے گی۔"

"جی نہیں۔ رات کو نعیم صاحب سے معاملات طے کرکے صبح گھر لوٹ چلنا ہے۔"

"ارے وہ بھی سوچ لیں گے۔ اے رکشا والے بابو۔ ٹھیرالو۔"

رکشا کو کرایہ ادا کرکے رخصت کیا گیا۔

"آپ تنہا دیکھ آئیے۔ میں دس بجے جامع مسجد کے مشرقی دروازے پر مل جاؤں گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" وہ میرا بازو دبوچے ہوئے تھے "فضول کی باتیں نہ کیا کرو۔"

"نہیں صوفی صاحب۔ طمنچہ باز حسینہ۔ مکہ باز حسینہ۔ چالباز حسینہ۔ یہ سب دیکھی جا سکتی ہیں مگر قوالی باز حسینہ میرے بس کا روگ نہیں۔"

"یار وہابیت مت پھیلاؤ۔ یہ کھیل ہماری طرف تو آیا نہیں۔"

"نہ آیا ہوگا۔ میں سوچ رہا ہوں نماز عصر آپ نے شاید قوالی کی رات میں پڑھی ہو۔ اب مغرب قریب ہے۔"

ان کی بھویں تن گئیں۔ جھلا کر بولے "ہاں ہاں تم تو مفتیوں کے باوا آدم ہو۔ عقل سے کام لیا کرو۔ یہ سفر ہے۔ عصر اور مغرب عشاء کے ساتھ پڑھ لیں گے۔"

"اس کی بھی کیا گارنٹی ہے۔ فرض کیجئے قوالی باز حسینہ سے فارغ ہو کر کسی اور سنیما پر قوالی باز عاشق کا بورڈ نظر آ گیا تو آپ کہیں گے کہ آؤ اسے بھی لگے ہاتھوں دیکھ ڈالیں۔"

"... نہیں لیں گے تمہارے سر کی قسم۔ یار [illegible]

ملتی ہے۔ تم نہیں سمجھتے عبادات کا مقصد روح کو تازہ کرنا ہے۔ تم خود ایک بار کہہ رہے تھے کہ ۔۔۔ بھلا وہ کیا نام لیا تھا جس کی قوالی سنکر تمھیں ایک مہینے تک سچے خواب آتے رہے تھے؟"

"مس قمر جہاں۔ مگر وہ تو شاہ چمن علی کی مرید تھی کہاں وہ کہاں یہ فلموں کی دنیادار عورتیں۔"

"خیر یہ تو نہ کہو۔ ہم نے کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ ایکٹریسیں اولیاء کو بہت مانتی ہیں۔ مزاروں پر چادریں بھی چڑھاتی ہیں۔ یہ تو خدا کی دین ہے میاں آگ کو گلزار بنا دے۔ اب دیر نہ کرو فلم شروع ہونے والی ہوگی۔" انھوں نے مجھے سنیما کی طرف گھسیٹا۔

"کم سے کم یہ تو دیکھئے صرف بالغوں کے لئے!" میں نے قدم جما لئے۔ غنیمت ہے ہم فٹ پاتھ کے قریب ہی تھے ورنہ کچلے گئے ہوتے۔ ایک اسکوٹر کان کے پردے پھاڑتا بال برابر فاصلے سے گذرا تھا۔

"وہ تو دیکھ لیا۔ ہم تم کیا نابالغ ہیں۔ کیوں دیر کر رہے ہو۔"

"مجھے تو بالکل موڈ نہیں ہے۔ اتنا ہی ضروری ہے تو کل دیکھ لیجئے گا۔"

"کیا خبر کل کون جیئے کون مرے۔ آج کل تم دیکھ ہی رہے ہو ہارٹ فیل چٹاپٹ ہو رہے ہیں۔"

"اور ہم لوگ اگر قوالی باز حسینہ دیکھے بغیر مر گئے تو شاید ہمیشہ جہنم میں جلنا پڑے گا؟" میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوالیہ انداز میں کہا۔

"اب یہ وقت مسلے بگھارنے کا تو ہے نہیں" وہ اونٹ گئے "ٹکٹ تو ہم ہی خریدیں گے تم کیوں مرے جاتے ہو۔"

"مجھے ننگی عورتیں بالکل پسند نہیں۔ انھیں دیکھ کر کچھ گزشت کا تصور آتا ہے۔ ابکائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ اب ننگی عورتیں گھسیٹ لائے۔

کون مردود ان کا ذکر کر رہا ہے۔"
"یہ فقرہ مردود۔ صرف بالغوں کے لئے۔"
"اس سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی تھیٹر تو ہے نہیں کہ سچ مچ کے مرد عورت دیکھنے پڑیں گے۔ فلم میں تو پرچھائیاں ہوتی ہیں۔ کسی بھی مفتی سے پوچھ لو پرچھائیوں کا اور اصل کا حکم ایک نہیں ہو سکتا۔ ایسا تو نہیں کہ تم دیوبند والے اشرف علیؒ یا جماعتِ اسلامی والے مودودی کے چکر میں آگئے ہو۔ ایسا ہوا تو کباڑا ہو جائے گا۔ منافق دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں پھینکا جاتا ہے۔"
"میں سو فی صدی آپ کا ہم مشرب ہوں مگر میرا خیال ہے ہمیں دن کا بارہ سے تین والا شو دیکھنا چاہیئے۔ کوئی نماز تو قضا نہیں ہو گی۔"
"چلو کل وہ بھی دیکھ لیں گے۔ ایک اخبار میں نظر پڑا تھا کہیں خواجہ بندہ نواز بھی چل رہی ہے۔"
"وہ بھی نہیں صرف وہی دیکھیں گے۔ کل لازماً گھر لوٹ چلنا ہے۔"
"بڑے گھر پر لڈو بٹ رہے ہیں" وہ رہ رہ کر جھلا رہے تھے" روز روز کہیں دلّی آنا ہوتا ہے۔ آدمی کو وقت سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔"
"آپ آدمی ہیں اس لئے ضرور اٹھائیں۔ میں ڈارون کے نظریۂ تخلیق کا قائل ہوں لہٰذا آدمی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"
"اب بکواس ہی کرتے جاؤ گے۔ اتنا وقت گذار دیا۔ کھیل یقیناً شروع ہو گیا ہو گا۔"
"بس تو ادھورا کیا دیکھنا۔ آپ یقین کریں میری بھی ایک پھوپی زاد خالہ ہیں ان کے اولاد نہیں ہوتی۔ چلتے چلتے انھوں نے قسم دلائی تھی شاہ نظام الدین میں ضرور جانا اور عرض کرنا کہ اولاد کے لئے حق تعالیٰ سے سفارش فرمائیں میں اُدھر ہو آؤں آپ ہرے بھرے شاہ ہو آئیں۔"
"شاہ نظام الدین میں اب کچھ نہیں رکھا۔ جب سے وہاں تبلیغی جماعت والوں نے ڈیرہ جمایا ہے شاہ صاحب نے مسکن ہی چھوڑ دیا ہے۔"
"او ہو۔ بھلا کہاں چلے گئے ہوں گے۔"
"یہ اہل اللہ کے راز ہیں۔ نامحرم کے آگے بیان کئے جائیں تو زبان جل جائے گی۔ حلق میں چھالے پڑ جائیں گے۔" باتوں میں سات بج گئے۔ اب دوبارہ رکشا کی گئی۔

نعیم صاحب فی الحال دو ہزار اڈوانس پر راضی ہو گئے تھے۔ معاملہ یہ طے پایا کہ تین دن بعد وہ درگاہ بلیسلی کا تفصیلی جائزہ لینے پہنچیں گے۔ ان کے قیام کا انتظام کسی اچھے ہوٹل میں کر دیا جائے۔

اگلی صبح ان سے رخصت ہو کر ہم نے متعدد مزارات پر حاضری دی۔ میری حیثیت تو تابع مہمل کی تھی قیادت کا فریضہ صوفی صاحب ہی انجام دے رہے تھے۔ مزارات سے مجھ کم نصیب کو تو کیا فیض ملتا البتہ موصوف نے بتایا کہ انھیں بہت کچھ حاصل ہوا ہے۔ میں نے بہت کچھ کی وضاحت چاہی تو ارشاد فرمایا۔

"تم کیا سمجھ سکو گے۔ دراصل ہم نقش بندی نسبت کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ مہینوں سے غضب یہ ہو رہا تھا کہ سہروردی اور چشتی سلاسل کے کچھ لطائف بیچ میں حائل ہو رہے تھے۔ ہمیں بڑی پریشانی تھی۔"
"ایسا کیوں ہو رہا تھا؟" میں نے اپنی معلومات میں اضافہ چاہا۔
"ہمارے پڑوس میں ایک مودودیہ آ بسا ہے۔ یہ لوگ جہاں بھی جا بستے ہیں طریقت کے سلاسل میں گڑبڑیں شروع ہو جاتی ہیں کیونکہ ان کے سروں پر شیطان کا سایہ ہوتا ہے۔"
"بڑے مردود لوگ ہیں۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرے پڑوس میں جو ڈاکٹر تنویر رہ رہے ہیں وہ بھی تفہیم القرآن پڑھتے پڑھتے کچھ مودودیہ سے ہو گئے ہیں۔ شاید اسی لئے میرا دل قوالی سے اُچاٹ ہو گیا ہے۔ خواب بھی ڈھنگ کے نہیں آتے۔ ابھی پچھلے ہفتے بڑا اشاندار خواب

دیکھ رہا تھا کہ ہوا میں اُڑا جا رہا ہوں۔ کئی بہشتی حوریں بھی ساتھ ساتھ اُڑ رہی ہیں۔ بس دفعتًا ایک جال سا کسی نے پھینکا اور میں اس میں اُلجھ کر زمین پر آ رہا۔ کیا دیکھتا ہوں جال کی رسّی ڈاکٹر تنویر کے ہاتھ میں اور وہ اپنے صاحب زادے کو آوازیں دے رہے ہیں کہ جلدی سے چھری لاؤ ایک مرغابی ہاتھ آئی ہے۔"

"بڑا نقصان پہنچایا ہے ان کم بختوں نے۔ بہر حال ہماری شکل تو حل ہو گئی۔ سبحان اللہ کیسا کیسا اولیا پڑا ہے دلی میں۔ فیوض و برکات کے چشمے جاری ہیں۔ تم نے کچھ محسوس کیا؟"

"جی ہاں کیوں نہیں۔ سبھی مزارات سے نور ہی نور پھوٹتا نظر آیا تھا۔ بس یوں جی چاہ رہا تھا کہ قربان ہو جاؤ۔"

"مگر تم کسی بھی مزار کے قریب تو پہنچے نہیں۔ دور ہی دور سے کیا خاک محسوس کیا ہوگا۔"

"کمال کرتے ہیں آپ۔ قریب جاتا تو فروغِ تجلّی سے جل نہ جاتا۔ مجھے تو تعجب آتا ہے آپ پر کیسے برداشت کر لیتے ہیں۔"

"مرشد رضی اللہ عنہ کا فیضان ہے۔ وہ تو تجلی کا تار پکڑ لیا کرتے تھے۔ سلوک کی راہ میں سب سے مشکل مرحلہ تجلیاتِ ذات کا ہوتا ہے۔ بس یوں سمجھو جیسے آگ کے دریا سے گزرنا۔ مگر مرشد رضی اللہ عنہ اس سے نہ جانے کتنی بار صاف گذر گئے۔ بدن پر چھالا تک نہیں پڑا۔"

"کیا آپ بھی گذرے ہیں؟"

"کیوں نہیں دو مرتبہ گذرے۔ ایک مرتبہ تو بدن پر پت اُچھل آیا تھا۔ دوسری مرتبہ بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ اب تو اصلی گھی نہیں ملتا۔ کمبخت کوکو جم نے باطنی صلاحیتوں پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب گاؤں کا خالص گھی ہمارے یہاں بہ افراط آیا کرتا تھا۔ دل روشن دماغ روشن۔ وظائف میں بڑا اثر تھا۔ اب تو کوکو جم بھی نہیں مل رہا — یار ہاں وہ ڈپو والے محمد حسن سے تو تمھاری صاحب سلامت ہے۔ ایک دو ٹین ڈالڈا کے دلواؤ نا۔"

"آپ ٹین کہہ رہے ہیں۔ میں نے فقط ایک کلو کے لئے کہا تھا جواب ملا کہ ڈالڈا تو ہے نہیں جھاڑو مار کر بناسپتی مل سکے گا۔ ایک کلو کے لئے پندرہ روپے بھجوا دو۔ میں نے بھجوا دیئے تھے۔ دو دن بعد بالکل گریس جیسی ایک چیز آئی جس سے ماربو اُٹھ رہی تھی۔ میں نے بڑی عاجزی کے ساتھ عرض کیا تھا کہ بھائی محمد حسن یہ گھی ہے یا چربی اور گریس کا ملغوبہ۔ جواب ملا تھا کہ چھوٹے بھائی۔ اسے بھی غنیمت ہی سمجھو۔ آگے کو یہ بھی شاید ہی ملے۔"

"بے حد خطرناک زمانہ آگیا ہے۔ ہم نے تو کئی سال پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہابیوں کی روش سے اولیاء اللہ بہت ناراض ہوتے جا رہے ہیں اور اندیشہ ہے کہ ہر طرف تباہی نازل ہوگی۔ دیکھ لو کیا سے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ آٹا غائب۔ سمنٹ غائب۔ گھی غائب۔ صابن غائب۔ حد ہے میاں زعفران غائب۔ تعویذ بادامی رنگ سے لکھنے پڑ رہے ہیں۔ پچھلے مہینے ایک آصیب کے علاج میں گول مرچوں کی ضرورت تھی۔ بجائے گول مرچوں کے نہ جانے کس خبیث کے بیج ملے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آصیب اُلٹا ہم پر چڑھ بیٹھا۔ وہ تو ہم مرشد رضی اللہ عنہ کی توجہ سے کام نکال لے گئے ورنہ ہو گیا تھا قصہ تمام۔"

"آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے پیر صاحب بعد مردن بھی آپ کے کام آ رہے ہیں۔ میرے مرشد علیہ الرحمۃ تو ایسے دنیا سے گئے کہ بقول شاعر خط بھی نہ بھیجا رسیلا کا۔ خواب تک میں نظر نہیں آتے۔"

"ایک سو ایک بار دعائے گنج العرش پڑھ کر مراقبہ کرو۔ سوا روپے کے بتاشے زکوٰۃ میں بانٹ دینا۔ یقین ہے کہ مرشد کی روح پُر فتوح سے رابطہ قائم ہوگا۔"

کافی دیر ہم مسائلِ قبوریہ پر اسی طرح ایمان افروز باتیں کرتے رہے۔ اب واپسی کا پروگرام بنتا تھا کہ صوفی صاحب نے کہا:۔

"آج ہی کیوں لوٹیں۔ کل تم نے قوالی یا زحسینہ نہیں دیکھنے دی۔ آج تو کوئی عذر حائل نہیں۔ مدد اور بھی

دیکھنے کے قابل چل رہے ہیں۔"
"یہ دلی ہے۔ یہاں سیکڑوں سنیما ہال ہوں گے۔
چکر آپ نے چلایا تو مہینے بھر بھی واپسی نہ ہو سکے گی۔"
"لعنت ہے اور کھیلوں پر۔ تم تو جانتے ہی ہو
نیما کا شوق نہیں البتہ روحانی کھیلوں کی بات
ہے۔ یار تم نے کچھ حاصل بھی کیا ہے اپنے مرشد رضی
نہ سے یا بس یونہی طریقت کا نام بدنام کرتے ہو۔"
"میرے مرشد خدا بخشے سنیما نہیں دیکھتے تھے۔
قول تھا کہ جب گوشت پوست کے پیکر بہتر سے بہتر
ہیں تو پرچھائیاں کیوں دیکھی جائیں۔ وہ کبھی کبھی
ر قوالی اور تلاوتِ قرآن سن لیا کرتے تھے بس۔"
"وہ تو خیر ہم بھی سن لیتے ہیں مگر ہمارے مرشد
للہ عنہ کا قول تھا کہ اہلِ سنت والجماعت کو خدا
توں کے معاملہ میں تنگ دل نہیں ہونا چاہئے۔
ور حسن اور نغمہ سب خدا کی نعمتیں ہیں۔ یار فضول
ہ جلاؤ۔ ساڑھے دس ہو رہے ہیں۔ کریم ہوٹل میں
کھائے لیتے ہیں۔ بارہ سے تین تک قوالی باز حسینہ
ں گے۔ ساڑھے تین سے ساڑھے چھ تک خواجہ
نواز۔ پھر کسی ہوٹل میں کھانا کھا کر جنت کی کلی میں
ہیں گے۔"
"جنت کی کلی۔ یہ نام میں نے آج تک نہیں سنا۔"
"اخبار دیکھ لو۔ ریگل میں چل رہی ہے۔ اور سنو
ا ہیروئن مس فردوسیہ کو ہم نے بچشمِ خود ہیران کلیر
ں میں دیکھا تھا۔ بہت خوش عقیدہ ہے۔ درگاہ کے
با دو ہزار دیئے تھے۔"
"پھر تو فلم کا نام لنگر باز حسینہ ہونا چاہئے۔ یا
صاحب اگر ہم اسی طرح وقت ضائع کرتے پھرے تو
جئیے آپ کی درگاہ کا بیڑا غرق ہو جائیگا۔ نعیم
ب کی ہدایات کے مطابق ہمیں وہاں ان کے پہنچنے
لے بہت کچھ کرنا ہے۔"
"وہ سب ہم پر چھوڑ دو۔ کل صبح پہلی گاڑی سے
نکل جائیں گے۔"
میں نے عاجز آ کر ایک طویل سانس لیا۔
"اچھا۔ آپ نے تہیّہ ہی کر لیا ہے تو پھر پروگرام یوں
رکھئے۔ پہلے قوالی باز حسینہ۔ پھر دو جاسوسی فلمیں۔"
"استغفر اللہ۔ تمھاری آوارہ مزاجی تو جوں کی توں ہے
سوچو ذرا غلط سلط فلمیں دیکھنے سے قلب تاریک ہو جاتا
ہے۔"
"روشن ہی رہ کر کیا تیر مارے گا۔ دیکھ لیجئے آپ کا
تو روشن ہے مگر درگاہ میں اُلّو بولنے لگا ہے۔"
"آزمائشیں تو قدرت کی طرف سے پیش آتی ہی ہیں
خواہ مخواہ کی بحثیں نہ نکالو۔ اچھا یوں سہی۔ ایک جاسوسی
دُو روحانی ــــ"
"یوں کیوں نہ کیجئے۔ آپ روحانی دیکھ آئیں میں
ذرا قطب کی لاٹ وغیرہ دیکھ آؤں۔ مدّت ہو گئی اِن
تاریخی یادگاروں کی زیارت کئے۔"
"ہرگز نہیں۔ پردیس کا معاملہ ہے ساتھ جئیں گے
ساتھ مریں گے۔ بس اٹھو پونے گیارہ ہو گئے۔"
کریم ہوٹل میں بیس روپے پچاس پیسے کا کھانا کھا کر
ہم اسکوٹر اسٹینڈ کی طرف چلے۔ دفعتاً کیا دیکھتے ہیں کہ
سامنے سے صوفی شعبان کے بھانجے میاں ادریس چلے آ
رہے ہیں۔
"ہائیں یہ کہاں" صوفی صاحب کے مُنہ سے نکلا۔ میاں
ادریس ہماری طرف جھپٹے اور سلام کے بعد کہنے لگے۔
"ماموں جان میں تو آپ ہی کو بلانے دلی آیا ہوں۔"
"خیریت تو ہے۔" صوفی صاحب نے سہمی ہوئی سی
آواز میں پوچھا۔
"کل شام مشتری آپا آ گئی ہیں۔ وہ مصر ہو گئیں کہ
دلی سے آپ کو ڈھونڈ کے لاؤں وہ زیادہ نہیں ٹھیرینگی۔"
میں نے محسوس کیا صوفی صاحب دفعتاً کھِل اٹھے۔
سہم کی جگہ طمانیت نے لے لی۔
"اچھا کیا تم نے آ گئے ورنہ آج ہماری واپسی ہوتی۔

ایسا کرو تم ڈھائی بجے اسٹیشن پہنچ جانا۔ تین والی سے چلیں گے۔ ہم بھی وہیں پہنچ رہے ہیں۔"

چند منٹ بعد ہم پھر ایک ہوٹل میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ صوفی صاحب کی باچھیں انگریزی گلاب کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔

"اُفوہ۔ ہم سے غلطی ہوگئی" وہ اچانک بولے "بسیں بھی تو جاتی رہتی ہیں۔ ریل کے چکر میں خواہ مخواہ اتنے گھنٹے ضائع ہوں گے۔"

"ابھی تو کچھ نہیں بگڑا۔ چلئے بس اسٹیشن چلیں۔"

"اب کیسے چلیں۔ ادریس میاں ریل پر ہمارا انتظار کریں گے نہ پہنچے تو پھر دن بھر یں ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔"

چائے کے دوران میں نے اندازہ کیا کہ وہ کسی خاص خیال کی دنیا میں گم ہیں۔ غالباً مشتری آپا کا سراپا چشمِ تصور کے سامنے جلوے دکھا رہا ہوگا۔ "آپا" وہ یقیناً تھیں مگر ادریس میاں کی نسبت سے ورنہ عمر پچیس سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔ میں خود ان کی خیالی تصویر کو اپنے حافظے کی لوح پر ابھرتا محسوس کر رہا تھا۔ کیا شاندار باڈی ہے۔ کیسا ترو تازہ چہرہ ہے۔ مسکرائیں تو جیسے کلی کھلے۔ بولیں تو جیسے غنچہ چٹکے۔ ان کے شوہر الطاف حسین لطیف آباد میں ملازم ہیں۔ صوفی شعبان سے کچھ سسرالی رشتہ ہے۔ کئی بار میاں بیوی دونوں ساتھ آئے۔ پردہ ان کے یہاں ہے نہیں۔ میری سلام دعا صوفی شعبان ہی کے گھر ہوئی۔ ایک دو بار مسز الطاف یعنی "مشتری آپا" بغیر شوہر کے بھی آئی ہیں۔ چھوٹا بھائی ساتھ ہوتا تھا۔ اولاد کوئی نہیں۔ تعلیم میٹرک تک ہے۔ بڑی چٹاخ پٹاخ قسم کی عورت ہیں۔

"یہ مسز الطاف اچانک کیسے وارد ہوگئیں؟" میں نے یونہی برسبیل تذکرہ پوچھا۔

"اچانک نہیں۔ آنا تو انھیں تھا ہی۔ البتہ وقت مقرر نہیں کیا تھا۔" صوفی صاحب کھوئے کھوئے سے انداز میں بولے۔

"کیا معاملہ ہے سال میں ایک دو بار ضرور آتی ہیں، حالانکہ براہ راست رشتہ داری آپ کی الطاف صاحب سے ہے نہ کہ ان سے۔"

"ارے کیا پوچھتے ہو۔ قدرت نے مجبور کر دیا ہے۔ دراصل چار سال ہوئے ان کے والد صاحب پر اسمگلنگ اور رشوت ستانی وغیرہ کے کئی مقدمات چل رہے تھے۔ کسی صاحبِ باطن کے مشورے پر وہ ہماری درگاہ میں آئیں اور مزار شریف پر ایک منت مانی۔ چند ہی مہینوں میں سارے مقدمے ختم ہوگئے۔ اسی منت کے سلسلہ میں سال میں دو بار وہ حاضری پر مجبور ہیں۔"

"بھلا کیا منت تھی؟"

"ہر چھٹے مہینے درگاہ کے لنگر سے بریانی کی تین دیگیں اتروانا۔ قُل کی برجی میں صلوٰۃِ غوثیہ پڑھ کر حزب البحر کی ہزار تسبیحیں۔ مبارک پنج دریے میں رات بھر کی قوالی۔"

"کمال ہے۔ اس طرح کی منت کا شعور بھلا میٹرک پاس مسز الطاف کو کیسے ہوا؟"

"ارے ہم مر گئے تھے کیا۔ ہم نے ہی انھیں یہ سب تعلیم دی تھی۔ واقعہ یہ ہے ملّا بھائی یہ تینوں چیزیں بڑی مجرب ہیں۔ اب تک تو کسی کو بھی ناکامی کا منھ دیکھنا نہیں پڑا۔ جو مانگو سو ملے۔"

"لیکن قُل کی برجی میں صلوٰۃِ غوثیہ اور تسبیحیں وغیرہ وہ کیسے پڑھتی ہوں گی۔"

"انھیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کی جگہ ہم نے حافظ نذیر حسین اور قاری شمشیر وغیرہ کا انتظام کر دیا ہے معمولی معاوضے پر۔ قوالی کا انتظام بھی ہم سب کر ہی لیتے ہیں۔ ان کے لئے یہ بھی پابندی نہیں کہ رات بھر بیٹھیں۔ بس بارہ بجے تک سے کام چل جاتا ہے۔"

"تب تو ان کی آمد کا وقت پہلے سے آپ کے علم میں رہتا ہوگا۔"

"ہاں وہ تو ڈائری میں نوٹ ہے۔ اب کی قصہ یہ ہوا کہ عین وقت پر انھیں کوئی مجبوری پیش آگئی۔ ہمیں لکھا کہ

کیا کیا جائے بروقت حاضری کی کوئی صورت نہیں ہے۔
ہم نے جواب دیا کہ منت کا معاملہ ہے تو بہت سخت لیکن آپ کے لئے اتنی رعایت نکال لی گئی ہے کہ معذوری رفع ہوتے ہی فوراً آجایئے گا۔ جتنے دن کی تاخیر ہوگی فی دن سوا روپیہ کے حساب سے فاتحہ کی زکوٰۃ درگاہ کے بیت المال میں جمع کرادیجئے گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔ یہ بیس دن کی بات ہے۔ اب مجبوری رفع ہوئی ہوگی تو فوراً آگئیں۔"

"غالباً الطاف صاحب ساتھ نہ آئے ہوں گے۔ ادریس میاں نے ان کا حوالہ نہیں دیا۔"

"یہی معلوم ہوتا ہے۔ بڑے دل گردے کی عورت ہیں۔ میاں کو بھی خاطر میں نہیں لاتیں۔"

"مگر آپ کو خاطر میں ضرور لاتی ہیں۔ میرا مطلب ہے فوراً ادریس میاں کو یہاں دوڑایا۔"

"ہم نہ ہوں تو منت کی تکمیل کیسے ہو۔ مگر۔ ملّا بھائی ایک بڑی مصیبت ہے۔ تم ہی کچھ علاج کرو۔"

"فرمایئے۔ ناچیز کی تو جان بھی آپ کے لئے حاضر ہے۔"

"جب بھی مشتری بیگم آتی ہیں ہماری زوجہ بدبخت جان کا وبال بن جاتی ہے۔ حالانکہ دیکھو الطاف حسین اسی کے رشتہ دار ہیں اور اس لحاظ سے مشتری بیگم بھی اسی کی رشتہ دار ہوئیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بھی اور ہمیں بھی بدبخت پھاڑ کھائے گی۔"

"اوہو۔ مگر مشتری بیگم ان کی بدمزاجیاں آخر کیسے برداشت کرلیتی ہوں گی۔"

"ان کے منھ پر تھوڑی کچھ کہتی ہے۔ انھیں تو ہم نچلی منزل میں ٹھیرا دیتے ہیں۔ وہ اوپر اوپر اونٹنی رہتی ہے۔ پھر جب ہم اوپر پہنچتے ہیں تو لال پیلی آنکھیں کرکے چڑھ دوڑتی ہے۔"

"کیا شکایت ہے اسے آپ سے؟"

"اپنا سر۔ میاں شکایت کیا ہوتی۔ عورتوں والی جلن اور کیا۔ نامراد یہ سمجھتی ہے کہ مشتری بیگم سے ہمارا عشق چل رہا ہے۔ غضب خدا کا تم خود سوچو۔"

"جی ہاں۔ میں نے سوچ لیا۔ بیویاں اس معاملہ میں بہت بیہودہ ہوتی ہیں۔ مگر خادم اس سلسلہ میں کس طرح کام آسکتا ہے۔"

"ہماری زوجہ تمھاری زوجہ کو بہت مانتی ہے۔ اپنی زوجہ کو سمجھاؤ کہ وہ ہماری زوجہ کو سمجھائے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔ مشتری بیگم کو کسی قیمت پر ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔ میرا خیال ہے وہ ہمارے منصوبے میں اہم پارٹ ادا کرسکیں گی۔"

"وہ کیسے؟" صوفی صاحب کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"اسکیم میں یہ بھی ہے کہ سرمایہ دار قسم کے ارادتمندوں کے لئے ایک طلسماتی قسم کی جنت بنائی جائے۔ جنت میں بہرحال حوریں چاہئیں اور حوریں پیڑوں پر نہیں اُگتیں۔ مشتری بیگم کا ٹائپ جہاں تک میں سمجھا ہوں ایسا ہی ہے کہ انھیں آپ اور ہم مل کر شیشے میں اُتار لیں گے۔ کیا خیال ہے؟"

اللہ اکبر۔ یار کہاں کہاں کی سوچ لیتے ہو۔ قسم ہے خداوند ذوالجلال کی اگر ایسا ہوگیا تو مزا ہی آجائے گا۔ مگر یار تم مذاق تو نہیں کررہے ہو۔"

"آپ کے سر کی قسم مذاق سے کیا مطلب۔ صاف بات ہے بندہ تو اس کا قائل ہے کہ آدمی گو کھائے تو ہاتھی کا کھائے۔ نعیم صاحب سے اس کے متعلق بات ہوچکی ہے۔"

"لیکن یہ سمجھ لو مشتری بیگم بھولی بھالی نہیں ہیں۔ اُڑتی چڑیا کے پر گنتی ہیں۔"

"وہ تو اسی سے ظاہر ہے کہ آپ جیسا شریف آدمی انھیں منت کی راہ پر لگائے گیا۔"

"خباثت کی باتیں مت کرو۔ تمھارا گویا یہ مطلب ہے کہ۔۔۔"

"میرے مطلب کی آپ مطلق پروا مت کیجئے۔ میں اسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ سمجھوں گا اگر کوئی عورت خوبصورت بھی ہو اور عقلمند بھی۔"

"یہ تو تمھاری بکواس ہے۔ مشتری بیگم کو ہم نے ہر اعتبار

سے عقل مند پایا ہے۔"

"آپ ہی نے تو پایا ہے۔ یہ دنیا داری کے چکر تو آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ عقل کی ایک ہزار قسمیں ہیں۔ اب اُٹھیئے بازار سے ایک دو چیزیں لیتے ہوئے اسٹیشن پہنچ جائیں گے۔"

پھر اسٹیشن پہنچ کر ادریس میاں سے تصدیق ہوگئی کہ "مشتری آپا" اپنے برادر خورد ہی کے ساتھ آئی ہیں الطاف صاحب نہیں آئے۔

ریل فراٹے بھر رہی تھی۔ ادریس میاں ہم دونوں سے اتنی دور تھے کہ ہماری باتیں سننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لہذا میں اور صوفی صاحب بلا تکلف رازو نیاز میں مصروف تھے۔

"ایسا کرنا سید سے ہمارے ہی یہاں چلے چلنا۔ اس میں دو فائدے ہوں گے۔"

"یعنی؟" میں نے پوچھا۔

"ایک تو میاں یہی کہ تمہاری موجودگی میں زوجہ بدبخت زیادہ نہیں بھڑکے گی۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ وہ بھری بیٹھی ہوگی۔ خدا خیر کرے ڈر لگتا ہے کہ وہ بدزبان کسی دن مشتری بیگم ہی سے نہ بھڑ جائے۔"

"اور دوسرا؟" میں نے فائدۂ اول کو ہضم کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ جو تم کہہ رہے تھے کہ جنت کے لئے انھیں شیشے میں اُتارنا ہے تو اس کی بھی شروعات آج ہی سے کر دینا۔ تمہاری سلام دعا تو پہلے ہی سے ہے۔"

"حق فرمایا لیکن مائی ڈیر صوفی صاحب۔ میری بیوی کو جب پتا چلا کہ سفر سے واپسی پر سیدھا گھر پہنچنے کے بجائے مشتری بیگم سے اٹھکیلیاں کرنے جا پہنچا ہوں تو کیا بعید ہے کہ وہ فرطِ محبت میں طلاق ہی دے ڈالے۔"

"کیوں خواہ مخواہ مذاق کرتے ہو۔ ہمیں تو یقین سا نہیں آ رہا ہے کیا واقعی مصنوعی جنت بن سکتی ہے۔ اتنی لمبی چوڑی جگہ بھی آخر کہیں سے آئے گی۔"

"جگہ پر لعنت بھیجئے۔ ایک خوابناک اور طلسماتی فضا میں جب حوروں کے حسین پیکر طلوع ہوں گے تو دیکھنے والوں کو اس کی پروا ہی کب ہوگی کہ جنت کی لمبائی چوڑائی کتنی ہے۔ وہ ایک مختصر کمرے کو بھی جنت مان سکتے ہیں اگر عورت کو ان کے اعصاب پر سوار کر دیا جائے۔"

"خیر بھئی۔ فلسفے تم ہی سمجھو۔ ہمیں تو بہرحال تم پر اعتماد ہے۔ اسکیم خدا کے فضل سے کامیاب ہوگئی تو ہماری درگاہ کا نام ساری دنیا میں روشن ہو جائے گا۔ درگاہ سمنونیہ میں خاک اُڑنے لگی تو سمجھو سب کچھ ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے ملا بھائی سمنونیہ کا سجّادہ بڑا خبیث ہے۔ اصلی معرفت کی تو اسے ہوا بھی نہیں لگی۔"

"کیا نام ہے بھلا؟"

"خواجہ الحمار للہ۔ خبیث نے اپنے مقدس نام کا بھی خانہ خراب کر دیا۔ چھپ چھپ کر شراب پیتا ہے۔ عقیدت مندوں کو بہکا رکھا ہے کہ یہ آبِ کوثر ہے جسے پی کر روح آٹھویں آسمان کی سیر کرتی ہے۔"

"آٹھویں؟!" میں چونکا۔

"ارے ہاں یہی تو شیطنت پھیلا رکھی ہے ابلیس نے۔ کہتا ہے سات آسمان عامیوں کے لئے ہیں۔ عارفوں کیلئے مولانے آٹھواں آسمان تیار کیا ہے۔"

"آپ پروا نہ کیجئے۔ ہم نواں اور دسواں تیار کرنے کی کوشش کریں گے۔ بس رقم کے معاملہ میں دل تنگ نہ کیجئے گا۔"

"بالکل نہیں کریں گے۔ ہمارے حلقے میں ایسے ایسے سیٹھ ہیں کہ ضرورت پڑنے پر تھیلیوں کے منھ کھول سکتے ہیں۔ بمبئی کے ایک سیٹھ ہیں پیارے بھائی دلارے بھائی صندوق والا۔ عورتوں کے بڑے شائق ہیں۔ دو سال ہوئے اپنے یہاں عرس میں گیندا قوال کی پارٹی کے ساتھ ایک نئی خوش ادا آگئی تھی۔ نفیسہ بیگم سیٹھ بھی آئے ہوئے تھے۔ بس کیا پوچھتے ہو۔ کم سے کم پانچ ہزار اُٹھا کر گئے۔ درگاہ کے حصے میں تو مشکل سے ڈیڑھ ہزار آئے ہوں گے باقی سب وہی لے گئی۔ بلا کی حسین تھی۔ اسے

دیکھ کر نیرنگیِ قدرت کا تماشا نظر آتا تھا۔"
"کیا مشتری بیگم سے بھی زیادہ حسین تھی؟" میں نے سوال کیا۔
"اب یہ بتانا تو مشکل ہے۔ یوں سمجھ لو ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔" صوفی صاحب کے ہونٹوں پر تبسم اور آنکھوں میں جذبۂ افتخار کے آثار جھلکے۔
"خیر اِس قسم کی تو فی الحال آپ کے پاس ابھی ایسی کمی نہیں۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ اس کے بھروسے پر آپ کام کر رہے ہیں تو سمجھئے بیڑا پار ہے۔"
معارف و لطائف کے ایسے ہی دُر ہائے شہوار لٹاتے اور عرفان و اسرار کے موتی رولتے راستہ کٹتا چلا جا رہا تھا۔

صوفی صاحب کے مکان کے گراؤنڈ فلور میں، دو کمرے ہیں۔ ایک میں باتھ روم وغیرہ ہے۔ دوسرا ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پہلے اس میں مونڈھے بچھے رہتے تھے۔ اب ایک شاندار صوفہ سیٹ اور جدید ڈزائن کی گول میز جلوہ طراز ہے۔ یہ تبدیلی مشتری بیگم ہی کی وجہ سے ہوئی تھی۔
وہ ہلکے جامنی سوٹ میں نظر آئیں۔ ہاتھ میں کوئی ناول تھا۔ صوفے پر نیم دراز بڑے انہماک سے مطالعہ فرما رہی تھیں۔ ہماری آہٹ پاکر چونکیں اور پھر رسمی سلام دعا ہوئی۔
"تم بیٹھو ـــــ ہم لوگ ذرا اوپر ہو کر آتے ہیں۔" صوفی صاحب نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے مجھے زینے کی طرف کھینچا۔
امید کے مطابق مسز شعبان یعنی زوجہ آف صوفی دی گریٹ بھری بیٹھی تھیں۔ صوفی صاحب کے قدموں کی آہٹ ہی سے انھوں نے پہچان لیا تھا کہ سیڑھیاں کون چڑھ رہا ہے۔
"ہاں ہاں آتے کیوں نا۔ ریل مری بیٹی غارت ہو جاتی تب بھی پیدل ہی دوڑے آتے۔ وہ لگی سگی آئی ہوئی ہے نا۔"
ابھی اور نہ جانے کیا کہا جاتا کہ صوفی صاحب آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے کھنکارے اور فرمایا۔
"خاموش نیک بخت! ملّا میاں بھی ساتھ ہیں۔ آؤ بھئی آ جاؤ۔" انھوں نے گردن موڑ کر مجھ سے کہا۔ مسز شعبان مجھ سے برائے نام سا گھونگٹ کرتی تھیں۔ عمر ساٹھ کے قریب ہوگی۔ صورت تو جوانی میں بھی بوڑھوں ہی جیسی تھی۔ یہ صوفی شعبان کا بیان ہے۔
"آؤ بیٹا ـــ اچھا ہوا تم آ گئے۔ آج فیصلہ ہو کر ہی رہے گا۔"
"ارے آہستہ بولو۔" صوفی صاحب نے دانت کچکچائے۔
"کیوں بولوں آہستہ۔ سنتی ہے تو سنے کلموہی ـــ لے بیٹا۔ ذرا تم ہی منصفی کرو۔ یہ ان کی عمر ہے کیا اِن باتوں کی۔ فرشتے بھی جہنم میں تھوکتے ہوں گے۔"
"خدا کے لئے چپ بھی ہو جاؤ۔" صوفی صاحب تقریباً رو دیئے "جانے تمھارے خیالات اتنے گندے کیوں ہیں۔ ملّا میاں تم ہی بتاؤ کیا ہم کوئی ایسے ویسے آدمی ہیں" یہ کہتے ہوئے انھوں نے صوفیا اُن سے نظریں بچا کر مجھے بائیں آنکھ ماری تھی۔
"یہ تو واقعہ ہے تائی جان مشتری بیگم اِنھیں باپ کی طرح مانتی ہیں۔ بڑی شریف عورت ہیں۔"
"ارے بیٹا شریف عورتیں کہیں اکیلے دیس پردیس پھرتی ہیں۔ پندرہ سال کا لونڈا ساتھ ہے کیا خبر بھائی ہے یا کیا بلا ہے۔"
"ایسا مت سوچئے۔ میں خوب واقف ہوں وہ بھائی ہی ہے۔ در اصل اُن کے شوہر صاحب بے حد مصروف آدمی ہیں سرکاری ملازمت کا معاملہ ہے۔" میں بولا۔
"تو ایسی آفت ہی کیا پڑ رہی ہے کہ آندھی جائے بارش جائے چلی آ رہی ہیں۔ ایسی منت تو ج کسی نے سنی ہو۔"
"آپ بدگمانی نہ کیجئے۔ منت کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر پوری نہ کی جائے تو مزار والے بزرگ الٹا لٹکا

دیتے ہیں۔ اخبار میں تو روز ایسے واقعات آتے رہتے ہیں کہ فلاں فلاں آدمی درخت میں اُلٹے لٹکے دیکھے گئے۔ آنتیں منھ کے راستے باہر آگئیں تھیں۔"

"تیرا تو خیر مجھے اعتبار ہے تو جھوٹ نہیں بولتا مگر یہ تیرے تائے دنیا جہان کا جھوٹ بولتے ہیں۔ ذرا پوچھ ان سے باپ دادوں کے اطوار چھوڑ کے مونڈھوں کی جگہ فرنگی کرسیاں کیوں لائے۔ تجھ سے بتادیا کہ سو سو کی آئی ہیں۔ صفیہ کے چچا سے پتا چلا کہ چار سو لٹائے گئے ہیں۔ غضب خدا کا۔"

"آپ صفیہ کے چچا کا اعتبار نہ کیا کریں۔ وہ صوفی صاحب سے جلتے ہیں گھر میں فساد ڈلوانا چاہتے ہیں۔ یہ کرسیاں تو اب بھی سو ہی روپے کی ملتی ہیں۔"

نصف گھنٹے کی سعیِ بلیغ کے بعد میں نے تائی جان کو یقین دلا ہی دیا کہ مشتری بیگم اور صوفی صاحب کا ربط باہم خطرے کی حد سے باہر ہے۔ پھر بھی انھوں نے یہ ضرور کہا۔

"خیر جب تک وہ یہاں ہے تم ساتھ لگے رہو۔ یہ تمھارے تائے زہر کی پڑیا ہیں میں ان کی رگ رگ جانتی ہوں۔"

صوفی صاحب کو اوپر ہی چھوڑ کر میں نیچے اُتر آیا۔ ان میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ نیچے میرے ساتھ آتے۔ مشتری بیگم نے مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر کتاب کے ورق کا کونہ موڑا اور میز پر رکھتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھیں۔ ادریس میاں موجود نہیں تھے۔

"او ہو۔ برخوردار کو کہاں بھیج دیا۔" میں نے دروازے پر ٹھٹک کر کہا۔

"آئیے تشریف رکھئے۔ وہ شاید بازار گیا ہے۔"

"کونسی کتاب پڑھ رہی تھیں؟۔ دیکھ سکتا ہوں؟"

"ارے بس یونہی ــــ کیا دیکھیں گے آپ ٹھیرے مولوی آدمی۔ میں تو خالی اوقات میں رومانی ناولوں سے دل بہلا لیتی ہوں۔" ان کے ہونٹوں پر معذرت آمیز تبسم تھا۔ میں نے کتاب اٹھا کر نام دیکھا ــــ "اے عشق کہیں لے چل۔" مصنفہ حسین سردھنوی۔

"مصنف تو بُرا نہیں" میں نے کہا" اس کے دو چار ناول میں نے بھی پڑھے ہیں۔"

"آپ نے بھی پڑھے ہیں۔" وہ تحیّر آمیز لہجے میں بولیں۔

"کیوں آپ کو حیرت کیوں ہوئی؟"

"ارے بھلا ــــ یعنی"

"چھوڑئیے ــــ زندگی بہرحال کچھ تفریحات چاہتی ہے۔ مولوی کا مطلب یہ تو نہیں کہ آدمی کنوے کا مینڈک بن کر رہ جائے۔ کیا خیال ہے؟"

آخری فقرہ ان کے لئے شاید غیر متوقع تھا۔ چونک سی گئیں۔ میں اب بھی ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"میرے شوہر مولوی نہیں ہیں مگر ان کا خیال ہے کہ سب سے بڑی تفریح پیسہ جمع کرنا ہے ــــ ہٹائیے۔ آپ کو رومان نگاروں میں سب سے زیادہ کونسا مصنف پسند ہے؟"

"اب تو کوئی بھی نہیں۔ دراصل میں نے شادی کے بعد سے ناول پڑھنے چھوڑ دیئے۔ میرا خیال ہے رومانی ناول شادی کے بعد نہیں پڑھے جاسکتے۔"

"او ہو ــــ بھلا کیوں؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔"

"کیا بات ہوئی۔" وہ ہنس پڑیں۔ میں نے خفت کی ایکٹنگ کی۔

"خیر۔ آپ کبھی لطیف آباد بھی گئے ہیں؟" انھوں نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"آئیے کبھی۔ بڑی پُرفضا جگہ ہے۔ میرا مکان دیکھ کر آپ خوش ہوں گے۔"

"مشکل ہے۔"

"کیا مشکل ہے؟"

"آپ یہاں آکر بھی میرے غریب خانے کو شرف

نہ بخشیں — معاف کیجئے گا۔"

"اوہو۔ اس کا موقعہ ہی کب ہوا۔ جب کہئے چلیں۔ آپ کی بیگم سے مل کر مجھے یقیناً خوشی ہوگی۔ البتہ یہ اُمید کم ہی ہے کہ انھیں بھی مجھ سے مل کر خوشی ہو۔"

"وہ بڑی گریٹ عورت ہے۔ آپ تائی جان پر قیاس نہ کریں۔"

"تائی جان ؟"

"محترمہ صوفیائن صاحبہ کو میں تائی جان کہتا ہوں۔"

"بڑی دقیانوسی عورت ہیں۔ میرا تو ان کے سائے تک سے جی گھبراتا ہے۔"

اسی وقت ادریس میاں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں وِلس فلیک سگریٹ کے تین پیکٹ تھے۔ مجھے سلام کرکے انھوں نے پیکٹ بہن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیجئے بڑی مشکل سے تین ملے ہیں۔ آس پاس کوئی بڑی دکان نہیں ہے۔"

بہن کا حال دیدنی تھا۔ چہرے پر ایک رنگ آیا ایک گیا۔

"تجھے تو کبھی عقل آئے گی ہی نہیں۔" وہ ادریس پر اُلٹ پڑیں۔ "کوڑ مغز۔ بیہودہ۔" لہجہ بے حد جارحانہ تھا۔ ادریس سہم گیا۔ شاید وہ سمجھا ہی نہیں تھا کہ "آپا جان" کیوں آگ بگولا ہوگئی ہیں۔ پیکٹ اس نے میز پر رکھدیئے۔

"بچہ ہے۔ چھوڑیئے۔" میں نے ناصحِ مشفق کے انداز میں کہا۔

"یہ ڈھینگ کا ڈھینگ بچہ ہے۔ اب منہ کیا تک رہے ہو چلو بیٹھو۔"

"الحمد للہ میرا ایک بڑا فکر دور ہوا —" میں بولا۔

"جی ؟"

"میں ڈر رہا تھا کہ آپ میرے یہاں جائیں گی تو میری بیوی کو سگریٹ پیتا دیکھ کر کیا سوچیں گی۔ وہ تو کبھی کبھی حقہ بھی پی لیتی ہے۔"

"کیا میرا مضحکہ اُڑا رہے ہیں۔" اس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"استغفر اللہ۔ آپ میری مولویت کا غلط اندازہ نہ لگائیں۔ میں روایتی قدامت پرستی کا قائل نہیں سگریٹ میں پیوں تو میری بیوی کیوں نہ پئے۔ وِلس فلیک اسے بھی پسند ہے۔"

"بات یہ ہے پچھلے سال میرے معدے میں درد ہوا تھا۔" وہ بولیں "کئی دن بڑے سخت گذرے۔ کسی علاج سے فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک حکیم صاحب کی دوا سے فائدہ ہوا مگر انھوں نے ہدایت کی تھی کہ حقہ یا سگریٹ پیا کرو ورنہ معدے میں کینسر ہو جائے گا۔"

ان کا لہجہ اگرچہ بڑا رواں تھا مگر ہلکی ہلکی شرمساری اس میں اب بھی تھی۔

"حقہ کا تو جواب ہی نہیں ہے۔ خیر تکلف نہ کیجئے شوق فرمائیے۔" میں نے پیکٹ اُٹھا کر کھول ڈالا۔ انھوں نے پاس رکھے ہوئے ننھی پرس سے ایک ننھا منا لائٹر نکال کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے ایک سگریٹ اپنے اور ایک ان کے لئے نکالی۔

"جی آپ پیجئے میں اس وقت نہیں پیوں گی۔"

"تکلف غیر ضروری ہے۔ غالباً صوفی صاحب سے تو پردہ نہ ہوگا۔"

"ان کے تو علم میں ہے مگر آپ پیجئے۔ میرا موڈ نہیں ہے۔"

"آپا جان — ہم تو نوگزا پیر دیکھنے جائیں گے۔"

دفعتاً ادریس میاں نے زبان کھولی۔

"بکواس ہے۔ کیوں ملا صاحب یہ نوگزا پیر کیا بلا ہے میں نے بھی کسی سے سُنا تھا۔"

"بلا نہیں۔ وصال کے وقت ان کا قد فقط پانچ فٹ تین انچ تھا۔ دم نکلتے ہی بڑھنا شروع ہوا اور قبر تک پہنچتے پہنچتے نوگز ہوگیا۔ وہ تو خدام نے تدفین میں جلدی کی ورنہ ایک گز فی گھنٹہ کی رفتار سے بڑھتا جا رہا تھا۔"

"نہیں !" وہ چونکیں۔ ان کے چہرے پر دہشت کے

کے آثار اُبھرے تھے۔ پیکرِ سیمیں میں شاید تھرتھری بھی آ گئی تھی۔

"آپ یقین فرمائیں۔ دفن کرنے والوں کی بھی گھگیاں بندھ گئی تھیں۔ میرے پیر رحمۃ اللہ علیہ کے دادے پیر رضی اللہ عنہ خود تدفین میں شریک تھے۔ کیا پوچھتی ہیں بڑے بڑے بزرگ ہوئے ہیں ہمارے یہاں۔"

اب صوفی صاحب داخل ہوئے۔ بڑے مشفقانہ انداز میں مشتری بیگم کی مزاج پرسی کی پھر فرمایا کہ درگاہ کی طرف چلا جائے۔ میں نے گھر جانے کی اجازت چاہی تو مشتری بیگم نے ٹوکا۔

"جلدی کیا ہے۔ درگاہ سے چلے جائیے گا۔"

"اب اجازت ہی دیجئے۔ میں شام تک پھر ملونگا۔"

"اپنے گھر کب بلا رہے ہیں؟"

"بس چل کے بیوی سے مشورہ کرتا ہوں۔ غالباً کل دوپہر کے کھانے پر آپ سب کو مدعو کر سکوں گا۔"

دعوت کا مسئلہ میرے اور زوجہ کے درمیان کافی جنگ و جدل کے بعد طے ہو سکا۔ جنگ صرف ذہنی ولسانی تھی توپ بندوق تک نوبت نہیں پہنچی تھی۔ وہ بار بار باورچی خانے کی خانہ ویرانی کا مرثیہ شروع کرتی اور میں فوراً مہمان نوازی اور فیاضی و توکل جیسے اوصافِ حمیدہ کی شان میں دو غزلہ عرض کر کے اسے کنتوں سے کاٹ دیتا۔ آخر کار جب اسے ہمیشہ کی طرح آج بھی یہ احساس ہو گیا کہ میرے دلائلِ قاہرہ کی تاب لانا اس کے بس کا روگ نہیں تو ہتھیار ڈال دیئے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ تائی جان یعنی مسز شعبان کو بھی ضرور بلایا جائے گا۔ یہ بہت ہی واہیات بلکہ خطرناک شرط تھی مگر میں اسے رد کر کے اس کی چھٹی حس کو بیدار کرنا نہیں چاہتا تھا۔

عصر پڑھ کر خوش خوش درگاہ پہنچا یقین تھا کہ صوفی صاحب مع مشتری بیگم وہیں ہوں گے مگر وہاں پہنچکر یہ منحوس خبر ملی کہ صوفی صاحب کے سینے میں دفعتاً درد ہوا تھا وہ گھر لوٹ گئے ہیں۔

گھر پہنچا تو ایک کہرام سا دیکھا۔ موصوف کے عزیز و اقربا جمع تھے۔ تائی جان رو رہی تھیں مشتری بیگم کی بھی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دو ڈاکٹر صوفی صاحب پر جھکے ہوئے تھے اور صوفی صاحب لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑے تھے۔

انجکشن دینے کے بعد ایک ڈاکٹر نے صوفی صاحب کے چچیرے بھائی محرم علی کو مخاطب کیا۔

"انھیں بڑے ہسپتال لے جائیے گا۔" پھر دوسرے ڈاکٹر سے مشورہ کر کے وہ بولے "چند دوائیں لکھے دیتے ہیں صبح تک انھیں استعمال کرائیے۔ کل ہسپتال میں داخل ضرور کرا دیجئے۔"

بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ ہسپتال میں فوری داخلہ خصوصی کوششوں کے بغیر آسان نہ تھا۔

ایک گھنٹے بعد انھیں ہوش آیا ـــــ سب کی جان میں جان آئی۔ وہ فرطِ ضعف سے فوراً بول تو نہیں سکے تھے لیکن اپنے اردگرد غمخواروں کا ہجوم دیکھ کر مطمئن ضرور ہوئے تھے۔ پھر کچھ دیر بعد بولے بھی۔ نصف گھنٹے میں اچھی خاصی توانائی آ گئی۔ بتایا کہ اب درد بالکل نہیں ہے بس ہلکی سی گھٹن ہے۔

عشاء کی اذان ہو رہی تھی جب انھوں نے جملہ حاضرین سے فرمایا۔

"آپ لوگ کچھ دیر کے لئے ہمیں تنہا چھوڑ دیں۔ بس ملّا میاں ٹھیرے رہیں۔ کچھ خاص باتیں کرنی ہیں۔"

حاضرین کو تفریقِ مراتب حیرت تو ہوئی مگر موقعہ ایسا تھا کہ این وآں نہ کر سکے۔ چند منٹ بعد کمرہ خالی ہو گیا

"آپ نے تو جان ہی نکال لی تھی قبلۂ وکعبہ" میں نے بڑے پیار سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "بھلا یہ کیا موقعہ تھا بیمار پڑنے کا۔ بچاری مشتری بیگم تو صدمے سے نڈھال ہو کر رہ گئی ہیں۔"

"بات سنو۔ ایک خاص کام ہے جو تمھیں آج ہی رات میں کرنا ہے ـــــ اور قریب ہو جاؤ۔ ہوں۔ دیکھو" انھوں نے بہت ہی رازداری کے لہجے میں کہا" درگاہ میں جو برگد کا پیڑ ہے اس سے جنوب کی طرف چوتھی قبر کے سرہانے ایک کیکر کا درخت ہے۔ اس کے تنے سے دو گز شمال کی طرف چھوڑ کر ایک اور قبر ہے۔ اسے کھود ڈالنا۔"

"کھود ڈالوں!" میں عالمِ تحیّر میں بدبدایا۔ ان کے ہونٹوں پر ذومعنی تبسم کا تبسم آیا۔

"گھبراؤ نہیں۔ وہاں لاش نہیں نکلے گی۔ لوہے کا چھوٹا سا ایک صندوق نکلے گا۔ اسے ہماری امانت سمجھ کر محفوظ رکھنا طبیعت ٹھیک ہونے کے بعد ہم لے لیں گے۔"

"آپ تو حیران کئے دے رہے ہیں ـــــ آخر قصہ کیا ہے۔"

"اب تو بتانا ہی ہوگا۔ دراصل سال بھر ہو گیا ہے ہم نے اور ایک اور شخص نے صندوق وہاں گاڑا تھا۔ پھر وہ شخص افریقہ چلا گیا۔ ایک مہینہ ہوا خبر ملی تھی کہ اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ مگر یہ خبر غلط تھی۔ آج ہی شام ہمیں علم ہوا کہ وہ زندہ سلامت واپس آگیا ہے۔ اگر ہم اچانک بیمار نہ ہو گئے ہوتے تو تمھیں تکلیف نہ دیتے۔ تمھارے سوا کوئی بھروسے کے قابل آدمی نہیں۔ اگر جلد سے جلد تم نے صندوق نہ نکال لیا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ نکال لے جائے گا۔"

"آخر اس صندوق میں کیا ہے؟"

"تمھیں اس سے کیا بحث۔"

"ہمارا اعتبار نہیں ہے!"

"ہے میاں۔ اچھا سنو۔ اس میں ایک لاکھ کے نوٹ ہیں اور کچھ زیورات جن میں قیمتی ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔"

"یا خدا ـــ اتنی دولت۔ یعنی کہ ـــ"

"بس دیکھو عزیزم" انھوں نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ اپنے سینے سے چپکاتے ہوئے فرمایا" یعنی وغنی کا بالکل وقت نہیں ہے۔ ہم بعد میں تمھارے ہر سوال کا جواب دیدیں گے۔ اگر آج ہی یہ کام نہ ہو گیا تو سمجھو ساری دولت گئی۔ اس شخص پر وقتی طور پر ہم نے اعتماد کر لیا تھا مگر بعد کی تحقیق سے منکشف ہوا کہ چار سو بیس آدمی ہے۔ صندوق نکال کر لے جائے گا پھر ہم کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔"

"جان سے پیارے برخوردار۔ ٹال مٹول مت کرو۔ جو کچھ ہمارا ہے وہ سب تمھارا ہے۔" پھر وہ تکیے کے سہارے نصف اُٹھ بیٹھے اور بہت ہی رازدارانہ انداز میں کہنے لگے۔ "اللہ قسم۔ ہم نے مشتری بیگم سے تمھاری تعریف کی ہے ـــ وہ تمھیں اپنے گھر بھی بلائیں گی۔ ہم اگر نہ چاہیں تو تم اکیلے انھیں شیشے میں نہیں اُتار سکتے۔"

"آپ نہیں چاہیں گے تو مجھے ضرورت ہی کیا ہو گی انھیں شیشے یا پتھر میں اُتارنے کی۔ میں تو آپ ہی کی درگاہ کے لئے اس کھیل میں شریک ہوا ہوں۔"

"وہ تو تمھارا شکریہ۔ لیکن یہ تو ہرگز تم نہیں کہہ سکتے کہ مشتری بیگم کے جمال کا کوئی اثر ہی تمھارے جذبات پر نہیں ہوا ـــ آہ ـ چبھن سی پھر ہو رہی ہے۔" وہ ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ سیدھے لیٹ گئے۔ چہرے پر کرب کی لہر نظر آئی تھی "آپ زیادہ باتیں نہ کیجئے۔"

"وعدہ کرو۔ آج یہ کام ضرور کر ڈالو گے تمھیں ہماری جان کی قسم۔" انھوں نے مرتعش سی آواز میں کہا۔

"اچھا جناب وعدہ۔ آج ہی کوشش کروں گا۔"

"ہزاروں برس جیو ـــ ہم صبح تمھارا انتظار کرینگے۔ ـــ اب جاؤ اور دوسروں کو یہاں بھیجدو ہمیں دوا پلائیں۔"

میں اندازہ کر رہا تھا کہ ان کا کرب بڑھ رہا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے وہ سینہ دباتے جا رہے تھے۔ میں نے کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے افراد کو وہاں بھجوایا اور خود زینے سے اُتر گیا۔ مشتری بیگم زینے سے نیچے کھڑی ملیں۔

"کیا حال ہے ـــ کیا بات تھی۔" انھوں نے بیتابانہ انداز میں اکلدم دو سوال کئے۔

"کچھ نہیں۔ بعض گھریلو معاملات ـــ"

"آئیے۔ کمرے میں بیٹھیں گے۔"

"اس وقت معافی چاہوں گا۔ آپ اُدپر ہی چلی جائیے

تو بہتر ہے۔ صوفی صاحب کو پھر کچھ تکلیف شروع ہو گئی ہے۔"

"مجھے تو معاملہ ڈینجرس نظر آرہا ہے ـــــ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"خطرہ تو بہرحال ہے ہی۔ ہارٹ اٹیک میں اطمینان کیسے ممکن ہے۔"

"پھر بھی آپ جا رہے ہیں؟"

"قبلہ ہی کے کام جا رہا ہوں۔ افسوس کل کی دعوت کا پروگرام تباہ ہو گیا۔ دیکھئے آگے کو کیا ہو۔ اچھا پھر ملوں گا۔"

صوفی صاحب کے حکم کی تعمیل غیر ممکن تو نہیں تھی لیکن میں نہ جانے کیوں اپنے میں آمادگی نہ پا سکا۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ وہ دوسرا آدمی بھی کہیں آج ہی کھدائی کے لئے نہ پہنچ جائے۔ ایسی صورت میں خون خرابہ بھی لازماً ہوگا۔

رات کے گیارہ بجے تک یہی لیت و لعل رہی۔ طبیعت اندر سے انکار کئے جا رہی تھی۔ آخر میں نے سوچا ایک بار صوفی صاحب کو پھر دیکھ آؤں۔ ان سے کہوں گا کہ اپنا کام کسی اور سے کرا لیں۔

اب جو موصوف کے درِ دولت پر پہنچتا ہوں تو پہلے سے زیادہ کہرام نظر آتا ہے۔ اوہ شاید کام ہی تمام ہو گیا۔ ڈرتے ڈرتے زینہ طے کیا۔ وہاں اجتماعی نوع کا گریہ و ماتم بپا تھا۔

"ختم ہو گئے" کسی نے میرے دریافت کرنے پر گلوگیر آواز میں کہا۔

"انا للہ و انا الیہ راجعون ـــــ کب کتنی دیر ہوئی؟"

"ابھی بس دس منٹ ہوئے ہوں گے۔ ڈاکٹر آپ کے آگے ہی آگے گیا ہے۔ بڑا سخت دورہ پڑا تھا۔"

اتنے میں مشتری بیگم میری طرف بڑھ آئیں۔

"اب کچھ نہیں دھرا ـــــ اندر پردے والیاں آ گئی ہیں آپ نہ جا سکیں گے ـــــ آئیے نیچے چلیں ـــــ ایک بہت ضروری بات ہے۔"

وہ جملہ پورا کئے بغیر نیچے چلی گئیں۔ میں بھی لوٹا۔ نیچے کمرے میں پہنچکر انھوں نے کہا۔

"دورے کے بعد بیہوش ہو گئے تھے۔ بیہوشی میں دو بار ان کے منہ سے آپ کا نام نکلا اور صندوق صندوق کچھ کہہ رہے تھے۔"

"تیمار داروں نے کلمہ پڑھوانے کی کوشش نہیں کی؟"

"بہت کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ آخری لفظ جو ان کے ہونٹوں سے ادا ہوا صندوق ہی تھا۔ ایک بار درگاہ سمنونیہ کا بھی نام لے رہے تھے۔"

"جی ہاں ـــــ بڑے اونچے درجے کے صوفیا میں تھے۔ اللہ مغفرت کرے۔ مرتے مرتے بھی اپنے فرائض کی طرف سے غافل نہیں ہوئے۔ صندوق وہ درگاہ کے لئے بنوانا چاہتے تھے۔ بہت بڑا جس میں نذرانے کی چیزیں محفوظ کی جائیں۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔ تدفین تو بہرحال دن ہی میں ہوگی۔ مجھے ذرا جلدی ہے۔"

"آپ ہمیشہ جلدی میں ہوتے ہیں۔" اس نے طنز کیا

"یہ بات نہیں۔ آپ دیکھئے کچھ لوگ ابھی اوپر سے نیچے اتریں گے کچھ باہر سے آکر اوپر جائیں گے۔ ہمیں یہاں آرام سے بیٹھا دیکھ کر وہ کیا سوچیں گے۔"

"سوچا کریں۔ مجھے ایسی باتوں کی پروا نہیں ہوتی۔"

"آپ کو نہ ہو۔ مجھے تو ہوتی ہے ـــــ فی امان اللہ۔"

یہ کہہ کر میں اٹھ ہی گیا۔ انھوں نے برا مانا ہوگا مگر اب کھیل ختم ہو چکا تھا ـــــ اللہ بس باقی ہوس۔

حدیثِ دفاع • سفینۂ زرِ گل • اعراف
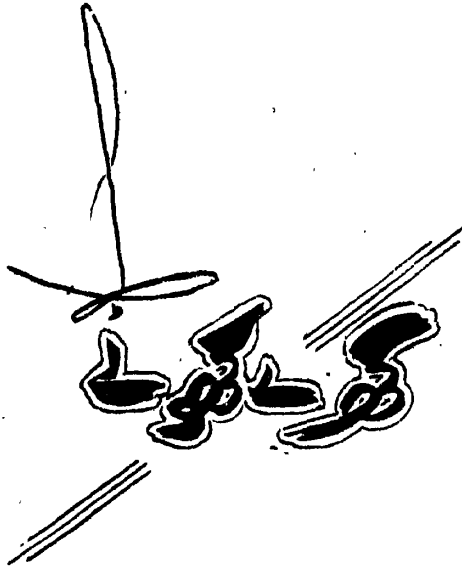
حدیث دفاع

مصنفہ:- جنرل محمد اکبر خاں • متوسط سائز کے ۳۱۶ صفحات لکھائی چھپائی کاغذ مناسب۔ قیمت مجلد دس روپے۔ • شائع کردہ:- مکتبہ رحمانیہ۔ دیوبند (یوپی)

یہ کتاب تقریباً بیس سال پہلے تصنیف کی گئی تھی۔ پاکستان میں چھپی اور کافی مقبول ہوئی۔ اس میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ حق میں جو بے مثال کامیابی اور اسلام کو غالب کرنے میں جو لاجواب کامرانی حاصل ہوئی اسکے پیچھے اگرچہ نصرت الٰہی کی کارفرمائی تو بہر حال تھی لیکن اسباب و علل کی حد تک خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبردست فہم و دانش اور اعلیٰ صلاحیتوں کا بھی اس میں بڑا دخل تھا۔ آپ بہترین سیاست داں۔ اعلیٰ ترین کمانڈر۔ زبردست مدبر اور کمال درجہ فعّال انسان تھے۔ مصنف نے فنِ حرب اور علم سیاست کے زاویوں سے حضوؐ کے غزوات و سرایا کا تجزیہ کرکے ثابت کیا ہے کہ دنیا کے وہ بڑے بڑے جنرل اور جنگجو ہیرو اور فاتحین جن کا ڈنکا عالم میں بج رہا ہے حضوؐ کے آگے کوتاہ قامت ہیں اور تفکر و تدبر کی ان بلندیوں تک نہیں پہنچ سکے جن تک عرب کا یہ دریتیم پہنچا تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم فاضل مصنف چونکہ خود بھی سپاہی ہیں اور دوسری جنگ عظیم کے آزمودہ کار اسلئے ان کا سیاسیہ کسی اناڑی کا تجزیہ نہیں بلکہ ایک ماہرِ فن کا تجزیہ ہے۔ وہ جگہ جگہ مغرب کے معروف ماہرینِ حرب اور اس فن کے فرمودات پیش کرکے یہ ثابت کرتے ہیں کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں محض خوش عقیدگی کا آوردہ نہیں بلکہ معروضی مطالعہ کا حاصل اور حقائق ثابتہ سے ہم آہنگ ہے۔

غیر معمولی خوشی یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ وہ اگرچہ حضوؐ کی محبت میں بجا طور پر غرق اور صحابہؓ کی عقیدت سے پیوستہ ہیں لیکن معقولیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے انھوں نے دوسرے شہرۂ آفاق کمانڈروں اور سیاست دانوں کے بالمقابل رسول اللہؐ کی جو شان امتیازی ثابت کی ہے اس کے لئے روشن دلائل اور قوی شواہد بھی زیبِ قرطاس کیئے ہیں۔ ان کی نظر گہری، قوتِ اخذ و استخراج

فراوانی اور انداز تبصرہ دلکش ہے ہمیں تو تعجب ہوا کہ ایک "سپاہی" اور انشا اچھا انشا پرداز انشاپردازی کے علاوہ ان کی تحریر سے اسلام کا گہرا درد، ایمان کا خروش، اسلام کا جذبہ اور اقدام و عمل کا ولولہ نمایاں ہے وہ کتنے ہی غزوی میدان جنگ اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے ہیں فنی رخ سے ان کا مطالعہ کیا ہے۔ پیمائش سے بھی نہیں گھبرائے۔ کم و بیش چودہ صدیوں قبل کے غزوات کو چشم تصور کے آگے لانے کے لئے انھوں نے عرق ریز محنت کی ہے اور اس میں کامیاب ہیں۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے۔

بعض حقائق سامنے تو سب کے ہوتے ہیں لیکن ان پر نگاہ چند ہی اہل البصیرت کی جمتی ہے۔ جیسے:۔ دور رسالت کی فتوحات کا دائرہ۔ فاضل مصنف نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ دس سالوں میں حضورؐ نے زمین کے اتنے وسیع رقبے پر فتح و ظفر کا پرچم لہرایا جسے دنوں میں تقسیم کر کے دیکھا جائے تو اوسط ۲۷۴ میل یومیہ نکلتا ہے۔ جانی نقصان کا اوسط یہ رہا کہ مسلمان مہینے میں ایک اور دشمن مہینے میں تقریباً ۱۵۔ یہ حقائق حیرتناک بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔

دوران مطالعہ دو ایک چند گوشے ایسے بھی محسوس ہوئے کہ ان پر نظرثانی ہو جاتی تو اچھا ہوتا۔ ص۱۵ پر کہا گیا ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے کام کبھی فرشتوں سے نہیں کرائے میدان جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے لڑنے کے لئے کبھی فرشتے نہیں بھیجے۔"

ان فقروں سے مصنف کا مقصود تو نیک ہے۔ لیکن یہ نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ کیونکہ بعض آیاتِ قرآنیہ سے ان کی تطبیق بہت دشوار ہے۔

"اسباب ہجرت" کے زیر عنوان نفیس بحث ہے۔ مصنف یہ بتا رہے ہیں کہ اہل مکہ کو متعدد وجوہ سے حضورؐ کی دعوت اسلام سے سخت بیر تھا۔ ان کے بقول ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسلام تو سود کو حرام قرار دے رہا تھا لیکن اہل مکہ کی معاشی زندگی کا بڑا مدار بت خانوں کی مجاورت پر تھا یا تجارت اور سودی کاروبار پر۔ یہاں مصنف یہ بھول گئے کہ سود کی حرمت تو ہجرت سے کہیں بعد مدینے میں نازل ہوئی ہے۔ پھر اسے کیسے ان اسباب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ جو قبل از ہجرت اہل مکہ کے عناد و اختلاف کا باعث بنے تھے۔ ص۱۱ پر یہ بتاتے ہوئے کہ حضورؐ نے لشکریان اسلام کی تربیت کیسے فرمائی کہا گیا کہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ جنگ ایک بھیانک بازی ہے اور اس بازی کے کھلاڑی کو بھوک پیاس، مصائب اور خطرات کے مقابلہ کے لئے عزم و حوصلہ کے علاوہ سخت تربیت کی بھی ضرورت ہے

"چنانچہ آپ نے روزے کا حکم دیا تاکہ مسلمان مجاہد بھوک پیاس کی تکلیف کو آسانی سے برداشت کر سکیں اور اس کے عادی بنیں۔"

لیکن سب جانتے ہیں کہ روزہ تو پہلی شریعتوں سے چلا آرہا ہے اور امت محمدیہ کو بھی روزے کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے نہ کہ حضورؐ کی جانب سے۔ یہ تجزیہ تو اس وقت درست ہوتا جب حضورؐ اپنی طرف سے فریضۂ صوم عائد کرتے کوئی صاحب نظر قاری فوراً محسوس کرے گا کہ مصنف یہاں حقائق کی سطح سے ہٹ کر جذبات کی لہروں میں بہہ گئے ہیں یہی صورت وہاں محسوس ہوئی جہاں مصنف نے غزوۂ خندق کی بحث میں حضورؐ کو خندق کا بانی و موجد قرار دیا ہے (۱۲۳، ۲۴۴) مصنف خود بھی ذرا قلم دبا کر یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ خندق کھودنے کا مشورہ سلمان فارسیؓ نے دیا تھا۔ اور یہ بھی انھیں یقیناً علم ہے کہ سلمان فارسی بھی اسکے موجد نہ تھے۔ بلکہ فارس میں یہ طریقہ معروف تھا۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرب کی جنگوں میں اسکا پہلا استعمال حضورؐ نے کیا۔ بانی و موجد کے الفاظ مبالغہ اور مغالطے سے خالی نہیں۔

مصنف کی انشا زوردار اور دلنشیں ہے مگر معنوی تکرار اس میں کافی ہے۔ متعدد مقامات پر لفظی تکرار کا بھی احساس ہوتا ہے۔ کتابت کی غلطیاں اچھی خاصی رہ گئیں متبعد کو ایک سے زائد جگہ مستعبد پڑھنا پڑا۔ ص۲۲ پر مشیت الٰہی کا معیشت الٰہی بن گیا۔ ص۲۲ "برتر" کی جگہ ابتری چھپ گیا اگلے ایڈیشن میں تصحیح کی بلیغ کوشش کی جائے۔

سفینۂ زر گل

مجموعہ کلام جناب فضا ابن فیضی:۔ • کتابت، طباعت اور کاغذ معیاری • صفحات ۲۷۲ • قیمت مجلد بارہ روپے • شائع کردہ:۔ دانش

دانش کدہ پبلیکیشنز مئو ناتھ بھنجن۔ (یو پی)

فضا صاحب کو وقتاً فوقتاً رسائل میں پڑھنے کا موقعہ ملا تھا آج مجموعۂ کلام کی بھی زیارت ہو گئی۔ اتنی دلکش لکھائی چھپائی ایسا اچھا کاغذ اور اتنے حسین و بلند پایہ اشعار۔ تحفہ ہو تو ایسا ہو تبصرہ تو ہمیں کرنا ہی تھا۔ اتفاق سے فضا صاحب ہی کا ایک شعر بھی مل گیا جو مستقل دعوتِ تبصرہ ہے۔

میں خود اپنے آپ کو پہچان تو لیتا فضا
میرے بارے میں کچھ اربابِ قلم بھی بولتے

"اربابِ قلم" تو جو ہوں گے سو ہوں گے۔ "بندگانِ قلم" میں شمار ہمارا بھی ہے۔ جب کبھی کہیں بھی فضا صاحب کی کوئی چیز پڑھی ہے محسوس کیا ہے کہ یہ ایک منفرد آواز ہے جو فن کی رعنائیوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اسلوب اور لب و لہجے کے اعتبار سے وہ جدید و قدیم کا دلکش سنگم ہے۔ شاعری کا قالب روایتی مگر مغلوب ترقی پسندانہ۔" ترقی پسندی اگرچہ اپنی خرمستیوں اور لغویتوں کی بنا پر اب ایک عنوانِ تمسخر بھی بن چکی ہے لیکن فضا صاحب کی ترقی پسندی اعتدال سے نہیں گذری اس لئے اس میں علمی سنجیدگی بھی ہے اور سخن ورانہ معنویت بھی۔ ان کے یہاں طباعی ہے مگر صحت مند روایتی ضوابط کی پابند۔ جدت پسندی ہے مگر فصاحت و بلاغت کے قدیم معیار سے وابستہ۔ ان کا آہنگ علمی ہے مگر جمالیاتی نزاکتوں کا امین۔ ان کا تخیل بلند، فکر عمیق اور طرزِ ادا ممتاز ہے۔ وہ اپنے دور کے ان شاعروں میں ہیں جنھیں پڑھا لکھا کہا جا سکتا ہے۔ ہمارا ناقص مطالعہ یہ ہے کہ اب پڑھے لکھے شاعر کم ہی رہ گئے ہیں۔ زیادہ تر یا تو مشاعراتی شاعر ہیں یا پھر نام نہاد ترقی پسندی کے سودائی جنھیں جنونِ ترقی نے شترِ بے مہار بنا دیا ہے۔

پیشِ نظر مجموعۂ کلام صرف غزلوں اور قطعوں پر مشتمل ہے۔ اس میں سے کچھ منتخب اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

تیری ہستی ہے گلستاں میں ہوا جھونکا
تو جہاں سرو بنا ذوقِ سفر سے بھی گیا

جس طرف نظریں اٹھاؤ سوچتے چہروں کی بھیڑ
آدمی بے چارہ خوابوں کے کھنڈر سے بھی گیا

فضا کو آس تھی کیا کیا نہ دوستوں سے مگر
یہ کھیت سوکھ گیا بادلوں کی بستی میں

قاتلوں سے ملتی ہے دوستوں کی صورت بھی آئینے پشیماں ہیں
سوجھتا نہیں کچھ بھی کس سے فاصلہ چاہو کس کو درمیاں رکھو

چمک کے تیرگیٔ جاں بڑھا گیا کچھ اور
مرے لبوں کا تبسم شرار جیسا تھا

سفینۂ زرِ گل ہے فضا سخن جس کا
خود اپنے سوختہ خوابوں کی گرد ہے وہ شخص

منائے جاتے ہیں یوں زندگی کے جشن کہاں
پلک پلک وہ لہو کی برات اپنی تھی

فضا کو توڑ تو پھینکا ہواؤں نے لیکن
یہ پھول اپنی ہی شاخوں کے درمیان گرا

سوزِ احساس سلامت! کہ اندھیرے کتنے
چاندنی بن کے مری روح کے اندر اترے

مگر کوئی یہ خوشی اس سے دستکش نہ ہوا
یہ زندگی جیسے ہر شخص حادثہ بھی ہے

زندگی ٹوٹتے رشتوں کا حصار
جسم، سانسوں کی بکھرتی دیوار

سرد برتاؤ سے گھبراؤں کیا؟ برف کہسار کی زینت ٹھیری

سنور گیا ہوں تو کھلنے لگا ہوں یاروں کو
خراب تھا تو بہت برگزیدہ میں بھی تھا

یہ راز کھولا نمک پاش دوستوں نے فضا
کہ زندگی کا جراحت رسیدہ میں بھی تھا

میرا وجود ہے کہ بیاباں کی خشک ریت
لوگو! متاعِ دیدۂ تر کون لے گیا

یہی جگنو شبِ ہستی کو اجالیں گے فضا
ہاتھ میں شمع نہ لو، پلکوں پہ تارے چن لو

کس قدر زخم ہیں تحویل میں، آنسو کتنے
اے نگہدارو! حسابِ گل و بادہ کر لو

قاتل جو کوئی ہو تو کروں خوں بہا طلب
یوں ہے کہ اپنے ہاتھ کی تلوار میں ہی تھا

کچھ کہو تو اپنے ہی قاتل بنو
چپ رہو تو روح پر خنجر چلے

ٹوٹنا تو یہاں شیشے کا مقدر ٹھہرا
کیسے پتھر کی یہ تحریر مٹائی جائے

ساغر ساغر پیاس کے شعلے، مرہم مرہم زخم کی آنچ
ہم جیسے معصوموں سے بھی کر گئے دنیا داری لوگ

ہر ایک شخص ملا ہم سے آسماں کی طرح
جو ساتھ ساتھ چلے اور ہم سفر نہ لگے

جن پہ بارشِ گل ہے ان کا حال کیا ہوگا
زخم کھانے والے بھی باغ باغ ہیں لوگو

ہے ہر اک رنگ میں قاتل یہ جنوں کا خم و پیچ
تیری زلفوں میں رہے یا مری راہوں میں رہے

میں خود اپنی جگہ ایک شورش کدہ، کارگاہِ جنوں محشرِ آب و گل
وقت کو میرے زانو پہ نیند آگئی، حادثے میری باہوں میں گم ہو گئے

نور چہروں پہ ضمیروں میں اندھیرا ہے یہاں
کوئی کردار نہ تیرا ہے نہ میرا ہے یہاں

آفتابوں کی کیا کمی یارو ÷ پھیل جاؤ ذرا افق کی طرح
ہو جو ذوقِ مطالعہ تو کھلے ÷ پھول کی پنکھڑی ورق کی طرح[1]

اس لئے راہ وفا میرے جنوں کو ہے پسند
ہیں کچھ اس میں بھی حسیں خم ترے گیسو کی طرح

فروغِ دانشِ حاضر بھی کم نہیں سفاک
جو تیرگی سے بچے روشنی میں ڈوب گئے

دورِ نو اک جادوگر ہے اس کے کرتب دیکھو!
ویرانوں میں حسن برسے اور آبادی میں کال

فضا صاحب کی قدرت کلام کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ عموماً وہ کافی مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور خوب شعر نکال لے جاتے ہیں۔ ان میں مضمون آفرینی کی صلاحیت غیر معمولی ہے اور حالانکہ ان کا آہنگ پوری طرح غزل کا آہنگ نہیں مگر نغمگی اور سوز و اثر کے رنگ و بو سے خالی نہیں۔ وہ الفاظ کے دروبست میں روانی، رعنائی اور چستی کا کافی اہتمام کرتے ہیں جس سے خشک تر زمینوں میں بھی کچھ تری پیدا ہو جاتی ہے۔

دوسرا رخ:۔

بعض الفاظ ان کے یہاں اتنی کثرت سے استعمال ہوئے ہیں کہ ان کی تکرار وجدان کو کچھ گراں سی گذری ہے۔ جیسے صلیب صدیاں۔ شعور آگہی۔ بکھرنا۔ تیشہ۔ پتھر۔ آئینہ۔ پھوڑنا۔ سنگ۔ دشت و صحرا۔ سنگ ملامت۔ گرد۔

نغمگی اور جذباتی سرشاری کا ہلکا سا رچاؤ اُن کے اشعار میں یقیناً ہے لیکن تغزل کم ہے۔ تغزل جو جمالیاتی شاعری کی جان اور مذاقِ حسن کا فطری تقاضا ہے۔ اس کی نفسیاتی وجہ شاید یہ ہو کہ ان میں جذبۂ نیازمندی کم اور ذوقِ ناز آرائی زیادہ ہے، اسی بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر خود شناس و خود پسند ہیں اور دیوانگی عشق کو ضبط و متانت کے دائرے میں محدود رکھنا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے زیر تبصرہ مجموعے میں ایسے اشعار کافی ملے جو خود ستائی، احساس تفوق اور انا کی ہاہمی سے خالی نہیں ہیں۔

غلط فہمی نہ ہو۔ ایسی خود شناسی ہمارے نزدیک بھی نعمت ہے جو عرفانِ ذات اور خود آگہی سے عبارت ہو لیکن اسے رعونت یا کبر یا انانیت سے ملوث نہیں ہونا چاہئیے۔ ذیل کے نمونوں سے ہمارا مطلب بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

خیمۂ بصیرت میں ایک میں ہی بس تنہا جل رہا ہوں صدیوں سے
یوں تو سب یہ کہتے ہیں، ہم سحر کے وارث ہیں تیرگی کے دشمن ہیں

یہاں "میں" کا مصداق سمجھ میں نہیں آیا۔ "صدیوں سے" کی جگہ "مدت سے" کہا گیا ہوتا تو بات صاف تھی۔ "میں" کا مصداق اگر خود شاعر ہے تو "صدیوں" کا مصداق کیا ہوگا۔ بہرحال یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ایک شخص ضمیرِ متکلم کے ساتھ اپنی بصیرت کا اعلان اور دوسروں کی بصیرت کا ماتم کر رہا ہے۔

فضا میں آئینۂ شش جہت ہوں آج کہ ہے
ہر ایک چہرہ مرے خط و خال میں گم سا

---

[1] یہاں اس سے قطع نظر کر لیجئے کہ افق کا قافیہ ورق نادرست ہے۔ اُفُق میں فا پر پیش ہے اور وَرَق میں را پر زبر۔ مضمون شعر بہرحال پسند آیا۔

مطلب جو بھی ہو خودستائی کا پہلو بہرحال نمایاں ہے۔

یہ اعتراف مرے بعد سب کریں گے فضا
شعورِ لفظ کو بیدار کر گیا ہے کوئی

مرے بغیر کٹے گی نہ تیرگی کی چٹان
بڑھاؤ ہاتھ کہ میں روشنی کا تیشہ ہوں

مجھے نہیں مری آواز کو تو پہچانو
نئے شعور نئی فکر کا وسیلہ ہوں

مری بلندیٔ قد کو نہ رشک سے دیکھو
میں آسماں ہوں مگر خاک کا عطیہ ہوں

فضا مرے سوا یہ فکر و فن ملے کس کو
میں اپنی ذہن ہوں اپنے قلم کا ثمرہ ہوں

مقطع میں شاعر اپنے آپ میں اس قدر کھو گیا کہ پہلے مصرعہ کی تراش کا نقص بھی اسے محسوس نہ ہوا۔ "فضا مرے سوا" یہ بندشِ الفاظ نومشقوں جیسی ہے۔

بجلی کی جست ابر و ہوا کی اڑان ہوں
ہر شخص سوچتا ہے کہ میں آسمان ہوں

حل کر مجھے ذرا جو ہے دانائے کائنات
اے عہدِ کم عیار ترا امتحان ہوں

پندارِ قلم بھی ہے کوئی شے کہ فضا بھی
مغرور ترے خانہ خرابوں کی طرح ہیں

مری متاعِ قلم، دولتِ ہنر لے جا
لہو کسی کا ہو اپنا پیالہ بھر لے جا

میں اپنی ذات سے دریا ہوں موتیوں سے بھرا
تجھے ہوس ہے تو مجھ کو کھنگال کر لے جا

میری قاتل ہے یہی منفرد آواز مری
سب جہاں رشک سے گونگے ہیں وہاں تو بھی ہی

بہت حریص ہیں دیدہ ورانِ شہر فضا
نقاب ڈال کے چل آگہی کے چہرے پہ

گرنے لگی سروں سے کلاہِ سخن وراں
مجھ کو خدا بلندیٔ فن سے اتار دے

نافے لٹا رہا ہوں سرِ دشتِ آہواں
مانگو تو کوئی قیمتِ عرضِ ہنر نہ دے

یاروں کو پاسبانیٔ شعر و نوا سے کام
تنہا مگر قلم کا نگہدار ہیں ہی فضا

مجھ کو کہیں چھپا کے تو اس خاکداں میں رکھ
میں آسماں سے چھینا ہوا لاجورد ہوں

میں اپنی ذات سے ہوں اک حکیمِ شعر و نوا
اے میرے نکتہ ورو! مجھ سے استفادہ کرو

ہر سخن جس کا ہے انمول فضا
سب نے اس شخص کو کمتر جانا

میری شمعِ قلم مطلعِ نو ہے، میرا رنگِ سخن دیکھنا دوستو
میں بہ ایں روشنیٔ فروغِ ہنر، درد ساماں سہی شب گزیدہ سہی

مسجودِ فکر و فن رہی تنہا ہماری ذات
ہم اپنے بت کدے میں خدا کی طرح رہے

اک زمانے کو فضا ذہن و قلم بخشا ہے
کچھ روایات ہیں ہم خوش سخنوں کے پیچھے

خودستائی پر مشتمل اشعار کتنے ہی اساتذہ کے یہاں پائے جاتے ہیں لیکن کثرت سے نہیں انسانی فطرت کسی بھی شخص کی خودستائی اور تعلّی کبھی پسند نہیں کرتی چاہے بہ اعتبارِ واقعہ وہ درست ہی کیوں نہ ہو۔ فضا صاحب اس سے پرہیز کریں تو مناسب ہوگا۔

کتنے ہی اشعار ایسے بھی نظر آئے جنکا سمجھنا کم سے کم ہماری جیسی عقل رکھنے والوں کے لئے مشکل ہی ہے۔ ان میں سے کچھ کا مطلب تو کافی غور کے بعد نمودار سا ہونے لگتا ہے لیکن کچھ بہرحال راز ہی بنے رہتے ہیں اور خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر اپنے مافی الضمیر کو قابلِ فہم انداز میں ادا نہیں کر پایا۔

مثالیں:-

خود اپنا سرخ لہو چاٹتی پھریں صدیاں
بکھرتے ٹوٹتے لمحوں کا وار ایسا تھا

ہم نہیں کہتے کہ اس کا کوئی مطلب ہوگا ہی نہیں۔ مگر ہم بہرحال اسے نہ پا سکے۔

قدم قدم کے حوادث سے ہم یہ کیا پوچھیں
ہمیشہ کیوں سفرِ روزگار ایسا تھا

یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔

مطمئن ہر شخص اپنے مسئلوں میں تھا بہت
بستیوں میں جو نہیں وہ جنگلوں میں تھا بہت

یہ بھی کم و بیش چیستاں محسوس ہوا۔

کاش انھیں کوئی پکڑ لاتا تری زلفوں کے بیچ
پیاس کا احساس اڑتے بادلوں میں تھا بہت

زلفوں کی صفتِ معروفہ "پیاس بجھانا" تو نہیں پھر شعر بے شکن کہاں ہوا۔ مفہوم ہی عنقریب بود ہو گیا۔

خواب خواب لمحوں کی بے قرار باہوں میں پل رہا ہوں صدیوں سے
میں بہ صورتِ قطرہ وقت کا سمندر ہوں مجھ کو بیکراں رکھو

طرزِ بیان اور لفظی درو بست کے اعتبار سے عمدہ شعر لیکن مفہوم الجھا ہوا۔ یہی پتا نہیں چلتا کہ "متکلم" کون ہے اور کس خارجی یا داخلی کیفیت یا واقعے کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

نہ نام آگہی کُل کائنات اپنی تھی
یہ زہر پی گئے خود ہم کہ بات اپنی تھی

آگہی کو "زہر" کس پہلو کے پیشِ نظر کہا گیا اس کی طرف ایک لفظ بھی مشیر نہیں۔ پھر آگہی "تو فقط علم و ادراک کا نام ہے قبضہ و تصرف کا نہیں" "کُل کائنات اپنی تھی" کا ٹکڑا بنیاد چاہتا تھا وہ اسے نہیں ملی۔

ہر خزاں میں جو بہاروں کی گواہی دیگا
ہم بھی چھوڑ آئے ہیں اک شعلہ حسین میرا لیا

مطلب سمجھ میں آتا ہے مگر نہیں آتا۔ شعلہ کس شے سے کنایہ ہے اور وہ آنے والی تمام خزاؤں تک باقی کیسے رہ سکے گا۔ شعلہ کی جگہ کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جسکے طولِ قیام کو وجدان قبول کر سکتا۔

اب تو میرے جسم پر زخموں کی چادر بھی نہیں
اے وقارِ درد تو اس پیرہن سے بھی گیا

زخموں کی چادر وقارِ درد کے لئے مفید ہو سکتی ہے یا مُضر یہ سوچنے کا مسئلہ ہے۔ زخم کہاں گئے یہ بھی پتا نہیں چلتا۔ اگر مندمل ہوئے تو زرد "کی موجودگی اب کیسے قرینِ قیاس ہو گی۔ اگر مندمل نہیں ہوئے تو کیا مطلب ہوا شعر کا۔

میں اپنے عہد کی یہ تازگی کہاں لیجاؤں
اک ایک لفظ قلم سے لہو لہان گرا

اگر "تازگی" سہوِ کتابت نہیں ہے تو یہاں اس کا مطلب گرفت میں نہیں آیا۔ تازگی کی وجہ سے الفاظ کا لہو لہان گرنا بے تکی سی بات ہے۔

دوسرے مصرعہ میں "اک ایک" بھدا ہے۔ شاید بہتر ہوتا اگر یوں کہا جاتا۔

میں اپنے عہد کی عشوہ گری کو کیا کہدوں
کہ حرف حرف قلم سے لہو لہان گرا

یا کسی اور طرح سہی۔

مرے وجود کی آرائشوں میں صرف ہوئے
وہ ہیرے تو جنھیں پتھر کا حوصلا بھی کہیے

"حوصلہ" جانداروں کی صفت ہے بلکہ صرف اُن جانداروں کی جو شعور و ادراک رکھتے ہیں۔ شاید اسی لئے شیر کو جری اور بہادر وغیرہ تو کہتے ہیں "حوصلہ مند" نہیں کہتے۔ پتھر تو بے جان شے ہے۔ اس کا حوصلہ کیا ہوتا ہے اس کی کوئی نشاندہی شعر نے نہیں کی۔ بہت سے بہت پتھر کی صلابت کو اس کا حوصلہ کہہ لیجئے لیکن ہیرا تو صلابت میں پتھر سے کہیں بڑھ کر ہے پھر اسکی شدتِ جمود اور صلابت کو اس سے کم سخت چیز سے ظاہر کرنا کیا معنی۔ ہم واقعی اس کی تہہ کو نہیں پہنچ سکے۔ نہ یہ سمجھ میں آیا کہ شعر کا پورا مفہوم کیا ہے۔

زندہ شہروں کی علامت ہیں ابھی
ہانپتے سائے، لرزتی دیوار

ہانپتے سائے کیسے ہوتے ہیں اس سے قطع نظر یہ تو سامنے کی بات ہے کہ لرزتی دیواریں زلزلوں اور بھونچالوں کی علامت ہوتی ہیں نہ کہ زندہ شہروں کی۔ زندہ شہروں کی علامت وہ دیواریں ہو سکتی ہیں جو بلند ہوں۔ مضبوط، شان سے سر اٹھائے کھڑی ہوں۔ پھر کیا مطلب ہوا شعر کا۔

سایوں کے ساتھ ہانپنے کی صفت صرف اسی وقت قابل

فہم ہوسکتی ہے جب تیز ہوا چل رہی ہو اور درختوں کی متحرک ٹہنیوں کے سائے لرزش کا نظارہ پیش کر رہے ہوں۔

بجا کہ لوگ بغل میں کتاب رکھتے ہیں
مجھے بھی پڑھ لیں یہ دیدہ وروں کے بس میں نہیں

جسے دیدہ ور بھی نہ پڑھ سکیں وہ پڑھنے کے لائق ہی نہ ہوگا۔ دیدہ وروں کی تخصیص نے مفہوم تباہ کر دیا۔ بے شمار کتاب در بغل لوگ دیدہ ور نہیں ہوتے بلکہ محض حرف خواں ہوتے ہیں۔ انکے بارے میں اگر کہا جائے کہ مجھے پڑھ لینا ان کے بس میں نہیں تو بات بنتی ہے۔

اب اس کو ہاتھ سے چھو کر بھی اک ذرا دیکھو
وہ سنگ تو نہیں یا رو کہ بولتا ہی نہیں

یہاں "اس" کا مصداق سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر مراد محبوب ہو تو مطلب پھر بھی ژولیدہ۔ اور کوئی ہو تو اس کا سراغ کس ترکیب سے لگے۔

اب بھی تری محراب سخن میں شمعیں سی روشن ہیں نقاؔ
سورج کو یہ آگ اگلتے ایک زمانہ بیت گیا

دوسرا مصرعہ اگر پہلے مصرعہ کا تشبیہی بدل ہے تو سورج کی بے تحاشا آگ میں اور شمع نما چیزوں کی روشنی میں آخر کیا تطابق ہے۔ پھر پہلا مصرعہ مدح ہے اور دوسرا ذم۔ اس کی فنی توجیہہ کیا ہو۔

کیوں صلیبوں کا گریباں پکڑو
روشنی حرفِ صداقت ٹھہری

الفاظ واضح مگر معنی مبہم۔

کون بانٹے گا قلم کی جاگیر
یہ مرے دور کی حرمت ٹھیری

دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ کی قابلِ فہم تکمیل نہیں کر سکا۔ حرمت کا لفظ یہاں سوالیہ نشان بن گیا ہے۔

وقت تم سے کبھی مانگے گا ضرور اس کا حساب
بیکراں صدیو! یہ بکھرے ہوئے لمحے چن لو

اوّل تو صدی کے لئے بیکراں کا وصف ہی اجتماع ضدین ہے لفظ صدی کی عین وضع میں حد بندی موجود ہے۔ سو سال پھر بیکراں کیا معنی۔ اور اگر صدیوں کے مجموعے کو بیکراں کہا گیا ہے تو آخر مراد کیا ہوئی؟ بکھرے ہوئے لمحے صدیوں سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ ان کے اپنے اجزائے ترکیبی ہیں۔ لمحوں ہی کے مجموعے سے صدی کا وجود تقویم پاتا ہے مگر شعر تقاضہ کر رہا ہے کہ بکھرنے والی شے کوئی اور ہو اور اسے چننے والا کوئی اور۔

جیب و قبا پہ زخم بدن کا گماں ہوں
خوش ہوں کہ اپنے دور کا میں ترجماں ہوں

واللہ اعلم پہلے مصرعہ میں کیا کہا گیا ہے۔

صدیوں سے منتظر ہوں کہ تیرہ خلاؤں میں
مجھکو بھی کوئی چاند بنا کر اچھال دے

خود شاعر ہی بتا سکیں گے کہ وہ کیا کہہ گئے ہیں۔ ہماری فہم ناقص میں تو نہیں آیا کہ یہاں متکلم کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔

چہروں پہ مجھکو گرد بنا کر بکھیر دو
صدیوں سے ایک دیدۂ بینا میں قید ہوں

وہی ابہام بلکہ شاید اہمال۔ کون بول رہا ہے۔ کیا بول رہا ہے۔ وہ کون قیدی ہے جو صدیوں سے قید چلا آرہا ہے اور وہ کون سا دیدۂ بینا ہے جس کی عمر اتنی طویل ہے۔ پھر گرد تو چہروں پر مَلی جا سکتی ہے غازے کی طرح جمائی جا سکتی ہے۔ بکھیرنا کیسا۔

یہ موت دے وہ موت کو بھی رہ گزر نہ دے
ترجیح دار کو قدِ دلدار پر نہ دے

لفظوں کا مطلب تو بن گیا مگر مطلب کا مطلب کیا ہوا یہ سمجھنا آساں نہیں۔ ایسے اشعار کو ہمارا وجدان اشعار نہیں مانتا۔ آورد ہی آورد۔

تم کو یقیں نہ آئے تو لفظوں سے پوچھ لو
ہر دور میں وسیلۂ اظہار میں ہی تھا

یہ "میں" بار بار ہماری سمجھ سے باہر چلا جاتا ہے۔ مراد اگر "انسان" ہے تب بھی مضمون محتاج شرح ہی رہا۔

دور تک نہیں ملتا جستجو کا سایہ بھی
ساتھ کس جگہ چھوڑا ہم سفر اُجالوں نے

اجالے اگر ساتھ چھوڑ دیں تو مسافر کی نظروں سے راستہ اوجھل ہو سکتا ہے۔ جستجو کا سایہ نہ ملنے کی بات کہاں سے پیدا ہوگئی۔

کم نہیں ہوتی نبوت کی ہوس
آگ لینے پھر وہ پیغمبر چلے

یہ کیا کہدیا۔ بات مہمل ہے اور تلمیح خلافِ واقعہ۔ حضرت موسیٰؑ کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ:۔

آگ لینے کو جائیں پیمبری ملجائے

پھر ہوس چہ معنی دارد! اور یہ معمہ بھی حل طلب ہی رہا کہ آخر کن لوگوں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے اور اشارے کا حاصل کیا ہے۔

یوں تو نہ بھر سکے گا کبھی وقت کا یہ زخم
مرہم بنا کے رکھو مجھے لمحوں کے گھاؤ پر

خطاب کس سے ہے "یہ زخم" میں "یہ" کا مشارٌالیہ کونسا زخم ہے۔ لمحوں کے گھاؤ سے کیا مراد ہے اور متکلم کون ہے جو خود کو مرہم کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ یہ سارے سوالات جواب سے محروم نظر آ رہے ہیں۔

کبھی تو ٹوٹے گا آخر بدن کا سناٹا
حریمِ جاں میں دیئے جا صدا سلیقے سے

خوبصورت الفاظ مگر مصداق سے عاری "ذہن کا سناٹا" تو ایک قابلِ فہم استعارہ ہو سکتا ہے لیکن بدن کا سناٹا کیا چیز؟ اور پھر حریمِ جاں میں صدا دینے کا کیا مطلب؟

یہیں سے ہم بھی کریں سیرِ عالمِ اسرار
ذرا دریچۂ بندِ قبا کشادہ کرو

محض الفاظ:۔ خطاب اگر محبوب سے ہے تو محبوب چاہے کتنا ہی حسین ہو اسکے جسم میں وہی سب اعضاء ہوں گے جو سب کے جسموں میں ہوتے ہیں۔ وہ اگر جامہ اتار پھینکے۔ یا پھینکے تو نہیں مگر بندِ قبا کھول کر عاشق کو اندر جھانکنے کا موقعہ دیدے تو وہاں "اسرار" کونسے نظر آجائیں گے۔ زبان کی غلطی یہ ہے کہ دریچے کے تعلق سے کشادہ کہدیا گیا لیکن یہ نہیں سوچا گیا کہ بند کھولنے کے لئے کشادہ کرنے کے الفاظ موزوں نہیں۔ بست وکشاد اور چیز ہے اور کشادہ کرنا اور چیز۔ اگر کوئی بند قبا کھولے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے بندِ قبا کشادہ کئے۔ کشادگی وسعت دینے کا نام ہے کھولنے کا نہیں۔ بہرصورت شعر گنجلک اور دور از فہم ہی رہا۔

شمارِ عشوۂ خوباں کے سلسلہ سے سہی
حسابِ عمر میں یک دو نفس زیادہ کرو

ہم یہاں بھی اپنی نارسائی کا اعتراف کرتے ہیں۔

یہ پختہ کاریِ عمرِ جنوں کے تیور دیکھ
ہوائے گل بدنِ بست سالہ رکھتے ہیں

یہ شاعری نہیں حدّادی ہے۔ یعنی لوہے کو ٹھوکنے پیٹنے کا فن!

بوجھ شانوں سے پھسل جائے گا آہستہ چلو
ایک اک لمحے پہ صدیوں کا بسیرا ہے یہاں

یعنی؟

ذرا مسائلِ بندِ قبا کو سلجھاتے
یہ کام بھی نہ فقیہانِ نکتہ جو سے ہوا

بند قبا کا تو بس ایک ہی مسئلہ ہے۔ باندھئے یا کھولئے۔ اگر یہ واقعی مسئلہ ہے تو اس کے لئے فقیہوں کی کیا ضرورت؟ متعدد جگہ قبا اور بندِ قبا کے ذکر سے کچھ ایسی غلط فہمی ہونے لگتی ہے جیسے شاعر کے تحت الشعور پر محبوب کی پوشاک بہت گراں گزر رہی ہے۔

یہ مثالیں ہوئیں شاعر کے اغلاق و ابہام کی یا پھر ہماری کم سمجھی کی۔ اب زبان و بیان کی سلوٹوں پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

شہرِ ہم خیالاں میں ہم بھی لیکے نکلے تھے حرفِ جاں کی سوغاتیں
ہم یہ کیا سمجھتے تھے صاحبانِ بینش بھی آگہی کے دشمن ہیں

شعر برا نہیں۔ مگر حرفِ جاں بے معنی ہے۔ اس کی جگہ "فکر و فن" موزوں رہتا۔

خیمۂ بصیرت میں ایک میں ہی بس تنہا جل رہا ہوں صدیوں سے

صدیوں کا لفظ خدا جانے کیوں نقا صاحب کے ذہن سے چپک گیا ہے۔ "مدت سے" کہدیا ہوتا تو شکن نکل جاتا۔

کتنا سخت موسم ہے دھوپ ہے جنازوں کی قافلوں کی بستی میں

"جنازوں کی دھوپ" حد سے متجاوز ترقی پسندی ہے۔ دھوپ اور جنازے میں کوئی مناسبت نہیں۔

غنچۂ قلم چٹکے، موجِ آگہی بھڑکے، فکر کا بدن جاگے

خنجر ہیں مسائل ہیں روبرو تو کیا، منہ میں پھول سی زباں رکھو

بحر سہ لخت ہے۔ یہاں دوسرا مصرعہ معناً دو لخت رہ گیا ہے یہ غلطی نہیں مگر کمالِ فن کے خلاف ہے۔ فضا صاحب جیسے فنکار سے کمال ہی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

بہت کم ایسے ملیں گے اے صاحبانِ نظرا

لے" دب گیا۔ حرفِ ندا ہمیشہ پوری کشش کے ساتھ مزا دیتا ہے۔

نشاط ملبغ ہوا کل رات میرا کمرہ بھی
وہ سرخ کپڑوں میں جلتے چنار جیسا تھا

ایسے گھٹیا شعر اتنے اچھے شاعر کو زیب نہیں دیتے۔ الفاظ گھٹیا نہیں ہیں مگر .....!

صبا کے دھوکے میں پھولوں نے ملکے بانٹ لیا
جو دولتِ نفس بے ثبات اپنی تھی

تعجب ہے "دولت" کو مذکر بنا دیا گیا۔ "بانٹ لی" کا محل تھا۔ یا پھر دولت کے ساتھ علامتِ مفعولی "کو" آنی چاہئے تھی۔

"لوگوں نے ساری دولت آپس میں بانٹ لی"

یا۔ "لوگوں نے دولت کو آپس میں بانٹ لیا"

"دولت بانٹ لیا" تو ظاہر ہے کہ درست نہیں۔

جتنے دن بھی جیو دیواروں سے ٹکراتے پھرو
دشتِ ہستی ہے ہمارے لئے گھر ہی ایسا

جب "دشت" کہا تو دیواروں کا کیا موقعہ۔

جو نامراد جیا باکمال اتنا تھا
خود اپنے عہد سے میرا سوال اتنا تھا

فضا صاحب اگر خود غور کریں تو اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ مضمون کی ادائیگی صحیح طور پر نہیں ہو سکی ہے۔

گراں نہ گذری بڑی سے بڑی قیامت بھی
ہماری ذات کے پیچھے وبال اتنا تھا

یہ محض قافیہ بندی ہے۔ "وبال" کا لفظ یہاں ناجنس ہے

مجھے خراب کیا غیرتِ ہنر نے مری
نہ اس سے پہلے میں آسودہ حال اتنا تھا

آسودہ حالی کا نہیں آشفتہ حالی کا محل تھا۔

صلۂ حرفِ وفا سنگِ ملامت بھی نہیں

"حرف" کے بعد "سے" حذف ہے۔

یہ کون مجھ میں ہے جو مجھ کو جانتا بھی نہیں
کہیں تو روح بدن کا سراغ پا جائے

"روح" نے کام بگاڑ دیا۔ اندر کا آدمی بے شک بسا اوقات باہر والے آدمی سے جدا ہوتا ہے۔ مگر اس اندر کے آدمی کو "روح" سے تعبیر نہیں کرتے۔ روح تو مستقل ایک الگ وجود ہے جبکہ اندر کا آدمی محض ایک وجدانی اور نظری شے ہے۔

جو میں نہ تھا تو کہیں دھوپ تھی نہ سایہ تھا
وہ اس بھری ہوئی دنیا میں کتنا تنہا تھا

"میں" سے مراد اگر شاعر کی ذات ہے تو شعر یقیناً مہمل ہے اگر مراد نوعِ بشری ہے تب بھی خلافِ واقعہ، کیونکہ دھوپ اور سائے کے مظاہر کی آماجگاہ یہ زمین تو تخلیقِ بشر سے پہلے وجود میں آ چکی تھی۔ "وہ" سے مراد محبوب تو نہیں ہو سکتا۔ پھر کیا "خدا" مراد لیں۔؟

کچھ بھی مراد لیجئے یہ بہرحال ناقابلِ حل معمہ ہے کہ دنیا بھری ہوئی بھی ہو اور دھوپ سایہ کا وجود بھی نہ ہو۔ اللہ جانے شاعر کے ذہن میں کیا ہے۔

رفیقو! حرفِ روایت کا احترام کرو
اسے ہمارے نئے تجربوں نے لکھا تھا

اسے مہمل شعروں کی فہرست میں آنا چاہئے تھا۔ رہ گیا۔

آنکھیں زمیں نے کھولیں تو جاگا شعورِ زیست
ورنہ یہ چرخ پہلے شکستہ سی آس تھا

زمین کا آنکھیں کھولنا اور بند کرنا عجیب بات ہے۔ اگر مراد یہ ہے کہ زمین پیدا ہوئی اور تبھی شعورِ زیست بھی جاگا تو یہ پھر بھی نہیں سمجھ میں آتا کہ پیدائشِ زمین سے قبل آسمان شکستہ سی آس کیوں تھا۔ اور یہ بھی غور طلب ہے کہ "شکستہ سی آس" کیا چیز ہوتی ہے اور آسمان سے اس کا کیا جوڑ ہے۔

پڑھئے ذرا مجھے بھی کبھی آپ غور سے
دلچسپ اس کتاب کا ہر اقتباس تھا

"اقتباس" تو اس عبارت کو کہتے ہیں جو کتاب سے اٹھا کر

کہیں اور نقل کردی جائے۔ یہاں پیرا یا کالم یا صفحہ یا ورق چھپا کوئی لفظ با معنی ہو سکتا تھا۔ جب خود کتاب کو پڑھنے کی دعوت دی جا رہی ہے تو اقتباس کا کیا محل۔

پلکوں پہ آنسوؤں کی جراحت ہی لے چلیں
ہم اس کے پاس غم کی امانت ہی لے چلیں

"جراحت" بس قافیہ ہے۔ جراحت ایک معنوی کیفیت کو کہتے ہیں یا پھر ایک معنوی مفہوم کو۔ پلکوں پر آنسو ہو سکتے ہیں اور وہی غم کی امانت بھی ہیں۔ جراحت پلکوں پر کہاں آجائے گی۔

اب کیا کروں اے مرمریں چہروں کے آئینو!
وہی سلوٹ۔ "اے" کھینچ کر رہ گیا۔

ہر ایک چہرے میں آسودہ ہیں کئی چہرے
"آسودگی" کا موقعہ نہیں تھا۔

وہ میں کتاب ہوں تو نے جسے پڑھا ہی نہیں
خواہ مخواہ تعقید گوارا کی گئی۔ "میں وہ" کہنا تھا۔

ایک چھلکا ہے خالی ہے جو مغز سے آگہی کے حجابوں میں کیا یاد گے
"حجابوں" کی مناسبت سے مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا

چند چھلکے ہیں خالی ہیں جو مغز سے ......

ویسے بھی مغز ہونے نہ ہونے کی بحث متعدد چھلکوں والی اشیاء سے متعلق ہے۔ جیسے پیاز۔ ایک چھلکا جن چیزوں پر ہوتا ہے مثلاً سیب، بیر، آلو بخارا ان کے اندروں کو مغز سے تعبیر نہیں کرتے۔

اک راستہ ہو بند تو سو راستا کھلے
فضا صاحب اور زبان کی ایسی غلطی! "سو راستے کھلیں" کہنا تھا۔

جب راستے کے ساتھ سو کا عدد لگا دیا تو موقعہ واحد کا کہاں رہا۔ یہ کتابت کی بھی غلطی نہیں کیونکہ توا اور کربلا وغیرہ قافیہ ہے اور کھلے ردیف۔

حسرتوں کے آغوش میں پلتے ایک زمانہ بیت گیا
"حسرتوں" کی لڑکھڑاہٹ نہ جانے کیوں شاعر کے ذوقِ سلیم نے محسوس نہ کی۔ لفظوں کو یوں دا بنا بھینچنا تو بس اناڑیوں کو زیب دیتا ہے۔ پختہ کاروں کو نہیں۔

کھل گیا شب کے رسولوں کا بھرم
روشنی حرفِ صداقت ٹھیری

لفظِ رسول محض ایک لغوی ہی لفظ نہیں اصطلاحی بھی ہے۔ اس کا استعمال اردو میں ہمیشہ تحسین و تعظیم کے سیاق میں ہوتا ہے۔ حالانکہ یہاں سیاق ذم اور الزام کا ہے۔

نہ پوچھ مجھ سے مرا کاروبارِ محرومی
سمندروں سے گھرا پیاس کا جزیرہ ہوں

"کاروبار" کا لفظ بے جگہ آیا۔ محرومی ایک سلبی وصف ہے اور کاروبار ایک ایجابی عمل۔ مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا۔

نہ پوچھ مجھ سے مری داستانِ تشنہ لبی
"تشنہ لبی" نہ جچے تو چلئے محرومی ہی سہی مگر داستان کے ساتھ۔

شوخ و شنگ غزل کا مصرع وہ گیسو اور وہ چہرا
تنہا اور سایا کا قافیہ مصرع! — یہ تو فلمی شاعر کی والی بات ہوئی۔

داد خواہ اپنے قلم سے ہوں فضا
"خواہ" کی ہا غائب ہی ہو گئی۔ ٹھیک ہے کہ "اپنے" کا الف حرفِ علت ہونے کی بنا پر گر سکتا ہے مگر کمالِ فن مجبور ہو جانے کا نام تو نہیں۔ اس سے قدرتِ کلام پر حرف آتا ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
اس مصرعہ پر ادھر اُدھر کاٹے ہوئے ضرور دی سکتے۔ سب جانتے ہیں یہ غالب کا مصرعہ ہے۔

لطفِ سوزِ غم سے ہم داغ داغ ہیں یارو
"لطف" نہ صرف زائد ہے بلکہ خامی پیدا کر رہا ہے۔ داغ سوز سے پڑتے ہیں نہ کہ لطف سے یہاں داغ کا جوڑ لطف سے لگ گیا۔

ناشناسوں کی تحسین رنگ لاتی ہے کیا کیا
"ناشناسوں" کا واؤ اور نون غائب ہو کر رہ گیا۔

کوئلے بھی اب لعلِ شب چراغ ہیں یارو
یعنی بحر درست ہے مگر یہاں یک لخت ہو کر رہ گئی ہے۔ اسے غلطی نہیں کہیں گے مگر چاند کا داغ ضرور کہیں گے۔

نقش پا کی تو ہے بھیڑ اتنی یہاں، قافلے چلتی راہوں میں گم ہوگئے

"چلتی" کا لفظ صحیح مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے۔ نیز "نقشِ پا" کا نہیں نقوشِ پا کا محل تھا۔

دیکھیں اس بازار میں اپنے فن کا اب کیا دام لگے

غلط زبان ہے۔ یوں کہنا چاہئے تھا۔

دیکھیں اس بازار میں اپنے فن کے اب کیا دام لگیں

اہلِ زباں دام کو (قیمت کے معنی میں) جمع ہی بولتے ہیں۔

میری ہستی ہے کسی لالۂ خودرو کی طرح

خودرُو — خوشبو جادو اور جگنو کا قافیہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شاعر نے اگر اس کی "را" کو مرفوع سمجھا ہے تو غلط سمجھا ہے۔ یہ مفتوح ہے (رَو) اس کا قافیہ ضو اور نو اور لو ہے۔

وہ نقطۂ صدِ عروج ہے بہار دل کا مری

"صد" فاضل ہے۔ نقطۂ عروج خود درجۂ کمال کا مظہر تھا۔

دروازے کو بند ابھی پردوں کو گرادو

ابھی کا الف قتل ہو کر رہ گیا۔

حالات کی رو موڑ بدل دیتی ہے　　انسان کو ابد اور ازل دیتی ہے
جس طرح زمیں زلزلوں سے گھبراکر　　پوشیدہ خزانوں کو اگل دیتی ہے

دوسرا مصرعہ سمجھ میں نہیں آیا۔ ازل تو اُس نقطۂ آغاز کا نام ہے جب حالات کا محض "بیج" پیدا ہوا تھا۔ پھر حالات نے جنم لیا۔ پھر موڑ آئے۔ موڑ کے نتیجے میں ازل نے وجود نہیں پایا۔ ابد کا بھی کوئی تعلق موڑ بدلنے نہ بدلنے سے نہیں۔ اگلے دو مصرعے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ازل اور ابد بھی ایسی ہی چیزوں کے نام ہوں جو حالات کے بطن میں چھپی ہوئی ہیں۔ پھر موڑ زلزلوں کی طرح انھیں باہر لائیں۔

سانچے میں شباب کے وہ ڈھلتے ہوئے جسم
غمزوں کے فشار سے مچلتے ہوئے جسم
خلوت میں لپک اٹھتے ہیں کوندے کی طرح
آغوش کی گرمی سے پگھلتے ہوئے جسم

معنی و مصداق کے لحاظ سے ایسی شاعری شاید شریفانہ نہ کہی جاسکے۔ فضا صاحب جیسے متین سخنور نے اس سطح پر اتر آنا کیسے گوارا کیا یہ حیرتناک ہی ہے۔

ہمیں اخبار میں یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ "سفینۂ زرگل" پر یوپی اردو اکاڈمی کی طرف سے دو ہزار روپے انعام ملا ہے۔ بلاشبہ فضا صاحب ایسے ہی سخنور ہیں کہ ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔ لیکن حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ خوش فہمی میں مبتلا ہو جائیں۔ ہم تمنا کرتے ہیں کہ فضا صاحب اپنے احساسِ ترفع اور خود پسندی کو ذہن سے کھرچ کر خود تنقیدی کی عادت ڈالیں۔ پھر وہ عظیم شاعر بن سکتے ہیں۔

اعراف

عبدالرحیم نشتر کا مجموعۂ فکر ● صفحات ۱۱۴
قیمت مجلد چار روپے پچاس پیسے
● ناشر: بی کے پبلیکیشنز ۷۔۳۰۲ پرتاپ اسٹریٹ دریا گنج دہلی ۶

آغاز ہی میں شاعر کی تصویر بھی ہے لیکن وہ نہ بھی ہوتی تب بھی کتاب کے مطالعہ سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ نوعمر ہی ہوں گے۔ اگر انھیں کوئی سمجھدار مشیر مل جاتا تو یقیناً وہ مشورہ دیتا کہ ابھی "صاحبِ دیوان" بننے کا ارادہ نہ کریں بلکہ کسی سخن فہم رہنما سے وابستہ ہو کر اپنے اشعار کے عیوب و محاسن کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کریں تاکہ عیوب سے بچا جائے اور محاسن کو فروغ دیا جائے۔

کوئی شبہ نہیں کہ عزیزی نشتر کو خدا نے ذہانت بھی دی ہے اور شعر کہنے کی استعداد بھی لیکن شاید غلط قسم کے ماحول اور خارجی محرکات نے انھیں صحیح رخ پر نشوونما کا موقع نہیں دیا اس لئے ان کی صلاحیتیں اپنا حقیقی حسن نمایاں نہیں کر پائی ہیں۔ ویسے بھی چالیس سال سے قبل شعور میں پختگی آتی بھی کہاں ہے۔

ترقی پسند شاعروں کی جدت پسندیوں اور ملا جبوں نے دنیائے شعر و ادب میں جو افراط و تفریط پھیلائی ہے وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ نئے پن کا شوق اور آزادی کا

ہیئت جس طرح ہپی ازم کو جنم دیتا ہے اسی طرح شعر و ادب میں جدت و بدعت اور نئے تجربات کا جنون جب اعتدال سے گذر کر خلاؤں میں کود پھاند کرتا ہے تو بڑے واہی تباہی شہکار جنم لیتے ہیں۔

عزیزی قیصر ایسے ہی تجربات سے متاثر معلوم ہوتے ہیں اور ظاہر ہے یہ تاثر شعوری وارادی نہ ہوگا۔ اسی لئے ان کا فی الحال یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم ان کے مجموعے سے چند اشعار نمونتہً نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کچھ محسوس کرسکیں۔

(۱)
بوڑھی اور کمزور ہوائیں دیتی ہیں آواز مجھے
سینے میں جھنکار اٹھا سورج بھرلوں چٹانیں توڑوں

(۲)
میرے بھی ہاتھوں میں چاند اور سورج کے دو ٹکڑے ہیں
مجھکو بہکانے آئے ہو میں بھی تو پیغمبر ہوں

(۳)
وہ اجنبی تری باہوں میں جو رہا شب بھر
کسے خبر کہ وہ دن بھر کہاں رہا ہوگا

(۴)
رات کیا جانے کیسے بیتے گی
جا چکی اب تو آخری بس بھی

(۵)
ابھی تو اس نے آپ کو مدعو کیا ہے آج
پھر کیا ہے موج اڑائیے اچھی ہوا ہے آج

(۶)
رنگوں میں قید کرکے مجھے شوخ چشم نے
اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بنا لیا

(۷)
دشتِ افکار میں سوکھے ہوئے پھولوں سے ملے
کل تری یاد کے معتوب رسولوں سے ملے

(۸)
ایک حبشی کی طرح کالی سوچ
راستے میں بنی ہوتی ہے اراڑ

(۹)
پان کے ٹھیلے، ہوٹل، لوگوں کا جمگھٹ
اپنے تنہا ہونے کا احساس بھی کیا

(۱۰)
چکنے گناہوں کی سڑکوں پہ گھوما کرو
سلگتی جہنم ننگا ہوں سے چوما کرو

(۱۱)
جلتی ہواؤں کے نیزوں سے حملہ کرو
سیہ پربتوں کے بدن کو برہنہ کرو

---

(۱۲)
آواز دے رہا ہے اکیلا خدا مجھے
میں اس کو سن رہا ہوں ہواؤں کے کان سے

(۱۳)
مرے کیا مجھے نیک و بد سب برابر ہی ہیں
جو تمکو خدا کا ڈر ہو تو سوچا کرو

یہ بس صفحہ ۳۴ تک کے نمونے ہیں۔ آگے پڑھنے سے وجدان نے انکار کردیا۔ یہ فی الحقیقت اشعار نہیں ہیں۔ بلکہ کوئی ایسی چیز ہیں جنکا مناسب نام اب تک کی کسی ڈکشنری میں نہیں پایا جاتا۔ ذوقِ لطیف اور وجدانِ سلیم کے لئے انکی مثال کچھ ایسی ہے جیسے چھت پر پڑے ہوئے ٹین پر گلی کے بچے روڑے پتھر پھینک رہے ہوں۔ فن اور قواعد زبان کے اعتبار سے فرداً فرداً ایک سرسری نظر ڈال لیجئے (ہمارا خطاب عزیزی شاعر سے ہے)

صفت اور موصوف میں کوئی فکری یا مشاہداتی مناسبت نہ ہو تو کم از کم قیاسی اور تصوراتی مناسبت تو ہو۔ ہواؤں کو بوڑھاپے اور کمزوری کا موصوف بنانا بس مسخرا پن ہے۔ ادب سے اس کا کیا تعلق۔ جھنکارنا آواز کی اقسام میں سے ہے۔ سورج کا آواز سے کیا واسطہ۔ پھر یہ سوائے فضول گوئی کے اور کیا ہے کہ سورج سینے میں بھرلوں۔ مزید فضول گوئی یہ کہ چٹانیں توڑوں۔ ان باتوں میں کیا ربط اور کیا سنجیدگی ہے؟

دوسرے شعر میں مفہوم ہی غائب ہے۔ یہ "میرے" کون ذات شریف ہیں جنکے ہاتھوں میں چاند اور سورج کے دو ٹکڑے ہیں۔ کون بہکانے آیا ہے، کیوں آیا ہے۔

تیسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کسی طوائف سے گفتگو کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کسی اجنبی باہوں میں رات گذارنے والی فاحشہ ہی ہوسکتی ہے۔ پھر بھلا اسے اس سے کیا دلچسپی کہ اس کی رات کا ساتھی دن بھر کہاں رہا۔ ایسے شعر شاعر اور سامع دونوں کے ذہن و قلب کو تاریک کرتے ہیں۔ ان سے بچنا چاہیئے۔

آخری بس چلی گئی تو اب صبح تک یا تو اسٹینڈ پر کھڑے رہیئے یا کسی ہوٹل میں جا سویئے۔ آخر شاعری غریب کو بس اسٹینڈ کی سیر کرانے سے کیا فائدہ۔ بس دل نے یوں کہا کہ "بس" کا قافیہ مزید اور ہے گا ہو جائے ایک شعر۔

۵۔ یہ بھی شعر نہیں ہے دل لگی ہے۔
۶۔ یہ شعر نہیں ہے چٹکلا ہے۔
۷۔ اس کا مطلب آپ خود ہی لوگوں کو بتائیں تو شاید دماغ میں اترے۔
۸۔ حیرت ہے "اراڑ" جیسا لفظ نظم کرتے ہوئے آپ کو ذرا محسوس نہ ہوا کہ یہ ارباب ذوق کے وجدان پر کیسا کاری زخم لگائے گا۔ "کالی سوچ" بھی خرافات ذہنی میں سے ہے
۹۔ اس سے تو بہتر ہے کہ لطیفے گڑھے جائیں۔ شاعری کا ان بازاریات سے کیا سروکار۔
۱۰۔ شعر بن سکتا تھا اگر دماغ پر جدت طرازی کا سودا سوار نہ ہوتا۔
۱۱۔ یعنی ؟
۱۲۔ بری بات۔ خدا مسخرے پن کا موضوع نہیں ہے !
۱۳۔ جو منہ میں آیا اگل دیا۔
مجموعے میں کچھ اچھے شعر بھی ہوں گے لیکن اعلیٰ درجے کی دیگ میں دس پانچ چوہے بھی ابال دیئے جائیں تو سوچ لیجئے کون نوالے کھا سکے گا۔
عزیزم شاعر کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ مزید چھپنے سے پہلے کسی متین اور ذی علم اُستاد کا دامن پکڑیں۔
فقط والسلام

غزل

(عبدالمتین نیاز۔ بھوپالی)

ان پہ ہی ہر نشترِ غم آزماتی ہے حیات　　اس جہاں میں کم ملیں گے اہل فن سے سینہ چاک
قربتِ محبوب لاتی ہے جدائی کا الم!　　غنچے ہوتے ہیں گلے ملکر کرن سے سینہ چاک
آپ تو میرے مسیحا بن کے آئے تھے مگر　　ہو گیا ہے آپ کے طرزِ سخن سے سینہ چاک
عشق کی آشفتہ حالی جانے کس منزل میں ہے　　خواہشیں نکلی ہیں دل کی انجمن سے سینہ چاک
لوگ سمجھے تھے دوامی ہے اندھیروں کا وجود　　ہو گیا سورج کی اِک ننھی کرن سے سینہ چاک
شوقِ سیرِ گل لئے پہنچے تھے ہم تو اے نیاز　　کیا خبر تھی ہم کو نکلیں گے چمن سے سینہ چاک

بہت کچھ کیا ہے۔ ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "خلافت و ملوکیت" کو پہلی فرصت میں دیکھئے "اسلامی ریاست" مل جائے تو اسے بھی پڑھیں۔ اور مکتبہ جماعت اسلامی ہند سے فہرست کتب طلب کرکے بعض اور کتابیں منتخب فرمائیں جن میں یہ موضوع زیر بحث آیا ہو۔

مجھے اندیشہ ہے کہ اتنا کچھ لکھنے کے باوجود شاید میں آپ کی الجھن رفع نہ کرسکا ہوں گا۔ یہ میری نااہلی ہی سمجھئے بہرحال آپ کے لئے موجودہ مرحلے میں سب سے زیادہ لائق توجہ اور مستحق غور یہ بات ہے کہ موجودہ زندگی کے چند بقیہ دن گذارنے کے بعد آپ کو بالیقین جس نئی زندگی اور نئی دنیا سے سابقہ پڑنا ہے وہاں کے آرام و آسائش کی خاطر فوری طور پر کوئی مثبت قدم اٹھائیں ـــ یا پھر اپنی موجودہ ہی حالت میں موت کا استقبال کریں!ـــ میری دعا ہے اور تمنا بھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جرأت عطا فرمائے اور جس پیغمبر کو آپ نے صادق و امین مان لیا ہے اس پر ایمان کا اعلان بالجہر بھی کرسکیں۔ اس دعا اور تمنا میں جذبۂ قومیت کا کوئی شمول نہیں۔ درحقیقت آدم کے بیٹے کی حیثیت میں سب انسان بھائی بھائی ہیں اور آپ سے تو میرا دوہرا رشتہ ہے۔ آدمیت کا بھی اور وطنیت کا بھی۔ میرے دل کا تقاضا کیوں نہ یہ ہو کہ میرا ہر بھائی اور ہر ہم وطن آخرت کے آرام و راحت سے ہم کنار ہو اور اس دین کو قبول کرنے کے لئے اس کا سینہ کھل جائے جسے قبول کئے بغیر اخروی فلاح کی کوئی توقع ہی نہیں ہے۔

فقط والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔

محمد سلیمان میرٹھیؒ (مدرسہ دارالحدیث مطلع العلوم میرٹھ)

مولانا اسد رحمانی کے نام

محترم مولانا عامر عثمانی صاحب مدیر و مسئول ماہنامہ
لی دیوبند۔ سلام مسنون۔
تجلی مطابق دسمبر ۷۳ء کے صفحہ ۲۸ پر ایک مضمون
رویت ہلال اور ہمارا موجودہ رویہ" نظر سے گذرا۔
نل مضمون نگار مولانا اسد رحمانی صاحب نے اپنے
مون کو پھیلاتے ہوئے ایک ذیلی سرخی "عوام کا
بھی ہلالِ عید ہے" کے تحت رقم فرمایا ہے کہ ایک بار
تہ کے اندر میری موجودگی میں ۲۹ رمضان کو چاند
رویت نہ ہو سکی۔ بڑی مسجد کے امام اور متولی نے
نا محمد حسین میرٹھی کو مشورہ کے لئے بلوایا اور ایک جگہ
نا میرٹھی اور حافظ محمد یوسف کو رویت کی تحقیق کے
بیجا گیا۔ واپسی پر بالاتفاق فیصلہ کیا گیا کہ چاند کی خبر
ن کے بعد غلط ثابت ہوئی لہذا کل عید نہیں ہوگی۔
اچانک رات کو گیارہ بجے بڑی مسجد کی سُرخ بتی
ی گئی جو اس بات کی علامت تھی کہ چاند ہو گیا
عید ہوگی۔ فی الفور مولانا میرٹھی بڑی مسجد کے
احب کے پاس تشریف لے گئے۔ مولانا میرٹھی سے
ار پر امام صاحب نے فرمایا کہ چاند ہو گیا اس کا یقین
نہیں ہے مگر عوام کے جبر سے مجبور ہو کر بتی جلادی
ہے۔ اس گفتگو کے بعد مولانا میرٹھی لوٹ آئے اور
لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو میں کل روزہ رکھوں گا۔ مگر
باؤ کے آگے مولانا میرٹھی مرحوم جھک گئے اور خود
رکھ کر نمازِ عید پڑھائی۔
اس مضمون میں جہاں حضرت مولانا سید عبدالخبیر
صاحب مرحوم قائد جماعت مولانا ڈاکٹر سید عبدالحفیظ
صاحب سلفی کے متعلق مبالغہ آمیز غلط باتیں تحریر ہیں۔ اسی
کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا محمد حسین میرٹھی مرحوم پر بھی سراسر
یہ افتراء اور بہتان موجود ہے کہ انھوں نے "خود روزہ
رکھ کر نماز عید پڑھائی"۔

اس مضمون کو پڑھکر مجھے یہ یاد آیا کہ مولانا میرٹھی
مرحوم ۵۶ء میں کلکتہ امام و خطیب کی حیثیت سے
دوبارہ تشریف لے گئے اور ۶۸ء تک جامع مسجد
اہل حدیث کلکتہ میں امامت و خطابت کے فرائض
بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔

اس ۱۳ سالہ دور میں مولانا میرٹھی مرحوم برابر
عیدین کی نماز کلکتہ میں پڑھاتے رہے البتہ راقم الحروف
نے ۵۶ء سے لے کر ۶۲ء تک مولانا مرحوم کے ساتھ
ہی تمام رمضان گذارے اور عید الفطر کی نمازیں ادا
ادا کیں مگر ایسا کوئی واقعہ میرے ذہن میں محفوظ نہیں
جس کے نتیجے میں مولانا مرحوم نے یہ یقین کرتے ہوئے کہ
چاند نہیں ہوا اور روزہ بھی رکھا ہو اور عوام الناس کو
خوش کرنے کے لئے بحالتِ روزہ عید کی نماز بھی پڑھائی ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ کلکتہ میں رویت سے متعلق اختلافات
کم و بیش ہر سال رونما ہوتے ہیں مولانا میرٹھی کے دور
میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا ۱۳ سالہ مدت میں سب سے
سنگین اختلاف اس وقت پیدا ہوا جب کہ ناخدا مسجد
کے امام شیخ احمد کمال مدنی نے ۲۹ شعبان کو یہ اعلان
کہ رمضان کا چاند پارک سرکس کے علاقہ میں دیکھا گیا ہے

لہٰذا وہاں کی رویت پر میں اعلان کرتا ہوں کہ کل پہلا روزہ رکھا جائے چونکہ یہ اعلان نصف شب کے کافی بعد کیا گیا تھا لہٰذا مولانا میرٹھی نے فرمایا کہ سحری کھالی جائے اور نماز فجر کے بعد ہم خود پارک سرکس جا کر تحقیق کریں گے۔ سحری کھائی، نماز پڑھائی اور نماز کے فوراً بعد ہی پارک سرکس کے علاقہ میں پہنچ گئے تقریباً تین گھنٹے تک مکان در مکان گھومے لیکن اس علاقہ کے لوگوں نے یہی بتایا کہ یہاں کسی نے چاند نہیں دیکھا ہم نے تو بڑی مسجد کے اعلان پہ روزہ رکھا ہے مولانا میرٹھی نے واپس آکر بڑی مسجد کے ذمہ دار حضرات سے ان لوگوں کا پتہ معلوم کرنا چاہا جنھوں نے شہادت دی تھی لیکن بجائے مطمئن کرنے کے ملا جان مرحوم وغیرہ نے یہ فرمایا کہ "رویت کی تحقیق ہر آدمی کا کام نہیں اعلان ہوگیا بس روزہ رکھ لو۔ اس میں چنیں اور چناں کی گنجائش نہیں۔" مولانا میرٹھی نے یہ فرماتے ہوئے کہ ہم اس رویت سے مطمئن نہیں روزہ توڑ دیا اور ایک بڑی تعداد نے اس معاملے میں مولانا میرٹھی کا ساتھ دیا۔

میرے خیال میں رویت سے متعلق یہ سب سے شدید اختلاف تھا جو اختتامِ رمضان تک جاری رہا تاوقتیکہ چاند نے اس کا فیصلہ نہ کر دیا۔

اس کے علاوہ چند بار اختلافات اور بھی ہوئے لیکن مولانا اسد رحمانی صاحب نے جو صورتِ حال سامنے رکھی ہے میں دعوے سے لکھتا ہوں کہ مولانا میرٹھی مرحوم کے ۱۳ سالہ دور میں ایسی کوئی صورت پیش نہیں آئی۔ کتنی بڑی غلط بیانی ہے کہ مضمون کو دلچسپ بنانے کے لئے ایک فرضی واقعہ تحریر کر دیا اور اس کا انتساب اس شخص کی طرف کیا جس کی حق گوئی اور بیباکی کو صرف اہل کلکتہ ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ساری جماعت اہلِ حدیث جانتی ہے میں ایسی باتوں کا منظرِ عام پر آنا بالکل مناسب نہیں سمجھتا یہی وجہ ہے کہ میں نے تجلی میں اپنی گذارشات بھیجنے سے قبل بواسطہ مولانا اسد رحمانی کے پاس متعدد خطوط لکھے مگر مولانا نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ اب میں بواسطہ تجلی مولانا سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ اپنی تحریر کے ثبوت میں شواہد پیش کریں یا تجلی ہی میں معذرت چاہیں تاکہ وہ خدا کے اس عذاب سے اپنے کو بچا سکیں جو مفترین کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

تجلّی

یہ مراسلہ اپریل ۷۲ء میں موصول ہوا تھا۔ اپریل کے بعد "طلاق نمبر" ہی نکلا ہے جس میں اس کے شمول کی گنجائش نہ تھی۔ اب گنجائش نکال کر اسے اس لئے شاملِ اشاعت کر دیا گیا ہے کہ صحافتی دیانت کا تقاضا پورا ہو۔ یہ بڑی تکلیف کی بات ہے کہ مراسلہ نگار جناب محمد سلیمان نے مولانا اسد رحمانی کو خطوط لکھے اور وہاں سے جواب نہیں ملا۔ ہمیں بے تحقیق الزام تراشیوں سے کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ مراسلہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اسد رحمانی نے تجلی میں جو مضمون شائع کرایا اس میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ یہ مسئلہ خبر و روایت کا ہے لہٰذا مزید بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ غلط الزام لگانے والوں کو نیک توفیق دے اور جن پر یہ الزامات لگائے گئے انھیں مظلومیت کا اجر عطا فرمائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امریکہ۔ انگلینڈ۔ نائجیریا۔ کنیڈا۔ فرانس۔ انڈونیشیا اور ملیشیا سے بذریعہ بحری ڈاک دو پونڈ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک ۵ پونڈ۔ بحرین افریقہ۔ سعودی عرب قطر وغیرہ سے بذریعہ بحری ڈاک ایک پونڈ دس شلنگ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک تین پونڈ۔

ماہنامہ

تجلی

دیوبند

چھبیسویں سال کا چھٹا شمارہ

ایڈیٹر
عامر عثمانی

اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے

اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائیگا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

وی پی بائیس ۲۲ روپے کا ہوگا۔

منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے

فہرست ماہ اکتوبر ۱۹۷۴ء

اس شمارے کی قیمت
دو روپے

سالانہ قیمت
بیس روپے

اسلامی پریس۔ دیوبند

احوالِ واقعی

اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ تجلّی کی اشاعت کا بگڑا ہوا نظام درست ہوا۔ پچھلا شمارہ اعلان کے مطابق اگست کے آخری عشرے میں آپ تک پہنچ گیا تھا۔ اب یہ شمارہ بھی انشاء اللہ بر وقت ہی آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

کاغذ کا مسئلہ اگرچہ وقتی طور پر حل ہو گیا ہے لیکن ابھی سے یہ اطلاع بھی مل گئی ہے کہ کئی سو روپے ٹن دام اور بڑھ گئے ہیں۔ یعنی لاگت اور فروخت میں توازن قائم رکھنے کا جو پرابلم بحالتِ موجودہ ہی دردِ سر بنا ہوا ہے وہ چند ماہ بعد دردِ جگر اور دردِ دل بننے والا ہے۔ کس سے کہیں اور کیا کہیں۔ ہماری سرکار عالیہ ٹیکسوں کے معاملے میں حد سے زیادہ وسیع النظر ہوتی جا رہی ہے۔ پہلے سال بہ سال ٹیکسوں کا اضافہ ہوا کرتا تھا اب دَورانِ سال میں جب چاہے ہو سکتا ہے۔ ساتھ ساتھ حکومت یہ بھی اعلان کرتی ہے کہ عوام پر اس کا بوجھ نہیں پڑے گا لیکن یہ اعلان جیسا کچھ تمسخر اور استہزاء اپنے اندر رکھتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ہر نئے ٹیکس کا بوجھ آخر کار عوام ہی کی اُس کمر پر جا پڑتا ہے جو دوہری کے بعد تہری ہو چکی ہے اور خدا کے کروڑوں بندے انتہائی پریشانیوں اور مایوسیوں کے تاریک غاروں میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح زندگی گذار رہے ہیں۔

دوسری طرف ایک بڑا طبقہ ہے جسے خبر ہی نہیں کہ گرانی کس چڑیا کا نام ہے۔ اس کے پاس بے شمار دولت ہے۔ کوئی بھی چیز وہ ہر قیمت پر بہ آسانی خرید سکتا ہے۔ اس عجیب صورتحال میں ہم جیسے بے ننگ و نام زبان بھی کھولیں تو کیا کھولیں۔

بہر حال صبر کے سوا چارہ نہیں۔ ہم جہاں تک لڑ سکتے ہیں حالات سے لڑیں گے اور دین و ملت کی جو ٹوٹی پھوٹی خدمت انجام دے رہے ہیں اسے دیئے چلے جائیں گے۔ مدد مدد پکارنا اور تعاون کی اپیلیں کرنا ہماری عادت نہیں۔ جو لوگ تجلّی کو مفید سمجھتے ہیں اور اس کی زندگی انھیں عزیز ہے وہ خود ہی اس حقیقت کو ملحوظ رکھیں کہ تجلّی جیسے جریدوں کے لئے بڑے کٹھن مراحل آ گئے ہیں۔ حکومت کے اشتہارات لینے پر ابھی تک ہمارے قلب کو انشراح نہیں ہوا۔ انشراح کے بغیر یہ کام ہم کریں گے نہیں۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ پرچے میں ایک بھی اشتہار نہ ہو۔ بغیر اشتہارات کی معقول اجرت کے پرچے کی آمدنی خرچ پر بازی لے جائے یہ کافی دشوار بن گیا ہے لہٰذا تجلّی کے مخلصین اور محبین اپنے امکانی تعاون سے غافل نہ ہوں اور یہ انتظار نہ کریں کہ جب کوئی اپیل شائع ہوگی اسی وقت سرگرمی دکھائی جائے گی۔

آغازِ سخن

تجلی پڑھنے والوں میں ایک کرم فرما ہیں آدم۔ ایس۔ اے پٹیل۔ دین کے معاملے میں پُرجوش اور اخلاص کیش۔ ان کے کچھ تعلقات جناب شمش پیرزادہ صاحب سے بھی ہیں شمس پیرزادہ بھی ان مقالہ نگاروں میں ہیں جنھوں نے تین طلاقوں والے سمینار کو اپنے مقالہ سے رونق بخشی تھی۔ ان کا مقالہ بھی تجلی کے "طلاق نمبر" میں زیرِ بحث آچکا ہے۔

پٹیل صاحب نے تجلی طلاق نمبر پڑھ کر انھیں ایک خط لکھا تھا جس کے کچھ مندرجات یہ تھے:۔

(۱) میرا مشورہ ہے کہ آپ عامر عثمانی صاحب کے دلائل کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے مقالہ سے رجوع فرمالیں۔ یا پھر ان دلائل پر نقد و تبصرہ کرکے یہ ثابت فرمائیں کہ ان میں یہ خامی اور یہ کمزوری ہے۔

یہ مشورہ دیتے ہوئے پٹیل صاحب نے اپنے اس خیال کا بھی برملا اظہار کر دیا تھا کہ تجلی کے دلائل و براہین کا رد آپ کے لئے ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

(۲) آپ آخر اہلِ حدیث اور غیر مقلد ہی کیوں رہیں حنفی اور مقلد کیوں نہ بن جائیں۔ یہی راستہ بہتر نظر آتا ہے۔

(۳) اگر اس طرح مسلک کی تبدیلی سے احباب و اعزّا کی ناراضگی اور قطع تعلق کا خوف ہو تو انھیں سمجھائیے اور بے خوف ہو کر مسلک تبدیل فرمالیجئے۔

یہ تھے پٹیل صاحب کے نامۂ اخلاص کے مندرجات۔ وہ لکھتے ہیں کہ پچھلے ربط و ضبط اور دید و شنید کی بنا پر مجھے امید تھی کہ میرا خط کچھ کارگر ہوگا لیکن شمس صاحب کے دیئے ہوئے جواب نے میری اُمید پر پانی پھیر دیا۔

اب یہ خط موصوف نے اس فرمائش کے ساتھ ہمیں ارسال کر دیا ہے کہ اس پر تجلی میں لکھا جائے۔ خصوصاً تقلید اور بے تقلیدی کے موضوع پر مفصّل گفتگو کی جائے۔ اس فرمائش کے ساتھ موصوف نے یہ بھی وضاحت فرمادی ہے کہ شمس صاحب کا خط یہاں بھیج دینے کی اطلاع وہ صاحبِ خط کو دے چکے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر اظہارِ خیال کرنے کا جواز تجلی کے لئے پیدا کر دیا گیا ہے۔

لیجئے شمس صاحب کا خط بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔ پٹیل صاحب

[illegible] لکھتے ہیں:-

"محترمی! السلام علیکم۔ گرامی نامہ مندرجہ یکم اگست موصول ہوا۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے تجلی کا طلاق نمبر تو پڑھ لیا لیکن زندگی کا طلاق نمبر جس میں مقالات شائع ہوئے ہیں، نہیں پڑھا۔ اس طرح مقالات کو دیکھے بغیر تجلی کی تنقید سے آپ مطمئن ہوگئے! بہرحال آپ جس رائے پہ مطمئن ہیں وہی اختیار فرمائیں۔ راقم الحروف جب عامر صاحب کے دلائل سے مطمئن نہیں ہے تو وہ کیوں ان کی رائے سے اتفاق کرے گا!

رہی آپ کی یہ نصیحت کہ "حنفی اور مقلد ہوجایئے"۔ تو اس کے لئے قرآن و سنت کی کوئی دلیل ہو تو ارشاد فرمایئے ورنہ اپنی من مانی باتوں کو شرعی حکم کا ذریعہ دینا کتنی زبردست غلطی ہے اس پر آپ خود ہی غور فرمائیں اللہ تعالیٰ نے تو صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے کسی مسلک کی تقلید کا حکم نہ قرآن میں ہے اور نہ سنت میں۔

رشتہ داروں سے کٹ جانے کا مجھے کوئی خوف نہیں، اور نہ میرے کسی مسلک کو اختیار کرنے میں میرا کوئی رشتہ دار رکاوٹ پیدا کرسکتا ہے۔ آپ نے یہ بات محض اٹکل سے لکھی۔ والسلام۔ شمس پیرزادہ"

ڈاک سے خاصا تفصیلی جواب تو ہم ٹیپل صاحب کو دے چکے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مزید اظہار خیال کے لئے شمس صاحب ہی کو مخاطب بنائیں تاکہ درمیان میں کوئی حریری پردہ باقی نہ رہ جائے۔

اے بہت ہی محترم دوست! اللہ تعالیٰ آپ کو عافیتِ دارین سے نوازے۔

جو بات آپ نے ٹیپل صاحب کو لکھی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کے طلاق نمبر میں کوئی ایسا مواد بھی باقی رہ گیا ہے جسے نالائق مدیر تجلی نے نظر انداز کردیا اور وہ مواد ایسے دلائل و شواہد اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے کہ ٹیپل صاحب اگر اس کا مطالعہ کرلیتے تو محسوس کرتے کہ تجلی کی تنقید تشنہ، غیر تسلی بخش اور ناکام ہے۔

میں عرض کروں گا کہ اگر یہ بات آپ نے محض دفع الوقتی کے لئے حوالۂ قلم نہیں کی بلکہ اس میں رائی برابر بھی سچائی ہے تو حق پرستی اور اخلاص فی الدین کا تقاضا ہے کہ آپ اس مواد کی نشاندہی کریں اور نالائق مدیر تجلی کے نقد و نظر کی زلفِ دوتا میں اسیر ہوجانے والے بےشمار بندگانِ خدا کو بتلائیں کہ انھیں فریب دیا گیا ہے۔ زندگی کے مقالات میں ابھی فلاں فلاں دلائل ایسے موجود ہیں جو رد نہیں کئے جاسکے اور ان کی رو سے مقالہ نگاروں ہی کا مسلک و موقف برحق ثابت ہوتا ہے۔

میرا ناچیز خیال ہے کہ ایسا کہنا آپ کے لئے ممکن نہیں ہے۔ آج ہی نہیں پہلے سے میری عادت اور روش یہ ہی ہے کہ جس مسلک سے مجھے اختلاف ہوتا ہے اس کے تمام موافق و مخالف دلائل پر دیانت داری سے نگاہِ غور ڈالتا ہوں اور پھر ہر ہر مخالف دلیل کا ضعف واضح کرتے ہوئے تمام موافق دلائل کو شرح و بسط سے پیش کرتا ہوں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ کوئی مسلک اگر دس دلائل سے ثابت ہو رہا ہے تو اسے رد کرنے کے لئے اس کے دس دلائل کا توڑ کرنا ہوگا۔ اگر نو دلائل کی کمزوری واضح کردی لیکن ایک دلیل شکست و ریخت سے بچ گئی تو یہ دعویٰ درست نہ ہوگا کہ یہ مسلک غلط ثابت کردیا گیا۔ لہٰذا کیسے ممکن تھا کہ زندگی میں شائع شدہ مقالات کے صرف بعض دلائل پر میں گفتگو کرتا اور بعض کو نظر انداز کرجاتا۔ محاورہ ہے نہ گھوڑا دور نہ میدان۔ دوسرا محاورہ ہے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ زندگی اور تجلی دونوں کے طلاق نمبر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ مارکیٹ میں موجود ہیں۔ آپ کے پاس بھی ہوں گے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ خوردبین لگا کر پھر سے مطالعہ کیجئے اور بلا تکلف نشاندہی فرمایئے کہ مسئلہ طلاق پر آپ کے موقف و مسلک کے حق میں وہ کونسی دلیل مقالات میں بچی رہ گئی ہے جسے نالائق مدیر تجلی کے خامۂ نقد نے کریلا اور ٹٹولا نہ ہو۔ آپ تو فقط مقالات کی بات کر رہے

ہیں۔ مجھ ناکارہ نے تو آپ کے مسلک والے بہتیرے ایسے دلائل بھی دائرۂ نقد میں لے لئے ہیں جو مقالات میں مندرج نہیں اور جن علامہ ابنِ قیم کی تقلید بجا، آپ حضرات اس مسئلہ میں کرتے ہیں ان کے اکثر دلائل کو کھنگال ڈالا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ میرا ہر استدلال حرفِ آخر اور ہر خیال پتھر کی لکیر ہوا کرتا ہے۔ العیاذ باللہ، میں بھی ایک ضعیف اور ناتواں انسان ہی ہوں۔ مجھ سے بھی فکر و استدلال اور عرض و بیان کی خطائیں برملا سرزد ہوسکتی ہیں اور ہوتی ہیں مگر یہ ضرور کہوں گا کہ پٹیل صاحب کو جو جواب آپ نے دیا ہے وہ حقائق سے ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے اپنی دانست میں مقالاتِ مطبوعہ کے کسی مثبت و منفی استدلال اور کسی نقلی و عقلی گوشے کو نظرانداز نہیں کیا ہے۔ لیکن اگر پھر بھی آپ میری کوتاہ نظری پر مصر ہیں تو بسم اللہ۔ زندگی کے صفحات سے وہ چیزیں نکال کر سامنے لائیے جو آپ کے نزدیک میرے دستِ نقد کی پہنچ سے دور رہ گئی ہیں۔ میں اپنی کم نگاہی کا اعتراف کرتے ہوئے ان پر دیانت دارانہ اظہارِ خیال کروں گا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ پٹیل صاحب کو آپ نے ایک چلتا ہوا سا جواب دیدیا اور بات ختم کردی۔

رہا میرے دلائل سے آپ کا مطمئن نہ ہونا۔ تو میرے دوست میں ناکارہ کیا چیز ہوں۔ خدا کے جلیل القدر پیغمبر بھی بے شمار ان لوگوں کو مطمئن نہ کرسکے جن کے لئے مشیت کا فیصلہ تھا کہ وہ مطمئن نہ ہوں۔ دلائل بندوق کی گولی یا کمان کا تیر نہیں ہوتے کہ زبردستی گھسے اور سینے میں ترازو ہو جائیں۔ ان کی تاثیر کا مدار مخاطب کی اپنی نفسیات اور ذہنی و قلبی کیفیات پر ہے۔ آنجناب نے اگر تہیہ ہی کرلیا ہے کہ جس معاملے میں جو رائے قائم کرچکے ہیں اس سے نہیں ہٹیں گے تو یہ بندۂ بے بضاعت کیا حقیقت رکھتا ہے افلاطون اور ارسطو اور غزالی اور ابوحنیفہ بھی اپنی ابدی آرام گاہوں سے اٹھ آئیں تو آپ کی رائے پر اثرانداز نہ ہوسکیں گے۔

خدا توفیق دے تو تجلی کا طلاق نمبر ایک بار پھر ورق ورق پڑھیں اور غور فرمائیں کہ مدیر تجلی نے نام بنام جملہ مقالہ نگاروں کی جو علمی نارسائیاں، فکری خامیاں اور نقل و روایت کی خطائیں شرح و بسط سے منقح کی ہیں انہیں کہاں کیا غلطی ہے اور خود آنجناب نے دلائل کے نام پر جو مواد اپنے مقالے میں پیش کیا ہے وہ جائزے اور نقد کے بعد کس حال میں ہے۔ مجھے بڑا رنج اور تحیر ہے کہ دلائل و شواہد کا پورا لشکر بھی آپ پر مطلق اثر نہ ڈال سکا یہاں تک کہ خدا، رسولؐ اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کے صف در صف فیصلے اور فتوے بھی آپ کی بارگاہِ ناز میں اپنا سا منھ لے کر رہ گئے۔ یہ فیصلے اور فتوے اگرچہ عدمِ گنجائش کی بنا پر ترتیب و انضباط کے ساتھ طلاق نمبر میں نہ آسکے تھے لیکن ذیلاً بہرحال آچکے تھے اور لیجئے پچھلے شمارے میں تو منضبط طور پر بھی آچکے — کیا ان کی کوئی قیمت نہیں؟ کیا حق پسندی کا شیوہ یہی ہے کہ اپنی رائے کے آگے کسی کی بات نہ سنی جائے؟

بہرحال یہ گناہگار تو اپنا فریضہ ادا کرچکا۔ بندوں کی ٹھیکیداری تو انبیاء تک پر نہیں تھی۔ ان کا فریضہ بس پہنچادینا تھا اسی طرح ان کے غلام عامر عثمانی کا بھی پارٹ نقد و نظر کے بعد ختم ہوگیا۔ کون مطمئن ہوتا ہے اور کون نہیں ہوتا یہ مشیتِ ایزدی کے اسرار ہیں۔ البتہ یہ اچھی طرح ذہن نشین کرلیجئے کہ روزِ محشر خدا کی بارگاہ میں یہ سوال آپ سے اور جملہ مقالہ نگاروں سے پوچھا جاسکتا ہے کہ اے میرے بندو! تمھارے پاس اپنے مسلک پر جمے رہنے کا کیا جواز رہ گیا تھا جب ہمارے ایک بندے نے تمھاری ہر ہر ناقص دلیل کی کمزوری واضح کرتے ہوئے قوی دلائل دوسرے مسلک کی صحت پر قائم کردیئے تھے۔ تم کیوں اپنی رائے کو الٰہ بنائے رہے اور مسلک تبدیل نہیں کیا۔

تقلید کے سلسلہ میں آنجناب نے جو کلمات پٹیل صاحب کو لکھے ان پر میں اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کرسکتا کہ وہ اپنی

اور ثبوت دونوں اعتبار سے یکتا نہ نوع کے ہیں۔ سب سے بڑھ کر کج فہم اور فریب خوردہ کون ہوگا جو اس خیالِ خام میں مبتلا ہو کہ مقلد حضرات اللہ اور رسول کے سوا بھی کسی کی اطاعت کا فاسد عقیدہ رکھتے ہیں۔ آپ ہی کی طرح ابو حنیفہ، شافعی، مالک اور ابن حنبل اور ان کے کروڑوں مقلدین کا عقیدہ اور حتمی فیصلہ یہی ہے کہ مُطاع صرف اللہ اور رسولؐ ہیں۔ ان کے سوا کسی کا کلام گفتگو سے بالا تر نہیں۔ تقلید اطاعت کا نام نہیں بلکہ کم و بیش اُس چیز کا نام ہے جس کی تلقین اللہ تعالیٰ نے بایں الفاظ کی ہے۔ فَسْئَلُوا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل۔ الانبیاء)

تقلید کے مسئلہ پر بڑی مبسوط بحثیں ہو چکی ہیں۔ خود ناچیز بارہا موشگافی کر چکا ہے۔ بیسیل صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ تقلید و عدم تقلید کے موضوع پر پھر ایک بار میں شرح و بسط سے کلام کروں۔ جواباً عرض ہے کہ آئندہ کسی اور موقعہ پر میں اس فرمائش کی تعمیل انشاء اللہ کر ہی دوں گا لیکن موجودہ مرحلے میں اس کی ضرورت نہیں۔ اولاً یوں کہ جب تجلی کا طلاق نمبر بھی شمس صاحب کے لئے مؤثر نہ ہو سکا حالانکہ یہ دلائل کا لشکر ساتھ لئے ہوئے ہے تو تقلید ہی کے موضوع پر میرے دلائل ان پر کیا اثر کریں گے۔ میں آسمان سے وحی تو اُتار کر لانے سے رہا۔ وحیِ جلی کے بغیر میرے دوست کسی بات کو ماننے پر آمادہ نہیں تو بتائیے اللہ اور جبریل پر میرا کیا بس ہے!

ثانیاً یوں کہ تقلید کے مسئلہ میں اور طلاق ثلٰث کے مسئلہ میں فرق ہے۔ طلاق ثلٰث ایک اجماعی مسلک ہے جس کے اجماعی ہونے پر میں دلائل دے چکا مگر تقلید کا مسئلہ ایسا نہیں۔ تقلید کو عوام اور کم علم خواص کے لئے انتہائی ضروری خیال کرنے کے باوجود میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ غیر مقلد حضرات اجماعِ امت کو توڑ رہے ہیں۔ وہ از راہِ غلط فہمی تقلید کو کتنا ہی بُرا کہے جائیں لیکن عملاً وہ خود اس پر عامل ہیں، اور تقلیدی جمود ان میں ہم مقلدوں سے کہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا مجھے کوئی شوق نہیں کہ تقلید کے موضوع پر ان سے جنگ کروں۔ وہ شوق سے "غیر مقلد" بنے رہیں اس سے فی الحال کوئی نیا فتنہ کھڑا نہیں ہوگا مگر طلاقِ ثلٰث والے اجماعی مسلک کو مسترد کرنے سے تو ان لوگوں کے ہاتھ ایٹم بم آجاتا ہے جو شب و روز اس فکر میں گھلے جا رہے ہیں کہ مسلم پرسنل لا کو اپنے بازیچے کی گیند بنالیں اور اُس دفاعی لائن کو توڑ دیں جسے "اجماع" کہا جاتا ہے۔

خدا شمس صاحب کو اور دیگر مقالہ نگاروں کو یہ سمجھنے کی توفیق دے کہ مجرد اپنی رائے اور خیال کی ترنگ میں وہ کیسا مہلک ہتھیار مسلم نما غیر مسلموں کے ہاتھ میں دیدینا چاہتے ہیں۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

بلا تبصرہ

دوستی کے پردے میں روس ہمیں کتنا نقصان پہنچا رہا ہے

روس ہمارا دوست ہے اور حکومتِ ہند اس کی دن رات تعریف کرتی ہے۔ اور روس کو محسنِ اعظم قرار دیتی ہے۔ روس ہم سے تجارت کرتا ہے۔ ہماری مدد کرتا ہے۔ ہمیں جانکاری فراہم کرتا ہے ہمیں گرانٹ بھی دیتا ہے لیکن ان تمام ابواب میں روس جس طرح سے ہمارا استحصال کر رہا ہے اور ہم سے جس قدر فائدہ اٹھا رہا ہے اُس کا ذکر کوئی نہیں کرتا۔ روس ہمارا کتنا سچا دوست اور کتنا ہمدرد ہے اس کا حال تو اُسی وقت معلوم ہو گیا جب کہ اخباری کاغذ کا معاہدہ کر کے بھی روس مُکر گیا اور اس کی قیمت بے انتہا بڑھا دی دنیا سرمایہ دار ملکوں کو گالیاں دیتی ہے کہ وہ دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ روس کی ذہنیت جس قدر سرمایہ دارانہ ہے اتنی کسی کی بھی نہیں روس اخباری کاغذ پر ہمیں بین الاقوامی مارکیٹ سے دو سو فی صد زیادہ چارج کر رہا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ جو کاغذ روس ہمیں دے رہا ہے وہ اُس کا اپنا نہیں بلکہ کنیڈا اور امریکہ سے کم قیمت پر خریدا ہوا ہے۔ روس نے امریکہ اور کنیڈا میں آنے والے پانچ سال تک کا تمام فاضل۔ گیہوں ایک معاہدے کے تحت خرید لیا ہے اور کم قیمت پر خریدا ہوا گیہوں دوست ممالک کو چار گنا منافع رکھ کر فروخت کر رہا ہے۔ پھر بھی وہ سوشلسٹ اور غریب پرور ملک کہلاتا ہے۔ ناروے۔ سویڈن اور دوسرے ملکوں میں اُس نے اخباری کاغذ بھی خرید لیا ہے اور ہمیں ایک روپیہ کا مال چار میں دے کر بھی احسان جتا رہا ہے۔ ہندوستان کو روس نے اب تک ۸۹۲ کروڑ روپے کا قرضہ دیا ہے، اس کے برعکس دوسرے ملکوں کو گیارہ ہزار کروڑ کا قرضہ دیا ہے۔ روس صرف اُنھی صنعتوں پر سرمایہ لگاتا ہے جو اس کی مرضی کے تحت قائم ہوں۔ یعنی زمین۔ عمارت کا پلان۔ تعمیر۔ مشینری۔ کام کرنے والے اور ماہر وغیرہ سب اس کی پسند کے ہوں۔ کارخانے میں مال بھی اس کی ضرورت اور پسند کا تیار ہو اور اس کی مقرر کردہ قیمت پر دیا جائے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی منظور نہیں کی گئی تو امداد نہیں دیتا۔ بتایا جاتا ہے کہ روس نے جتنے بھی کارخانے ہمارے یہاں قائم کئے ہیں اُن کی مشینری تھرڈ کلاس اور پرانی ہے۔ جہاں تک تجارت کا معاملہ ہے روس جو بھی مال ہم سے خریدتا ہے اس کی قیمت بین الاقوامی مارکیٹ سے آدھی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اُس نے بھلائی سے دس لاکھ ٹن فولاد خریدا اور اس کی قیمت بیس فی صد کم ادا کی۔ ہم امریکہ کو ایک کلو شکر ساٹھ پیسے میں فروخت کرتے ہیں لیکن یہی شکر روس ہم سے ۴۲ پیسے میں خریدتا ہے۔ روس کی خاطر ہم مصنوعی ریشے سے تیار کردہ کپڑا ۳۰ فیصد کم قیمت پر دیتے ہیں۔ روس جو پٹ سن ہم سے خریدتا ہے اس کی قیمت آٹھ فی صد کم ادا کرتا ہے۔ روس نے ہم سے ۴۵ ہزار واگن فی واگن بیس ہزار روپے کے حساب سے خریدے۔ جب مال تیار کر کے حساب لگایا گیا تو ایک واگن کی اصل قیمت ۲۴ ہزار فیکٹری ہی میں پڑ گئی۔ اس طرح روس نے دوستی کے پردے میں ۱۰۸ کروڑ کا نقصان پہنچایا۔ روس جو بھی معاہدے کرتا ہے دس سال یا پانچ سال کے لئے کرتا ہے اور ان سے خوب نفع کماتا ہے۔ روس ہمیں جو مال دیتا ہے اس کی کہانی بڑی دردناک ہے۔ مکمل عالمی مارکیٹ میں ۱۵ ہزار روپے فی ٹن

ہے مگر روس ہمیں تمیں ہزار میں دیتا ہے۔ ٹریکٹروں کے پُرزے بھی تین گنا زیادہ قیمت پر ہمیں دیئے جاتے ہیں۔ ٹرسنائیل پر ۴۰ فیصد زیادہ قیمت پر ہمیں سپلائی کیا جا رہا ہے۔ روس فولاد۔ اُون۔ کپاس اور دوسری چیزیں دے کر تیار مال لیتا ہے۔ ہندوستانی مزدوروں کو ۸ آنے ادا کرتا ہے تو تیار مال فروخت کر کے ۸۰/- روپے کماتا ہے۔ روس سے جو بھی چیزیں آتی ہیں وہ اچھی نہیں ہوتیں پھر بھی ہمیں دوستی کی خاطر انھیں قبول کرنا پڑتا ہے۔ یہ ہے روس کی دوستی کا فائدہ۔ نشیمن (بنگلور) ۱۱ اگست ۷۲ء

• وہی ذہنی بگاڑ • حضورؐ اپنی قبر میں! • اسلامی نظام اور حجر اسود • غیر ضروری سوالات
• مسجد میں ذکر و شغل اور تبلیغی نصاب • اسلام اور عیسائیت • جماعت احمدیہ۔

تجلی کی ڈاک

وہی ذہنی بگاڑ!

سوال :- از : عاصم فاروقی۔ سکندر آباد

مولانا محمد حمید الدین عاقل حسامی جو شہر حیدر آباد کے مشہور و ممتاز واعظ و عالم دین ہیں اور موصوف مسلم نوجوانوں میں زیادہ مقبول ہیں۔ اپنی ایک تقریر میں فرما رہے تھے "قاب قوسین" سے اللہ تعالیٰ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب مراد ہے یعنی اتنی نزدیکی دو قوس کے برابر بلکہ اور بھی قریب جو تصور سے باہر ہے۔ اس تعلق سے عرض کرنا یہ ہے کہ جبریلؑ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت اتنک سنتے اور پڑھتے آئے تھے لیکن مولانا کا ایسا فرمانا کہاں تک صحیح ہے؟ کیا بعض علماء اللہ تعالیٰ اور حضورؐ کی قربت مراد لیتے ہیں؟ اگر علماء کرام میں اختلاف ہے تو کس حد تک؟ وضاحت فرمائیں۔

مولانا عاقل اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب ہونے کے تعلق سے فرما رہے تھے "جس حد تک اللہ تعالیٰ اپنے آخری رسولؐ کو علم غیب سے سرفراز فرمایا تھا اس حد تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم علم غیب سے واقف تھے۔ غیب کا علم حضورؐ کو تھا، یہی عقیدہ اہل سنت والجماعت کا ہے اور صحیح ہے۔"

جواب

کوئی شخص عقل و منطق اور زبان و ادب کے تقاضوں سے بے بہرہ ہو کر محض مبالغے اور خوش عقیدگی کی راہ پر لگ جائے اس کے لئے تو ممکن ہے کہ سورۂ نجم کی آیت "قاب قوسین" سے یہ معنی نکالنے لگے کہ رسول اللہؐ کا اور خدائے وحدہٗ لاشریک کا درمیانی فاصلہ کم و بیش کمان سے برابر رہ گیا ورنہ واضح قطعی اور بے غبار تفسیر اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ آیت میں رسول اللہؐ اور حضرت جبریلؑ کے درمیانی فاصلہ کا ذکر ہے۔ مستند مفسرین کی بھاری اکثریت یہی کہتی آئی ہے اور ہم کچھ دنوں قبل تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں کہ اس کے سوا کوئی مطلب نکالنا قرآن کے ساتھ زبردستی ہے۔

آپ کو معلوم ہی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ذی جسم نہیں اور محدود بھی نہیں۔ وہ ہر جگہ ہے اور کوئی جگہ ایسی نہیں جس کے بارے میں کہا جا سکے کہ اللہ یہاں تو ہے اور دوسری جگہ نہیں ہے۔ تعیّن، حد بندی، تجسیم، ان تمام چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور بالاتری تمام علمائے سلف و خلف کا متفق علیہ عقیدہ ہے۔ سب اس کے قائل ہیں کہ قرآن میں اللہ کے ہاتھ، پاؤں اور چہرے وغیرہ کا جو ذکر آتا ہے وہ مجاز و کنایہ ہے نہ کہ حقیقت اور اللہ ایک نور بسیط ہے۔ مادیت سے بلند، ہمہ گیر، بے حد و نہایت، ادراک کی گرفت سے بالاتر۔

حالانکہ اگر آیت کا وہ مطلب نکالا جائے جو مولانا عاقل صاحب نے نکالا ہے اور بعض اور ناقابلِ لحاظ حضرات بھی نکالتے رہے ہیں تو اللہ کی یہ تمام خصوصیات ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ کوئی بھی دو چیزیں جب تک دو مقامات کیساتھ مخصوص نہ کر دی جائیں ان کا درمیانی فاصلہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ صاحبِ جسم تھے۔ وہ جب جس مقام پر بھی ہوں ان کا جسم اسی طرح خلا کا کچھ حصہ گھیرتا تھا جس طرح دوسرے اجسام گھیرتے ہیں اور انگلی اٹھا کر یہ کہدینا آسان تھا کہ آپ اس وقت فلاں جگہ ہیں اور فلاں جگہ نہیں ہیں۔ یہی حال اگر اللہ تبارک و تعالیٰ کا بھی ہوتا تب تو یہ کہنا واقعی ممکن تھا کہ فلاں وقت رسول اللہ کے اور اللہ کے مابین اتنا کم فاصلہ رہ گیا لیکن اللہ کا حال یہ نہیں ہے پھر کیسے درمیانی فاصلے کا تعیّن یا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔

قرب و بُعد کو معنوی اور مجازی معنی میں استعمال کرنے کی مثالیں تو قرآن ہی میں موجود ہیں۔ مثلاً اللہ فرماتا ہے کہ ہم بندے کی رگِ گلو سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ اس کا مطلب سب جانتے ہیں کہ قرب جسمانی مراد نہیں بلکہ یہ کنایہ ہے علم و خبر کے درجۂ کمال کا۔ اس طرح کا کنایاتی قرب و بُعد تو اللہ اور بندے کے درمیان صریح طور پر قابلِ فہم ہے لیکن جسمانی قرب و بُعد کی بحث ہی فضول ہے جب کہ اللہ ذی جسم ہی نہیں اور تمام مقامات پر اس کی موجودگی مسلّمات میں سے ہے۔ اس مسلّمے کے اعتبار سے وہ ہر وقت ہر بندے کے قریب ہے، لہٰذا جو شخص یہ تصور کرتا ہے کہ آیت میں اللہ اور رسول ﷺ کا جسمانی فاصلہ بیان ہو رہا ہے وہ غلط فہمی اور غلط اندیشی کا شکار ہے۔

آپ دیکھتے ہیں۔ قرآن میں بیان کیا گیا کہ نظم عالم درست کرنے کے بعد اللہ عرش پر مستوی ہوا۔ اس کا مطلب مستند مفسرین یہ ہرگز نہیں لیتے کہ اللہ کسی محدود جسم کی طرح عرش نامی کسی تخت پر بیٹھ گیا اور اس تخت سے باہر کائنات کا جو پھیلاؤ تھا وہ اللہ کے وجود سے خالی ہو گیا۔ اس کے برخلاف وہ ایسی تفسیر کرتے ہیں جس سے اللہ کے لئے جسم اور محدودیت لازم نہ آئے۔ اسی طرح قرآن کی کسی بھی آیت کا ایسا مطلب نکالنا درست نہیں جو اللہ کی تنزیہ میں خلل ڈالنے والا ہو۔

خلاصہ یہ کہ سورۂ نجم میں کمان برابر جس فاصلے کا ذکر ہے وہ حضرت جبریلؑ اور رسول اللہ ﷺ کے جسموں کا فاصلہ ہے۔

(۲) علم غیب سے متعلق جو فقرے آپ نے مولانا موصوف کے نقل کئے وہ ایک اعتبار سے تو درست ہیں۔ یہ کہ جن جن اُمور میں غیب کا علم دینا اللہ کے نزدیک ضروری تھا وہ اللہ نے حضور ﷺ کو عطا کیا۔ لیکن اس معاملہ میں حضور ﷺ ہی کی کوئی خصوصیت نہیں۔ اور بھی لاتعداد انسان گذرے ہیں جنھیں اللہ نے وقتاً فوقتاً بعض اُمورِ غائبہ پر مطلع کیا اور یہ تو قرآن ہی میں آپ پڑھتے ہیں کہ فالھمہا فجورہا وتقوٰہا۔ یعنی تمام انسانی نفوس پر خیر و شر کا بنیادی احساس الہام کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے فجور و تقویٰ یا خیر و شر امورِ غائبہ ہی میں ہیں اور اللہ اگر نفوس میں تمیز و احساس کی صلاحیت پیدا نہ فرماتا تو حواس ظاہری سے یہ پتا چل ہی نہیں سکتا تھا کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا۔ فسق کیا ہے اور تقویٰ کیا۔

گویا اللہ کی طرف سے دیئے گئے علم غیب کے باب

میں حضورؐ کے اور دوسرے انسانوں کے مابین کوئی جوہری اور اصولی فرق نہیں البتہ مقدار و نوعیت کا فرق ہے۔ حضورؐ کو جتنے کثیر امورِ غائبہ پر مطلع کیا گیا کسی اور کو نہیں کیا گیا۔ آپ معراج کے معاملے میں منفرد ہیں اور معراج میں جس قدر غائب امور و اشیاء کا مشاہدہ آپ نے فرمایا ہے کون اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کی طرف سے بعض غائب امور و اشیاء کا علم عطا ہونا ایک عام بات ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ نہ اس میں کوئی کلام کر تا ہے۔ اصل مسئلہ در ہے۔ وہ یہ کہ جن امورِ غائبہ کا علم عطا کئے جانے کا ثبوت حضورؐ کے بارے میں قرآن و حدیث میں موجود ہے ان پر قیاس کرتے ہوئے کیا ہم ایسے امورِ غائبہ کا بھی حضورؐ کو عالم تصور کر سکتے ہیں جن کے علم کا کوئی قوی ثبوت موجود نہیں ہے؟ یا ایسا قیاس غلط ہے۔

ہمارے نزدیک ایسا قیاس بہت ہی خاص شرائط اور حدود کے ساتھ تو جائز ہو سکتا ہے لیکن وسعت اور تعمیم کے ساتھ نہیں۔ جن لوگوں نے شرائط اور حدود کا لحاظ نہیں رکھا وہ یہاں تک جا پہنچے کہ حضورؐ کو تمام ما کان و ما یکون کا علم تھا۔ یعنی جتنا علم خدا کو ہو سکتا ہے وہ سب حضورؐ کو بھی تھا۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ خیال و عقیدہ لغو و باطل ہے۔ عقل، وجدان، شریعت سب اس کے باطل ہونے پر متفق ہیں۔ یہ کھلا شرک ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔

ایک اور نکتہ سمجھ لیجئے۔ وہ یہ کہ اگر کسی غائب شے کا علم ہمیں کسی خارجی ذریعہ سے ہو تو اس علم کو اصطلاحاً علم غیب کہتے ہی نہیں مثلاً آپ نے امریکہ، فرانس، ہالینڈ، قطب شمالی و جنوبی اور بحر الکاہل وغیرہ نہیں دیکھے۔ ان کے وجود اور احوال اور جغرافیہ کا علم آپ کو خارجی ذرائع سے ہوا ہے تو کیا اصطلاحاً کبھی بھی کسی نے ایسا کہا ہے یا آپ نے ایسا سمجھا ہے کہ ان اشیاء کی حد تک آپ "عالم الغیب" ہیں۔ در حقیقت "علم غیب" کا اطلاق غائب امور و اشیاء کے صرف ایسے ہی علم پر ہوتا ہے جس کا کوئی خارجی ذریعہ اور وسیلہ نہ ہو بلکہ آدمی کی اپنی ذات اور اپنے عین میں اس کی صلاحیت موجود ہو۔ یہی وہ مفہوم و مراد ہے جسے ذہن میں رکھتے ہوئے علمائے حق برابر کہتے آئے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں اور خود قرآن ہانکے پکارے کہہ ہی رہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی علم غیب کا حامل نہیں۔ اسی قرآن سے معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ نے بے شمار امورِ غائبہ کا علم اپنے رسولوں کو عطا کیا اس کے باوجود اگر وہ بلا تکلف یہی اعلان کرتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں تو آپ سے آپ ثابت ہو جاتا ہے کہ امورِ غائبہ کا جو علم اللہ نے اپنے بعض بندوں کو زیادہ اور بعض کو کم عطا کیا اس پر علم غیب کا اطلاق ہی نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو صریح طور پر وسیلے اور ذریعے سے پہنچ رہا ہے۔ یہ خصوصیت صرف اور صرف اللہ کی ہے کہ اگلی اور پچھلی ہر چیز براہِ راست اسکے علم میں ہے۔ وہ کسی خارجی ذریعہ کا رہینِ منت نہیں۔ اس کی عین ذات میں یہ وصف موجود ہے کہ کائنات کی ہر موجود اور سابق و لاحق شے اس کے علم میں رہے۔ اس خصوصیت میں کوئی بھی اس کا شریک و سہیم نہیں۔ حضورؐ کی اپنی ذات اور اپنی حقیقتِ بشری اور اپنے وجودِ نوعی میں ایسی کوئی صفت نہیں تھی اور نہیں ہو سکتی کہ آپ سے آپ سارے غیوب ان کی نظروں کے سامنے رہیں۔ مولانا عاقل صاحب خود تسلیم فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو علم غیب سے سرفراز کیا تھا تو اس کے سوا کیا مطلب نکلا کہ جس علم کا نام انھوں نے "علمِ غیب" رکھا ہے وہ حقیقتاً وہ علم غیب ہے ہی نہیں جس میں بحث کی جاتی ہے اور جو قطعی طور پر اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ اگر محض لغت کے پیچھے دوڑا جائے تب تو بلا تکلف اُس نجومی اور جادوگر اور ماہر موسمیات کو بھی "عالم الغیب" ماننا پڑے گا جو بارہا کتنے ہی امورِ غائبہ کا انکشاف کر دیتا ہے۔ اور ہم سب بھی عالم الغیب ہی قرار پائیں گے کیونکہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جسے بے شمار ایسے مقامات اور احوال اور امور کا علم

جنھیں ہم نے غائبانہ جانا ہے خود جا کر نہیں دیکھا۔
یہی بات یہ ہے کہ اہلِ بدعت یا اہلِ ہنود کی کچھ بھی کے لئے آپ کوئی نرم یا گھوم پھیر والی ٹکنک استعمال کریں کرلیں تو کرلیں دگرنہ سیدھی بے لاگ اور واحد قطعی بات تو صاف صاف یہی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں اور مولانا عاقل صاحب نے یہ بات محض عوام الناس کو بہلانے کے لئے فرمادی ہے کہ :-

"غیب کا علم حضورؐ کو تھا۔ یہی عقیدہ اہلِ سنت والجماعت کا ہے۔"

ہماری معلومات میں اضافہ ہوگا اگر مولانا علمائے سلف میں سے چند اُن بزرگوں کا نام بھی دیں گے جنھیں اہلِ علم عقیدۂ اہلِ سنت والجماعت کا ترجمان اور نمائندہ تسلیم کرتے ہوں۔ ہم نے تو صحابہ، تابعین، ائمہ اربعہ، فقہائے علام، مقتدیانِ تبحیرا ور محدثین عظام کسی کے یہاں بھی یہ قول نہیں پایا کہ "رسول اللہ عالم الغیب تھے۔" حالاں کہ یہ سب حضرات بھی بلاریب یہ ایمان رکھتے تھے کہ اللہ نے بے شمار اُمورِ غائبہ کا علم رسول اللہؐ کو عطا فرمایا۔

کافی دنوں سے یہ فیشن بہت چل رہا ہے — اور بریلوی مکتبِ فکر کو اس کا تقریباً موجد سمجھنا چاہیئے کہ چند اوندھی سیدھی دلیلیں کسی عقیدے کے لئے پیش کیں اور بلا تکلف دعویٰ کر دیا کہ یہی اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔ اس سے جہلاء پر رعب ضرور پڑ جاتا ہے لیکن اہلِ علم تحقیق کے لئے ایسی حرکاتِ خفیفہ کا کوئی وزن نہیں۔

ہم مولانا عاقل صاحب کے لئے حسنِ ظن رکھتے ہیں لیکن ہمارا یہ بھی پختہ خیال ہے کہ جو شخص سورۂ نجم کی آیت "قاب قوسین" سے اللہ اور حضورؐ کا درمیانی فاصلہ نکالے اس کی فکر میں کہیں نہ کہیں کجی ضرور ہے۔ اس کے منہ کو توہمات کی چاٹ لگ گئی ہے اور علم کے بجائے وہ مبالغہ آرائی کی راہ چل نکلا ہے۔ آیت اپنے سیاق و سباق میں اتنی صاف ہے کہ جس کا ذہن مریض نہ ہو وہ کسی طرح بھی یہ مغالطہ نہیں کھا سکتا کہ آیت میں کن دو ہستیوں کا فاصلہ

بیان کیا جا رہا ہے۔

حضورؐ اپنی قبر میں

سوال :- از - احمد اللہ خان بسمل - (ضلع ناگپور)
مولانائے محترم - السلام علیکم - کوئی شریف الحق امجدی اپنی کتاب "التحقیقات لدفع التلبیسات" کے آخری صفحوں میں یوں رقم طراز ہیں کہ اعلیٰ حضرت بریلوی سے کسی سائل نے یہ سوال کیا کہ "اولیاءِ کرام کی حیاتِ برزخیہ اور انبیاءِ کرام کے بعدِ وصال حیات میں کیا فرق ہے؟"۔ اس کے جواب میں اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ "اولیائے کرام کی حیاتِ برزخیہ پر دنیوی احکام جاری نہیں اور انبیاءِ کرام کی حیات بعدِ وصال پر دنیوی احکام جاری ہیں۔ اولیاءِ کرام کا ترکہ تقسیم ہوگا۔ انبیاءِ کرام کا ترکہ ورثہ میں تقسیم نہیں ہوگا۔ اولیاءِ کرام کی ازواج پر عدت ہے۔ انبیاءِ کرام کی ازواج پر عدت نہیں۔ اولیاءِ کرام کی ازواج بعدِ عدت عقدِ ثانی کر سکتی ہیں۔ انبیاءِ کرام کی ازواج بعدِ عدت بھی عقد نہیں کر سکتیں۔ اس فرق کی تائید مزید توضیح کے لئے فرمایا کہ علامہ سید عبدالباقی زرقانی فرماتے ہیں کہ "انبیاءِ کرام کی قبورِ مطہرہ میں ازواجِ مطہرات پیش کی جاتی ہیں اور وہ اُن کے ساتھ شب باشی فرماتے ہیں۔ اولیاءِ کرام کے لئے یہ بات نہیں۔" (الملفوظ حصہ سوم صفحہ ۳۰) — اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے جو کچھ فرمایا اس کی سند صاحبِ التحقیقات والتلبیسات نے صفحہ ۱۶۷ پر اس طرح دی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :-

"سبکی نے اپنی طبقات میں ابن فورک سے نقل کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبرِ انور میں حقیقی حیات کے بلا شائبہ مجاز زندہ ہیں۔ اذان اقامت کے ساتھ نماز ادا فرماتے ہیں۔ ابن عقیل حنبلی نے فرمایا اور اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ ہمبستری فرماتے ہیں اور ان سے دنیا میں جو تمتع حاصل فرماتے تھے اس سے بڑھ کر تمتع حاصل فرماتے ہیں

وہ اپنے بہ حلف بیان کرتے تھے کہ علامہ
زرقانی فرماتے ہیں بظاہر اس سے کچھ مانع
نہیں۔" (زرقانی جلد سادس صفحہ ۱۶۹)

اب سوال یہ ہے کہ علامہ زرقانی اور اعلیٰ حضرت
ریلوی کے یہ مندرجات کیا واقعی حقائق پر مبنی ہیں کہ
ن پر تکیہ کیا جائے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن میں ان
نوں کی کچھ نشاندہی کی ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کسی حدیث میں ایسا بیان آیا ہے؟

جواب:-

اب سے چودہ سو برس پہلے سرزمینِ مکہ پر ایک بچہ
ن کا نام محمدؐ ہے اپنی ماں کے پیٹ سے اسی طرح پیدا
تا ہے جس طرح دوسرے سب انسان پیدا ہوتے ہیں۔
ر ساٹھ سے کچھ اوپر سال گذارنے کے بعد وہ اسی طرح
ض الموت میں گرفتار ہوتا ہے جس طرح اور لوگ
تے آئے ہیں۔ کبھی اس شخص کو دشمنوں نے زہریلی غذا
ی تھی۔ اس کے چکھنے کا اثر اب بھی اس کے جسم میں کہیں
ہیں موجود ہے۔ بخاری کتاب المغازی میں خود رسولِ
رم کا یہ فرمودہ دیکھا جاسکتا ہے کہ اے عائشہ! خیبر کی
خ کے موقعہ پر مجھے جو زہریلا گوشت کھلایا گیا تھا اس کے
ھ نہ کچھ موذی اثرات تو میں برابر ہی محسوس کرتا رہا
وں لیکن اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس زہر کی
اثیر میری رگِ جاں ہی کاٹ ڈالے گی۔

اس وقت حضورؐ کو شاید بخار ہے اور پھر نزع
کیفیات سے گذر کر آپؐ اسی طرح سرد لاشے میں تبدیل
ہو جاتے ہیں جس طرح دوسرے انسان ہوتے ہیں۔ عین
ہی حالت جس کا نام "موت" ہے۔ فرشتۂ اجل نے
ح کو جسم سے الگ کیا اور پھر آپؐ کے اعزا نے آپ کو
ی طرح زیرِ زمین دفن کر دیا جس طرح دوسرے مرنے والوں
کیا جاتا ہے۔

یہ ہے وہ تاریخی حقیقت جس سے انکار کیا ہی نہیں
جاسکتا ہے۔ اس حقیقت کی جملہ تفصیلات قوی سندوں
کے ساتھ محفوظ ہیں اور اسی کے ساتھ کچھ اور دلائل بھی
محفوظ ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کو مستثنیٰ
کرکے باقی تمام ابنائے آدم کی طرح اللہ کا آخری رسولؐ
بھی موت سے ہمکنار ہوا اور اپنے جسم کے مطابق بنی ہوئی
قبر میں چھپا دیا گیا۔

موت نام ہے جسم سے روح کے نکل جانے کا۔ روح
نکالنے کا کام اللہ نے ایک فرشتے کے سپرد کیا ہے۔ اسی
فرشتے نے حضورؐ کی بھی روح نکالی جسے محاورے میں
"روح قبض کرنا" کہتے ہیں۔ اس طرح یہ بات شک سے
بالاتر ہو جاتی ہے کہ ہر فردِ بشر کی طرح حضورؐ نے بھی انتقال
فرمایا۔ انتقال کے بعد آپؐ کی روحِ شریفہ کو کبھی کبھی آپ
کے جسمِ مبارک میں منتقل کر دیا جاتا ہے یا مستقلاً وہ منتقل
کر دی گئی ہے یہ بحثیں محض تخمین و قیاس کے بل پر اٹھائی
گئی ہیں اور اس سلسلے میں جتنی بھی احادیث سے کام
لیا جاتا ہے وہ نہ تو اتنی قوی ہیں کہ یقین کا فائدہ دے
سکیں نہ اپنے معنی و مطلب کے اعتبار سے اتنی صریح اور
قطعی ہیں کہ ان پر کسی عقیدے کی بنیاد رکھی جاسکے۔

کچھ حضرات نے جن میں ہمارے اپنے بعض اساتذہ
اور مشائخ شامل ہیں اپنے اس خیال کے لئے کہ حضورؐ کو
قبر شریف میں دنیاوی زندگی حاصل ہے دو دلیلوں کو
بہت زور و شور سے پیش کیا ہے۔ ایک یہ کہ آپؐ کا ترکہ
تقسیم نہیں ہوا۔ دوسرے یہ کہ آپؐ کی بیویاں کسی اور سے
شادی نہیں کر سکتیں۔

ہم ان دلیلوں پر بارہا کلام کر چکے ہیں۔ جہاں تک
ترکہ کا تعلق ہے خود حضورؐ نے یہ قاعدہ بیان فرمایا ہے کہ
ہم گروہِ انبیاء نہ تو دوسروں کے وارث بنتے ہیں نہ ہمارا
کوئی وارث بنتا ہے۔ یہ گویا ایک خصوصیت ہوئی انبیاء
کی۔ اس کی علت یہ قرار دینا کہ انبیاء مرے ہی نہیں
اور برابر زندہ چلے آرہے ہیں محض خیال و گمان ہے جو
دلیل کا درجہ نہیں لے سکتا۔ اسی طرح حضورؐ کی ازواج سے

نکاح کی ممانعت بھی دوسری وجوہ سے ہو سکتی ہے۔ مثلاً قرآن ہی میں اللہ نے جتلا دیا ہے کہ رسول ؐ کی ازواج امت کی مائیں ہیں۔ یہی تنہا وجہ اس کے لئے کافی ہے کہ ان سے کوئی نکاح نہ کر سکے۔

ہم یہاں "حیات النبی" کے مسئلہ پر بحث کرنا نہیں چاہتے۔ نہ ہمارا مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ مرنے کے بعد انبیاء کا حال بھی عام انسانوں جیسا ہے۔ نہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء کے اجسام ان کی قبروں میں محفوظ رہتے ہیں اور یہ بھی بعید نہیں کہ جو روحیں موت کے وقت ان کے اجسادِ مبارکہ سے علیحدہ کر لی گئی تھیں انھیں کبھی کبھی ان کے اجساد کی طرف پھر لوٹا دیا جاتا ہو۔ یا لوٹائے بغیر ہی ان کا رابطہ کسی نامعلوم انداز میں جسموں سے قائم ہو۔ یہ سب ممکن ہے۔ لیکن اس طرح کی صورتوں میں جو بھی زندگی انبیاء کو ان کی قبروں میں حاصل ہوگی وہ وہ نہیں ہو سکتی جسے ہم "دنیاوی" زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دنیاوی زندگی کے بقا کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں ان کا تصور قبر کے اندر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے انبیاء کی قبور کو اتنا وسیع کر دیتا ہے کہ وہ اس میں کسی وسیع کمرے یا صحن کی طرح چل پھر سکیں۔ نمازیں پڑھ سکیں۔ نقل و حرکت کر سکیں تب بھی یہ عالم الغیب اور عالم اسرار کی باتیں ہوں گی۔ انھیں مادی تصورات اور دنیاوی تعبیرات سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ ان کیلئے یا تو عالم مثال یا عالم برزخ جیسی مرموز و مبہم اصطلاحات استعمال کی جائیں گی یا صاف کہہ دیا جائے گا کہ اللہ کے راز اللہ ہی جانے۔

اس تمہید کے بعد اب اصل سوال کی طرف آئیے۔ علامہ قسطلانی کی المواھب اللدنیۃ ایک مشہور کتاب ہے اور زرقانی نے اسے شرح سے مزین کر کے ضخیم مجلدات میں تبدیل کر دیا ہے۔ زرقانی بلاشبہ بڑے عالم تھے اور یہ شرح ان کے تبحرِ علمی، وسعتِ مطالعہ اور فہم و دراست کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ لیکن جیسا کہ مسلمات میں سے ہے اللہ اور رسول ؐ کے سوا کوئی معصوم نہیں۔ ہر ایک سے غلطی کا صدور ممکن بلکہ واقع ہے لہٰذا ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ابن عقیل حنبلی کا ایک بے دلیل اور بے بنیاد خیال نقل کر کے انھوں نے خطا کی ہے اور پھر یہ کہہ کر تو اس خطا کو اور بھی دو آتشہ بنا دیا ہے کہ "بظاہر اس سے کچھ مانع نہیں۔"

ابن عقیل حنبلی نہ نبی تھے نہ صحابی۔ وہ اگر اپنے کسی ذاتی خیال پر ٹھیک دیوارِ کعبہ کے نیچے ہزار حلف بھی اٹھا لیں تو اس سے اس خیال کی صحت کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا۔ یہ خبر اور روایت کا معاملہ نہیں عقیدے اور فکر کا معاملہ ہے۔ خدا جانے ان کی طرف حلف کی نسبت ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ بہرحال اُمورِ غیب کے بارے میں کوئی بھی رائے مضبوط شہادت اور دلیل چاہتی ہے۔ اعلیٰ حضرت بریلوی ہوں یا دیوبند کے کوئی شیخ ہوں یا حرمین شریفین کے کوئی علامہ۔ اصول و قواعد سب کے لئے یکساں ہیں۔ کوئی ان میں ایسا نہیں جس کی ذاتی رائے اور خوش فہمی عقائدِ شرعیہ میں حجت بن سکے۔

حضور ؐ کے لئے ان کی قبر شریف میں ایک خاص قسم کی زندگی کا عقیدہ رکھنے کے بجائے یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ عین دنیاوی زندگی ہے بجائے خود کافی بحث طلب ہے لیکن اس سے دو قدم آگے بڑھ کر یہ تک کہہ گزرنا کہ آپ ؐ اپنی قبر میں بیویوں سے ہم بستری بھی فرماتے ہیں، ہمارے نزدیک انتہائی نازیبا جسارت ہے جسے شاعری کی مذموم اقسام میں شمار کیا جانا چاہیئے۔ اس کا تو کھلا مطلب یہ ہوا کہ صرف حضور ؐ ہی کو نہیں ان کی تمام مرحومہ بیویوں کو بھی دنیاوی زندگی حاصل ہے اور وہ برابر اس پوزیشن میں ہیں کہ اللہ کا رسول ؐ اپنی قبر میں ان سے جنسی استفادہ کر سکے۔

العیاذ باللہ۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جو تائیدی فقرہ زرقانی کی شرح میں نظر آ رہا ہے وہ واقعی زرقانی کا ہے یا کسی منچلے نے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔ ہمارے خیال میں تو زرقانی اس قدر توہم پرست، شاعر مزاج اور بد مذاق نہ ہونے چاہئیں کہ ایسی لغو اور غیر مناسب بات انھیں مضائقے اور حرج سے خالی نظر آئے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ نے جنسی تعلق کو افزائشِ نسل کے مقصد پر استوار کیا ہے۔ دوسری مصلحت اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان لذتوں کا نمونہ دکھلائے جو بہشت میں نصیب ہونے والی ہیں۔ یہ دونوں مصالح ان زندوں سے مربوط ہیں جو قبر کے اندر نہیں صفحۂ گیتی پر زندگی گذار رہے ہیں۔ اللہ کا رسولؐ بہر حال سینۂ ارض پر تو ہے نہیں۔ بطنِ ارض میں مدفون ہے لہٰذا اس کے لئے اللہ ہمبستری کا بھی انتظام کرے گا یہ خلافِ قیاس بھی ہے اور معیار سے گرا ہوا بھی۔

بہر حال اعلیٰ حضرت بریلوی دنیا سے جا چکے۔ انھوں نے اپنے دینی عقائد کے لئے محض ہوائی باتوں کو بھی کافی سمجھ لیا یہ ان کا ذاتی فعل تھا ہماری دعا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور غفران و رحمت سے نوازے۔ خود ہمارے شیوخ میں بھی ایسے خیالات عنقا نہیں جن کی عمارت کمزور روایتوں یا خیالی قیاس آرائیوں پر کھڑی ہے۔ ہم بہر حال یہ پسند کرتے ہیں کہ جن امور پر عائشہ اور اسرار مکنونہ کی وضاحت اللہ اور رسولؐ نے بے غبار طریقے پر نہیں کی اور امت کو ان کے پیچھے لگنے کی ہدایت نہیں فرمائی ان کے سلسلے میں سکوت اور ذہنی بے تعلقی اختیار کی جائے۔ شریعت کا کوئی عقیدہ اور عمل اس پر منحصر نہیں کہ قبرِ رسولؐ کے اندر جھانکا جائے اور طے کیا جائے کہ وہاں اللہ کا رسولؐ کیسی زندگی گذار رہا ہے۔

اسلامی نظام اور حجرِ اسود

سوال ۳: سائل۔ غلام قادر۔ کشمیر۔

ہمارے ہندو بزرگ مندروں میں بت پرستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس سے تو ہم واقف ہی ہیں۔ اگر وہ لوگ ہم سے کوئی سوال پوچھتے اور جواب ہم سے نہ مل سکتا تو بات قابلِ افسوس نہ تھی۔ مگر اب مسلمان ہندوؤں کے دکیل نظر آتے ہیں۔ اسلامی نظام کی بات کی جائے اور کوئی غیر مسلم ٹھکر سوال کرے کہ ہم کو اسلام کے نظام میں یہ اور یہ مشکلات پیش آئے گی اس کا حل کیا ہے؟ تو یہ قابلِ فہم ہے۔ مگر خود بعض مسلمان کہتے ہیں کہ ہندوؤں کا کیا بنے گا!

نیز ہمارا ایک دوست کہتا ہے کہ تم بت کے سامنے جانے والے ہندو کو بت پرست کہتے ہو۔ مگر حجرِ اسود کے سامنے تم جو کچھ کرتے ہو۔ وہ بھی تو بت پرستی ہی ہے! انھوں نے قصص الانبیاء پڑھی ہے تو ان سوالوں کا جواب دیجئے۔

(۱) کیا حجرِ اسود پتھر ہی ہے۔ یا کوئی ملک۔

(۲) حجرِ اسود کو بوسہ دینا مذہب میں کیا اہمیت رکھتا ہے اگر اسے بوسہ نہ دیا جائے یا اس کی طرف جھکا نہ جائے تو کیا کچھ گناہ ہوگا۔ ہم نے سوال کرنے والے سے کہہ دیا تھا کہ حجرِ اسود کو بوسہ دیتے وقت ہمارے ذہن میں وہ تصور نہیں ہوتا ہے جو بت پرست کے ذہن میں ہوتا ہے۔ ان کا جواب ہے کہ پھر اگر بوسہ دینا چھوڑ دو تو کیا حرج ہے؟

جواب ۳:-

سوال کے دو جزو ہیں۔ بالترتیب جواب یہ ہے:-

اسلامی نظام کیا ہے اور اس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ذمہ داریاں، فرائض اور حقوق کیا ہوں گے یہ سب قرآن، حدیث اور علماءِ حق کے فرمودات میں موجود ہے۔ ہمارے زمانے میں اسلامی نظام کی تحریک اور دعوت کا مقدس فریضہ جس بندۂ مومن نے پوری استقامت اور لگن اور تسلسل کے ساتھ ادا کیا اس کا مشہور نام ہے سید ابو الاعلیٰ مودودی۔ اس شخص نے اس کام کو نظم و ضبط اور باہمی تعاون و اشتراک کے ساتھ آگے بڑھانے کے لئے ایک جماعت قائم کی جس کا نام ہے "جماعتِ اسلامی" اور اپنی عالمانہ تحریروں کے ذریعہ دنیا کو بتایا کہ اسلامی نظام کیا ہے اور اسے قائم کرنے کے لئے کن خطوط پر جد و جہد کرنی چاہیئے۔

پھر ہندوستان تقسیم ہوا اور دونوں حصوں کی جماعتِ اسلامی بھی تقسیم ہو گئی۔ ہند و پاک کے حالات الگ الگ تھے۔ پاکستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اور

ہندوستان میں ایسی مخلوط حکومت جس میں غلبہ بہرحال غیر مسلموں ہی کا تھا اور ہے۔ پاکستان میں آبادی کی اکثریت اہلِ اسلام پر مشتمل رہی اور ہندوستان میں غیر مسلموں پر۔ اسی اعتبار سے دونوں ملکوں کی جماعتِ اسلامی کا محاذ و میدان بھی بدل گیا۔ پاکستان میں تو اس کے کرنے کا کام یہ رہ گیا کہ اپنی مسلم حکومت سے وہ قانون نافذ کرائے جسے اسلامی قانون کہتے ہیں اور جسے نافذ کرنے کی ہدایت اللہ تعالیٰ نے دی ہے لیکن ہندوستان میں اب اس کا سوال ہی موجودہ مرحلے میں پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ غیر مسلموں سے آخر یہ مطالبہ کیسے کیا جاسکتا ہے کہ آپ قانون کو اسلامی بنائیں۔ یہاں جماعتِ اسلامی جو کچھ کرسکتی تھی یہی کرسکتی تھی کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو اسلام سے وابستہ رہنے اور غیر اسلامی تصورات سے بچنے کی تلقین کئے جائے۔ انھیں ان کی اصلی حیثیت یاد دلاتی رہے۔ ان سے کہے کہ اپنے اسلامی اخلاق کا تحفظ کرو اور اپنے کردار کو اتنا عمدہ بناؤ کہ غیر مسلم اس پر فریفتہ ہوں اور ان کے قلوب میں اسلام سے حسنِ عقیدت پیدا ہو۔ نیز یہ نہ بھولو کہ تم ایک ایسی امت ہو جسے دنیا میں اس لئے برپا کیا گیا ہے کہ اللہ کے بندوں کو اچھی باتوں کی ترغیب دیتی رہے اور بری باتوں پر ٹوکتی جائے۔

یہی کام یہاں کی جماعتِ اسلامی اپنی استطاعت اور فہم کی حد تک بحسن و خوبی انجام دے رہی ہے۔ غلطیاں کس انسانی کام میں نہیں ہوتیں۔ عجب نہیں کہ جماعتِ اسلامی والوں سے بھی کچھ غلطیاں سرزد ہو جاتی ہوں لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ جس طرح کے نامساعد اور حوصلہ شکن حالات ہم سب کے سروں پر اپنا شامیانہ تانے ہوئے ہیں ان میں جماعتِ اسلامی ہند کا کردار بڑا سلیقہ مندانہ اور دور اندیشانہ ہے۔ وہ کچھوے کی چال سے اپنی راہِ مستقیم پر چلی جارہی ہے حالانکہ سنگین قسم کی رکاوٹیں راستے میں اس قدر ہیں کہ کچھوے کی چال چلنا بھی انتہائی دشوار ہی کہا جاسکتا ہے۔

بحالاتِ موجودہ اس کی ضرورت ہی نہیں ر[...]
کہ "نظامِ اسلامی" پہ بحث کی جائے اور کسی غیر مسلم[...]
تشویش ہو کہ "نظامِ اسلامی" میں ہمارا کیا بنے گا۔ حقیق[...]
کسی غیر مسلم کو یہ تشویش ہے بھی نہیں۔ یہ تو دراصل بعض[...]
مسلمانوں کو "تشویش" ہے جو اپنے غیر اسلامی کردار او[...]
بیزار ذہن پر پردہ ڈالے رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً[...]
اسلامی پر اعتراض وطعن کو ضروری خیال کرتے ہیں[...]
اس طرح کے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں جن سے اس جما[...]
کے خلاف فضا پیدا ہو۔ ان کی زباں درازیاں علم[...]
سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ یہ بے چارے تو واقف[...]
نہیں ہیں کہ اسلام حقیقت میں ہے کیا اور اسلامی[...]
کس چیز کو کہتے ہیں۔ انھیں دنیا چاہیئے۔ عیش و آرا[...]
منصب اور دولت چاہیئے۔ یہ چیزیں اکثریت کا وفا[...]
بن کر ہی حاصل ہو سکتی ہیں اور اکثریت کی وفاداری[...]
اظہار اس سے بڑھ کر کس طرح ہو سکتا ہے کہ جماع[...]
اسلامی پر اعتراض کئے جاؤ۔ نظامِ اسلامی پر طنز ک[...]
اور اسلامی احکام کے خلاف شکوک پھیلائے جاؤ۔
آپ کو ہمارا مشورہ ہے کہ ایسے حضرات کو شور[...]
کرنے دیجئے اور اپنے کام سے کام رکھئے۔ آپ ا[...]
اُلجھ کر خواہ نخواہ اپنا وقت برباد کریں گے۔

(۲) حجرِ اسود ایک چھوٹا سا پتھر ہے جو دیوارِ کعبہ [...]
ساتھ ایک بلند مقام پر رکھا ہوا ہے۔ اس کے تعلق[...]
کبھی کبھی اس طرح کے واہی اعتراضات اور طعن سن[...]
آتے رہتے ہیں جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔
آپ نے اپنے جس دوست کا ذکر کیا ظاہر ہے[...]
ایک بے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ پڑھا لکھا آدمی وہ[...]
ہے جس نے کچھ علوم باقاعدہ پڑھے ہوں اور عمر کا ا[...]
تحصیلِ علم میں صرف کیا ہو۔ قصص الانبیاء جیسی کت[...]
تو عموماً وہ لوگ پڑھتے ہیں جن کی قابلیت پرائمر[...]
کے بچوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ اگر علمِ دین کے سل[...]
کوئی اعتراض اٹھائیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک[...]

سائنسی مسائل پر زبان درازی کرنے لگے۔ انھوں نے حجرِ اسود کے تعلق سے جو کچھ کہا وہ ذرا بھی قابلِ توجہ نہ تھا مگر اور بھی کچھ لوگ چونکہ اس طرح کا ہذیان کرتے رہتے ہیں اس لئے جواب عرض کیا جاتا ہے۔

بُت پرست اپنے بت کے آگے پجاری کی حیثیت سے جاتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ بت دیوتا ہے یا اوتار۔ اس کے نزدیک پتھر کی اس مورتی میں بعض ایسی صفات پائی جاتی ہیں جو اللہ کے ساتھ خاص ہیں۔ اس کے آگے وہ ماتھا ٹیکتا ہے۔ اس سے مرادیں مانگتا ہے۔ یہ محض ایک جسمانی رویّہ نہیں بلکہ ذہنی اور اعتقادی رویّہ ہے اور اس کا خلافِ توحید ہونا دو اور دو چار کی طرح صاف ہے۔

اس کے برخلاف حجرِ اسود کسی مورتی اور بُت کا نام نہیں بلکہ وہ تو ایک ناتراشیدہ پتھر ہے جسے اللہ کے گھر کا طواف کرتے وقت صرف پیار کیا جاتا ہے۔ پیار کرتے ہوئے ایسا کوئی تخیّل اور عقیدہ مسلمان کے ذہن میں نہیں ہوتا کہ اس پتھر میں کوئی طاقت اور اختیار ہے یہ نقصان یا نفع پہنچا سکتا ہے۔ اس سے کسی قسم کی مدد لی جاسکتی ہے۔ اسی لئے پیار کے سوا اور کوئی بھی ایسا عمل اس پتھر کے تعلق سے وہ نہیں کرتا جسے پوجا اور عبادت کے خانے میں فٹ کیا جاسکے۔

حجرِ اسود کو چومنے کی حیثیت اسلامی شریعت میں کیا ہے یہ بھی سُن لیجئے۔ یہ فرض ہے نہ واجب۔ اگر کوئی حاجی اسے چومے بغیر حج پورا کرلے تو حج بلاشبہ ادا ہوجاتا ہے۔ اس پر نہ تو دنیا میں کوئی جرمانہ عائد ہوتا ہے نہ آخرت میں عذاب ہے۔ چومنا بہت سے بہت سنت ہے یعنی ایسا عمل کہ اس کے کرنے میں ثواب ہے مگر نہ کرنے میں عذاب نہیں۔ اسی لئے شریعت کا حکم یہ ہے کہ زیادہ بھیڑ یا کسی اور وجہ سے اگر حجرِ اسود کو بوسہ دینا مشکل ہو تو صرف ہاتھ سے چھوکر ہاتھ چوم لیا جائے۔ ہاتھ سے چھونے کا بھی معاملہ مشکل ہو تو کسی لکڑی وغیرہ سے چھوکر یہ لکڑی چوم لی جائے۔ یہ تک نہ کیا تب بھی حج میں کوئی خامی نہیں۔

بتائیے کیا اس اختیاری چومنے میں اور بتوں کی پوجا پاٹ میں کوئی دُور کی بھی مناسبت ہے؟

آدمی پاگل پن پر اُتر آئے تو وہ بلا تکلف کہہ سکتا ہے کہ انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں دو دو آنکھیں اور دو دو کان رکھتے ہیں۔ دونوں کے بدن پر کھالیں ہیں اور جسم میں خون۔ دونوں کا جسمانی نظام ہڈیوں سے معمور ہے دونوں کھانے پینے کے محتاج ہیں اور دوسری بہت سی باتوں میں ان کے مابین یکسانیت پائی جاتی ہے۔ لیکن ہر ذی عقل جانتا ہے کہ ایسی مشابہتوں سے آدمی اور جانور ایک صف میں کھڑے نہیں کئے جاسکتے۔ اسی طرح اگر بُت اور حجرِ اسود کے درمیان صرف اتنی سی مشابہت پائی جاتی ہے کہ دونوں پتھر ہیں تو اس مشابہت کی بنا پر حجرِ اسود کے چومنے کو بُت پرستی جیسا کہہ ڈالنا دیوانے کی بڑ کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔

آپ اور ہم اور تمام غیر مسلم کیا اپنے بچوں کو نہیں چومتے؟ چومنا تو پوجا اور عبادت کے دائرے کی چیز نہیں بلکہ محبت اور اُنس کے دائرے کی چیز ہے۔ اگر آپ اپنے ننھے صاحبزادے کو گود میں لیکر پیار کررہے ہوں تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ صاحبزادے کی پوجا کررہے ہیں؟ اگر نہیں کہہ سکتا تو آخر حجرِ اسود کے سلسلہ میں اس سے زیادہ کس نے کیا سن لیا ہے کہ مسلمان دورانِ حج میں اسے پیار کرتے ہیں۔

پیار کیوں کرتے ہیں یہ بھی سُن لیجئے۔ اس پتھر سے بعض ایسی روایات منسوب ہیں جن سے اس پتھر کا مقدس و مبارک ہونا قیاس میں آتا ہے۔ تقدس اور برکت کا مطلب کسی پر پوشیدہ نہیں۔ ماں باپ کے پاؤں تک سعادتمند اولاد کے لئے مقدس اور بابرکت ہیں۔ استاد اور گرو اور شیخ سب میں تقدس پایا جاتا ہے۔ کسی مندر یا مسجد یا گردوارے یا گرجا کے اندرونی فرش کو بھی تمام اہلِ مذہب اس حد تک مقدس اور بابرکت مانتے ہیں کہ اس پر جوتے اُتار کر چلتے ہیں اور وہاں پیشاب کرنا یا گندگی پھیلانا ہرگز گوارا نہیں کرتے۔ تقدیس کے اس تصور میں نہ کوئی شرک ہے

قلی۔ اسی طرح حجرِ اسود کو بعض روایات کی بنا پر مقدس
یوب سمجھنا نہ شرک ہے نہ بد عقلی۔ اللہ کے آخری رسولؐ
سے بوسہ دیا اس لئے بوسہ دینا سنت قرار پایا۔ بوسہ
سمجھ ہی چکے کہ افعالِ عبادت میں سے نہیں بلکہ اظہارِ
ت کا ایک طبعی اور معروف طریق ہے۔ اور یہ بھی سمجھ
کہ مسلمان حجرِ اسود کے متعلق ایسا کوئی بھی تصور نہیں رکھتے
ثبت کے پجاری بُت کے متعلق رکھتے ہیں لہٰذا ظاہراً
یدۃً نہ قیاساً نہ معناً کسی بھی اعتبار سے دونوں چیزوں
کوئی ہم آہنگی اور یکسانی اور مشابہت نہیں۔
یہ ہم عرض کر ہی چکے کہ حجرِ اسود کا بوسہ نہ فرض ہے
واجب۔ حج اس کے بغیر بھی ادا ہو جاتا ہے لہٰذا یہ فعل ایسا
ہی نہیں جس کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا ہو کہ جس طرح
بُت پرست باقاعدہ ارادہ کر کے بُت کی خدمت میں
ہر ہوتا ہے اسی طرح مسلمان بھی باقاعدہ ارادہ کر کے
سود کی "خدمت" میں حاضر ہوتے ہیں۔ وہ حج کرنے
تے ہیں اور اس کے ایک ذیلی جزو کی حیثیت سے حجر
د کو چومتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ جس فعل کو خود رسول اللہؐ
لیا ہو اس سے مسلمان پرہیز کرے اور حجرِ اسود کو قصداً
نہ دے۔ جو حضرات یہ چاہتے ہیں کہ بوسہ کا یہ عمل
کر دیا جائے وہ اگر مسلمان ہیں تو ان سے پوچھئے کہ آپ
اسلام کا سرچشمہ اور ماخذ کیا ہے۔ آپ اسلام کی کیا
یف سمجھتے ہیں۔ آپ نے کتنا وقت اسلام کو سمجھنے اور اس کے
کام کی حقیقت و حکمت جاننے میں صرف کیا ہے؟
اور اگر غیر مسلم ہیں تو ان سے عرض کیجئے کہ کیا فقط یہی
عمل ایسا رہ گیا ہے جس پر آپ کو اعتراض ہے اور باقی
ے اسلام سے آپ متفق ہیں؟ اور کیا آپ بُت پرستی سے
کا اعلان فرما دیں گے اگر مسلمان یہ کہہ دیں کہ ہم آئندہ حجر
د کو نہیں چومیں گے؟
جس وقت آپ یہ عرض کریں گے اس وقت آپ پر
قت کھلے گی کہ اعتراض کرنے والے حضرات نہ تو طالبِ حق
نہ دیانتدار اور معقولیت پسند بلکہ محض جھکی اور متعصب
اور بدنیت ہیں جن سے بحث میں وقت برباد کرنے کے سوائے
زیاں کے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔

خلاصہ جواب کا یہ ہے کہ آج کا دَور فتنوں کا دَور
ہے۔ شیطان خوب خوب کھل کھیل رہا ہے۔ آپ اپنی عاقبت
محفوظ رکھنا چاہیں تو فضول قسم کے دوستوں سے بچتے ہوئے
خدا پرست لوگوں کی صحبت میں بیٹھئے، اچھی مستند کتابیں
پڑھئے اور اپنے کردار و عقائد کو بہتر بنانے پر پورا دھیان
دیجئے۔

غیر ضروری سوالات

سوال:- از- ولایت علی- حیدرآباد۔
رام کرشنا آشرم کے طلباء دریافت کرتے ہیں کہ۔
"نماز روزانہ پانچ وقت کیوں پڑھی جاتی ہے؟ اور نمازِ فجر
دو رکعت، نمازِ مغرب تین رکعت، نمازِ ظہر و عصر و عشاء چار
چار رکعت پڑھنے کی کیا مصلحت ہے؟ اور سب سے آخری
نماز واجب الوتر تین رکعت رکھنے کا کیا مقصد ہے؟ اس
کے معقول منطقی جوابات دیئے جائیں"۔

۲۔ ایک مسلمان صاحب دریافت کرتے ہیں کہ "حضور
اکرم صلعم قعدۂ نماز میں موجودہ التحیات ہی پڑھتے تھے یا
کچھ اور پڑھتے تھے۔" انھیں حوالۂ حدیث مطلوب ہے۔
براہِ کرم تجلی کے ذریعہ جواب دیا جائے۔

جواب:-

ان طلباء سے یہ دریافت فرمائیے کہ آدمی کے چہرے
پر دو آنکھیں کیوں ہیں جب کہ ایک سے بھی کام چل سکتا ہے۔
ناکیں دو کیوں نہیں۔ ہر ہاتھ پیر میں پانچ پانچ انگلیاں کیوں ہیں
چار چار یا چھ چھ ہوتیں تو کیا حرج تھا۔
اسی طرح آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ آسمان پر اتنے
بہت سے ستارے کیوں پیدا کئے گئے۔ چاند کو سورج کی طرح
ذاتی روشنی کیوں نہ دی گئی تاکہ وہ سورج کا محتاج نہ رہتا۔
بچہ ماں کے پیٹ میں نو دس ماہ کیوں رہتا ہے ایسا کیوں نہ ہوا

کہ چھینہ میں دن میں تولّد پذیر ہو جایا کرتا۔

جو لوگ ہر ہر "کیوں" کا منطقی جواب حاصل کرنے کے چکر میں پڑ جائیں گے وہ ایک ایسی بھول بھلیاں میں پھنس جائیں گے جس سے زندگی بھر نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ ان طلبا سے کہئے کہ خدا کی تخلیقات اور احکامات کے اسباب و وجوہ کو منطقی رُخ سے سمجھ لینا انسان کی چھوٹی سی عقل کے بس سے باہر ہے۔ وہ یہ تک تو سمجھ سکتا نہیں کہ اس کی پیدائش آخر ماں کے پیٹ ہی سے کیوں ضروری قرار دی گئی یوں کیوں نہ ہوا کہ وہ غلّے کی طرح زمین سے اُگتا یا پھلوں کی طرح شاخوں پر لٹکتا۔ لہذا انسان کو اپنی تمام تر توانائی، ذہانت اور دولتِ وقت صرف اس تحقیق و تجسس میں صرف کرنی چاہئے کہ کائنات کے خالق و مالک نے کیا کیا ہدایات دی ہیں کیا کیا احکامات نازل فرمائے ہیں، کن کن افعال و عقائد کو موجبِ سزا قرار دیا ہے اور کن اعمال و افکار پر انعام کا وعدہ فرمایا ہے۔ تحقیق و تجسس کے بعد جو کچھ معلوم ہو اسے سینے سے لگانا اور فرماں بردار بندوں کی طرح زندگی گذارنے کی کوشش کرنا آدمی کی تمام تر سعی و جہد کا محور ہونا چاہئے۔ فضول قسم کے سوالات وقت کی بربادی کے سوا کوئی فائدہ نہیں رکھتے۔

بعض علمائے اسلام نے اگرچہ نماز روزے زکوٰۃ سب کی تفصیلی حکمتیں اور تعداد وغیرہ کی لطیف مصلحتیں بیان ضرور کی ہیں اور ہم بھی اپنے قیاس و فہم سے کچھ اضافہ کرکے انھیں دہرا سکتے تھے لیکن گُر کی بات وہی ہے جو ہم نے عرض کی۔ خواہ مخواہ "کیوں" کے پھیر میں پڑنا بری عادت ہے۔ ہاں مفید اور نتیجہ خیز سوالات ضرور کرنے چاہئیں۔

(۲) ان مسلمان صاحب سے کہئے کہ سوال وہ کرنا چاہئے جس سے کوئی فائدہ بھی ہو۔ اگر یہ سوال کیا جاتا کہ ہم مسلمان نماز میں جو التحیات پڑھتے ہیں اسے پڑھنے کا حکم کیا اللہ اور رسولؐ نے دیا ہے یا فقہاء نے بطور اجتہاد اسے داخلِ نماز کر دیا ہے تو اس سے یہ فائدہ حاصل ہوتا کہ صحیح جواب پاکر طبیعت مطمئن ہو جاتی کہ واقعی اللہ کے رسولؐ ہی نے التحیات پڑھنے کا حکم دیا تھا اور اس کی صحت میں ایسا کوئی شبہ نہیں جس کا امکان اجتہادی مسائل میں ہوا کرتا ہے۔

لیکن یہ دریافت کرنے سے آخر کیا فائدہ کہ خود حضورؐ بھی نماز میں یہی التحیات پڑھا کرتے تھے یا نہیں پڑھتے تھے۔ وہ پڑھتے ہوں یا نہ پڑھتے ہوں اُمت کو تو بس اتنا کافی ہے کہ انھوں نے اسے پڑھنے کی ہدایت کی ہے۔ یہ مسلمان صاحب حوالۂ حدیث طلب کرنے کے بجائے اگر خود زحمت فرماکر بخاری و مسلم دیکھ لیتے تو انھیں متعدد صحیح روایات اس سلسلہ کی مل جاتیں اور معلوم ہو جاتا کہ التحیات کا لفظ لفظ حضورؐ کا سکھایا ہوا ہے۔

کسی بھی شرعی مسئلے میں قرآن و حدیث کا حوالہ طلب کرنا اُس شخص کے لئے تو جائز و مناسب ہوا کرتا ہے جو تھوڑی سی محنت خود بھی قرآن و حدیث کے مطالعہ میں کرلے اور پھر وہاں اسے کسی مسئلہ کی دلیل نہ ملے تو اہلِ علم سے پوچھے۔ اگر مطالعہ کی فرصت یا صلاحیت نہیں ہے تو ایسے کسی مسئلے میں جو جمہور امت کے یہاں متفق علیہ ہو اور شرق سے غرب تک اس پر عمل بھی جاری ہو قرآن یا حدیث کا حوالہ دریافت کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ شخص اپنی کاہلی یا بے علمی کے باوجود تمام علمائے امت اور فقہائے علّام سے بدظن ہے۔ اس بدظنی کو ظاہر ہے جہلِ مرکب ہی کہیں گے۔

ہم ایک بار پھر مشورہ دیں گے کہ آپ ان مسلمان صاحب سے یہ ضرور دریافت فرمالیں کہ حضورؐ نماز میں یہی التحیات پڑھتے تھے یا نہیں پڑھتے تھے اس تحقیق و تفحص سے آخر انھیں کیا ملے گا اور کیوں وہ ایک لاحاصل بحث میں سر کھپانا چاہتے ہیں۔ اگر فرض کیجئے تحقیق کے بعد یہ ثابت ہو کہ حضورؐ کسی اور طرح پڑھتے تھے یا التحیات پڑھتے ہی نہیں تھے تو کیا اس سے وہ یہ استدلال کریں گے کہ پھر تو ہمیں بھی نہ پڑھنا چاہئے۔ اگر یہ استدلال کریں گے تو اس کا مطلب ہوگا دین سے انحراف اور شریعت سے

بغاوت۔ حضورؐ کے لئے اللہ نے بہتیرے امور و معاملات
میں تخصیص فرمائی مثلاً آپ بیک وقت چار سے زائد
بیویاں رکھ سکتے تھے۔ آپ کی بیواؤں سے کوئی شخص نکاح
نہیں کر سکتا تھا۔ آپ کا ترکہ تقسیم نہیں ہو سکتا تھا وغیر
ذٰلک کسی شخص کے لئے ان امور میں حجت نہیں۔ امت
تو اس بات کی پابند بنائی گئی ہے کہ اللہ اور رسولؐ جس طرح
تعلیم دیں اس طرح مانو۔ حضورؐ نے قعدۂ نماز میں التحیات کی
تعلیم دی ہم پر ضروری ہوا کہ جوں کا توں اسے بغیر مانیں اس
بحث میں نہ پڑیں کہ خود حضورؐ بھی التحیات پڑھتے تھے
یا نہیں پڑھتے تھے۔ ہاں اس پہلو سے ہر وقت گفتگو ہو
سکتی ہے کہ حضورؐ کی یہ تعلیم صحیح روایات سے ثابت ہے
یا نہیں تو ہم نے عرض کر ہی دیا کہ بخاری و مسلم جیسی مستند
کتابوں میں متعدد صحیح و قوی روایات موجود ہیں مسلم کا
باب التشہد فی الصلوٰۃ ہی دیکھ لیا جائے تو کافی ہوگا۔

مسجد میں ذکر و شغل اور تبلیغی نصاب

سوال:- از محمد عبدالولی۔ حیدر آباد۔
فاضل و دقیق مسائل مختلفہ پر آنجناب کے افاضات
عالیہ قلوب پر نقش کالحجر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کم سے کم
مجھے آنجناب کے فرمودات سے والہانہ عقیدت ہے اور میرے
لئے مشعلِ راہ ہیں ـــ میں نے دیکھا مسجد میں چند اصحاب
جمع تھے اور ذکر و تسبیح کا شغل جاری تھا۔ ان میں میرے
ایک کرم فرما بھی شریک تھے۔ میں نے ازراہِ فلاح انکو ٹوکا
اور اس نظر فریب عبادت میں بدعت کی حرمت ظاہر کی
موصوف کی جبیں شکن آلود ہوگئی اور فرمانے لگے اس عمل
صالح کی تائید میں احادیث اور اللہ کا حکم موجود ہے۔ پھر
تبلیغی نصاب جلد اوّل مرتبہ شیخ الحدیث حضرت مولانا
زکریا صاحب سے چند اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ کمترین میں
اتنی علمی و دینی بصیرت کہاں کہ ردّ و قدح یا مناظرے کے
ذریعہ کوئی مسکت جواب دے کر اپنے موقف کو مستحکم کروں۔
اس لئے آنجناب سے رجوع کر رہا ہوں اور گراں قدر اوقات
میں خلل اندازی و زحمت کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

ا۔ حضرت ابوہریرہؓ اور ابوسعیدؓ دونوں حضرات اسکی
گواہی دیتے ہیں کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ارشاد
فرماتے ہیں کہ جو جماعت اللہ کے ذکر میں مشغول ہو فرشتے اس
جماعت کو سب طرف سے گھیر لیتے ہیں اور رحمت انکو ڈھانک
لیتی ہے اور سکینہ ان پر نازل ہوتی ہے اور اللہ جل شانہٗ انکا
تذکرہ اپنی مجلس میں تفاخر کے طور پر فرماتے ہیں۔
(ملاحظہ ہو تبلیغی نصاب جلد اول باب فضائل ذکر صفحہ ۲۴)

ب۔ جہاں اللہ کے ذکر کی مجلس ہو اللہ کا ذکر کیا جا رہا ہو
وہاں جمع ہوں اور اس کو سنیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۴)

ج۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ صحابہؓ کی ایک
جماعت کے پاس تشریف لے گئے اور دریافت فرمایا کہ کس
بات نے تم لوگوں کو یہاں بٹھایا ہے۔ عرض کیا کہ اللہ جلّ
شانہٗ کا ذکر کر رہے ہیں اور اس بات پر اس کی حمد و ثنا
کر رہے ہیں کہ اس نے ہم کو اسلام کی دولت سے نوازا یہ اللہ
کا بڑا ہی احسان ہم لوگوں پر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا خدا کی قسم صرف اسی وجہ سے بیٹھے ہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا
خدا کی قسم صرف اسی وجہ سے بیٹھے ہیں۔ حضور صلعم نے فرمایا
کسی بدگمانی کی وجہ سے میں نے تم کو قسم نہیں دی بلکہ جبرئیل میرے
پاس ابھی آئے تھے اور یہ خبر سنا گئے کہ اللہ جل شانہٗ تم لوگوں
کی وجہ سے ملائکہ پر فخر فرما رہے ہیں (ایضاً۔ صفحہ ۲۶)

د۔ حضور صلعم کا ارشاد ہے کہ جو بھی لوگ اللہ کے ذکر کے
لئے مجتمع ہوں اور ان کا مقصد صرف اللہ کی رضا ہو تو
آسمان سے ایک فرشتہ ندا کرتا ہے کہ تم لوگ بخش دیئے گئے۔ (ایضاً صفحہ ۲۷)

س۔ حضور اقدس صلعم دولت کدہ میں بیٹھے تھے کہ آیت
(واصبر نفسک) نازل ہوئی جس کا ترجمہ یہ ہے " اپنے
آپ کو ان لوگوں کے پاس بیٹھنے کا پابند کیجئے جو صبح و شام
اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ حضور اقدس صلعم اس آیت کے
نازل ہونے پر ان لوگوں کی تلاش میں نکلے۔ ایک جماعت
کو دیکھا کہ اللہ کے ذکر میں مشغول ہے۔ بعض لوگ ان میں

بکھرے ہوئے بالوں والے ہیں اور خشک کھالوں والے اور صرف ایک کپڑے والے ہیں۔ جب حضورؐ نے ان کو دیکھا تو ان کے پاس بیٹھ گئے اور ارشاد فرمایا کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا فرمائے کہ خود مجھ کو ان کے پاس بیٹھنے کا حکم ہے۔ (ایضاً صـ۱۹۹)

جواب:-

تبلیغی نصاب کے محترم مؤلف اور تبلیغی جماعت کے ممتاز رہنما اور مظاہر العلوم سہارنپور کے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا دام ظلہٗ اگرچہ بعض اعتبار سے بہت بڑی شخصیت ہیں اور صاحبِ علم بھی ہیں۔ ان کی متعدد تصانیف اور شروح ہیں، ان کا شغل حدیث پڑھانا ہے اور ان کے مریدین بہت ہیں۔

لیکن ان تمام اوصافِ حمیدہ کے باوجود یہ ماننا مشکل ہے کہ وہ فقیہ بھی ہیں۔ فقاہت یعنی سوجھ بوجھ اور بصیرت و فراست کے بہت سے درجے اور اسٹیج ہیں۔ کسی نہ کسی درجے میں فقیہ تو فلاں اور فلاں سبھی ہوتے ہیں۔ مگر فقاہت کا وہ درجہ جو عبقریت کی شان لئے ہوئے ہو اور ہی چیز ہے۔ اس کا انحصار کثرتِ مطالعہ اور وسعتِ معلومات اور ذکر و تسبیح کی فراوانی اور عبادات کی ہماہمی پر نہیں بلکہ ایک خداداد صلاحیت اور اعلیٰ ترین وہبی استعداد پر ہے یہ استعداد کمائی یا خریدی نہیں جاسکتی بلکہ ماں کے پیٹ سے ملتی اور سازگار حالات سے نشوونما پاتی ہے۔

یہاں وہ دلائل بیان کرنے تو مشکل ہیں جنھوں نے ہمیں اس رائے تک پہنچایا البتہ اتنا ضرور عرض کرسکتے ہیں کہ ابھی ان کی ایک کتاب آئی ہے جس میں انھوں نے تبلیغی جماعت پر وارد ہونے والے متعدد اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ اسے پڑھ کر مایوسی ہوتی ہے کہ اس میں وہ تمام نقائص موجود ہیں جو کسی کمزور موقف کی پشتیبانی اور غلو آمیز وکالت میں ہوا کرتے ہیں۔ دعوے اور دلیل میں مطابقت عنقا یا برائے نام۔ غیر ضروری نکات پر طویل موشگافی اور ضروری نکات سے صرفِ نظر معترض کے دلائل کو سمجھنے سے دانستہ یا نادانستہ اعراض۔ صحیح اقوال و نصوص کا غلط انطباق۔ رکوع کے موقعہ پر سجدہ اور سجدے کے موقعہ پر قیام۔ قوی ترین احادیث سے بے اعتنائی اور ضعیف روایات سے گہری دل چسپی اور وابستگی۔ اس کتاب کے مطالعہ نے ہمارے اُس تأثر کی صحت کا ثبوت مہیا کیا جو تبلیغی نصاب کے مطالعہ سے کبھی پہلے قائم ہوچکا تھا۔ تبلیغی نصاب کئی اعتبار سے قیمتی اور مقدس شے ہے۔ لیکن اسکی مثال کم و بیش اُس سالن جیسی ہے جس میں کچھ اجزاء تو نہایت مفید اور صحت بخش اور مقوّی ملائے گئے ہوں لیکن کچھ اجزاء زہریلے اور امراض پیدا کرنے والے بھی آمیز کردئیے گئے ہوں۔ یہ تو طے ہے کہ محترم شیخ الحدیث نے جان بوجھ کر ایسا نہ کیا ہوگا۔ کوئی بھی باورچی اپنی دیگ کو قصداً تو نہیں بگاڑا کرتا لیکن اجزاء کے خواص و اثرات سے بے خبری یا ان کے بارے میں غلط فہمی اور غذا کے مجموعی ثمرے اور حاصل کے بارے میں بے شعوری یا خوش فہمی تفقہ کی کمی اور ژرف نگاہی کی قلت اور بصیرت کی نارسائی ہی کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ تبلیغی نصاب صالحیت اور خدا رسیدگی کا جو مجموعی تصور دیتا ہے وہ جوہری اعتبار سے کم و بیش وہی تصور پیدا کرتا ہے جو راہبوں اور سنیاسیوں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ مصطلحہ عبادات اور طریقت کے اختراع کردہ اوراد و اشغال سے روحانی قوت حاصل کرکے دفعتاً جنت میں چھلانگ لگا جانے کا درس تو یہ نصاب بڑی خوش اسلوبی سے دیتا ہے لیکن موجود دنیا کے مسائل سے پنجہ کشی اور دوسری اقوام پر اثر انداز ہونے والے اخلاق و کردار اور ایمانی فراست کا لوہا منوانے والے اطوار و اعمال کی طرف اس کا رویّہ نہ صرف منفی ہے بلکہ کہیں کہیں تو یہ دیوار بن کر کھڑا ہوگیا ہے۔

اس اشاراتی تبصرے کے بعد اب ہم آپ کے سوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

جو اقتباسات تبلیغی نصاب سے آپ کے سامنے پیش کئے گئے

انھیں مساجد کے مذکورہ زیر بحث اجتماع اور ذکر و شغل کے حق میں بطور دلیل پیش کرنا ٹھیک ویسا ہی علم کلام ہے جو بریلوی مکتبِ فکر استعمال کرتا ہے۔ کون مسلمان ہوگا جو ذکرِ الٰہی کی فضیلت سے انکاری ہو یا اُن مجالس کو بُرا سمجھتا ہو جن میں اللہ اور اس کے رسول صلعم کی تعریف کی جائے۔ کون مسلمان ہے جسے تسبیح و درود سے بَیر ہو۔ کون مسلمان ہے جو اللہ کی رضا جوئی پر زبانِ اعتراض کھول سکے۔ پھر کیا ان لوگوں کو کم عقل اور سادہ لوح نہیں کہیں گے جو اعتراض کی اصل نوعیت تو سمجھتے نہیں اور ایک متفق علیہ اور مسلم بات کے ثابت کرنے میں اپنا اور دوسروں کا وقت برباد کرتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک معمار چھت کی اینٹوں کو ستونوں میں استعمال کرنے لگے اور ٹوکنے پر یہ تقریر شروع کر دے کہ چھت کی اینٹ بڑی قیمتی ہوتی ہے۔ خوش نما بھی ہوتی ہے۔ سبک بھی ہوتی ہے وغیر ذلک۔ یا یہ ایسا ہی ہے جیسے بدعتی لوگ اذان کے وقت انگوٹھے چومتے ہیں، مساجد میں صلوٰۃ پکارتے ہیں، نذر و نیاز اور میلاد و فاتحہ کے جشن مناتے ہیں، قبروں پر جھک مارتے ہیں، قوالیوں میں وجد کرتے ہیں اور عرسوں کے میلے لگاتے ہیں پھر ٹوکئے تو نعتِ رسول اور درجاتِ اولیاء اور اہمیتِ نماز اور کشف و کرامات پر دادِ تحقیق دینے لگتے ہیں۔ یہ دراصل غباوت اور بے مغزی کی ایک قسم ہے جو کبھی کبھی مالیخولیا تک جا پہنچتی ہے۔

اللہ کا ذکر ہو، رسول صلعم کی ثنا ہو، صحابہؓ و اتقیاء کی توصیف ہو ان سب کے کچھ حدود اور کچھ قیود ہیں۔ جو وقت بال بچوں کی روزی کمانے کا یا حقِ زوجیت ادا کرنے کا ہے اُس وقت کوئی نوافل میں جٹا رہے یا الا اللہ کی ضربیں لگانے میں مست ہو تو اسے مردِ مومن نہیں بلکہ عابدِ احمق کہیں گے۔ اللہ کی رضا اور خوشنودی اس کی شریعت میں منحصر ہے۔ کسی بھی عمل کو موجبِ ثواب و برکت سمجھنے سے پہلے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اللہ اور رسول صلعم کی تعلیم اور صحابہؓ کا اسوہ اس کے بارے میں کیا ہے اور فقہائے کرام کیا فرماتے ہیں۔ مساجد میں کیا کرنا اچھا ہے اور کیا برا۔ اسکی دریافت کے لئے قرونِ اولیٰ مشہود لہا بالخیر کی طرف چلئے یعنی اُن ادوارِ مبارکہ کی طرف جن کے بابرکت ہونے کی شہادت اللہ کے رسول صلعم نے دی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مساجد میں مومنین کا اجتماع یا تو فرض نمازوں کے لئے ہوتا تھا یا کسی اہم ملی و سیاسی مسئلے میں مشاورت اور تبادلۂ خیال کے لئے۔ وہ سنن و نوافل تک اکثر صحابہ اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھروں میں پڑھتے تھے جو فرض نمازوں سے قبل یا بعد فرادیٰ فرادیٰ پڑھے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد ایک مرتبہ کچھ زاہد و عابد قسم کے لوگوں کو یہ سوجھی کہ چلو مسجد میں جمع ہو کر اللہ کا ذکر کریں۔ وہ بے چارے بھی شاید اسی طرح کی غلط فہمی میں مبتلا تھے جس میں تبلیغی جماعت والے مبتلا ہیں۔ چنانچہ حلقہ بنا کر اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ اور سبحان اللہ وغیرہ کی تسبیحات شروع ہو گئیں۔ شمار کے لئے وہ سنگریزے استعمال کرنے لگے۔ شارہ شدہ اس کا پتا صحابیِ رسول عبداللہ ابن مسعودؓ کو چلا۔ وہ دوڑے گئے اور بڑے خشمگیں انداز میں ان لوگوں سے کہا کہ یہ کیا حرکتیں تم نے شروع کر دی ہیں۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ جناب ہم تو ذکر اللہ کر رہے ہیں۔ تکبیر و تہلیل میں مست ہیں۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا۔ حیرت ہے تم پر اے امتِ محمدی کے سادہ لوحو۔ تم کس قدر جلد ہلاکت کی راہ چل نکلے حالانکہ ابھی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور ابھی تو ان کے اصحاب بکثرت تم میں پائے جاتے ہیں۔

یہ واقعہ مسند دارمی میں بیان ہوا ہے۔ ابن عبدالصمد تمیمی دارمی امام بخاری کے ہم عصروں میں تھے۔ ان سے روایت کرنے والوں میں امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام ابو داؤدؒ، اور امام احمدؒ کے بیٹے عبداللہؒ اور محمد بن یحییٰؒ ذہلی جیسے بزرگ شامل ہیں۔ خراسان کے چار حفاظِ حدیث میں انکا شمار تھا۔ ان کی جمع فرمودہ کتابِ حدیث مسند دارمی کے نام سے مشہور ہے جس میں کم و بیش ساڑھے تین ہزار حدیثیں ہیں۔

چند تعارفی الفاظ صحابیِ رسول عبداللہ ابن مسعودؓ کے بارے میں بھی سن لیجئے۔ ان کا شمار فقیہ ترین صحابہ میں

ہے یعنی دین و شریعت میں مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے۔ امام نوویؒ شارح مسلم تو یہاں تک فرما گئے ہیں کہ قرآن کے علم و تحمل میں وہ چاروں خلفائے راشدین سے بھی آگے تھے[۵۱]۔ علامہ ابن عبدالبر الاستیعاب[۵۲] میں رسول اللہؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ عبداللہ ابن مسعودؓ تمہارے لئے جس شے کو ناپسند کرے اسے میں بھی ناپسند کرتا ہوں۔ یہی ارشادِ رسولؐ بعض اور کتب میں بھی منقول ہوا ہے۔ ابن مسعود کو فقاہت میں ایک بلند مقام حاصل تھا اس پر تمام چوٹی کے علماء متفق ہیں۔

جو واقعہ ہم نے بیان کیا وہ سنن دارمی ہی تک محدود نہیں۔ بہتیری کتابوں میں یہ بیان ہوتا آرہا ہے۔ مثلاً علامہ شہیر ابن دقیق العید احکام الاحکام[۵۳] میں اسے بطور استدلال پیش فرماتے ہیں۔ ان کی نقل کے مطابق حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے حلقۂ ذکر کے شرکاء سے یوں فرمایا تھا۔

> "کیا تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ سے بھی زیادہ ہدایت یافتہ ہو؟ ظالمو تم نے ایک بہت بڑی بدعت کا آغاز کیا ہے۔ کیا تمھیں یہ خوش فہمی ہے کہ اصحابِ رسول سے بھی بڑھ کر عالم فاضل ہو گئے!"

فقیہِ شہیر علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں فتاویٰ بزازیہ کے توسط سے ایک فقہی استدلال کے ذیل میں یہی روایت لاتے ہیں اور اس میں تصریح ہے کہ عبداللہ ابن مسعودؓ نے ذکراللہ کے ان متوالوں کو مسجد سے نکال باہر کیا تھا[۵۴]۔

ایک اور واقعہ سنئے۔ طلوعِ آفتاب کے کچھ دیر بعد ایک نماز حضورؐ پڑھا کرتے تھے جس کا معروف اردو نام "چاشت" ہے۔ اور عربی میں اسے "صلوٰۃ الضحیٰ" کہتے ہیں۔ کبھی چار رکعت کبھی چھ یا آٹھ یہاں تک کہ "مراقی الفلاح" میں بارہ رکعات بھی نقل ہوئی ہیں۔ یہ بہرحال طے ہے کہ نمازِ چاشت حضورؐ کم و بیش پابندی سے ادا فرماتے تھے۔

اس کے باوجود بخاری و مسلم[۵۵] جیسی مستند کتابوں میں یہ قصہ مذکور ہے کہ حضرت مجاہدؒ اور حضرت عروہؓ ایک صبح بعد طلوعِ آفتاب مسجد میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ صحابیِ جلیل حضرت عبداللہ ابن عمرؓ حجرۂ عائشہؓ کے قریب تشریف فرما ہیں اور چند حضرات مسجد میں نمازِ چاشت ادا کر رہے ہیں۔ مجاہدؒ کا بیان ہے کہ ہم نے حضرت ابن عمرؓ سے اس بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے برملا فرمایا کہ یہ لوگ بدعت کے مرتکب ہیں۔

ابن عمرؓ کے اس صریح ارشاد کے ساتھ درج ذیل امور بھی ملحوظ رکھے جائیں:۔

ایک یہ کہ معاملہ نماز کا ہے کسی ایسے ذکراللہ کا نہیں جس کی شکل و ہیئت غیر معین ہو۔ دوسرے یہ کہ رسول اللہؐ کا نمازِ چاشت پڑھنا مسلّمات میں سے ہے۔ جو علماء یہ نہیں مانتے کہ حضورؐ پابندی سے یہ نماز پڑھا کرتے تھے وہ بھی یہ ضرور مانتے ہیں کہ جب آپ سفر میں جاتے یا سفر سے آتے تو یہ نماز بے شک پڑھا کرتے تھے۔

تیسرے یہ کہ عین مسجد ہی میں بارہا آپؐ کا نمازِ چاشت پڑھنا قوی روایات سے ثابت ہے۔

اس کے باوجود ابن عمرؓ جیسے فقیہ صحابی نے برملا یہ کہا کہ یہ مسجد میں نمازِ چاشت پڑھنے والے بدعت کے مرتکب ہیں۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہوا کہ مسجد میں عبادات کے قبیل کا صرف وہی عمل درست ہے جس کی نہ صرف شکل و ہیئت حدیث سے ثابت ہو بلکہ یہ بھی ثابت ہو کہ صحابہؓ نے دورِ رسالت میں یا اس کے بعد اس پر فلاں انداز میں عمل کیا ہے۔ یہی چیز عبداللہ ابن مسعودؓ والے مذکورہ قصے سے ظاہر ہے اور اسی کے مماثل اور بھی واقعات

---

[۵۱] جلد اوّل صفحہ ۳۵۹ [۵۲] جلد اوّل صفحہ ۵۲ [۵۳] جلد ۱ صفحہ ۵۲۔ [۵۴] شامی جلد پنجم صفحہ ۳۵۰ [۵۵] بخاری ابواب العمرۃ۔ باب کم اعتمر النبیؐ۔ مسلم باب بیان عدد عمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم و زمانہن۔

ہیں مثلاً ابن عمرؓ نے اجتماعاً دعائے قنوت پڑھنے کو بدعت کہا عبداللہ ابن مغفلؓ صحابیِ رسول نے مساجد میں زور زور سے بسم اللہ پڑھنے کو بدعت کہا۔ نمازِ تہجد کو مسجد میں اجتماعاً پڑھنا فقہاء کے نزدیک بدعت ہے۔

غرناطے کے امام شاطبی نے اپنی الاعتصام میں اس مسئلے پر بڑی اہم اور بنیادی باتیں لکھی ہیں۔ جس قسم کے اجتماعی ذکر و تسبیح کے بارے میں یہاں سوال کیا گیا ہے ٹھیک اسی کے بارے میں امام شاطبی یہ الفاظ لکھتے ہیں:۔

ومنھا التزام الکیفیات والھیئات
المعینۃ کالذکر بھیئۃ الاجتماع۔

(ترجمہ) اور ان ہی بدعتوں میں سے معین کیفیتوں اور ہیئتوں کا التزام کرنا ہے جیسے کچھ آدمیوں کا جمع ہوکر ذکر کرنا۔

عبداللہ ابن مسعودؓ کا یہ ارشاد اس باب میں حرفِ آخر ہے

اتبعوا آثارنا ولا تبتدعوا فقد کفیتم
(الاعتصام۔ جلد اول ص۵۴)

(ہمارے نقشِ قدم پر چلو اور نئی نئی باتیں نہ نکالو۔
ایسا ہی کرنا تمھاری فلاح کیلئے کافی ہے)

اس موضوع پر اگر ہم لکھنا چاہیں تو بلا مبالغہ ہزار صفحات لکھ سکتے ہیں لیکن یہاں تو اتنا ہی مواد بہت ہے۔ ہر منصف مزاج اندازہ کرے کہ مسجد کے جس ذکر و شغل کا آپ نے ذکر کیا وہ بدعت ہے یا نہیں اور اس کے عاملین سادہ لوح ہیں یا نہیں۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ اصل قصور ان بیچاروں کا نہیں ہے جو تبلیغی نصاب پڑھ پڑھ کر حورانِ جنت کے قربِ خیالی سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ بلکہ اپنے شیوخ ہی سے انھیں یہی مزاج ملا ہے۔ مثلاً حضرت محترم شیخ الحدیث مولانا زکریا کے یہاں ہر سال رمضان میں اعتکاف ہوتا ہے۔ اس کی تفصیلات راز نہیں ہیں۔ مریدین و متوسلین دور دور سے سفر کرکے آتے ہیں اور مسجدِ شیخ میں معتکف ہوتے ہیں سیکڑوں کا اجتماع ہو جاتا ہے معتکفین کی ایک بستی بس جاتی ہے۔ اجتماعی انداز میں سحر و افطار ہوتا ہے کتنے ہی بندگانِ خدا ہیں جن سے گفتگو کرتے ہوئے ہم نے اندازہ کیا ہے کہ مسجدِ شیخ میں شیخ کے ہم پہلو معتکف ہونے کو وہ بہت بڑی سعادت اور خوش نصیبی تصور کرتے ہیں۔

اب آیئے اسوۂ رسولؐ اور آثارِ صحابہؓ کی طرف۔ اعتکاف حضورؐ کی سنت ہے اور قرآن سے بھی اس کا استحباب نکلتا ہے۔ لیکن کیا تبلیغی جماعت کے اہلِ علم میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ مذکورہ قسم کے اجتماعی اعتکاف کا استحباب کہاں سے نکالا گیا۔ کیا کچھ صحابہؓ بھی حضورؐ کے زمانۂ اعتکاف میں مسجدِ نبوی کے اندر معتکف ہوتے تھے؟

ایک حدیث صحیح مسلم میں یہ ملتی ہے کہ ایک مرتبہ رمضان کے آخری عشرے میں رسول اللہؐ نے مسجد میں اپنا خیمہ لگوایا۔ اس پر ام المومنین حضرت زینبؓ نے بھی اپنا خیمہ لگوایا۔ پھر بعض دوسری ازواجِ مطہرات نے اپنے خیمے لگوائے۔ اب جو نمازِ فجر سے فراغت پاکر حضورؐ یہ منظر دیکھتے ہیں تو ناخوشگواری کے انداز میں فرماتے ہیں آلبرَّ یُرِدنَ لفظاً اس کے معنی یہ ہیں کہ کیا انھوں نے نیکی کا ارادہ کیا ہے یا یہ کہ کیا ان کا ارادہ نیک ہے مگر اصطلاحاً اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کا ارادہ نیک نہیں ہے۔ چنانچہ آپؐ نے نہ صرف ان کے خیمے اکھڑوا دیئے بلکہ رمضان میں اعتکاف ہی چھوڑ دیا۔ (مسلم۔ جلد اول۔ کتاب الاعتکاف)

تبلیغی جماعت کے اکثر و بیشتر افراد میں تو خیر یہ صلاحیت ہے ہی نہیں کہ تبلیغی نصاب سے آگے کی کوئی چیز زیرِ غور لاسکیں۔ ہم حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا مدظلہ جیسے علماءِ دین سے سوال کرتے ہیں کہ اس حدیث کے کیا کیا مضمرات و نتائج ہیں۔

یہ تو ایک موٹی سی بات ہے کہ اس سے عورتوں کے اعتکاف فی المسجد کی ممانعت نکلتی ہے مگر کیا کچھ اور نہیں نکلتا؟۔

مذکورہ ازواجِ مطہرات کے ارادۂ اعتکاف میں

برائی کا پہلو کیا تھا اسے سوچئے۔ ایک خرابی تو صریحاً یہ بھی کہ مسجد میں عام لوگ آتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ منافقین بھی اور دیہاتی بھی۔ ازواج مذکور کو حوائج ضروریہ کے لئے بہرحال روزانہ ہی مسجد سے باہر آنا جانا پڑتا۔ اس صورتِ حال کو حضورؐ کے مذاقِ بلند نے گھٹیا تصور کیا اور بجا کیا۔ لیکن اس کا ازواج مطہرات کے ارادے اور نیت سے تو کوئی تعلق نہ ہوا۔ حضورؐ کا برجستہ ارشاد کسی اور ہی پہلو کی طرف مشیر ہے۔ وہ پہلو کیا ہو سکتا ہے یہ سمجھنا مشکل نہیں۔ دراصل اعتکاف نام ہے ایک ایسی خلوتِ کاملہ کا جس میں بندہ تمام علائق سے کٹ کر اپنے رب سے رشتہ جوڑے۔ ذہنی و قلبی رشتہ۔ اور مکمل یکسوئی کے ساتھ اپنے اعمالنامے پر نظر ڈالے اور اپنے گناہوں پر گڑگڑائے۔ یہ وہ لمحاتِ خلوت ہیں جن میں بندہ اور آقا، مالک اور مملوک، عابد اور معبود تنہا ہیں۔ ان کے مابین جسمانی یا ذہنی یا روحانی طور پر کوئی حائل نہیں۔

حضرت زینب حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہم حضورؐ کی بیویاں ہیں۔ آپ انھیں اندر باہر سے خوب جانتے ہیں۔ آپ نے فوراً محسوس فرما لیا کہ انکا اعتکاف خالصتہً للہ نہیں ہے بلکہ یہ میرے قریب تر رہنا چاہتی ہیں اور آپس میں تفخر و مباہات کا جذبہ ان کے اندر کام کر رہا ہے۔ اسی چیز کو آپ نے خرابی نیت کا نام دیا۔ صاف کہا کہ ان کا ارادہ نیک نہیں ہے۔

اب غور کیا جائے۔ کیا فی ذاتہ یہ کوئی معیوب بات تھی کہ بیویوں نے اپنے شوہر سے قربِ جسمانی کی حرص کی۔ اللہ اور رسولؐ کو تو زن و شوہر کا ذہنی و جسمانی ارتباط اس قدر پسند ہے کہ اسے عینِ مطلوب قرار دیا گیا۔ پھر رسول اللہؐ جیسا شوہر کہ اس کا پسینہ بھی عطر، اس کا سانس بھی مشک و عنبر، اس کے قدموں کی خاک بھی سعادتِ دارین کی ضامن۔ اس کی ہمسائگی نعمتِ عظمیٰ۔ اسکی وساطت کے بغیر تو خدا کا بھی صحیح عرفان محال۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس خاص موقعہ پر قرب کی یہی حرص و خواہش ازواج کے خلوص کی قاتل قرار پائی اور ان کے ارادۂ اعتکاف کو بارگاہِ پیمبری سے کراہت کا ثمرِ تلخ ملا۔ بیک بینی و دو گوش خیمے ہی اُکھڑوا دیئے گئے اور حضورؐ نے رمضان کا اعتکاف تک چھوڑ دیا۔

جو لوگ واقعتہً وہی اعتکاف کرنا چاہیں جو حقیقتِ شرعیہ کے اعتبار سے اعتکاف ہے تو کونسا جذبہ یا کون سے جذبات ہیں جو انھیں شیخ الحدیث سہارنپوری کی مسجد میں کھینچ کر لاتے ہیں۔ کیا یہ مسجد مسجدِ نبوی سے بھی زیادہ بابرکت ہے اور کیا شیخ الحدیث کا پیکرِ خاکی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ مبارک سے بھی بڑھ چڑھ کر مقدس ہے کہ مریدین و متوسلین اس سے قرب و اتصال کا شوق فرمائیں اور پھر بھی ان کا اعتکاف مخلصانہ نہ رہ جائے۔ کھلی بات ہے کہ یہاں بھی داخلی محرک ویسا ہی ایک جذبہ ہے جیسا ازواج کے فعل میں نظر آتا ہے۔ یہاں بھی بندے اور آقا کے درمیان ایک انسان حائل ہے۔ یہاں بھی عابد اپنے معبود کے آگے براہِ راست حاضر ہونا نہیں چاہتا بلکہ اپنے پیر و مرشد کے جسمانی قرب کی مفروضہ برکتوں کا سہارا لیتا ہے اور ایک ایسا ماحول پسند کرتا ہے جہاں کم سے کم افطار و سحر میں وہ جلوت اور انجمن کی کیفیت سے ہمکنار ہو۔ نیز دیگر اوقات میں بھی یہ محسوس کر سکے کہ وہ اکیلا نہیں ہے ہم مشرب اور بھی آس پاس ڈیرہ لگائے ہوئے ہیں۔ یہ احساس بجائے خود اعتکاف کی معنویت کا قاتل ہے۔

پھر کیا وہ دوسرا نفسانی جذبہ بھی ان عاشقانِ شیخ کے اندر نہیں پایا جاتا جس کا ادراک و احساس حضورؐ نے ازواج کے طرزِ عمل میں کیا تھا۔ کیا ان میں باہمی مباہات اور حرصا حرصی اور تفاخر کے وجود سے انکار ممکن ہے۔

خدا کے لئے ہمیں کوئی بتاؤ کہ آخر صحابہؓ کو اجتماعی اعتکاف کی کیوں نہ سوجھی اور معتکفین کا یہ سلسلہ کیوں بدعت کے زمرے سے خارج ہے جو ہر سال مسجدِ شیخ میں لگتا ہے صحابہؓ کے بعد تابعین آتے ہیں۔ مجتہدین و ائمہ آتے

ہیں۔ یہ بھی اس کی تعلیم نہیں دیتے۔ پھر کیا بدعت کے سر پر سینگ نکلنے چاہئیں تب ہی اسے بدعت قرار دیا جا سکے گا۔

مروجہ تصوف گویا انہی بدعات کا منبع اور سرچشمہ [illegible] شیخ الحدیث تو الحمدللہ عالم دین ہیں، استاذ [illegible] ہیں۔ شارح حدیث ہیں۔ وہ بھی اگر بدعت و سنت کے فرق کو تحفظ نہیں دے سکے تو یہی ماننا پڑے گا کہ بگڑا ہوا تصوف اب کبھی اس راہ پر نہیں آسکے گا جسے راہِ احسان کہتے ہیں۔

اسلام و عیسائیت

سوال:۔ از۔ میر ولایت علی۔ حیدر آباد۔

تجلی مارچ و اپریل ۶۷ء کے صفحہ ۴۷ پر بہ سلسلہ "حضورؐ کی بشریت" آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو جو نعوذ باللہ خدا کا بیٹا بنا دیا وہ بھی ایسی ہی غالی اور غیر عقلی عقیدتمندی کا شاخسانہ تھا پھر دیکھ لو کہ آج بھی کروڑوں افراد حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ مانتے ہی چلے جا رہے ہیں" عیسائی نہ صرف حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ کہتے بلکہ اپنی پوری قوم کو "نحن ابناء اللہ واحباؤہ" کہا کرتے۔ میں اس وقت ابن اللہ کی لفظی بحث میں جانا نہیں چاہتا صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ جب خود مسلمان حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بے پدر مانتے ہیں اور انھیں آج تک آسمان پر بجسدِ عنصری زندہ مانتے ہیں تو عیسائیوں پر کیا الزام کہ وہ اپنے پیغمبر کو دیگر تمام پیغمبروں سے ایک اعلیٰ اور ممتاز درجہ پر فائز مانتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے سامنے قرآنی ثبوت پیش کرتے ہیں کہ دیکھو پیغمبر اسلام نے بھی خدا کی طرف سے حضرت مسیحؑ کا سب سے اعلیٰ اور ممتاز درجہ تسلیم فرمایا ہے اور کہتے ہیں کہ "مسلمان محض ہٹ دھرمی سے حضرت مسیحؑ کے اس خصوصی امتیاز کے انکاری ہیں۔ اور پیغمبر اسلام کو قرآنی سند کے بغیر غلو کے عقیدے سے افضل الانبیاء منوانے کی کوشش کرتے ہیں" براہِ کرم اس خصوص میں مدلل روشنی ڈالئے تاکہ دونوں فرقوں کے صحیح عقائد واضح ہو جائیں اور دونوں بڑی قومیں فلاحِ انسانیت کے کام مل جل کر لیا کریں اور دنیا کو آخرت کی سرسبز و شاداب کھیتی ثابت کر دکھائیں۔

جواب:۔

آپ کے سوال کا شافی جواب چند سطور میں بھی ہو سکتا تھا لیکن جو ذہن اور طرزِ فکر اس سوال کے پیچھے کام کر رہا ہے وہ نہایت زہریلا اور فاسد ہے اس لئے ہم شرح و بسط سے گفتگو کریں گے۔

سب سے پہلے ہم ان تمہیدی فقروں کو لیں گے جنھیں آپ نے سوال کی تقریب میں حوالۂ قلم فرمایا ہے۔ ان میں آپ نے ایک مرموز قسم کی تعریض کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کے مطالعہ کا آپ کو موقع نہیں ملا ہے حالانکہ حضرت عیسیٰؑ کے بے پدر پیدا ہونے اور آسمان پر اٹھا لئے جانے کے عقائد کا صریح تقاضا یہ تھا کہ آپ ایک مسلمان کی حیثیت سے پہلے قرآن پر طالب علمانہ نظر ڈال لیتے اور اس کے بعد اگر کوئی اشکال ذہن میں کھٹکتا تو اسے سامنے لاتے۔

"ابن" عربی میں بیٹے کو بھی کہتے ہیں۔ عزیز و محبوب کو بھی اور بغیر کسی لغوی معنی کے یہ کنیتوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے ابن حجر، ابن بطوطہ وغیرہ۔ یہ سیاق و سباق ہی بتاتا ہے کہ کہاں یہ کیا مفہوم دے رہا ہے۔ مثلاً آپ کی نقل فرمودہ آیت نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ میں اس استعمال بیٹے اور فرزند کے معنی میں نہیں ہوا بلکہ محبوب مقرب اور برگزیدہ کے معنی میں ہوا ہے۔ عیسائی اور یہودی حضرات کہا کرتے تھے کہ ہم سب اللہ کے چہیتے اور لاڈلے ہیں۔ لیکن یہی لفظ بعض اور آیات میں لازماً بیٹے اور ولد کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے سورۂ توبہ میں فرمایا گیا۔

قَالَتِ الْیَھُوْدُ عُزَیْرُنِ ابْنُ اللّٰہِ وَقَالَتِ

اَلنَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰہِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ یُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰہُ اَنّٰی یُؤْفَكُوْنَ (التوبۃ۔ آیت ۳۰)

اور یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ باتیں کہتے ہیں اپنے منھ سے۔ حرص کرتے ہیں اپنے سے پہلے والے کافروں کے قول کی۔ خدا انھیں غارت کرے کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ کو اللہ کا محبوب و مقرب کہنا تو کفر نہیں ہے بلکہ انھیں اللہ کا محبوب و مقرب ماننا تو عین ایمان ہے لہٰذا یہ طے ہوگیا کہ ابن سے مراد یہاں "بیٹا" ہے اور نصرانی حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا اور فرزند کہنے ہی کی بنا پر قولِ کفر کے مرتکب قرار پائے ہیں۔

لفظ "ابن" عربی سے منتقل ہوکر جب اُردو میں آیا تو اپنے اسی واحد مفہوم میں آیا۔ چنانچہ ہم یا کوئی بھی شخص جب یوں کہے کہ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ مانتے ہیں تو کسی شخص کو اس میں شبہ نہیں ہوسکتا کہ ابن کا مطلب یہاں فرزند ہے نہ کہ محبوب اور لاڈلا۔ یہ ایسا ہی جیسے احادیث کی اسناد میں جب کسی راوی کا نام ابن کے ساتھ آتا ہے تو قطعی طور پر اس سے باپ بیٹے کے رشتے کا اظہار ہوتا ہے نہ کہ محبوبیت اور قربت کا۔ زید بن ثابت کا مطلب ہے ثابت کا بیٹا زید اور سعید بن عمران کا مطلب ہے عمران کا بیٹا سعید۔

جب یہ بات منقح ہوگئی تو آپ خود دیکھ لیجئے کہ آپکے وہ تمہیدی فقرے کیا قدر و قیمت رکھتے ہیں جو اس حقیقتِ ثابتہ پر غبار اُڑانے کی خدمت انجام دے رہے ہیں کہ نصرانی حضرات حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں نہ کہ صرف محبوب اور مقرب۔ قرآن میں اگر ایک دو جگہ لفظِ ابن یا اس کی جمع "ابناء" محبوب و مقرب کے مفہوم میں استعمال ہوئی ہے تو اس کا یہ مطلب کیسے ہوگیا کہ قرآن ہی کے ان دوسرے مقامات کو نظر انداز کر دیا جائے جہاں اس کا مفہوم فرزند کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کے صریح الفاظ نازل کیئے سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ [1]

اب آیئے اصل سوال کی طرف۔ تعجب ہے کہ ایک تعلیم یافتہ مسلمان ہوکر بھی یہ حقیقت آپ سے پوشیدہ رہی کہ جمہور امت کبھی کسی طبع زاد اور خانہ ساز عقیدے پر متفق نہیں ہوتے بلکہ صرف اُن عقائد پر اتفاق کرتے ہیں جو یا تو قرآن سے یا احادیثِ متواترہ سے ثابت ہوں۔ حضرت عیسیٰؑ ابن مریم بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور انھیں سولی ہرگز نہیں دی گئی بلکہ آسمان پر اٹھالیا گیا۔ مسلمانوں کے ان دو متفق علیہ عقیدوں کا تذکرہ آپ نے اس انداز میں فرمایا گویا ان کی صراحت قرآن و حدیث میں تو ہے ہی نہیں بس مسلمانوں نے انھیں قیاس و اجتہاد سے داخلِ ایمان کرلیا ہے۔ نیز آپ کے اسلوب سے یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ ان عقیدوں سے اتفاق نہیں رکھتے۔ یہ دونوں ہی باتیں سراسر غفلت اور بے خبری کا ثمرہ ہیں۔ علم و تحقیق سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ اگر مسلمان کی حیثیت میں قرآن و حدیث کو بغور پڑھیں تو کوئی شبہ اس میں نہ رہے گا کہ ان دونوں باتوں کی خبر خود اللہ اور رسولؐ نے دی ہے اسلئے امت ان پر ایمان لے آئی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قیاس، اجتہاد، منطق، اٹکل اور پرداز تخیل کے زور سے یہ عقیدے پیدا کرلئے گئے ہوں۔

عیسائی کچھ کہتے رہیں۔ تعجب آپ پر ہے کہ سلامتی ہوش و حواس کے باوجود آپ کو امت کے ان عقیدوں میں اور عیسائیوں کے ابن اللہ والے عقیدے میں وہ زمین و آسمان کا فرق محسوس نہیں ہو رہا ہے جو اسقدر ظاہر باہر ہے جیسے ہمالیہ پہاڑ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کی اطلاع اور زندہ آسمان پر اٹھالئے جانے کی خبر قرآن دیتا ہے اور اس خبر کے کسی پہلو میں کوئی ابہام اگر متصور ہ

[1] نہ اس کا کوئی فرزند ہے نہ وہ کسی کا فرزند ہے۔ پاک ہے ان اوصاف سے جو نکو لوگ جن کی نسبت اس کی طرف کرتے ہیں۔

ہو سکتا ہے تو اسے حدیث رسولؐ دور کر دیتی ہے۔ اس کے برخلاف ابن اللہ والے عقیدے پر قرآن بار بار سخت نکیر کرتا ہے اور اسے کفرِ شدید قرار دیتا ہے۔ کیا پھر بھی ایک مسلمان کی حیثیت میں کسی کے لئے ممکن ہے کہ وہ ایسے خیالات رکھے جیسے آپ کے سوال سے عیاں ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو تعریض آپ نے فرمائی وہ عقل و منطق کے لحاظ سے بھی غیر معقول ہے۔ کاش آپ نے سوچا ہوتا کہ مسیح کو ابن اللہ ماننا کن باطل مضمرات و ثمرات کا حامل ہے۔ بہت موٹی سی بات ہے کہ دنیا کی ہر مخلوق میں باپ اور بیٹے کی نوع اور اجزاء ترکیبی اور مادۂ تخلیق اور خمیر جسمانی میں یکسانیت ہوتی ہے اشتراک ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ آدمی کے صلب سے فرشتہ یا جن پیدا ہو جائے۔ عورت کے بطن سے کوئی نوری یا ناری مخلوق نکل پڑے۔ اللہ کا اگر کوئی بیٹا ہو تو اس کا قطعی مطلب یہ ہو گا کہ اس کی اور اللہ کی نوع ایک ہے۔ دونوں میں جوہری یکسانی پائی جاتی ہے۔ دونوں یا تو مادیت سے ماوراء سرتاسر نور ہیں یا نار یا مٹی۔ دونوں کا مایۂ خمیر ایک ہے۔ یہ مطلب جہاں توحید کا قاتل ہے وہیں عقلِ سلیم کے خلاف اور قیاس سے متصادم اور منطق کی ضد ہے۔ کوئی غیر مسلم خواہ کسی ڈھنگ سے سوچے لیکن ایک مسلمان آخر کس طرح اس مضحکہ خیز اور فاسد ترین عقیدے کو شمہ برابر وقعت دے سکتا ہے۔

رہے وہ دونوں عقیدے جنھیں آپ نے اسی فاسد ترین عقیدے کے مماثل و مشابہ قرار دینے کی کوشش کی ہے تو وہ ایسے ہر فساد اور سقم سے پاک ہیں۔ اللہ نے حضرت آدمؑ کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا تو اس میں کیا قباحت ہے کہ وہ ایک انسان کو بغیر باپ کے محض ماں کے پیٹ سے پیدا کر دے۔ جو شخص اللہ کے ان اوصاف سے واقف ہے جن کی نشاندہی اللہ اور رسولؐ نے کی ہے اس کیلئے تو اس میں کوئی استبعاد اور استعجاب نہیں۔ اور اسی طرح یہ بھی کوئی محال بات نہیں کہ اللہ کسی بندے کو جسم سمیت زندہ آسمان پر اٹھالے۔ ایک جسم تو کیا اگر اللہ نے یہ اطلاع دی ہوتی کہ ہم نے فلاں قوم کے تمام افراد کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا یا فلاں پہاڑ کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر لے گئے یا فلاں سمندر ہمارے حکم سے زمین کا سینہ چھوڑ کر ساتویں آسمان پر جا پہنچا تو کوئی بھی تامل اس اطلاع پر ایمان لانے میں نہ ہوتا۔ جو خدا قادر مطلق ہے۔ جو پانی کی بوند سے انسان جیسی شاہکار مخلوق نکال سکتا ہے، پتھر میں نرم و نازک پودے اگا سکتا ہے، اپنے آخری رسولؐ کو پل کے پل میں عالم بالا کی سیر کرا سکتا ہے اس کے لئے آخر کیا مشکل ہے کہ ایک بندے کو یا پورے کرۂ ارض کو سموچے آسمان پر اٹھالے جائے۔ جن عقلوں پر غبار چھایا ہوا ہے وہی اسے محال و ناممکن تصور کر سکتی ہیں ورنہ یہ اتنا ہی ممکن ہے جتنا دن کے بعد رات کا آنا اور غروب کے بعد چاند کا طلوع ہونا۔ پھر ان دونوں ہی واقعوں میں۔ ــــ یعنی بلا باپ کی پیدائش اور جسم سمیت آسمان پر اٹھالیا جانا ــــ کوئی پہلو اور گوشہ ایسا نہیں جس سے خدا کی ذات و صفات پر حرف آتا ہو۔ کوئی عقلی یا اخلاقی یا طبیعی یا نفسیاتی الجھن نہیں۔ کوئی علت اور سقم نہیں۔ کوئی شرک نہیں۔ کوئی کفر نہیں۔

کیا اب بھی آپ ادراک نہیں فرما سکے کہ مسلمانوں کے مذکورہ عقیدے کسی بھی الزام سے بالاتر کیوں ہیں اور عیسائیوں کے عقائد سراسر باطل و فاسد کیوں۔ عیسائی حضرات قرآن سے جیسی سفیہانہ اور بیہودہ کھلواڑ کرتے ہیں اور بزعم خود جس جہل آرائی کا نام "قرآنی ثبوت" رکھتے ہیں اگر اس کی نامعقولیت اور لغویت آپ نے محسوس نہیں فرمائی تو اس کا مطلب ہے کہ نہ تو آپ نے قرآن پڑھا نہ عیسائیوں کے علم کلام کا مطالعہ فرمایا۔ عیسائیوں کے وکیل کی حیثیت سے جو نکتے اجمالاً آپ نے پیش فرمائے وہ سوائے چرب زبانی کے آخر کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن زور دیتا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم اللہ کے بیٹے نہیں بندے ہیں اور ان کی خصوصیت بس یہ ہے کہ جس طرح اور بے شمار انسان منصبِ نبوت پر

فائز کئے گئے وہ بھی کئے گئے۔ مگر عیسائی کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بیٹے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ عیسیٰؑ ہرگز مقتول یا مصلوب نہیں ہوئے۔ عیسائی کہتے ہیں بلکہ ان کے سارے دین کا محور ہی یہ عقیدہ ہے کہ عیسیٰ مسیح کو سولی دی گئی۔ قرآن کہتا ہے کہ محمد خاتم النبیین ہیں۔ تمام امت کی طرف سے آخری پیغمبر بنا کر بھیجے گئے ہیں اور اب ان کی ہی شریعت دنیا کے لئے آخری مشعلِ راہ ہے مگر عیسائی سرے سے محمدؐ کو آخری پیغمبر ہی نہیں مانتے اور حضرت عیسیٰؑ کو تمام انبیاء پر ایسی فوقیت دیتے ہیں جیسی خدا کو بندوں پر حاصل ہے ـــ قرآن صرف اُس انجیل کی تصدیق کرتا ہے جو حضرت مسیحؑ پر نازل ہوئی تھی مگر عیسائی متی اور مرقص اور یوحنا اور لوقا کی انجیلیں اٹھائے پھرتے ہیں جو مسیحؑ کے سالہا سال بعد لکھی گئیں اور انکی اصل بھی کہیں موجود نہیں اور شرم و حجاب کو بالائے طاق رکھ کر کہتے ہیں کہ قرآن ہماری انجیلوں کی تصدیق کرتا ہے۔

یہ حال جس قوم کے طرزِ استدلال اور علم کلام کا ہو اسکی طرف سے وکالت کسی مسلمان کو توزیب دے نہیں سکتی اور اگر کسی مسلمان کو یہ شوق لاحق ہو ہی گیا ہے تو اپنے استدلال میں کم سے کم اُس معیارِ معقولیت کا تو لحاظ رکھنا ہی چاہیئے جو پوری دنیا میں معروف و مسلم ہے ـــ کیا آنجناب کا خیال یہ ہے کہ قرآن میں واقعی حضرت عیسیٰؑ کو سب سے اعلیٰ اور افضل قرار دیا گیا ہے۔ اگر ہے تو دلائل پیش فرمائیں۔ نہیں ہے تو پھر آپ کو خود ہی عیسائیوں کے دعوے کے باطل ہونے پر مطمئن ہونا چاہیئے تھا۔ اور کیا آپ عیسائیوں کے مانند خود بھی یہی خیال رکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآنی سند اور قطعی دلائل و شواہد کے بغیر محض غلوئے عقیدت میں افضل الانبیاء مان لیا ہے۔ اگر رکھتے ہیں تو صاف کہئے تاکہ ہمیں یہ دھوکا نہ ہو کہ آپ مسلمان ہیں اور ہم وہی طرزِ بحث اختیار کریں جو کسی غیر مسلم کے لئے موزوں ہو سکتا ہے لیکن اگر نہیں رکھتے تو پھر عیسائیوں کے ایک باطل و فاسد خیال کو دہرانے سے فائدہ ؟

آخر میں جو فقرہ آپ نے لکھا وہ بھی ہمارے نزدیک خطا سے خالی نہیں۔ عیسائی گنتی کے اعتبار سے ایک بڑی قوم سہی لیکن یہ بڑی قوم اپنی پوری تاریخ میں کب کہاں کس دن اُس اسٹیج پر آئی ہے جہاں صحیح طرزِ فکر کیساتھ آخرت کی فلاح کے لئے بھی کوئی کام کیا جاتا ہے۔ اُن گہرے تعصبات کو چھوڑیئے جو اس قوم میں مسلمانوں کے خلاف متوارث چلے آرہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جن کے دین و ایمان کی کوئی مستند اصل ہی نہ ہو اور جو خدا کے ایک بندے کو اس کا بیٹا مانے بیٹھے ہوں ان سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ کبھی بھی آخرت کے لئے کچھ کرنے کی پوزیشن میں آسکیں گے۔ استغفر اللہ، قرآن تو اس قوم کے عقائد کو بدترین کفر سے تعبیر کرتا ہے اور آپ ایک مسلمان ہو کر یہ آس باندھے بیٹھے ہیں کہ اس قوم کے ساتھ مل جل کر کوئی ایسا کام بھی کیا جا سکتا ہے جس سے یہ دنیا آخرت کی سرسبز و شاداب کھیتی ثابت ہو جائے! ـ پتھر میں جونک لگ سکتی ہے سورج مغرب سے اور چاند زمین کی تہہ سے نکل سکتا ہے بہار نصیح اُردو میں بات کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی قوم شرکِ مبین میں بھی گرفتار ہو اور فلاحِ آخرت کا بھی کوئی حصّہ اس کے نصیب میں آجائے۔ آقائے کائنات، آمرِ مطلق، خدائے لم یزل کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتا ہے کہ میں ہر گناہ کو معاف کر سکتا ہوں مگر شرک کو معاف نہیں کر سکتا۔ ہاں شرک سے توبہ کرتے ہوئے میرے سامنے گڑگڑاؤ تو شاید معاف کردوں۔

ہم سمجھتے ہیں آپ عقیدہ و فکر کی بھول بھلیوں میں کھو گئے ہیں۔ دوستانہ مشورہ ہے کہ آدھا تیتر آدھا بٹیر کسی مصرف کا نہیں۔ یا تو تہہِ دل سے قرآن و حدیث پر ایمان لائیے اور بنیادی عقائدِ اسلامیہ کو سینے سے لگائیے ورنہ دوسرا کوئی راستہ اختیار کیجئے۔ مسلمان اور عیسائی ـــ دونوں قوموں کے عقائد و نظریات

عام ہو چکے ہیں لہذا ہم سے ان کی وضاحت طلبی فضول ہے۔ وہ سراسر مشرک ہیں بلا ریب وابہام۔ اور مسلمان بلا شک موحد ہیں بشرطیکہ وہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کو سینے سے لگائے رہیں اور خرافاتی عقائد سے بچیں۔

جماعتِ احمدیہ

سوال:- از۔ حسن کیفی۔ ورنگل (دکن)

کیا جماعتِ احمدیہ حق پر ہے۔ اور کیا یہ انگریزوں کی پیداوار ہے؟۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں کے اتحاد میں تفرقہ ڈالنے کے لئے بطور سیاسی ہتھیار استعمال کیا تھا۔ اس کے جغرافیے سے واقف کرائیں۔ ان لوگوں نے قرآن مجید میں تحریف کی ہے۔ ان لوگوں کی نمازِ جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو اس کا ازالہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ یعنی میں اس عمل کا مرتکب ہو چکا ہوں۔ پاکستان میں اس جماعت کو غیر مسلم قرار دینے کی جو تحریک چل رہی ہے اس مکتبِ خیال سے آپ کہاں تک اتفاق کرتے ہیں۔

جواب:-

آپ نوعمر ہیں۔ جس زمانے میں آپ پیدا بھی نہ ہوئے ہوں گے اس زمانے میں علمائے حق نے جماعتِ احمدیہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور آئینہ کی طرح یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ یہ جماعت مسلمانوں کا کوئی فرقہ نہیں ہے بلکہ اسلام سے خارج ایک نئے مذہب کی حامل ہے جو شریعتِ اسلامیہ کی نظر میں دیگر مذاہبِ کفر کی طرح ایک مذہبِ کفر ہے۔

انگریزوں کی پیداوار ہونا نہ ہونا الگ مسئلہ ہے۔ جعلی نبی مرزا غلام احمد قادیانی کی اپنی تحریروں سے دو اور دو چار کی طرح واضح ہو چکا ہے کہ اس جماعت کو انگریزوں کی نہ صرف پشت پناہی حاصل رہی بلکہ مرزا نے بہت کھل کر ان کے قصیدے پڑھے اور ان کی حکومت کو دنیا میں سب سے بڑھ کر خیر و برکت اور انصاف والی حکومت کہا اور اپنی وفاداری کا طرح طرح سے اعلان کرتے گئے۔

لیکن یہ شکل نہ ہوتی تب بھی ان کا خارج از اسلام ہونا شبہ سے بالاتر تھا۔ حضورؐ کے بعد کسی بھی نبی کا قائل تمام علمائے حق کے نزدیک کافر ہے۔ پھر جو شخص نہ صرف دعوۂ نبوت کرے بلکہ پوری بے تکلفی کے ساتھ قرآن کی متعدد آیات کا خاص مخاطب اپنے آپ کو بتائے اور بے شمار واہی باتیں اپنی کتابوں میں لکھے اس کا درجۂ کفر آپ خود سوچ لیجئے۔

ان کی نمازِ جنازہ کا کیا سوال جب یہ مسلمان ہی نہیں آپ بھولے سے پڑھ چکے تو استغفار کیجئے بھول چوک معاف ہو جاتی ہے۔ آئندہ پڑھیں گے تو عذابِ الٰہی کے مستحق ہوں گے۔

پاکستان میں یا کہیں بھی مسلمان اگر یہ مطالبہ کریں کہ قادیانیوں کو مسلمان نہ مانا جائے بلکہ غیر مسلم قرار دیا جائے تو یہ عقل و نقل ہر لحاظ سے ایک صحیح اور جائز مطالبہ ہے۔ قادیانی تو خود ہمیں مسلمان نہیں مانتے۔ ان کی دسیوں تحریریں اسکے ثبوت میں موجود ہیں اور عملی ثبوت آپ اور دیگر دیکھ سکتے ہیں کہ کوئی قادیانی اپنی لڑکی ہم مسلمانوں کو نہ دیگا۔

کسی بھی ملک کی تحریکات کے سیاسی پہلوؤں سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔ پاکستان میں جو تحریک چل رہی ہے قدرتاً اس کے کچھ سیاسی پہلو اور سیاسی مضمرات و عواقب بھی ہو سکتے ہیں۔ ان پر گفتگو سیاست دانوں کا حصہ ہے۔ ہماری گفتگو فقط شرعی نقطۂ نظر سے ہے اور شرعی نقطۂ نظر اس معاملہ میں اتنا واضح ہے کہ سوائے جاہل یا احمق مسلمان کے اور کوئی بھی فردِ ملت ایسے کسی فرقے کو مسلمان نہیں مان سکتا جو حضورؐ فداہ امی و ابی کے بعد کسی کی نبوت کا قائل ہو یا ایک جعلی نبی کو مہدی اور بزرگ مانتا ہو۔ فنعوذ باللہ من ذلک۔

یارو کتنے دیوانے ہیں آج کی دنیا کے فرزانے
اس کو مسیحا مان رہے ہیں درد بڑھایا جسکی دوا نے

نیند کے سائے میں جو گذرے صرف وہی لمحے تھے سہانے
تعبیروں نے توڑ دیئے ہیں خوابوں کے سب تانے بانے

کتنے فنکاروں نے سجائے جسمِ ہوس پر عشق کے چہرے
دیوانوں کا بھیس بدل کر پھرتے ہیں کتنے فرزانے

مجھ کو میرے ہی اندر کی کشمکشِ پیہم نے مارا
عقل کی باتیں عشق نہ سمجھے عشق کی باتیں عقل نہ مانے

میخواروں میں شاید کوئی اتنا سادہ لوح نہ ہوگا
میں نے پہلی ہی توبہ پر توڑ دیئے سارے پیمانے

شہروں کی رونق کے پیچھے ایک بھیانک سناٹا ہے
بستی بستی پھیل گئے ہیں حسرت و حرماں کے ویرانے

یہ جو کوئی سودائی عامرؔ آج درِ جاناں پہ پڑے ہیں
مدت گذری واعظ بنکر آئے تھے مجھ کو سمجھانے

عامر عثمانی

قرآن اور تعمیر سیرت تعلیمات قرآنی کا نچوڑ، تصوف اور ادب صالح کا دل کش مجموعہ ڈاکٹر میر ولی الدین کے قلم سے۔ قیمت مجلد — ۹/۵۰

جائزہ تراجم قرآنی دنیا میں کب اور کس زبان میں قرآن کے تراجم ہوئے۔ اس کی تحقیق و تفصیل مترجمین اور شارحین کے نام۔ بہت عمدہ اور معلومات افزا کتاب ہے۔ قیمت — چھ روپے ۶/-

غنیۃ الطالبین مصنفہ:۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔ قیمت:۔ مجلد — تیس روپے ۳۰/-

اسلام اور ترقی مولانا اشرف علیؒ کے احادیث سے لبریز ارشادات۔ قیمت ۶۰ پیسے

تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانیؒ ملک و ملت کی ایک ممتاز شخصیت مولانا عبداللطیف نعمانیؒ شیخ الحدیث مفتاح العلوم مئو۔ ۱۳۹۲ھ کی دینی، علمی، سیاسی اور مجاہدانہ زندگی کے زندہ جاوید کارنامے اور اہل علم و رہنمایان ملک و ملت کے خراج ہائے عقیدت۔ قیمت — پانچ روپے ۵/-

تاریخ الفخری تاریخ اسلامی کی ایک مشہور اور مستند کتاب کا ترجمہ اُردو، فارسی اور فرنچ زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ آپ کی خدمت میں اُردو ترجمہ حاضر ہے۔ قیمت — تیرہ روپے ۷۵ پیسے ۱۳/۷۵

سفر مصر و حجاز امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کے قلم سے ایک بصیرت افروز معلومات افزا سفر نامہ۔ قیمت — ڈھائی روپے ۲/۵۰

امت مسلمہ کی رہنمائی حضرت عمرؓ کی تعلیمات میں مولانا تقی امینی کی ایک تازہ تصنیف انفرادی و اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں حضرت عمرؓ کے اصلاحی فرمودات و اقدامات، دور رس حکمتوں سے لبریز۔ قیمت — دو روپے ۲/-

آنکھوں کی ٹھنڈک اللہ کے سوا کوئی حاضر و ناظر نہیں جو مسلمان اس غلط خیال کا شکار ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بھی حاضر و ناظر ہیں۔ ان کے خیال کی مدلل تردید قرآن و حدیث کے روشن دلائل، فقہاء و مجتہدین کے مستند حوالے۔ قیمت مجلد — آٹھ روپے ۸/-

مناجات مقبول (کرمی) عکسی مولانا اشرف علیؒ کی مقبول عام اور مفید ترین کتاب پرانے اور نئے اضافوں کے ساتھ۔
قیمت — چھ روپے ۶/- مجلد سات روپے ۷/-

رمضان کیا ہے؟ مولانا محمد عبداللہ دہلویؒ کے نتیجۂ قلم۔ رمضان کے موضوع پر خوبتر کتاب۔ قیمت مجلد — تین روپے ۳/-

تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے شاندار ماضی میں دین کی تبلیغ و تعلیم کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ مسجدیں، راستے، بازار کہیں بھی ہوں مسلمان بنے رہے۔ دنیا کے کاروبار نے انھیں دین سے غافل نہیں کیا۔ از:۔ قاضی اطہر مبارک پوری۔
قیمت — ڈیڑھ روپیہ ۱/۵۰

التشرف احادیث تصوف کی معرفت مولانا اشرف علیؒ کی معروف کتاب۔ سولہ روپے ۱۶/-

مکتوبات خواجہ معصوم سرہندیؒ معارف و اسرار ہدایت و نصائح اور نکات و لطائف سے لبریز خطوط اُردو لباس میں مطالعہ کی بہترین چیز۔ قیمت — چھ روپے ۶/-

صفائی معاملات جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں مولانا اشرف علیؒ نے معاملات کی صفائی کے شرعی طور طریق بیان فرمائے ہیں۔ بڑے کام کا رسالہ ہے۔ قیمت صرف ۸۰ پیسے۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

مدیر زندگی کا مراسلہ اور اس کا جواب

— ۲ —

موصوف کے خط کی دوسری شق

ایک مجلس کی تین طلاقوں کے طلاق بائن مغلظہ ہونے پر اجماع کے دعوٰی کو میں نے اپنے مقالے میں "محل نظر" قرار دیا ہے۔ آپ نے مجھ سے اس پر گفتگو کی تھی اور طلاق نمبر میں بھی آپ نے اس پر گفتگو کی ہے۔ اس کے باوجود اس مسئلے کو اجماعی اور قطعی سمجھنا دشوار ہے۔ میرے نزدیک دعوٰی اجماع کے محل نظر ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ علماء کی ایک جماعت اس مسئلے پر اجماع کا انکار کرتی آ رہی ہے (اس سلسلے میں میں نے غلطی سے ابن حزم کا نام بھی لکھ دیا تھا۔ میرے حافظے میں "بعض اہل الظاہر" کے الفاظ محفوظ تھے۔ لکھتے وقت داؤد ظاہری کے بجائے ابن حزم کا نام قلم بند ہو گیا۔ اس غلطی پر آپ کی تنبیہ کا میں شکر گزار ہوں)

علماء کی جو جماعت دعوٰی اجماع کا انکار کرتی آ رہی ہے اس میں علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے ساطین امت بھی شامل ہیں میں اس کو ایک ثبوت اس لئے مانتا ہوں کہ اگر اس مسئلے پر بلا اشتباہ یقینی طور پر اجماع ثابت ہوتا تو یہ لوگ اس کا انکار نہ کرتے کیونکہ کسی مسئلے پر ثابت شدہ اجماع سے انکار گمرہی ہے۔

دعوٰی اجماع کے محل نظر ہونے کا دوسرا ثبوت میرے نزدیک یہ ہے کہ جو علماء و فقہاء ایک مجلس کی تین طلاقوں کے طلاق بائن مغلظہ ہونے کے قائل ہیں وہ بھی اپنی کتابوں میں اسے اختلافی مسئلہ قرار دیتے آ رہے ہیں اور متعدد صحابہؓ و تابعین اور ان کے بعد کے علماء کی طرف یہ منسوب کرتے آ رہے ہیں کہ وہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک تسلیم کرتے تھے۔ آپ نے اس سلسلے میں لکھا ہے:-

"مدیر زندگی کا اجماع میں شبہ ظاہر کرنا ظاہراً معقولیت کے خلاف نہیں ہے کیونکہ وہ بجا طور پر یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ سیکڑوں سال سے اہل علم اپنی کتابوں میں اختلاف کا ذکر کرتے ہی آئے ہیں اور علمائے خلف کی کتابیں بھی اس ذکر سے خالی نہیں۔

واقعی اس صورت میں یہ سمجھنا ہی چاہئے کہ مسئلہ کسی درجے میں اختلافی ہے لیکن ہم نے انھیں بتایا کہ یہ فتنے اور اختلاف کا بیج دراصل خوارج اور روافض کا بویا ہوا ہے۔ دس بارہ نام جو بعض کتابوں میں اختلاف کرنے والوں کے درج ہو گئے ہیں وہ سب دھوکے کی ٹٹی ہیں۔ جہاں تک صحابہؓ کا تعلق ہے ان میں سے تو کسی ایک کی طرف بھی اختلاف کی نسبت کذب و افترار کے سوا کچھ نہیں۔ سفید جھوٹ۔ باقی ناموں میں اکثریت انکی ہے جو اجتہاد و تفقہ کے بازار میں پھوٹی کوڑی کی بھی قیمت نہیں رکھتے۔ رہے ایک دو وہ نام جن کی واقعی کوئی اہمیت ہے تو ان کی طرف اختلاف کی نسبت ہی درست نہیں۔ قوی سندوں سے نقل کا کہیں پتہ نہیں البتہ اجماع ثابت کرنے والی نقلیں قوی ترین اور کثیر سندوں سے

مردی ہیں جنھیں جھٹلانا کسی واقفِ فن کے لئے
ممکن ہی نہیں۔" (تجلّی' دیوبند' طلاق نمبر صفحہ ۱۶۶)

گذارش ہے کہ آپ کو اپنی اس عبارت پر دوبارہ غور کرنا چاہیئے۔ آپ کی تحریر پڑھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن علماء نے اس مسئلے کو اختلافی قرار دیا اور بعض صحابہؓ و تابعین کی طرف ایک دوسرا قول منسوب کیا ہے۔ کیا وہ خود افترا کرتے رہے اور سفید جھوٹ لکھتے رہے ہیں یا وہ اتنے بے خبر رہے ہیں کہ انھیں اس "دھوکے کی ٹٹّی" "کذب و افترا اور سفید جھوٹ" کا احساس تک نہیں ہوا؟

آپ کی یہ عبارت علماء و فقہاء کی کثیر جماعت کو کس پوزیشن میں ڈال رہی ہے؟ روافض پر آپ کا الزام بھی قابلِ غور ہے۔

اب میں ایک اور بات آپ کے ملاحظہ کے لئے پیش کرتا ہوں۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس مسئلے پر اجماع منعقد ہوگیا ہے' ان کی دلیل کیا ہے؟ ان کی سب سے بڑی دلیل مسلم شریف کی وہی روایت ہے جس کے ناقابلِ استدلال ہونے پر میں نے مقالہ شائع کیا ہے اور آپ نے بھی اپنے انداز میں اس کی پُرزور تائید کی ہے۔ اجماع کا دعویٰ کرنے والے لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک شمار ہیں کی جاتی رہی ہوں تو ان کے فیصلے کے بعد اس پر اجماع منعقد ہوگیا کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں اب تین ہی ہوں گی' انھیں ایک شمار نہیں کیا جائے گا۔ انعقادِ اجماع کی دلیل یہ ہے کہ کسی نے بھی ان کے فیصلے سے انکار نہیں کیا اختلاف نہیں کیا۔ سوال یہ ہے کہ جب وہ روایت ہی قابلِ احتجاج نہیں ہے تو پھر اس سے اجماع ثابت کرنا کس طرح صحیح ہوگا؟ اور جہاں تک مجھے علم ہے اس روایت کے سوا کوئی دوسری روایت موجود نہیں ہے جو اس مسئلے پر انعقادِ اجماع کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہو۔

اس صورتِ حال میں اگر میں نے دعویٰ اجماع کو محلِ نظر قرار دیا ہے تو کیا غلطی کی ہے۔

اس مسئلے پر ایک اور پہلو سے غور فرمائیے۔ اجماع کی اصطلاح تین قسم کے اجماع کے لئے استعمال کی جاتی ہے؛

(الف) ان احکام و مسائل پر اجماع جو کتاب و سنت کے صریح اور قطعی الثبوت دلائل سے ثابت ہوں جیسے نمازِ پنجگانہ۔ زکوٰۃ۔ صومِ رمضان اور حج وغیرہ ان کے لئے بھی علماء "ثابت بالکتاب والسنۃ والاجماع" کے الفاظ لکھتے ہیں۔

(ب) کسی مسئلے میں پہلے کچھ اور حکم تھا اور پھر اس کے خلاف پر اجماع ہوگیا مثلاً پہلے ام ولد کی بیع جائز تھی پھر اس کے عدم جواز پر اجماع ہوگیا۔

(ج) کسی آیت یا حدیث سے مستنبط اجتہادی مسئلے پر اجماع۔ مثلاً مانعینِ زکوٰۃ سے جہاد پر صحابہؓ کا اجماع ہوگیا۔ اب قابلِ غور بات یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے تین ہونے پر آپ جس اجماع کا دعویٰ کرتے یا زوردار تائید کرتے ہیں وہ اجماع کی کس قسم میں داخل ہے؟ پہلی قسم میں داخل نہیں اس لئے کہ کوئی اس کا قائل نہیں اور غالباً آپ بھی اس مسئلے کو نمازِ پنجگانہ کی طرح قطعی نہیں سمجھتے ہوں گے۔ دوسری قسم میں بھی داخل نہیں اس لئے کہ آپ یہ نہیں مانتے کہ حضرت عمرؓ کے فیصلے سے پہلے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو بہرحال ایک شمار کیا جاتا تھا اور بعد کو حضرت عمرؓ نے اسکے خلاف فیصلہ کیا۔ تیسری قسم میں بھی داخل نہیں اس لئے کہ آپ اس کو اجتہادی مسئلہ تسلیم نہیں کرتے تو پھر غور فرمائیے کہ آپ نے جس زور شور سے اس مسئلے پر اجماع ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ کس قسم کا اجماع ہے؟

جہاں تک میں نے غور کیا ہے یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ عہدِ رسالت' عہدِ صدیقی اور ابتدائے عہدِ فاروقی میں ایک مجلس کی تین طلاقیں بہرحال ایک شمار کی جاتی تھیں اور یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ کے فیصلے کے بعد اس مسئلے پر کوئی اجماع منعقد ہوگیا ہے بلکہ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ جمہور کے مسالک کے دلائل قوی

یں، اس لئے ان کا مسلک راجح ہے اور جن لوگوں نے
ایک مجلس کی تین طلاقوں کو بہرحال ایک قرار دیا ہے ان
کے دلائل ضعیف ہیں اس لئے ان کا مسلک مرجوح ہے۔
(۳) مسلم شریف کی روایت پر میرا جو مقالہ شائع ہوا
ہے اس کے تعلق سے آپ نے میری طرف ایک ایسی بات
منسوب کی ہے جس کی کوئی دلیل نہیں دی ہے۔ زبانی گفتگو
میں آپ نے مجھے مخاطب کر کے صرف یہ کہا تھا کہ "آپ فقہاء
سے خفا کیوں ہیں؟" آپ نے کہیں میری عبارت کی نشاندہی
نہیں کی تھی اس لئے میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میری
کس عبارت میں آپ کو فقہاء کی تحقیر و تخفیف نظر آئی اور
میرے کس عبارت سے آپ نے یہ معلوم کیا کہ میرے دل میں
فقہاء کی طرف سے بدظنی اور نفرت موجود ہے فقہاء کی
تعریف اور ان کے احترام میں آپ کی تقریر و تلقین
پڑھ کر احساس ہوا کہ مجھ سے زیادہ خود آپ اس کے
مخاطب ہیں۔ زبانی آپ نے فرمایا تھا کہ طلاق نمبر آپ نے
بڑی نرمی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ لیکن آپ کی جارحانہ
تقلید کی عادت اپنا کرشمہ دکھانے سے باز نہیں آئی ہے
جب آپ نے مجھے تقلید کو دانتوں سے پکڑنے کا مشورہ
دیا تھا اور اپنی تقلید پسندی کا اقرار کیا تھا تو میں نے
ہنستے ہوئے عرض کیا تھا کہ آپ کسی مسئلے میں مقلد جامد
بن جاتے ہیں اور کسی مسئلے میں مجتہد مطلق ہو جاتے ہیں۔ اب
مزید عرض کرتا ہوں کہ اگر میں تقلید کو دانتوں سے
پکڑے رہتا تو مسلم شریف کی روایت پر وہ مقالہ
بھی تیار نہ ہوتا جس کو آپ نے بھی "بہت اچھا" کہا
ہے اور اگر آپ خود تقلید کو دانتوں سے نہ چھوڑتے تو
طلاق نمبر مرتب نہ ہوتا۔ میں بھی اپنے آپ کو مجتہد
نہیں سمجھتا جس طرح آپ اپنے کو مجتہد نہیں سمجھتے۔ اس حقیر
کو بھی یہ علم ہے کہ اجتہاد کا درجہ بہت بلند ہے۔

آپ کا بھائی

سید احمد قادری

تجلّی

آپ نے ادنیٰ تحقیق کے بغیر حافظ ابن حزم کا نام ان
لوگوں کی فہرست میں شامل کر دیا تھا جو یہ رائے رکھتے ہیں
کہ ایک وقت کی تین طلاقیں تین نہیں ایک ہوتی ہیں میں
نے آپ کو بتایا کہ یہ بالکل الٹی بات ہے۔ ابن حزم تو ان
لوگوں میں ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ایک وقت کی تین طلاقیں نہ
صرف پڑ جاتی ہیں بلکہ وہی طلاقِ سنت بھی ہیں۔
یہ معاملہ بحث و نظر کا نہیں نقل کا تھا۔ میں نے بطور
ثبوت ابن حزم کی المحلّی کا نام بھی لیا تھا۔ آپ کے لئے قطعاً
گنجائش نہیں تھی کہ اپنے سہو کی کوئی بُری بھلی تاویل کر سکیں،
لہٰذا آپ مجبور ہو گئے کہ اپنے سہو کو تسلیم کر لیں۔ بظاہر بات
ختم ہو گئی لیکن فی الحقیقت ختم نہیں ہوئی۔ دیکھنا یہ ہے
کہ آپ نے عذر کیا پیش فرمایا ہے اور اس عذر کے مضمرات
کیا ہیں۔
آپ کہتے ہیں کہ میرے حافظے میں "بعض اہل ظاہر" کے
الفاظ محفوظ تھے۔ لکھتے وقت داؤد ظاہری کے بجائے ابن
حزم کا نام قلم بند ہو گیا۔
اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ایک انتہائی اہم مسئلہ
پر ذمہ دارانہ مقالہ تحریر فرماتے ہوئے آپ نے یہ اہتمام نہیں
فرمایا کہ صرف مستند مصدقہ باتیں تحریر فرمائیں بلکہ اٹکل
کے تیر بھی چلا دیئے۔ تین طلاقوں کے مسئلے پر جن چند علمائے
سلف نے طویل و مفصل کلام کیا ہے ان میں حافظ ابن حزم
بھی ہیں۔ کوئی بھی شخص اگر اس موضوع پر واقعی دادِ
تحقیق دینا چاہے تو اس کے شوق و تحقیق کا تقاضا لازماً یہ ہونا
چاہئے کہ ابن حزم کی المحلّی میں بھی یہ بحث پڑھے۔ آپ نے
المحلّی دیکھی تک نہیں مگر مطمئن ہو گئے کہ میں جس موضوع
پر مقالہ لکھ رہا ہوں اس کی تمام وسعتوں اور گہرائیوں
کا مجھے علم ہے اور تمام نقاطِ نظر کا مطالعہ ان کے دلائل
سمیت کر چکا ہوں۔ یہ ایک غیر ذمہ دار ذہن کا رویہ تو
ہو سکتا ہے اُس ذہن کا نہیں ہو سکتا جسے یہ فکر لاحق ہو کہ

میں حرف حرف کے لئے عند اللہ مسئول اور عند الناس جواب دہ ہوں۔

دوسرا مطلب آپ کے عذر کا یہ ہوا کہ بجائے ابن حزم کے اگر آپ داؤد ظاہری کا نام لکھدیتے تو آپ کی دانست میں بات قابل اعتراض نہ ہوتی۔ میں پوچھتا ہوں کیا آپ نے کبھی تحقیق فرمائی ہے کہ داؤد ظاہری کون تھا۔ اس کے کیا عقائد تھے۔ علمائے حق اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نہیں فرمائی۔ اگر فرماتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ علماء اہل سنت کے نزدیک ان ذات شریف کا طرز فکر واہی اور طریق اجتہاد فاسد تھا۔ انھیں ایسا بدعقل اور بدخود غلط شخص کہا گیا ہے جسے نہ اصول شریعت کا ادراک نہ اجتہاد کے طریقوں کی خبر۔ ان کے بعض معتقدات انتہائی لغو و باطل مانے گئے ہیں۔

آپ نے اگر طلاق نمبر پڑھنے کی طرح پڑھا ہوتا تو اس کے صفحہ ۱۴۲ اسے کم سے کم اجمالاً اور مختصراً تو آپ کو معلوم ہی ہو جاتا کہ داؤد ظاہری کا حدود اربعہ کیا ہے۔ میں نے وہاں ازراہ اختصار صرف تین کتابوں کے مختصر اقتباسات پیش کئے ہیں۔ ان ہی سے ہر ہوشمند کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ کسی عالم حقانی اور حق پسند محقق کا داؤد ظاہری جیسے شخص کو دین وشریعت کے کسی مسئلہ میں گواہ بنا کر لانا اپنے ذہنی افلاس اور بے علمی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ یہ کم و بیش ایسا ہی ہوگا جیسے ابو بکرؓ و عمرؓ کو معاذ اللہ منافق اور غیر راشد ثابت کرنے کے لئے روافض وشیعہ کی گواہیاں پیش کی جائیں۔

اگر آپ بھولے سے ابن حزم کا نام نہ لکھتے بلکہ داؤد ظاہری کا لکھدیتے تو اگرچہ غلطی کی نوعیت بدل جاتی مگر ہوتی یہ بھی پہاڑ ہی جیسی غلطی۔ ثقہ اہل علم داؤد ظاہری کو ایک ایسا غلط اندیش اور گم کردہ راہ شخص تصور کرتے ہیں جو اپنی فکری و علمی استعداد کے لحاظ سے تھا تو فقط عامی اور تیسرے درجے کا آدمی لیکن بعض علوم عقلیہ کی آڑ میں اس نے مجتہد کا بھیس بدلا اور شہرت پاگیا۔

افسوس کی بات یہ ہے آپ جیسا ذمہ دار آدمی اپنی رائے کی وکالت میں ایسے بے ننگ ونام گواہوں کا تعاون حاصل کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ غور کر لیجئے کہ آپ کی عذر داری پر "عذر گناہ بدتر از گناہ" کی کہاوت صادق آتی ہے یا نہیں آتی۔

مزید آپ فرماتے ہیں :-

"علماء کی جو جماعت دعویٰ اجماع کا انکار کرتی آ رہی ہے اس میں علامہ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ جیسے اساطین امت بھی شامل ہیں۔"

غلط کہا آپ نے۔ علمائے سلف میں ایسی کوئی جماعت نہیں پائی گئی۔ صرف یہی دو نام ہیں جو آپ نے لئے۔ ان کا وظیفہ آپ ہزار بار پڑھیں مگر یہ مغالطہ مت دیں کہ ان کے علاوہ بھی متعدد اساطین دعوۂ اجماع کے منکر رہے ہیں۔ جسارت آپ کی یہ ہے کہ خود مجھے مخاطب کر کے یہ مغالطہ دے رہے ہیں حالانکہ میں نے طلاق نمبر میں دلائل وشواہد کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ سلف میں کوئی جماعت تو کیا ایک بھی معروف و مستند عالم ایسا نہیں پایا گیا جس نے دعوۂ اجماع کو مشکوک کہا ہو۔ بس ابن تیمیہ اور ابن قیم سات سو سال بعد شک اندوزی کرنے آئے ہیں۔

جمود اور ضد کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔ یہ ناچیز اب بھی اپنی اس دعوت کو دُہراتا ہے کہ جماعت تو درکنار آپ اسلام کے ابتدائی تین سالوں میں ایک بھی معروف و ثقہ مجتہد، صحابی، تابعی، فقیہ، محدث، مفسر یا متکلم کا نام نامی پیش کر دیجئے جس نے صاف صاف یہ کہا ہو کہ ایک وقت کی تین طلاقوں کو تین ماننے پر اجماع مشتبہ ہے۔

آگے چلئے۔ آپ نے منطق یہ استعمال فرمائی کہ اگر اس مسئلہ پر یقینی طور پر اجماع ثابت ہوتا تو ابن تیمیہ وابن قیم اس کا انکار نہ کرتے کیونکہ اجماع سے انکار گمراہی ہے یہ منطق کم و بیش ایسی ہی ہے جیسے قرآن و حدیث کا کوئی حکم پیش کرنے پر بعض خوش عقیدہ پھٹ سے یہ

فرمادیا کرتے ہیں کہ واہ صاحب فلاں شیخ صاحب اور فلاں اعلیٰ حضرت نے تو یوں کہا ہے کیا وہ قرآن و حدیث سے نابلد تھے؟ کیا آپ ہی قرآن و حدیث کے ماہر ہوگئے!

حیرت اور عبرت کی بات ہے کہ آپ تو اس جماعت اسلامی کے رکن ہیں جس کے بنیادی عقائد میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ "اللہ اور رسولؐ کے سوا کوئی معیارِ حق نہیں۔" میرے نزدیک یہ عقیدہ زرِ خالص ہے اس میں کوئی کھوٹ نہیں۔ لیکن آپ کے اعصاب پر فقط دو آدمی ابنِ تیمیہ اور ابنِ قیمؒ اس طرح سوار ہوگئے کہ نہ تو آٹھ احادیثِ رسولؐ کی اہمیت رہی نہ چودہ صحابہؓ کے فتاویٰ کی نہ اُن ضعف در ضعف دلائل کی جو طلاق نمبر میں ملاحظہ سے گذرے ہوں گے۔

ذرا ارشاد تو فرمائیے۔ آپ ایک حدیث کو فن کے قوی ترین دلائل سے من گھڑت ثابت کرتے ہیں تو کیا کسی شخص کا یہ ٹوکنا معقول ہوسکتا ہے کہ اگر یہ من گھڑت ہوتی تو فلاں فلاں محدّث اسے اپنی کتابوں میں کیوں جگہ دیتے۔ انھوں نے جگہ دی تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حدیث موضوع نہیں ہے؟

آپ کو معلوم ہے بہت سی کتبِ حدیث ہیں۔ حتیٰ کہ بعض ان کتابوں میں بھی جو حدیث کی چھ صحیح کتابوں (صحاحِ ستّہ) میں شمار ہوتی ہیں کتنی ہی روایاتِ موضوع داخل ہوگئی ہیں۔ بعد کے متعدد علمائے فن نے نقد و نظر کی روشنی ڈال کر ان کی نشاندہی کی اور اہلِ علم نے مان لیا کہ بیشک یہ من گھڑت ہیں تو کیا ان کے باب میں بھی آپ یہی منطق استعمال فرمائیں گے کہ جب بعض بڑے محدثین نے انھیں موضوع نہیں سمجھا تو اب یہ بات ٹھیک نہیں کہ انھیں بے قیمت قرار دیا جائے اور ان سے حجت نہ پکڑی جائے؟

محض سنی سنائی پر اعتبار کرکے فقاہت کی مسند بچھانا سنجیدہ طریق نہیں۔ آپ نے ابن تیمیہ اور ابن قیم کے ان دلائل کو کبھی فن کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جن کے سہارے وہ اجماع میں نفی نکالتے ہیں۔ میں نے طلاق نمبر میں ضمناً ان بزرگوں کے بعض بنیادی دلائل و افکار کی کیفیت واضح کرکے یہ منقح کردیا ہے کہ اس مسئلہ میں یہ حضرات غلط فہمیوں اور نارسائیوں کا شکار ہیں۔ یہ انسان ہی تھے جو دھوکا بھی کھاتا ہے اور غلط بھی سوچتا ہے۔ ان کا دعوۂ اجماع سے انکار وحیِ الٰہی نہیں ہے کہ اسے کسی بھی دلیل و شہادت سے ساقط الاعتبار ٹھیرایا ہی نہ جاسکے۔

دعوۂ اجماع کے محلِ نظر ہونے کا جو دوسرا ثبوت آپ نے پیش فرمایا اس کا جواز اس وقت تو تھا جب تک طلاق نمبر آپ کی نظر سے نہیں گذرا تھا۔ چنانچہ میں نے خود آپ کو معذور ٹھیرایا تھا اور میری یہی عبارت آپ نے نقل بھی فرمادی ہے۔

لیکن جب میں نے دلیل و شہادت کے ساتھ یہ واضح کردیا کہ جو بھی اہلِ علم اپنی کتابوں میں اختلاف کا ذکر کرتے آرہے ہیں وہ اس مسئلے کی حد تک فریب خوردہ ہیں وہ پروپیگنڈے کا شکار ہوگئے ہیں۔ انھوں نے ایک شور سُنا اور اس کی حکایت کردی لیکن یہ تحقیق نہ فرماسکے کہ شور کی اصل حقیقت کیا ہے۔

اس وضاحت کے بعد کسی بھی طالبِ حق کے لئے دو ہی راہیں تھیں۔ یا تو وہ یہ کہتا کہ نالائق عامر کی فلاں فلاں شہادت اور فلاں فلاں دلیل کمزور یا غلط ہے اور اس دعوے کی دلیل لاتا۔ یا پھر وہ مان لیتا کہ اجماع کو دھواں دھواں پروپیگنڈے کے بل پر کیا گیا ہے ورنہ احادیث و آثار اور تابعین و فقہاء کے نزدیک یہ مسئلہ بے ریب تسک اجماعی رہا ہے یعنی مکمل طور پر متفق علیہ۔

لیکن جناب نہ تو پہلی راہ اختیار کرتے ہیں نہ دوسری بلکہ تیسری راہ اختیار کرتے ہیں یعنی اپنی بات پر اڑنا اور خود مجھ سے ناصحِ مشفق بن کر یہ فرمانا کہ۔

"آپ کو اپنی اس عبارت پر دوبارہ غور کرنا چاہئیے۔"

ایک سوال بھی یہاں آپ نے پیدا کر ڈالا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر عامر نالائق مسئلہ کے اجماعی ہونے پر مصر

ہے تو گویا وہ ان علماء کو مفتری اور کذاب اور مغفل قرار دے رہا ہے جنھوں نے اس مسئلہ کو اجماعی نہیں مانا بلکہ اختلافی کہا۔

میں بلٹ کر آپ سے پوچھتا ہوں کیا طلاق نمبر میں آپ نے یہ نہیں پڑھا کہ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی اور حافظ ابن عبد البر اور امام ابن رجب اور علامہ شامی جیسے اساطین نے اجماع کو مسلّم مانا ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس اجماع کی مخالفت کرنے والا اجماع سے منحرف ہے اس کا قطعاً کوئی اعتبار نہیں۔ علامہ عینی کہتے ہیں کہ اس اجماع کا منکر اہلِ سنت کا مخالف اور بدعتی ہے۔ علامہ شامی نے ۔۔۔ جنھیں آپ بھی بہت بڑا فقیہ مان کر مراسلہ کی پہلی قسط میں ان کی کتاب سے نظائر نقل کر آئے ہیں جو کچھ فرمایا ہے اسے طلاق نمبر کے صفحہ ۱۳۲ اور ۱۳۳ پر پڑھئے۔ وہ تو نسبتاً ماضی قریب کی شخصیت ہیں۔ انھیں آپ سے زیادہ اس بات کا علم تھا کہ بہت سے علماء اس مسئلہ کو اختلافی لکھتے آئے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ کہتے ہیں کہ جملہ صحابہ، تمام تابعین اور ان کے بعد کے ائمۃ المسلمین اس مسئلہ پر متفق ہیں۔ پھر وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اجماع ڈھکا چھپا اور مشتبہ نہیں بلکہ ظاہر و باہر ہے۔ اس کی دلیل بھی وہ ارشاد فرماتے ہیں اور پھر صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ جو اس اجماع سے گریز کرتا ہے وہ گمراہی کا راستہ اختیار کرتا ہے لہٰذا قاضی بھی اگر اس اجماع کے خلاف فیصلہ دے گا تو وہ نافذ نہ ہوگا۔

اگر طلاق نمبر آپ نے پڑھنے کی طرح پڑھا تھا تو یہ سب آپ نے کیوں نہ پڑھا اور اگر یہ سب پڑھ لیا تھا تو یہ موٹی سی بات آپ کے ذہنِ مبارک میں کیوں نہ آئی کہ جو الزام میں سوال کی شکل میں عامر نالائق پر لگا رہا ہوں وہ کہیں زیادہ شد و مد کے ساتھ علامہ شامی اور علامہ عینی اور حافظ ابن حجر جیسے مشاہیر اساتذہ پر پہلے عائد ہو جاتا ہے عامر نے تو اس اجماع سے اختلاف کرنے والوں کو نہ بدعتی کہا نہ گمراہ اہلِ سنت سے خارج مگر یہ حضرات سبھی کچھ کہہ رہے ہیں اور آپ صرف میری طرف منھ کر کے لطور

ناصح مشفق یہ فرما رہے ہیں کہ:-

"آپ کی یہ عبارت علماء و فقہاء کی کثیر جماعت کو کس پوزیشن میں ڈال رہی ہے۔"

ایک اور مغالطہ آپ نے یہاں دیا۔ یا خود مغالطہ کھا گئے میں نے جو یہ کہا ہے کہ کسی بھی صحابی کی طرف مخالف نقطۂ نظر کی نسبت کذب و افترا اور سفید جھوٹ کے سوا کچھ نہیں تو اس کا یہ مطلب آپ نے کیسے نکال لیا کہ میں ان علماء کو مفتری و کذاب کہہ رہا ہوں جنھوں نے اختلاف کو محض نقل کیا ہے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں گھڑی اپنے مذکورہ فقرے سے متصل قبل جب میں یہ کہتا ہوں کہ اختلاف کا بیج دراصل خوارج و روافض کا بویا ہوا ہے تو معمولی فہم کا آدمی بھی میرے اس مدعا کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ کذب و افتراء کی نسبت میں نے خوارج و روافض کی طرف کی ہے اور بعد میں جن علماء نے بلا تحقیق اس من گھڑت کو واقعہ سمجھ کر نقل کر دیا وہ فریب خوردہ ہیں نہ کہ مفتری اور کذاب۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے مثلاً امام ابن ماجہؒ عدم تحقیق کی بنا پر متعدد موضوع احادیث اپنی صحیح میں درج کر گئے ہیں لیکن اس فریب خوردگی کی بناء پر انھیں وضاع اور مفتری تو نہیں کہا گیا۔ گناہِ وضع کے مرتکب اور جھوٹے صرف وہ لوگ تھے جنھوں نے حدیثیں گھڑیں۔ انھیں مطعون کرنے کا یہ مطلب نہ ہوگا کہ امام ابن ماجہ یا دوسرے فریب خوردہ محدثین کو مطعون کیا جا رہا ہے۔

اس مقام پر فقرے کے آخر میں آپ نے یہ جملہ بھی حوالۂ قلم کر دیا ہے کہ:-

"روافض پر آپ کا الزام بھی قابلِ غور ہے۔"

میں عرض کروں گا کہ جب آپ تحقیق کے بجائے تفریح کے موڈ میں ہوں اور اٹکل پچو نام بھی بلا تکلف لے سکتے ہوں تو آپ کو سبھی کچھ قابلِ غور نظر آئے گا۔ اپنی رائے پر اصرار کی رَو میں اگر آپ روافض تک کی وکالت

کرنے کا شوق فرمانا چاہتے ہیں تو بسم اللہ۔ ذرا تفصیلی دلائل روافض کی صفائی میں پیش فرمائیں پھر میں انشاء اللہ آپ کو بتاؤں گا کہ میں نے روافض و خوارج پر الزام دل سے گھڑ کر نہیں لگایا بلکہ اس کیلئے بزرگوں کی نقل رکھتا ہوں۔ موجودہ مرحلے میں مجھے ضرورت نہیں ہے کہ آپ کے مجمل سے فقرے پر تفصیل کے دفتر کھولوں۔

یوں بھی سوچئے کہ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی اور علامہ شامی ان علماء میں ہیں جو متعدد اختلافی اقوال خود ہی اپنی کتابوں میں نقل فرما گئے ہیں۔ اس کے باوجود جب انھوں نے حاصلِ گفتگو کے طور پر مسئلہ کو اہلِ سنت کے مابین شدومد سے اجماعی قرار دیا تو ثابت ہوا کہ اختلاف کا یہ غل غپاڑہ ان اساتذہ کے نزدیک ایسا ہے ہی نہیں جو اجماع میں مانع اور قادح ہو سکے۔ اجماع کسے کہتے ہیں۔ وہ کب اور کس طرح منعقد ہوتا ہے، کس معیار کے علماء کا اختلاف اجماع کو مشتبہ بناتا ہے اور کن لوگوں کے اختلاف سے اجماع پر کوئی اثر نہیں پڑتا یہ باتیں مذکورہ مشاہیر شاید آپ سے اور مجھ سے تو زیادہ ہی جانتے ہوں گے۔ پھر کیا بات ہے کہ آنجناب اختلاف کی بے بنیاد کہانی کو خواہ مخواہ اہمیت دیکر اجماع میں نفی نکالے جا رہے ہیں اور تجلی طلاق نمبر کا تہ در تہ مواد دیکھنے کے بعد بھی بڑے اطمینان سے یہ فرما رہے ہیں کہ مجھے اپنے موقف میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

اجماع کے محلِ نظر ہونے پر دو مذکورہ ثبوت پیش کرنے کے بعد آپ نے جو گفتگو چھیڑی ہے اب اس کے بارے میں سنئے کہ اس کی بسم اللہ ہی غلط ہے۔

آپ سے یہ کس نے کہدیا کہ اجماع کا دعویٰ کرنے والے اپنی سب سے بڑی دلیل مسلم کی اُس روایت کو قرار دیتے ہیں جس کے ناقابلِ استدلال ہونے پر آپ نے مقالہ شائع کیا ہے۔ طلاق نمبر آپ کے آگے موجود ہے۔ مسلم کی مذکورہ روایت پر جتنے رُخ سے گفتگو ممکن تھی وہ میں نے کر ڈالی ہے۔ آپ انگلی رکھ کر بتائیں کہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ اجماع کی سب سے بڑی دلیل یہ روایت ہے۔ اس کے برخلاف میں نے تو بپایانِ کار یہ ثابت کیا ہے کہ یہ روایت اپنی موجودہ شکل میں قابلِ حجت ہے ہی نہیں۔ اس کا تعلق غیر مدخولہ باکرہ کی طلاق سے ہے نہ کہ زیرِ بحث طلاق سے۔ اگر آپ پر اپنی بات کی پیچ کا جذبہ طاری نہ ہوتا تو طلاق نمبر میں شرح و بسط سے بتا دیا گیا ہے کہ دعوۂ اجماع کے دلائل کیا ہیں اور کس قدر روشن اور دو ٹوک ہیں۔ طلاق نمبر کے علاوہ آپ خود اپنا یہ لکھا بھول گئے:۔

> "ان احادیثِ نبوی و آثارِ صحابہ نے پوری طرح واضح کر دیا کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں۔"

آپ کا یہ ارشادِ گرامی "زندگی" سے میں نے طلاق نمبر میں بھی نقل کر دیا تھا۔ جب خود آپ کے نزدیک ایک حدیث نہیں بلکہ متعدد احادیثِ نبوی اور جملہ آثارِ صحابہ نے پوری طرح ایک قانونِ شرعی واضح کر دیا تو اب اِس گل افشانی کا کیا جواز ہے کہ دعوۂ اجماع کی سب سے بڑی دلیل بس مسلم کی ایک روایت ہے!

نقاہت کے لئے میرے دوست ایسا متحمل اور ضابطہ دماغ چاہیئے جو کچھ پچھلا بھی یاد رکھ سکے۔ یہ نہیں کہ جب جو میں آیا کہہ ڈالا۔

آپ نے اجماع کی اصطلاح پر جو متعدد سطور حوالۂ قلم کی ہیں ان پر اگر میں کلام کروں تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ آپ کو شاید معلوم تو ہوگا کہ اس اصطلاح پر اہلِ فن نے سیکڑوں صفحات لکھے ہیں۔ انھیں چند سطروں اور کالموں میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔ میرے قارئین ویسے ہی خشک و دقیق مسائل سے بور ہو رہے ہیں اس لئے میں اس تطویل میں نہیں پڑوں گا کہ الف، ب اور جیم کی ترتیب سے آپ نے جو اقسام پیش فرمائی ہیں وہ کس کس پہلو سے ناقص و تشنہ ہیں۔ ویسے بھی

اس لمبی بحث میں پڑنا ایک صاف وسادہ حقیقت کو الجھانے کے مرادف ہوگا۔ ایچ پیچ اور خواہ مخواہ کی موشگافیوں سے ہٹ کر صاف وسادہ صورتِ حال یہ ہے کہ قرآن وحدیث سے تین طلاقوں کا قاتلِ نکاح ہونا واضح ہے اور ایسی حدیثیں متعدد پائی جاتی ہیں جن میں ایک وقت کی تین طلاقوں کو تین قرار دیا گیا ہے اور بدعی طریقہ اختیار کرنے کو موجبِ گناہ ٹھیرانے کے باوجود حضورؐ نے مؤثر مانا ہے۔ خود قرآن کا بھی یہی اندازِ نظر ہے۔ اس میں صاف کہا گیا کہ بیوی کو ماں کہنا اگرچہ جھوٹ اور گناہ ہے لیکن یہ قول مؤثر ہوگا۔ بیوی حرام ہوجائے گی اور کفارہ ادا کرکے ہی اسے حلال کیا جاسکے گا۔

اس کے برخلاف ایسی ایک بھی حدیث نہیں پائی جاتی جس میں کسی شخص نے تین صریح وغیر مبہم طلاقیں دی ہوں اور حضورؐ نے انھیں ایک قرار دیا ہو۔

آثارِ صحابہؓ کا حال یہ ہے کہ جتنے بھی صاحبِ افتاء اور فقیہ صحابہ ہیں ان میں سے ستر فیصد کے فتاویٰ ایک ہی نقطۂ نظر کی تائید میں ملتے ہیں اور باقی تیس فی صد میں سے ایک بھی اس نقطۂ نظر کے خلاف قول نہیں کرتا۔

ائمۂ مجتہدین کا حال یہ ہے کہ وہ سب اسی نقطۂ نظر پر متفق ہیں۔ ان کے معروف تلامذہ بھی اسی کی حمایت کرتے چلے آرہے ہیں۔ تابعین اور تبعِ تابعین میں بھی جملہ اساتذہ اور اساطین حمایت واتفاق کے سوا کوئی روش اختیار نہیں کرتے۔ سات سو برس تک تمام ممالک میں جملہ اہلِ سنت کے مابین یہ قانون متفقہ طور پر قانونِ شریعت مانا جاتا رہا ہے کہ تین صریح طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں چاہے اکھٹی دو چاہے الگ الگ ۔ کوئی ایک بھی معروف قاضی اس کے خلاف فیصلہ نہیں دیتا۔

کیا یہ صورتِ حال اس دعوے کے لئے کافی شافی دستاویزی شہادت نہیں ہے کہ یہ مسئلہ اجماعی ہے۔ کیا جھوٹے انتسابات اور من گھڑت قصے اور اختلاف کی غیر مصدقہ واہی کہانیاں اس شہادتِ ناطقہ کو مشتبہ بنا سکتی ہیں۔

یہ ایک مکتبی اور فنی بحث ہے کہ کونسا اجماع کس قسم میں داخل ہے اور کونسا عنوان کہاں مناسب رہے گا۔ بے محل اور دورازکار نکتوں سے بات کو الجھانا حق پسندوں کا شیوہ نہیں۔ آپ یہ بتایئے کہ اس آئینے کی طرح روشن صورتِ حال سے گریز وفرار کی آپ کے پاس کیا راہ ہے اور کیا آپ کسی قانونِ شرعی کو صرف اسی صورت میں قطعی اور ناقابلِ تغیر مان سکتے ہیں جب آسمان سے صاف صاف ندا آئے؟ یا جبریلِ امین سامنے آکر گواہی دیں؟

آیئے میں آپ کے علم کلام کی ایک اور غلطی سے آپ کو آگاہ کردوں۔ آپ نے پہلے تو ایک الٹی بات یہ فرض کرلی کہ مدعیانِ اجماع کی سب سے بڑی دلیل مسلم کی وہ روایت ہے جو ناقابلِ استدلال ہے۔ حالانکہ یہ روایت مدعیانِ اجماع کی نہیں بلکہ منکرینِ اجماع کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ عامر نالائق کی تحریر اگر کسی طرح آپ کے فہم مبارک کو اپیل نہیں کرتی تو کم سے کم اپنے "زندگی" ہی کا وہ نمبر دیکھ لیا ہوتا جس میں مقالات شائع فرمائے ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے جو اجماع کے انکاری ہیں اسی روایت کو مستدل بنا کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اکھٹی تین طلاقیں دورِ رسالتؐ اور عہد صدیقی میں ایک ہوا کرتی تھیں حضرت عمرؓ نے انھیں تین بنایا۔ مولانا محفوظ الرحمٰن نے بھی اسی روایت کو اپنے حق میں استعمال فرمایا ہے۔ مولانا شمس پیرزادہ بھی اسی کے بل بوتے پر یہ کہنے کی پوزیشن میں آئے ہیں کہ دورِ رسالت اور دورِ صدیقی میں تین طلاقیں ایک ہوا کرتی تھیں۔ مولانا حامد علی نے بھی اسی روایت کو اپنی سب سے پہلی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ گویا تمام وہ مقالہ نگار جو اجماع سے منحرف ہیں صریحاً اس روایت سے اپنے حق میں استدلال کرتے ہیں اور آپ نہ جانے کس عالمِ خیال میں یہ شگوفہ چھوڑ رہے ہیں کہ مدعیانِ اجماع کی سب سے بڑی دلیل یہ روایت ہے!

اس شگوفے کے بعد آپ نے بزرگوں کے طرزِ بحث

اور علم کلام سے ناواقفیت کا ایک حیرت ناک مظاہرہ کیا۔ وہ یہ کہ اجماع کا انکار اور ایک طبع زاد مسلک پر اصرار کرنے والوں نے جب مسلم کی مذکورہ روایت پیش کر کے یہ استدلال کیا کہ تمام دورِ رسالت اور تمام دورِ صدیقی میں اکھٹی تین طلاقوں کو ایک مانا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے انھیں تین قرار دیا تو اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کا یہ اقدام محض ایک وقتی اقدام تھا جو کسی وقتی مصلحت پر مبنی تھا۔ لہٰذا امت کو حق پہنچتا ہے کہ جب مصالح تبدیل ہوں تو وہ دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقی کی سنت کی طرف لوٹ جائے۔

اس استدلال کا جواب اجماع کا دعویٰ کرنیوالوں نے جس جس پہلو سے دیا اس کی تفصیل تجلی کے طلاق نمبر میں موجود ہے۔ جواب کے مختلف اسالیب میں سے ایک اسلوب یہ بھی ہوا کرتا ہے کہ مدعی کی ایک غلط بات کو تھوڑی دیر کے لئے صحیح فرض کر لیا جائے اور پھر یہ بتایا جائے کہ صحیح فرض کر کے بھی تمہارا ادعویٰ اس سے ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ اہلِ اجماع نے بعض مواقع پر یہ اسلوب بھی اختیار کیا اور فرمایا کہ اگر اس روایت کو قابلِ احتجاج مان لیں اور اس کا مطلب بھی وہی مان لیں جو تم لے رہے ہو تب بھی تمھیں اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا کیونکہ جب حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا تو کسی صحابی نے اس سے اختلاف نہیں کیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام صحابہؓ کے علم میں کوئی ایسا ناسخ موجود تھا جس کی بنا پر دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقیؓ کا حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ ناسخ حضرت عمرؓ کا ذاتی خیال تو ہو نہیں سکتا کیونکہ رسولؐ کے حکم کو کوئی امتی منسوخ نہیں کر سکتا۔ یقیناً رسولؐ ہی کی کوئی ایسی حدیث ہی ہو گی جسے صحابہؓ نے ناسخ مانا لہٰذا اب کسی کو یہ اختیار کہاں سے مل سکتا ہے کہ اللہ کا رسولؐ جس حکم کو منسوخ کر چکا ہو اسے پھر سے زندہ و جاری کرے۔

یہ تھی اہلِ اجماع کی جوابی تقریر۔ علم کلام کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ اس تقریر سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ اہلِ اجماع نے روایت کا وہی مفہوم صحیح مان لیا جو فریقِ مخالف لیتا ہے نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ دورِ رسالت اور دورِ صدیقی کے معمول کا افسانہ حقیقت مان لیا گیا نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اعلان پر اجماع کی بنیاد رکھی گئی بلکہ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر فریقِ مخالف کے غلط و عادی اور باطل مفروضات کو کچھ دیر کے لئے درست بھی فرض کر لیا جائے تب بھی اس کی گاڑی آگے نہیں چلتی۔

لیکن آنجناب اس جوابی تقریر سے یہ عجیب و غریب مفہوم نکالا کہ اجماع کے مدعی ایک ایسی روایت کو مستدل بنا رہے ہیں جو قابلِ استدلال ہی نہیں ہے اور بلا تکلف یہ فقرہ حوالۂ قلم کر دیا کہ:-

"سوال یہ ہے کہ جب وہ روایت ہی قابلِ احتجاج نہیں ہے تو پھر اس سے اجماع ثابت کرنا کس طرح صحیح ہو گا"

یا للعجب۔ یہ آخر آپ کر کیا رہے ہیں۔

میرے مکرم دوست! مسلم کی جس روایت کو آپ بار بار ناقابلِ استدلال کہہ رہے ہیں وہی تو لے دے کے ایک پونجی ہے مخالفینِ اجماع کی۔ اسی کے سہارے تو یہ غلط کہانی مشہور کر دی گئی ہے کہ دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقی میں تین طلاقیں ایک ہوتی تھیں۔ اسے ناقابلِ استدلال مان لیا جائے تو مدعیانِ اجماع کا کچھ نہیں بگڑتا فریقِ ثانی کے پیروں تلے سے زمین کھسک جاتی ہے۔ میں واقعی حیران ہوں کہ آپ کس ترکیب سے بالکل اوندھی باتیں سوچ لینے اور انھیں ہضم کر دینے پر قادر ہو جاتے ہیں۔

آپ کو شکوہ ہے کہ مسلم کی روایت پر آپ کا جو مقالہ شائع ہوا تھا اس کے تعلق سے میں نے آپ کی طرف ایک ایسی بات منسوب کر دی جس کی کوئی دلیل نہیں دی۔

آپ بھول گئے۔ زبانی گفتگو کے دوران میں نے آپ سے کہا تھا کہ خود آپ کے مقالات پر جو مفصل تحریر میں نے لکھی ہے اسے شائع کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا کیونکہ مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میرے اور آپ کے درمیان مباحثہ ہو۔ اُس تحریر میں میں نے اپنی عادت کے مطابق اس بات کا ثبوت بھی پیش کیا تھا کہ آپ فقہاء پر خواہ مخواہ بگڑتے ہیں۔ وہ تحریر میں نے پھاڑ دی اور نئے سرے سے فقط دو صفحے لکھے جو طلاق نمبر میں شائع ہوئے ہیں۔

آپ تجاہل عارفانہ پر اُتر آئے ہیں تو لیجئے دلیل بھی لیجئے۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ اسی "زندگی" کے شمار میں آپ نے مسلم والی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے شوکانی وغیرہ کے جذباتی غلو کا ذکر فرمایا اور پھر تیر انداز کے ملبے اس طرح برابر کئے:۔

"اسی طرح فقہائے احناف اِس روایت کے دوسرے ٹکڑے کو اس مسئلہ پر اجماع کی دلیل بناتے ہیں اور پہلے ٹکڑے کی دوراز کار تاویلیں کرتے ہیں۔ مسالک و مذاہبِ فقہ کی یہ روش نہایت نامناسب رہی ہے۔" صلاح

میں آپ سے پوچھتا ہوں کیا اس ارشادِ گرامی میں جملہ مذاہبِ فقہ کی عموماً اور احناف کی خصوصاً تحقیر و تنقیص موجود نہیں رہی ہے؟

آپ شاید فقہاء کی تحریروں میں اپنا ذہن پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اسی لئے ان کی بعض کار آمد باتیں بھی آپ کو دور از کار محسوس ہوتی ہیں اور ان کی مناسب روش بھی نامناسب لگتی ہے۔ میں نے طلاق نمبر میں زیر بحث مسئلے پر بڑے بڑے فقہاء کا طرزِ فکر اور اندازِ بحث اور علم کلام مفصلاً پیش کر دیا ہے۔ انگلی رکھ کر بتائیے کہاں کون سی بات انھوں نے دور از کار کہی اور کس جگہ نامناسب روش پر چل نکلے۔ الزام لگایا ہے تو دلیل دیجئے۔ میں تو اس مسئلے میں مستند فقہاء کی روش کو کہیں بھی غیر مناسب اور دور از کار نہیں پاتا۔

آپ میری تنقیدوں کو جارحانہ نہیں قاتلانہ بھی کہہ لیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ عامر نالائق کو زبان و قلم کے معاملہ میں نا اہل مان لیا جائے۔ بدتمیز اور بے سلیقہ ٹھیرا دیا جائے۔ چلئے سر آنکھوں پر۔ لیکن اس سے اُن عقلی و نقلی دلائل کا جواب تو نہیں بنتا جنھیں یہ نا اہل تجلی کے صفحات پر بکھیر آیا ہے۔

آج کل عام طریقہ ہے کہ ہر حملہ آور اپنے آپ کو مدافع اور جس پر حملہ کیا ہے اسے جارح قرار دیتا ہے۔ یہی تکنک آپ بھی استعمال فرما رہے ہیں۔ تاہم میں اپنے جارح نہ ہونے پر اصرار نہیں کروں گا۔ اصرار کیوں کروں۔ خدا دیکھ رہا ہے کہ میں اپنی کوئی حقیقت ہی نہیں سمجھتا۔ میں ایک خاطی دگناہ گار طالب علم ہوں جو ذاتی قابلیت کچھ نہیں رکھتا محض دوسروں کے خوان علم و تفقہ سے ریزے چُنتا ہے۔ مجھے جارح کہو۔ ہرزہ سرا قرار دو۔ بے بضاعت اور کم فہم ٹھیراؤ۔ میری انا کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگے گی۔ انا کے شیطان کو میں نے کبھی قریب نہیں آنے دیا۔

لیکن پیارے دوست۔ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں! میں نے دسیوں بار تجلی کے صفحات میں اپنی مختلف غلطیوں کا کھلا اعتراف کیا ہے۔ کیا آنجناب نے بھی زندگی کے صفحات میں یہ توہین کبھی گوارا فرمائی ہے؟

اور اسے بھی چھوڑیئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میں لوگوں کے عیوب کے ساتھ ان کے کچھ محاسن بھی بیان کر دیا کرتا ہوں۔ مثلاً اسی طلاق نمبر میں آپ کے مقالات کے لئے میں نے تعریفی الفاظ بھی لکھے ہیں اور ایک مقالہ کو بہت اچھا بھی کہا ہے لیکن آپ کا ظرف یہ ہے کہ طلاق نمبر ملاحظہ فرمانے کے بعد اتنا لمبا مراسلہ تعریض و اعتراض کا تو رقم فرما دیا مگر اس میں ایک حرف ایسا نہیں آنے دیا جس سے عامر بیچارہ یہ تاثر لے سکے کہ اس کی کوئی ادا حضور کو پسند بھی آئی ہے۔ بخل سا بخل۔ لوگ اخلاقاً بھی ایک آدھ کلمۂ خیر کہہ ہی دیتے ہیں مگر شاباش ہے آپ کی وسعتِ قلبی اور اعلیٰ ظرفی کو

کہ حوصلہ افزائی، محبت، تحسین کا ایک حرف زبان پر لانا گوارا نہیں فرمایا حالانکہ پورا طلاق نمبر اسی موقف کی حمایت میں ہے جو بنیاداً خود آنجناب کا موقف ہے اور اختلاف جناب سے مجھ گناہ گار نے محض جزواً اور ضمناً کیا ہے۔ گویا جو شخص آپ سے حرفاً حرفاً اتفاق نہ کرے بلکہ کسی جزو سے اسے کچھ اختلاف ہو اس کے خلاف آپ کے ذہن و قلب میں اتنی بھی گنجائش نہیں کہ تواضعاً اور اخلاقاً ہی ایک دو حرفِ تحسین کہنے کے روادار ہو سکیں۔

مجھے دیکھئے۔ آپ سے بالمشافہ گفتگو کا جو حال میں نے طلاق نمبر کے صفحہ ۱۵۶ پر لکھا ہے اس میں تواضع کی کیا روش اختیار کی ہے۔ آپ نے غلط طور پر ابن حزم کا نام درج مقالہ کیا۔ میں نے ٹوکا کہ یہ اُلٹی بات ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ابن حزم کی محلی مجھے میسر ہی نہ ہوئی لہٰذا بے تحقیق ابن حزم کا نام لکھا گیا۔ اس واقعے کے سلسلے میں مَیں نے یہ طرزِ تحریر اختیار کیا ہے:۔

"اس اعتراض کا جواب موصوف نے ایک دیانتدار اور بندہ مومن کی طرح یہ دیا کہ ....."

انصاف کیجئے۔ آپ کے قصور پر لے دے کرنے کے عوض میں نے دو اعلیٰ درجے کی صفات آپ کی طرف منسوب کر دیں حالانکہ آپ کے اعترافِ خطا میں نہ کوئی شانِ دیانت تھی نہ شانِ ایمانی۔ وہ تو ایک مجبوری میں آپ اعتراف کر رہے تھے۔ آپ کے بس میں نہیں تھا کہ کوئی نیا ابنِ حزم پیدا کریں یا المحلی کے متعلقہ اوراق ناپید کر دیں۔ تاویل کی کوئی ادنیٰ صورت میسر نہیں تھی اس لئے اعترافِ خطا کرنا پڑا۔ ظاہر ہے اس طرح کے اعترافات کا تعلق جذبۂ دیانت یا خلوصِ ایمانی سے نہیں ہوا کرتا پھر بھی میں نے توصیفی پیرایہ اختیار کیا۔ علاوہ اس کے اوپر نیچے متعدد جگہ آپ کی صالحیت اور اعلیٰ ظرفی اور اخلاص وغیرہ کے گن گائے۔ پھر اگر میں جائح ہوں تو انصاف اور حسنِ اخلاق شاید اسی کا نام ہوگا کہ جس طلاق نمبر کے ورق ورق پر مجھ قلم کے مزدور کا پسینہ اور خونِ جگر ہر شخص دیکھ سکتا ہے اسے اول سے آخر تک پڑھ لینے کے بعد آپ اپنے طویل مکتوب گرامی میں چھوٹوں کو بھی کوئی لفظ حوصلہ افزائی کا نہ لکھیں۔ گویا آپ علم و تفقہ کے اتنے اونچے مینار پر سکونت پذیر ہیں کہ وہاں سے عامر جیسے اطفالِ مکتب کی کوئی بھی دردسری اور محنت فقط بچوں کا کھیل نظر آتی ہے۔ اگر صالحیت اور حسنِ اخلاق اور حلم و فیاضی اسی کا نام ہے تو میں بس ایک شعر پر یہ کالم بند کروں گا۔

کامل اِس فرقۂ زہّاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

تقلید کے سلسلے میں آپ نے یہ طعن فرمایا ہے کہ تم کسی مسئلے میں مقلد جامد بن جاتے ہو اور کسی مسئلے میں مجتہدِ مطلق ہو جاتے ہو۔

بے شک یہ طعن ہنستے ہوئے ہی کیا گیا تھا اور میں جوابی تبسم کے ساتھ اسے پی گیا تھا۔ پی اس لئے گیا تھا کہ مجھے ملاقات کی اُس مختصر سی مجلس کو مکدر کرنا پسند نہ تھا۔ نیز مجھے توقع تھی کہ میرا نرم اور نیازمندانہ رویہ شاید آپ کے خود پسند ذہن کو اس بات کے لئے تیار کر سکے کہ آنے والا طلاق نمبر ٹھنڈے دل سے پڑھیں اور اپنی بعض ناقص آرا سے رجوع فرمائیں۔

لیکن اب جب کہ مجھے یقین ہو چکا ہے کہ آپ اپنی کسی بھی رائے سے پسپائی اختیار کرنے والوں میں نہیں ہیں کفِ قلم کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔

طعن کا جواب سُنئیے۔ پہلے آپ کو یہ تحقیق کرنی چاہئیے کہ اجتہاد کسے کہتے ہیں اور تقلید کسے۔ میں گناہگار اپنے ہر نقطۂ نظر کو اگر شدومد اور زور شور سے پیش کرنے کا عادی ہوں اور قائلانہ جارحیت میرے قلم میں پائی جاتی ہے تو آپ نے شاید اسی کو یہ معنی پہنا دیئے ہیں کہ عامر بجائے مقلد کے مجتہدِ مطلق بن بیٹھتا ہے۔ یا پھر آپ شاید اس لئے یہ طعن فرما رہے ہوں کہ عامر اپنے اساتذہ اور ہم حلقہ بزرگوں کی رائے کے برعکس جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کی حمایت کرتا ہے لہٰذا وہ مقلد کہاں ہوا۔

اگر یہی وجوہ ہیں تو میں کہوں گا کہ آپ تقلید و اجتہاد
...فہوم ہی نہیں سمجھے اور اگر کوئی اور وجہ ہو تو اسے سامنے
...یے۔ تجلی کا ۲۴ سالہ فائل موجود ہے' نکال کر دکھلایئے
...کے کس مسئلے میں میں نے مستند ائمۂ احناف کی رائے کے
...ف مسلک اختیار کیا ہے۔ مجھے ایسا یاد نہیں۔ اگر یہ خطا
...سے سرزد ہوئی ہو گی تو اطمینان رکھیئے کہ آگاہ ہو جانے
...بعد ایک لمحے کی بھی دیر رجوع اور اعترافِ خطا میں نہ
...ں گا۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھا نہ آج
...ا ہوں نہ تا دمِ مرگ سمجھوں گا کہ فقہی مسائل میں ابوحنیفہؒ
...یوسفؒ و زفرؒ یا ابنِ ہمام اور زیلعی یا حصکفی و شامی کے
...قابل زبان کھول سکوں۔ ہاں اعتقادی و نظری مسائل کی
...ملت میں سوائے خدا اور رسولؐ کے کسی کو اس مرتبے کا حامل
...ں مانتا کہ اس کا قول حرفِ آخر ہو اور میں اپنے دل و دماغ
...کا تابع بنا دوں۔

یہ بات میری عقلِ ناقص میں بالکل نہیں آئی کہ میرا
...ق نمبر مرتب کرنا آخر یہ معنی کیسے رکھتا ہے کہ میں نے تقلید
...دامن چھوڑ دیا۔ پیارے بھائی! پہلیاں کیوں بجھواتے
...۔ کونسی عینک ہے جسے لگا کر پڑھنے سے آپ کو یہ نظر آیا
...طلاق نمبر کے مرتب نے تقلید کا قلادہ اتار پھینکا ہے۔
...نے سے پہلے تول بھی لیا کیجئے۔ دوسروں کو احمق سمجھنے والے
...گفتگو کا یہ غیر ذمہ دارانہ طریق اختیار کرتے ہیں میں یقیناً
...رانہ سے پردہ اٹھانے کی درخواست کروں گا کہ طلاق
...کے کس کونے میں مرتب کے تارکِ تقلید ہونے کا ثبوت
...پڑا ہے۔

واضح صورتِ حال یہ ہے کہ مجھ پر ترکِ تقلید کا الزام
...مجتہدِ مطلق بننے کا طعن تو ابھی محتاجِ دلیل ہے مگر آپ کا
...بارے میں یہ فرمانا کہ "میں بھی اپنے آپ کو مجتہد نہیں
...سمجھتا۔" خلافِ واقعہ ہونے میں نقد دلیل سے مشرف ہے
...یا جائے کہ چاروں مکاتبِ فقہ میں کس امام فقہ نے
...بے سر و پا مسلک اختیار کیا ہے کہ جو شخص اس خیال سے
...تین کی صراحت کے ساتھ طلاق دے کہ اس کے بغیر

طلاق واقع نہیں ہوتی ایسی تین طلاقوں کو ایک شمار کرنا
چاہیئے۔

میں جواب میں کہانیاں نہیں سنوں گا۔ جتنے نظائر آپ
نے کتب فقہ سے پیش کئے تھے ان کا تجزیہ کر کے میں دکھا آیا
ہوں کہ آپ کے مسلک کی کوئی بنیاد ان میں نہیں۔ آپ مجھے
کسی معروف و مستند کتاب فقہ کے حوالے سے کسی ایک امام
فقہ کا ایسا قول نقل کر کے دکھلائیں جس میں واضح الفاظ میں
وہ رائے ظاہر کی گئی ہو جو آپ نے ایجاد فرمائی ہے۔

حالانکہ میرا مطالبہ دراصل یہ ہونا چاہیئے تھا کہ جس
مکتبِ فقہ کی تقلید آپ فرماتے ہیں صرف اسی مکتبِ فقہ
کے کسی مجتہد و امام کی نقل پیش کیجئے کیونکہ وہ شخص مقلد نہیں
ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف مکاتبِ فقہ کے پیچھے چل کھڑا
ہوتا ہو اور کسی ایک اصولِ فقہ پر نہ جمے۔ تاہم رعایتہً
میں نے آپ کو وسعت دیدی ہے کہ چاروں مکاتبِ فقہ میں
سے کسی بھی مکتب سے اپنی عجیب و غریب رائے کی تائید میں
قول لے آیئے۔

اگر نہیں لا سکتے ——— اور میں کہتا ہوں کہ نہیں لا سکیں
گے تو اس کے سوا کیا منظر سامنے آیا کہ ایک ہی سانس
میں آپ دعوۂ اجتہاد بھی کر رہے ہیں اور خود کو مجتہد نہ
سمجھنے کا اعلان بھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ زندگی میں بعض سوالات کا
جواب دیتے ہوئے آپ نے فقہ حنفی سے علیحدہ روش پسند
فرمائی ہے۔ میرے پاس فائل ہوتا تو ڈھونڈ کر نمونے نکالتا
مگر بحالتِ موجودہ ایک نمونہ سامنے ہی ہے تو کیوں رامپور
آ کر آپ سے فائل ٹٹولنے کی اجازت مانگوں۔ ہاں اگر آپ دعوت
دیں گے کہ نمونہ نکال کر دکھلاؤ تو میں رام پور کے سفر سے بھی
گریز نہیں کروں گا۔ ریسرچ کے لئے لوگ ٹمبکٹو اور سکاٹ
تک جاتے ہیں تو مجھے رام پور تک جانے میں کیا تامل ہوگا۔

تفسیر ماجدی

(۹)

پچھلی روش کے مطابق ہم پہلے سورۂ توبہ کے ترجمے
گاہ ڈالتے ہیں پھر تفسیر کا مطالعہ کریں گے۔
) اِس سورۃ کی چوتھی آیت کا ترجمہ مولانا دریابادی
نے یہ فرمایا:۔

"مگر ہاں وہ مشرکین اس سے مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے
عہد لیا پھر انھوں نے تمھارے ساتھ ذرا کمی نہیں
کی اور نہ تمھارے مقابلے میں کسی کی مدد کی سو ان کا
معاہدہ ان کی مدت (مقررہ) تک پورا کر دو۔"

ب ہم مولانا اشرف علیؒ کا ترجمہ دیکھتے ہیں تو یہ ملتا ہے:۔

"مگر وہ مشرکین مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے عہد لیا پھر
انھوں نے تمھارے ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ تمھارے
مقابلے میں کسی کی مدد کی سو ان کے معاہدے کو ان
کی مدت تک پورا کر دو۔"

نوں ترجموں میں خود مولانا دریابادی بھی اور جملہ
ن بھی مقابلہ کر کے دیکھیں کیا یہ محسوس نہیں ہوتا کہ
جمہ دوسرے ترجمے کی تقریباً نقل ہی ہے نہ کہ کوئی الگ
الانکہ جب فاضل مفسر نے مترجم ہونے کی ذمہ داری
ا ہے تو ترجمے میں الفاظ ان کے اپنے اور فقروں کا دروبست
نا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ شعروں اور مصرعوں میں تو توارد
ا ہے اور ہوتا ہے لیکن تیس سے زیادہ الفاظ والے
، بھی لفظاً متوارد ہو جائیں یہ عادۃً محال ہے۔ اردو
بت سے ترجمے ہوئے ہیں لیکن مفہوم کی یکسانیت کے
باوجود الفاظ اور ان کا دروبست ہر مترجم کے یہاں الگ ملیگا
پھر کیا ہم یہ سمجھیں کہ فاضل مفسر نے اپنے ترجمے میں کہیں کہیں
محض نقل سے بھی کام چلایا ہے۔

دوسری بات جو یہاں قابلِ گفتگو ہے وہ عٰهَدْتُّمْ
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کا ترجمہ ہے:۔ فاضل مفسر اور مولانا
اشرف علیؒ دونوں ہی نے اس کا ترجمہ فرمایا ــــ "جن سے
تم نے عہد لیا۔"

ہماری ناچیز رائے یہ ہے کہ اردو روزمرہ کے اعتبار سے
یہ ترجمہ ناقص ہے۔ بلکہ خود عربی قاعدے سے بھی اس میں خامی
ہے۔ عٰهَدْتُّمْ کا مصدر ہے معاہدہ اور معاہدہ اُس عہد کو
کہتے ہیں جو دو فریقین کے درمیان واقع ہو۔ اس میں دونوں
فریق اپنے اپنے شرائط رکھتے ہیں اور اپنے اپنے لئے ذمہ داریاں
قبول کرتے ہیں۔

اس کے برخلاف کسی کا کسی سے عہد لینا بالکل دوسری
ہی بات ہے۔ یہ ایسے موقعہ پر بولتے ہیں جیسے مثلاً باپ بیٹے
سے یوں کہے کہ عہد کرو آج کے بعد مدرسہ جانے میں دیر نہیں
کروگے۔ یہاں معاہدہ نہیں ہوا بلکہ وعدہ لیا گیا۔ یہ دو فریقوں
کا معاملہ نہیں بلکہ یہاں فریق کوئی ہے ہی نہیں۔

"امریکہ اور جرمنی نے معاہدہ کیا" ــــ جس موقعہ پر
یہ فقرہ بولا جاتا ہے کیا اس موقعہ پر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ
"امریکہ نے جرمنی سے عہد لیا"؟ نہیں کہہ سکتے۔ قرآن
یہاں معاہدوں کا ذکر کر رہا ہے جو کفار و مسلمین کے مابین

دو فریقوں کی حیثیت سے کئے گئے ہوں۔ کسی ایسے وعدے اور عہد کی بات نہیں کر رہا ہے جو مسلمانوں نے اپنی قوت اور بالادستی کے تحت کفار سے لیا ہو۔

ویسے بھی دیکھ لیجئے۔ ایک باپ یا استاد یا حاکم اگر کسی سے کوئی وعدہ اور عہد لیتا ہے تو اس عہد کو پورا کرنے کی ذمہ داری اس شخص پر عائد ہوتی ہے جس سے عہد لیا گیا ہے۔ عہد لینے والے پر اس سلسلہ میں کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی حالانکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ اے مسلمانو اگر کفار و مشرکین معاہدے پر قائم رہیں تو تم بھی معاہدے پر قائم رہو، اور جس وقت تک کے لئے یہ معاہدہ ہوا ہے اس وقت تک اس کی خلاف ورزی مت کرو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں کسی ایسے وعدے اور عہد کا ذکر نہیں ہے جو مسلمانوں نے کفار سے لیا ہو بلکہ ایسے معاہدے کا ذکر ہے جس میں خود مسلمانوں نے بھی کچھ وعدے کئے ہوں اور کچھ ذمہ داریاں اپنے اوپر لی ہوں۔

چنانچہ رئیس المترجمین شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ یہ ہے:۔

"مگر وہ کوئی کہ عہد کیا ہے تم نے مشرکوں سے۔"

شاہ صاحب نے اگرچہ معاہدہ کا لفظ استعمال نہیں فرمایا لیکن "عہد لیا" کے بجائے "عہد کیا" لکھ کر قرآن کا اصل مطلب واضح فرما دیا۔ "لیا" اور "کیا" میں جو فرق ہے محتاجِ تشریح نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بات اگرچہ معاہدے ہی کی ہے لیکن قرآن کے مخاطب یہاں چونکہ صرف مسلمان ہیں اس لئے حقیقۃً بات صرف ان وعدوں کی ہے جو مسلمانوں نے اس معاہدے کے اندر مشرکوں سے کئے ہوں۔ وعدہ کرنے والے ہی اس حکم کے مخاطب بن سکتے ہیں کہ مدتِ مقررہ تک انھیں پورا کرو۔

حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ یہ ہے:۔

"مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا۔"

مولانا مودودی کے الفاظ یہ ہیں:۔

"بجز اُن مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے۔"

عہد لینا اور عہد کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔ فاضل مفسر اور حضرت مولانا اشرف علیؒ دونوں کے ترجمے نے بات کو اُلٹ دیا ہے حالانکہ دانستہ انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ مفہوم ان کے ذہنوں میں بھی یقیناً وہی رہا ہوگا جو آیت شریفہ کا ہے مگر ذہن کی تھوڑی سی اونگھ نے قلم کا قدم ڈگمگا دیا۔

ویسے مولانا دریابادی یہ فرما سکتے ہیں کہ ہم نے تو "کیا" لکھا تھا کاتب نے "لیا" لکھ دیا۔ لیکن مولانا اشرف علیؒ کی طرف سے یہ معذرت مشکل ہے کیونکہ ہم نے ترجمۂ اشرفیہ کے متعدد ایڈیشن دیکھے جن میں تاج کمپنی والا صحیح ترین ایڈیشن بھی شامل ہے سب میں "لیا" پایا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت تکوینی ہی ہمیشہ سے یہ چلی آرہی ہے کہ ہر انسان اپنی بشری کمزوریوں کا عملی ثبوت دیتا رہے۔ بس بے خطا اور کمزوریوں سے پاک تو صرف ایک ہی ذات ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جلّ جلالہٗ و عمّ نوالہٗ۔

(۲) آیت ۱۳۔ وَهُمْ بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ۔

فاضل مفسر کا ترجمہ:۔

"اور انھوں نے تمھارے مقابلے میں اوّل خود ہی ابتدا کی پہل کی۔"

یہاں گفتگو مفہوم میں نہیں الفاظ میں ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ کے زمانے میں زبانِ اُردو اور ادبِ اُردو کا جو معیار تھا اس کے اعتبار سے اگر وہ ایسا ترجمہ کرتے تو حیرت کی بات نہیں تھی لیکن آج ادبِ اُردو اور انشائے اُردو کا جو معیار ہے اسے ملحوظ رکھئے تو حیرت ہی کرنی پڑے گی کہ مولانا دریابادی جیسا ادیبِ شہیر اور ایسا بے ہنگم ترجمہ۔ اوّل۔ ابتدا۔ پہل۔ سارے ہی ہم معنی الفاظ یکجا کر کے رکھ دیئے۔ مولانا خود ہی اس پر نگاہِ غور ڈالیں کیا یہ واقعی ان کے شایانِ شان زبان ہے۔ یہاں تو مولانا اشرف علیؒ کی زبان بھی اتنی فرسودہ نہیں حالانکہ وہ ماضی کی شخصیت ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے:۔

"اور انھوں نے تم سے خود پہلے چھیڑ نکالی۔"

حضرت شیخ الہند رح کا ترجمہ یہ ہے:-

"اور انھوں نے پہلے چھیڑ کی تم سے۔"

مولانا مودودی کا ترجمہ یہ ہے:-

"اور زیادتی کی ابتدا کرنے والے وہی تھے۔"

قرآن ہی تو بتا رہا ہے کہ جن اہلِ کفر نے اپنی قسمیں توڑیں اور رسول صلعم کو جلا وطن کرنے کی ٹھانی اور تمھارے ساتھ زیادتی کرنے میں پہل کی ان سے قتال کرو۔ اس کے لئے آخر اس کی کیا ضرورت ہے کہ اول اور ابتدا اور پہل سارے ہی الفاظ ترجمہ میں جمع کر دیئے جائیں۔

(۳) آیت ۲۸۔ وَ اِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً فَسَوْفَ یُغْنِیْکُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ اِنْ شَاءَ۔

مفسر ممدوح کا ترجمہ:- "اور اگر تم کو مفلسی کا اندیشہ ہو تو اللہ تمھیں اگر چاہے گا اپنے فضل سے (ان سے) بے نیاز کر دے گا۔"

پہلی بات تو زبان سے متعلق ہے۔ اشعار میں تعقید تو اس لئے گوارا ہو جاتی ہے کہ وزن کی پابندی ہے لیکن نثر میں تعقید عموماً ناگوار ہی ہوتی ہے۔ "تمھیں" کا لفظ ناموزوں جگہ آیا۔ فصیح عبارت یوں ہوتی:-

"اللہ اگر چاہے گا تو تمھیں اپنے فضل سے....."

دوسری بات قواعد عربی سے متعلق ہے۔ عربی کی وسعت اور گوناگونی کے کیا کہنے۔ غ۔ ن۔ ی سے نہ جانے کتنے باب اور کتنے معانی بنتے ہیں۔ جیسے غَنِیَ یَغْنیٰ (باب سمع یسمع) نکاح کرنا بے نیاز آرائش ہونا۔ غنّٰی یُغَنِّی (باب تفعیل) گانا عشق بازی کرنا۔ تعریف یا مذمت کرنا۔ پھر اسی باب میں جب یوں کہیں کہ غنّاہُ فلانٌ تو مطلب ہوتا ہے کہ اس نے اسے مالدار بنا دیا۔

مفسر ممدوح بھی یقیناً جانتے ہی ہیں کہ عربی میں کیسی باریکیاں ہیں اور ہم جیسے اطفالِ مکتب اُن جیسے فاضل استاد سے یہی توقع رکھ سکتے ہیں کہ قرآن کا ترجمہ وہ عربی زبان کی باریکیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کریں گے۔

مگر بعض اور مقامات کی طرح یہاں بھی اس توقع کو دھکا لگا۔ یُغْنِیْکُمْ یہاں باب افعال سے آیا ہے۔ اِغْنَاء کے معنی بے نیاز کر دینے کے بھی آتے ہیں مگر جبکہ اس کا صلہ عَنْ آئے یا پھر ایسا مِنْ آئے جو سببیت کے لئے نہ ہو بدل کے لئے ہو۔ قرآن ہی سے چند مثالیں لے لیجئے۔

سورۂ جاثیہ:- اِنَّھُمْ لَنْ یُّغْنُوْا عَنْکَ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا۔

یوسف:- مَا کَانَ یُغْنِیْ عَنْھُمْ۔

طور:- یَوْمَ لَا یُغْنِیْ عَنْھُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا۔

دخان:- یَوْمَ لَا یُغْنِیْ مَوْلًی عَنْ مَّوْلًی شَیْئًا۔

ان جیسے تمام مقامات پر امیری و دولت مندی کا کوئی ذکر نہیں بلکہ بے نیازی ہی واحد مفہوم ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ سب جگہ عَنْ صلہ آ رہا ہے۔

سورۂ نجم اور سورۂ یونس میں:- اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ۔

یہاں بھی دولت کا ذکر نہیں کیونکہ حرف مِنْ بدل کے طور پر ہے سببیت کے لئے نہیں ہے۔ اسی طرح سورۂ غاشیہ میں لَا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ۔ یہاں بھی مِنْ سببیت کے لئے نہیں لہٰذا مفہوم بے نیازی ہے نہ کہ دولتمندی۔

لیکن مثلاً سورۂ نور میں:- اَنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَاءَ یُغْنِھِمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ کا ترجمہ لازماً یہ ہوگا:-

"اگر وہ مفلس و بے زر ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے امیر و زردار بنا دے گا۔"

یعنی بے نیازی جیسا وسیع المصداق لفظ ترجمے میں استعمال نہ ہوگا بلکہ ایسے ہی الفاظ استعمال ہوں گے جو مال و جائداد کا مصداق لئے ہوئے ہوں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ "بے نیازی" کے واحد معنی پیسے کی بے نیازی نہیں ہوتی اور نیازمندی کا ترجمہ لازماً مفلسی نہیں ہوا کرتا۔ خلاصہ یہ کہ جہاں بھی فقر و افلاس کے مقابلے میں لفظِ غنی آئے گا اس کا صحیح ترجمہ دولتمند اور مالدار ہوگا اور صلہ عَنْ نہیں آئے گا۔

اب اس ترجمے پر نگاہ ڈالئے جو ممدوح نے فرمایا ہے۔ آیت عَنْ سے خالی ہے اور مِنْ موجود ہے مگر سببیت کے لئے ہے۔ پھر مقابلہ مفلسی (عَیْلَة) سے ہے لہٰذا ترجمہ میں لفظ "بے نیاز" کا محل نہیں تھا بلکہ ایسے لفظ کا محل تھا جو

خاص طور پر مالی احتیاج سے گلو خلاصی کی خبر دے۔ چنانچہ شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ ہے:۔

"اور اگر ڈرو تم محتاجگی سے پس قریب ہے، کہ دولتمند کرے گا اللہ فضل اپنے سے اگر چاہے گا۔"

حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ یہ ہے:۔

"اور اگر تم ڈرتے ہو فقر سے تو آئندہ غنی کر دے گا تم کو اللہ اپنے فضل سے اگر چاہے۔"

مولانا مودودی نے بھی کم و بیش یہی ترجمہ کیا۔

مولانا اشرف علیؒ کا ترجمہ یہ ہے:۔

"اور اگر تم کو مفلسی کا اندیشہ ہو تو خدا تم کو اپنے فضل سے اگر چاہے گا محتاج نہ رکھے گا۔"

مولانا دریابادی نے بھی آیت کا مفہوم تو درست ہی سمجھ رکھا ہے اور اپنے تفسیری نوٹ میں تو وہ خود وضاحت کرتے ہیں کہ بات بے زری اور زرداری کی چل رہی ہے لیکن ترجمے میں چوک ہو گئی۔ بریکٹ دیگر "ان سے" کا اضافہ بھی غیر ضروری محسوس ہوتا ہے۔ (جاری)

مُلّا ابن العرب مکّی

مسجد سے میخانے تک

اصلی نام نہیں لوں گا۔ فرض کر لیجئے ان کا نام "درگا پرشاد" ہے۔ وہ اپنے ہندوستان جنت نشان کی حکومت عالیہ کے راج محل میں ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مجھ جیسے ٹھیٹھ لوگوں کی پہنچ ان تک کیا ہوتی مگر سیٹھ عنایت اللہ پیاز والا کے واسطے سے درشن اور پھر مصافحے اور پھر استفادے کا موقع ملا تھا۔ سیٹھ عنایت اللہ پیاز والا سے مجھ فقیر کی رسم و راہ مدت ہوئی اُس وقت شروع ہوئی تھی جب پیران کلیر شریف کے عرس میں انھیں ایک رِنِ عاشقِ اولیاء سے اُنس ہو گیا تھا۔ میں نے ازراہِ اخلاق اس سلسلے میں ان کی کچھ خدمات انجام دیں اور ہماری شناسائی بے تکلفی میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔

سیٹھ عنایت درگا پرشاد سے ملنے جا رہے تھے تو مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ میں شاید نہ جاتا لیکن ان کی نئی شیورلٹ امپالا نے مجھے مقناطیس کی طرح کھینچا۔ کیسی چم چم کرتی ہوئی دل میں اُترتی ہوئی روح میں گھر کرتی ہوئی۔ ہاتھ تو ہاتھ نگاہ تک پھسلے۔ یہ گاڑی انھوں نے ابھی چند ماہ قبل خریدی تھی۔ خریدی اس لئے تھی کہ نئی نئی شادی کی تھی۔ شادی اس لئے کرنی پڑی کہ پچھلی سیٹھانی ایک ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر عالمِ بالا کی طرف پرواز کر گئی تھیں۔ ایکسیڈنٹ اس لئے ہوا تھا کہ ان کی گاڑی کا ڈرائیور گھنشیام معمول سے کچھ زیادہ پی گیا تھا۔ زیادہ اس لئے پی گیا تھا کہ اس کی گرل فرینڈ مس روپیٹا نے دفعتاً اسے چھوڑ کر ایک نیا دوست بنا لیا تھا۔ نیا اس لئے بنایا تھا کہ گھنشیام باوجود ہزار وعدوں کے اسے ٹیلیویزن سیٹ خرید کر نہیں دے سکا تھا۔

بہر حال مجھے اس سے بحث نہیں کہ امپالا خریدنے کے بعد سیٹھ نے پچھلی تین گاڑیوں کا کیا کیا تھا۔ اسٹیرنگ خود سیٹھ صاحب نے سنبھالا۔ ڈرائیور تو ویسے انھوں نے کئی کئی رکھ چھوڑے تھے مگر شوق ہی تو ہے۔ ان کے برابر میں مولوی ہدایت علی بیٹھے۔ وہ اس لئے بیٹھے کہ گنیش پور سے رام گنج تک جانے والی زیرِ تعمیر سڑک پر بس چلانے کے لئے انھیں پرمٹ مطلوب تھا۔ سیٹھ صاحب نے ازراہِ تعلق وعدہ

کرلیا تھا کہ وہ انھیں درگا پرشاد جی سے نہ صرف ملا دیں گے
بلکہ سفارش بھی کر دیں گے۔

پچھلی سیٹ پر سیٹھ کی نئی نویلی بیگم زیبا غوثیہ بیٹھیں
اور مجھ ناچیز کو بھی وہیں جگہ ملی۔ غوثیہ ان کی ماں کا نام نہیں
تھا بلکہ ایک مذہبی قسم کا امتیازی نشان تھا۔ ان کے والد
غیاث الدین گو کہ مذہبی آدمی نہیں تھے لیکن غوث الاعظم
پیران پیر دستگیر کے بے حد چاہنے والوں میں تھے۔ جب بھی
کوئی دشواری پیش آتی غسل کر کے نماز غوثیہ پڑھتے اور دشواری
بے چاری اپنا سا منھ لیکر رہ جاتی۔ گھر اگرچہ کرایہ کا تھا مگر
اس پر غوث منزل کی تختی لٹکا دی تھی۔ پھر بھلا بیٹی زیبا کے
ساتھ غوثیہ کا اضافہ کیسے بھولتے۔

موصوفہ کے لباس سے اتنی تیز خوشبو پھوٹ رہی
تھی کہ میرے بھیجے پر بقول شاعر تقاطرِ امطار شروع ہو گیا۔ یعنی
نزلے کی پھوار سے کھوپڑی کی وسعتوں میں چیونٹیاں سی
رینگنے لگیں۔ ایک دو چھینکیں بھی ہاتھوں ہاتھ آئیں محترمہ
نے برا سا منھ بنایا۔ ان کی عمر بائیس ۲۲ سے زائد نہ ہوگی سیٹھ
پچاس سے اوپر جا چکے تھے۔ ابھی پچھلے ہی ہفتے انھوں نے
اپنی باونویں سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی تھی جس
میں باون قسم کی مٹھائیاں سرد ہوئی تھیں۔

ویسے دیکھنے والے انھیں ساٹھ سے بھی اوپر کا سمجھتے
تھے کیونکہ چہرہ مکمل طور پر بوڑھا ہو گیا تھا۔ معدے کی مستقل
خرابی نے چہرے کا نور صبورا اور بدن کا ست چوس لیا تھا۔
اب زیبا غوثیہ نے آکر توازن کچھ درست کیا۔ وہ حسن اور
صحت کا مجسمہ تھیں۔ بلا کی پرکشش۔ جب ایک طرف جھاڑ
جھنکاڑ ہوں اور دوسری طرف پھولوں کی کیاری تو توازن
آپ ہی پیدا ہوگا۔ معنوی توازن بھی خدا کے فضل سے
اس لئے پیدا ہو گیا تھا کہ سیٹھ جس قدر چلتا پرزہ تھے
زیبا غوثیہ اسی قدر سادہ لوح تھیں۔ مگر سادہ لوح ہونے
کا یہ مطلب نہیں کہ زبان چلانے میں کسی سے پیچھے ہوں۔
پھر سکنڈ ایر تک تعلیم بھی چونکہ حاصل کر لی تھی اس لئے زبان
چلانے کا انداز دقیانوسی نہیں رہ گیا تھا۔ زبان چلا
چلا کر وہ چند ہی ہفتوں میں مجھ سے بہت زیادہ بے تکلف
ہو گئیں تھیں اور اسی بنا پر برا سا منھ بناتے ہوئے انھوں
نے یہ بھی فرمایا تھا۔

"تمھیں ملّا صاحب کچھ بھی تمیز نہیں۔ اتنی زور
سے چھینک دیا۔"

"آپ شاید خوشبو کے ٹب میں غوطہ لگا کر آئی ہیں۔
میں نہ چھینکتا تو شاید میرا ہارٹ ہی فیل ہو جاتا۔"

"گنوار ہو ـــ کیا تمھیں خوشبو پسند نہیں۔"

"بہت ہے مگر حد بھی تو ہونی چاہئیے۔"

"دیہاتی جو ٹھہرے۔ خبر بھی ہے یہ ایوننگ ان
برازیل ہے۔ ہاف اونس کی شیشی پانسو میں امپورٹ ہوتی
ہے۔"

"یہ ایوننگ ان قطب شمالی بھی ہو تو نزلہ اسکی
کوئی پروا نہیں کرے گا۔ چلئے میں ناک باہر کئے لیتا ہوں۔"
میں نے بازو کھڑکی سے ٹیک کر منھ سڑک کی طرف کر لیا۔

"نان سینس۔ میں یہ توہین برداشت نہیں کر سکتی۔
اِدھر منھ کرو۔"

گاڑی تارکول کی سڑک پر اس طرح تیر رہی تھی
جیسے ناکام تمناؤں کے بحرِ ظلمات میں مستقبل کے حسین
خواب تیرتے ہیں۔ سبحان اللہ۔

سیٹھ عنایت اور مولوی ہدایت بھی خاموش
نہیں تھے۔ ان کے پورے مکالمے تو سمجھ میں نہ آسکے لیکن
موضوع بالکل واضح تھا۔ پرمٹ۔ لائسنس۔ امپورٹ
ایکسپورٹ بزنس۔ تعمیرات کے ٹھیکے۔ ایک فقرہ یہ کان
میں پڑا جو مولوی ہدایت کے منھ سے نکلا تھا۔

"میں بہت سے بہت ایک لاکھ لگا سکتا ہوں۔
آپ کا اور میرا کیا مقابلہ۔"

"ناک پر سے ہاتھ ہٹاؤ۔" یہ فقرہ ظاہر ہے سیٹھ
نے تو کہا نہ ہوگا۔ سیٹھ کو اس سے کوئی بحث ہی نہ تھی کہ
پچھلی سیٹ پر کیا ہو رہا ہے۔ میں نے چہرے کا رخ محترمہ
کے پچھلے آرڈر پر بے شک درست کر لیا تھا مگر ایک انگلی

ناک کے نتھنوں پر اب بھی رکھی ہوئی تھی۔
"مجھ پر اختلاج کا دورہ پڑ جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے انگلی ہٹالی۔
"تم جان بوجھ کر میری جان جلاتے ہو۔ اُس دن بھی تم نے میرا سفید سوٹ دیکھ کر بڑا توہین انگیز فقرہ کہا تھا۔ بھلا کیا کہا تھا؟"
"آپ ہی کو یاد نہیں تو مجھے کیا یاد ہوگا۔"
"نہیں۔ تم جھوٹے بھی ہو۔ اُس دن وعدہ کر کے گئے تھے کہ ٹھیک نو بجے پہنچ رہا ہوں۔ ہم لوگ سوا نو تک انتظار کرتے رہے پھر تمھارے بغیر ہی پکچر جانا پڑا۔"
"اس کے لئے میں سیٹھ جی سے معافی مانگ چکا ہوں۔"
"مجھ سے تو نہیں مانگی۔ کیا انتظار کی کوفت میں میں شریک نہیں تھی۔"
"تین گاڑیاں خریدنے کی مجھ میں سکت نہیں۔" یہ جملہ ظاہر ہے میں نے تو نہ کہا ہوگا۔
"سکت تو پیدا کی جاتی ہے۔" سیٹھ کا فقرہ سنائی دیا۔
"کیا سوچنے لگے۔" محترمہ جھلّائیں۔ انھیں اگلی سیٹ کے مکالموں سے ذرّہ برابر دلچسپی نہیں تھی۔
"میں سوچ رہا ہوں میں تو ایک رکشا بھی نہیں خرید سکتا۔ یہاں تین تین گاڑیوں کی بات ہو رہی ہے۔"
"ارے تو تم پر کیا آفت آئی ہے رکشا خریدنے کی۔ اوٹ پٹانگ باتیں مت کیا کرو۔ اچھا بتاؤ تاج محل کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے۔"
"میرا خیال ہے اس کی تعمیر میں پچاس ہزار روپے لگ گئے ہوں گے۔"
"ایڈیٹ کہیں کے۔ میں روپیوں کو نہیں پوچھ رہی ہوں۔ کیا کہا پچاس ہزار تم گھاس تو نہیں کھا گئے۔"
"نہیں کھائی تو اب کھانی پڑے گی۔ ٹماٹر چار روپے کلو۔ آلو تین روپے۔ چھینڈے۔"
"میں گاڑی رکوا کر تمھیں باہر دھکا دیدوں گی۔ تاج محل اور چاندنی کے عنوان سے میں نے ایک کہانی لکھی تھی۔ کیا تم کہانیاں پڑھ لیتے ہو۔"
"افسوس بچپن میں قاعدہ نورانی پڑھا تھا۔ پھر والد صاحب نے حافظ جی کی درسگاہ میں بٹھا دیا۔ سات سال تک قرآن ہی ختم نہیں ہوا۔ حافظہ بہت خراب ہے۔ جو آج پڑھتا ہوں کل بھلا دیتا ہوں۔"
"تم سے بات کرنا فضول ہے۔ کسی دن میں خود پڑھ کر تمھیں یہ کہانی سناؤں گی۔ کیا سمجھتے ہو کالج میں جس نے بھی سنی تھی دل پکڑ کر رہ گیا تھا۔"
"لالہ جانکی داس بھی ہماری بات ٹالنے والے نہیں۔ بس ذرا لالچی ہیں۔" سیٹھ کا یہ فقرہ میرے کان میں پڑا مگر محترمہ اپنی دنیا میں مگن تھیں۔
"تم ادھر کیا سننے لگتے ہو۔" محترمہ کی بھنویں تن گئیں۔
"میں سوچ رہا ہوں ان دونوں بزرگوں کا کوئی فقرہ شاید میرے لئے بھی نسخۂ کیمیا ثابت ہو۔ میں سیٹھ عنایت نہ سہی مولوی ہدایت اللہ تو بن جاؤں۔"
"پیسے کے لوبھی۔ نان سینس۔ تمھیں میں شاعر قسم کا آدمی سمجھتی تھی۔"
"شعروں سے پیٹ نہیں بھرتا۔ اب دیکھ لو آٹا ڈھائی روپے کلو۔ سوختہ بارہ روپے من۔"
"اچھا بس اب چپکے بیٹھو۔ تم بھی شاید اسی لئے ساتھ جا رہے ہو کہ کوئی پرمٹ ورمٹ حاصل کرنا ہوگا۔" ان کا لہجہ بڑا تلخ تھا۔
"نہیں۔ میں درگا پرشاد جیسے عظیم انسان کی زیارت کے لئے جا رہا ہوں۔ گاندھی جی کی فلاسفی پر یہ شخص اتھارٹی مانا گیا ہے۔"
"مجھے خبر ہوتی کہ تم ایسی بور باتیں کرو گے تو اگلی سیٹ پر بیٹھتی۔ تمھاری عمر بھلا کیا ہوگی۔"
"یہی کوئی ستر سال۔"
"میں سچ کہتی ہوں چانٹا مار دوں گی۔ میرا اندازہ ہے تم تیس سے اوپر نہیں گئے۔"

"چلیئے یونہی سہی — پھر؟"

"مگر ذہنی اعتبار سے تم گھوسٹ ہو چکے ہو۔ میں نے تمھاری فرینچ کٹ داڑھی دیکھ کر خواہ مخواہ یہ تصور کر لیا تھا کہ تمھارے خیالات بڑے رومانٹک ہوں گے۔"

"تھے کبھی۔ میں سڑکوں پر چلتے چلتے سنہری خواب دیکھا کرتا تھا۔ تاج محل جیسے حسین خواب۔ لیلیٰ اور شیریں کے خواب۔ افق میں تیرتے ہوئے رنگین اہریوں کے خواب۔ ایک دفعہ تو کار سے جا ٹکرایا تھا۔ بس کسر رہ گئی ورنہ ہو گیا تھا بیڑا پار۔"

"کبھی کبھی اچھے فقرے بول لیتے ہو۔ رنگین اہریوں کے خواب مجھے بھی پسند ہیں۔ افق پر تیرتے ہوئے حسین بادل۔ پھولوں کی مہک میں ڈوبے ہوئے شمالی ہواؤں کے نرم نرم جھونکے۔ بلبل اور فاختہ کے نغمے۔ سمندر میں ڈوبتا ہوا سورج — اور کچھ کہو۔"

"میں سوچ رہا ہوں۔ بناسپتی گھی کا بزنس شروع کردوں۔ ایک پاؤڈر کریں۔ ایک پاؤ سنگھاڑے کا آٹا۔ ایک بوتل صاف کیا ہوا مٹی کا تیل۔۔۔۔"

فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی امپالا ڈاک بنگلے کے پورچ میں رک گئی۔ محترمہ کا موڈ بہت خراب ہو گیا تھا۔ گاڑی سے اترتے اترتے میرے کان کے قریب بولیں۔

"میں تم سے سمجھ لوں گی۔ ایڈیٹ ہو بالکل۔"

چند منٹ بعد ہم ایک بڑے کمرے میں درگا پرشاد جی کے سامنے تھے۔ چہرہ بارونق۔ بدن ٹپلا ہوا۔ وزن اتنا ضرور ہو گا کہ میں اور سیٹھ عنایت اور محترمہ زیبا تینوں برابر سے تل جائیں۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی میں تصور کئے ہوئے تھا کہ گاندھی جی کی فلاسفی کا یہ بین الاقوامی شیدائی بہت دبلا پتلا ہو گا جیسے گاندھی جی تھے۔ بدن پر لنگوٹی کے علاوہ زیادہ سے زیادہ کھدر کی جاکٹ ہو گی۔ آنکھوں سے مسکینی اور ہونٹوں سے تواضع برستی ہو گی مگر وہ اعلیٰ درجے کی غیر ملکی بوسکی کا قمیص اور نفیس قسم کے لٹھے کا پائجامہ پہنے ہوئے تھے۔ چپل شاید جاپانی تھے۔ کونے میں دو جوڑی جوتے نظر آئے جن کی ساخت امریکن تھی کھونٹی پر متعدد ملبوسات لٹکے ہوئے تھے جن میں سے ایک بھی دیسی نہ تھا۔

میرا معمولی سا تعارف کرایا گیا۔ انھوں نے رسماً مصافحہ تو کیا مگر دو انگلیوں سے۔ پھر مولوی ہدایت علی کے حصہ میں شاید تین انگلیاں آئیں۔ البتہ جب سیٹھ عنایت نے محترمہ زیبا کا تعارف کرایا تو درگا پرشاد جی کرسی سے آدھے اٹھ گئے اور میں نے کہا کمرے کے در و دیوار تک نے دیکھا کہ زیبا کی پانچوں انگلیاں ان کے چوڑے چکلے پنجے کی گرفت میں گم ہو گئیں۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" وہ چہکے۔ چہکنا میں نے لب و لہجے کی نسبت سے کہا ہے ورنہ آواز تو پھٹے ہوئے بانس جیسی تھی۔

زیبا کے چہرے پر ناخوشگوار اثرات صاف دیکھے جا سکتے تھے اس نے ہاتھ چھڑایا اور سب سے دور والی کرسی پر جا بیٹھی۔ میں بھی وہیں چلا گیا۔ یہاں صوفے نہیں تھے ڈاک بنگلہ جو ٹھیرا۔ چند کرسیاں تھیں۔ ایک پلنگ تھا۔ مولوی ہدایت پلنگ پر ٹک گئے۔ اب ان بزرگانِ کرام میں اپنے موضوعات پر گفتگو چھڑی۔

"میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں محترمہ کہ میرا اور آپ کا مصرف یہاں کیا ہے۔" میں نے زیرِ لب سرگوشی کی۔ فاصلہ ان لوگوں سے اتنا تھا کہ بھنبھناہٹ وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ پھر ویسے بھی وہ خاصی بلند آواز میں اپنے مسائل کی جگالی شروع کر چکے تھے۔

"محترمہ تم نے میری چڑھ بنا لی ہے۔" انھوں نے گوشۂ چشم سے میری طرف دیکھ کر زیرِ لب ہی کہا۔ لہجہ خاصا کھردرا تھا۔

"توبہ توبہ۔ کیا احترام بھی نہ کروں۔"

"اپنا مصرف تو تمھیں خود معلوم ہو گا۔ میں اپنی

رضی سے نہیں آئی جو اپنا مصرف بھی جانوں۔ انھوں نے کہا تھا میں نے مان لیا۔"

"آپ اپنا آنچل درست کریں"۔ میں نے اور بھی دبی آواز میں کہا "میرا خیال ہے درگا پرشاد جی کی چور نظریں بار بار آپ کی طرف پڑ رہی ہیں۔"

"تمھارے خیالات بڑے گندے ہیں"۔ یہ کہنے کے باوجود انھوں نے آنچل درست کر لیا تھا۔

"گندگی اور پاکیزگی کے فلسفہ پر ہم کسی اور موقعہ پر بحث کریں گے۔ فی الحال ذرا غور سے سنئے گاندھی ازم کے یہ عظیم ماہر کن اسرار و رموز کی پردہ کشائی فرما رہے ہیں۔"

"عربی بولتے ہو۔ میں رعب میں آنے والی نہیں"۔

"آپ کچھ دنوں مجھ سے عربی پڑھیں۔ صرف پانسو روپے ماہوار۔ ناشتہ آپ کے ذمے۔"

"تم نے ٹھیک کہا تھا" انھوں نے میری طرف رُخ کئے بغیر نیچا منھ کر کے کہا۔ "منحوس بار بار ادھر ہی گھور رہا ہے۔"

"کہو تو ایسا تعویذ لکھ دوں آنکھیں پھوٹ جائیں مردود کی۔"

"اچھا اب چپ رہو۔ مجھے تو بڑی بوریت ہو رہی ہے"۔ مجبوراً گرامی قدر حضرات کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ درگا پرشاد جی فرما رہے تھے۔

"بڑی پریشانی ہے سیٹھ بھائی۔ گورنمنٹ کے پاس کافی روپیہ نہیں۔ بے وقوف لوگ اعتراض تو کر دیتے ہیں کہ گورنمنٹ شراب کی دکانیں کھلوائے چلی جا رہی ہے۔ مگر یہ نہیں سوچتے کہ سرمایہ آمدنی کے بغیر ملک کیسے آگے بڑھے گا۔ بے روزگاروں کو روزگار کیسے ملے گا۔ دفاعی اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔"

"جی بے شک" مولوی ہدایت علی نے زبان کے ساتھ سر اور ہاتھوں کو بھی زوردار تائیدی جنبش دی "اخلاقیات کو لوگوں نے سمجھا ہی نہیں۔ ملک ترقی نہیں کرے گا تو اخلاقیات کا کیا اچار ڈالے گا۔"

"اس لفظ سے مجھے گھن آتی ہے" سیٹھ بولے "اخلاق اخلاق کی رٹ لگانے والے خود تو سمو چا اونٹ ہضم کر جاتے ہیں اگر آس پاس کوئی نہ ہو مگر اسٹیج پر آکر اخلاق اور سماج اور الابلا کی وہ رٹ لگاتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ میں سمجھتا ہوں ضلع میرٹھ کے لئے صرف پچاس دکانیں کم ہوں گی۔ سو تک کی اچھی خاصی گنجائش موجود ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے" درگا پرشاد جی نے بے تکان فرمایا "لیکن شور زیادہ مچتا اس لئے فی الحال پچاس سے شروعات کی گئی ہے۔ گاندھی جی کا فلسفہ یہ تھا کہ بڑی برائی کا خاتمہ کرنے کے لئے چھوٹی برائی کو گوارا کر لینا چاہئے۔ ملک کی ترقی رک جائے۔ دفاعی لائنوں میں کمزوری آجائے۔ اس سے بڑی برائی کیا ہوگی۔ شراب ہلکی برائی ہے۔ نشہ میں آدمی کھوپڑی سے باہر نہ ہو تو سرے سے وہ کوئی برائی ہی نہیں۔ ایک مشروب ہی تو ہے۔"

"میں کہتا ہوں کھوپڑی سے باہر ہو کر بھی آدمی کسی کا کیا بگاڑتا ہے"۔ سیٹھ بولے۔ "محض چھوٹی چھوٹی باتوں کو مذہبی بازیگر اور سودائی فرقہ پرست پھیلا پھیلا کر پیش کرتے ہیں۔ بکواس سرے سے۔"

"ہمیں گاندھی جی کے فلسفے کی روح کو سمجھنا چاہیئے۔ روح کے بجائے ست یعنی جوہر کہہ لیجئے۔ میں نے تو بہ سیری غور کیا۔ مجھے تو اس غل غپاڑے میں کوئی جان نظر نہیں آتی کہ ہمارا دیس گاندھی جی کی تعلیمات سے دور چلا گیا ہے۔" یہ درگا پرشاد جی کا ارشاد تھا۔

"میں سو فی صدی آپ کی تائید کروں گا"۔ مولوی صاحب بلیغ لہجے میں بولے "صنعتی دور میں اخلاقیات کو بھی نئے زاویوں سے دیکھنا چاہئے۔ ہر اخلاق کی ایک روح ہوتی ہے اور ہر روح کا ایک نچوڑ ہوا کرتا ہے۔ نچوڑ سے آپ جیسے عظیم مفکر جو بھی ست نکالیں وہی در اصل قوم کے لئے آب حیات ہوگا۔"

"اے محترمہ۔ سنا آپ نے" میرا بندِ ضبط ٹوٹ گیا۔

ہونٹ دباکر ممنانا ہی پڑا۔ انھوں نے گردن نیچی کئے کئے گوشۂ چشم سے مجھے قہر و غضب کی بشارت دی۔

"محترمہ کہیے۔ کبھی سنو یہ بکواس۔"

"کان تو غالباً آپ کے بھی ہیں۔"

"میں ایک نئی کہانی کا پلاٹ سوچ رہی ہوں۔ تمھارے ہی جیسا پاگل قسم کا ہیرو میرے ذہن میں گھوم رہا ہے۔ مگر اس میں آرٹسٹک سینس ضرور ہوگا۔ تم نرے ایڈیٹ ہو۔"

"شکریہ — اور ہیروئن کس ٹائپ کی ہوگی۔ میرا خیال ہے اگر آپ خود ہی اس میں ہیروئن بن جائیں تو قارئین باتمکین پاگل کتوں کی طرح بھونکنے لگیں گے۔"

"سور کہیں کے۔ اچھا یہاں سے چھٹکارا ملنے دو پھر دیکھوں گی تمھیں۔"

"میرا خیال ہے ڈیر زوبی تم واپس جاؤ —" دفعتاً سیٹھ صاحب نے گردن موڑ کر فرمایا۔ "اور تم بھی میاں ملا۔ یہ لو چابی۔"

انھوں نے گاڑی کی چابی میری گود میں پھینکی۔

"مگر دیکھو۔ بھلا اینڈ ڈھلا کمپنی کے آفس ہوتے ہوئے جانا۔ وہاں سیٹھ منوہر جی ملیں گے۔ ان کا فون کل سے خراب پڑا ہے۔ کہنا فوراً ڈاک بنگلے آجائیں۔"

مجھے کچھ متأمل سا پاکر سیٹھ صاحب نے گھورا اور غرائے۔

"کیا بات ہے؟"

"اوہ ..... کچھ نہیں۔ دراصل آپ سے ایک بات عرض کرنی تھی۔"

"تو کرو عرض۔"

"پلیز — ادھر ایک منٹ۔"

وہ متحیر ہوکر اٹھے اور میرے قریب آئے۔

"یہ نیازمند بھی حکومت کی خیرخواہی میں درگا پرشاد جی کے آگے ایک اسکیم پیش کرنا چاہتا ہے۔" میں نے اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ کوئی اور نہ سنے۔

"اوہو — تو ہم تمھیں اس کا موقعہ ضرور دلائیں گے۔ مگر اس وقت نہیں۔ بڑے اہم معاملات ابھی طے کرنے ہیں۔ تم منوہر سیٹھ کو بھیجتے جاؤ۔ شام کو ہم تمھیں درگا پرشاد جی سے تنہائی میں ملوا دیں گے۔"

محترمہ زیبا فوثیہ پہلے ہی کمرے سے باہر جا چکی تھیں گاڑی کے قریب پہنچکر وہ اگلی کھڑکی کی طرف بڑھیں۔

"ٹھیریئے محترمہ — آپ پچھلی سیٹ پر بیٹھیں گی۔" میں نے جھپٹ کر قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

"کچھ دماغ تو خراب نہیں ہوا ہے۔ میرا جہاں جی چاہے بیٹھوں تم حکم چلانے والے کون۔"

"بس تو ڈرائیونگ سیٹ پر اجلاس فرمائیں۔ احقر پیچھے بیٹھ جائے گا۔"

"مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔"

"بس تو یقین کیجئے میں گاڑی کسی عمارت کی تیسری منزل پر چڑھا دوں گا۔"

"تمھیں کچھ عقل بھی ہے۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے والے مالک کہلاتے ہیں اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے والا ملازم۔"

"کوئی حرج نہیں۔ آپ جیسی شاندار خاتون کا ملازم ہونا بھی کچھ کم فخر کی بات نہیں۔"

"کچھ بھی کہو میں تو آگے ہی بیٹھوں گی۔ تم برابر میری توہین کئے چلے جا رہے ہو۔"

میں نے طویل سانس لیکر ہتھیار ڈالے پھر انجن کھولا وہ مذاق اڑانے کے انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

"مجھے افسوس ہے محترمہ۔ آپ کے شوہر نے آپ کا کتنا خوبصورت نام بگاڑ دیا۔ بھلا زوبی بھی کوئی نام ہوا۔"

"اے محترم۔ تمھیں تو ہر اچھی چیز بری ہی لگتی ہے۔ لعنت ہے تمھارے ذوق پر۔"

"آپ ذرا سا ادھر کو سرک جائیں۔ مجھے زبردست چھینک آنے والی ہے۔" میں نے نتھنے سکیڑے۔

"ارے ارے۔" انھوں نے جھٹ سے رومال میری طرف بڑھایا "خدا تمھاری چھینکوں کو غارت کردے۔" بھلا اینڈ ڈھلا کمپنی کے آفس پر گاڑی روک کر

میں تنہا ہی اندر جانا چاہتا تھا کہ سیٹھ منوہر جی آفس سے باہر آتے دکھائی دیئے پھر انھیں امپالا تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔

"ہلو ہلو ــــ زہے نصیب۔ ارے تشریف لائیے نا۔"

وہ ایک سانس میں کہتے چلے گئے۔ خطاب مجھ سے نہیں محترمہ سے تھا مجھے تو وہ نظر انداز ہی کر گئے تھے۔

"سیٹھ جی پہلے میری سنئے۔" میں نے کہا۔

"بالکل نہیں سنیں گے۔ پہلے آپ دونوں آفس میں آئیں کچھ چائے پانی کریں۔"

"سنئے تو۔ درگا پرشاد جی تشریف لے آئے ہیں۔ آپکو ابھی ڈاک بنگلے بلوایا ہے۔ آپ کے دوست سیٹھ صاحب بھی وہیں۔"

"او کے ــــ اچھا تو پھر سہی۔ وعدہ کیجئے مسز عنایت آپ میرے آفس کب آ رہی ہیں۔"

"آفس" میں نے دخل دیا "بھلا آفس میں یہ کیا کریں گی گھر بلائیے کم سے کم میں تو ہمراہ بل آؤں گا۔"

"تم بھی آؤ یہ بھی آئیں بھلا کب تک؟"

میں نے محترمہ کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھا۔ انھوں نے روکھائی سے جواب دیا ــــ "دیکھا جائے گا جس دن بھی موقعہ ہوا۔"

منوہر جی کا چہرہ اُداس ہو گیا بس اتنا کہہ سکے۔ "مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

یہاں سے چل کر میں نے اگلے چوراہے سے گاڑی جمشید روڈ پر موڑنی چاہی تو وہ بولیں:۔

"ابھی گھر نہیں۔ ذرا مارکیٹ چلو کچھ شاپنگ کرنی ہے۔"

"مجھے تو معاف رکھیں۔ بیوی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے گوشت ترکاری کا انتظار کر رہی ہوگی۔"

"چلو تو اچھا آج تمھارے ہی گھر چلیں۔ بہت ذکر کرتے ہو اپنی بیوی کا دیکھیں تو کیسی ہیں۔"

"اے محترمہ۔ آپ میں کچھ سوچنے سمجھنے کا بھی مادہ ہے۔ اگر آپ کے شوہر نے گھر واپس آکر دیکھا کہ مائی سویٹ ڈارلنگ اب تک دولتکدے پہ نہیں لوٹی ہیں تو وہ کیا سوچیں گے۔"

"کچھ بھی نہیں سوچیں گے۔ وہ تم پر جتنا بھروسہ کرتے ہیں دیکھ ہی لو۔"

"پھر بھی کھوپڑی پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ نا بابا۔ اب تو سیدھے ہی چل رہے ہیں۔ پھر ان سے پوچھ کر میں تمھیں بیوی سے ملواؤں گا۔"

وہ برابر بھیجا چاٹتی رہیں مگر میں نے گاڑی ان کے دولتکدے تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ پھر دال نے مبین ہونا چاہتا تھا کہ وہ بولیں:۔

"بھاگے کہاں جا رہے ہو۔"

"کہا تھا نا گوشت ترکاری۔"

"بتاؤ کیا کیا بھجوانا ہے۔ میں نوکر سے بھجوائے دیتی ہوں۔"

"اُفوہ۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔"

"جہنم میں جاؤ۔ مجھ سے اب کلام بھی مت کرنا۔" یہ کہکر وہ پیر پٹختیں برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ گئیں۔

بعد مغرب میں اس لئے پھر نہیں پہنچا تھا کہ سیٹھ عنایت کے ساتھ درگا پرشاد جی کی خدمت میں جاؤں گا۔ مگر سیٹھ صاحب نے بشارت دی:۔

"میاں غضب ہو گیا درگا پرشاد جی کے جوان سالے کا ایکسیڈینٹ ہو گیا۔ اسکوٹر پر تھا۔ ٹرک سے ٹکرا گیا۔ کچھ دیر پہلے فون آیا تھا۔ پرشاد جی جبھی واپس چلے گئے۔"

"بھگوان سورگ نصیب کرے۔ ظاہر ہے بڑیا مر مر ہو گئی ہوں گی۔"

"بہت خراب ہے تمھارا لہجہ۔ چلو خیر اپنی اسکیم بتاؤ۔ میرا تو خیال ہے تم اپنی عادت کے مطابق محض بکواس کر رہے ہو گے۔"

"اور درگا پرشاد جی گا ندھیائی فلسفے پر جو گل افشانیاں فرما رہے تھے اسے شاید کشف و الہام کہتے ہوں گے!"

سیٹھ صاحب ہنسے۔ "جانِ عزیز۔ یہ بزنس ہے

تم دیگر معاملات میں بڑے کائیاں ہو مگر بزنس کی ابجد بھی نہیں جانتے۔"

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مولوی ہدایت اللہ جمعیۃ المصلحین کے ہیڈ آفس میں صرف چار سو روپے ماہوار کے ملازم ہیں۔ باپ دادا نے کوئی جائیداد نہیں چھوڑی۔ پھر یہ لاکھوں کی باتیں کیسے کر لیتے ہیں۔"

"سب تمھاری طرح اپنے دشمن نہیں ہوتے۔ جمعیۃ المصلحین نے انگریزی اخبار کے لئے جو چندہ جمع کیا تھا لاکھوں سے کم نہیں تھا۔ پھر کیا جمعیۃ کے ذمہ دار اراکین کو یہ حق بھی نہیں پہنچتا کہ اس رقم کو ملک وقوم کی ترقی میں لگائیں اور دو چار بنائیں۔"

"ملک وقوم آپ کس چڑیا کو کہتے ہیں۔"

"ابے گدھے۔ اتنا تو خیال کر لیا کر میں تجھ سے کتنا بڑا ہوں۔" انھوں نے ہنس کر کہا۔

"پیران کلیر شریف والی کہانی تو یاد ہوگی آپکو۔ کیا آپنے وہاں خیال فرمایا تھا کہ یہ حقیر پُر تقصیر آپ سے کتنا چھوٹا ہے۔"

"چُپ" انھوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھی "زہرہ بی کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی تو دماغ چاٹ جائے گی۔"

"وہ تو شاید گھر میں ہی نہیں۔"

"ہے کیوں نہیں۔ اپنے کمرے میں ہے۔ کہہ رہی تھی میں ملّا سے ناراض ہوں۔"

"آخر کچھ بتایا آپ کو کیوں۔"

"کہہ رہی تھی میری ہر بات ٹھکرا دیتا ہے۔ میرے سامنے چھینکیں لیتا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے انھوں نے زور کا قہقہہ اڑایا۔ مگر اگلے منٹ سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگے:۔

"میاں کیا واقعی کوئی اسکیم ہے؟"

"جی ہاں آپ کی دعا سے۔"

"تو اب منھ سے پھوٹو۔"

"میرا خیال ہے عربی میں عرض کروں۔ اُردو بیچاری

ایسے مضامین عالیہ کو شاید ہی برداشت کر سکے۔"

"بکواس رہنے دو۔ حکومت واقعی آج کل اخراجات کے باعث بے حد پریشان ہے۔ کوئی بھی منافع بخش اسکیم وہ دل وجان سے قبول کر لے گی۔"

"مجھے حیرت ہے گاندھی جی کی تعلیمات کا ست نکالنے والوں کے ذہن میں خود ہی یہ اسکیم اب تک کیوں نہ آئی۔ شراب اور عورت تو قافیہ ردیف ہیں۔"

"کیا مطلب؟" انھوں نے آنکھیں نکالیں۔

"کچھ دن پہلے بڑے شہروں میں اچھے خاصے بازار ہوا کرتے تھے۔ اب بھی ناپید تو نہیں ہوئے لیکن عنوان بدل گیا ہے۔ سوال یہ ہے ہماری گورنمنٹ نے اس معاملہ میں وہی طرز فکر کیوں نہ اختیار کیا جو شراب کے معاملے میں کیا ہے۔"

"بازاروں سے تمھاری مراد....."

"بس آگے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ مراد تو آپ سمجھ ہی گئے۔ اندازہ کیجئے خواہ مخواہ کے امتناعی قوانین بنانے کے عوض اگر گورنمنٹ اسے بھی ایک نفع بخش کاروبار کی حیثیت سے نیشنلائز کر لیتی اور منظم طور پر چلاتی تو کتنا فائدہ ہوتا۔"

سیٹھ چبھتی ہوئی نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھے جا رہے تھے۔ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم بھی تھا۔ میں نے فقرہ پورا کیا تو تبسم کو کچھ اور نکھارتے ہوئے بولے:۔

"بہت ہی سور ہو۔ اچھا ہوا درگا پرشاد جی چلے گئے ورنہ یہی سورپن تم ان کے آگے بھی پھیلاتے۔"

"میں سنجیدہ ہوں قبلہ حضور۔ آپ حساب پھیلا کر تو دیکھئے۔ ملک میں لاکھوں عورتیں ہیں جو اپنے طور پر یا دلالوں اور ایجنٹوں کے ذریعہ یہ بزنس چلا رہی ہیں۔ کتنی ہی فرمیں اور انسٹیٹیوٹس ہیں جن کا اصلی کاروبار یہی ہے۔ پردے کے لئے انھوں نے کسی دوسرے بزنس کا بورڈ آویزاں کر رکھا ہے۔ بڑے شہروں کے ہوٹل، پارک، کلب گھر، آرٹ گیلیریاں، بال روم اور گیسٹ ہاؤس

اِس منافع بخش بذنس کی منڈیاں ہیں۔ امتناعی قوانین اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتے کہ درمیان میں کچھ اور لوگوں کو ہاتھ رنگنے کے مواقع فراہم کردیں۔ میں سمجھتا ہوں گورنمنٹ کو اس کے لئے کوئی نیا محکمہ بھی قائم نہیں کرنا پڑے گا۔ آب کاری کا زرخیز محکمہ پہلے ہی سے موجود ہے اسی میں ایک نئے شعبے کا اضافہ کردیا جائے ڈیپارٹمنٹ آف کاسمو پولیٹن آرٹ۔ بلکہ دو نام رکھے جائیں۔ ایک تو یہی۔ یہ ان لوگوں کے لئے باعثِ کشش ہوگا جن کے ہندوستانی جسموں میں تناسخ کے گھپلے کی بنا پر انگریزی روح داخل ہوگئی ہے۔ دوسرا انر ناری نویدن وشال کاریالیہ۔ اس سے ان نیک بختوں کو فیض پہنچے گا جو——"

"پیارے مقرر —— دم لے کر۔" انھوں نے ہاتھ اٹھاکر مجھے خاموش کیا۔ ویسے ان کی آنکھوں میں ایک دبے دبے جوش کی علامتیں صاف نظر آرہی تھیں۔

"تم اس خوش فہمی میں ہو کہ یہ اسکیم پہلی بار تمھارے ہی ذہن میں آئی ہے۔ تم غلطی پر ہو عزیزم۔ ذمّہ دار حلقوں میں پہلے ہی کئی بار اس سلسلے میں غور و فکر ہو چکا ہے ہمارے ایک بڑے قومی مفکر کی یہی رائے ہے کہ پرائیوٹ سیکٹر کے اِس بزنس کو مزید ڈھیل نہ دی جائے خود حکومت اسے اپنے طور پر منظم کرے۔" وہ ایک لحظہ رک کے پھر آگے کو جھک کر بولے۔ "مشکل یہ ہے ابھی تک کوئی ایسا نقشہ نہیں بن سکا ہے جسے بہ آسانی روبہ عمل لایا جاسکے۔ ٹیکنیکل اور انتظامی دشواریوں کے علاوہ عوام کے بھڑک جانے کا اندیشہ بھی سدِّ راہ بنا ہوا ہے۔"

"عوام کی ایسی تیسی۔ بات کرتے ہیں آپ۔ عوام گھی کی جگہ گریس اور چربی کا ملغوبہ پندرہ روپے کلو خرید رہے ہیں۔ دھنیے کی جگہ گھوڑے کی لید کھا رہے ہیں۔ وہ کیا کرلیں گے حکومت کا۔"

"تم نہیں سمجھو گے۔ ووٹ تو بہرحال عوام ہی سے لینا ہے۔ شراب کے معاملہ میں ان کے احساسات اتنے نازک نہیں جتنے جنس کے معاملے میں ہیں۔ گاندھی جی کی فلاسفی سے شراب نچوڑنے میں جتنا وقت لگا ہے اس سے کہیں زیادہ وقت جنس نچوڑنے میں لگے گا۔ ورنہ عوام کتّے کی طرح بھونکنے لگیں گے۔"

دفعتاً بجلی بھاگی گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اسی وقت کچھ دھماچوکڑی سی ہوئی اور دیوار سے کوئی چوکھٹا فرش پر گرا۔ آئینہ ٹوٹنے کی چھناکے دار آواز تاریک کمرے میں پھیل گئی۔

"ارے او شدّو۔ فقیرے —— مردود کہاں مرگئے۔" سیٹھ حلق کے بل چیخے۔

"آیا حضور۔ دیا سلائی نہیں مل رہی ہے۔ ابھی آیا——"

"بڑا عذاب ہے۔" وہ خود کلامی کے انداز میں غرغرائے۔ "جب دیکھو غائب۔ جب دیکھو غائب۔"

"اب ہم قبر کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ سوچئے قبلہ اتنا ہی گھپ اندھیرا بلکہ اس سے بھی کچھ گاڑھا اور تہہ بر تہہ ہماری قبورِ شریفہ ——"

"بکواس بند کرو۔ میرا خیال ہے گاندھی جی والا فریم گرا ہے۔ اس طرف وہی تھا۔ یہ ایک بلّی حرام زادی اکثر یہاں آنے لگی ہے وہی کودی ہوگی۔"

"پروا نہ کیجئے۔ صرف شیشہ ٹوٹا ہوگا۔ گاندھی جی امر ہیں۔ ان کی تصویر پر ہزار بار نئے شیشے اور فریم چڑھائے جاسکتے ہیں۔"

"خبیث الزّماں۔ اندھیرے میں تو زبان کو لگام دے لو۔ کس قدر گھٹن محسوس ہوتی ہے۔"

"یہ اندھیرا مائی ڈیر قبلہ لالٹین اور قمقمے سے دور ہونے والا نہیں۔ ہم اندھیروں کے ایک ناپیدا کنار سمندر میں....."

"بس۔ اب ایک لفظ نہیں —— ابے او خبیث شدّو اب تک ماچس نہیں ملی کیا۔" وہ پھر چیخے۔ اسی وقت باہر سے محترمہ زیبا کی بھی آواز آئی —— "اری او خورشیدن کدھر چلی گئی۔ جان مصیبت میں آگئی ہے۔"

آخر کار شندو جلتا ہوا لیمپ لے ہی آیا یہ الگ بات ہے کہ اس کا شعلہ پھک پھک کر رہا ہو۔ ساتھ ہی محترمہ بھی داخل ہوئیں۔ انھوں نے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے بائیں ہاتھ کی انگشت شہادت پکڑ رکھی تھی اور قریب آنے پر سیٹھ اور ملّا دونوں ہی کو اچھلنا پڑا کیونکہ انگلی کے سرے پر خون نظر آ رہا تھا۔

" ارے ارے یہ کیا ہوا۔" سیٹھ بولے۔

" بلیڈ سے کٹ گئی۔ میں ایزل پر چڑھانے کیلئے کاغذ کا سائز کاٹ رہی تھی اکدم بجلی ہو بھاگی بلیڈ انگلی پر چل گیا۔" یہ کہتے ہوئے وہ پاس والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

" اب مجھے اپنا ہی جنریٹر لگانا ہوگا۔" سیٹھ پرجوش لہجے میں بولے " روز روز کا عذاب۔ ارے تو اُلو کے پٹھے کھڑا منھ کیا دیکھ رہا ہے۔" انھوں نے شندو کی طرف رُخ کیا جو لیمپ کو میز پر رکھ کر کسی دوسرے حکم کا منتظر تھا " میرے بڈ روم میں کارنس پر ٹارچ رکھی ہے۔ اسے جلا کر الماری سے ٹیرامائسین کا ٹیوب اٹھالا ــ۔"

" سرکار اندھیرے میں ٹارچ بھی ملنی مشکل ہے۔ وہاں بہت سی بوتلیں بھی رکھی رہتی ہیں ٹٹولنے میں پتا نہیں کیا کیا گر جائے۔"

" لالٹین کیوں نہیں جلائی چھ چھ لالٹینیں ہیں اور تو یہ بھبھکتا ہوا لیمپ اٹھا کے لایا ہے۔"

" حضور! چھ کی چھ خراب ہو رہی ہیں۔"

" ہائیں۔ ابے دو تو ابھی پچھلے ہی مہینے آئی تھیں۔"

" وہ تو سرکار سبھی سے خراب نکلیں۔ جلتے ہی بھڑکنے لگتی ہیں۔"

" تم سب سور کے بچے حرام کی کھاتے ہو۔ لو بتاؤ نئی لالٹینیں اس سے نہیں جلتیں۔ یہ نفیر اکہاں مر گیا۔"

" حضور ہی نے تو اسے تھوڑی دیر ہوئی بھیجا تھا۔"

" اوہ ــــ اچھا بک بک بند کرو ــــ زوبی ڈارلنگ میں خود اٹھا کے لاتا ہوں ٹیرامائسین۔ وہ فوری طور پر کافی سکون دے گی۔ پھر بجلی آ جائے تو ڈاکٹر کو فون کر دوں گا۔"

سیٹھ چلے گئے تو میں نے محترمہ سے کہا:۔

" تو جناب پینٹنگ کا بھی شوق فرماتی ہیں!"

" مجھ سے بات مت کرو۔ تم جیسے دہقانیوں کو منھ لگانا میری توہین ہے۔"

" میں نے منھ لگانے کی فرمائش نہیں کی۔ آپ صرف زبان ہلائیے۔"

" بولے جاؤ میں سن ہی نہیں رہی ہوں۔ تمھیں ابتک میں نے اپنی کوئی پینٹنگ اسی لئے نہیں دکھائی کہ خدا جانے کیا بک دوگے۔ بندر کیا جانے ادرک کا مزا۔ ابھی مجھے اسکول میں ایک تصویر پر انعام ملا تھا۔"

" کیسے مان لیا جائے ــــ کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس۔"

" کیا" انھوں نے تنتنے کے انداز میں کہا اور آنکھیں نکالیں۔ " تم مجھے جھٹلانے کی ہمت کیسے کر سکتے ہو۔"

" جب کوئی جھوٹ بولے گا تو جھٹلایا ہی جائیگا۔ کیڑے مکوڑوں کو پینٹنگ نہیں کہتے۔ اچھی تصویر بنانے میں خونِ جگر بلکہ خونِ دل وغیرہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔"

" خدا انھیں غارت کر دے۔ تم کیا جانو آرٹ کسے کہتے ہیں۔"

سیٹھ ٹیرامائسین کا ٹیوب اٹھالائے مگر موڈ بگڑا ہوا تھا " جانے کیا کیا لڑھک گیا کارنس پر سے۔ کل ہی جنریٹر کا انتظام کروں گا۔"

انگلی زیادہ نہیں کٹی تھی سیٹھ ٹیوب استعمال کرتے ہوئے بولے ــــ " ڈارلنگ تمھارے قیمتی خون کا ایک ایک قطرہ ہیرے سے زیادہ قیمتی ہے۔ مجھے اپنی روح میں زخم کا احساس ہو رہا ہے۔"

" یہ تو چند قطرے نکلے ہیں" محترمہ نے ناخوش گوار لہجے میں کہا " یہ آپ کے ملّا آج ہی آج میں میرا نہ جانے کتنا خون جلا چکے ہیں۔ خدا انھیں غارت نہ کرے دل توڑنے میں انھیں بڑا لطف آتا ہے۔"

" آپ غضب کر رہی ہیں جناب ــــ ابھی چند منٹ

پہلے آپ نے اس کے برعکس دعا دی تھی۔ خدا غارت کرے اور خدا غارت نہ بھی کرے، کیا بات ہوئی۔"

"دیکھا۔ دیکھا آپ نے" وہ چینخیں رُوئے خطاب سیٹھ کی طرف تھا" اس طرح میرا خون پھونکتے ہیں۔"

"بڑے واہیات ہو تم میاں ملّا۔" سیٹھ نے تیوری چڑھا کر فرمایا" دلداری بھی کوئی چیز ہے۔ تم ان کے ساتھ شاپنگ کو نہیں گئے۔ اپنے گھر بھی نہیں لے گئے حالانکہ انھوں نے تم سے فرمائش کی تھی۔ یہ کہاں کا اخلاق ہے۔"

اسی وقت قمقمے جل اٹھے۔ سیٹھ کا خیال درست نکلا گاندھی جی کی تصویر والا چوکٹھا ہی فرش پر پڑا تھا اور آئینہ کسی عاشقِ نامراد کے قلبِ مہجور کی طرح چکنا چور ہو گیا تھا۔ نوکر نے بڑھ کر اسے سمیٹا۔

"میں تمھاری ایک تصویر بناؤں گی جس میں دو سینگ اور ایک دُم ضرور لگاؤں گی۔" محترمہ نے ایک انگلی کو ہوا میں حرکت دیتے ہوئے مجھے گھورا۔ سیٹھ ہنسے۔

"بالکل بنانا۔ ہو سکے تو دو دُمیں لگانا۔" سیٹھ نے گرہ لگائی۔

وہ چلی گئیں۔ نوکر بھی گیا۔ اب سیٹھ نے فرمایا:۔

"تم صاحب زادے بعض معاملات میں تو افلاطون کے کان کاٹتے ہو مگر بعض معاملات میں بالکل ہی بدھو ثابت ہوتے ہو۔ کیا تم واقعی میرے ہمدرد نہیں ہو؟" ان کا لہجہ متین تھا۔

"تشریح چاہوں گا!" میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا

"میری اور اس کی عمر کا تفاوت بالکل ظاہر ہے۔ ناممکن ہے کہ میری ذات اس کے جمالیاتی جذبات کا واحد مرکز بن جائے۔ عمر کا طبعی تقاضا اسے اِدھر اُدھر بھٹکائے گا وہ بہت بھولی ہے مگر بھول پن ضرر رساں بھی ہو سکتا ہے۔ ـــ سمجھ رہے ہو نا؟"

"مگر آپ اسے درگا پرشاد جی سے متعارف کرانے کیوں لے گئے تھے؟"

"سیاستہً۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ـــ"

"میں جانتا ہوں ـــ وہ ایک خوبصورت چارہ ہے جسے آپ بڑی مچھلیوں کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں ـــ بُرا مت مانیئے گا۔ میں نے گاندھیائی فلسفہ کا مطالعہ آپ کی اور درگا پرشاد جی کی عینک سے نہیں کیا۔ آخر کتنی دولت آپ کو اور مطلوب ہے۔"

"ارے گدھے۔ مجھ پر مولویت کا رعب مت جماؤ میں سیٹھ نعمانی کو ہر قیمت پر شکست دینا چاہتا ہوں۔ ان کا بینک بیلنس تین کروڑ ہے اور میرا فی الحال دو کروڑ۔ ان کی چھ فیکٹریاں ہیں اور میری پانچ۔ میں ہر قیمت پر ان سے آگے بڑھوں گا۔"

"بس تو بڑھتے رہئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"یقیناً کر سکتے ہو۔ زوبی کو ہینڈل کرو ـــ اسے دولت سے کوئی دلچسپی نہیں مجھے ڈر ہے کوئی بھی چالاک جوان اسے مجھ سے چھین سکتا ہے۔ تم میں بڑی صلاحیتیں ہیں۔ تم اسے بھٹکنے سے بچا سکتے ہو۔"

"خوب۔ مگر پیارے قبلہ! مجھے فرشتہ آپ نے کیسے سمجھ لیا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں ہی اسے آپ سے چھین لے جاؤں۔"

"ناممکن" انھوں نے پوری سنجیدگی سے کہا" میں تمھیں آزما چکا ہوں۔ میرے اندازے بہت کم غلط ہوتے ہیں۔ اور ویسے بھی مائی ڈیر تم شادی شدہ ہو۔ تم اسے چھین کر کہاں لے جاؤ گے۔"

"بڑا غلط موضوع چھیڑ دیا ہے آپ نے۔ نہیں محترم۔ میں یہ خدمت انجام نہ دے سکوں گا۔ میں اتنا فرشتہ نہیں ہوں جتنا آپ نے سمجھا ہے۔"

"کیا واقعی؟" انھوں نے عمیق نظروں سے مجھے گھورا۔

"جی بالکل واقعی" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا" آپ کی زوبی بہت حسین ہے۔ بہت معصوم ہے۔ آپ ایک اعلیٰ درجے کے شہکار کو برباد کر کے اچھا نہیں کریں گے ـــ"

"کیا بکتے ہو ـــ میں اتنا کمینہ تو نہیں ہوں جتنا تم

سمجھتے ہو۔ لاحول ولا قوۃ۔"

"کیا لاحول ولا قوۃ۔"

"بات سمجھو۔ اب مثلاً درگا پرشاد جی نے دیکھ لیا کہ سیٹھ عنایت ایک جوان و حسین بیوی کا شوہر ہے وہ اب سیٹھ کو زیادہ سے زیادہ ممنون احسان بنانے کی کوشش کریں گے۔ کیا سمجھے!"

"اور پھر احسانات کی قیمت بھی آپ سے چاہیں گے۔"

"یہ کوئی کھلا سودا تو نہ ہوگا کہ وہ زبان سے کوئی مطالبہ کر سکیں۔ مجھے بس کبھی کبھار ان کی آتش شوق کو شعلہ زن رکھنے کے لئے زوبی سمیت ان کی خدمت میں جانا ہوگا۔ اکیلے وہی کیا۔ بذنس میں نہ جانے کتنوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ میں نے اب تک تو کوئی پتھر ایسا دیکھا نہیں جس میں حسن کی جونک نہ لگتی ہو۔"

"اس مقصد کو آپ بغیر شادی کے بھی پورا کر سکتے تھے۔ چارے کی بازار میں کیا کمی ہے۔"

"تم نہیں سمجھتے۔ یہ لائن تمھارے بس کی ہی نہیں پھر کیا سمجھوگے۔ چھوڑو۔ اچھا سنو تمھیں ایک دو لائسنس دلوائے دیتا ہوں۔ کم سے کم ایک گاڑی تو خرید ہی لو۔ پیدل پھرتے ہو۔"

"میرا معدہ خراب نہیں ہوتا کیونکہ ٹانگوں کی حرکت اسے تعاون دیتی ہے۔ آپ بات ٹلا گئے۔ میں کہتا ہوں نقطۂ نظر بدلئے۔ جتنی دولت آپ کے پاس ہے یہی آپ سے زندگی بھر استعمال نہ ہو سکے گی۔ زوبی بڑی پیاری بیوی ہے۔ نعمت کی قدر کیجئے۔"

"تم دولت کی پیاس کو نہیں جانتے ۔۔ مولوی ہدایت علی بھی آخر تمھاری ہی طرح مولوی ہیں وہ تو ایسا دقیانوسی ذہن نہیں رکھتے۔"

"وہ اور آپ شاید آب حیات پی گئے ہیں۔ مجھے تو مرنا ہے۔"

"چلو چھوڑو۔ ایک اور طریقہ بتاتا ہوں۔ زوبی کو فارسی عربی پڑھاؤ۔ شاعری سکھاؤ۔ انشاپرداز بناؤ

ایک ہزار روپے مہینہ ملے گا۔ یہ تو کسب حلال ہوا نا؟"

"ٹیوٹر آپ کو سو روپے مہینہ پر بھی مل سکتا ہے۔"

"مگر تم نہیں آمادہ ہوگے" وہ جھلا گئے۔

"میرا موڈ اس وقت خراب ہو گیا ہے۔ پھر کسی وقت گفتگو کریں گے اب اجازت چاہوں گا۔"

پھر میں اٹھ ہی گیا تھا۔

کہانی نمبر

دینی و علمی موضوعات پر تجلی کے بیشمار خاص نمبر آپ دیکھ چکے۔ نہ جانے کتنے شائقین کا دیرینہ تقاضا ہے کہ ایک نمبر "مسجد سے میخانے تک" کا بھی ہونا چاہئیے۔ یہ کالم تجلی جیسے پرچے کے معیار و مزاج سے مطابقت اگرچہ نہیں رکھتا لیکن یہی کالم ہے جس نے ہزاروں ایسے افراد کو تجلی سے وابستہ کیا ہے جو عام حالات میں کسی مذہبی و علمی جریدے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ وابستگی کے بعد یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ان کی نظر دوسرے کالموں پر نہ پڑے۔ چنانچہ دوسرے کالموں کے مطالعے نے انھیں یہ احساس دلایا کہ دینی و علمی مضامین بھی پڑھنے کی چیز ہیں اور کچھ نہ کچھ توجہ آخرت کی طرف بھی رکھنی ہی چاہئیے۔

اب ایسے ہی حضرات کی مسلسل فرمائش پر "کہانی نمبر" نکالا جا رہا ہے۔ یہ نمبر ہیئت کے اعتبار سے پورا ناول ہی ہوگا۔ مگر مقصد و معنیٰ کے لحاظ سے مرقعۂ عبرت۔ اس میں کردار نگاری کے ذریعہ یہ تنقیح کی جائے گی کہ اصلی تصوف کیا ہے اور نقلی کیا۔ ملّا کی تعریف یا تنقیص میں ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ صرف یہ توقع ظاہر کر سکیں گے کہ یہ "ناول" مقصدی ادب میں ایک منفرد اضافہ ہوگا اور بڑے سے بڑا خشک مزاج بھی اس کے دو صفحے پڑھ کر آخر تک پڑھنے پر مجبور ہو جائے گا۔

مزید تفصیل اور تاریخ اشاعت کا انتظار کیجئے۔

منیجر تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

ترقی پسند مسلمان کسے کہتے ہیں؟

سوویٹ سرکاری نظریہ کے مطابق کوئی مسلمان ترقی پسند تب ہی کہلا سکتا ہے۔ اگر وہ خدا پر ایمان سے مکمل طور پر دست کش ہو جائے۔ اپنے تہذیبی ورثے کو مکمل طور پر خیر باد کہہ دے اور اپنا اسلامی نام تک ترک کر دے۔

سوویٹ حکام اس معاملے میں کسی قسم کی نرمی برتنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر کوئی مسلمان مولوی مسلمانوں کے سامنے ایسی احمقانہ باتیں کہنے کو تیار ہو جائے کہ "اسلام کے جو چالیس احکام ہیں ان میں اکتالیسواں حکم بھی ہونا چاہئے۔ روسی زبان پر عبور حاصل کرنا"، تو بھی وہ سوویٹ حکام کی نظر میں غیر مشتبہ نہیں ٹھہرتا۔ کیونکہ ایسی باتیں کہتے وقت بھی وہ اسلامی احکام ہی کا حوالہ دیتا ہے۔ اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ "ہر چیز کا فیصلہ خدا ہی کرتا ہے"۔

اس سرکاری سوویٹ نظریہ کا اظہار ایک سے زائد بار ہوا ہے۔ لیکن اسکا غیر مبہم ترین اظہار سوویٹ ماہر نظریہ الیف اشیرود کے ایک مضمون میں ہوا ہے۔ جسکا عنوان ہے "اسلام اور قومی روابط" یہ مضمون سوویٹ جریدے "سائنس اور مذہب"، کے ۱۹۷۳ء کے دسویں شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

مضمون کا مطالعہ کرتے وقت آدمی یہ محسوس کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ سوویٹ نقطۂ نگاہ اور اس نکتہ چینی میں جو ہندوستانی مسلمانوں کے رویہ کے خلاف ہندوستانی کمیونسٹوں اور ان کے ہمسفروں یعنی سیکولرازم کے غالی حامیوں کی طرف سے ہوتی رہتی ہے۔ کافی مشابہت ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ ہندوستانی کمیونسٹ اور ان کے ہمسفر کیونکہ محروم اقتدار ہیں، اس لئے وہ اپنی بات روسیوں کی طرح کھل کر نہیں کہہ سکتے۔ عبد الخبیر

جب سرمایہ دارانہ نظام کا ظہور ہوا تو سماجی شیرازہ بندی کی ایک نئی شکل ابھری سماجی شیرازہ بندی کی یہ نئی شکل قوم تھی۔ قومی اقتصادیات اور قومی تہذیب کو فروغ دینے کے لئے قومی وحدت اور قومی احساس کو تقویت دینا ضروری ہو گیا۔ اس عمل کے نتیجے میں قومی ریاستیں وجود میں بھی آئیں اور ان کا استحکام بھی ہوا۔ سوال یہ ہے کہ اس عمل کی طرف اسلام کا رویہ کیا تھا۔ جس نے جاگیرداری اور قبل از جاگیرداری دور میں جنم لیا۔ مسلم تنظیموں اور مسلمان مولویوں کا یہ خیال تھا کہ قوموں کا وجود میں آنا اور قومی اقتدار کی نشو و نما اسلام کے اصولوں اور اسلامی اقتدار کے لئے خطرہ ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے قومی احکام اور انکی قومی ریاستوں کی تشکیل کی مخالفت کی کیونکہ اس میں انہیں اپنے مذہب کے لئے خطرہ نظر آتا تھا۔ مسلمان مولویوں کا یہ خیال بے بنیاد بھی نہیں تھا۔ کیونکہ مغربی یورپ میں قومی ریاستوں کی تشکیل سے مذہب کی بنیادوں کو ضعف ہی پہنچا تھا۔

ہمارے ملک کی وہ قومیں جو ایسے علاقوں میں رہتی تھیں۔ جہاں اسلام کا دور دورہ تھا۔ وہاں قومی ریاستوں کی تشکیل سوشلسٹ انقلاب کے فوراً ہی بعد شروع ہوگئی ان قوموں کے نام ہیں۔ قازق، تازک، ترکمان، کرگز، باشکر اور چیچن وغیرہ۔ یہاں جن ریاستوں کی تشکیل ہوئی وہ وہ نئی قسم کی ریاستیں تھیں۔ سوشلسٹ ریاستیں جو سرمایہ دارانہ قسم کی ریاستوں سے مختلف تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں

کے باشندوں کو سیکولرزم کی راہ پر گامزن کرنے میں کافی مشکلات پیش آئیں۔

مسلمانوں کی مذہبی تنظیموں اور مولویوں نے مشرق کے عوام کی سماجی یا قومی نجات کی سرگرم مخالفت کی انھیں یہ گوارا نہیں تھا کہ عوام میں قومیت کو فروغ ہو۔ مسلمانوں کی مذہبی تنظیمیں اور مولوی یہ درس دیتے تھے کہ قومی یا طبقاتی وحدت اسلامی وحدت کی ضد ہے۔

یہ تصور کہ مسلمان قومیں مذہبی طور پر ایک اکائی ہیں خود قرآن میں موجود ہے۔ اس دینی وحدت کو مسلمان من اللہ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا یہ وحدت دوامی ہے۔ اور اس میں کوئی ردّوبدل نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک قومی وحدت کا تعلق ہے۔ اسلام انھیں دوسری انسانی تخلیقوں کی طرح ہی سمجھتا ہے جو ناپائدار ہیں۔ اس کی تائید پان اسلام ازم کے مبلغ حقانی منظر کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتی ہے "جہاں تک موجودہ دور کی ایک اصطلاح قومیت کا تعلق ہے اسلام کی تعلیمات میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق مذہب اور قومیت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اسلام کی تعلیمات صرف ایک ملت کو تسلیم کرتی ہیں۔ جو بین الاقوامی اسلامی ملت ہے۔"

موجودہ دور میں جہاں کہیں بھی مذہبی وحدت کے تصور کا قومی یا طبقاتی وحدت کے عمل سے تصادم ہوا ہے۔ وہاں لامحالہ جیت آخرالذکر کی ہی ہوئی ہے اس کا ایک ثبوت سوویٹ یونین میں سوویٹ قوموں کی تشکیل ہے جو اسلامی تنظیموں کی مخالفت کے باوجود کامیاب رہی۔ اس کا ایک اور ثبوت مشرقی پاکستان کی قومی آزادی کی تحریک کی کامیابی ہے جس کے نتیجے میں بنگلادیش کی ریپبلک قائم ہوئی۔

اس وقت جب کمیونسٹ اور سوویٹ یونین کے محنت کش سوویٹ ریپبلکوں کو ایک واحد سوشلسٹ ریاست کی شکل دینے میں مصروف تھے جو ان کے نزدیک سوشلزم کی تعمیر اور ملک کی تمام قومی تہذیبوں کی ترقی اور ملک کے اقتصادی نظام کے نشوونما کے لئے ضروری تھا۔ مسلم مذہبی تنظیموں اور مولویوں نے اسی عمل کی زبردست مخالفت کی۔ ایسا کرتے وقت وہ بین الاقوامی سامراج کے حلیف بن گئے۔ جو ہر طریقے سے سوویٹ یونین کے قیام کو روکنا چاہتا تھا۔ وسطی ایشیا، کاکیشیا اور وولگا میں انہوں نے مسلمانوں سے یہ نہیں کہا کہ وہ روس، یوکرین اور بیلوروسی کے مزدوروں کے ساتھ تعاون کریں۔ بلکہ انھیں یہ سبق دیا کہ وہ ترکی کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا ساتھ دیں۔ انکے ایک نمائندے مصطفیٰ جوکیو کا کہنا تھا کہ "ہم سب مسلمان خواہ وہ کرگز ہوں خواہ باشکی خواہ تاتاری ایک واحد ترکی خاندان کے رُکن ہیں۔ ہم ایک ترکی قوم اور ایک واحد مسلم ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔

بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ سوویٹ مشرقی خطّے کے عوام اگر ان لوگوں کی بات مان لیتے جو انہیں پان اسلام ازم یا ترک وحدت کی تلقین کر رہے تھے تو انکا حال بُرا ہوتا۔ ان کا وہی حال ہوتا جو ان دنوں "اسلامی" دنیا کے بہت سے لوگوں کا ہے۔ اسلامی دنیا کی یہ قومیں سامراج کی مکمل طور پر ماتحت بن گئیں اور اقتصادی و تہذیبی طور پر پس ماندہ رہیں۔

پان اسلام ازم اور ترکی وحدت کے جو حامی باہر بھاگ گئے تھے۔ وہ اب بھی یہ حقیقت ماننے سے انکاری ہیں کہ سوویٹ یونین کے سابق عوام نے اپنی اپنی ریاستیں قائم کرلی ہیں۔

اسلامی تنظیموں اور مولویوں نے روس کے مشرق میں قومی ریاستوں کی تشکیل اور ان کی حدبندی کی جو مخالفت کی اور سماجی اور اقتصادی نظام کی بنیادی تہذیبوں کی جو مزاحمت کی اسکی بنا پر محنت کش مسلمانوں نے اجتماعی طور پر اسلام کو خیرباد کہنا شروع کر دیا۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اسلامی تنظیموں کا رویہ عوام دشمن ہے۔ بعد میں حامیانِ اسلام نے اپنے رویہ پر نظرثانی بھی کی۔ لیکن اس کے بعد بھی انہوں نے واقعات کو ایسی شکل میں پیش کرنا شروع کیا جو ان کی حقیقی شکل سے مختلف تھی۔ اب اسلام کے حامی یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام قومیت کا حامی ہے۔ اور مشرقی عوام کی قومی تہذیبوں اور ان کی ترقی کی ہر پہلو حمایت کرتا رہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکتوبر انقلاب کی کامیابی کے بعد بھی اسلامی تنظیموں اور مولویوں نے مسلمانوں کو تہذیبی طور پر علیحدگی پسندی کا درس

دیا اور یہ کوشش کی کہ سوویٹ یونین کے مشرقی خطوں کے کی رسائی یورپ کے ترقی یافتہ کلچر تک نہ ہو سکے۔

مسلمان مولویوں نے کوشش کی کہ مسلمانوں اور قوم کے غیر مسلم ممبروں میں رابطہ قائم نہ ہو اور اس سلسلے میں وہ قرآن کے اس قسم کے احکام کا حوالہ دیتے رہے کہ مومنوں اور منکروں یا کسی اور مذہب کے ماننے والوں کے درمیان دوستی اسلام کے منافی ہے قرآن کا حوالہ دیکر مولویوں نے یہ بھی کہا کہ غیر مسلم قوموں کی زبان سیکھنا بھی مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔ بہر حال اس سوال پر عوام نے مولویوں کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اُنہیں رفتہ رفتہ احساس ہو گیا کہ روسی زبان کو سیکھنے سے ان کی ترقی کے مواقع بہت بڑھ جائیں گے۔ روسی زبان سیکھ کر مشرقی خطو کے عوام کے لئے عالمی ترقی کے تاریخی عمل اور ایک عالمی تہذیب میں حصہ دار بننا ایک آسان امر ہو جائے گا۔

عوام کی اس ذہنی تبدیلی نے مسلمان مولویوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے پرانے نعروں کو خیر باد کہہ دیں ان دنوں وہ اپنے وعظ میں دوسری زبانوں کو سیکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور سب سے زیادہ زور روسی زبان کو سیکھنے پر دیا جاتا ہے۔ بہت سے مولوی تو مسلمانوں سے یہاں تک کہتے ہیں کہ اسلام کے جو چالیس احکام ہیں ان میں اب اکتالیسویں حکم کا اضافہ ہونا چاہئے۔ اور اس حکم کے ذریعہ روسی زبان کا سیکھنا فرض قرار دینا چاہئے۔

بہت سے مسلمان مولویوں نے ان خطوں میں جہاں اسلام بہت موثر تھا صنعتی ترقی کی بھی بہت مخالفت کی۔ کاشت کو تو مشترکہ بنانے کی انہوں نے خاص طور پر مخالفت کی اور عورتوں کی آزادی میں بھی رخنے ڈالے اس آزادی کو وہ روک تو کیا سکتے تھے۔ لیکن ان کی کوششوں سے اس میں تاخیر ضرور ہوئی۔

اب اسلام کے معتقدوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ قومی مفادات کے محافظ ہیں۔ لیکن تاریخی شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات نے صدیوں تک قوموں میں نفاق ہی ڈالا ہے اور قوم کے مختلف حصّوں میں عناد پیدا کیا ہے۔

مسلمان مولوی اپنے وعظوں میں با اوقات کہتے ہیں کہ ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنی زبان سکھائے وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی مادری زبان کے تحفظ سے یا تو مسجد کو دلچسپی ہے یا مولویوں کو۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ قومی روایات کی پاسبانی صرف مذہبی تنظیمیں ہی کر سکتی ہیں۔ مولویوں کے اس طرزِ عمل سے اسلام کو ماننے والوں میں اپنے ان ہم مذہبوں کے خلاف جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اپنے بچوں کو مادری زبان کے بجائے کسی اور زبان میں تعلیم دیتے ہیں۔ اور آپسی بات چیت کے لئے بھی اسی زبان کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس طرح ایک ہی قوم کے مختلف افراد میں نفاق پیدا ہو جاتا ہے۔

یہی معاملہ ناموں کا ہے۔ کہ وہ مسلمانوں کو بار بار یہ یقین دلاتے رہتے ہیں کہ مسلمان قوم کے ہر فرد کو اپنے بچے کا نام اسلامی رکھنا چاہیئے اس طرح اُن مسلمانوں کے لئے حقارت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو اپنے بچوں کے روسی نام رکھتے ہیں۔

کئی معاملوں میں مسلمانوں نے جو اپنے رویّے میں تبدیلی کی ہے۔ اسکے پیش نظر بعض لوگ یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ کیا اسلامی تنظیموں کی سرگرمیاں مختلف قوموں کے روابط کی بہتری کے لئے اب بھی خطرہ ہیں؟ آخر انہوں نے اپنے بہت سے پرانے تصورات کو خیر باد کہہ دیا ہے اور سائنس ٹیکنالوجی اور آرٹ کی ترقی کی حمایت شروع کر دی ہے۔ مختلف قوموں کی دوستی کے بھی اب وہ مخالف نہیں رہے۔ اس قسم کے سوالوں کے جواب کے لئے چند باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ مسلمان مولویوں کے رویہ میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ سوشلسٹ سماج کا نتیجہ ہے۔ سماجی ترقی اور قومی روابط کے بارے میں مسلمان مولوی جو نئی باتیں کہتے ہیں وہ اسلام کا جزو نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات کی ضد ہیں مولوی اپنے وعظوں میں جو باتیں کہتے ہیں۔ با اوقات وہ ان سوشلسٹ تصورات کا اعادہ ہوتی ہیں۔ جواب ہر سوویٹ شہری کو دل

سے عزیز ہیں۔ اور کبھی بارایسا بھی ہوتا ہے کہ مسلمان مولوی ان کی شکل بگاڑ کر پیش کرتے ہیں۔

یہ تجدیلی یہ ثابت نہیں کرتی کہ اسلام قدامت پسند نہیں اور اس کی تعلیمات رجعت پسندانہ نہیں سوویٹ سماج کی اقتصادی اور تہذیبی ترقی کے بارے میں مسلمان جو کچھ بھی کہتے ہیں اس لہجے میں کہتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر چیز کا فیصلہ خدا ہی کرتا ہے۔ اس طرح وہ عوام کے ذہن کو مارکسزم لینن ازم سے دور لے جاتے ہیں۔ اور سائنٹفک آئیڈیالوجی کے بجائے ان کے ذہن کو غیر سائنٹفک آئیڈیالوجی کی طرف راغب کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے دلوں میں ماورائی طاقتوں پر بھروسہ کرنے کا رجحان پیدا کرتے ہیں۔ اور اس طرح سماجی ترقی کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اسلامی مذہبی تنظیمیں اور مولوی خواہ کوئی بھی بہروپ بھر کر سامنے آئیں لیکن ان سے قومی علیحدگی کے عناصر کو تقویت ملتی ہے اور مختلف قوموں میں مفاہمت کے عمل کو ضعف پہنچتا ہے۔ ان کی مذہبی آئیڈیالوجی رجعت پسندانہ رسم و رواج کو تقویت پہنچاتی ہے اور عالمگیر رسم و رواج کی پذیرائی کو مشکل بناتی ہے۔ ان کی تعلیمات سے مختلف فرقوں میں شادی بیاہ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور قوموں کے باہمی میل جول میں بھی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے

• صبحِ فاراں (شمیم کرہانی) • الحرف الآخر (مولانا عبدالرحیم دہلوی) • اعترافات (عبدالرحیم نشتر) • شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (اقبال حسن خاں)۔

کھرے کھوٹے

صبحِ فاراں

ملک کے معروف شاعر جناب شمیم کرہانی کی ایک طویل نظم • صفحات ۶۴ • لکھائی چھپائی اچھی • قیمت تین روپے • شائع کردہ:- حسین اختر مرآد کرہانی ۱۷۶۸ حوض سوئی والان۔ دہلی ۶

شمیم کرہانی۔ زیادہ شہرت یافتہ نہیں تو بالکل گمنام بھی نہیں۔ غزل اچھی کہتے ہیں اور مشاعروں میں توجہ سے سنے جاتے ہیں۔ ان کی نظم پہلی بار سامنے آئی۔ ۵۳۲ مصرعوں کی اس مسدس نما نظم میں انھوں نے پہلے نعتِ رسولؐ کا مقدس فریضہ ادا کیا ہے پھر اسلام کے دورِ عروج کی کچھ مجمل سی تصویر کشی کی ہے اور اس کے بعد مہاجرینِ فلسطین کی طرف روئے سخن پھیرا ہے۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ غزل اور نظم شعر کی دو الگ صنفیں ہیں جن میں صرف طول و اختصار ہی کا فرق نہیں ہوتا بلکہ دروبست، ہیئت اور معنویت کا بھی فرق ہوتا ہے۔ نظم زنجیر جیسا تسلسل چاہتی ہے اور غزل صرف ایسے پھولوں کا گلدستہ ہے جو ایک دوسرے سے کوئی ربط نہیں رکھتے۔ بہت کم لوگ ہیں جو غزل اور نظم دونوں پر یکساں قادر ہوں۔ اس کا تعلق دراصل ذہن کی قدرتی ساخت سے ہے۔ تبصرہ نگار کا خیال ہے کہ جناب شمیم کرہانی کی ذہنی ساخت غزل ہی کے لئے موزوں ہے۔ انھیں اپنی بہترین صلاحیتیں اسی صنفِ سخن پر صرف کرنی چاہئیں نظم نہ کہیں تو بہتر ہے۔

نعتِ رسولؐ اور توصیفِ اسلام کے بعد جب وہ مہاجرینِ فلسطین کا ذکر شروع کرتے ہیں تو بیسیوں اشعار تک پتا ہی نہیں چلتا کہ دفعتاً یہ کس کا ذکر شروع ہو گیا ہے۔ اگر انھوں نے آغاز ہی میں یہ نشاندہی نہ کر دی ہوتی کہ یہ نظم مہاجرینِ فلسطین کے حالات سے بھی واسطہ رکھتی ہے تو پڑھنے یا سننے والے سمجھ ہی نہ سکتے کہ نظم چلتے چلتے یکایک کس وادی میں مڑ گئی ہے۔ کافی آگے چل کر احساس ہوتا ہے

کہ پچھلے بہت سے اشعار کا تعلق مہاجرین فلسطین سے ہے۔

وہ ایک اچھے غزل گو ہیں اس لئے بہت سے اچھے مصرعے تو ان کی نظم میں یقیناً دستیاب ہو جاتے ہیں مثلاً:۔

(۱) رحمت کی چھاؤں جیسی گھنی تھی گھنی رہی
(۲) دریا رواں رہا خس و خاشاک بہہ گئے
(۳) بزمِ بتاں میں ساغرِ توحید چل گیا
(۴) تو نے عرب کے ذہن کو تبدیل کر دیا
(۵) اسلام کے دیار میں صد پور برات ہے

لیکن مسدس میں کسی مصرعہ یا شعر کی مستقل بالذات حیثیت نہیں ہوتی بلکہ وہ پورے بند کا ایک جزو ہوا کرتا ہے اور اصلاً بند بھی مستقل بالذات نہیں ہوتا بلکہ پوری نظم کا ایک حصہ ہوتا ہے جیسے مشین کا ایک پرزہ یا بدن کا ایک عضو۔ لہذا نظم نگار کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ نظم کے بعض اجزاء سے نہیں اس کی مجموعی ہیئت اور دروبست ہی کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ بحیثیت مجموعی ہم شمیم صاحب کی اس پاکیزہ کاوش کو کامیاب محسوس نہیں کر سکے ہیں۔

تعجب یہ ہے کہ ذی علم ہونے کے باوجود اس ۵۳۲ مصرعوں کی نظم میں شمیم صاحب سے زبان و لغت کی بھی متعدد غلطیاں ہوئی ہیں جنھیں نہ ہونا چاہئیے تھا۔

پہلا ہی مصرعہ ہے:۔

اے سرورِ زمانہ و روشن گرِ زمیں

"روشن گر" محاورے کے خلاف ہے۔ زمین یا مکان یا محفل کو جو شمع یا قمقمہ روشن کرے نہ تو اسے "روشن گر" کہا جاتا ہے نہ اس شخص کو جس نے شمع جلائی یا قمقمہ روشن کیا۔ ہمارے محدود مطالعہ میں اردو ادب "روشن گر" کی ترکیب سے ناآشنا ہے۔

تو پتھروں میں ڈھنگ کے بھی دیتا رہا پیام

"ڈھنگ" بے محل استعمال ہوا۔ اگر کوئی شخص پتھروں سے مضروب و مجروح ہو تو کون اہلِ زبان یوں کہتا ہے کہ وہ "پتھروں سے ڈھنگ گیا"۔

چھایا ہوا طلسمِ زیاں کائنات پر

"طلسمِ زیاں" خواہ مخواہ کی ترکیب ہے۔ زمانِ بعثت سے قبل دنیا عموماً اور اہلِ عرب خصوصاً کردار و افکار کی جن گراوٹوں کی مجسم تصویر تھے اسے لفظ "زیاں" سے تعبیر کرنا یوں بھی صحیح طریق تعبیر نہیں پھر "طلسم" کے اضافے نے اسے اور بھی ناموزوں بنا دیا۔ یہاں "کائنات" کا لفظ بھی بے محل ہے۔ انسانی کردار و عقائد کی تمام گراوٹوں کا تعلق ظاہر ہے اس سرزمینِ آدم ہی سے ہے جو کائنات کے بیکراں سمندر میں ایک قطرے سے زیادہ نہیں۔ پھر یہ "طلسمِ زیاں" پوری کائنات پر کیسے پھیلا دیا گیا۔

وہ چھوٹی چھوٹی تنگ خیالوں کی بستیاں
اُن بستیوں میں نخوتِ باطل کی ہستیاں

دوسرا مصرعہ کسی اہلِ زبان کے کہنے کا نہیں۔ شمیم صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ تنگ خیالوں کی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں وہ لوگ بس رہے تھے جو سراسر باطل پر تھے اور اپنی اس حالت پر انھیں گھمنڈ بھی تھا۔ یہ مضمون ان کے مصرعہ سے سمجھ میں آ جاتا ہے لیکن یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ بات کو ڈھنگ سے کہا گیا ہے۔ "نخوتِ باطل کی ہستیاں" لغو ٹکڑا ہے۔

"انصاف آدمی کے لئے ہے نہ داد ہے"

انصاف اور داد یہاں مرادف الفاظ ہیں۔ ان کے استعمال میں ایسی ہی خامی ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ

"زید غم سے چھٹکارا نہ پا سکا نہ الم سے"

اور — "بکر کے حصہ میں دولت آئی نہ سرمایہ"

داد کو اگر "بخشش" کے مفہوم میں لے لیں تب بھی اس کا یہاں موقعہ نہیں۔

حسرت کہ کیوں نہ ہم ہوئے سردارِ سروراں
نفرت کہ سربلند ہے کیوں مطلب کی جاں

محترم شاعر ان کفار کے خیالات کی عکاسی کر رہے ہیں جو رسول اللہ کی روز افزوں عظمت و مقبولیت سے غصہ و غم اور حسد و حسرت میں مبتلا ہیں۔ "سردارِ سروراں" کا

کوئی موقعہ نہیں تھا۔ جس شخص صلعم کے مقابلہ میں کفار حسد وحسرت کا شکار رہیں وہ ابھی "سردارِ سروراں" نہیں بنا ہے۔ ابھی تو وہ صرف مٹھی بھر غریبوں اور خستہ حالوں کا سردار ہے مگر مصرعہ اس کے خلاف تأثر دے رہا ہے۔

"مطلب کی جان" بجائے خود حیرت ناک پھر "جان" کے لئے سربلندی کی صفت اور بھی تعجب خیز۔ ہم جانتے ہیں کہ اہلِ زبان جانِ مادر۔ جانِ پدر جانِ برادر جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں اسی طرح کسی مناسب موقعہ پر حضور صلعم کے لئے "جانِ مطلب" بھی استعمال کرنا ممکن ہے لیکن "مطلب کی جاں" کہنا تو اناڑی پن ہے پھر جس سیاق میں کہا گیا وہ اہلِ ادب کے سامنے ہے۔ نیز "نفرت" کا نہیں رشک یا حسد جیسے کسی لفظ کے استعمال کا موقعہ تھا۔

کانٹوں سے ڈھانک دی گئی ہر ایک رہگزر

"ڈھانک" کو یہاں شاید غلط تو نہ کہہ سکیں مگر صحیح ترین لفظ "پاٹ" تھا۔ "ڈھانکنا" تو اس جگہ موزوں رہتا ہے جہاں کسی شے کے چھپائے جانے کا ذکر ہو۔ "ڈھانکنا" پردہ ڈالنے یا کسی بھی شے کو دوسری شے کی آڑ میں لے لینے کا نام ہے۔ راہوں میں کانٹے ڈالنے کا مقصد راہ کو چھپانا نہیں ہوتا دشوار گذار بنانا ہوتا ہے۔

کعبہ تو ملکیت ہے بتانِ سیاہ کی
کیسی ندا یہ اشہد ان لا الٰہ کی

اوّل تو "بتانِ سیاہ" کوئی خوشگوار ترکیب نہیں۔ پھر اس بنا میں شمیم صاحب کفار کے خیالات بیان کر رہے ہیں۔ وہ جب اذان کی آواز پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے اپنے ان بتوں کا ذکر کریں گے جو اب تک بیت اللہ میں شانِ خدائی سے نصب ہیں تو ان کے ساتھ "سیاہ" جیسی کوئی قبیح و مذموم صفت کیوں لگائیں گے۔ یہاں شمیم صاحب کافر کے ذہن میں مسلمان کی زبان رکھ گئے ہیں۔

ارضِ ستم پہ شیوۂ دختر کشی ہے عام
ہوتا ہے یہ مقاتلہ دھرتی پہ صبح و شام

اگر عربی الفاظ استعمال کرنے ہی تھے تو کاش شمیم صاحب نے تھوڑی سی عربی پڑھلی ہوتی۔ "مقاتلہ" جب تا کے زیر سے ہو (مقاتِلہ) تو نام ہے لڑنے والی جماعت کا اور جب تا کے زبر سے ہو تو دو فریقوں کی باہمی حرب و ضرب کو کہتے ہیں۔ عرب زمانہ جاہلیت میں بچیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے اس کے لئے "مقاتلہ" کا لفظ استعمال کرنا مضحکہ خیز حد تک غلط ہے۔

کردار ہے کہ آئینۂ رحمتِ بشر

"رحمت بشر" یہاں مہمل ہے۔

تاباں شعور و وحدتِ جذبات ہو گیا

اتحاد و اخوت کا جو جذبہ حضور صلعم کی تعلیم نے صحابہ رضی اللہ عنہم میں بیدار کر دیا تھا اسے ان الفاظ میں بیان کرنا قادر الکلامی کا مظاہرہ نہیں کہلا سکتا۔

باتیں رفوگری کی حیاتِ گلیم سے

گلیم کمبل یا گدڑی وغیرہ کو کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کیڑا کھائے ہوئے کمبل میں رفو کی خدمت انجام دے رہا ہے اور اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ برابر یہ خدمت انجام دیتا رہے گا تو کیا اس صورتِ حال کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ فلاں شخص "حیاتِ گلیم سے رفوگری کی باتیں کر رہا ہے۔"

پھٹے ہوئے لباس کو سی اور گانٹھ کر اس کی عمر میں اضافہ کر دیا جائے تب بھی یوں تو نہیں کہا جاتا کہ "حیاتِ لباس میں اضافہ کر دیا۔" مگر یہاں تو ایک اور بھی پیچیدگی ہے۔ مصرعہ میں یہ رفوگر "حیاتِ گلیم" ہی سے مخاطب ہے۔ اسے کیا کہیں گے۔

درماں کی گفتگو دلِ چاکِ یتیم سے

"دلِ چاکِ یتیم" کی اردو کیجئے۔ یتیم کے چاک کا دل۔ آخر کیا معنی ہوئے۔ غالباً محترم شاعر "چاکِ دلِ یتیم" کہنا چاہتے ہوں گے مگر وزن کی مجبوری نے دل اور چاک کو آگے پیچھے کر دیا۔

کیا مہربانیاں ہیں اسیرانِ درد پر

"اسیرانِ درد" بجائے خود غلط ترکیب نہیں۔ لیکن بعثتِ رسولؐ کے وقت اہلِ عرب جن بے شمار برائیوں سے ملوث تھے کیا ان کی تعبیر بایں الفاظ کی جاسکتی ہے کہ وہ لوگ اسیرانِ درد تھے ؟

دوسرا مصرعہ ہے :-

جیسے پھوار گرتی ہے گلہائے زرد پر

زرد صرف قافیہ پیمائی ہے ورنہ تشبیہ میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں کہ سرخ، نیلے، بنفشئی پھولوں کو مستثنیٰ کر کے صرف زرد پھولوں پر پھوار گرائی جائے۔ ہاں یہ دور کی کوڑی ضرور لائی جاسکتی ہے کہ وہ لوگ چونکہ اسیرانِ درد تھے اور درد میں مبتلا آدمی کا چہرہ عموماً زرد ہو جاتا ہے اس لئے زرد پھولوں کی تخصیص کی گئی۔

ظلمت شکن جو ہو گئی تنویر کی صدا
عالم میں گونجنے لگی تکبیر کی صدا

حیرت ہوتی ہے کہ محترم شاعر کس قسم کا طرز اظہار پسند فرماتے ہیں۔ "تنویر کی صدا" بھلا کیا چیز ہوتی ہے یہ بگڑے ہوئے ترقی پسندوں کی روش ہے کہ جس موصوف کے ساتھ جو صفت چاہے چپکا دو۔ مضمحل دیوار۔ غمگین براندہ متفکر دھواں۔ دہاڑتا سورج۔ گاتا چاند۔ بس اسی طرح "تنویر کی صدا" بھی ہے۔

اور ظلمت مٹ جانے کا نتیجہ آخر یہ کیسے نکل آیا کہ عالم میں تکبیر کی صدا گونجنے لگی حالانکہ پہلے مصرعہ کا لفظ "جو" یہ بتاتا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں جس نتیجے کا بیان ہے اس کے لئے وہ واقعہ سبب بنا ہے جو پہلے مصرعہ میں بیان ہوا ہے۔

مائل بہ لطف سیلِ غم و جور ہو گئی

"سیل" کو مؤنث پہلی بار پڑھا۔ کیا واقعی مستند اہلِ زبان کا کوئی حلقہ اس کی تانیث کا بھی قائل ہے۔ اس نحوی غلطی کے علاوہ اندازِ بیان قطعاً نوشقوں جیسا ہے۔ غم اور جور مٹ جائیں اور زندگی خوشی اور انصاف سے ہمکنار ہو جائے تو یوں کون بولتا ہے کہ غم وجور کا سیل مائل بہ لطف ہو گیا۔ یہ اسلوب تو بتاتا ہے کہ غم وجور کا سیل اپنی جگہ موجود ہے مگر اب اس نے اپنا رخ "لطف" کی طرف پھیر دیا ہے۔

صحرا میں زندگی سے ملاقات ہو گئی

یہاں شاید توارد واقع ہوا۔ معلوم نہیں کس کا مصرعہ ہے مگر ہے بہت مشہور:-

کل رات زندگی سے ملاقات ہو گئی

غالباً کسی ریکارڈ میں بجتا ہے۔

مٹی کو چھو لیا تو گُہر بن کے رہ گئی
تپتی پہ کی نظر تو شجر بن کے رہ گئی
دیکھا جوراُت کو تو قمر بن کے رہ گئی
ظلمت سے بات کی تو سحر بن کے رہ گئی

جہاں تک ہماری فہمِ ناقص کا تعلق ہے یہ اندازِ بیان تحسین و توصیف کے لئے موزوں نہیں ہوتا۔ یوں تو کہتے ہیں کہ ——— "فلاں شخص پے در پے ایسے حوادث کا نشانہ بنا کہ تباہ ہو کر رہ گیا۔" مگر یوں نہیں کہتے کہ "فلاں شخص کو پے در پے ایسے سنہری مواقع حاصل ہوتے چلے گئے کہ وہ بے حد دولت مند ہو کر رہ گیا۔"

"ہو کر رہ جانا" بے بسی اور مجبوری کی ایک ایسی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جو حسن کا نہیں قباحت کا پہلو اپنے اندر رکھتی ہے یا کم سے کم تعریف کا پہلو اس میں نہیں ہوتا۔

زید حیران ہو کر رہ گیا ——— بکر کی زندگی نمونۂ عبرت بن کر رہ گئی ——— فلاں شخص فلاں کا غلام بنکر رہ گیا یہ فقرے صحیح ہیں مگر ذیل کے فقرے صحیح نہیں ہیں۔

زید کو ایسی اچھی بیوی ملی کہ خوش ہو کر رہ گیا ——— طلحہ کو فلاں جگہ کی آب و ہوا ایسی سازگار آئی کہ تندرست بن کر رہ گیا۔ نجمہ کو ایسا عمدہ شوہر ملا کہ خوش قسمت بنکر رہ گئی۔

کبھی اگر اس طرح بولیں کہ "زید کو دولت کیا ملی سراپا عیش بن کر رہ گیا۔" تو مقصود تعریف و تحسین نہیں ہوتی تنقیص و تعریض ہوتی ہے۔ اور اگر یوں کہیں کہ "کھانا مزے دار تو تھا مگر اتنا کم تھا کہ ہم ہونٹ چاٹتے رہ گئے۔"

——— تو اس سے بھی بے بسی حسرت اور محرومی کے عنصر کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اس وضاحت کی روشنی میں غور کیا جائے کہ کیا منقولہ بند زبان کے اعتبار سے معیاری ہے۔

قاتل نگاہ لطف سے مقتول ہو گئے
سحرِ حلالِ حسن سے معمول ہو گئے

دوسرے مصرعہ سے ناپختگی ہویدا ہے۔ کوئی شخص یا گروہ اگر حسن کے جادو سے مسحور ہو جائے تو یوں نہیں بولا جائے گا کہ ——— "وہ حسن کے سحر سے معمول ہو گیا۔"

"سے" کا تو محل ہی نہیں۔ ویسے بھی "معمول" اُس شخص کو کہتے ہیں جو وقتی طور پر کسی عامل کے زیرِ اثر ہو اور اِس شخص کی جنبش و حرکت میں اس کے اپنے شعور و قصد کی کارفرمائی نہ ہو۔ حالانکہ جو لوگ رسول اللہ ؐ کے حسنِ سیرت اور حسنِ تعلیم کے سحر سے مسحور ہوئے ان کا تاثر وقتی اور محدود نہیں تھا نہ ایسا تھا کہ ان کا اپنا شعور اور قوتِ ارادی مسلوب ہو کر رہ گئی ہو۔

پائی ہوا جو رحمتِ پروردگار کی
صرصر نے بوئے گل کی روش اختیار کی

"صرصر" آندھی یا جھکڑ کو کہتے ہیں۔ اول تو یہی عجیب ہے کہ کسی قسم کی ہوا یا کہ صرصر کی روش میں کوئی تبدیلی واقع ہو۔ دوسرے صرصر کی تبدیل شدہ روش کو پسندیدگی کے موقعہ پر نسیمِ سحر یا بادِ سبک رو یا بادِ بہاری کی رو سے تو تعبیر کر سکتے ہیں بوئے گل کی روش سے تعبیر کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بُو کی اپنی کوئی روش نہیں وہ ہوا کے کاندھے پر سفر کرتی ہے۔

ہر دل میں دردِ عشق کی خوشبو مچل پڑی

یہ وہی "ترقی پسندی" ہے جس کی مثال ہم دے آئے۔ "درد کی خوشبو" ایسی ہی بات ہے جیسے غم کی بدبو اور صدمے کا تعفن۔ نیز خوشبو کے لئے مچلنے کی صفت بھی کچھ زیادہ قرینِ فہم نہیں۔

محنت، بہار در بغل و کشت در جلو

جلو کے لام پر پیش ہونا چاہیئے مگر اس لفظ کو تو اور نو اور جو کا ہم قافیہ باندھا گیا ہے۔ اس بند کا پہلا مصرعہ ہے:—

محنت، لہو کا رنگ جبینِ عرق کی لَو

"جبینِ عرق کی لَو" میں بھی وہی الٹ پلٹ ہے جو "دل پاکِ تئیم" میں تھی۔ "عرقِ جبیں کی لَو" کہنا چاہیئے تھا مگر اس سے وزن خراب ہو جاتا۔

نانِ جویں، معیشتِ اقوام کا سراغ

کیا بات ہوئی ؟

دولت، سہیمِ زندگیِ مجلسِ عوام

توالیِ اضافات سے قطع نظر الفاظ بے محل ہیں۔

دیتے ہیں نور قصرِ صداقت کے جھاڑ کو

تحیر ہے کہ شاعر کے مذاقِ سلیم نے لفظ "جھاڑ" کو یہاں کیسے گوارا کر لیا۔ "جھاڑ فانوس" ملا کر بولیں تو کھردرا پن کم ہو جاتا ہے مگر تنہا جھاڑ تو وجدان کیلئے روڑے سے کم نہیں۔

وجہِ زکوٰۃ کیا ہے دفینہ عیاں رہے

اس سے قطع نظر کہ زکوٰۃ کی مصلحت و غایت صحیح تشخیص نہیں کی گئی لفظ "دفینہ" کا یہ کوئی موقعہ نہیں تھا۔ ہر چھپے ہوئے مال کو دفینہ نہیں کہتے بلکہ اس کا اطلاق صرف زمین میں گڑے ہوئے مال پر ہوتا ہے۔

بنیادِ ربط ہے سببِ انہماک ہے
زر ملکیت نہیں بدلِ اشتراک ہے

خیال بھی ناقص اور طرزِ اظہار بھی نارسا۔ "سببِ انہماک" تو کسی دوسری زبان کا ترجمہ محسوس ہوتا ہے۔

دولت حیات و حدتِ دل کا نظام ہے

معلوم ہوتا ہے کہ مافی الضمیر کی ادائیگی کیلئے موزوں الفاظ کے انتخاب پر شاعر کو قدرت نہیں ہے۔ وہی بتائیں کہ اس طرح کی زبان کسی کو کیا دے گی۔

سرمایہ، دہر کے لئے ترسیلِ آگہی
تہذیبِ نفس و خواہش تکمیلِ آگہی

جہدِ حیات و جذبۂ تحصیلِ آگہی
شامِ جنوں کی راہ میں قندیلِ آگہی

ایک بھی مصرعہ قدرتِ اظہار و بیاں کا مظہر نہیں۔
"سرمایہ یعنی دولت زمانہ کے لئے آگہی کی ترسیل ہے"
یہ کس قسم کا جملہ ہے۔ اول تو آگہی سے سرمایہ کا تعلق کیا۔ پھر ترسیلِ آگہی اور بھی معمہ۔ آگے "تہذیبِ نفس" اور "خواہش تشکیلِ آگہی" کی پہیلیاں بھی حل مانگ رہی ہیں۔ سرمایہ "تہذیبِ نفس" ہو یہ تو مہمل بات ہے۔ تہذیبِ نفس کا ذریعہ ہو یہ بھی بامعنی بات نہیں ہوئی "تشکیلِ آگہی" کا مصداق کیا ہے اور اس کی خواہش کا ذکر کیوں۔ مزید دونوں مصرعے بھی چیستاں ہیں۔

سارے مسافرانِ سحر مبتلائے شام

افسوس کہ محترم شاعر جس لفظ کو جہاں چاہے لے آتے ہیں۔ مبتلائے فراق، مبتلائے رنج، مبتلائے درد تو سنتے آئے تھے مگر مبتلائے شب، مبتلائے شام، مبتلائے نہار جیسے الفاظ اب سننے میں آئے۔

ہم سازشِ زمانہ سے حیراں ہیں صف بہ صف

لوگوں کا باقاعدہ صف بصف حیران ہونا بھی آج ہی سننے میں آیا۔

خیموں میں قیدِ زہرۂ و مہتاب و کہکشاں

خیال نہیں فرمایا گیا کہ کہکشاں کا اطلاق کسی "فردِ واحد" پر نہیں ہوتا وہ تو ستاروں کے مجموعے کا نام ہے اور اپنی عین وضع میں جمع کا مفہوم رکھتا ہے۔ یہاں زہرہ اور مہتاب کے ساتھ اس کا عطف درست نہیں۔

چلنے لگے حیاتِ غریبانِ مستہام

ہمیں اقرار ہے کہ یہاں لفظ "مستہام" ہماری قابلیت کی سطح سے بلند رہا۔

رکھتے نہیں یگانہ و دشمن میں امتیاز

کاش شاعرِ محترم اشاعت سے قبل اپنی نظم کسی ذی علم کو دکھا لیتے۔ "مقابلۃ" جیسی فحش غلطی یہاں بھی ہے۔ "یگانہ" تو یکتا اور لاجواب کو کہتے ہیں مگر انھوں نے اسے "دوست" کے معنی میں سمجھ لیا ہے۔ شاید مغالطہ انھیں لفظ "بیگانہ" سے ہوا کہ جب بیگانہ کے معنی غیر، دشمن، اجنبی وغیرہ کے ہیں تو یگانہ کے معنی اپنے اور خویش اور دوست وغیرہ کے ہوں گے۔

یہ بھی خبر نہیں کہ زمانہ ہے جانگداز

لفظ "جانگداز" کا استعمال اس جگہ سراسر محلِ نظر ہے۔

قتّالِ روشنی ہے اندھیروں کا ساز باز

لفظِ قتّال یہاں کسی طرح بھی برمحل نہیں۔ اگر یہ خیال کیا گیا ہے کہ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے تو یہ بھی صحیح نہیں۔ "قاتل" سے مبالغہ کا صیغہ قتول آتا ہے قتّال نہیں۔ اور اگر باب تفعیل سے اسے اسمِ فاعل قرار دیا گیا ہے تو معلوم ہونا چاہیئے کہ باب تفعیل سے قتل اس وقت لایا جاتا ہے جب بہت سے لوگ قتل کر دیئے جائیں۔ یہاں شاعر کے بیان کے مطابق مقتول "روشنی" ہے یعنی شئی واحد پھر قتّال کیا معنی۔

راہوں میں اشتراک نہ منزل پہ اتفاق

یہاں سے شاعر امت کا موجودہ حال بیان کر رہے ہیں۔ یہ سلیس مصرعہ اس کے لئے بہت موزوں ہے لیکن دوسرا مصرعہ پھر سلاست سے گر گیا۔

آئینِ زندگی ہے کہ منشائے افتراق

منشار کا کوئی محل ہی نہیں تھا۔ تیسرا مصرعہ بھی سقم سے خالی نہیں۔

ملّت کا حوصلہ نہ اخوت کا اشتیاق

شاعر اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ "اخوت" ایک مصدری مفہوم ہے اور ملّت ایک اسم شئے۔ ایثار، غمخواری، دوستداری جیسا کوئی لفظ ملّت کے بجائے آتا تو بات بنتی۔

اسی سلسلۂ مضمون میں آگے کہا گیا:۔

توحیدِ عشق، دین کا پیغام ہی نہ ہو
دنیا میں کوئی مرکزِ اسلام ہی نہ ہو

کوئی بتائے کہ پہلے مصرعہ کا کیا مفہوم ہے۔

رہتے ہیں جن میں چشمۂ روغن رواں دواں

یہ عربوں کی زمینوں کا ذکر ہے۔ پتا نہیں اسقدر مشکل پسندی

شاعر کے ذہن پر کیوں سوار ہے کہ چاہے بندش خراب ہو جائے مگر سہولت پیدا نہ ہو سکے۔ نحوی اعتبار سے "چشمہ ہائے روغن" کا موقعہ تھا لیکن اس جھنجھٹ سے بچ کر یوں بھی تو کہہ سکتے تھے:۔

رہتے ہیں جن میں تیل کے چشمے رواں دواں

حالانکہ "رواں دواں" پھر بھی حشو سے خالی نہیں ضرورت صرف "رواں" پر ختم ہو جاتی تھی۔ تاہم "چشمہ روغن" کا بوجھ تو کچھ ہلکا ہوتا۔

بخشا گیا تھا جن کو مذاقِ انا بھی

آج کے بہتیرے شعراء "انا" کو بطور تحسین عرفانِ ذات اور خودداری جیسے مفہوموں میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ شمیم صاحب نے بھی یہاں یہی کیا ہے لیکن یہ ہے ایک غلط روش۔ انا اور انانیت کا مصداق ہے نخوت کبر، گھمنڈ۔ ان اوصاف کا شمار ظاہر ہے رذائل میں ہے فضائل میں نہیں۔

خوفِ نجات و خواہشِ دنیا سے ہمکنار

"خوفِ نجات" مہمل ترکیب ہے۔ نجات ڈرنے کی چیز نہیں تمنا کرنے کی چیز ہے۔

خوفِ آخرت اور خوفِ خدا تو درست مگر خوفِ نجات اک امرِ نادرست۔

سینوں میں اک جہانِ غم و ہم لئے ہوئے

اَلْھَمُّ عربی میں بے شک غم کو بھی کہتے ہیں لیکن اُردو میں یہ لفظ مانوس نہیں۔ اس کا استعمال یہ ظاہر کرتا ہے شاعر مانوس الفاظ میں مصرعہ پورا کرنے سے عاجز آ گیا ہے۔ کیا مشکل تھا اگر یوں کہہ دیا جاتا:۔

سانسوں میں ایک سلسلۂ غم لئے ہوئے

اس سے غم و الم کی اُس کثرت و شدت کا اظہار سادہ الفاظ میں ہو جاتا جسے اس بند میں ظاہر کیا گیا ہے۔

امیدوار چشمِ کرم آفریں ہیں ہم

"آفریں" فضول ہے۔ اُردو میں صدہا اشعار ہوں گے جن میں تنہا "چشمِ کرم" نے وہی مفہوم ادا کیا جسے اس مصرعہ میں ادا کیا گیا ہے۔

آخر گناہگار ہیں کافر نہیں ہیں ہم

اس پر اگرچہ حاشیہ دے دیا گیا ہے کہ غالب سے استفادہ۔ لیکن ایک بات قابلِ غور یہ ہے کہ غالب کے یہاں بھی اور اس بند میں بھی لفظ کافر فا کے زبر سے استعمال ہوا ہے۔ ذاکر اور سرور کا قافیہ جس زبان کا یہ لفظ ہے اس کے قواعد تو فائے مفتوح کی اجازت نہیں دیتے۔ قرآن سے بڑھ کر کیا سند چاہئے۔ مومن کا مقابل کافر جہاں بھی پائیں گے فائے مکسور سے پائیں گے (کافِر) اس باب کا وزن فاعِل ہی یہ ہے۔ پھر کیا غالب یا کسی بھی سلف و خلف کی خطا سند قرار پا سکتی ہے کیوں اس خطا کا تتبع کیا جائے۔

زبان کی ان خامیوں اور سلوٹوں کے بعد کچھ اور گوشے بھی قابلِ گفتگو ہیں۔

لیکن ثباتِ عزم سے فطرت بدل گئی

کہا یہ جا رہا ہے کہ اہلِ عرب اگرچہ بہت سفاک اور گم گشتہ راہ تھے لیکن رسول اللہ ﷺ نے استقامت کے ساتھ دعوتِ حق کو جاری رکھا تو ان لوگوں کا رنگ ہی بدل گیا۔ اس تبدیلی کو فطرت کی تبدیلی کہنا درست نہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ اگر تم سنو پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو یقین کر لو لیکن یہ سنو کہ فلاں کی فطرت بدل گئی ہے تو ہرگز مت یقین کرو۔

فطرت بدلنا کسی کے بس میں نہیں۔ حضورؐ کی دعوتِ حق نے اہلِ عرب کے فطری خواص و خصائل کو صحیح سمت عطا کی تھی ان کی پیدائشی صلاحیتوں پر سے وہ زنگ چھڑایا تھا جو جاہلیت اور بعض خارجی عوامل نے ان پر چڑھا دیا تھا۔

رحمت کا پھول غیب کی تائید ہی تو ہے
جانِ بہار نغمۂ توحید ہی تو ہے

کہا یہ جا رہا ہے کہ ہر شخص تو دل میں بغض اور ہاتھ میں پتھر لئے پھر رہا ہے مگر:۔

رحمت کا ایک پھول پیمبر لئے ہوئے

ہمارے خیال میں حضورؐ کی وسیع شانِ رحمت ورافت کا اندازہ "ایک پھول" کے الفاظ سے بہت کم ہوتا ہے۔ حضورؐ تو رحمت ورافت کے چمن تھے بلکہ چمن اندر چمن۔

تاہم یہ کہنا کہ "رحمت کا پھول غیب کی تائید ہی تو ہے" کوئی موزوں طرزِ اظہار نہیں۔ پھر دوسرے مصرعہ میں "نغمۂ توحید" کا کیا موقعہ تھا۔ پھول جانِ بہار ہو سکتا ہے مگر نغمہ اس کی صفت کہاں۔ "رحمت کا پھول نغمۂ توحید ہے" یہ ایک بے تکی بات ہوئی۔

عرفاں سے دور غیظ وغضب سے قریب تر

عرفاں کا مقابل غیظ وغضب نہیں جہل ہے اور غیظ و غضب کا مقابل عرفاں نہیں حلم وضبط اور نرمی ورافت ہے۔ یہاں دو متقابل چیزیں درکار تھیں جو نہیں فراہم ہو سکیں۔

جس کی طرف جبینِ ملائک جھکی ہوئی

اگر تلمیح حضرت آدمؑ والے قصے کی ہے کہ انھیں ملائکہ نے بحکم خداوندی سجدہ کیا تو اس میں حضورؐ کی کوئی خصوصیت نہیں تمام ہی ابنائے آدم ضمناً مسجودِ ملائک کہے جا سکتے ہیں۔ جیسے اقبال نے تعریضاً کہا تھا:۔

تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے

لیکن اگر کوئی اور منشاء ہے تو اس کا سراغ نہیں لگا۔ ملائکہ کسی کے آگے نہیں جھکتے اِلاّ یہ کہ خدا انھیں حکم دے۔ حضرت آدمؑ کے بعد کبھی کسی کے لئے اللہ نے فرشتوں کو سجدے کا حکم نہیں دیا چنانچہ حضرت جبریل حضورؐ کے پاس آتے تھے تو فرطِ تعظیم میں رکوع وسجود کرتے نہیں آتے تھے۔

ہاں "جبینِ ملائک جھکنے" سے اگر کچھ اور مطلب لیا گیا ہے تو محترم شاعر جانیں۔

دشنام جاہلاں سے نہ خاطر ہوئی ملول

یہ درست نہیں، جاہلوں کی بدزبانیاں اور بیہودہ سرائیوں سے بارہا حضورؐ کو بہت ملال ہوا کرتا تھا۔ خوشی یا غم تو فطری جذبے ہیں۔ ان سے حضورؐ بالاتر نہیں تھے ہاں ثبات و استقامت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ گالیوں نے عزم وہمت میں تزلزل پیدا نہیں کیا۔

قدیم عرب کی رسم دخترکشی کا ذکر کر کے کہا گیا ہے:۔

لیکن ترا پیام ہے کیا دل نشیں پیام
بیٹی کے در پہ آ کے جو تو نے کیا سلام
بنتِ نبی کا مرتبہ پہچاننے لگے
بیٹی کو لوگ ماں کی طرح ماننے لگے

موٹی سی بات ہے کہ لفظِ "پیام" کا اطلاق کسی ایک تحریری نصیحت یا دعوت پر ہوا کرتا ہے۔ اس پیام کے ذیل میں تفصیلی تعلیم وتربیت کا جو کام کیا جائے اسے تعلیمات یا ہدایات جیسے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ حضورؐ کا پیام عالمِ انسانیت کو یہ تھا کہ خدا ایک ہے اور میں اس کے رسولؐ کی حیثیت سے خبر دے رہا ہوں کہ تنہا وہی بندگی کے لائق ہے۔ یہ پیام نہ تو دخترکشی جیسی کسی ناپاک رسم پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے نہ چوری اور زنا اور شراب نوشی اور سود خواری جیسی لعنتوں سے اس کا راست تعلق ہے اس لئے یہ کہنا کہ "تیرے پیام نے دخترکشی کی ملعون رسم کا خاتمہ کر دیا" امرِ واقعہ کے بیان کا ناموزوں اور غیر منطقی اسلوب ہے۔

پھر شاعر نے پیام والا مصرعہ تشنہ چھوڑ کر دفعتاً ایک اور بات شروع کر دی۔ یہ بات بجائے خود محتاجِ تشریح تھی۔ حضورؐ متعدد بیٹیوں کے باپ ہوئے ہیں۔ بند سے نہیں پتا چلتا کہ آپ نے کون سی بیٹی کے در پہ آ کے سلام کیا تھا۔ مزید یہ کہ ایک باپ اگر بیٹی کے گھر میں داخل ہو کر اسے سلام کرے تو کوئی مہذب آدمی اسے اس طرح بیان نہیں کر سکتا جس طرح شاعر نے کیا ہے۔ خصوصاً باپ جب رسول اللہؐ جیسا رفیع الشان باپ ہو۔ یہ طرزِ بیان تو اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب کوئی کم درجہ انسان کسی بلند مرتبہ انسان کے درِ دولت پر نیازمندانہ حاضری دے۔ جب شاعر لوگ "درِ محبوب" پر جبہ سائی اور حاضری کا ذکر کرتے ہیں اسوقت بھی ذہنی پس منظر یہی ہوتا ہے کہ محبوب کا درجہ کہیں بلند ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر محترم شمیم صاحب کے ذہن میں کوئی ایسا واقعہ

ہو جس میں رسول اللہؐ نے اپنی کسی بیٹی کے گھر پہنچکر اسے سلام کیا ہو تو اس کے ذکر و بیان میں وہ سلیقہ نہیں برت سکے ہیں۔ علاوہ ازیں رسم دختر کشی کے خاتمے کے لئے اس منفرد اور نجی واقعے کو بطور سبب بیان کرنا بہت ہی بھول پن ہے۔ متانت اور معقولیت سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ مستزاد یہ کہ مجرد یہ واقعہ اس کی وجہ نہیں بن سکتا کہ لوگ بنتِ نبی کا مرتبہ پہچاننے لگیں۔

ان گوشوں سے قطع نظر سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہاں بنتِ نبی کا آخر ذکر ہی کیا تھا۔ گفتگو تو ہو رہی تھی لوگوں کی اس سفاکانہ جاہلیت پر کہ وہ بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیتے ہیں۔ شاعر کو کہنا چاہیئے تھا کہ رسول اللہ کی تعلیم نے انھیں اس جاہلیت سے نکالا اور وہ محسوس کرنے لگے کہ بیٹیاں بھی تحفظ اور محبت کی مستحق ہیں۔ ان کا بھی قتل شدید مجرمانہ فعل ہے۔ انھیں بھی اولاد کی طرح سینے سے لگا کر رکھنا چاہیئے۔ یہاں مرتبہ شناسی کے بجائے محبت اور رحم اور خدا ترسی جیسے جذبات کے ذکر کی ضرورت تھی۔ نیز یہ حقیقت ثابتہ بھی شاعر نے ملحوظ نہیں رکھی کہ صحابہ رضؓ نے یا بعد کے مسلمانوں نے "بنتِ نبی" کو ماں کی طرح نہیں مانا ہے بلکہ ازواجِ رسولؐ کو ماں کی طرح مانا ہے۔ یہ اسلئے مانا کہ اللہ نے صراحتہً اس کا حکم دیا تھا۔ "اُمّہات المومنین" کا لقب ازواجِ رسولؐ ہی کو ملا اور رسول اللہؐ کی بیٹیاں امت کے لئے خواہ کتنی ہی تعظیم اور عقیدت کا مرجع رہی ہوں مگر ان کے "ماں" ہونے کا تصور کبھی نہیں پایا گیا۔

قیاس کہتا ہے کہ یہاں "بنتِ نبی" سے مراد حضرت فاطمہ رضؓ ہیں۔ حضرت فاطمہ کو لوگ ماں کی طرح معظم مانتے تھے یا نہیں مانتے تھے اس کی آخر بحث ہی رسمِ دختر کشی کے سلسلہ میں کیا تھی۔ کاش کچھ تو غور کر لیا گیا ہوتا۔

کہتے ہیں لوگ پیش ہے دنیا کا مال و جاہ
حاضر ہے بنتِ زہرہ وش و کہکشاں نگاہ

یہ اس واقعہ کا ذکر ہے جب کفار نے کہا تھا کہ اے محمد! تم اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمھیں اپنا سردار مان لیں گے۔ عیش چاہتے ہو تو ہم تمہارے لئے عرب کی حسین ترین عورتیں مہیا کر دیں گے۔ اس پیشکش کے بیان میں پہلا مصرعہ تو مناسب ہے لیکن دوسرا مصرعہ غیر مناسب۔ یہ دوسرا مصرعہ اُسوقت مناسب ہوتا جب کفار کسی متعین حسینہ کو ساتھ لاکر یا اس کا نام لے کر یہ کہتے ہیں کہ اے محمد! یہ حاضر ہے آپ کی دلبستگی کے لئے۔ لیکن جب ان کی پیش کش ایک سے کہیں زیادہ غیر معین حسیناؤں کی تھی، تو واحد لفظ "بنت" آخر کیسے موزوں ہو سکتا ہے۔ صریحاً "بنات" کا موقع تھا۔

اس بنیادی سقم کے بعد جزئیات پر بھی غور کر لیجئے۔ "بنتِ زہرہ" تو قابلِ فہم استعارہ ہے لیکن "وش" کا اضافہ کیا معنی۔ اسے یہاں حشو کے خانے میں رکھنا ہو گا۔ اور "کہکشاں نگاہ" بھی ہمارے خیال میں محلِ نظر ہے۔ اُردو ادب میں قمر نگاہ اور شمس نگاہ اور انجم نگاہ جیسی تراکیب ہماری نظر سے نہیں گذریں۔ "نگاہ" کوئی آنکھوں سے نظر آنے والی چیز ہے ہی نہیں جو اس کے لئے بطور تعریف ایسی چیزوں کا حوالہ دیا جائے جن کا حسن آنکھوں سے نظر آتا ہے۔ کہکشاں ستاروں کے جھنڈ کو کہتے ہیں۔ کوئی بتائے "کہکشاں نگاہ" کا کیا مطلب لیا جائے۔

دو بولوں میں جو چھین لیا دل غنیم کا
اعجاز ہے یہ سب ترے خلقِ عظیم کا

اس طرح کا شعر کسی ایسے موقع پر کہا جا سکتا ہے جب رسول اللہؐ کو کسی متعین غنیم سے سابقہ پیش آیا ہو اور آپ نے بہت مختصر گفتگو کر کے اسے حلقہ بگوش کر لیا ہو۔ لیکن ایسی کوئی بات شاعر کے پیشِ نظر نہیں۔ وہ اس عام واقعہ کا ذکر کر رہے ہیں کہ طرح طرح کے ایثار اور حسنِ اخلاق کے ذریعہ رسول اللہؐ نے کفار کے دلوں کو مسخر کیا اور وہ حلقہ بگوش ہو گئے۔ اس سیاق میں نہ تو "دو بول" کا کوئی مطلب ہے نہ لفظِ غنیم کا۔ زبان کی سلوٹ یہ ہے کہ "دل چھین لیا" کہا گیا حالانکہ "دل جیت لیا" کا محل تھا۔

کب رزم گاہِ زیست میں وجہ محن ہوئی
نانِ جویں تو دہر میں خیبر شکن ہوئی

خیبر شکنی کی تلمیح قوت و صلابت کے لئے آتی ہے۔ اس کا مقابل ہے ضعف و ناتوانی۔ "محن" کے لفظ نے یہ ثبوت مہیا کیا کہ شاعر کے نزدیک اہمیت بس قافیہ پیمائی کی ہے حسنِ معنی کی نہیں۔

صفحہ ۲۸ پر شاعر نے اُس مباہلہ کا ذکر کیا ہے جس میں حضورؐ اپنے مخصوص اہلِ بیت کو ساتھ لئے ہوئے تھے۔

کیا شوکتِ جمال تھی روزِ مباہلہ
دنیا کو یاد ہے ترا معصوم قافلہ

اس بند کے باقی چار مصرعوں میں حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کا ذکر ہے۔ پھر اگلا بند یوں شروع ہوتا ہے:۔

اس قافلے سے دہر کو دانائیاں ملیں
دل کو نشاط' دین کو رعنائیاں ملیں

گویا شاعر نے یہاں قدرے مرموز انداز میں اُس عقیدے کا اظہار کیا ہے جو شیعہ حضرات کا معروف عقیدہ ہے۔ یعنی خدمتِ دین اور فروغِ ملت کا تمام کریڈٹ صرف اہلِ بیت کے لئے اور باقی صحابہؓ اس سے محروم۔ گو کہ شاعر نے تنقیص کا کوئی لفظ کسی کے لئے نہیں کہا' لیکن یہ تاثر وہ بہر حال دے گئے کہ ان کا تاریخی مطالعہ ناقص ہے۔ "اس قافلے" کا مشارٌ الیہ عام حالات میں تمام ہی صحابہؓ کی جمعیت کو مانا جا سکتا تھا' لیکن پہلے بند میں صرف چند اور مخصوص اہلِ بیت ہی کے لئے "ترا معصوم قافلہ" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اس لئے مشارٌ الیہ بھی فقط یہی اہلِ بیت بن جاتے ہیں۔

الفاظ و اسلوب کی فروعی لغزشوں سے ہٹکر دیکھئے تب بھی نظم میں نہ تو شایانِ شان داخلی ربط ہے نہ معانی میں گٹھاؤ نہ الفاظ اور دروبست میں بے ساختگی اور آمد کی کیفیت۔ آورد ہی آورد کا مزا آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ معدودے چند مقامات پر آمد کی بھی کوئی جھلک نظر آجاتی ہو۔

کم ہو گی ضَو نہ دین میں کے ایاغ کی
آندھی کرے گی آپ حفاظت چراغ کی

یہ اسی مسدس کا ایک شعر ہے اور پیش لفظ سے قبل سرنامے کے طور پر پورا ایک صفحہ دیکر درج کیا گیا ہے۔ ہم نہیں سمجھتے پیالے کی صفت ضَو اور روشنی کب سے ہو گئی۔ پیالہ گھٹیلا لگے تو ساغر یا جام کہہ لیجئے۔ ایاغ بہر حال پیالے ہی کو کہتے ہیں۔ ایاغ سے مستی' نشے' خمار' سرخوشی وغیرہ کا تو جوڑ ہے مگر ضَو کا کیا جوڑ۔ دوسرا مصرعہ معیارِ بلاغت اور صنعتِ شعری کے اعتبار سے ٹھیک ہے۔ چراغ اور آندھی کا تقابل بہت خوب۔ اور یہ بھی درست کہ چراغ اور ضَو کا ربط باہم محتاجِ وضاحت نہیں لیکن ضَو اور ایاغ کے غیر مربوط ہونے نے کام بگاڑ دیا۔

نقائص کی اتنی مفصل نشاندہی ہے تو ہمارے لئے باعثِ رسوائی۔ لوگ یوں کہتے ہیں کہ ایڈیٹر تجلی تبصرے کی آڑ میں لوگوں کی پگڑیاں اُچھالتا ہے' ان کے حوصلے پست کرتا ہے' خوردہ گیری اور نکتہ چینی کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس پر خدا کی پھٹکار۔

ہم دل ہی دل میں سوچتے ہیں کہ بندوں کی پھٹکار تو بجا مگر خدا کی پھٹکار والی بات شاید درست نہیں۔ خدا کا حکم ہے کہ علم کو مت چھپاؤ۔ کتمانِ علم گناہ ہے۔ پھر اسی نے یہ بھی جتلایا کہ تعلیم و تعلم کا سب سے بڑا ذریعہ قلم ہے۔ (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ) تو آخر ہم کفِ قلم کیوں کریں اور اپنی بساط کے مطابق علم و تحقیق کی خدمت کیوں نہ کریں۔ بہتیرے دوستوں کو ہم نے تبصرے کر کر کے اپنا دشمن بنا لیا۔ مر جائیں گے تو یہ سب خوشی کا نعرہ لگائیں گے کہ خس کم جہاں پاک!

الحرف الآخر

پورا نام:۔ الحرف الآخر فی ابطال تدافین الشیخ عبدالقادرؒ:۔

• صفحات تین سو۔ سائز متوسط۔ لکھائی چھپائی معمولی۔
• کاغذ اچھا۔ قیمت پانچ روپے۔

• مصنفہ :- حضرت مولانا سید عبدالرحیم دہلوی۔
• شائع کردہ :- ادارہ دعوت و تبلیغ ۔ ۴۸۴۷ صدر بازار
بارہ ٹوٹی ۔ دہلی ع۶ ۔

کتاب کا موضوع اپنی جگہ منجملہ عجائبات ہے۔ تفصیل جس کی یہ ہے کہ معروف شیخ طریقت شاہ عبدالقادر رائپوری رحؒ نے ۱۶ راگست ۱۹۶۲ءکو لاہور میں انتقال فرمایا۔ ان کی تمنا اور وصیت تھی کہ اگر میرا انتقال پاکستان میں ہو جائے تو میری میت کو رائپور منتقل کردیا جائے تاکہ میں اپنے شیخ شاہ عبدالرحیم علیہ الرحمۃ کے قدموں میں دفن ہوسکوں مشیئت ایزدی کہ انتقال لاہور میں ہوگیا مگر ان کی وصیت پر عمل نہ کیا جاسکا بلکہ جنازہ ایک مقام "ڈھڈیاں" لیجایا گیا اور وہاں دفن میت کی شکل کچھ ایسی بنی کہ اس پر دفن کا اطلاق ہی مشکل۔ بہ الفاظِ مصنف شاہ علیہ الرحمۃ کی نعش ابھی تک تدفینِ شرعی سے محروم ایک تابوت میں رکھی ہے اور تابوت سیمنٹ کے ایک کمرے میں محبوس و مقید ہے۔

یہ سب کیسے ہوا، کیوں ہوا، ٹھیک ہوا یا غلط ہوا۔ یہ بڑی دلچسپ بحث ہے۔ جب واقعہ تازہ تھا تو اس بحث میں بڑی بڑی معروف شخصیتوں نے دادِ کلام دی ہے، مثلاً مولانا علی میاں، مولانا منظور نعمانی، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا قاری محمد طیب، مولانا زکریا، مفتی فلاں اور مولوی فلاں۔ ان حضرات کے خیالات کا معتدبہ حصہ زیر تبصرہ کتاب کے فاضل مصنف مولانا عبدالرحیم نے شاملِ کتاب کر دیا ہے۔ ان کا اپنا موقف یہ ہے کہ شیخ رائپوری کی نعش کے ساتھ جو کچھ کیا گیا وہ ایک دنیا پرستانہ منصوبے کا حصہ ہے اور تدفین کی جس شکل کو "تدفین" قرار دیا گیا ہے وہ ہرگز تدفین نہیں۔ اس موقف کے اثبات میں موصوف نے بڑے قوی دلائل پیش کئے ہیں اور جب تک کوئی ان دلائل کا رد نہ پیش کرسکے یہ ماننا ہی پڑے گا کہ تدفین متحقق نہیں ہوئی۔ کم سے کم ہم تو موصوف کے موقف کی صحت کے قائل ہوگئے ہیں اور ہمیں اس پر تحیر بھی نہیں کہ بعض مریدین اپنے شیخ کی نعش کو مفاد پرستانہ سیاست کے میدان کی گیند بھی بنا سکتے ہیں۔ اس دنیا میں سبھی طرح کے عجائبات پائے جاتے ہیں اور دنیائے تصوف و طریقت کے عجائبات تو شمار سے باہر ہیں۔

ہمارے لئے نہ سہی لیکن بہتیرے قارئین کے لئے ا[illegible] کتاب کے بعض مشتملات چونکا دینے والے ہوں گے۔ مثلاً مدیر الفرقان مولانا منظور نعمانی اس ڈرامے کے ایک نمایاں کردار ہیں۔ ان پر "گفتگو" کرتے ہوئے فاضل مصنف نے ان کی تلون مزاجی اور انتہا پسندی اور "پندار عجز" کی [illegible] تصور کشی کی بڑی پہلودار ہے۔ مولانا نعمانی کا درج ذیل فرمودہ کسی پتھر پر کندہ کر لیا جائے تو آنے والے مؤرخ کے لئے شاید مفید ہو گا۔ وہ فرماتے ہیں :-

"میں تو دنیائے اسلام میں صرف چار ہی شخصوں کو عالم سمجھتا ہوں۔ ایک تو مصر میں ہیں۔ ایک پاکستان میں مولانا محمد یوسف بنوری اور دو ہندوستان میں۔ ایک مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی اور ایک میں !"

اگر واقعی مولانا نعمانی نے ایسا ہی فرمایا تو ہم کہیں گے کہ انھوں نے کسر نفسی کی۔ حقیقت شاید یہ ہو کہ ان کی صف اور درجے کا ایک بھی عالم خاک ِ ارضِ عالم میں نہیں پایا جا[illegible] مولانا نعمانی نے شیخ الحدیث مولانا زکریا کے متع[illegible] یہ فرمایا :-

"میری چند مرتبہ ان سے علمی گفتگو ہوئی لیکن وہ مجھے مطمئن نہ کرسکے اور میں ان کو عالم نہیں سمجھتا ہوں۔"

مولانا محمد طیب صاحب کے بارے میں ان کی رائے [illegible]

"میں ان کو بھی عالم نہیں مانتا بلکہ وہ ایک واعظ ہیں۔ سیرت کے جلسوں میں تقریریں کرکے لوگوں کو جنت کا راستہ دکھلاتے ہیں اور وہ دس آنے بھر دیوبندی ہیں۔"

ایک اور موقع پر مولانا زکریا کے بارے میں ان کا یہ ریمارک نقل ہوا:-

"میں شیخ الحدیث صاحب کی علمیت کا قائل نہیں ہوں۔"

ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ انتسابات کس حد تک درست ہیں فاضل مصنف نے کوشش تو کی ہے یقین دلانے کی کہ وہ الزام تراشی نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہی باتیں پیش فرما رہے ہیں جن کے شاہد موجود ہیں مگر یہ کہنا بہر حال مشکل ہے کہ یہ انکشافات دستاویزی ہیں۔ یہ بات کسی طرح حلق سے نہیں اُترتی کہ مولانا نعمانی نے بسلامتیِ ہوش وحواس اپنے آپ کو دنیا کے چار اعلیٰ ترین علماء میں گنوایا ہو۔ ہاں مولانا زکریا یا مولانا محمد طیب کے سلسلے میں ان کی طرف جو اقوال منسوب ہیں وہ نہ صرف حلق سے اُتر گئے بلکہ معدے نے انھیں ہضم بھی کر لیا۔ اس معنی میں نہیں کہ ان دونوں ہستیوں کے بارے میں انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ سراسر برحق ہے بلکہ اس معنی میں کہ انھوں نے ایسا فرمایا بہر حال ہوگا۔

جن شیخ الحدیث مولانا زکریا کے بارے میں مولانا نعمانی کے مذکورہ خیالات منکشف ہوئے وہ خود بھی اس پورے ڈرامے کا ایک نمایاں کردار ہیں۔ ان کا اس کتاب میں نہ صرف اچھا خاصا تذکرہ ہے بلکہ ان پر مستقل باب بھی ہے۔ جو حضرات محترم شیخ الحدیث کے زہد وعبادت' ورع وتقویٰ اور کمالِ تصوف پر ایمان رکھتے ہیں ان کے لئے زیرِ تبصرہ کتاب بڑی تکلیف دہ ہوگی کیونکہ اس کے آئینے میں شیخ موصوف کے دامنِ صدق وامانت اور رُوئے خلوص ودیانت پر سیاست کاری اور تدلیس وتلبیس اور فنکاری کے داغ دھبے نظر آتے ہیں۔

حاصلِ تبصرہ یہ ہے کہ کتاب اپنے موضوع پر خوب ہے۔ مسائلِ تصوف اور اسرارِ خانقاہی اور ولایت وقطبیت کے غوامض پر نالائق تبصرہ نگار کی رائے زنی ایک عامی اور طفلِ مکتب کی رائے زنی ہوگی اس لئے اس باب میں تو قفلِ خاموشی ہی بہتر لیکن ایک جزئی مسئلہ میں ہمیں فاضل مصنف کی خدمت میں مؤدبانہ کچھ عرض کرنا ہے۔

ذیلاً آپ نے حضرت شیخ الحدیث کے ایک مکتوب سے یہ بات نقل کی ہے کہ حدیث میں انبیاء علیہم السلام کے بارے میں وارد ہے کہ ان کے جسموں کو زمین نہیں کھاتی مگر اولیاءِ عظام کے متعلق احادیث میں کوئی نص وارد نہیں جہاں تک اعتقاد وحسن عقیدت کا تعلق ہے امید یہی ہے کہ انشاء اللہ کوئی تغیر نہیں پیدا ہوگا لیکن یہ کوئی قطعی چیز نہیں۔

اس ارشادِ گرامی سے حضرت شیخ الحدیث کا منشا یہ تھا کہ حضرات رائے پوری کی زیرِ بحث تدفین کو آٹھ دس برس گذر چکے ہیں ناممکن نہیں ہے کہ ان کی نعش بگڑ چکی ہو اور اس کا بہت سا حصہ خاک میں بدل چکا ہو لہٰذا اب اس نعش کا اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ منتقل کرنا مناسب نہیں۔

اس پر آنجناب کا اصولی نقد تو درست ہے لیکن "دوسری بات" کہہ کر آپ نے علامہ عینی کے حوالے سے یہ جو فرمایا ہے کہ انبیاء کی طرح علماء وشہداء ومؤذنین کو بھی یہ فضیلت حاصل ہے کہ ان کے اجسام بھی محفوظ رہتے ہیں اس سے ہرگز اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ عینی نے "قیل" کہہ کر ایک مجہول قول کی حیثیت سے یہ رائے ذکر کی ہے جو غیر معقول اور بے حقیقت رائے ہے۔ نیز ہمارے شیخ الشیوخ اور استاذ الاساتذہ حضرت گنگوہی نے اگر یہ فرمادیا کہ اولیاءِ کرام بھی بحکم شہداء ہیں اور اس آیت کے مصداق میں شامل ہیں جس میں اللہ نے فرمایا ہے کہ شہداء زندہ ہیں اور انھیں رزق دیا جاتا ہے۔ تو اسے جسموں کے محفوظ رہنے اور نہ رہنے کی بحث میں لانا مناسب نہیں ہے۔

بڑے ادب سے گذارش ہے کہ موت کے بعد اولیاء کا زندہ رہنا یا ان کے جسموں کا قبروں میں محفوظ رہنا بڑا فتنہ انگیز اور مغالطہ پرور عقیدہ ہے جس سے حامیانِ دینِ متین اور خادمانِ شریعت کو دور ہی رہنا چاہیئے۔ ولی کا اطلاق قرآن وحدیث کی روشنی میں ہر اس مردِ مومن پر ہوتا ہے جو شریعت کا پیرو اور اعمالِ صالحہ کا حامل ہو۔ ولایت تصوف وطریقت کا کوئی عہدہ ہو تو ہو تو شریعت نے اسے عہدہ قرار نہیں

دیا جب کہ "نبوت" ایک عہدہ ہے۔
یہاں تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔ تبصرہ ان الفاظ پر ختم ہے کہ فاضل مصنف اپنے موضوع کا حق ادا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

اعراف

عبدالرحیم نشتر کا مجموعۂ فکر • صفحات ۱۱۲
• قیمت مجلد چار روپے پچاس پیسے۔
• ناشر:- بی۔ کے پبلیکیشنز ۳۰۷۲۔ پرتاپ اسٹریٹ۔ دریا گنج۔ دہلی ۶

آغاز ہی میں شاعر کی تصویر بھی ہے لیکن وہ نہ ہوتی تب بھی کتاب کے مطالعہ سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ نوعمر ہی ہوں گے۔ اگر انھیں کوئی سمجھ دار مشیر مل جاتا تو یقیناً وہ مشورہ دیتا کہ ابھی "صاحبِ دیوان" بننے کا ارادہ نہ کریں بلکہ کسی سخن فہم رہنما سے وابستہ ہو کر اپنے اشعار کے عیوب و محاسن کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کریں تاکہ عیوب سے بچا جائے اور محاسن کو فروغ دیا جائے۔
کوئی شبہ نہیں کہ عزیزی نشتر کو خدا نے ذہانت بھی دی ہے اور شعر کہنے کی استعداد بھی لیکن شاید غلط قسم کے ماحول اور خارجی محرکات نے انھیں صحیح رخ پر نشو و نما کا موقعہ نہیں دیا اس لئے ان کی صلاحیتیں اپنا حقیقی حسن نمایاں نہیں کر پا رہی ہیں۔ ویسے بھی چالیس سال سے قبل شعور میں پختگی آتی ہی کہاں ہے۔
ترقی پسند شاعروں کی جدت پسندیوں اور طباعیوں نے دنیائے شعر و ادب میں جو افراط و تفریط پھیلائی ہے وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ نئے پن کا شوق اور آزادی کا ہیضہ جس طرح ہپی ازم کو جنم دیتا ہے اسی طرح شعر و ادب میں جدت و بدعت اور نئے تجربات کا جنون جب اعتدال سے گزر کر خلاؤں میں کود پھاند کرتا ہے تو بڑے واہی تباہی شہکار جنم لیتے ہیں۔
عزیزی نشتر ایسے ہی تجربات سے متاثر نظر آئے — اور ظاہر ہے یہ تاثر شعوری و ارادی نہ ہوگا اسی لئے ان کا فی الحال یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم ان کے مجموعے سے چند اشعار نمونۃً نقل کرکے کوشش کرتے ہیں کہ وہ کچھ محسوس کر سکیں۔

(۱)
بوڑھی اور کمزور ہوائیں دیتی ہیں آواز مجھے
سینے میں جنگھاڑ تا سورج بھر لوں چٹانیں توڑ دوں

---

(۲)
میرے بھی ہاتھوں میں چاند اور سورج کے دو ٹکڑے ہیں
مجھ کو بہکانے آئے ہو میں بھی تو پیغمبر ہوں

---

(۳)
وہ اجنبی تری باہوں میں جو رہا شب بھر
کسے خبر کہ وہ دن بھر کہاں رہا ہوگا

---

(۴)
رات کیا جانے کیسے بیتے گی
جا چکی اب تو آخری بس بھی

---

(۵)
اچھا تو اس نے آپ کو ناراض کیا ہے آج
پھر کیا ہے موج اڑائیے اچھی ہوا ہے آج

---

(۶)
رنگوں میں قید کرکے مجھے شوخ چشم نے
اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بنا لیا

---

(۷)
دشتِ افکار میں سوکھے ہوئے پھولوں سے ملے
کل تری یاد کے معتوب سوالوں سے ملے

---

(۸)
ایک حبشی کی طرح کالی سڑک
راستے میں بنی ہوئی ہے اژدہا

(۹)
پان کے ٹھیلے، ہوٹل، لوگوں کا جمگھٹ
اپنے تنہا ہونے کا احساس بھی کیا

(۱۰) تیکھے گناہوں کی سڑکوں پہ گھوما کرو
شعلگی جہنم نگاہوں سے چوما کرو

(۱۱) جھلستی ہواؤں کے نیزوں سے حملہ کرو
سیہ بربتوں کے بدن کو برہنہ کرو

(۱۲) آواز دے رہا ہے اکیلا خدا مجھے
میں اسکو سن رہا ہوں ہواؤں کے کان سے

(۱۳) مرے کیا مجھے نیک و بد سب برابر ہی ہیں
جو تم کو خداؤں کا ڈر ہو تو سوچا کرو

یہ بس صفحہ ۳۲ تک کے نمونے ہیں۔ آگے بڑھنے سے وجدان نے انکار کردیا۔ یہ فی الحقیقت اشعار نہیں ہیں بلکہ کوئی ایسی چیز ہیں جن کا مناسب نام اب تک کسی ڈکشنری میں نہیں پایا جاتا۔ ذوقِ لطیف اور وجدانِ سلیم کے لئے ان کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے چھت پر پڑے ہوئے ٹین پر گلی کے بچے روڑے پتھر پھینک رہے ہوں۔ فن اور قواعد زبان کے اعتبار سے فرداً فرداً ایک سرسری نظر ڈالئے۔

(ہمارا خطاب عزیزی شاعر سے ہے)

صفت اور موصوف میں کوئی فکری یا مشاہداتی مناسبت نہ ہو تو کم سے کم قیاسی اور تصوراتی مناسبت ہو۔ ہواؤں کو بوڑھاپے اور کمزوری کا موصوف بنانا بس مسخرہ پن ہے۔ ادب سے اس کا کیا تعلق۔ چنگھاڑنا آواز کی اقسام میں سے ہے۔ سورج کا آواز سے کیا واسطہ۔ پھر یہ سوائے فضول گوئی کے اور کیا ہے کہ سورج سینے میں بھر لوں۔ مزید فضول گوئی یہ کہ چٹانیں توڑ دوں۔ ان باتوں میں کیا ربط اور کیا سنجیدگی ہے۔

۲۔ دوسرے شعر میں مفہوم ہی غائب ہے۔ یہ "میرے" کون ذات شریف ہیں جن کے ہاتھوں میں چاند اور سورج کے دو ٹکڑے ہیں۔ کون بہکانے آیا ہے۔ کیوں آیا ہے۔

۳۔ تیسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کسی طوائف سے گفتگو کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کسی اجنبی کی بانہوں میں رات گذارنے والی فاحشہ ہی ہو سکتی ہے۔ پھر بھلا اسے اس سے کیا دلچسپی کہ اس کی رات کا ساتھی دن بھر کہاں رہا۔ ایسے شعر شاعر اور سامع دونوں کے ذہن و قلب کو تاریک کرتے ہیں۔ ان سے بچنا چاہیئے۔

۴۔ آخری بس چلی گئی تو اب صبح تک یا تو اسٹینڈ پکھڑے رہیئے یا کسی ہوٹل میں جا سوئیے۔ آخر شاعری غریب کو بس اسٹینڈوں کی سیر کرانے سے کیا فائدہ۔ بس دل نے یوں کہا کہ "بس" کا قافیہ مزیدار رہے گا ہو جائے ایک شعر۔

۵۔ یہ بھی شعر نہیں ہے دل لگی ہے۔

۶۔ یہ شعر نہیں ہے چٹکلا ہے۔

۷۔ اس کا مطلب آپ خود ہی لوگوں کو بتائیں تو شاید دماغ میں اترے۔

۸۔ حیرت ہے "اراٹ" جیسا لفظ نظم کرتے ہوئے آپ کو ذرا محسوس نہ ہوا کہ یہ اربابِ ذوق کے وجدان پر کیسا کاری زخم لگائے گا۔ "کالی سوچ" بھی خرافاتِ ذہنی میں سے ہے۔

۹۔ اس سے تو بہتر ہے کہ لطیفے گھڑے جائیں۔ شاعری کا ان بازاریات سے کیا سروکار۔

۱۰۔ شعر بن سکتا تھا اگر دماغ پر جدت طرازی کا سودا اسوار نہ ہوتا۔

۱۱۔ یعنی ؟

۱۲۔ بری بات ۔ خدا مسخرے پن کا موضوع نہیں ہے!

۱۳۔ جو منھ میں آیا اگل دیا۔

مجموعے میں کچھ اچھے شعر بھی ہوں گے لیکن اعلیٰ درجے کی دیگ میں دس پانچ چوہے بھی اُبال دیئے جائیں تو سوچ لیجئے کون کتنے نوالے کھا سکے گا۔

عزیزم شاعر کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ مزید چھپنے سے پہلے کسی متین اور ذی علم استاد کا دامن پکڑیں۔

والسلام۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ

• تالیف :- اقبال حسن خاں (ایم۔ اے۔ ایم فل۔ ایچ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (علیگ) لکچرار شعبۂ سنی دینیات • بڑے ۵ ۴۴ صفحات • لکھائی چھپائی معمولی۔ قیمت درج نہیں • شائع کردہ :- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

جنگ آزادی کے ابتدائی دور میں دیوبند کے ایک درویش صفت عالم اور مرد مجاہد محمود الحسنؒ نے جو غیر معمولی شہرت پائی اس سے پچھلی نسل کے بچے کھچے لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ قوم نے اس فرد فرید کو شیخ الہند کا خطاب دیا اور یہ خطاب اسکی شخصیت پر ایسا چسپاں ہوا کہ نام سے بڑھ کر خطاب کو دلوں میں جگہ دی گئی۔ متعدد کتابیں اس تاریخی شخصیت پر پہلے سے موجود ہیں لیکن اقبال حسن صاحب نے سینکڑوں سے زائد کتابوں اور جریدوں میں دیدہ ریزی کرنے کے بعد یہ بڑا جامع تذکرہ مرتب فرمایا ہے جس پر انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بجا طور پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے۔

موصوف کا طرزِ تحریر سلیس و دل کش ہے مضامین کا دروبست بھی خوب ہے۔ ترتیب یوں ہے کہ داستان انگریزوں کی ہند میں آمد سے شروع کی گئی پھر تحریک ولی اللہی کے ضروری گوشوں کو روشنی میں لاتے ہوئے شیخ الہندؒ کے تذکرے کا آغاز ہوا۔ ان کے خاندانی احوال۔ ان کی علمی خدمات۔ ان کے افکار و خیالات، ان کی خاموش سیاسی سرگرمیاں۔ ان کی قید و بند کی جھلکیاں اور پھر رہائی کے بعد ان کی مختصر لیکن سنسنیزہ کار زندگی کی تصویرکشی۔ جو تحریک عام طور پر "ریشمی رومال" کے نام سے مشہور ہے اس کی تفصیلات اس کتاب سے زیادہ شاید کہیں یکجا نہ ملیں۔ اندازِ بیان اور دروبست اتنا اچھا ہے کہ شروع سے آخر تک دل چسپی

یکساں طور پر قائم رہتی ہے۔ ہم فاضل مصنف کو انکی کامیاب کوشش پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

البتہ تصحیح پر کچھ اور توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ کتابتی غلطیاں بہت ہیں جن میں بعض بڑی بے ڈھب ہیں۔ جیسے صہ ۴۳ پر العلم حجاب اللہ پڑھنے میں آیا حالانکہ حجاب الاکبر ہونا چاہیئے تھا۔ یا مثلاً حضرت شیخ الہندؒ کے نواسے سمنون کا نام ممنون چھپا۔ اب ظاہر ہے کہ کوئی بھی قاری اس غلطی کی تصحیح نہ کر سکے گا۔

حضرت مغفور کے حلقہ بگوشوں میں ایک مولانا تھے عُزیر گل۔ ان کا نام کتاب میں دسیوں جگہ آیا ہے لیکن فقط دو جگہ شیخ الہندؒ کے خطوط میں تو صحیح کتابت ہوا، باقی تمام مقامات پر عزیز گل طبع ہوا۔ اسے کتابت کی غلطی کہنا مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے فاضل مؤلف ہی کو غلط فہمی ہوئی ہے چنانچہ جہاں یہ نام باقاعدہ جلی عنوان بنا ہے وہاں بھی عزیز ہی لکھا گیا ہے۔

ایک اور سہو وہاں محسوس ہوا جہاں شیخ الہندؒ کے ممتاز شاگردوں کے حالات مختصراً بیان ہوئے ہیں۔ خاتم المحدثین مولانا انور شاہ کاشمیریؒ بھی ان ہی کے شاگرد تھے۔ ان کے اوصاف میں ذہانت و فطانت، شوقِ تعلیم اور فقاہت کا تو ذکر آیا لیکن اُس مخصوص وصف کا ذکر نہیں آیا جس میں وہ اپنے زمانے کے فرد فرید تھے یعنی حفظ و ضبط۔ روایات ثابت کرتی ہیں کہ یادداشت کے معاملہ میں وہ قرنِ اولیٰ کے محدثین رحمہم اللہ کا نمونہ تھے اور مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ کیا شیخ الہندؒ اور کیا مولانا محمد قاسمؒ کوئی بھی اس خداداد صلاحیت میں ان کا ہم صف نہ ہوا۔ مولانا محمد قاسمؒ کی انفرادیت ان کی بے پناہ ژرف نگاہی، دراکی اور باریک بینی میں ہے۔ فہم و فراست کا ہمالیائی پیکر۔ حضرت شیخ الہندؒ کی انفرادیت ان کی اولوالعزمی میں ہے۔ ضعیف و لاغر جسم کے اندر پہاڑ جیسا دل۔ صبر و ضبط اور عزم و حوصلہ کا حیرتناک نمونہ۔ حضرت شاہ صاحب کم و بیش ٹیپ ریکارڈ جیسا حفظ و

ضبط رکھتے تھے۔ اس صفت خاص کو ان کے تذکرے میں ضرور آنا چاہئے تھا۔ باقی اس میں کوئی شک نہیں کہ تفقہ، تقویٰ، ذہانت و فطانت اور علم دینیہ سے یہ تمام حضرات بفرق مراتب مرتفع تھے۔ طاب اللہ سراہم۔

صفحہ ۲۲ پر ایک جہاد کے تذکرے میں مولانا محمد قاسم کے بارے میں یہ روایت نقل کی گئی ہے:۔

"کنپٹی پر ایک گولی بھی لگی مگر عجیب بات ہے کہ گولی لگنے سے کپڑے تو خون سے تر ہو گئے لیکن چند لمحوں بعد عمامہ اتار کر دیکھا تو کہیں گولی کا نشان تک نہ تھا۔"

دوسرے تمام وقائع اور حکایات کی طرح فاضل مؤلف نے حاشیہ میں اس کا بھی ماخذ اگرچہ بتا دیا ہے لیکن اچھا ہوتا اگر وہ اس حکایت کو شامل کتاب نہ کرتے۔ سوانح قاسمی۔ جس کے حوالے سے یہ حکایت آئی ہے۔ اگرچہ مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے متقی عالم اور وسیع المطالعہ استاد کی تالیف ہے لیکن رطب و یابس کا مجموعہ ہے۔ ممدوح مؤلف کی سادہ دلی اور نیک طبعی نے بہتیری ایسی روایات کو قابل اعتماد مان لیا ہے جن کی ثقاہت شدید طور پر مشتبہ ہے۔

بہر حال داغ تو چاند میں بھی ہیں۔ انسانی کارنامہ بھلا خامی سے پاک کب ہوتا ہے۔ بحیثیت مجموعی اقبال حسن صاحب کی یہ کتاب ہر لائبریری کی زینت بننے کی مستحق ہے۔

خاتمے پر کتابیات کے عنوان سے انھوں نے ماخذ کی یکجائی فہرست بھی دیدی ہے اور ہر ہر صفحے پر فرادی فرادی بھی حوالے دیتے چلے گئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امریکہ ۔ انگلینڈ ۔ نائجیریا ۔ کینیڈا ۔ فرانس ۔ انڈونیشیا اور ملیشا سے بذریعہ بحری ڈاک دو پونڈ ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک ۵ پونڈ ۔
بحرین افریقہ ۔ سعودی عرب قطر وغیرہ سے بذریعہ بحری ڈاک ایک پونڈ دس شلنگ ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک تین پونڈ

فہرست ماہ نومبر ۱۹۷۴ء

اگر

اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے ۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں ۔ آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں ۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپکا اخلاقی فرض ہوگا ۔
وی پی ۲۲ بائیس روپے کا ہوگا ۔ منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے ۔

ماہنامہ تجلی دیوبند

چھبیسویں سال کا ساتواں شمارہ

ایڈیٹر
عامر عثمانی

سالانہ قیمت
بیس ۲۰ روپے

اس شمارے کی قیمت ۔ دو روپے

اسلامی پریس ۔ دیوبند

احوالِ واقعی

پچھلا شمارہ صحیح وقت پر شائع ہوا لیکن یہ شمارہ پھر کچھ
لیٹ ہوگیا ہے۔ وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تجلی کا حال پہلے
سے بھی کچھ ابتر رہا اور چھپائی پروگرام کے مطابق نہ ہوسکی۔
خدا کرے حال مزید ابتر نہ ہو تو امید ہے کہ اگلی اشاعتوں کا
نظم درست چل سکے گا۔

ہماری ایک بھول

تجلی طلاق نمبر میں ص ۱۳۸ پر ہم نے مولانا شمس
پیرزادہ پر اعتراض کیا تھا کہ رفاعۃ القرظی والی روایت
مسلم شریف میں موجود ہی نہیں ہے جب کہ آپ نے حوالہ مسلم
ہی کا دیا ہے۔ چند روز ہوئے مولانا موصوف کا ایک مراسلہ
ہمیں ڈاک سے موصول ہوا جس میں انھوں نے وضاحت کی ہے
اعتراض درست نہیں۔ یہ روایت مسلم میں موجود ہے البتہ
ایک ان سے یہ ہوئی ہے کہ حوالہ "مسلم کتاب الطلاق" کا دے
گئے ہیں حالانکہ یہ روایت "کتاب النکاح" میں آئی ہے۔

ہم ان کا پورا مراسلہ ہی شائع کردیتے لیکن پرچہ مرتب
ہوچکا بس یہی صفحہ زیرِ تکمیل ہے لہٰذا بات اگلے ماہ پر اٹھا
رکھنے کے بجائے ہم نے اپنے الفاظ میں یہیں ان کے مراسلہ کا
خلاصہ بیان کردیا۔ کون جانے اگلے ماہ تک ہم زندہ بھی رہیں
نہ رہیں۔ اپنے کسی قصور سے آگاہ ہوجانے کے بعد ہم ضروری
سمجھتے ہیں کہ جلد از جلد اس کا اعلان کردیا جائے۔ مولانا
موصوف کو جو تکلیف اس قصور سے پہنچی ہے اس کے لئے ہم معذرت
خواہ ہیں لیکن یہ بہرحال ظاہر ہے کہ قصور کا باعث ان کا غلط
حوالہ بنا ہے۔ ویسے نفسِ بحث پر اس قصور کا کوئی اثر نہیں
پڑا۔ اس روایت پر ہم نے ہر پہلو سے بحث کی ہے جو ہماری
دانست میں کافی شافی ہے۔ مراسلہ میں یہ بھی اطلاع دی
گئی ہے کہ جو معارضہ تجلی نے موصوف کے مقالہ پر کیا ہے اس کے
جواب میں ایک کتاب شائع کی جارہی ہے۔ اس اطلاع سے
خوشی ہوئی ہم بڑے شوق سے اس کتاب کے منتظر رہیں گے۔

اگلے شمارے میں

(۱) "قادیانیت" کے سلسلے میں روزنامہ الجمعیۃ کے سابق
ایڈیٹر جناب محمد عثمان فارقلیط کا ایک مضمون ماہنامہ شبستان
میں شائع ہوا ہے۔ یہ امت کے اجماعی اور قطعی موقف کے
خلاف ایک جاہلانہ اور غیرِ عالمانہ نقطۂ نظر پر مشتمل ہے لہٰذا
اس پر نقد کیا جائے گا۔

(۲) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا ایک تازہ مضمون "قادیانی
مسئلہ اور اس کا صحیح حل" ابھی ان کے ترجمان القرآن میں شائع
ہوا ہے اسے بھی ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔
تجلی کے مستقل کالم اپنی جگہ بدستور۔

ڈاک کا نظم

کچھ دنوں سے ڈاک کا نظم عجیب طرح کی برہمی کا شکار نظر
آرہا ہے۔ دہلی یہاں سے پورے سو میل بھی دور نہیں لیکن وہاں
کے بعض خط یہاں دس بارہ دن میں پہنچے اور یہاں کے
وہاں پندرہ بیس دن میں۔ چوتھے روز پہنچا تو اکثر و بیشتر خطوط
کی قسمت ہی گیا ہے۔ حالانکہ ٹرین صرف پانچ گھنٹے میں
یہ فاصلہ طے کرلیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب راجدھانی کا حال
یہ ہے تو ملک کے دوسرے شہر و دیار کا حال زیادہ بہتر کیا ہوگا
پرچہ بعض لوگوں کو بہت دیر میں پہنچتا ہے یا نہیں بھی پہنچتا اور
اور وہ دفتر کو شکایتی خطوط لکھتے ہیں تو ان کی تعمیل بروقت
نہیں ہوتی کیونکہ وہ معمول کے مطابق پہنچتے ہی نہیں مگر خطوط
لکھنے والے یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ بے توجہی کا نشانہ بنے۔
اس ناپسندیدہ صورتِ حال سے ادارہ دردِ سر میں مبتلا ہے
یہ سطور اس مقصد سے لکھی گئی ہیں کہ شائقین ہماری معذوری
سے آگاہ رہیں۔ وہ خود انصاف فرمالیں کہ ادارہ کس حد
تک قصوروار ہے۔

آغازِ سخن

تجلی "طلاق نمبر" کی اشاعت سے قبل ہی ہمیں اندازہ تھا کہ اور کوئی ہمارے بالمقابل سن بحث سجائے یا نہ سجائے مگر اہلِ حدیث میں سے کوئی بزرگ بالیقین یہ خدمت انجام دیں گے اور یہ بھی یقین تھا کہ ان کا علم کلام اور اندازِ گفتگو اور لب و لہجہ ان کی گہری اور مسلکی روایات کے مطابق ہی ہوگا۔

اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا اور ۱۵ ستمبر کے ترجمان (دہلی) میں یہ جلی عنوان نظر آ ہی گیا۔

"مدیر تجلی اور ایک مجلس کی تین طلاقیں"

ہم ان لوگوں میں ہیں جو اپنے خلاف شائع ہونے والے مضامین بھی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور یہ نیت رکھتے ہیں کہ معترض نے جو بھی بات حق و صداقت اور دلیل و معقولیت کے مطابق کہی اسے بلا تامل مان لیں گے اور اپنی اس غلطی سے رجوع کا اعلان کر دیں گے جسے دلنشیں دلائل سے ناصح کر دیا گیا ہو۔

لیکن تجربے نے یہ ثابت کیا ہے کہ اہلِ حدیث بزرگوں کی تنقید و تعقب کو ذوق و شوق سے پڑھنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ یہ حضرات عموماً بات تو کرتے ہیں بعد میں اور گالی دیتے ہیں پہلے۔ کم سے کم ہم ناچیز کے معاملہ میں تو بارہا ان کا یہی ٹھیک رویہ رہا ہے چنانچہ ان کی پاکیزہ گل افشانیوں کا جواب تو ہم کیا دیتے صرف پڑھنے ہی پڑھنے میں دماغ کی کیفیت ہو جاتی ہے جیسے گردن پر سر کی جگہ پتھر رکھ دیا گیا ہو۔

حالانکہ تجلی کے قارئین خوب واقف ہیں کہ خشک موضوعات سے ہم بھاگتے نہیں۔ تحقیق و تدقیق سے گھبراتے نہیں، مگر بے شری قسم کی گالیوں اور بے ہنگم قسم کی صلواتوں سے دلچسپی لینا ہمارے لئے اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی بھدی آواز والے قوال سے قوالی سننا۔

پھر بھی دل پر جبر اور دماغ پر زبردستی کر کے مذکورہ مضمون ہم نے پڑھ ہی ڈالا۔ مضمون سے قبل

جمان کے بہت ہی لائق مدیر جناب عبدالحمید رحمانی
ظلہ العالی نے ایک طویل نوٹ بھی دیا ہے جو بجائے
دایک مضمون ہے۔ اسے بھی کسی نہ کسی طرح گلے سے
ا۔ اس پر یا نفس مضمون پر تنقید ہمارا مقصود
یں۔ آج کی صحبت میں ہم صرف یہ دکھلانا چاہتے
کہ نالائق مدیر تجلی کو بدزبان، ہرزہ سرا، بے تمیز
اری، سیاہ قلب اور ادب و شائستگی سے بے بہرہ
دم قرار دینے والے محترم اساتذہ کی اپنی تہذیب
شائستگی کیا ہے۔

تجلی نقد و نظر نمبر۔ تجلی طلاق نمبر اور اس سے
شمارہ — تینوں میں طلاق ثلاث کی بحث پھیلی
ئی ہے۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ہم نے کوئی بات
لیل نہیں کہی۔ کوئی دعویٰ بے ثبوت پیش نہیں کیا
کو جاہل یا خائن کہا تو اس کی جہالت و خیانت
نمونے بھی سامنے لائے۔ کوئی گوشہ مجمل نہیں چھوڑا
شق کو تشنہ نہیں رہنے دیا۔

اگر ترجمان کے کثیر المناقب مضمون نگار جناب
نا انیس الاحمد ندوی اپنے مضمون میں مدیر تجلی
مام علم کلام کا معقول رد پیش فرما دیتے تو اس کے
بے شک انہیں حق تھا کہ اسے نالائق، ہرزہ سرا
بان اور بے عقل جو چاہے کہہ گزریں، اور مدیر
بان کو بھی حق تھا کہ اسی طرح کے خطابات و
اب پر مشتمل ایک پورا مضمون زیب قرطاس
دیں۔ لیکن کرم یہ کیا گیا ہے کہ مضمون کے آغاز
قبل ہی مدیر ترجمان نے عامر عثمانی کے لتّے
لے ہیں۔

لتّے لے ڈالنے کا مطلب شاید نئی نسل کی سمجھ میں
ئے۔ لتّے لینا کہتے ہیں آڑے ہاتھوں لینے کو اور
ے ہاتھوں لینے کا مطلب کچھ ایسا ہے جیسے کوئی
یف آدمی چلا جا رہا ہو اور آپ پیچھے سے اس کے
سر پر چپت جھاڑ دیں۔ یا اس کے بال پکڑ کر کھینچ لیں۔

بہر حال جس اعلیٰ معیار کی شائستگی اور شیریں
کلامی سے فاضل مدیر نے کام لیا ہے اس کے کچھ
نمونے ہدیۂ خدمت ہیں تاکہ عامر عثمانی کی واہیات
تحریریں پڑھنے والوں کو پتا تو چلے کہ پاکیزہ و شائستہ
اور شریفانہ نگارشات کیسی ہوتی ہیں۔

فرمایا گیا:—

”زبان و قلم کو آداب صحافت و انشاء
کے تقاضوں سے بالکل آزاد رکھنے والے
مولانا عامر عثمانی صاحب نے اس مسئلہ پر
اپنے مجلہ تجلی کا ایک ضخیم نمبر شائع کر دیا جو
زبان و بیان کے ایسے ایسے ”شاہکار“ بھی
اپنے اندر سموئے ہوئے ہے جن کے سامنے علامہ
دریابادی، مولانا محمد میاں وغیرہ پر مدیر
تجلی کے بازاری فقرے بھی ہیچ ہیں۔“

مولانا محمد میاں کی کتاب ”شواہد تقدس“
پر جو تنقید ہم نے کی تھی وہ تو پرانی بات ہوئی۔ تازی
بات یہ ہے کہ مولانا دریابادی کی ”تفسیر ماجدی“
پر تبصرہ مستقل مضمون کی شکل میں مہینوں سے تجلی
میں چل رہا ہے اور زیر دست شمارے میں بھی اسکی
قسط موجود ہے۔ اس میں کہاں کہاں بازاریت
پائی جا رہی ہے اس کی بھی نشاندہی ہمارے کرم فرما
فرما دیتے تو بہتوں کا بھلا ہوتا۔ نہیں فرمائی تو قارئین
تجلی خود ہی ایک بار تکلیف کر کے اس تبصرے کی
تمام قسطوں کا جائزہ لیں اور بلا رو رعایت فیصلہ
دیں کہ اگر یہ انداز تحریر ”بازاری“ ہے تو ”غیر بازاری“
تحریریں دنیا کے کس خطّے اور گوشے میں پائی جاتی ہیں۔

ہمارے علم کی حد تک نالائق عامر عثمانی کی
بازاریت اور بد تمیزی اور نالائقی شاید یہ ہے
کہ وہ نہ تو گول مول باتیں کرتا ہے نہ اجمال و اختصار
کا عادی ہے۔ صاف کہتا ہے، ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے

اتہام نہیں تراشتا بلکہ الزام کے دلائل وشواہد بھی پیش کرتا ہے۔ جاہل کہے گا تو جہل کا نمونہ بھی سامنے رکھ دے گا اس کا یہی جرم بہتیرے بزرگوں کو بہت کھلتا ہے اور اہل حدیث کرم فرما بھی غالباً اسی پر چراغ پا ہیں۔

مزید سنئے۔ کہا گیا :-

"بیچارے عامر صاحب اپنی طبیعت سے مجبور ہیں۔ وہ ایک طرف تو حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے لئے "مسجد سے میخانے تک" کا چکر لگاتے رہتے ہیں اور اس راہ میں اتحادِ ملت کا ایسا بلیغ وعظ فرماتے ہیں کہ سادہ لوح اہل حدیث عوام تک سر دھننے لگتے ہیں اور جب اپنی فطرت و عادت سے مجبور ہو کر وہ تقلید و جمود کی حمایت پر اترتے ہیں تو کوثری اور شوق نیموی سے آگے بڑھ جاتے ہیں"۔

دیکھ رہے ہیں آپ۔ یہ ان محترم مدیر ترجمان کی نگارش ہے جو عامر عثمانی پر بازاریت کی پھبتی کستے ہیں اور دنیا کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم اہل حدیث کی تحریریں نہایت متین، عالمانہ اور شائستہ ہوتی ہیں۔

انصاف کیا جائے "حکومتِ الٰہیہ" کی اصطلاح کبھی جماعتِ اسلامی نے اختیار کی تھی۔ اس سے اسکی مراد وہ حکومت تھی جو اپنے حیطۂ اقتدار میں اسلامی قوانین رائج کرے۔ عامر عثمانی کا قصور یہ ہے کہ اس نے اس "مراد" کی تحسین و تائید کی۔ یہ قصور کم سے کم دینداروں کے نزدیک تو ایسا نہ ہونا چاہئے کہ وہ مضحکہ اڑائیں۔ ہمارے نزدیک تو ہر سچے مسلمان کے عین ایمان کا تقاضا یہی ہونا چاہئے کہ وہ غیر اسلامی قوانین سے کڑھے اور تمنا کرے کہ اللہ تعالیٰ اسلام کا بول بالا کر دے۔ اس تمنا کو تمسخر کا نشانہ بنانا کیا واقعی متانت اور ثقاہت سے کوئی واسطہ رکھتا ہے پھر تمسخر میں بھی مدیر مکرم ایسا انداز اختیار کر گئے جو غیر ذمہ دار اور بے سلیقہ لوگوں کے سوا کسی کو زیب نہیں دے سکتا۔ تجلی کے رسوائے زمانہ کالم "مسجد سے میخانے تک" پر اگر عامر عثمانی کا نام ہوا کرتا تب تو اس تمسخر کا کوئی سر پیر بھی تھا لیکن سب جانتے ہیں کہ اس پر بحیثیت کالم نگار ملّا ابن العرب مکی کا نام ہوتا ہے۔ موصوف نے کسی ثبوت و شہادت کے بغیر ہی یہ قطعی فیصلہ کر دیا کہ یہ دونوں شخصیتیں ایک ہی ہیں۔ حالانکہ سنجیدہ اور باسلیقہ لوگ محض اپنے ظن و تخمین کو قطعیت کے ساتھ ظاہر نہیں کیا کرتے۔

علاوہ ازیں بحث ایک سنجیدہ علمی مسئلے کی تھی ــــ یعنی طلاق ثلاث کی۔ اس پر لب کشائی کرتے ہوئے خواہ مخواہ "مسجد سے میخانے تک" کا ذکر درمیان میں لانا کیا اس بات کا قرینہ نہیں ہے کہ اصل مسئلے سے زیادہ محترم مکرم کو نالائق عامر عثمانی کی ٹانگ گھسیٹنے سے دلچسپی ہے اور موقعہ ہو نہ ہو وہ اسے ہدفِ ملامت ضرور بنانا چاہتے ہیں۔ شاید ان کے یہاں اسی رویّہ کا مقدس نام شائستگی اور متانت ہوگا۔

آگے ارشاد ہوا :-

"طلاق نمبر شائع ہونے کے بعد کئی دوستوں نے مجھ سے کہا کہ اس کا جائزہ لینا ضروری ہے مگر میں اس کی لاطائل بحثوں کے پیچھے اپنا وقت ضائع کرنا فضول سمجھتا تھا"

یعنی کہاں عامر جیسا لغو نگار طفلِ مکتب اور کہاں درجۂ علیا کے استاد اور ترجمان جیسے عظیم المرتبت جریدے کے مدیر خوش تدبیر! ـــــ واقعی بات تو انھوں نے درست کہی۔ وہ علم، تقویٰ، بردباری سب میں ہم سے بڑھ چڑھ کر ہیں اور وہی کیا ہم تو ان کے شاگردوں سے بھی اپنا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم عالم نہیں بلکہ علماء کے خوشہ چیں ہیں۔ ہمیں تقویٰ سے کیا نسبت جب کہ دامانِ عمل گناہوں اور بے توفیقیوں کے کیچڑ سے

لت پت ہے۔

لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب تجلی کا طلاق نمبر لاطائل بحثوں کی پوٹ تھا اور اس کے پیچھے پڑنا ممدوح کی دانست میں وقت ضائع کرنے کے مرادف تھا تو آخر یہ کیا ہوا کہ مولانا رئیس الاحرار کا مضمون آتے ہی اسے بڑے ذوق و شوق اور طمطراق سے فوراً شائع کرنا شروع کر دیا۔ اب وہ احساس کہاں گیا کہ لاطائل بحثوں کے پیچھے کیوں وقت ضائع کیا جائے۔

احساس شاید موصوف کو بھی ہوا کہ اس تضاد کو محسوس کر لیا جائے گا چنانچہ اس کا دفیعہ درج ذیل عبارت سے کیا گیا ہے۔

"اسی اثنار میں ہمارے دوست مولانا رئیس الاحرار ندوی مدرس مرکزی دارالعلوم بنارس کا درج ذیل مقالہ اشاعت کے لئے آگیا جو علمی اور تحقیقی اعتبار سے انتہائی وقیع ہے، ہم اسے احباب و مخلصین و مختلف مکاتب فکر کے روشن ضمیر دوستوں کے اصرار پر بالاقساط شائع کر رہے ہیں"۔

سمجھے آپ، یہ محترم اپنے قارئین کو کیا بتانا چاہتے ہیں۔ بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ اگرچہ تجلی کی بحثیں محض بکواس ہیں اور ان پر متوجہ ہونا وقت کا ضائع کرنا ہے لیکن ہمارے ادارۂ ترجمان میں ہر وقت مختلف مکاتب فکر والوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ ادھر کوئی مقالہ ڈاک سے آیا اور ادھر ان حضرات نے اسے پڑھ کر اپنی رائے ظاہر کی۔ اس مقالہ کا مسودہ جب ان حضرات نے پڑھا تو وہ جھوم اٹھے، دجد میں آگئے کہنے لگے کہ اسے ضرور چھاپو۔ اب ہم ان سے کیا کہتے کہ تجلی کی بکواس پر التفات کرنا بوالفضولی ہے۔ قیمتی وقت کی بربادی ہے۔ مجبوراً چھاپنے ہی کا فیصلہ کر ڈالا۔

ہم تو اس صورتِ حال پر اعتبار کر لیتے کیونکہ احمق ہیں لیکن کوئی عقل والا بھی اسے خندۂ استہزار سے زیادہ کسی شے کا مستحق سمجھے یہ بہت مشکل ہے ترجمان جیسے سیکڑوں پرچے ہندوستان جنت نشان کے گلی کوچوں سے نکلتے ہیں۔ یہ سب بھی ایک دوسرے کے ممد و معاون بن جائیں تب بھی ایسے کسی سکریٹریٹ کی عمارت نہ بن سکے گی جس میں مختلف مکاتب فکر والے ہمہ وقت مسندیں سجا کر بیٹھیں اور آمدہ مسودات کا مطالعہ فرما فرما کر فیصلے دیا کریں کہ فلاں کو شائع کرو اور فلاں کو ردی کر دو۔

جس مقالہ کو، یہ مکرم انتہائی وقیع اور علمی و تحقیقی قرار دے رہے ہیں اس کی بھی کچھ جھلکیاں دیکھ لی جائیں تو کچھ حرج نہیں۔ بسم اللہ یوں ہوتی ہے۔

"یہ معلوم ہے کہ احادیث نبویہ اور مسلک اہل حدیث کے خلاف منکرین حدیث کے ملتی جلتی ہوئی ہرزہ سرائی و لغو طرازی ماہریہ تجلی دیوبند کا شیوہ و شعار ہے۔ وہ احادیث نبویہ و علمائے حدیث و مسلک حدیث کیخلاف زہر افشانی کے بے حد شائق بلکہ عادی ہیں"۔

دیکھ لیجئے۔ کیا ہم نہ کہتے تھے کہ یہ حضرات گالی پہلے دیتے ہیں بات بعد میں کرتے ہیں۔

ہرزہ سرا۔ لغو طراز۔ زہر افشاں۔ کتنی بردباری اور پاکیزگی ٹپک رہی ہے ان خطابات سے۔ پھر مزید لطف و کرم یہ کہ عامر عثمانی کو منکرین حدیث سے بھی مشابہت دے ڈالی۔ جزاک اللہ۔ عطائے تو بہ لقائے تو اب ہم کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔ ایک ایسے عجیب و غریب زمانے میں جبکہ قبروں کی پوجا اور دعوۂ توحید تک میں مفاہمت و مصالحت کر لی گئی ہے۔ کوئی انہونی انہونی نہیں کہی جا سکتی۔

اور فرمایا گیا :-

"مدیر تجلی بظاہر ایک تقلید پسند حنفی المذہب صاحب قلم دیوبندی مولوی ہیں۔ موصوف اپنے تقلیدی مذہب کے سرگرم داعی و مبلغ بھی ہیں۔ اسی بنا پر حنفی و اہل حدیث کے مابین اختلافی مسائل و مباحث میں اپنے تقلیدی موقف کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے زور قلم صرف کرنے کے عادی ہیں موصوف اپنے تقلید پرست ہونے کا پروپیگنڈہ کرنے کے باوجود ہمیشہ لبادۂ تحقیق اوڑھ کر انصاف و اعتدال اور اصول پرستی کی دہائی دیتے ہوئے میدانِ بحث و نظر میں نمودار ہوتے ہیں اور اظہار تواضع و انکساری کے باوجود اپنی ہمہ دانی و تحقیق پسندی کا زبردست پروپیگنڈہ کرتے ہیں"۔

اہل قلم ملاحظہ فرمائیں اس عبارت میں دو بار لفظ پروپیگنڈہ استعمال ہوا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانائے معظم کے قلب صافی میں نالائق عامر عثمانی کے لئے حسنِ ظن اور خیال نیک کی کوئی گنجائش نہیں وہ شاید اپنی لیبرٹ اور روحانی لطافت کے زیر اثر طے کر چکے ہیں کہ عامر عثمانی محض پروپیگنڈسٹ ہے یعنی کورا بہروپیا !

ظاہر ہے جب یہ طے کر لیا گیا تو عامر عثمانی کی کوئی بھی ادا انھیں زہر سے کم کیا لگے گی۔

عامر نالائق کی مزید تعریف استاذ محترم کے قلم سے یوں نکلی :

"دعویٰ دیانتداری و امانت شعاری کے باوجود تلبیس و تدلیس کے تمام مقلدانہ ہتھکنڈوں کا استعمال پوری آزادی سے کرتے ہیں"۔

دیکھا آپ نے - پروپیگنڈہ کا قافیہ ہتھکنڈہ ! یہ ان بزرگوار عالم کی زبان ہے جو ہم جیسے بدتہذیب اطفال مکتب کو ادب و شائستگی اور شیریں زبانی سکھانے چلے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ بحث و استدلال کا ہفت خواں طے کرنے سے پہلے ہی محترم رئیس الاحرار نے فیصلہ فرما دیا کہ جس طفل مکتب کا وہ تعقب کرنے چلے ہیں وہ پروپیگنڈسٹ بھی ہے اور ہتھکنڈہ باز بھی۔

کاش وہ محسوس کرتے کہ یہ فیصلہ سنا دینے کے بعد وہ خود کس مقام پر جا کھڑے ہوئے۔ ایک استادِ حدیث اور ایسے گھٹیا لوگوں سے الجھے !

مزید سنئے۔ بدنصیب عامر ہی کا ذکر چل رہا ہے۔

"لطف یہ کہ ان کے تقلیدی مذہب کا کوئی شخص اگر کسی خاص مسئلہ میں تقلید کے تیرہ و تاریک اور متعفن ظلمت کدہ سے نکل کر کتاب وسنت کی پاکیزہ فضا میں سانس لینا چاہے تو اسے بھی اپنی نیش زنی اور دشنام طرازی سے نہیں بخشتے"۔

کیا تیور ہیں۔ کیا طنطنہ ہے۔ معلوم ہوا کہ پوری امتِ مسلمہ ہی شروع سے اب تک بدبودار اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتی رہی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ تیسری صدی ہجری کے خاتمے تک فقہ کے چاروں معروف مکاتب فکر دنیائے اسلام میں مشہور و مقبول ہو چکے تھے اور امت کے کروڑوں افراد انہی مکاتب سے وابستہ ہو گئے۔ پھر نسلاً بعد نسلٍ آج تک یہی سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ فقیہ و مجتہد کسی بھی قوم اور امت میں بہت زیادہ نہیں ہوا کرتے۔ غالب اکثریت عوام ہی کی ہوا کرتی ہے۔ پھر یہاں تو یہ ہوا کہ عوام ہی نے نہیں بے شمار فقہاء اور مجتہدین اور شیوخ اور اعیانِ حق نے اپنا رشتہ کسی نہ کسی مکتب فقہ سے جوڑا اور تقلید کا قلادہ گردن میں ڈالا۔ اگر بے تقلیدی کا وہی مذہب و مسلک واحد صحیح مسلک ہو جسے مقالہ نگار اختیار کئے ہوئے ہیں تو پھر موصوف ہی کے

الفاظ میں یہ کہنا پڑے گا کہ چند ہزار کو چھوڑ کر کروڑوں
مسلمان شروع سے اب تک قرآن و سنت کی آزاد فضا
سے محروم اور تیرہ و تاریک متعفن ظلمت کدہ میں سرگرداں
چلے آرہے ہیں۔

اگر واقعی یہی بات ہے تو بریلویوں کی کیا خطا
ہے اگر وہ اپنے محدود گروہ کے سوا سارے عالم کو
بد دین تصوّر کرتے ہیں اور قادیانیوں کا کیا قصور اگر
وہ کہتے ہیں کہ جو شخص مرزا غلام احمد کو نبی نہ مانے
وہ کافر ہے۔

منہ میں جھاگ بھر کر اور باچھوں پر کف لا کر
تقلید اور مقلدین پر سنگباری کرنا شاید بہت ہی
شائستہ اور عالمانہ مشغلہ ہے لہٰذا عامر عثمانی جیسے
چھوٹوں کی آڑ لے کر ساری امت کو گالیوں اور تہمتوں
کا نشانہ کیوں نہ بنا دیا جائے۔

مبارک ہو اے خسروانِ مملکتِ حدیث!
کھیلو کھیلو خوش رہو۔

آگے محترم استاذ کا پارہ کچھ اور چڑھا۔ تہذیب و
شائستگی کے ابخارات نے کچھ اور زور باندھا تو عامر
بیچارے کو بایں طور ابلیس لعین سے تشبیہ دیدی کہ
جس طرح ابلیس تلبیس کا امام اعظم تھا اور باغیِ حق
ہونے کے باوجود ناصح مشفق بن بیٹھا تھا ایسا ہی وطیرہ
عامر عثمانی کا بھی ہے۔

ہمیں رنج نہیں ہوا اور نہ کہتے کہ انما اشکو بثّی و
حُزنی الی اللہ۔ رنج اس لئے نہیں ہوا کہ محترم مقالہ نگار
معذور ہیں۔ معذور اس لئے ہیں کہ تجلی طلاق نمبر نے
انھیں بڑی ضیق میں ڈال رہا ہے۔ ضیق میں اسلئے
ڈال رہا ہے کہ گالی باز اور ہرزہ سرا عامر نے اس نمبر
میں ایجابی و سلبی ہر طرح کے دلائل اتنی مقدار میں
جمع کر دیئے ہیں کہ وہ زندگی بھر بھی ہاتھ پیر ماریں گے
تو ان سے عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے۔

لاف و گزاف اور فضول گوئی کا تو کسی کے پاس کوئی
علاج نہیں۔ ہاں اگر ایک دو ایسے جج مقرر کر دیئے جائیں
جن کے علم و فہم اور غیر جانبداری اور انصاف پسندی
مسلّم ہو تو ہم اللہ کے بھروسہ پر بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ
تنہا مقالہ نگار ہی نہیں ان کے جملہ اعیان و انصار بھی
ایک دوسرے کے ممد و معاون بن جائیں تو یہ مقابلہ
وہ جیت نہیں سکتے۔ اپنے نام کے ساتھ "اہلِ حدیث"
لکھ دینا یہ معنی تو نہیں رکھتا کہ اب حدیث پر آپ ہی کی
اجارہ داری قائم ہو گئی۔ اور کوئی حدیث سمجھ ہی نہیں
سکتا۔

ناانصافی ہو گی اگر موصوف محترم کی خوش گفتاری کا
ایک اور نمونہ سامنے نہ لایا جائے۔ تکلم فرمایا گیا:-

"مدیر تجلی کی دشنام طرازی، ہرزہ سرائی
اور تقلید پرستی کی مدح سرائی میں مبالغہ
آرائی سے قطع نظر اصل بحث پر موصوف
کی (یعنی مدیر تجلی کی) ظلمت آفریں جہالت
طرازیوں کو ہم حقائق و معارف کی روشنی
میں لانا چاہتے ہیں"۔

سبحان اللہ۔ کیا گھریلو زبان ہے۔ کیا مقدس
لب و لہجہ ہے۔ کیسا پیار چھلک رہا ہے ایک ایک لفظ
سے۔ کتنی عالمانہ متانت، کیسی صالحانہ شیریں بیانی
کس قدر تقویٰ شعاری سمائی ہوئی ہے فقرے کے
حرف حرف میں۔

آگے کچھ حصہ نفس بحث سے بھی متعلق ہے، یعنی
تین طلاقوں کے مسئلہ سے۔ اسے پڑھا تو سوائے
اس کے کچھ سمجھ میں نہ آسکا کہ استاذ محترم نے حدیث
کی کچھ کتابیں پڑھی ضرور ہیں مگر شاید وہ انھیں
ہضم نہیں کر سکے اور ان کا دماغ بھی شاید اس فنِ دقیق
کی سہار نہیں کر سکا۔

تاہم ایک قابلِ نقل بات اس میں بھی مل ہی گئی۔ مدیر تجلی کا مسلک یہ ہے کہ تین طلاقیں اگر صریح الفاظ میں بیک وقت دی گئی ہیں تو وہ تین ہی واقع ہوں گی۔ اسی کے تعلق سے فرماتے ہیں۔

"مدیر تجلی کے اس تقلیدی مذہب کو چاروں تقلیدی مذاہب کی حمایت حاصل ہے اس لئے اپنے تقلیدی موقف کو صحیح ثابت کرنے کیلئے موصوف کو مذاہب اربعہ کی کتابوں سے کچھ کافی مواد حاصل ہو گیا ہے"

اس ریمارک کو نوٹ کر لیا جائے۔

اب تو ہر شخص مانے گا کہ تین طلاقیں پڑنے والا مسلک تنہا احناف کا نہیں چاروں ائمہ کا ہے اور سوائے نوزائیدہ اہلِ حدیث کے کوئی جماعت کبھی ایسی نہیں رہی جو اس کے خلاف رائے رکھتی ہو۔

یہ آپ دیکھ چکے کہ اس مسلک کی تائید و حمایت کو محترم مقالہ نگار نے ظلمت آفریں جہالت طرازی کہا ہے۔ اس کا واضح مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ چاروں ائمہ اور ان کے کروڑوں پیرو دل کھول کر گالیاں دے رہے ہیں۔

ایک بات اور انصاف طلب ہے۔ تجلی کے طلاق نمبر میں ہم نے جو دلائل استعمال کئے ہیں ان کا تقلید سے مطلق کوئی تعلق نہیں۔ تقلید تو کہتے ہیں کسی امام فقہ کی رائے کو دلیل دریافت کئے بغیر مان لینے کو۔ ہم نے اگر یہ کہا ہوتا کہ چونکہ چاروں مکاتبِ فقہ تین طلاقوں کا وقوع مانتے ہیں اس لئے ہم بھی اس کے حامی ہیں تب تو یہ الزام دیا جا سکتا تھا کہ عامر نے مقلدانہ رخ اختیار کیا لیکن ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ہم نے قرآن، حدیث اور صحابہ کے فتاویٰ کو مستدل بنایا ہے۔ اس کے باوجود اگر ہمارا تعاقب کرتے ہوئے اہلِ حدیث بزرگ تقلید تقلید کی رٹ لگائے جاتے ہیں تو خود سوچ لیجئے کہ ان کا سرمایہ فہم و دیانت کیا ہے۔ یہ تو سیاسی بازیگروں کا کام ہے کہ حریف کے خلاف خواہ مخواہ اشتعال پھیلاؤ۔ ہمارے اہلِ حدیث اس بہاڑ جیسی غلط فہمی بلکہ نادانی میں مبتلا ہیں کہ حدیث و قرآن سے مسائل تو بس وہی نکالتے ہیں اور مقلد حضرات فقط تقلیدی ہیرا پھیری کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض مغالطہ ہے جس کے جال میں وہ اپنے کوتاہ فہم شاگردوں کو پھانستے ہیں۔

ہمارے تعاقب میں جو مقالے اب لکھے جا رہے ہیں یا آئندہ لکھے جائیں گے ان سے انشاء اللہ فقط ایسے ہی لوگ دھوکہ کھا سکیں گے جو تجلی طلاق نمبر کو سامنے نہ رکھیں۔ یا جن میں اتنی استعداد ہی نہ ہو کہ معقول اور نامعقول میں تمیز کر سکیں ورنہ فہیم لوگ تو تقابلی مقابلے سے خود ہی جان لیں گے کہ جواب و تعصب کے نام پر لفاظی اور خامہ فرسائی کا کونسا کارنامہ انجام دیا جا رہا ہے۔

مدیر تجلی کی خوب خوب پگڑی اچھالنے کے بعد استاذ مکرم نے جو مقالہ شروع فرمایا ہے اس کا بس تھوڑا سا حصہ پیشِ نظر شمارے میں آ سکا ہے۔ اسکے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے تجلی کا طلاق نمبر یا تو پڑھا ہی نہیں یا پڑھا ہے تو اس سے نظریں چرانا چاہتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ اس حدیث کو اپنے مسلک کے لئے نصِ قاطع نہ کہتے جس پر ہر پہلو سے تجلی بحث کر چکا ہے اور قطعی دلائل کے ساتھ ثابت کر چکا ہے کہ کسی فعل کا گناہ ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ مؤثر بھی نہ ہو۔ اللہ کے رسول اگر کسی شخص پر اس لئے غصہ ہوئے کہ اس نے بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالی تھیں تو اس کا یہ مطلب آخر کہاں سے نکل آیا کہ یہ طلاقیں واقع بھی نہیں ہوئیں۔ اللہ کے رسول تو یقیناً اس شخص پر بھی غصہ ہوتے جو قتلِ ناحق کا مرتکب ہو گیا ہوتا مگر کیا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ قتل واقع ہی نہیں ہوا اور مقتول کو زندوں میں شمار کیا جاتا ہے

اللہ کے رسول تو اس شخص پر بھی غصہ ہوتے جو زنا کا مرتکب ہوا ہوتا لیکن کیا اس غصہ کا مطلب یہ ہوتا کہ اس زنا سے نطفے کا استقرار ناممکن ہے۔ یہ فعلِ جنسی واقع ہی نہیں ہوا۔

عقل کو محو حیرت کر دینے والی منطق استعمال فرمائی ہے کہ بیک وقت تین طلاقوں کا اختیار شریعت نے دیا ہی نہیں اور جس چیز کا اختیار نہیں دیا وہ مردود ہے چنانچہ جن عورتوں سے نکاح حرام ٹھہرایا ان سے نکاح کیا جائے تو وہ ہوگا ہی نہیں۔

ہم کہتے ہیں اول تو یہ بات سراسر خلافِ واقعہ ہے کہ شریعت نے اکٹھی تین طلاقوں کا اختیار دیا ہی نہیں قرآن کی جس آیت میں تین طلاقوں کا حکم بیان ہوا ہے اسے نظر انداز کر کے ادھر ادھر کی آیات کو من ملنے طریقے پر جوڑنا قرآن سے کھیل کرنا ہے۔ موصوف نے قرآن سے بحث کا آغاز کر کے بعض اور آیات لے لی ہیں مگر اس آیت کا مطلق ذکر نہیں کیا حالانکہ یہی آیت اس موضوع پر صریح ہے۔ اس میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شوہر کو تین طلاقوں کا اختیار دے رہا ہے۔ رہا یہ کہ شوہر اس اختیار کو یکدم استعمال کر ڈالے یا قسط وار کرے اس سے قرآن بحث نہیں کرتا۔ ہم طلاق نمبر میں بڑی مفصل گفتگو اس آیت پر کر چکے ہیں۔

دوسرے یہ کہ استاد محترم معاملات کی دو قسموں کا فرق نہیں سمجھتے۔ ایک ہوتا ہے کسی شے پر اپنا حق قائم کرنا اور ایک ہوتا ہے کسی حق سے دستبرداری دینا ——— کسی بھی کسی مہذب قانون نے ان دونوں طرح کے معاملات کو ایک صف میں نہیں رکھا۔ نکاح ایک مرد کو ایک عورت کے جسم پر متصرف ہونے کا حق دیتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ یہ حق مرد اُن ضوابط کے مطابق حاصل کرے جو صاف صاف مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن طلاق دینا اپنے حق سے دستبرداری دینے کا نام ہے۔ کوئی شخص اگر یہ پسند کرے کہ اپنے کسی حق سے دستبرداری دیدے تو آخر کونسی قانونی

منطق اس میں حائل ہو سکتی ہے۔ تجلی میں اس پہلو سے بھی مفصل بحث کی جا چکی ہے مگر جب کچھ لوگ طے ہی کر لیں کہ اپنی رائے کے خلاف کسی معقول سے معقول بات کو نہیں مانیں گے اور برابر اپنی کہے جائیں گے تو ہم کیا رازی اور غزالی بھی ان سے کچھ نہیں منوا سکتے۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے فی الحال مذکورہ مقالہ پر نقد و نظر ہمارا مقصود نہیں۔ پورا مقالہ شائع ہو جانے کے بعد اگر ہم نے دیکھا کہ اس میں کوئی ایسا استدلال آ گیا ہے جس پر گفتگو تجلی میں نہیں آئی تو بے شک کچھ عرض کریں گے۔ اہلِ حدیث بزرگوں سے دردمندانہ گزارش ہے کہ اگر وہ فضول وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے بلکہ سنجیدہ اہلِ علم کا اسلوب اختیار کرنا چاہتے ہیں تو اس کا بطریقہ ہرگز نہیں ہے کہ جو مواد ہم نے پیش کر دیا اسے نظر انداز کر کے ہماری تحریروں سے صرف وہ سطریں نکال لی جائیں جو محض ضمنی ہیں۔ اگر کہیں کہیں ہمارا طرزِ تحریر واقعی جارحانہ اور اشتعال انگیز ہو گیا ہے تو اسے نظر انداز کر کے آپ صرف دلائل و شواہد پر گفتگو کیجئے۔

ہم نے آپ کے لئے آسانی یہ پیدا کر دی ہے کہ طلاق نمبر سے اگلے شمارے میں اپنے اصلی اور بنیادی مثبت دلائل کو یکجا کر دیا ہے اور یہ دلائل تقلیدی نہیں ہیں بلکہ تحقیقی ہیں ان کی ترتیب یوں ہے کہ پہلے ہم نے وہ آیات لی ہیں جن سے ہمارے نزدیک تین یکجائی طلاقوں پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ہم نے آٹھ حدیثیں حوالوں کے ساتھ پیش کی ہیں جن سے بداہتہً ثابت ہوتا ہے کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی تین یکجائی طلاقوں کو واقع مانتے تھے جب کہ وہ صریح و غیر مبہم ہوں۔ اس کے بعد صحابہ رضوان اللہ علیہم کے چیدہ آثار پیش کئے گئے ہیں جن کا رشتہ قول سے بھی ہے اور عمل سے بھی۔

فرمائیے کیا استدلال کی اس تکنیک اور استشہاد کے اس مواد کو بھی آپ تقلیدی کہہ سکتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر

یہ کہاں کی معقولیت ہے کہ آپ بار بار تقلید اور مقلدین کی ہجو کر کے خواہ مخواہ ایک غلط تاثر دے رہے ہیں — حق پسند ہیں تو دنیا کو متین دلائل کے ساتھ بتائیے کہ اتنی احادیث اور اتنے آثار صحابہ کو آپ کیوں نظر انداز کر رہے ہیں اور چاروں ائمہ جس مسلک پر متفق ہیں اسے محض تقلیدی مسلک کیوں کہے چلے جا رہے ہیں۔

ایک درس عبرت! اہل حدیث کے مرکزی دارالعلوم (بنارس) سے ایک جریدہ نکلتا ہے "صوت الجامعہ" اس کے اگست ۱۹۷۶ء کے شمارے میں اس کے ادارے کے ایک رکن مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی نے مدیر زندگی کے اس مقالہ پر سخت تنقید کی ہے جو انھوں نے مسلم کی ایک حدیث کے متعلق لکھا تھا اور زندگی کے طلاق نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ اس پوری تنقید سے ہمیں فی الحال تعرض نہیں کہ اس کا نوٹس لینا تو مدیر زندگی کے ذمہ ہے البتہ اس میں سے ایک دو نمونہ ہم ایسا آپ کے سامنے رکھتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ ہم پر تقلید کی پھبتی کسنے والے اور خود کو محقق کہنے والے اپنی بات کی پچ میں کتنے کورے اور نامعقول مقلد بن جاتے ہیں۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری شرح بخاری میں تین طلاقوں کے مسئلہ پر طویل بحث کی ہے۔ اس بحث کے دوران ایک جگہ وہ صیغۂ مجہول کے ساتھ بعض نامعلوم افراد کا یہ دعویٰ ذکر کرتے ہیں کہ حضرت علی حضرت ابن مسعود حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت زبیر رضوان اللہ علیہم سے بھی یہی منقول ہے کہ تین یکجائی طلاقیں دور رسالت اور دور صدیقی میں ایک ہوا کرتی تھیں۔

ابن حجر نے یہ دعویٰ تصدیق و تائید کے طور پر بیان نہیں کیا۔ اگر ان کے نزدیک یہ دعویٰ درست ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ وہ یہ فیصلہ صادر فرما دیتے کہ تین طلاقوں کے پڑنے پر اجماع ہے اور کسی صحابی نے اس اجماع کے خلاف قول نہیں کیا۔ ابن حجر کا فیصلہ ہم طلاق نمبر کے صفحہ ۱۰۹ پر بحوالہ نقل کر چکے ہیں۔

لیکن مولانا آزاد رحمانی اپنے مضمون کے قائلین کو بلاتکلف یہ باور کرا رہے ہیں کہ ابن حجر کے نزدیک چاروں صحابہ کے بارے میں مذکورہ نقل صحیح ہے۔ اسے علمی بددیانتی کے سوا کیا کہیں گے۔

پھر چلئے ایک منٹ کو مان لیا کہ ابن حجر اس نقل کو درست مانتے ہوں بلکہ یہی مان لیجئے کہ خود ابن حجر نے ایسا دعویٰ کیا ہو لیکن مولانا آزاد تو ماشاء اللہ تقلید کے دشمن اور تحقیق کے علمبردار ہیں۔ ان کی دیانت کا تقاضا تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ ابن حجر کے مجرد دعوے کو یوں ہی نہ مان لیں بلکہ تلاش کریں کہ مذکورہ صحابہ کا یہ قول کہاں کس سند صحیح سے پایا جاتا ہے۔ تلاش کے بعد اگر انھیں قابل اعتماد سندیں مل جائیں تب تو اس قول کو زیب مضمون فرمائیں، نہ ملیں تو ردی سمجھ کر دیوار پر ماریں۔ یہ تھا محققانہ طریق مگر انھیں ایسے موقعہ پر تحقیق کی یاد کیوں آنے لگی جب کہ ایک بے سند اور بے بنیاد قول سے انھیں کمک مل رہی ہو۔

دوسرا نمونہ بھی اسی جگہ ہے۔ علامہ نظام الدین قمی نے "غرائب القرآن" میں کچھ صحابہ کا نام دے کر یہ لکھدیا ہے کہ ان میں بعض وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ایک وقت میں دو یا تین طلاقیں دیں تو ایک ہی شمار ہوگی علاوہ ازیں مولانا عبدالحی لکھنوی بھی اپنی عمدۃ الرعایہ میں یہی بات لکھ گئے ہیں۔

اب ہمارے محترم مولانا آزاد رحمانی بالکل بھول گئے کہ میں تو محقق ہوں مقلد نہیں۔ مجتہد ہوں متبع نہیں۔ فوراً ان دونوں بزرگوں کے اقوال کو اس طرح نقل کر دیا گویا ان کا کہا بنا دلیل قطعی ہے اور اب کسی کو یہ پوچھنے کا حق نہیں کہ بعض صحابہ کا مذکورہ قول آخر کہاں ہے اور اس کی سند کہاں ہے۔ ظاہر ہے علامہ نظام الدین یا مولانا عبدالحی تابعی تو ہیں نہیں کہ مزید تحقیق کی ضرورت ہی نہ ہو۔ قول رسول کو تسلیم کرنے

کے لئے اگر مولانا آزاد رحمانی ایسی سند ضروری سمجھتے ہیں جس کا ہر ہر راوی جانچا پرکھا ہو تو آخر بعض صحابہ کا مذکورہ قول انھوں نے بلا سند کیسے مان لیا۔

مزید سنئے۔ مولانا عبدالحی نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام مالک کے دو قولوں میں سے ایک قول یہی ہے اور امام احمد کے بعض اصحاب بھی اسی کے قائل ہیں۔

اسے بھی مولانا نے برملا نقل کر دیا اور اس طرح فارغ ہو بیٹھے جیسے مکمل طور پر حق تحقیق ادا کر دیا ہو۔ حالانکہ تحقیق کے ... میں وہ مخلص ہوتے تو مولانا عبدالحی کی تحریر کو ہرگز ہرگز درجۂ وحی میں نہ رکھا دیتے بلکہ خود تفتیش کرتے کہ امام مالک کا مزعومہ قول کس سند سے ثابت ہے اور بعض اصحاب احمد کی رائے کہاں کن ذرائع سے درجۂ ثبوت کو پہنچی ہے۔ ہم طلاق نمبر میں ثابت کر آئے ہیں کہ اس طرح کے دعوے پروپیگنڈے اور افواہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اگر ہمارا خیال غلط ہے تو مدعیان تحقیق عوام الناس کو خواہ مخواہ دھوکا دینے کے عوض دستاویزی دلائل سے ثابت فرمائیں کہ واقعی امام مالک نے کبھی مذکورہ قول کیا تھا اور بعض اصحاب احمد نے یہ رائے رکھی تھی۔

ایک اور غضب۔ طلاق نمبر میں ہم نے صفحہ ۲۸ پر مولانا محفوظ الرحمٰن کی ایک علمی خیانت کو منکشف کیا تھا۔ خدا کی شان ہے کہ مولانا آزاد رحمانی کے یہاں بھی وہی خیانت دن کی روشنی میں نظر آرہی ہے۔ صورت یہ ہے کہ ابوداؤد میں ایک روایت یوں بیان ہوئی ہے۔

> "ایوب نے عکرمہ سے اور عکرمہ نے ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ جب تم اپنی بیوی کو ایک ہی منہ میں تین طلاق دو تو یہ ایک طلاق ہوگی"

اگر روایتِ ابوداؤد بس اتنی ہی ہوتی تو مولانا موصوف کا یہ لکھنا صحیح ہوتا کہ

> "امام ابوداؤد نے خود حضرت ابن عباس کے ایک شاگرد عکرمہ کے بارے میں کہا ہے کہ وہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ اذا قال انت طالق ثلاثا بفم واحد فھی واحدۃ"

لیکن جس کا جی چاہے ابوداؤد شریف اٹھاکر دیکھ لے — اور مولانا موصوف کے شاگرد تو خصوصیت سے دیکھیں کہ امام ابوداؤد نے عین اسی جگہ یہ تنبیہ بھی کر دی ہے کہ عکرمہ نے یہ قول ابن عباس کا قول کہہ کر نقل نہیں کیا (ابوداؤد کی پوری عبارت اور خیانت کی مکمل تفصیل تجلی طلاق نمبر صفحہ ۴۸ و صفحہ ۴۹ پر ملاحظہ فرمائی جائے)

حالانکہ یہ قول اگر حضرت ابن عباس کا بھی ہو تب بھی اس کا کوئی تعلق زیر بحث تین طلاقوں سے نہیں ہے جس کی قطعی دلیل ہم طلاق نمبر کے صفحات ۱۴۹ تا ۱۵۳ پر بیان کر آئے ہیں۔ تاہم کم عقلی یا کم درائی یا کم علمی کی بنا پر کسی حدیث کا صحیح مطلب نہ سمجھ پانا تو محض ایک فکری خطا بھی جا سکتی ہے لیکن امام ابوداؤد کی صحیح سے ایک ایسی روایت کاٹ کر نقل کر دینا جس کی تردید اسی جگہ امام موصوف کر رہے ہیں خیانت کے سوا اور کیا کہلائے گا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

(القیامۃ)

اے نبی ﷺ اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے

ﷺ ۱۱ یہاں سے لے کر "پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے" تک کی پوری عبارت ایک جملۂ معترضہ ہے جو سلسلۂ کلام کو بیچ میں توڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم دیباچہ میں بیان کر آئے ہیں، نبوت کے ابتدائی دور میں، جب کہ حضور ﷺ کو وحی اخذ کرنے کی عادت اور مشق پوری طرح نہیں ہوئی تھی، آپ ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپ کو یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا تھا کہ جبریل علیہ السلام جو کلام الٰہی آپ کو سنا رہے ہیں وہ آپ کو ٹھیک ٹھیک یاد رہ سکے گا یا نہیں، اس لئے آپ وحی سننے کے ساتھ ساتھ اسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگتے تھے۔ ایسی ہی صورت اس وقت پیش آئی جب حضرت جبریل سورۂ قیامہ کی یہ آیات آپ کو سنا رہے تھے۔ چنانچہ سلسلۂ کلام توڑ کر آپ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپ وحی کے الفاظ یاد کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ غور سے سنتے رہیں، اسے یاد کرا دینا اور بعد میں ٹھیک ٹھیک آپ سے پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ آپ مطمئن رہیں کہ اس کلام کا ایک لفظ بھی آپ نہ بھولیں گے نہ کبھی اسے ادا کرنے میں غلطی کر سکیں گے۔ یہ ہدایت فرمانے کے بعد پھر اصل سلسلۂ کلام "ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے" سے شروع ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اس پس منظر سے واقف نہیں ہیں وہ اس مقام پر ان فقروں کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلۂ کلام میں یہ بالکل بے جوڑ ہیں۔ لیکن اس پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد کلام میں کوئی بے ربطی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک استاد درس دیتے دیتے یکایک یہ دیکھے کہ طالب علم کسی اور طرف متوجہ ہے اور وہ درس کا سلسلہ توڑ کر طالب علم سے کہے کہ توجہ سے میری بات سنو اور اس کے بعد آگے پھر اپنی تقریر شروع کر دے۔ یہ درس اگر جوں کا توں نقل کر کے شائع کر دیا جائے تو جو لوگ اس واقعہ سے واقف نہ ہوں گے وہ اس سلسلۂ تقریر میں اس فقرے کو بے جوڑ محسوس کریں گے۔ لیکن جو شخص اس اصل واقعہ سے واقف ہوگا جس کی بنا پر یہ فقرہ درمیان میں آیا ہے وہ مطمئن ہو جائے گا کہ درس فی الحقیقت جوں کا توں نقل کیا گیا ہے، اسے نقل کرنے میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے۔

ان آیات کے درمیان یہ فقرے بطور جملۂ معترضہ آنے کی جو توجیہ ہم نے کی ہے وہ محض قیاس پر مبنی نہیں ہے۔

ذمہ ہے، لہٰذا جب ہم اِسے پڑھ رہے ہوں[۱۲] اُس وقت تم اِسکی قرأت کو غور سے سُنتے رہو، پھر اسکا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے[۱۳]

بلکہ معتبر روایات میں اس کی یہی وجہ بیان ہوئی ہے۔ مُسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن جریر، طبرانی، بیہقی اور دوسرے محدثین نے متعدد سندوں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جب حضورؐ پر قرآن نازل ہوتا تھا تو آپ اس خوف سے کہ کہیں کوئی چیز بھول نہ جائیں، جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ وحی کے الفاظ دہرانے لگتے تھے۔ اس پر فرمایا گیا کہ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ——— یہی بات شعبی، ابن زید، ضحاک، حسن بصری، قتادہ، مجاہد اور دوسرے اکابر مفسرین سے منقول ہے۔

۱۲؎ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبریل علیہ السلام قرآن پڑھ کر سناتے تھے، لیکن چونکہ وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پڑھتے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "جب ہم اِسے پڑھ رہے ہوں"۔

۱۳؎ اس سے گمان ہوتا ہے اور بعض اکابر مفسرین نے بھی اِس گمان کا اظہار کیا ہے کہ غالباً ابتدائی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی کے دوران ہی میں قرآن کی کسی آیت یا کسی لفظ یا کسی حکم کا مفہوم بھی جبریل علیہ السلام سے دریافت کر لیتے تھے، اس لئے حضورؐ کو نہ صرف یہ ہدایت کی گئی کہ جب وحی نازل ہو رہی ہو اس وقت آپ خاموشی سے اسکو سنیں، اور نہ صرف یہ اطمینان دلایا گیا کہ اُس کا لفظ لفظ ٹھیک ٹھیک آپ کے حافظے میں محفوظ کر دیا جائے گا اور قرآن کو آپ ٹھیک اُسی طرح پڑھ سکیں گے جس طرح وہ نازل ہوا ہے بلکہ ساتھ ساتھ یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم اور ہر ارشاد کا منشاء اور مدّعا بھی پوری طرح آپ کو سمجھا دیا جائے گا۔

یہ ایک بڑی اہم آیت ہے جس سے چند ایسی اصولی باتیں ثابت ہوتی ہیں جنہیں اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو اُن گمراہیوں سے بچ سکتا ہے جو پہلے بھی بعض لوگ پھیلاتے رہے ہیں اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔

اوّلاً، اِس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعے سے آپ کو ایسا علم دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں ہے۔ اسلئے کہ قرآن کے احکام و فرامین، اُس کے اشارات، اُس کے الفاظ اور اُس کی مخصوص اصطلاحات کا جو مفہوم و مدعا حضور کو سمجھایا جاتا تھا وہ اگر قرآن ہی میں درج ہوتا تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کا مطلب سمجھا دینا یا اس کی تشریح کر دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے کیونکہ وہ تو پھر قرآن ہی میں مل جاتا۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالبِ قرآن کی تفہیم و تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی تھی وہ بہرحال الفاظِ قرآن کے ماسوا تھی۔ یہ وحیِ خفی کا ایک اور ثبوت ہے جو ہمیں قرآن سے ملتا ہے (قرآن مجید سے اس کے مزید ثبوت ہم نے اپنی کتاب "سنت کی آئینی حیثیت" میں صفحات ۹۴-۹۵ اور صفحات ۱۱۸ تا ۱۲۵ میں پیش کر دیئے ہیں)۔

ثانیاً، قرآن کے مفہوم و مدعا اور اس کے احکام کی یہ تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی گئی تھی آخر اسی لئے تو بتائی گئی تھی کہ آپ اپنے قول اور عمل سے اُس کے مطابق لوگوں کو قرآن سمجھائیں اور اس کے احکام پر عمل کرنا سکھائیں۔ اگر یہ اُس کا مدعا نہ تھا اور یہ تشریح آپ کو صرف اس لئے بتائی گئی تھی کہ آپ اپنی ذات کی حد تک اس علم کو محدود رکھیں تو یہ ایک بےکار کام تھا کیونکہ فرائضِ نبوت کی ادائیگی میں اِس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ اس لئے صرف ایک بےوقوف آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تشریحی علم سرے سے کوئی تشریعی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خود سورۂ نحل آیت ۴۴ میں فرمایا ہے وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ۔ "اور اے نبی، یہ ذکر ہم نے تم پر اس لئے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو اُن کے لئے اُتاری گئی ہے" (تشریح کے لئے ملاحظہ ہو

تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۴۰)۔ اور قرآن میں چار جگہ اللہ تعالیٰ نے صراحت فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف کتاب اللہ کی آیات سنا دینا ہی نہ تھا بلکہ اس کتاب کی تعلیم دینا بھی تھا۔ (البقرہ، آیات ۱۲۹ و ۱۵۱۔ آل عمران، ۱۶۴۔ الجمعہ، ۲۔ ان سب آیات کی تشریح ہم "سنت کی آئینی حیثیت" میں صفحہ ۷۴ سے ۷۷ تک تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں)۔ اس کے بعد کوئی ایسا آدمی جو قرآن کو مانتا ہو اس بات کو تسلیم کرنے سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کی صحیح و مستند، بلکہ فی الحقیقت سرکاری تشریح صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے فرما دی ہے کیونکہ وہ آپ کی ذاتی تشریح نہیں ہے، بلکہ خود قرآن کے نازل کرنے والے خدا کی بتائی ہوئی تشریح ہے۔ اس کو چھوڑ کر یا اس سے ہٹ کر جو شخص بھی قرآن کی کسی آیت یا اس کے کسی لفظ کا کوئی من مانا مفہوم بیان کرتا ہے وہ ایسی جسارت کرتا ہے جس کا ارتکاب کوئی صاحب ایمان آدمی نہیں کر سکتا۔

ثالثاً قرآن کا سرسری مطالعہ بھی اگر کسی شخص نے کیا ہو تو وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جنھیں ایک عربی داں آدمی محض قرآن کے الفاظ پڑھ کر یہ نہیں جان سکتا کہ ان کا حقیقی مدعا کیا ہے اور ان میں جو حکم بیان کیا گیا ہے اس پر کیسے عمل کیا جائے۔ مثال کے طور پر لفظ صلوٰۃ ہی کو لے لیجئے۔ قرآن مجید میں ایمان کے بعد اگر کسی عمل پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے تو وہ صلوٰۃ ہے لیکن محض عربی لغت کی مدد سے کوئی شخص اس کا مفہوم تک متعین نہیں کر سکتا۔ قرآن میں اس کا ذکر بار بار دیکھ کر زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ عربی زبان کے اس لفظ کو کسی خاص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مراد غالباً کوئی خاص فعل ہے جسے انجام دینے کا اہل ایمان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن صرف قرآن کو پڑھ کر کوئی عربی داں یہ طے نہیں کر سکتا کہ وہ خاص فعل کیا ہے اور کس طرح اسے ادا کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے بھیجنے والے نے اپنی طرف سے ایک معلّم کو مقرر کر کے اپنی اس اصطلاح کا مفہوم اسے ٹھیک ٹھیک نہ بتایا ہوتا اور صلوٰۃ کے حکم کی تعمیل کرنے کا طریقہ پوری وضاحت کے ساتھ اسے نہ سکھا دیا ہوتا تو کیا صرف قرآن کو پڑھ کر دنیا میں کوئی دو مسلمان بھی ایسے ہو سکتے تھے جو حکم صلوٰۃ پر عمل کرنے کی کسی ایک شکل پر متفق ہو جاتے؟ آج ڈیڑھ ہزار برس سے مسلمان نسل در نسل ایک ہی طرح جو نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں، اور دنیا کے ہر گوشے میں کروڑوں مسلمان جس طرح نماز کے حکم پر یکساں عمل کر رہے ہیں، اس کی وجہ یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف قرآن کے الفاظ ہی وحی نہیں فرمائے تھے بلکہ ان الفاظ کا مطلب بھی آپ کو پوری طرح سمجھا دیا تھا اور اسی مطلب کی تعلیم آپ ان سب لوگوں کو دیتے چلے گئے جنھوں نے قرآن کو اللہ کی کتاب اور آپ کو اللہ کا رسول مان لیا۔

رابعاً قرآن کے الفاظ کی جو تشریح اللہ نے اپنے رسولؐ کو بتائی اور رسولؐ نے اپنے قول اور عمل سے اس کی جو تعلیم امت کو دی، اس کو جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث و سنت کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جو حضورؐ کے اقوال و افعال کے متعلق سند کے ساتھ اگلوں سے پچھلوں تک منتقل ہوئیں۔ اور سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو حضورؐ کی قولی و عملی تعلیم سے مسلم معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں رائج ہوا، جس کی تفصیلات معتبر روایات سے بھی بعد کی نسلوں کو اگلی نسلوں سے ملیں اور بعد کی نسلوں نے اگلی نسلوں میں اس پر عملدرآمد ہوتے بھی دیکھا۔ اس ذریعۂ علم کو قبول کرنے سے جو شخص انکار کرتا ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ فرما کر قرآن کا مطلب اپنے رسول کو سمجھا دینے کی جو ذمہ داری لی تھی اسے پورا کرنے میں معاذ اللہ وہ ناکام ہو گیا، کیونکہ یہ ذمہ داری محض رسولؐ کو ذاتی حیثیت سے مطلب سمجھانے کے لئے نہیں لی گئی تھی، بلکہ اس غرض کے لئے لی گئی تھی کہ رسولؐ کے ذریعہ سے امت کو کتاب الٰہی کا مطلب سمجھایا جائے اور حدیث و سنت کے ماخذِ قانون ہونے کا انکار کرتے ہی آپ سے آپ یہ لازم آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرسکا ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔ اس کے جواب میں جو شخص یہ کہتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں گھڑ بھی تو لی تھیں، اُس سے ہم کہیں گے کہ حدیثوں کا گھڑا جانا خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آغازِ اسلام میں پوری امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کو قانون کا درجہ دیتی تھی۔ ورنہ آخر گمراہی پھیلانے والوں کو جھوٹی حدیثیں گھڑنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ جعل ساز لوگ وہی سکے تو جعلی بناتے ہیں جن کا بازار میں چلن ہو۔ جن نوٹوں کی بازار میں کوئی قیمت نہ ہو انھیں کون بیوقوف جعلی طور پر چھاپے گا؟ پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ اِس اُمت نے اوّل روز سے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذات پاک ؐ کے اقوال و افعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے اور جتنا جتنا غلط باتوں کے اُس ذات ؐ کی طرف منسوب ہونے کا خطرہ بڑھتا گیا اُتنا ہی اِس اُمت کے خیرخواہ اس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے چلے گئے کہ صحیح کو غلط سے ممیز کیا جائے۔ صحیح و غلط روایات کی تمیز کا یہ علم ایک بڑا عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایجاد نہیں کیا ہے۔ سخت بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس علم کو حاصل کئے بغیر مغربی مستشرقین کے بہکائے میں آکر حدیث و سنت کو ناقابلِ اعتبار ٹھیراتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اپنی اس جاہلانہ جسارت سے وہ اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

محبت فاتح عالم — مولانا ابوالحسن علی ندوی — -/25
پاجا سراغِ زندگی — " — 4/-
ذکر خیر — " — 3/-
باب رحمت — " — 1/25
مشعلِ راہ — مولانا عبدالرؤف عالی — 5/-
جمالِ مصطفےٰ (مجموعۂ نعت) دررد قریشی — 1/-
عقیدت کے پھول " مختلف شعراء — -/60
الفاروق عکسی مجلد مع کور — 10/-
کلیات شکیل بدایونی مجموعۂ کلام — 8/-
صہبائے خیال مجموعۂ کلام عاصم بریلوی — 6/-
لفظوں کا سفر " جمیل احمد آبادی — 6/-
انکشاف بجواب زلزلہ — 6/-
تاریخ ادب اُردو — ڈاکٹر نذیر احمد — 5/-
مذہب افیم ہے؟ (اُردو) سید قطب شہیدؒ — 1/25
اقلیتوں کے حقوق اسلامی ریاست میں " — 2/30

اسلام کا روشن مستقبل۔ سید قطب شہیدؒ — 2/25
دھرتی پر انسان — عبدالقادر عودہ شہیدؒ — 1/-
روحِ توحید — حسن البناء شہیدؒ — -/90
خطباتِ حرم — مولانا ابوالاعلیٰ مودودی — -/90
فضائلُ القرآن " (درس حدیث) — 2/50
کتابُ الصّوم " — 6/-
تہذیب کی جدید تشکیل مجلد — مولانا تقی امینی — 20/-
اساس تہذیب — ڈاکٹر سید عبداللطیف — 10/-
اساس تہذیب اسلامی " — 10/-
بنیادی تصورات قرآن — ابوالکلام آزادؒ — 5/50
محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ۔ مرتبہ صفی الرحمٰن — 4/50
مہرِ نبوت — قاضی سلیمان منصور پوری — 1/60
پیامِ انسانیت — مولانا عبدالحق علی ندوی — 2/50
مقامِ انسانیت " " — 2/-

مکتبہ تجلّی۔ دیوبند (یو۔پی)

مولانا مودودی اور مسئلہ طلاق • جنت کا محلِ وقوع اور نظریۂ ارتقاء • مسجد میں کسی اور کی زمین • جماعتِ تبلیغی • آپس کی باتیں • جاہل کی امامت • بریلویوں کی فتنہ گری • نئے درود • شریعت حقیقت طریقت معرفت • وراثت کا اہم ترین مسئلہ • داڑھی کا مسئلہ۔

تجلّی کی ڈاک

مولانا مودودی اور مسئلہ طلاق

سوال:- از۔ نظام محمد صالح۔

"طلاقِ ثلٰثہ در مجلسِ واحدہ" کے مسئلے میں تجلّی کے "نقد و نظر نمبر" اور "طلاق نمبر" میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے بہت خوب لکھا ہے۔ آپ نے جہاں جماعت اسلامی والوں مثلاً مولانا شمس پیرزادہ اور مولانا حامد علی صاحب کو ان کے امیر مولانا مودودی کی "تفہیم القرآن" نہ دیکھنے کی شکایت کی وہیں آپ مولانا مودودی کی کتاب "حقوق الزوجین" کے مطالعہ کی رائے دیتے اور خود بھی ایک نظر ڈال لیتے تو مذکورہ شماروں میں آپ کو مزید تقویت مل جاتی۔ بہرحال مجھے "حقوق الزوجین" سے جو خلش پیدا ہوتی ہے امید ہے اُس کو دُور کریں گے۔

مولانا مودودی نے "حقوق الزوجین" میں "تطلیقاتِ ثلٰثہ در مجلسِ واحدہ" کا عنوان دے کر جو کچھ لکھا ہے اس کے تحت ذیل کی باتیں توضیح طلب ہیں:-

(۱) مذکورہ مضمون میں ایک روایت آئی ہے کہ حضرت عمرؓ تین یکجائی طلاق دینے والے کو دُرّے مارتے تھے۔
یہ روایت فن کے اعتبار سے کیسی ہے؟

اور اگر مذکورہ روایت صحیح ہے تو کیا ایک وقت میں تین طلاق دینے والے کو دُرّے لگانا بدعت نہ ہو؟

(۲) مولانا مودودی کی رائے کے مطابق ایک وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کرنے پر پابندیاں عائد کرنا (جب کہ حضورؐ نے ایسا نہ کیا) اور عدالت میں عورت کا جانا اور ہرجانہ کی مقدار کم از کم مہر کی نصف مقدار تک مقرر کرنا وغیرہ بدعت نہ ہوا؟

جواب:-

آپ کے لکھنے پر میں نے "حقوق الزوجین" دیکھی۔ جون ۱۹۶۳ء میں مرکزی مکتبۂ اسلامی (دہلی) نے جو اس کا ایڈیشن چھاپا ہے وہی میرے سامنے ہے۔ اس میں "تطلیقاتِ ثلٰثہ در مجلسِ واحدہ" کے زیرِ عنوان بھی اور شروع میں

لاق" کے زیرِ عنوان بھی دہی سب کچھ لکھا گیا ہے جسے
ق ثانی ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ مولانا مودودی
ے مفکرِ اسلام سے یہی توقع کی بھی جاسکتی تھی کہ وہ اجماعِ
ت کے ساتھ چلیں گے۔ البتہ ذیلاً ایک معمولی سی
ل ان سے ضرور ہوگئی ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے تحریر
ایا — "بیک وقت تین طلاقوں کے بدعت و معصیت
رنے میں کسی کو اختلاف نہیں۔"

یہ بات مطابقِ واقعہ نہیں ہے۔ امام شافعی اسے
ت و معصیت نہیں مانتے بلکہ صرف خلافِ اولیٰ
ال کرتے ہیں اور ابن حزم تو خلافِ اولیٰ بھی نہیں مانتے
ہ اسے عین طلاقِ سنت کہتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد ہم آپ کے سوالوں کا جواب
ن کرتے ہیں:—

۱) یہ روایت صحیح ہے۔

۲) "بدعت" کا اصطلاحی مفہوم سمجھ لیجئے۔ بدعت
ن نئے کام کو کہتے ہیں جو دین و شریعت میں نکالا
ئے اور اس سے ثواب کی توقع کی جائے۔ حضرت عمرؓ
ا یہ فعل (یعنی درّے مارنا) عبادتی نوع کا فعل نہیں تھا
ن پر سنت و بدعت کی بحث کھڑی ہو، بلکہ حاکمانہ فعل
ا جس کا تعلق انتظامی اور تربیتی مصالح سے ہوتا ہے۔
ادہ اس کے یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو چکا کہ حضرت عمرؓ
ن یکجائی طلاقیں دینے کو گناہ کا کام سمجھتے تھے لہٰذا کسی
کب گناہ کو بطور تادیب و تنبیہ چند کوڑے وہ مار دیں تو
ن پر اعتراض کیا۔ ہاں یہ وہ بھی جانتے تھے کہ باوجود
ناہ ہونے کے تین یکجائی طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اس
ے یہ ان کے بس میں نہیں تھا کہ مطلقہ کو پھر سے شوہر کے
اتھ چپکا دیں۔

۳) قتل یا چوری یا رشوت ستانی جرائم اور معاصی
ں داخل ہیں۔ ان کی روک تھام کے لئے آخر دینی ور
یا دونوں کے کچھ نہ کچھ قوانین موجود ہیں اور ان قوانین
ہ باوجود لوگ ان کے مرتکب ہو جائیں تو انھیں سزا بھی

بھی دی جاتی ہیں۔ ایسا ہی معاملہ تین یکجائی طلاقوں کا سمجھئے۔
قتلِ ناحق اگرچہ حرام ہے مگر وہ واقع بہرحال ہو جاتا ہے اسی
طرح بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالنا گناہ ہے مگر بہرحال
اس گناہ کا ارتکاب تین طلاقیں ڈال دیتا ہے لہٰذا کیا
الجھن ہے اگر مسلمانوں کے اربابِ حلّ و عقد کچھ ایسی پابندیوں
کی تجویز پیش کریں جن کی موجودگی میں یہ گناہ کم سے کم واقع ہو
اور واقع ہو ہی جائے تو گناہ گار کو تھوڑی سی سزا بھی ملے۔

حضورؐ نے ایسا نہیں کیا اس کا ذکر اِس موقعہ پر بے محل
ہے۔ وہؐ اس مسئلہ میں خدا کی پسند و ناپسند کی وضاحت فرما
گئے اب امت اپنے زمانوں اور حالات کی مطابقت
سے اس وضاحت کو رُوبکار لانے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ
ایسا ہی ہے جیسے انتظامی اور عسکری معاملات میں بے شمار
ایسے کام حضرت عمرؓ نے انجام دیئے جنھیں حضورؐ نے انجام
نہیں دیا تھا۔ فلاں مقام سے فلاں مقام تک حضورؐ نے
پکی سڑک نہیں بنوائی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی امتی
بھی اس سڑک کو پختہ نہ کرے۔

حضورؐ کے زمانے میں شاذونادر ہی کوئی مسلمان ایسا
ہو سکتا تھا جو کسی بھی مسئلے میں اللہ اور رسولؐ کی پسند سے
واقف ہو جانے کے بعد اس کے خلاف روش اختیار کرتا
حضرت عمرؓ کے صاحب زادے نے اپنی زوجہ کو حالتِ حیض
میں ایک طلاق دی تو اس کی وجہ مسئلہ کے بارے میں غلط
فہمی تھی۔ پھر جب حضورؐ نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا تو کیا
مجال کہ ابن عمر کبھی نافرمانی کے مرتکب ہوں۔ اسی طرح اور
بھی کسی صحابی نے بیک وقت تین طلاقیں حضورؐ کے زمانے
میں دی ہیں تو ازراہِ غلط فہمی دی ہیں۔ جب حضورؐ نے ظاہر
فرمادیا کہ ایسا کرنا بری بات ہے تو یہ اظہار ہی اس کے لئے
کافی ہو گیا کہ مسلمان رُک جائیں۔ حضورؐ خود ہی قاضی بھی
تھے، حاکم بھی۔ خدا کے رسولؐ بھی اور بیک وقت تین طلاقیں
دے ڈالنا ان کے زمانے میں کوئی مستقل مسئلہ اور فتنہ نہیں
بنا تھا۔ اب بعد میں جب یہ مسئلہ اور فتنہ بن گیا ہے تو علمائے
حق کے لئے یہ فکر بھی روا ہے کہ دائرۂ شریعت میں رہتے

ہوئے ایسے ضابطے تجویز کریں جو اس باب میں مفید ثابت ہوں۔ علمائے امت اگر یہ کہتے ہیں کہ تین یکجائی طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس روش سے پرہیز کرنا چاہیئے اور ایک وقت میں ایک ہی طلاق دینی چاہیئے لہذا مولانا مودودی نے اپنی صواب دید کے مطابق جو تجاویز پیش کی ہیں وہ بے محل نہیں ہیں۔

(۴) خلع کے تعلق سے آپ نے جو متعدد سوالات کئے ہیں انھیں ہم نے ازراہِ اختصار حذف کر دیا۔ "خلع" طلاق ہی کی ایک قسم ہے۔ عورت کی طلب پر جو طلاق دی جائے اسے "خلع" کہتے ہیں۔ مرد اگر طلاق دینے پر راضی نہ ہو اور قاضی یہ سمجھتا ہو کہ عورت طلاق طلب کرنے میں حق بجانب ہے تو خود قاضی فیصلہ نافذ کرے گا کہ عورت کو آزاد کر دیا جائے۔ اس فیصلے سے طلاقِ بائن واقع ہو گی یعنی شوہر رجوع نہیں کر سکتا البتہ بیوی راضی ہو تو دوبارہ اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ قاضی کے کہنے پر اگر مرد ایک طلاق دیگا تو وہ بھی طلاقِ رجعی نہ ہو گی۔ تین طلاقیں دینے پر اسے قاضی مجبور نہیں کر سکتا نہ اس کی ضرورت ہے۔ ایک ہی طلاق اس مقصد کو پورا کر دیتی ہے جس کی خاطر عورت مقدمہ لائی ہے۔ ہاں اگر عام حالات کی طرح یہاں بھی ایک طلاق سے رجوع کی اجازت مرد کو مل جاتی تو مقصد فوت ہو جاتا اس لئے یہ ایک ہی طلاق شریعت نے بائن قرار دی ہے۔

جنت کا محلِ وقوع اور نظریۂ ارتقاء

سوال:- (ایضاً)

ایک سوال یہ ہے کہ "جنت کا محلِ وقوع" سے متعلق تجلی کے "نظریہ ارتقاء" نمبر میں آپ نے ثابت کیا ہے کہ جنت زمین پر اونچی چوٹی پر نہیں بلکہ حضرت آدمؑ اسی جنت میں تھے جسے جنتِ ماویٰ کہتے ہیں۔ لیکن مولانا مودودی نے "رسائل و مسائل" حصہ اول تا چہارم کے کسی حصے میں یہ بتایا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جس جنت میں تھے وہ زمین پر اونچی پہاڑی کے سرے پر واقع تھی۔ آپ اس سلسلے میں صحیح معاملہ بتایئے۔

"نظریۂ ارتقاء" سے متعلق عرض ہے کہ جہاں فوزان صاحب نے مسلمانوں کے نام نہاد نظریہ ارتقاء کو ماننے سے متعلق عالموں کی فہرست دی تھی وہیں ہم نے برق کی کتاب "دو قرآن" کا حوالہ دے کر سوال پوچھا تھا جسے آپ نے بذریعہ خط جواب دیا تھا کہ برق صاحب خرافات کہتے ہیں۔ اب مزید مطالعہ سے پتا چلا ہے کہ مولانا رومؒ نے بھی کہیں شاعری میں نظریہ ارتقاء کے متعلق کہا ہے ملاحظہ ہو "گیتا اور قرآن" (از پنڈت سندر لال) کیا مولانا رومؒ بھی نظریۂ ارتقاء کو مانتے تھے؟

جواب:-

مولانا مودودی کی کتاب "رسائل و مسائل" مارکیٹ میں موجود ہے۔ اس کے تمام حصوں کا مطالعہ کر کے آپ اطلاع دیتے کہ انھوں نے کہاں کیا لکھا ہے تب بات بنتی۔ ہم اس مسئلہ کو کوئی قابلِ ذکر مسئلہ ہی نہیں سمجھتے۔ وہ تو نظریۂ ارتقاء کی بحث کے ضمن میں مجبوراً ہمیں اس پر گفتگو کرنی پڑی ورنہ اس طرح کے مسائل میں وقت کھپانا ہمارے نزدیک وقت کا صحیح استعمال نہیں ہے۔ مولانا مودودی کی یا فلاں اور فلاں کی جو بھی رائے ہو ہوا کرے۔ وہ اپنی رائے میں خوش ہم اپنی رائے میں خوش ہاں "نظریۂ ارتقاء" کا یہ معاملہ نہیں۔ وہ ایک ذہنی گمراہی اور صریح بدعقیدگی ہے۔ اسی لئے اس پر ہم نے شرح و بسط سے کلام کیا ہے۔

شاعری عموماً عقائد کا مظہر نہیں ہوا کرتی کوئی بھی شاعر خواہ کتنا ہی بڑا ہو اسے کم سے کم شاعری کے دائرے میں فقیہ اور مفتی کا درجہ نہیں دیدینا چاہیئے مولانا روم نے نظریۂ ارتقاء کے متعلق کیا کہا ہے اس کا پتا اس وقت چلتا جب آپ ان کے متعلقہ اشعار بھی نقل فرما دیتے۔ آپ نے تو محض "گیتا اور قرآن" کا حوالہ

دے دیا۔ ہم کہاں تک حوالے کی کتابیں مہیا کرتے پھریں۔
اس کتاب میں اگر اس کے مصنف پنڈت سندر لال نے
یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا روم بھی نظریۂ ارتقاء کے قائل
تھے تو ضروری نہیں کہ وہ مولانا روم کو سمجھے بھی ہوں۔
بہتیرے فنکار دوسروں کے شعروں سے ایسے ایسے
مطالب اخذ کرلیتے ہیں کہ خود شاعر کے حاشیۂ خیال
تک میں ان کا وہم نہیں گذرتا۔ مولانا روم سے یہ توقع
نہیں کی جاسکتی کہ وہ قرآن کو نظر انداز کرکے ایک
برعکس اور واہی نظریہ کو سینے سے لگالیں گے لیکن اگر کسی کو
اصرار ہی ہو کہ انھوں نے ایسا کیا ہے تو بہرحال ان کا
کوئی قول و فعل دین میں حجت تو ہے نہیں۔ وہ بھی ایک
انسان ہی تھے غلطیاں کرسکتے تھے۔ حجت صرف خدا اور
رسولؐ کے ارشادات ہیں یا پھر علمائے امت کے
اجماعی فیصلے۔ اجماعی فیصلے بھی اسی لئے حجت ہیں کہ
ان سے اللہ اور رسولؐ کی مرضی کا سراغ لگتا ہے ورنہ
انسانوں کی کوئی بھیڑ مجرد اپنی ذاتی حیثیت میں حجت نہیں ہے

مسجد میں کسی اور کی زمین

سوال: ۔ از ۔ عمر اقدس جیلانی ۔ در بھنگہ (بہار)

میری بستی کے قریب ایک دوسرے گاؤں میں
ایک مسجد بنائی گئی ہے جس کا تھوڑا سا حصہ غلطی سے
ایک ہندو کی زمین آگیا ہے۔ بعد میں جب زمین کی
پیمائش ہوئی تو یہ بات معلوم ہوئی۔ اب اس ہندو
سے کہا جاتا ہے کہ تم اس زمین کی قیمت لے لو کیونکہ تمھاری
زمین میں مسجد بنانی جائز نہیں۔ مگر وہ نہیں لیتا۔ کہتا ہے
جیسا بھگوان آپ کا ویسا میرا۔ جیسا مندر ویسی مسجد۔
پھر میں کیوں قیمت لوں۔ میں نے وہ زمین مسجد کو دیدی
لوگ اسے ڈراتے ہیں۔ مقدمہ کرنے کی دھمکی دیتے ہیں
تب بھی نہیں مانتا بلکہ مقدمہ لڑنے کو تیار ہے۔ بتائیے
اب کیا کیا جائے۔ کیا مسجد توڑ دی جائے؟
براہ کرم اس الجھے ہوئے مسئلے کو کسی نزدیک کے
شمارے میں جگہ دے کر ہم لوگوں کی پریشانی کو دور کریں
شکریہ کا موقع دیں۔

جواب: ۔

اس ہندو بھائی سے اس زمین کا باقاعدہ ہبہ نامہ
لکھوالیا جائے۔ باقاعدہ سے مراد ہے پختہ کاغذ پر قانو
وقت کا پورا لحاظ کرتے ہوئے۔ الفاظ ایسے ہوں جن
بعد کسی کے لئے قانوناً یہ گنجائش نہ رہ جائے کہ اس حصہ
زمین پر دعویٰ کرسکے۔ اگر یہ ہندو بھائی ایسا کاغذ لکھ
دیتے ہیں تب تو مسجد کو جوں کا توں رکھا جائے۔ کوئی قباح
اس میں باقی نہیں رہتی ہے۔
لیکن اگر یہ ایسا کاغذ لکھنے سے گریز کریں اور فق
زبانی اطمینان دہانی فرمائیں تو اس کا اعتبار نہیں مس
کا اتنا حصہ توڑ کر زمین خالی کردینی چاہئے اور دیوار
بنانی چاہئے جہاں زمین کا کوئی نزاع نہ ہو۔ شرعی حکم
ہے کہ کسی کی زمین میں اگر بلا اجازت مسجد بنالی ہے تو ا
ڈھادینا چاہئے۔ مالک زمین اپنی رضامندی اور ہبہ نا
لکھدے تب اسے قائم رکھنے کا جواز ہے۔
اور یاد رکھئے یہ حکم غیر مسلم ہی کی زمین میں منحصر نہیں
مسلمان کی زمین پر بھی اس کی اجازت کے بغیر مسجد نہ
بنائی جاسکتی۔ اگر بنالی گئی اور اس نے اعتراض کیا تو ا
توڑنا ہوگا۔

جماعت تبلیغی

سوال: ۔ از ۔ وارث ریاضی مغربی چمپارن

میرے علاقہ کے ایک صاحب جن کا تعلق موجود
جماعت تبلیغ سے ہے وہ اپنی جماعت کے اکابرین کے
حوالہ سے فرماتے ہیں کہ: ۔
"جو علماء عملی طور پر جماعت تبلیغ سے وابستہ
یا اس جماعت کی "مجلس شوریٰ" میں شریک ہو کر جما
کے افراد کو نیک مشورے دیتے ہیں یا کم از کم اس جما

کے طریق کار سے اتفاق رکھتے ہیں اور جماعت کی کامیابی
کے لئے دعائیں کرتے ہیں وہی علماء حق ہیں۔"

آنجناب کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ جماعت اسلامی، دیوبند اور ندوہ کے علماء واکابر کو جماعت تبلیغ کے طریق کار سے کلیتہً اتفاق ہے چونکہ اس جماعت کا طریق کار عین سنت کے مطابق ہے اور امت مسلمہ کی اصلاح کے لئے مفید و موثر ہے۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیل سے جواب دیا جائے کہ کیا واقعی جو علماء عملاً جماعت تبلیغ سے وابستہ ہیں یا اس کے طریق کار سے اتفاق رکھتے ہیں وہی علمائے حق ہیں اور جو علماء اس جماعت سے وابستگی نہیں رکھتے یا اس کے طریق کار سے ان کو اتفاق نہیں وہ علماء سوء ہیں؟

کیا گھر بار کو اللہ کے حوالے کر کے قریہ قریہ، شہر شہر گھوم گھوم کر اسلام کے چند مخصوص احکام یعنی چھ باتوں کی دعوت دینا ہی اصل تبلیغ ہے؟ کیا یہ طریق تبلیغ عین سنت کے مطابق ہے؟ اور کیا اس طریق تبلیغ سے اکابر علماء حق کو کلیتہً اتفاق ہے؟۔

جواب:۔

جماعت تبلیغی کے بارے میں ہم وقتاً فوقتاً اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔

کسی صاحب کے جو فقرے آپ نے نقل فرمائے ان پر کچھ کہنا تو ایک فضول ولایعنی بحث میں وقت ضائع کرنا ہے۔ یہ فقرے کوئی ذمہ دار عالم تو کہہ نہیں سکتا البتہ ایسے لوگ یقیناً کہہ سکتے ہیں جن کا علم برائے نام اور عقل برائے بیت ہو۔

ہمیں جہاں تک معلوم ہے جماعت اسلامی اور ندوہ و دیوبند کے بہتیرے علماء کو جماعت تبلیغی کے طریق کار سے بنیادی اختلاف ہے۔ وہ برسر عام چاہے اسکی مخالفت نہ کریں لیکن اس کی تائید و حمایت بھی کبھی نہیں کرتے اور اس کے طریقے پر کام کرتے ہوئے بھی انھیں کبھی نہیں دیکھا گیا۔

بہرحال صحیح تر نقطۂ نظر یہ ہے کہ جماعت اسلامی، جماعت تبلیغی اور ندوہ و دیوبند کے علماء سبھی اپنے اپنے طور پر دین وملت کی خدمت میں کوشاں ہیں۔ ان میں کوئی نہیں جو اخلاص اور حسن نیت سے خالی ہو۔ یہ سب قرآن وسنت پر ایمان رکھتے ہیں، اسلام کے بنیادی عقائد کی حد تک یہ ایک دوسرے سے متفق ہیں اور ایسی کوئی بات ان میں نہیں پائی جاتی جس کی بنا پر کسی ایک کو ہدایت یافتہ اور دوسرے کو گمراہ قرار دیا جاسکے۔ البتہ سوچنے کا انداز سب کا یکساں نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتا اللہ تعالیٰ نے انسانی شکلوں کی طرح انسانی ذہنوں میں بھی رنگا رنگی پیدا کی ہے۔

ہر دماغ کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں جیسے کہ ہر چہرے کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں۔ ہر ذہن کا الگ سانچا ہے۔ اس فرق کی بنا پر قدرتی بات ہے کہ غور و فکر کا اسلوب اور استدلال کا طریق بھی جدا جدا ہو۔ پھر علم و فہم کا یکساں نہ ہونا بھی مزید رنگارنگی پیدا کرتا ہے۔ ایک شخص محض حافظ قرآن ہے اور تھوڑی سی اردو فارسی کے سوا اس نے کچھ نہیں پڑھا۔ اس کی نظر بھلا ان گہرائیوں تک کہاں جا سکتی ہے جن گہرائیوں تک کسی ایسے شخص کی نظر جاسکتی ہے جس نے قرآن کو سمجھا بھی ہو، حدیث کے معانی ومطالب تک بھی رسائی حاصل کی ہو اور فقہائے کرام کے فرمودات بھی اس کے مطالعے میں آئے ہوں۔ ان دونوں کے طرز فکر، طریق استدلال اور صلاحیتوں میں یکسانی کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر جہالت اور علم دونوں کے بے شمار درجے ہیں اور اسی طرح فہم و دراست اور سوجھ بوجھ کے بھی بے شمار اسٹیج ہیں اسی لئے ازل سے آج تک یہی ہوتا آیا ہے اور قیامت تک یہی ہوتا رہے گا کہ حسن نیت اور اخلاص وللہیت کے باوجود لوگ بہتیرے معاملات و مسائل میں ایک دوسرے سے مختلف آراء قائم کریں اور

طریقِ کار ہی میں نہیں اصول و مبانی میں بھی ان کے مابین اچھا خاصا اختلاف ہو۔

جب فطری اور قدرتی صورتِ حال یہ ہے تو کس طرح یہ بات جائز ہو سکتی ہے کہ کوئی بھی جماعت یہ تصور کرنے لگے کہ حق صرف ہمارے اندر منحصر ہے اور جو لوگ ہمارے دائرے سے باہر ہیں یا ہم سے متعدد امور میں اتفاقِ رائے نہیں رکھتے وہ گمراہ ہو چکے ہیں۔ یہ تصور دراصل ایک بیماری ہے جسے کینسر اور تپ دق جیسا مہلک سمجھنا چاہیئے۔ جماعتِ تبلیغی ہو، جماعتِ اسلامی ہو، علمائے دیوبند ہوں، علمائے اہلِ حدیث ہوں۔ ان سب کے دلوں اور ذہنوں میں توسع ہونا چاہیئے۔ رواداری اور فراخی ہونی چاہیئے۔ احساسِ ذمہ داری اور سنجیدگی ہونی چاہیئے۔ اختلافی مسائل میں یہ جتنا چاہے زور باندھیں۔ اپنے اپنے مسالک کے لئے دلائل کا انبار لگائیں، دوسرے مسالک کے رد میں سرگرمی دکھائیں لیکن اس علمی جنگ کو بغض و عناد اور منافرت کے حدود میں داخل نہیں ہونا چاہیئے اور مجموعاً کسی کے خلاف بد دینی اور گمراہی کے فیصلے صادر نہیں کرنے چاہئیں۔

ہمارے نزدیک تبلیغی جماعت کا طریق کار مفاسد سے خالی نہیں ہے اور اس کے طرزِ فکر میں بھی ضرر رساں اجزا ملے ہوئے ہیں مگر ہم یہ کبھی نہ کہیں گے کہ یہ جماعت دائرۂ حق سے باہر ہو گئی اور حق پرستی کا سارا ٹھیکہ ہمارے حصّے میں آگیا۔ ہم جماعتِ اسلامی کے پرانے حامیوں میں ہیں لیکن یہ کبھی ہم نے نہیں کہا اور جماعتِ اسلامی والے بھی ہرگز یہ نہیں کہتے کہ حق پرست صرف وہ ہے جو جماعتِ اسلامی میں داخل ہو گیا اور جماعتِ اسلامی سے باہر رہنے والے یا اس کی مخالفت کرنے والے گمراہ ہیں۔ باطل پسند ہیں، بد دین ہیں۔

آپس کی باتیں

سوال:۔ از۔ اے۔ اے سعید۔ ابو ذہبی۔

تجلی کا طلاق نمبر ملا۔ بہت خشک ہے۔ مگر آپ کو اس کے لئے کافی محنت کرنی پڑی ہے۔ اللہ جزائے خیر دے۔ خشک تجلی کے اس طلاق نمبر میں تراوٹ کی آپ نے پوری کوشش ضرور کی ہے مگر آپ برا نہ مانیں تو کہدوں کہ آپ نے جہاں بھی موقع ملا ان مقالہ نگاروں کی وہ درگت بنائی ہے کہ بے چارے زندگی بھر آپ کے الفاظ کی چبھن بھول نہ سکیں گے۔ میں آپ پر یہ الزام لگانے کی جرأت تو نہیں کر سکتا کہ آپ نے دراصل اپنے پرچہ کی خشکی کو ختم کرنے کے لئے اس انداز کو اختیار کیا ہے۔

پہلے ہی دین اور دینی تعلیم سے ملت دور ہو رہی ہے اور ہماری بانجھ قوم میں بہت کم قومی، ملی اور دینی درد رکھنے والے اصحاب باقی رہ گئے ہیں۔ اگر ان کے تعلق سے بھی آپ ہم نوجوانوں کے اذہان میں شکوک پیدا کریں تو پھر ہماری مایوسی میں اضافہ ہی ہوگا۔

جواب:۔

اگر ہمارے نزدیک کاروباری منفعت کو اوّلین اہمیت حاصل ہوتی تو یقین کیجئے کہ ایسا خشک نمبر کبھی نہ نکالتے کیونکہ عام برادرانِ ملت کے لئے اس طرح کی علمی و فنی بحثوں کا خشک ہونا مسلمات میں سے ہے۔ پھر آپ تو ماشاء اللہ جوان آدمی ہیں۔ جوانی میں اس طرح کی بحثیں اور بھی غیر دلچسپ محسوس ہوتی ہیں لیکن ہم اپنے اُس فریضے کو کیا کریں جسے ہم نے ہر دوسری شے پر ترجیح اور اہمیت دے رکھی ہے۔ یہ فریضہ ہے نقد و نظر کی وہ کاوش جسے ہمارے ہم عصروں میں دوسرے اہلِ حضرت عموماً نظر انداز ہی کئے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی گفتگو طلب مسئلہ ہمارے سامنے آئے اور اس کا تعلق علومِ دینیہ سے ہو تو ہم پر واجب ہو جاتا ہے کہ جس بات کو حق سمجھیں اسے دلائل و براہین کے ساتھ کہہ ڈالیں۔

یہ خیال آپ کا درست نہیں کہ ہم نے خشکی دور کرنے کی خاطر مقالہ نگاروں کی درگت بنائی ہے۔ اگر واقعی درگت جیسی کوئی چیز ہماری موشگافیوں میں

پائی جارہی ہے تو ایسے ارادی و اختیاری نتنے تصور نہ فرمائیے۔ ہمارا استمرار اور عام طرزِ تحریر یہی ہے یہی تجلی کے قائل آپ دیکھیں تو اسی قسم کی دُرگست کے بے شمار نمونے آپ کو ملتے چلے جائیں گے۔ بات کو چبا چبا کر کہنے کا فن ہمیں نہیں آتا۔ باطل و فاسد افکار سے مفاہمت و مصالحت ہمارے بس کا روگ نہیں۔ جو کچھ کہنا ہوتا ہے کھل کر کہتے ہیں، بے کم و کاست کہتے ہیں، زورِ قوت کے ساتھ کہتے ہیں۔ یہ صاف گوئی اگر تلخ و تند لہجے اور نکیلے الفاظ کے جامے میں رونما ہوتی ہے تو اس پر ہمیں فخر نہیں، گھمنڈ نہیں، اسے ہم ہنر اور کمال نہیں سمجھتے بلکہ اپنی خامی اور بے سلیقگی تصور کرتے ہیں۔ مگر ضروری تو نہیں کہ آدمی اپنی ہر خامی کو دور کرنے پر قادر ہی ہو۔ یہ خامی ہم قبر میں ساتھ لے کر جائیں گے اور باری تعالیٰ کے نزدیک بھی اگر یہ واقعتہً خامی ہوئی تو اس پر ہم سے باز پرس بھی ہوگی۔ واللہ عفوٌ غفور۔

جب ہمارے احساسات کا یہ عالم ہے تو آپ یا کوئی بھی ہمیں اس رخ سے جو چاہے کہہ دے ہمیں برا ماننے کی کیا ضرورت۔ بہ شوق آپ اس سے بھی زیادہ کچھ کہیں جتنا آپ نے کہا ہے ہم جواباً یہ مصرعہ پڑھیں گے کہ ہر چہ از دوست می رسد نیکوست۔

البتہ اپنے دوسرے پیرے میں آپ نے جو کہا ہے وہ لائق شکایت ہے۔ اس میں آپ نے بعض ان حاکموں اور "شہزادوں" کا طرزِ فکر اختیار کیا ہے جو رعایا پر ستم توڑتے ہیں لیکن یہی رعایا جب اس ستم پر واویلا کرے تو اسیر مقدمہ چلا دیتے ہیں کہ تم نے حکومت کو بدنام کیا ہے۔ گویا قصوروار ستم توڑنے والے نہیں ہیں بلکہ اس ستم کی نشاندہی کرنے والے ہیں۔

میرے عزیز! کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ قوم و ملت کی خیر خواہی کے عنوان سے بعض ملا نما اور عالم فاضل حضرات جو چاہے کہتے رہیں، جیسی چاہے خلافِ دین آراء کا اظہار و اعلان کریں مگر کسی دردمند کو یہ جسارت نہ کرنی چاہیئے کہ انہیں ٹوکے۔ ان کی فاسد آراء کا فساد ظاہر کرے اور ان کے افکار پر نقد و نظر کا مرتکب ہو۔ اگر وہ ایسی جسارت کرے گا تو اس کے خلاف یہ فرد جرم عائد کی جائے گی کہ اس نے نوجوانوں کے اذہان میں شکوک پیدا کئے ہیں اور باوقار لوگوں کے وقار کو دھکا لگایا ہے۔

معلوم ہوتا ہے تجلی کا طلاق نمبر آپ نے خشکی کی بنا پر پڑھا ہی نہیں۔ بس ادھر ادھر سے چند سطریں یا چند کالم پڑھ کر بند کر دیا۔ اگر واقعی ایسا ہی ہوا ہے تو زیادہ بہتر تھا کہ اس کے تعلق سے آپ کوئی اظہارِ خیال نہ فرماتے۔ اٹکل پچو باتیں مفید نہیں ہوا کرتیں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے بلکہ نمبر کا معتد بہ حصہ آپ نے پڑھ ڈالا ہے تو بڑی عجیب بات ہے کہ ملزم آپ اس شخص کو گردان رہے ہیں جس نے اجماعِ امت کی تائید میں دلائل فراہم کئے اور ان لوگوں کے خیالاتِ خام کا پردہ فاش کیا جو اجماعِ امت کی پروا کئے بغیر جو چاہے کہے چلے جارہے ہیں۔ آپ کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے کچھ شہرت یافتہ علماء جو کچھ بھی کہیں اس پر ہر شخص کو خاموش ہی رہنا چاہیئے اور کسی پہاڑ جیسی غلطی پر بھی انہیں ٹوکنا نہیں چاہیئے ورنہ نوجوانوں کے اذہان میں شکوک پیدا ہوں گے اور ان کی مایوسیاں بڑھ جائیں گی۔

واہ واللہ۔ یہ کیا طرزِ فکر ہے۔ یہ کس کروٹ لیٹ کر آپ اس طرح کی عجیب باتیں سوچ رہے ہیں۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے، کسی بھی مصلحت کی کوئی قیمت حق و صداقت کے مقابلے پر نہیں ہے۔ قوم کی عزت اور حشمت کا بیڑا تو مدت ہوئی غرق ہو ہی چکا۔ سیاست و اجتماع کے دائرہ سے خود مسلمان اپنے دین کو مدت ہوئی جلا وطن کر چکے۔ اب جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ شریعت کا تحریری سرمایہ ہے۔ وہ عقائد و افکار ہیں جو کم سے کم کتاب کے صفحات پر اور اصحاب علم کے اذہان و قلوب میں آج بھی موجود ہیں۔ اب کیا انہیں بھی مسخ و تحریف کی دلدل میں دھنس

جائے دیا جائے اور ہم جیسے لوگ ہونٹوں پر قفل چڑھا کر بیٹھے رہیں۔

جاہل کی امامت

سوال :- از اے آر قریشی۔ احمد آباد۔

خدمت عالی میں گذارش ہے کہ ماہ دسمبر ۱۹۷۰ء کے جریدۂ تجلی میں صفحہ ۴۹ پر مرزا عبدالقادر بیگ صاحب نظام آبادی کے سوال "نماز جنازہ" کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "نماز جنازہ ہو یا کوئی اور نماز، امام کیلئے اصطلاحی عالم ہونا ضروری نہیں۔ بس اتنا علم ضروری ہے کہ جس کی روشنی میں نماز صحیح طور پر پڑھائی جا سکے۔"

اکثر مساجد میں احادیثِ نبوی کا کلینڈر رہتا ہے اس میں سلیس اُردو میں احادیث کا ترجمہ ہوتا ہے کہ جس سے عام مسلمان احادیث نبوی اور بزرگانِ دینِ متین کے زرین اقوال پڑھ کر نصیحت حاصل کریں۔

ہمارے ایک محترم دوست جو کہ موقد ہیں موصوف نے اس میں ایک ہدایت کا اضافہ کر دیا وہ یہ ہے:-

"جاہل کے پیچھے نماز نہ پڑھیں کیونکہ جاہل کا خاتمہ بالخیر نہیں ہوا کرتا۔ اس کی عاقبت جہنم ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

سرانجام جاہل جہنم بود
کہ جاہل نکو عاقبت کم بود

اسی لئے جاہلوں کے پیچھے یعنی جاہلوں کی امامت میں سب کی نماز خراب ہو جائے گی۔

موصوف محترم نے یہ اس لئے ہدایت کا اضافہ کر دیا ہے کہ اکثر اوقات مسجد میں امام کی غیر موجودگی میں ایسے لوگ جھٹ سے امام بن جاتے ہیں کہ جنھیں دیکھ کر بھی قرآن پڑھنا نہیں آتا۔ صرف نماز کے لئے چند سورتیں یاد کرلی ہیں۔ نماز کے مسائل سے نابلد ہوتے ہیں۔ احادیث نبوی میں سے ایک یا آدھی بھی حدیث یاد نہیں۔ ان لوگوں کے علمی معیار کا یہ عالم ہے کہ اُردو کا جریدۂ تجلی ممکن ہے کہ ہجے کر کے پڑھ لیں گے۔ لیکن جریدہ کیا کہہ رہا ہے یہ سمجھنے یا سمجھانے کی قابلیت نہیں ہے اور طرہ یہ ہے کہ شاید ہی کوئی ہفتہ سینما بغیر قضا ہو جائے اور بادلِ ناخواستہ قضا بھی ہو گیا تو شاید اس کا کفارہ تو ضرور ادا کر ہی دیتے ہوں گے۔ روزانہ کے فرضوں میں سے ایک یہ بھی فریضہ ہے کہ عام مسلمانوں کے قبرستان کے قریب سے گذرتے ہیں مگر عام مسلمانوں کی دعائے مغفرت کے لئے اس قبرستان میں نہیں جاتے لیکن پیر صاحب کے مزار اقدس پر جو دوسرے قبرستان میں ہے صبح کی نماز کے بعد بلاناغہ سجدۂ تعظیمی کے لئے اُچوک حاضری دی جاتی ہے۔ والدین کی قبروں پر کھڑے ہو کر دعائے مغفرت نہ کریں تو چل جاتا ہے لیکن پیر صاحب کی قبر پر نہ جائیں تو شاید جہنم کے انگارے سارے کے سارے انھیں حضرات پر الٹ پڑیں گے، اتنے پابندِ پیر ہیں۔ امتیازی طرہ یہ ہے کہ یا غوث الثقلین کریم الطرفین اغثنی وامددنی فی قضاءِ حاجتی یا قاضی الحاجات کی نماز کے دلدادہ ہیں۔ گویا ایسے سخت قسم کے بدعتی اور جہل مرکب لوگ بلا کسی کے کہے سنے جھٹ سے امام بن کر نماز پڑھانے لگ جاتے ہیں۔ جن کی زرخیز کھوپڑی میں بدعت کی یا جہالت کی یا دونوں مرکب غلاظت کی کھاد بھری پڑی ہو ایسے جاہلوں کی امامت میں تو تمام مقتدیوں کی نماز خراب ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے ہمارے محترم دوست نے ایک مزید ہدایت لکھ کر کلینڈر میں اضافہ کر دیا ہے۔

آپ کی خدمت میں گذارش ہے کہ تجلی کی ڈاک میں جواب تحریر فرمائیں کہ ہمارے محترم نے جو ہدایت لکھ کر اضافہ کر دیا ہے یہ درست ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

جواب :-

"اصطلاحی عالم" اُس شخص کو کہتے ہیں جو باقاعدہ کسی بھی مدرسے میں پڑھ کر سندِ فراغت حاصل کر چکا ہو۔ ایسا ہی

عالم امامت کر سکے گا یہ شرط کبھی کسی فقیہ نے نہیں لگائی اور قرآن وحدیث سے بھی ثابت نہیں ہمارے جواب کے اس جزو میں تو کوئی بحث ہی نہیں۔ رہا دوسرا جز تو وہ بھی بلاشبہ درست ہے البتہ اس سے وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جو شرک پسند ہوں مبدعتی ہوں۔ یا فاسق وفاجر ہوں۔ ہر قول میں ان چیزوں کا استثنیٰ آپ سے آپ ہو جاتا ہے جن کا مستثنیٰ ہونا معلوم ومعروف ہو مثلاً زید کہتا ہے کہ فلاں ٹانک بے حد مفید ہے تو اس سے ان لوگوں کا استثناء خود بخود ہو جائے گا جو اس درجہ مریض ہوں کہ ٹانک اور مقویات ہضم ہی نہ کر سکیں یا جیسے قرآن میں ایک جگہ کہا گیا کہ اللہ تمام گناہ بخش دیتا ہے تو اس سے کفر وشرک اور الحاد وارتداد کا استثناء خود بخود ہو گیا کہ یہ استثناء معروف ومشہور ہے لہٰذا ہماری عبارت کا یہ مطلب نہیں لینا چاہئے کہ ایسے جہلاء اور مبتدعین اور فساق بھی امامت کے مستحق ہیں جن کا نقشہ آنجناب نے کھینچا ہے۔ انھیں امام بنانا بدترین قسم کی بدبختی ہے۔ یہ لوگ تو پکے بدعتی ہیں۔

اس کے باوجود آپ کے دوست کی لٹکائی ہوئی "ہدایت" تشنہ اور مغالطہ انگیز ہے۔ اصطلاح میں وہ سبھی لوگ جاہل کہلاتے ہیں جنھوں نے باقاعدہ علم دین حاصل نہ کیا ہو لیکن ان میں بہتیرے بندگانِ خدا ایسے نکوکار اور اتنے باخبر ہوتے ہیں کہ اچھی نماز پڑھا سکتے ہیں اور ان کے پیچھے نماز میں کوئی مضائقہ نہیں۔

وہ جوابات جن کے سوالات حذف کر دیئے گئے

بریلویوں کی فتنہ گری

پروفیسر سیّد محمد خلیل الرحمٰن۔ ایم۔ اے۔ ایم۔ ایڈ۔ (ناگپور) متوجہ ہوں۔

آنجناب نے ۲ فل اسکیپ صفحات پر جو کچھ لکھا ہے وہ سب نقل کرنے کے لئے صفحات کہاں سے لائے جائیں۔ بریلوی حضرات کا علم کلام کوئی نئی چیز نہیں بیسیوں برس سے یہ حضرات اسی طرح کی خرافات پھیلاتے چلے آ رہے ہیں جماعتِ اسلامی کو، علمائے دیوبند کو، علمائے حرمین کو، شاہ اسمٰعیل شہید کو غرض اپنے سوا سب کو گمراہ، بددین، وہابی کہنا اور اپنے منہ میاں مٹھو بننا ان کی کہنہ روش ہے۔ ان کی ایک شان یہ بھی ہے کہ جھوٹ بولو۔ خلافِ واقعہ دعوے کرو اور ڈنکے کی چوٹ کرو۔ اب مثلاً آپ کی نقل کردہ عبارت کے خاتمہ پر بریلوی مولوی صاحب نے کس بے تکلفی سے یہ گل افشانی کی ہے کہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب کو اللہ نے مجدد بنا کر پیدا کیا اور انھوں نے گمراہی وبدعت کو مٹا کر سنتوں کو زندہ کیا اور طوفان کا رخ موڑ دیا اور دینِ اسلام کو بدمذہبوں کے گرد وغبار سے پاک کر دیا۔

گویا ایک طرف تو یہ حضرات یہ رونا روتے ہیں کہ ان کے محدود طبقے اور حلقے کے سوا سب مسلمان گمراہ اور بددین ہو گئے مگر دوسری طرف یہ بھی خوش فکری ہے کہ دینِ اسلام بدمذہبوں کے گرد وغبار سے پاک ہو گیا!

حماقت، غباوت اور سفاہت کی جتنی اقسام ہیں سب کی سب بریلوی علم کلام میں افراط سے پائی جاتی ہیں علم حدیث کی انھیں ہوا نہیں لگی۔ قرآن کی آیات میں یہ لوگ اپنا ذہن پڑھتے ہیں۔ عرس وقوالی جیسے خرافات ان کی محبوب ترین متاع ہیں۔ مُردوں کو انھوں نے ذیلی اور ظلی خدا بنا رکھا ہے۔ اولادوں کے نام خواجہ بخش معین بخش عبدالنبی اگر کسی درگاہ کے صاحب مزار کا نام بھوندو شاہ ہو تو یہ اپنے صاحب زادے کا نام بھوندو بخش رکھنے میں بھی مضائقہ تصور نہیں کرتے ان کا ذوق ومذاق اور وجدان واحساس سب کچھ اوہام ووساوس نے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ انھیں زبان وادب اور محاوراتِ لسانی کا بھی کوئی سلیقہ نہیں۔ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا اشرف علیؒ اور مولانا محمد قاسمؒ جیسے علماء کی اردو عبارتوں میں طرح طرح کے کیڑے ڈالنا تو معمولی بات ہے یہ مسخرے قرآن کے الفاظ وعبارات تک سے کھیل کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مشرکانہ

مبالغے کرنا اور صالحین کے بارے میں اساطیری اور دیومالائی تخیلات کو اشاعت دینا ان کے دین و مذہب کا لُبِّ لباب ہے۔ حد ہے کہ یہ رسول اللہؐ کو "بشر" کہنا بھی وہابیت اور گمراہی تصور کرتے ہیں۔ ایسے توحید دشمنوں اور قرآن ناشناسوں کی واہی موشگافیوں سے کون سر مارے۔ ان کا حال یہ ہے کہ پچاس بار ان کے کسی اعتراض کا شافی جواب دیا جائے مگر یہ جواب کو نظر انداز کر کے برابر اعتراض کی جگالی کرتے چلے جائیں گے اور بیس سال بعد بھی یہی معلوم ہوگا کہ گویا کوئی تازہ اعتراض وضع کر کے لارہے ہیں۔ یہ بجلنے اعتراضات و الزامات آپ کی نقل کردہ عبارت میں شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور اکابرین دیوبند پر نظر آرہے ہیں ان کی لغویت اور بے بضاعتی سیکڑوں بار منقح کی جا چکی مگر کیا مجال کہ ان کے کانوں پر جوں تک رینگی ہو۔

متذکرہ کتاب کو اگر ہزاروں کی تعداد میں شائع کر کے مہاراشٹرا اور آندھرا پردیش میں تقسیم کیا جارہا ہے تو اس کا توڑ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اس میں جو زبان استعمال ہوئی ہے وہ نہایت پست ہے اور جس قسم کے نکات ارشاد ہوئے ہیں ان کا کوئی تعلق علم و تفقہ اور متانت و ثقاہت سے نہیں لہٰذا ہم ان پر کچھ نہیں لکھیں گے۔ ہم پڑھے لکھے حضرات سے مباحثہ کر سکتے ہیں مگر دماغی خلل میں مبتلا بد زبانوں سے بحث کی قدرت نہیں رکھتے۔ مذکورہ کتاب کے مصنف کا تو کیا ذکر ہے ہمیں پورے بریلوی طبقے میں بھی کوئی ایک فرد ایسا نظر نہیں آرہا ہے جو علوم تفسیر اور اصولِ حدیث میں مہارت رکھتا ہو۔ جسے متین علم کلام اور واہی کج بحثی میں تمیز کا سلیقہ ہو، پھر گفتگو ہو تو کس سے اور بحث ہو تو کیسے۔ قے آنے لگی ہے ان لوگوں کی ہفوات سے۔ آپ اگر ان کے جاہلانہ پروپگنڈے کا توڑ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے کہ تجلی کے صفحات سیاہ کرائیں بلکہ یہ ہے کہ جو کتابیں بریلوی افکار کے رد میں شائع ہو چکی ہیں انھیں زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کریں۔ صحیح العقیدہ حضرات کے تعاون سے انھیں بار بار چھاپیں اور لاگت کی لاگت بیچیں یا ممکن ہو تو مفت بھی تقسیم کرائیں۔

کسی کو کافر و مشرک یا بدعتی کہنا

کوئی شخص ایسے کسی عقیدے کا حامل یا فعل کا مرتکب ہو جس کا کفر یا شرک یا بدعت ہونا دلائلِ معتبرہ کے لحاظ سے بالکل مسلّم ہو تو ایسے شخص کو متعین طور پر بھی کافر یا مشرک یا بدعتی کہہ دینا بالکل جائز ہے بلکہ بعض حالتوں میں تو واجب بھی ہے۔ مثلاً کوئی شخص صاف صاف اس عقیدے کا اظہار کرتا ہے کہ اولیاء و انبیاء کی روحیں حاضر و ناظر ہیں یا فلاں نبی یا ولی کو اللہ نے کائنات میں تصرف کا اختیار عطا کر رکھا ہے یا فلاں مزار پر دعا مانگی جائے تو لازماً قبول ہوتی ہے یا فلاں مرحوم ہماری پکار کو ہر جگہ سے سن لیتے ہیں تو اسے مشرک کہنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ کیونکہ یہاں تاویل اور حسن ظن کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اگر یہ شخص یہ تاویل کرے کہ مذکورہ صفات کو میں اولیاء و انبیاء کی ذاتی صفات نہیں مانتا بلکہ یہ صفات اللہ نے انھیں عطا کی ہیں تب بھی یہ مشرک ہی ہے کیونکہ یہ بعینہٖ بُت پرستوں والا عقیدہ ہے۔ بُت پرست بھی اُس پتھر کو خدا نہیں مانتے جسے انھوں نے تراشا ہے۔ یہ تراشیدہ بت تو محض نشان اور مظہر ہیں۔ بعض بُت کسی گذری ہوئی ہستی کی شبیہ ہوتے ہیں اور بعض بُت اُن اوصاف کی نمائندگی کرتے ہیں جو پجاریوں کے ذہنوں میں مرتسم ہیں۔ یہ دونوں ہی شکلیں انکارِ خدا پر مبنی نہیں ہیں۔ آپ کسی پڑھے لکھے ہندو سے پوچھ دیکھئے وہ بھگوان کا انکار نہ کرے گا۔ یہ نہیں کہے گا کہ رام یا کرشن یا فلاں اور فلاں ایشور تھے۔ یہ بھی نہیں کہے گا کہ جن بتوں کو تراش کر مندر میں رکھا گیا ہے وہی عین بھگوان ہیں۔

اسی طرح مشرکینِ عرب بھی پتھر یا لکڑی یا مٹی کے بتوں کو عین خدا سمجھ کر نہیں پوجتے تھے بلکہ انھیں خدا کا مظہر یا کسی مرحوم عابد و زاہد کا پیکرِ خیالی تصور کرتے تھے اور اسی قسم کا ذہن ان کا بھی تھا کہ فلاں فلاں ہستیوں کو رب

الارباب نے فلاں فلاں اختیارات تفویض کر رکھے ہیں۔ اس طرزِ فکر کو قرآن نے ببانگِ دُہل شرک قرار دیا۔ اس پر سخت نکیر کی۔ اسے کھلی گمراہی ٹھیرایا اور حضورؐ نے بھی اس طرزِ فکر کو دفن کرنے کی جدوجہد میں کوئی تساہل نہیں برتا لہٰذا آج بجائے پتھر کے بتوں کے کوئی شخص کسی قبر کو یا کسی مرحوم کے خیالی وجود کو یا کسی روح کو یہی حیثیت دے لیتا ہے تو اسے شرک کے سوا آخر کیا کہیں گے۔

یہ عقیدے کا معاملہ ہوا عمل کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کسی قبر کا طواف کرتا دکھائی دے یا اس پر سجدہ ریز نظر آئے تو اسے مشرک کہنا ہوگا چاہے وہ کیسی ہی تاویل کیوں نہ کرے کیونکہ طواف صرف بیت اللہ کے لئے مخصوص ہے اور سجدہ ذاتِ باری کے لئے۔ یہ افعال کسی بھی نیت اور ارادے سے کئے جائیں آدمی کو مشرکین کے زمرے میں لے جاتے ہیں اور مفتیانِ دین کا فرض ہے کہ ایسے افعال کے مرتکب کو بلاخوف مشرک کہیں۔

بدعت کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص اجمیر یا کلیر یا کسی بھی درگاہ کے عرس میں یہ سمجھ کر شریک ہوتا ہے کہ یہ شرکت خیر و برکت اور ثواب کا ذریعہ بنے گی تو وہ یقیناً بدعتی ہے۔ ہاں اگر وہ محض تفریحاً شریک ہوتا ہے تو بدعتی نہیں فقط گنہگار ہے اور گناہ کے بھی مختلف اسٹیج ہیں۔ کچھ لوگ میلے ٹھیلے کی ذہنیت سے شریک ہوتے ہیں جیسے کہ نمائشوں میں شریک ہوا جاتا ہے۔ یہ کم درجے کے گنہگار ہوں گے۔ کچھ لوگ آوارگی اور اوباشی کے ذہن سے شریک ہوتے ہیں یہ بڑے گنہگار ہیں لیکن بدعت ہر گناہ سے بڑھ کر گناہ ہے اس لئے خوش عقیدگی اور ثواب اور کسبِ فیض کے ارادے سے شرکت کرنے والوں کو ان سب سے بڑھ کر گناہ گار تصور کرنا چاہئے۔ یہ بدعتی ہیں انھوں نے دین میں اضافہ کیا ہے۔ یہ خلقِ خدا کے لئے شرک کا وسیلہ بن رہے ہیں۔ ان کا عمل ہزار فتنوں کی جڑ ہے۔ ان سے کہیں بہتر وہ شخص ہے جو سنیما دیکھتا ہے اور احساس رکھتا ہے کہ میں کوئی اچھا کام نہیں کر رہا ہوں۔

البتہ جن عقائد و اعمال میں ذرا بھی حسنِ ظن اور بہتر تاویل کی گنجائش ہو ان کے حاملین و مرتکبین پر فتوی جھاڑنے میں عجلت نہیں کرنی چاہئے۔ زیادہ محتاط طریقہ یہ ہے کہ کسی متعین فرد یا گروہ کو کافر و مشرک یا بدعتی کہنے کے عوض کفر و شرک اور بدعت پر نکیر یا لے دے کرنی چاہئے مثلاً آپ بلاتکلف کہہ سکتے ہیں کہ شریعتِ قبوری سر سے پیر تک بدعت ہے اور اس میں شرک کے عناصر بھی شامل ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی کو عالم الغیب اور حاضر و ناظر ماننا ذہنی مالیخولیا کے سوا کچھ نہیں اور اس طرح کے عقائد اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

نئے درود

درود نام ہے اُن کلمات کا جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اللہ تعالیٰ سے سلام و صلوات کی دعا کی گئی ہو۔ اس کے لئے قرآن میں بھی اور احادیث میں بھی خاصا مواد ہے۔ نماز ہی میں ہم روزانہ جو درود پڑھتے ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تلقین فرمایا ہوا ہے۔

اب اگر کوئی بزرگ رسول اللہؐ کی محبت میں کچھ اور کلمات ایسے وضع کرتے ہیں جن میں حضورؐ کی تعریف کی گئی ہو تو یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں بلکہ دیکھنا صرف یہ ہوگا کہ جو تعریف انھوں نے کی ہے وہ مبالغے اور غلو سے پاک ہے یا نہیں۔ اگر پاک ہے تو اس کی تعریف و تحسین کریں گے۔ پاک نہیں ہے تو اس سے دور بھاگیں گے۔

ویسے حقیقت میں جو نور، برکت اور معنوی افادیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم فرمودہ الفاظ و کلمات میں ہو سکتی ہے وہ قرآن کے سوا کسی بھی کلام میں نہیں ہو سکتی الفاظ و حروف کے بھی اپنے خواص و اثرات ہیں۔ وظائف و عملیات کا سارا مدار ہی ان خواص و اثرات پر ہے لہٰذا ہمارے نزدیک تو احتیاط اور عافیت اور حسنِ ادب کا تقاضا یہی ہے کہ درود میں بھی ان الفاظ و کلمات ہی کو اختیار کیا جائے جو اللہ کے آخری رسولؐ کی زبانِ مبارک سے نکلے

ہیں جنھیں صحابۂ کرام نے غالب گمان کے طور پر حضورؐ سے منسوب کیا ہے۔

رہے صوفیاء کے تعلیم فرمودہ وظائف و اوراد تو انھیں حکیم کے نسخے جیسا سمجھئے۔ اگر صوفی واقعی صوفی ہے تو وہ بجا طور پر اس کا حق رکھتا ہے کہ امراضِ روحانی کے معالجے میں جب جس ورد یا وظیفے یا تسبیح کو مفید سمجھے اسکی تعلیم دے۔ اس تعلیم میں خلاف شرع کوئی عنصر نہ ہو تو مریضوں کو اس کی تعمیل کرنی چاہیئے۔ حضورؐ نے جو وظائف امت کو دیئے ہیں وہ ہمہ گیر نوع کے ہیں۔ جیسے مثلاً سیب اور انگور فی ذاتہٖ افادیت سے لبریز ہیں اور ہر شخص کے لئے انھیں مفید کہا جاسکتا ہے لیکن بیماری کی بہت سی حالتوں میں ان سے پرہیز بھی کرایا جاتا ہے اور ان کے بجائے دوسری غذائیں تجویز کی جاتی ہیں اسی طرح ایک صاحب نظر صوفی اور مرشد کسی مریضِ روحانی کو یہ تعلیم بھی دے سکتا ہے کہ بعد نماز صبح فلاں وظیفہ پڑھو اور فلاں نہ پڑھو۔ تہجد میں اتنی رکعات پڑھو اور اتنی مت پڑھو۔ تلاوتِ قرآن میں اتنا وقت دو اور اتنا مت دو۔

ہاں یہ بہر حال طے ہے کہ کوئی بھی تعلیم اور ہدایت خلافِ شرع نہ ہونی چاہیئے۔ نیز جن اوراد و کلمات کو اللہ رسولؐ نے وقت اور محل سے مخصوص کر دیا ہے ان میں تبدیلی کی اجازت کسی کو نہیں۔ جیسے نماز میں دو درود۔ یہ درود تبدیل نہیں کئے جاسکتے۔ یا جیسے سمع اللہ لمن حمدہ یا ربنا لک الحمد کے فقرے۔ یہ اٹل اور غیر متبدل ہیں۔

شریعت۔ حقیقت۔ طریقت۔ معرفت

شریعت نام ہے قوانین کے مجموعے کا۔ ایمان اور شریعت میں فرق یہ ہے کہ ایمان تو نام ہے چند بنیادی عقائد کو تہہ دل سے قبول کر لینے کا۔ خدا پر، اس کی نازل کردہ کتابوں پر، انبیاء پر، ملائکہ پر، تقدیر پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے پر قلب و ذہن کا مطمئن ہونا "ایمان" کا خلاصہ ہے۔ اور شریعت ان ذیلی اصول و احکام سے عبارت ہے جو قبولِ ایمان کے نتیجے میں واجب القبول ہو جاتے ہیں۔

طریقت کوئی قرآنی اصطلاح نہیں بلکہ ایک خاص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے وضع کی گئی ہے۔ یہ مفہوم ہے ایسے طریقے ڈھونڈنا جن سے زیادہ سے زیادہ رضائے الٰہی اور قربِ خداوندی نصیب ہو۔ حدیث میں جس چیز کو "احسان" کہا گیا ہے یعنی اللہ اور رسولؐ کے تمام احکام کی تعمیل نہایت درجہ خلوص اور شوق و شغف کے ساتھ کرنا اور شریعت نے جن چیزوں سے روکا ہے ان سے پوری طرح رُک جانا۔ اسی منزل کی طرف لے جانے والے طور طریقے "طریقت" کہلاتے ہیں۔

معرفت کہتے ہیں پہچان کو۔ ہر شے کی ایک سطح ہوتی ہے اور سطح کے نیچے بہت سے پرت ہوتے ہیں۔ گہرائیاں ہوتی ہیں۔ سطح تک محدود رہنا معرفت نہیں۔ گہرائیوں تک پہنچنا معرفت ہے۔ اللہ ایک ہے یہ صرف ایک عقیدہ ہوا لیکن اسے اللہ کی معرفت کا نام نہیں دیں گے معرفت یہ ہے کہ اللہ کی ذات و صفات کا نقش دل و دماغ میں گہرا ہوتا چلا جائے۔ اس کے بہت درجے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام سب سے اونچے درجے پر فائز ہیں اسکے بعد صحابہ، مفسرین، محدثین، اولیاء و اتقیاء اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس نعمت سے بہرہ یاب ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

حقیقت کسی بھی شے کی اصلیت کو کہتے ہیں۔ اس کا مقابل "مجاز" ہے۔ اس سے زیادہ باریکیوں میں آپ نہ پڑیں۔

وراثت کا اہم ترین مسئلہ

مسلمانوں میں اعمال و عقائد کے جہاں اور بے شمار مفسدے گھس گئے ہیں وہیں ایک یہ مفسدہ بھی نفوذ حاصل کرتا جا رہا ہے کہ جن لڑکیوں کی شادی ہو چکی وہ اب اپنے

والدین کی وراثت میں حق دار نہیں رہیں۔ حتیٰ کہ بعض نالائق باپ خود اپنی شادی شدہ بیٹیوں کو محروم ہی کر دینے کے خواہش مند نظر آتے ہیں اور اس کے لئے طرح طرح کے کرتب کھیلتے ہیں۔

کان کھول کر سن لیا جائے۔ لڑکیوں کا شرعی حصہ ہر حال میں قائم رہتا ہے خواہ ان کی شادی ہو چکی ہو اور خواہ دولت مند سسرال نے انھیں کتنا ہی دولتمند بنا دیا ہو۔ نیز یہ بھی نوٹ کر لیا جائے کہ کوئی باپ ہزار وصیت کر مرے کہ میرے ترکے میں فلاں بیٹی کو حصہ نہ دیا جائے مگر ایسی وصیتیں شریعت کی نگاہ میں ردّی کاغذ سے زیادہ نہیں۔ خدا کے بنائے ہوئے وارثوں کو کوئی محروم نہیں کر سکتا اور جس گھرانے میں ایسی ناپاک کوششیں کی جائیں گی اسے آخرت کے سخت عذاب کے لئے تیار رہنا چاہئیے۔

داڑھی کا مسئلہ

داڑھی اگر اس لئے رکھنی ہے کہ حکمِ رسولؐ کی تعمیل ہو اور آخرت کی بازپرس کا خطرہ نہ رہے تو پھر زیبائش کے نقطۂ نظر کو پسِ پشت ڈالئے۔ فقہاء نے حدیثِ رسولؐ پر غور کر کے یک مشت مقدار کو ضروری قرار دیا ہے۔ اگر یک مشت نکلی ہی نہیں تب تو جتنی نکلی ہے اتنی ہی رکھی جائے۔ یک مشت سے زیادہ نکلی ہے تو بڑھے ہوئے حصے کو کٹوایا جا سکتا ہے۔ چہرہ چھوٹا ہو بڑا ہو، دُبلا ہو موٹا ہو، اس سے کوئی بحث نہیں۔ نہ اس سے بحث ہے کہ کیسے چہرے پر کتنی داڑھی اچھی لگتی ہے۔ اگر تعمیلِ شریعت کے لئے کوئی کام کرنا ہے تو اس طرح کی بحثوں سے دور رہنا ہوگا۔

یک مشت کی مقدار سے تو اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ یہ ناپ احادیث میں نہیں آیا بلکہ فقہاء نے احادیث کے مصداق کا تعین اپنے طور پر کیا ہے لہٰذا اس سے اختلاف کرنا حدیث سے اختلاف کرنے کے ہم معنی نہ ہوگا لیکن محض اس لئے یکمشت داڑھی سے اجتناب کرنا کہ یہ اچھی نہیں لگتی ہے گناہ کی بات ہے۔

تاریخ دیوبند

دیوبند ایک قدیم ترین بستی ہے۔ اسکی سرزمین نے انقلابات کی بے شمار کروٹیں دیکھی ہیں۔ اور اب دارالعلوم کی وجہ سے یہ بستی بین الاقوامی شہرت کی مالک بن گئی ہے۔

اس بستی کی دلچسپ اور محققانہ تاریخ جناب سیّد محبوب رضوی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔ تاریخ نگاری میں مصنّف موصوف کی بصیرت ایک امتیازی شہرت رکھتی ہے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن چھپ کر ختم ہو گیا، اب دوسرا ایڈیشن فاضل مصنف کی نظرِ ثانی اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

صفحات ۵۱۲۔ قیمت مجلد دس روپے

بریلوی فتنے کا نیا روپ

بریلوی مکتبِ فکر کے اہلِ قلم جناب ارشد القادری کی تصنیف "زلزلہ" کا تنقیدی جائزہ۔ تحریف و تلبیس کی نشاندہی۔ دلچسپ علمی و منطقی بحث۔ دستاویزی حقائق۔ کتاب کے فاضل مصنف جناب محمد عارف سنبھلی نے بڑے دلکش اور فہیمانہ انداز میں نقد و تعقب کا فریضہ ادا کیا ہے۔

قیمت — پانچ روپے

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

قرآن اور تعمیرِ سیرت — تعلیماتِ قرآنی کا نچوڑ تصوف اور ادبِ صالح کا دلکش مجموعہ ڈاکٹر میر ولی الدین کے قلم سے۔ قیمت — چھ ۶/ روپے۔

جائزہ تراجمِ قرآنی — دنیا میں کب اور کس زبان میں قرآن کے تراجم ہوئے۔ اسکی تحقیق و تفصیل مترجمین اور شارحین کے نام۔ بہت عمدہ اور معلومات افزا کتاب ہے۔ قیمت — چھ ۶/ روپے۔

غنیۃ الطالبین — مصنفہ: شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔ قیمت مجلّد — تیس ۳۰ روپے۔

تاریخِ اسلام کے حیرت انگیز لمحات — قاہرہ کے ایک فاضل بیرسٹر عبداللہ عنان کی تالیف نئے اسلوب میں۔ تاریخِ اسلام کے بعض وقائع پر علم و تحقیق کی روشنی۔ قیمت۔ ساڑھے سات روپے ۷/۵۔

اسلام اور ترقی — مولانا اشرف علیؒ کے افادیت سے لبریز ارشادات۔ قیمت — ۶۰ پیسے

تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانیؒ — ملک و ملت کی ایک ممتاز شخصیت مولانا عبداللطیف نعمانی شیخ الحدیث مفتاح العلوم متوفی ۱۳۹۲ھ کی دینی، علمی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی کے زندہ جاوید کارنامے اور اہلِ علم و رہنمایانِ ملک و ملت کے خراجہائے عقیدت۔ قیمت — پانچ روپے ۵/

تاریخ الفخری — تاریخ اسلامی کی ایک مشہور اور مستند کتاب کا ترجمہ اردو، فارسی اور فرنچ زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ آپ کی خدمت میں اردو ترجمہ حاضر ہے۔ قیمت — گیارہ روپے ۱۱/۔

مکتوبات خواجہ معصوم سرہندیؒ — معارف و اسرار ہدایت و نصائح اور نکات و لطائف سے لبریز خطوط اردو لباس میں مطالعہ کی بہترین چیز۔ قیمت — چھ روپے ۶/۔

مناجاتِ مقبول (کتابی) عکسی — مولانا اشرف علیؒ کی مقبولِ عام اور مفید ترین کتاب پرانے اور نئے اضافوں کے ساتھ۔ قیمت — چھ روپے ۶/۔ (مجلّد۔ سات روپے ۷/)

آنکھوں کی ٹھنڈک — اللہ کے سوا کوئی حاضر و ناظر نہیں جو مسلمان اس غلط خیال کا شکار ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بھی حاضر و ناظر ہیں۔ ان کے خیال کی مدلل تردید قرآن و حدیث کے روشن دلائل۔ فقہاء و مجتہدین کے مستند حوالے۔ قیمت مجلّد۔ آٹھ روپے ۸/

رمضان کیا ہے؟ — مولانا محمد عبداللہ دہلویؒ کے رشحاتِ قلم۔ رمضان کے موضوع پر خوب تر کتاب۔ قیمت مجلّد — تین روپے ۳/۔

تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہدِ سلف میں — جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے شاندار ماضی میں دین کی تبلیغ و تعلیم کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ مسجدیں، راستے، بازار کہیں بھی ہوں مسلمان بنے رہے۔ دنیا کے کاروبار نے انھیں دین سے غافل نہیں کیا۔

ناشر: قاضی اطہر مبارک پوری۔ قیمت۔ ڈیڑھ روپیہ ۱/۵

التشرف — احادیث کی معرفت مولانا اشرف علیؒ کی معروف کتاب۔ قیمت — سولہ روپے ۱۶/۔

امتِ مسلمہ کی رہنمائی حضرت عمرؓ کی تعلیمات میں — مولانا تقی امینی کی ایک تازہ تصنیف انفرادی و اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں حضرت عمرؓ کے اصلاحی فرمودات و اقدامات، دور رس حکمتوں سے لبریز۔ قیمت — دو روپے۔

سفر مصر و حجاز — امیرِ شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کے قلم سے ایک بصیرت افروز معلومات افزا سفرنامہ۔ قیمت — ڈھائی روپے ۲/۵۔

مکتبہ تجلّی۔ دیوبند (یو۔پی)

تفسیر ماجدی

(۱۰)

(۴) آیت ۵۶ :- وَتَزْہَقَ اَنْفُسُہُمْ وَہُمْ کٰفِرُوْنَ۔
مولانا کا ترجمہ :- "اور ان کی جانیں ایسی حالت میں نکالی جائیں کہ وہ کافر ہوں۔"

یہاں جو چوک ہوئی ہے وہ ایسی لغزشوں میں ہے کہ اگر مولانائے محترم بغور نظرِ ثانی فرماتے تو اس کی اصلاح خود ہی فرمالیتے۔ تَزْہَقَ صیغہ معروف ہے لیکن مولانا ترجمہ مجہول کر گئے ہیں۔ حالانکہ مولانا اشرف علیؒ کا جو ترجمہ اور تفسیر برابر ان کے آگے کھلی رہی ہے اس پر اگر نظریں جمائے رکھتے تو یہ چوک نہ ہوتی۔ مولانا اشرف علیؒ کا ترجمہ یہ ہے :-

"اور ان کی جان کفر ہی کی حالت میں نکل جاوے۔"

شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ یہ ہے :- "اور باہر نکلیں روحیں ان کے بدنوں سے درحالیکہ وہ کافر ہوں۔"

شیخ الہندؒ کا ترجمہ یہ ہے :- "اور نکلے ان کی جان اور وہ اس وقت تک کافر ہی رہیں۔"

ان تمام تراجم میں صیغہ قرآنی کی مطابقت سے جان یا روح کو تَزْہَقَ کا فاعل بنایا گیا ہے جب کہ ممدوح مفسر کے ترجمے میں اسے مفعول مالم یُسَمَّ فاعلہٗ کی حیثیت دیدی گئی ہے (یعنی ایسا مفعول جس کا فاعل مذکور نہ ہو) حالانکہ آگے آیت ۸۵ میں یہی جملہ لوٹا ہے تو وہاں ممدوح نے درست ترجمہ کیا ہے۔

(۵) آیت ۵۷ :- لَوْ یَجِدُوْنَ مَلْجَاً۔ تا۔ وَہُمْ یَجْمَحُوْنَ
ترجمہ :- "یہ اگر کوئی سی بھی پناہ کی جگہ پاتے یا کوئی غار یا کوئی (اور) جگہ گھس بیٹھنے کی تو یہ ضرور منہ اُٹھا کر اوپر چل پڑتے۔"

ہمارا خیال ہے "اوپر" کتابت کی غلطی ہے۔ ممدوح نے "ادھر" لکھا ہوگا۔ مگر گذارش یہ کرنی ہے کہ گستاخی معاف کبھی کبھی تو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ جلد سے جلد تفسیر مکمل کر دینے کے خیال میں ممدوح فکر و تعمق کے بغیر بڑی تیز رفتاری سے قلم چلا رہے ہیں اور بہتیرے مقامات پر محاورۃً گھاس کاٹنے کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ مقام بھی منجملہ ان کے ایک ہے۔

ذکر قرآن میں ان منافقینِ مدینہ کا ہو رہا ہے جو مسلمانوں کے آگے جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنا بھرم رکھنا چاہتے ہیں۔ جو اصلاً کافر ہوتے ہوئے بھی خود کو مومن پوز کرتے ہیں۔ جو انتہائی بزدل ہیں۔ ان کے بارے میں اللہ اپنے رسولؐ اور اس کے صحابہؓ کو بتا رہا ہے کہ یہ اخبث بحالتِ مجبوری یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ کہیں بھاگ کے جا نہیں سکتے۔ تمہارے زور و قوت پر غلبہ نہیں پا سکتے۔ اگر انہیں کوئی جائے پناہ نظر آ جائے کوئی سر چھپانے کی جگہ معلوم ہو جائے، کوئی بل ایسا دکھائی دے جائے جس میں یہ چوہوں کی طرح چھپ کر بیٹھ جائیں تو یہ اس بل اور جائے پناہ کی طرف دوڑ پڑنے میں ایک پل کی بھی دیر نہیں لگائیں گے۔ وَہُمْ یَجْمَحُوْنَ کے خصوصی الفاظ نگاہ میں رکھنے کے قابل ہیں۔ فرسٌ الجموح اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو بے تحاشا دوڑا چلا جا رہا ہو اور کتنی ہی لگام کھینچو رکنے کا نام نہ لے۔ گویا یَجْمَحُوْنَ کہہ کر اللہ نے یہ نقشہ کھینچا ہے کہ جائے پناہ کی طرف یہ لوگ اس طرح سرپٹ دوڑیں گے کہ کوئی بھی تیر انہیں دوڑنے سے باز نہ رکھ سکے گی۔

اس کیفیت کو بہترین طور پر حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے نے پیش کیا:۔

"اگر وہ پائیں کوئی پناہ کی جگہ یا غار یا سر گھسانے کو جگہ تو الٹے بھاگیں اُسی طرف رسیاں تڑاتے۔"

"رسیاں تڑانا" محاورۃً اسی وقت بولا جاتا ہے جب کوئی ہر قیمت پر بھاگ پڑنے کا تہیہ کر چکا ہو اور ہر بندش کو توڑ ڈالنا چاہتا ہو۔

مولانا اشرف علیؒ کا ترجمہ ہے:۔ ..."تو یہ ضرور منہ اٹھا کر اُدھر چل دیتے۔"

خدا ان کی قبر کو نور سے بھر دے یہاں ان سے دھمر یجمحون نظر انداز ہو گیا ہے۔ مولانا مودودی نے بھی یہاں ترجمے میں اس لفظ کا حق ادا نہیں کیا۔ ان کا ترجمہ یہ ہے:۔

... "تو بھاگ کر اس میں جا چھپیں۔"

یہ مفہوم ہے ترجمہ نہیں ہے۔ "چھپنے" کا مرادف کوئی لفظ آیت میں موجود نہیں۔ شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ بھی یہاں اتنا عمدہ نہیں ہے جتنا شیخ الہندؒ کا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے الفاظ ہیں — "البتہ متوجہ ہو دیں طرف اس کے تمھارے ڈر سے۔"

صرف "توجہ کرنے" میں وہ بات کہاں جو رسیاں تڑا کر بھاگ پڑنے میں ہے۔ شاہ صاحبؒ کا ایک تفرد بھی یہاں ہے انھوں نے دھمر یجمحون کو الفاظِ ماسبق سے مربوط کرنے کے عوض مستقل فقرے کی حیثیت سے لے لیا ہے۔ یہ ایک لطیف و دقیق بحث ہے جو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

خلاصہ یہ کہ ممدوح مفسر کا ترجمہ شایانِ شان نہیں معلوم ہوا۔

(۶) آیت ۵۹ کے ترجمے میں کاتب سے کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے

(۷) آیت ۶۰:۔ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا۔

ترجمہ:۔ "صدقاتِ (واجبہ) تو صرف غریبوں کا اور محتاجوں اور کارکنوں کا حق ہیں اور جو اُن پر مقرر ہیں۔"

اہلِ نظر قارئین اور خود ممدوح مفسر انصاف فرمائیں کیا اس طرح کا ترجمہ پڑھ کر کوئی بھی ہوشمند قاری جھلاہٹ محسوس کئے بغیر رہ سکے گا۔ قصور یہاں ممدوح کا نہیں معلوم ہوتا "ا" کا اضافہ کاتب کی کاریگری ہے۔ اس کاریگری نے ایک مصرف کو دو مصارف میں بدل دیا ہے۔ گویا کارکن تو کوئی اور ہیں اور "جو اُن پر مقرر ہیں" وہ کوئی اور ہیں۔ تصحیح کی ایسی فروگذاشتیں قرآن کے ترجمہ میں قابلِ درگذر نہیں۔

(۸) آیت ۶۲:۔ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِ

ترجمہ:۔ "یہ لوگ تمھارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ تم کو خوش کر لیں حالانکہ اللہ اور اس کا رسولؐ زیادہ مستحق ہیں کہ خوش اللہ کو کر لیں اگر (واقعی) یہ لوگ ایمان والے ہیں"

جس فقرے پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے اس پر توجہ فرمائی جائے۔ یہ آخر کیا زبان ہے۔

صحیح ترجمے کی دو شکلیں تھیں۔ یا تو یوں لکھا جاتا:۔

"اللہ اور اس کا رسولؐ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ یہ لوگ انھیں خوش کر لیں۔"

یا پھر یوں لکھا جاتا — "اللہ اور اس کا رسولؐ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اسے یہ لوگ خوش کر لیں۔"

مولانا مودودی نے پہلی شکل اختیار کی۔ شاہ عبدالقادرؒ اور مولانا اشرف علیؒ نے دوسری۔ حضرت شیخ الہندؒ نے دونوں صورتوں کو چھوڑ کر نہایت بامحاورہ اور دلنشیں ترجمہ کیا:۔

"اللہ اور اس کے رسولؐ کو بہت ضرور ہے راضی کرنا۔"

خدا جانے ممدوح یہ فقرہ کیسے لکھ گئے "کہ خوش اللہ کو کر لیں۔"

(۹) آیت ۶۹:۔ اللہ تعالیٰ کافروں سے خطاب کر کے کہہ رہے ہیں کہ تمھاری حالت بھی پچھلے لوگوں جیسی ہے جو زور و قوت اور مال و اولاد کی کثرت میں تم سے بڑھ کر تھے۔ انھوں نے اپنے دنیوی حصے سے فائدہ اٹھایا تم نے بھی اپنے حصے سے فائدہ اٹھایا۔ اور تم نے بھی اسی طرح وہی رنگ ڈھنگ اختیار کئے جو انھوں نے اختیار کئے تھے۔

جس فقرے پر ہم نے خط کھینچا ہے اس کے لئے قرآن میں یہ فقرہ استعمال ہوا ہے:۔

وَخُضۡتُمۡ كَالَّذِيۡ خَاضُوۡا۔

اس کا ترجمہ ممدوح نے یہ فرمایا ہے:۔ "اور تم لوگ بھی گھسے جیسا کہ وہ لوگ گھسے تھے۔"

یہ لفظی ترجمہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی درج ذیل فقرہ پڑھے:۔

"زید کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔"

اور عربی میں اس کا ترجمہ یہ کر دے۔" طار ببغاوات من يدِ زيدٍ۔"

ظاہر ہے اس عربی ترجمے کو پڑھکر ایک عرب پچھاڑ کھا جائے گا حالانکہ بظاہر یہ "مناسب" لفظی ترجمہ ہے!

کاش ممدوح غور فرماتے کہ خاض یخوض (باب ن) کے معنی گھسنے کے آتے تو ہیں مگر اس وقت جب کہ کوئی گھسنے کی قابل شئے لفظاً مذکور ہو۔ جیسے خاض الماءَ۔ پانی میں گھسا۔ خاض الغمراتِ۔ مشکلات کی گھاٹیوں میں گھس پڑا۔ کود پڑا۔ زیدٌ یخوضُ اللیلَ۔ زید تاریکیوں سے لاپرواہو کر گھس پڑتا ہے۔

یہاں آیت میں مفعول مذکور نہیں پھر "گھسنے" کا ترجمہ کیسا۔ اگر محاورے کو نظر انداز کر کے لغت ہی کی پیروی کرنی تھی تو کم سے کم اتنا کرتے کہ لفظ "باطل" فقرے میں رکھدیتے جیسے کہ علامہ آلوسی نے رکھا ہے یا جیسے کہ شاہ عبدالقادرؒ نے ترجمہ کیا ہے۔" اور بیٹھے تھے وہ بیچ باطل کے مانند اس کے کہ بیٹھتے ہو تم باطل میں" (حالانکہ یہ ترجمہ بھی مقلوب ہے۔ لکھنا یوں چاہیئے تھا کہ بیٹھتے ہو تم باطل میں مانند اس کے کہ بیٹھے تھے وہ بیچ باطل کے)

مولانا اشرف علیؒ نے ترجمہ فرمایا ہے۔" اور تم بھی بری باتوں میں ایسے ہی گھسے جیسا وہ لوگ گھسے تھے۔"

مولانا مودودی نے بامحاورہ ترجمہ کرنے کی کوشش کی

"اور ایسی ہی بحثوں میں تم بھی پڑے جیسی بحثوں میں وہ پڑے تھے۔"

ہماری ناچیز رائے میں یہ ترجمہ بھی محل نظر ہے۔ عمدہ بامحاورہ ترجمہ شیخ الہندؒ کا ہے۔" اور تم بھی چلتے ہو انھی کی سی چال۔"

گھسنا دسنا کچھ نہیں۔ مقصد قرآن ٹھیک وہی ہے جو شیخ الہندؒ کے ترجمے سے ظاہر ہے۔ زبان قرآن نے بامحاورہ استعمال کی ہے۔ جب یوں کہا جائے کہ خُضۡ این تشاء تو یہ ترجمہ نہیں ہوگا کہ گھسو جہاں تمہارا دل چاہے۔ بلکہ یوں ترجمہ کیا جائے گا:۔

"جہاں چاہے گو کھاتے پھرو"

"جھک مارتے پھرو جہاں چاہیے"

"خاک چاٹو جس گلی کی چاہے"

قرآن کی تمثیل کا تعلق نہ تو صرف کج بحثیوں سے ہے نہ کسی مخصوص بے راہ روی سے بلکہ وہ عام روش باطل جو پچھلوں نے اختیار کی تھی مجموعاً اسی کی طرف اشارہ ہے۔" جیسے پچھلے پہلوں کے تھے ویسے ہی تمھارے بھی ہیں" جو وطیرے انھوں نے اختیار کئے وہی تم بھی کر رہے ہو۔

تطویل کی معافی۔ یہ قرآن ہے۔ اس کی زبان عربی مبین ہے۔ ترجمہ بھی اردوئے مبین ہی کی شان کا ہو تب بات ہے ورنہ زبان تو سبھی کے منہ میں اور قلم سبھی کے ہاتھ میں ہے۔!

(۵) آیت ۷۹:۔ کہا جا رہا ہے کہ جو لوگ آج مسلمانوں کا مذاق اڑا رہے ہیں اللہ خود ان کا مذاق اڑائے گا اور انھیں دردناک عذاب دے گا۔ آیت کے الفاظ ہیں ——

—— سَخِرَ اللّٰهُ مِنۡهُمۡ:۔ ممدوح نے اس کا ترجمہ کیا ہے:۔

"اللہ ان کا تمسخر انھیں پر الٹ رہا ہے۔"

اس ترجمے میں ایک لطیف خامی ہے۔ قرآن کا مقصود یہ بتانا ہے کہ آج جو لوگ مسلمانوں سے تمسخر اور استہزا کر رہے ہیں انھیں کل ان کے اس مجرمانہ روش کا بدلہ عذاب الیم کی صورت میں دیا جائے گا۔ خود ممدوح نے تفسیری نوٹ میں یہ الفاظ لکھے ہیں:۔

"یعنی ان کے تمسخر کی خوب سزا انھیں دے کر رہے گا۔"

گویا جس طرح عذاب الیم فوری طور پر نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ آئندہ دیا جائے گا اسی طرح اس فقرے کا مطلب بھی یہی ہے کہ تمسخر کی سزا آئندہ ملے گی۔ نہ یہ کہ فی الحال ہاتھوں

ہاتھ مل رہی ہے۔ جب یہ مطلب ہے، اور فاضل مفسر بھی اس سے متفق ہیں تو ترجمے میں حالیہ فقرہ کیوں استعمال کیا گیا "الٹ رہا ہے" کا مصداق تو یہ ہوا کہ جس وقت یہ لوگ تمسخر کر رہے ہیں اسی وقت ان کا تمسخر ان پر الٹا جا رہا ہے۔

مولانا اشرف علیؒ نے یہ ترجمہ کیا:۔ "اللہ تعالیٰ ان کو تمسخر کا بدلہ دے گا۔"

شاہ عبدالقادرؒ نے یہ ترجمہ کیا:۔ "اللہ تعالیٰ انکو جزا ٹھٹھے کی دے گا۔"

حضرت شیخ الہندؒ نے یہاں خالصۃً الفاظ کی پیروی کرتے ہوئے یہ ترجمہ فرمایا:۔ "اللہ نے ان سے ٹھٹھا کیا ہے۔"

یہ فقرہ نحوی اعتبار سے ماضی کا بیان ہے۔ قرآن کا لفظ سَخِرَ چونکہ ماضی ہی کا صیغہ ہے اس لئے لفظی اتباع میں ترجمہ بھی اسی کے مطابق کر دیا جائے تو اعتراض کی گنجائش نہیں لیکن "الٹ رہا ہے" ماضی نہیں حال ہے اور حال کے لئے عربی میں مضارع کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ترجمہ نہ لفظی رعایت کا حامل ہوا نہ معنوی رعایت کا۔

(۱۱) آیت ۸۷:۔ وَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ

ممدوح کا ترجمہ:۔ "اور ان کے دلوں میں مہر لگ گئی وہ سمجھتے ہی نہیں۔"

اس میں کئی جھول ہیں۔

ایک یہ کہ طُبِعَ صیغۂ مجہول ہے مگر ترجمہ بصیغۂ معروف کیا گیا۔ مجہول سے معروف کی طرف یا معروف سے مجہول کی طرف گریز کسی معقول بنا پر تو مناسب کہا جا سکتا ہے لیکن یہاں کوئی وجہ موجود نہیں۔ "لگ گئی" کی جگہ "لگا دی گئی" ہونا چاہئے تھا۔ ممدوح نے اتباع مولانا اشرف علیؒ کا کیا ہے اور ان کے بھی الفاظ یہی ہیں مگر اتباع ہنرمندی میں ہونا چاہئے بھول چوک میں نہیں۔

شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ یہ ہے:۔ "اور مہر کی گئی ہے اوپر دلوں ان کے کے۔"

شیخ الہندؒ کا ترجمہ یہ ہے:۔ "اور مہر کر دی گئی ان کے دل پر۔"

مولانا مودودی کا یہ ہے:۔ "اور ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا گیا۔"

گویا یہ سب حضرات صیغۂ قرآنی کے مطابق مجہول ہی ترجمہ کرتے ہیں۔

دوسرا جھول یہ کہ "میں" کا محل نہیں۔ قرآن نے فی قلوبھم نہیں کہا علیٰ قلوبھم کہا۔ اردو میں بھی محاورۃً "دلوں پر مہر" بولتے ہیں "دلوں میں مہر" نہیں۔

تیسرا یہ کہ فَهُمْ کی فا کا ترجمہ نظرانداز ہو گیا حالانکہ اسے ضرور ملحوظ رکھنا چاہئے تھا۔ فا یہاں صرف تعقیب ہی کے لئے نہیں سببیت کے لئے بھی ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کا ترجمہ "پس" کیا۔ مولانا اشرف علیؒ نے "جس سے" اور حضرت شیخ الہندؒ نے "سو"۔ بہرحال فا کا ترجمہ ہونا چاہئے تھا۔ لطف یہ ہے کہ چند ہی آیات بعد جب یہ آیت معمولی تغیر کے ساتھ لوٹی ہے تو ممدوح کے ترجمے میں کوئی جھول نہیں پایا جاتا۔ وہاں "میں" کی جگہ "پر" ہی ہے اور فا کا ترجمہ "سو" موجود ہے۔ صیغے بھی ہم آہنگ ہیں۔

تفسیر ماجدی کی زیر تبصرہ دوسری جلد سورۂ توبہ پر تمام ہو گئی ہے۔ التوبہ کے ترجمے پر ہم نے نظر ڈال لی اب اس کے تفسیری نوٹوں کا جائزہ باقی رہ گیا ہے تو انشاء اللہ وہ بھی باقی نہیں رہے گا۔

از:- وحید الدین سلیم - حیدر آباد

پردہ اور حدودِ حجاب پر ایک فیصلہ کن بحث

آج سے کوئی دس سال قبل ماہنامہ "رفتارِ زمانہ" میں ایک مقامی اور جدید تعلیم یافتہ مسلم رہنما کا ایک نہایت مفصل انٹرویو شائع ہوا تھا اور اس میں دین و ملت کے اہم ترین مسائل پر گفتگو کی گئی تھی۔ اُسی زمانہ میں حیدر آباد سے مولوی ابو سعید صاحب (سابق امیر جماعتِ اسلامی شہر حیدر آباد) کی ادارت میں "صادق" نام کا ایک ہفتہ وار اخبار شائع ہوا کرتا تھا۔ راقم الحروف نے اس انٹرویو پر "ہیں خواب میں ہنوز ....." کے عنوان سے ۳۵ فلسکیپ صفحات پر مشتمل ایک طویل تنقیدی مضمون لکھا تھا اور طے یہ ہوا کہ تھا کہ یہ پانچ قسطوں میں شائع ہو۔ لیکن "صادق" میں صرف پہلی ہی قسط چھپی تھی کہ یہ اخبار بند ہو گیا اور مضمون کا بڑا حصہ چھپنے سے رہ گیا۔

متذکرہ انٹرویو میں پردہ اور حدودِ حجاب سے متعلق مولانا مودودی مدظلہ العالی کے افکار و آراء پر بھی اعتراف کئے گئے تھے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی تھی کہ مولانا اس معاملہ میں انتہا پسند واقع ہوئے ہیں اور ان کے مقابلے میں مولانا عبد الماجد دریا بادی راہِ اعتدال پر گامزن نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس دعویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ قارئین اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔ (سلیم)

پردہ[۱] کے متعلق "۔۔[۲]" کی وہی پالیسی ہے جو منشائے شرع شریف ہے۔ لیکن یہ مسئلہ قابلِ توجہ ہے کہ آیا شرعِ شریف میں پردہ کا وہی تصور ہے جو ہم طور پر سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں شروع ہی سے ہمارے پاس دو نقاطِ نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک[۳] تو وہ جو پردے کے بارے میں ایک سخت نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور دوسرے[۴] وہ جو کس قدر لچک دار نقطۂ نظر رکھتے ہیں، جیسے[۵] موجودہ دور میں مولانا مودودی اس نقطۂ نظر کے حامی ہیں کہ پردہ کو شدت کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ اس[۶] کے برخلاف مولانا عبد الماجد دریا بادی لکھتے ہیں کہ چہرہ اور چار دیواری کا پردہ قطعی طور پر کتاب و سنت سے تو ثابت نہیں ہے۔ (مضامین عبد الماجد)

یہ[۵] سمجھنا کہ احکام شرع شریف سخت پردہ کی حمایت میں ہیں ایک نقطۂ نظر ہے اس سے زیادہ نہیں۔ شرع شریعت میں گنجائش ہے کہ خواتین عفت مآبی کے ساتھ ضروریات کی تکمیل کے لئے باہر نکلیں۔

(رفتارِ زمانہ۔ جنوری ۱۹۶۴ء صہ ۲۵)

[۱] فی الواقع شریعتِ اسلامی کا منشاء کیا ہے پہلے اس کی وضاحت کر دینی چاہیئے تھی۔

[۳] - [۴] سخت اور لچکدار نقطۂ نظر تو جناب صدر کا صرف طبع زاد نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے پیچھے

[۲] یہاں اس مجلس کے نام کو حذف کر دیا گیا ہے جس کے وہ صدر ہیں۔ کیونکہ یہ تحریر صرف افادۂ عام کے لئے شائع کی جا رہی ہے۔

ونی اصول کارفرما نہیں ہے۔

۵ یہ رائے مولانا مودودی کی تالیف "پردہ" پڑھے بغیر رسے ہی اعتماد کے ساتھ دے دی گئی ہے حالانکہ "پردہ" سلامی لٹریچر میں ایک شاہکار کتاب ہے۔ اس پر مفصّل بصرہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کے "صدق" میں نکل چکا ہے۔ اس کی چند عبارتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں :-

"شریعتِ اسلامی کے مسائل حجاب، صنفی عدم اختلاط و مسائل متعلقہ کے خلاف جو مسلسل اور پُر زور پروپگنڈا مخالفین کی طرف سے عرصہ دراز سے جاری ہے، وہ یہاں کامیاب ہوگیا ہے کہ غیر تو غیر اپنوں کو لفظ "پردہ" سے شرم آنے لگی ہے۔ اور اب اگر کوئی پردہ اس "علم"، "آزادی" "روشن خیالی" کے زمانہ میں بھی اختیار کئے ہوئے ہے تو گویا وہ کسی شدید جرم کا مجرم ہے اور اُس کے ساتھ رعایت زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتی ہے کہ اُس پر ترس کھا کر اُسے چھوڑ دیا جائے۔ متفرق طور پر ضرورتِ پردہ پر اور حمایتِ پردہ میں اچھے اچھے رسالے اور مقالے لکھے جاچکے ہیں لیکن ضرورت اس کی تھی کہ کوئی مردِ حق اُٹھتا اور اس سلسلے کے سارے مسائلِ متعلقہ کو لیکر اُن پر ایک جامع و مفصّل بحث کرتا اور تعلقِ صنفی کے باب میں شریعت کے پورے نظام کو جزئیات و اطراف و جوانب کی فلسفیانہ تشریح کے ساتھ واضح کرتا۔"

"اللہ نے اس خدمت کے لئے وقت کے دوسرے مسائل دَورِ حاضرہ کے دوسرے فتن کی طرح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو چُن لیا اور مولانا کے قلم سے اس بحث پر ایک جامع و مبسوط تصنیف شائع کردی۔"

"کتاب کی اصل خوبیاں تو کتاب ہی کے مطالعہ سے نظر آسکتی ہیں مصنف کے استدلالِ محکم کا علم تو جبھی ہوسکتا ہے۔ جب خود تصنیف کو اوّل سے آخر تک ایکبار پڑھ لیا جائے۔"

تبصرہ کے ختم پر مولانا نے کتاب کے مطالعہ کی کیسی پُرزور سفارش کی ہے، ملاحظہ ہو:-

"موجودہ دَور میں تو اس کتاب کو ہر پڑھے لکھے گھر میں ہونا چاہیئے۔ خصوصاً نوتعلیم یافتہ گروہ کے حق میں تو اس کا مطالعہ اکسیر ہے۔ کوشش کرکے اس کے نسخے ہر پبلک لائبریری میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں پہنچانے چاہیئے اور اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ ایک ایک مغرب زدہ بہن سے منت سماجت کرکے اسے ایک بار تو شروع سے آخر تک پڑھوا ہی لیا جائے۔"

اپنی تحریر کے تسلسل میں مولانا عبدالماجد صاحب نے جگہ جگہ اصل کتاب پردہ کے اقتباسات بھی نمونتاً دیئے ہیں جنھیں بخوفِ طوالت یہاں حذف کردیا گیا ہے۔ اس پورے تبصرے کو پڑھ جائیے۔ اِس فاضلِ جلیل کے قلم صدق نوا سے کتاب "پردہ" پر تنقیص و اختلاف کا ایک لفظ بھی نہ ملے گا۔ شروع سے آخر تک تعریف ہی تعریف اور تحسین ہی تحسین کے کلمات پر یہ تبصرہ مشتمل ہے۔ اس مستند رائے کے بعد جناب صدر کے اس ارشادِ عالی "مولانا مودودی اس نقطۂ نظر کے حامی ہیں کہ پردے کو شدّت کے ساتھ نافذ کیا جائے گا۔" کا کیا وزن باقی رہ جاتا ہے؟ ایک عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے!

۵۶ لہٰذا نقطۂ نظر کی تائید میں، مولانا عبدالماجد دریابادی کے جو الفاظ انٹرویو میں پیش کئے گئے ہیں۔ ابتداء میں اُن کے ربطِ مضمون کا اندازہ نہ ہوسکا تھا لیکن خیال تھا کہ مولانا کی یہ رائے کتاب "پردہ" سے پہلے کی ہے۔ اس کے باوجود احکامِ پردہ سے متعلق مولانا عبدالماجد کے افکار کی تلاش تھی اور خود انہی کے مرتب کردہ مجموعۂ مضامین "انشائے ماجد" کی دو جلدوں میں بھی اس موضوع پر کچھ نہیں ملا۔ اسی اثناء میں اتفاقیہ طور پر مولانا غلام رسول دستگیر رشید کی مرتب کردہ کتاب "مضامین عبدالماجد" ہاتھ لگی اس میں "پردہ کے حدود" کے مزید عنوان سے ایک مفصّل مضمون

شامل ہے۔ یہ مضمون اندازے کے مطابق مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی "پردہ" والی کتاب سے بہت پہلے ہی کا نکلا۔ اور شاید اس بنا پر "انشائے ماجد" میں اس کو شائع کرنا مناسب نہ سمجھا گیا ہو۔

یہاں اگر حدودِ حجاب اور حدودِ ستر کے خاص فرق کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ بحث ہی ختم ہو جاسکتی ہے۔ مولانا عبدالماجد نے حدودِ پردہ پر اپنی تحقیق سے جو کچھ لکھا تھا اور اب اس کا درجہ خواہ کچھ ہی ہو، مولانا نے نہایت احتیاط سے کام لیا ہے اور "چہرہ" کی تعریف یوں کی ہے:۔

> "چہرے سے مراد صرف چہرہ ہی ہے نہ کہ چہرے کے حوالی واطراف اور جس حصے کے کھلے رہنے کی اجازت ملی ہے وہ صرف آنکھیں، ناک، منھ اور رخساروں کا ایک حصہ ہے جسے ٹھیٹھ اُردو میں "چہرہ کی ٹکیا" کہتے ہیں۔ کان، گلا، کنپٹی، سر، پیشانی کا اوپر کا حصہ اُن میں سے کسی حصے کے کھلے رکھنے کی اجازت نہیں۔" (ص ۱۶۱)

پھر اختتام مضمون پر یہ لکھتے ہیں کہ:۔

> "چہرہ کا پردہ اور چار دیواری کا پردہ میری ناقص فہم ومحدود بصیرت میں لازمی اور قطعی طور پر کتاب وسنت سے نہیں نکلتا۔ البتہ جہاں فتنہ کا امکان قوی یا احتمال ہو، وہاں یہ قیود اور ان کے علاوہ دوسری پابندیاں بھی ضروری ہو جائیں گی۔ اسلام نے ان پابندیوں سے روکا ہرگز نہیں ہے۔" (مضامین عبدالماجد۔ مرتبہ علامہ نیاز فتح پوری۔ صفحہ ۱۶۹۔ جلد دوم۔ ناشر)

مولانا کی ان عبارتوں پر غور کیا جائے تو کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے؟ چہرہ کے ایک متعین مفہوم کے ساتھ اور جس زمانہ میں چہرہ دکھانے کی اجازت دی گئی تھی، کیا آج کے فتنہ پرور حالات اور ابلیسی سماج میں اس اجازت کو استعمال کر کے شرم وحیا اور طہارتِ جسم وروح کے وہ ثمرات حاصل کئے جاسکتے ہیں جو اسلام کا مطلوب ہیں؟ ـــــ چنانچہ

چہرے کے حکم اور نقاب کے مسئلے پر مولانا مودودی نے علمی و عقلی تمام پہلوؤں سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ عورتوں کو گھر سے باہر نکلنا ہو تو چہرے کا کھلا رکھنا صحیح نہیں ہے۔

۵۷ خواتین کی عفت آبی کے ساتھ گھر سے باہر نکلنے کی صورت کو یہاں جس غیر محتاط طریقے پر بیان کیا گیا ہے اسکے برعکس اسی مضمون کو مولانا مودودی نے کس قدر احتیاط و توازن کے ساتھ اپنی کتاب "پردہ" میں "حاجات کے لئے گھر سے نکلنے کی اجازت" کے تحت لکھا ہے۔ ملاحظہ کیا جائے۔

> "...... وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کے حکم قرآنی کا منشاء یہ نہیں ہے کہ عورتیں گھر کے حدود سے کبھی قدم باہر نکالیں ہی نہیں۔ حاجات وضروریات کے لئے ان کو نکلنے کی پوری اجازت ہے۔ مگر یہ اجازت نہ غیر مشروط ہے نہ غیر محدود۔ عورتیں اس کی مجاز نہیں

۵۸ اُردو کے مشہور ادیب اور شرقیات کے اسکالر جناب مالک رام صاحب نے جس زمانے میں "عورت اور اسلامی تعلیم" والی کتاب لکھی تھی تو پہلی مرتبہ اپنے مسودے کو مولانا سید سلیمان ندویؒ کے پاس روانہ کرتے ہوئے خواہش کی تھی کہ وہ اس کو ملاحظہ فرمائیں اور اس پر مقدمہ بھی لکھیں۔ مولانا مرحوم نے اس کے بعض مقامات سے اختلاف کیا۔ اور اس پر مقدمہ لکھے بغیر ہی مسودہ واپس کر دیا۔ اس کے بعد اس کتاب کی اشاعت میں تاخیر کا تذکرہ کرتے ہوئے مالک رام صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

> "اس دوران خود مجھے غور وفکر کا موقع ملا، پہلے میں نے پردہ کی بحث میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ منھ چھپانا اسلامی پردے میں شامل نہیں لیکن بعد میں مزید مطالعہ اور قرآن وحدیث پر زیادہ دقتِ نظر سے غور کرنے پر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ منھ بھی اس حکم میں شامل ہے اور یہ بھی دو ایک جگہ حقیقت میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ میں نے نہ صرف (آئندہ صفحہ پر)

ہیں کہ آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں پھریں اور مردانہ اجتماعات میں گھل مِل جائیں۔ حاجات و ضروریات سے شریعت کی مراد ایسی واقعی حاجات و ضروریات ہیں جن میں درحقیقت نکلنا اور باہر کام کرنا عورتوں کے لئے ناگزیر ہو۔ اب ظاہر ہے کہ تمام عورتوں کے لئے تمام زمانوں میں نکلنے اور نہ نکلنے کی ایک ایک صورت بیان کرنا اور ہر ہر موقع کے لئے رخصت کے علیحدہ علیحدہ حدود مقرر کر دینا ممکن نہیں ہے۔ البتہ شارع نے زندگی کے عام حالات میں عورتوں کے لئے نکلنے کے جو قاعدے مقرر کئے تھے اور حجاب کے حدود میں جس طرح کمی و بیشی کی تھی اس سے قانون اسلامی کی اسپرٹ اور اس کے رجحان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور اس کو سمجھ کر انفرادی حالات اور جزئی معاملات میں حجاب کے حدود اور موقعہ و محل کے لحاظ سے ان کی کمی و بیشی کے اصول ہر شخص خود معلوم کرسکتا ہے۔" (پردہ صـــ ۲۳۹ پہلا ایڈیشن)

مولانا نے اس عبارت کے اگلے حصّہ میں ضروری مثالیں دے کر حدود و مواقع کے سمجھنے میں بھی مدد بہم پہنچائی ہے۔ اب اس نپے تلے نقطۂ نظر کو ترک کرکے ذوقِ عریانی کا سامان فراہم کرنا کیا کوئی صحیح رہنمائی ہے؟ ـــ بعض لوگ جدید ضروریات کا سہارا لے کر عورتوں کی آزادی کا یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اسلام لاکھوں غریب اور مزدور عورتوں کا ذمہ دار نہیں ہے لہٰذا انھیں چہرہ دکھانے اور گھر سے باہر نکلنے کی کھلی آزادی ہونی چاہیئے تاکہ وہ فیکٹریوں اور کھیتوں میں کام کرکے اپنا روزگار فراہم کرسکیں۔

بظاہر یہ مطالبہ بڑا وقیع اور دردمندی سے معمور معلوم ہوگا لیکن اسلامی معاشرت کے اُصولوں اور اُن کی حکمتوں پر غور کیا جائے اور اسلامی معاشرے میں عورت کے مقام و مرتبہ کو سمجھا جائے تو یہ مطالبہ ایک منطق سے زیادہ نہیں رہ جاتا بلکہ یہ ایک مطالبۂ ظلم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر تنزکیہ خیال منظور ہو تو مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے نکلی ہوئی یہ عبارت پڑھنے اور بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔

"اسلام نے چونکہ عورت کے سر گھر کی ذمّہ داریاں، خانہ داری کا انتظام اور نسلِ انسانی کی پرورش و تربیت کا بار ڈالا ہے، اس لئے کسبِ معیشت سے اسے بالکلیہ آزاد رکھا ہے۔ کما کر لانا اور گھر والوں کو کھلانا فرض مرد کا ہے۔ یعنی شوہر کا، باپ کا، بھائی کا، بیٹے کا یا کسی اور ولی جائز اور افسر خاندان کا۔ اور جن شاذ صورتوں میں عورت اِن ساری نعمتوں سے محروم ہو، وہاں اسلامی حکومت میں تو خود حکومت کی طرف سے اس کی خبرگیری کی جائے گی اور بدقسمتی سے جہاں اسلامی حکومت نہیں وہاں بھی ایسی بدنصیب عورت محلہ کی، پڑوس کی شریف زادیوں کے واسطے سے سلائی وغیرہ کا کوئی ہلکا کام بسرِ اوقات کیلئے اختیار کرسکتی ہے۔" (ایک سوشلسٹ سے از مولانا [illegible])

جہاں اسلامی حکومت نہ ہو وہاں اسلامی معاشرہ کی ذمّہ داریاں خود مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں۔ مسلمان اپنے معاشرہ کے توازن کو برقرار رکھنے اور اس کو تباہی سے

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) یہ مقام ہی بدل ڈالے بلکہ پورا مضمون نئے سرے سے دوبارہ لکھ کر اسے شائع کر دیا۔ جب یہ مطبوعہ نسخہ ان کی خدمت میں پہنچا تو انھوں نے اس کی تعریف فرمائی۔"

(علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم۔ از مالک رام معارف۔ سلیمان نمبر مئی ۱۹۵۵ء ص ۳۵۹)

اس واقعہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ خود مولانا سلیمان ندویؒ بھی حدودِ حجاب میں چہرہ دکھلانے کے قائل نہیں تھے۔ اور مقامِ حیرت ہے کہ مسلمانوں کے ایسے بھی رہنما موجود ہیں جن کا مطالعہ قرآن و حدیث مالک رام صاحب کے درجہ پر بھی نہیں۔ (وحید الدین)

بچانے کے لئے خود اپنے طور پر اس مسئلہ کا حل نکال سکتے ہیں اور اگر مسلمان اس طرح کی کوشش میں کامیاب ہو جائیں تو اس سے نہ صرف مسلم خواتین ہی کی مشکلات آسان ہو جائیں گی بلکہ بیسویں صدی کی مہیب مادہ پرست تہذیب میں عورت جو ایک کھلونا بن کر رہ گئی ہے اُس کے صحیح انسانی اور سماجی مرتبہ کا تحفظ ہو جائے گا اور اس تجربہ سے دوسری قومیں بھی فائدہ اٹھانے کی طرف مائل ہونگی۔

دَورِ جدید کے حیاسوز فتنوں سے مسلم معاشرہ کی فضا حد درجہ مسموم ہوئی جارہی ہے۔ اگرچہ اکابرِ ملت ایک عرصہ سے اس طوفان کے مقابلے کی مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں لیکن ابھی تک ہمارا عمومی ذہن ہموار نہ ہو سکا۔ نواب بہادر یار جنگ علیہ رحمۃ نے آج سے کوئی چونتیس برس قبل زنانہ اسلامیہ کالج لاہور میں اپنی ایک تقریر کے دوران حقائق اسلامی کا اظہار کرتے ہوئے ملت کو اس طرح چونکایا تھا:-

"افسوس کہ اب ہمارا چراغِ خانہ شمعِ محفل بننے کی طرف مائل ہے اور یہ تمنا دن بدن زیادہ ہو رہی ہے، شاید گھر کی وسعتیں ہماری ماؤں بہنوں کو تنگ معلوم ہونے لگی ہیں اور اپنے دماغ و جسم کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت محسوس کر رہی ہیں لیکن دنیا کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ مشرق اور اسلام نے آپ کو جو کچھ دیا ہے وہ کافی ہے آپ گھر میں اولاد پیدا کر کے اور ان کی تربیت کر کے اُس سے کہیں زیادہ خدمت انجام دے سکتے ہیں جتنی آپ باہر آکر دینا چاہتی ہیں۔ وہ ممالک جہاں یہ آزادی موجود ہے اُن کا نظامِ معاشرت درہم برہم ہو چکا ہے اور وہاں کے مفکرین اس فکر میں ہیں کہ عورتوں کو اُن کی اصلی جگہ پر دوبارہ کس طرح لایا جائے۔ میں اپنی بہنوں سے بہ ادب درخواست کروں گا کہ خدا کے لئے اپنی سوسائٹی اور معاشرہ کو تباہ نہ کیجئے۔ آپ اس مقام پر رہیئے جہاں آپ کو رکھا گیا ہے۔ آپ کی گود میں ہماری اولاد کھیل رہی ہے۔ آپ فخر کیجئے کہ آپ کو ایسا مقام حاصل ہے کہ آپ مرد کو صحیح معنی میں مرد بنا سکتی ہیں۔"

"اسلام نے عورت کو عورت اس لئے کہا ہے کہ وہ چھپائے جانے کے قابل چیز ہے۔ چنانچہ ہاتھ کے پہونچوں تک پاؤں کے ٹخنوں تک، ادھر گردن تک عام جسم کو مخفی رکھنے کا حکم ہے۔ اگر اس میں سے کوئی حصہ نہ چھپا ہو تو عورت عورت نہیں رہے گی۔ لہٰذا کم پوشی جائز نہیں۔ بدقسمتی سے ہماری بہنوں کا لباس اُوپر سے نیچے اور بعض حالتوں میں نیچے سے اُوپر آرہا ہے۔" (صدق، ۲۰ رمئی سنہ ۱۹۴۰ء)

یہ حالت تقریباً نصف صدی پہلے کی تھی تو یہ بتلانے کی مزید ضرورت نہیں کہ اب وہ ملت کہاں پہنچ چکی ہے جس کا غم نواب صاحب جیسے مخلص انسان کو تھا۔ ناچ، گانے، ڈرامے، سنیما کے برق آسا شوق نے اسکو کس درجہ تباہی پر پہنچا دیا ہو گا؟ اس کا اندازہ مشکل ہے۔ مخلوط تعلیم کے رواج اور فحش لٹریچر کی بڑھتی ہوئی اشاعت نے جذباتی ہیجان برپا کر کے ایک آگ سی لگا دی ہے اور لڑکیوں میں اعلیٰ تعلیم کا شوق تو اپنے غلط نتائج کے لحاظ سے ایک طوفانِ بے حیائی ہے جو مسلم معاشرے کی دھجیاں بکھیر رہا ہے اور آج عام صورتِ حال اس درجہ نازک ہو گئی اور تمام تر کوشش یہ کی جارہی ہے کہ شرم و حیا کی روایات ہی اپنی تہذیب سے اُڑا دی جائیں۔ اور ان تمام آثار کے رونما ہو جانے کے بعد ضرورتِ پردہ کو ایک سخت نقطۂ نظر ٹھیرا کر تھوڑی بہت گھروں میں بیٹھی ہوئی شریف زادیوں کے حوصلے بڑھا چڑھا کر اُنھیں باہر لانے کی ہے یا نواب بہادر یار جنگ، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا مودودی سے زیادہ شدید ہو کر، جملہ مسائل تشہیر کو

استعمال کر کر کے انھیں اسلامی تعلیم کو سمجھانے اور ہدایتِ حجاب دیتی ہے؟ — یہ ایک اہم ترین سوال ہے وراس کے دونوں پہلو تعمیر و تخریب، اسلام و جاہلیت سامنے آچکے ہیں۔ چنانچہ اس کا جواب اب ملت کے اجتماعی فیصلہ پر منحصر ہے کہ وہ اپنی فلاح و بقاء اور تہذیبی تحفظ و برتری کے لئے کون سی راہ اختیار کرتی ہے؟

ہفت روزہ عزائم (لکھنؤ) کا خاص نمبر

جد و جہد آزادی کی تاریخ۔ نتائج کیا نکلے۔ ہم کہاں پہنچے۔
ن تمام امور پر نہایت وقیع و دلچسپ اور مبصرانہ مضامین۔
ظم و نثر دونوں معیاری اور دلکش۔ یہ ضخیم نمبر آپ کے مطالعہ
لی چیز ہے۔ قیمت:— پانچ روپے ۲۵ پیسے۔
(پہلی فرصت میں طلب فرمائیں ورنہ ختم بھی ہو سکتا ہے)

ذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ تمیمی نجدی

آپ جانتے ہی ہیں کہ بدعتی حضرات اپنے سوا تمام مسلمانوں کو "وہابی" کے قب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ در اصل محمد بن عبدالوہابؒ کے نام نامی کی طرف نسبت ہے اور اس نسبت کو گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر آپ سچائی کے متلاشی ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ فرما کر اس حقیقت سے آگاہ وں کہ محمد بن عبدالوہاب کس قدر سنت کے شیدائی بدعت کے دشمن اور دین کے خیر خواہ تھے۔ انگریزوں نے انھیں بدنام کیا اور بدعتی لوگوں نے اس نامی میں چار چاند لگائے۔ اس کتاب کے مصنف "قطر" کے محکمۂ شرعیہ کے اضی احمد بن حجر ہیں اور ترجمہ صفی الرحمٰن الاعظمی نے کیا ہے۔ ترجمہ کے لاوہ فاضل مترجم نے بیش قیمت نوٹ بھی حواشی پر بڑھائے ہیں۔
ت۔ ساڑھے چار روپے ۴/۵۰

جمالِ مصطفیٰ | درد قریشی کی نعتوں کا دل کش مجموعہ
قیمت — ایک روپیہ ۱/-

دین و شریعت | اردو ایڈیشن۔ قیمت مجلد ۴/۲۵
انگریزی ایڈیشن ۱۵/-

صفائی معاملات | جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس کتاب میں مولانا اشرف علیؒ نے معاملات کی صفائی کے شرعی طور طریق بیان فرمائے ہیں۔ بڑے کام کا رسالہ ہے۔ قیمت صرف ۶۰ پیسے۔

معجزہ کیا ہے؟ | مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی ایک فکر انگیز تصنیف۔
معجزے کے تمام پہلوؤں پر علم و تفقہ کی روشنی میں۔
قیمت مجلد — ڈھائی روپے ۲/۵۰

شہدائے بدر | شہدائے بدر کے مختصر حالات و کوائف۔ ایک روپیہ ۱/-

فنِ اسماء الرجال | از:— مولانا تقی الدین مظاہری
علم الحدیث کا مدار راویوں کے حالات پر ہے اور ان حالات کو سمجھنا فنِ اسماء الرجال پر منحصر ہے۔ لہٰذا احادیثِ رسولؐ سے دلچسپی رکھنے والے تمام ہی مسلمانوں کے لئے یہ کتاب بنیادی فوائد کی حامل ہے۔ قیمت — ایک روپیہ ۵ پیسے ۱/۰۵

مکتوباتِ مجدد الف ثانیؒ | حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے خطوط تمام اہل علم میں ایمان و معرفت اور شریعت و طریقت کا گنجینہ سمجھے گئے ہیں۔ سلیس اردو ترجمہ کی صورت میں انھیں پڑھئے۔
مجلد جلد اول — پندرہ روپے ۱۵/-
جلد دوم — اٹھارہ روپے ۱۸/- جلد سوم — پندرہ روپے ۱۵/-

فضائلِ نماز | شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی مشہور کتاب۔ عکسی طباعت کیساتھ
قیمت — ایک روپیہ ۷۵ پیسے ۱/۷۵

حدیث دفاع (جنرل اکبر خاں) مجلد ——— ۱۲/-
مکتوبات حضرت علیؓ (مع اردو ترجمہ) ——— ۱۰/-
تصوف کی حقیقت (شاہ ولی اللہؒ) ——— ۵/-
مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد ——— ۷/-

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

(حبیب ریحان ندوی، لکچرار اسلامک انسٹی ٹیوٹ
البیضاء، لیبیا)

دین و شریعت کو نقصان پہنچانے والے چار گروہ

شریعت کے احکام واجب الاتباع ہیں

شریعت کے منصوص اوامر، واجب احکام اور مقرر کردہ حدود چاہے وہ عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات اجتماعیات اور سوسائٹی کی دوسری چیزوں سے ہر مسلمان کے لئے واجب الاتباع ہیں، ان کی مشروعیت کا منکر کافر ہے اور مرتد ہو جانے کے جرم میں اگر شروط توبہ مرتد کے ماتحت توبہ نہ کرے اور اسلام کے دائرہ میں واپس نہ آئے تو واجب القتل ہے۔ اس کو جان بوجھ کر مسلسل چھوڑنے والا بھی فقہاء کے آسان سے آسان اقوال کے مطابق لائق تعزیر ہے۔ یہ حکم ان غیر مختلف فیہ احکام کے بارے میں ہے جس میں واضح نص موجود ہے کہ نص کے بعد اجتہاد و قیاس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن فروعی، جزوی اور فقہی وہ احکام جن میں واضح نص نہیں ہے یا نصوص میں تعدد ہے یا کئی توجیہات و آراء ممکن ہیں یا اجتہاد و قیاس کی گنجائش ہے وہ اس سے خارج ہیں بلکہ ان میں اجتہاد و تفقہ، بحث و مباحثہ، صحیح طریقہ پر شریعت کی حکمت معلوم کرنا اور علمی اختلاف کے ذریعے صحیح حل تک پہنچانا صرف یہ کہ گناہ نہیں ہے بلکہ حسن نیت اور اجتہاد کی شروط کی موجودگی میں اور ضرورت کے وقت واجب اور ضروری ہے اور شریعت کی حکمت سے قریب تر صحیح حل پیش کرنے والا خوش قسمت دو ثوابوں کا مستحق ہوگا اور اجتہادی غلطی کرنے والے کو بھی ایک اجر اس کے حسن نیت اور سعی و جہد کا ضرور ملے گا [illegible]

کہ اسلام سب سے آخری پیغام ہے۔ یعنی کمال دین اور اتمام نعمت کی شکل میں اس طرح مکمل و محیط ہو چکا ہے کہ اب کسی دوسرے دین کے آنے کا امکان بھی نہیں ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین ہیں جن پر آخری شریعت نازل ہو چکی ہے۔ اس لئے اب کسی حقیقی یا مجازی، ظلی یا بروزی ظاہر یا باطنی نبی کے آنے کا امکان کسی مسلمان کے عقیدے میں شرعی و عقلی دونوں طریقوں پر ختم ہو گیا ہے۔ اور کیونکہ یہ شریعت دائمی ہے اور اس کی نصوص سے تمام پیش آنے والے مسائل میں اجتہاد و قیاس و استنباط کے شرعی طریقوں سے مناسب حل نکالنے ضروری ہیں کیونکہ زندہ و پائندہ شریعت کی یہی علامت ہے کہ وہ کسی بھی زمانے میں کسی بھی مشکل کا حل پیش کرنے سے قاصر و عاجز نہ ہو۔

محافظین اسلام کی فوج ظفر موج

ابتدائے اسلام سے آج تک بے شمار مفسرین، محدثین اور فقہاء و مجتہدین اسلامی عقیدہ و شریعت اور احکام کی حفاظت کرتے رہے۔ اس کے منصوص اوامر کی پابندی کرتے رہے، اسلام کے دائرۂ اعتقاد و عمل سے انھوں نے سر مو تجاوز نہیں کیا اور جدید مسائل کے لئے نص کی عدم موجودگی میں اجتہاد و قیاس کو کام میں لاکر نصوص شریعت کی روشنی میں شریعت کی حکمت کے مطابق احکام نکالتے رہے۔

بالکل اسی طرح شروع ہی سے بعض وہ افراد اور گروہ [illegible]

تشریعی عبادات اور منصوص احکام سے پیچھا چھڑانے کی کوششیں کرتے رہے ہیں۔ اختصار کے ساتھ ان گروہوں کو چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) مدعیان نبوت اور ان کے متبع

ایک وہ گروہ جو زیادہ جرأت مند اور باغی ہوتا ہے اور وہ مکمل طور پر دین سے انحراف کر لیتا ہے اور نبوت کا دعویٰ کر دیتا ہے اور کذاب کہلاتا ہے اور اس کے پیرو اسے کسی بھی صورت میں نبی مانتے ہیں۔ مدعیانِ نبوت میں بھی دو فرقے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو رسول اللہؐ کی نبوت کا انکار کر دیتا ہے۔ دوسرا وہ جو آپؐ کی نبوت کے اقرار کے ساتھ ساتھ اپنی نبوت کا اعلان بھی کرتا ہے۔ شرعی و فقہی اصطلاح اور حکم میں ان دونوں میں مطلق کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ گروہ درحقیقت کمال دین، اتمام نعمت، ابدیتِ اسلام اور محمد رسول اللہؐ کی رسالت کے دائمی اور قیامت تک ساری انسانیت کے لئے شامل و کامل و محیط اور آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا منکر ہے۔ کسی زیادہ عقلی ریاضت کی ضرورت نہیں یہ بات واضح ہے کہ کسی دوسرے نبی کے آنے کا امکان ہی اسلام اور رسولِ اسلامؐ کی ان تمام خصوصیات، امتیازات اور کمال و دوام کے جملہ نظریات و اعتقادات کا بطلان ہے۔

(۲) معطلین شریعت

دوسرا وہ گروہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو دین کے دائرے میں ثابت کرتے ہوئے دین میں ثابت شدہ شعائر، فرائض اور واجبات اور قوانینِ اسلام کا منکر ہو جاتا ہے۔ جیسے نماز یا کسی ایک فرض نماز کی عدم شرعیت کا اعلان، زکوٰۃ کے وجوب کا انکار، روزہ اور حج کا انکار یا سود، خنزیر، شراب، زنا اور دوسرے محرمات کے جواز کا اقرار، شادی بیاہ، مہر و طلاق اور میراث وغیرہ میں سے کسی بھی شرعی حکم کی عدم شرعیت کا اعلان (یہ خیال رہے کہ کسی واجب عمل کو چھوڑ دینے یا کسی حرام فعل کا ارتکاب کرنے پر گناہ ضرور ہوگا، لیکن اگر مسلمان اس کی حرمت اور وجوب کا قائل ہے تو وہ بادجود گناہ کے اسلام کے دائرے میں رہتا ہے) لیکن خدا کی نازل کردہ حرمت و حلت یا فرائض کا عقیدۃً انکار کر دینے والا بھی پہلے گروہ کی طرح فوری طور پر اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

(۳) دل سے نظام اسلامی کے محاسن کا منکر گروہ

تیسرا گروہ وہ ہوتا ہے جو دل سے اسلامی نظام کا قائل ہی نہیں ہوتا اور اسلامی نظام حیات میں اسے نقص نظر آتا ہے، اسلامی عبادات اسے مذاق معلوم ہوتی ہیں اسلامی نظامِ عائلی سسٹم، نظامِ میراث ظلم اور نظامِ اقتصاد غلط بنیادوں پر قائم نظر آتا ہے کہ وہ بھلا سود کو کیوں حرام کرتا ہے جب کہ تہذیبِ حاضر کے رگ و ریشے میں سود سرایت کئے ہوئے ہے۔ اسلام کا نظام حدود و جنایات تو اسے سب سے بڑی درندگی اور وحشت معلوم ہوتا ہے کیونکہ عصرِ حاضر کے فریب خوردہ تمدن نے اسے چوری، ڈکیتی، قتل و غارت، حرام کاری، حرام خوری اور شراب نوشی کا اس طرح عادی اور گرویدہ بنا دیا ہے کہ سوسائٹی سے ان گندگیوں کے ختم کرنے کا ارادہ ہی بدل دیا گیا ہے بلکہ قدریں بدل دی گئی ہیں، جھوٹ اور فریب کا نام سیاست پڑ گیا ہے چوری اور ڈکیتی جوانمردی اور بہادری کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ حرام کاری اور فواحش کا نام فن اور آرٹ ہو گیا ہے۔ الغرض یہ گروہ دل سے نظام اسلامی، قانون اسلامی اور تفکیر اسلامی کو قرونِ وسطیٰ کا نظامِ پارینہ تصور کرتا ہے۔ لیکن زبان و قلم سے ان چیزوں کا انکار نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ کو اسلام کا شیدائی اور دوست ثابت کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کی کوششیں اس لئے ہیں کہ اسلام کا نام روشن ہو، اسلام کے وہ مسائل جن پر اغیار ہنستے ہیں اور مضحکہ اڑاتے ہیں ان کو ہم اسلام ہی کی محبت و عظمت کی خاطر اور نیک نامی کی خاطر عصرِ حاضر سے قریب کرنے کیلئے ان میں تاویلات کریں اور مصلحت اور عرف وغیرہ کے نام پر

ان میں توافق پیدا کرنے یا متبادل کرنے کی کوشش کریں، پھر اس کوشش کے لئے یہ گروہ اجتہاد کی شرطوں کے فقدان، عربی زبان میں مہارت اور اسلامی علوم شریعت میں کامل معلومات نہ ہونے کے باوجود خود کو بزعم خود مجتہد کے منصب پر فائز کر لیتا ہے اور پھر خود ساختہ مسائل و مشاکل کی گرہ کشائی کے لئے اجتہاد و قیاس کی کلہاڑی چلانی شروع کر دیتا ہے اور اکثر مواقع پر اسے اس کی بھی خبر نہیں ہوتی کہ "لا اجتہاد مع النص" حکم کی موجودگی میں اجتہاد نہیں ہے۔ اسی طرح قیاس کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔ اور یہ گروہ نئے مسائل نہیں بلکہ پرانے اور شریعت میں منصوص مسائل کو اجتہاد و قیاس کا تختہ مشق بناتا ہے اور غلط نتیجے نکالتا ہے۔ اس گروہ کو جب تک کہ وہ صراحت کے ساتھ نظام اسلامی کو باطل، ناقص، غیر کامل اور عصر موجود کا ساتھ نہ دینے والا زبان و قلم سے ثابت نہ کرے ہم دین کے دائرے سے خارج نہیں کر سکتے نہ اس کے لئے سزائے ارتداد کا مطالبہ کر سکتے نہ اس کے خلاف جہاد واجب کر سکتے ہیں کیونکہ ہم ظاہری قول و فعل پر عمل کرنے کے مکلف ہیں باطن کے احوال اور نیتوں کے حسن و قبح پر فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔

(۴) اخلاص کے ساتھ غلط نتیجے نکالنے والا گروہ

ایک چوتھا گروہ وہ بھی ہوتا ہے جو واقعی انتہائی حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ اسلامی شریعت، قانون اور نظام حیات کے بارے میں جدید مسائل و مشاکل وغیرہ سے متعلق آراء کا اظہار کرتا ہے لیکن اس کے نتیجے اس لئے غلط ہوتے ہیں اور نقصان دہ بھی کہ وہ شرعی، عقلی اور علمی شرطوں کا حامل نہیں ہوتا۔ اجتہاد کی جو شرطیں ہیں ان میں اخلاص و حسن نیت صرف ایک شرط ہے۔ اسکے بعد بہت سی ایسی شرطیں ہیں جن کا موجود ہونا ازحد ضروری ہے مثال کے طور پر عربی زبان کو اس کے اصول و قواعد کے ساتھ جاننا، جملہ علوم تفسیر پر دسترس ہونا، حدیث کے علوم کے ساتھ فن حدیث کی اصطلاحوں سے باخبر ہونا، فقہ کے تمام مذاہب اور اقوال فقہا وغیرہ پر عبور ہونا وغیرہ اور یہ بات کوئی اسلامی اجتہاد ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے نہ یہ کوئی ایسی بدعت ہے جسے علماء حق جدید ریسرچ اسکالرز کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہوں۔ بلکہ دنیا کے ہر علم و فن کے قواعد اس سے کہیں زیادہ سخت ہیں۔ کیا انتہائی حسن نیت کے ساتھ کوئی شہرۂ آفاق، ماہر اور قابل ترین انجینیر کسی سرجن کی خدمات انجام دینے کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ اور اگر دماغی خلل یا عوام کی ووٹنگ اور رائے شماری میں اکثریت حاصل کرنے کے بعد (یعنی آپریشن کرنے کے لئے اگر کوئی گروہ اس کا نام پیش کر دے اور اکثریت سے وہ منظور بھی ہو جائے) کسی آپریشن کی جسارت کرنا چاہے تو کیا دنیا کا کوئی ماڈرن ترقی یافتہ حریت رائے کا دلدادہ اور عوامی ہاسپٹل اسے اس غیر مناسب کام کے کرنے کی اجازت دے دیگا؟ اگرچہ اس نے اپنے شوق سے سرجری کی کچھ کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھ بھی لی ہوں۔ یا کیا کسی ماہر اور بین الاقوامی فورشین سے کسی ملک کی وزارت تعمیر ایک پل، ڈیم یا عمارت کا نقشہ بنوانے سے متعلق سوچ بھی سکتی ہے؟ جب کہ وہ یورپ و امریکہ کی ساری معماری ترقی دیکھ بھی چکا ہو اور ملک کی عمارتوں کے اندر رہ بھی چکا ہو۔

اس گروہ پر بھی ہم نعوذ باللہ کفر و ارتداد تو دور کی بات ہے فسق کا حکم بھی نہیں لگا سکتے اور نہ بے ادبی اور گستاخی اور توہین کے جملے استعمال کر سکتے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص تعلیم دین کی شروط کے بغیر تعلیم و تبلیغ کیلئے نہ صرف یہ کہ تیار ہو جائے بلکہ علمائے دین، مفتیان شرع متین اور مجتہدین امت سے بھی زیادہ اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھنے لگے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ان سے زیادہ دین کی صحیح فہم، مصلحتوں، حکمتوں اور شریعت کے تقاضوں کو سمجھنے کا بھی مدعی ہو جائے اور آخری مرحلہ یہاں تک پہنچ جائے کہ علماء، فضلاء، فقہاء پر نکتہ چینی، عیب جوئی، توہین اور دین کی صحیح فہم نہ رکھنے اور حقیقی اسلام کی ترجمانی

نہ کرنے کی تہمت بھی شروع کر دے۔ یا دوسری مثال یہ کہ وعظ و تقریر کی شرعی صلاحیت و اجازت کے بغیر قرآن و حدیث و فقہ میں عبور حاصل کرنے سے پہلے وعظ اور تقریریں شروع کر دے اور وہ بھی اس دعوے کے ساتھ کہ جو کچھ ان وعظوں میں کہا جا رہا ہے وہی حق ہے اور اس کے سوا سب باطل ہے۔ تعلیم دین وقت کا ضیاع ہے۔ تالیف و تصنیف علمی غرور ہے وغیرہ۔

بہرحال چوتھے گروہ یعنی اخلاص کے ساتھ، لیکن اجتہاد علم کی شرائط کے بغیر اجتہاد کرنے والوں کے اخلاص کی ہم قدر کریں گے لیکن ان کے افعال و اقوال، تقریر و تحریر اور افراط و تفریط کو دین کا جزو ہرگز نہیں سمجھیں گے۔ ان حضرات کے ساتھ کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا، اسکی تفصیل چند سطر بعد پیش کی جائے گی۔

اوّل الذکر دو گروہوں کے ساتھ اسلامی حکومت کا طریقۂ کار

مدعی نبوت دین میں معلوم بالضرورہ اور واجب و حتمی عقیدے کے انکار کی وجہ سے دین سے خارج ہو جاتا ہے، اس لئے مرتد کی سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ مستحل الدم اور واجب الجہاد ہوتا ہے اور اس کے اس دعوے پر یقین کرنیوالے بھی گویا اسلام سے پھر جاتے ہیں اور غیر اسلامی نظریے کو قبول کرتے ہیں، اس لئے وہ بھی اسلام سے خروج کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی طرح دین میں واجب کسی منصوص فریضے کا انکار کرنے والے، جیسے نماز کا منکر۔ یا کسی ایک نماز کی شرعیت کا منکر یا زکوٰۃ کے وجوب کا منکر یا اسلامی عائلی قوانین کی شرعیت کا منکر یا اسلامی حدود کے وجوب کا منکر، مختصر یہ کہ شریعت کی حرام کی ہوئی کسی چیز کی حلت کا مفر با شریعت کی حلال کی ہوئی کسی چیز کی حرمت کا مدعی بھی دین سے خارج ہو جاتا ہے اور یہ دین میں معلوم و منصوص حکم ہے کیونکہ جس طرح شریعت کے ایک فریضے کو فرض کرنے والا خدا ہے بالکل اسی طرح دوسرے فریضے کو فرض کرنیوالا

بھی وہی ہے جس نے نماز فرض کی ہے اسی نے زکوٰۃ مقرر کی ہے جس نے شادی بیاہ کے احکام نازل کئے ہیں اسی نے میراث کے حصے مقرر کئے ہیں جس نے تجارت کو حلال کیا ہے اسی نے سود کو حرام کیا ہے، جس نے شہد کو حلال کیا ہے اسی نے خمر کو حرام کیا ہے، جس نے قصاص و حدود و تعزیرات نافذ کی ہیں اسی نے اقتصادی پریشانیوں کا نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی ناآسودگیوں کا علاج اور حل بھی بتایا ہے جس نے ماں باپ یا بیٹا بیٹی سے شادی کرنے کی ممانعت کی ہے اسی نے مشرک یا مشرکہ سے شادی حرام کی ہے۔ الغرض جس ذات ستودہ صفات نے طیبات کو حلال کیا ہے اسی ذات بے ہمتا نے تمام اشیاء خبیثہ کو حرام فرمایا ہے اس لئے کسی منصوص حرام چیز کے حلال ہونے یا اس کے برعکس کسی منصوص حلال چیز کے حرام ہونے کا عقیدہ اسلام سے خروج کیلئے کافی ہے کیونکہ اس سے خدا کی شریعت میں تفریق اور خدا کی حاکمیت کا انکار لازم آتا ہے۔

اسلامی حکومت ان دونوں گروہوں کو دین سے خارج کرنے میں کسی قسم کی تفریق نہیں کرتی اور ان کے ساتھ وہی طریقہ کار استعمال کرتی ہے جو خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیق اکبرؓ نے اختیار کیا تھا، آپؓ نے صحابہ کرام کے مشورے سے مدعیان نبوت، معطلین شریعت اور مانعین زکوٰۃ سب کو مرتدین کی فہرست میں شامل کر کے سب سے جہاد کا اعلان کیا تھا اور اس جہاد بر حق میں آپ کامیاب ہوئے تھے اور یہی سب سے بڑی دلیل صدیق اکبرؓ کے فیصلے کی صحت اور آپ کی خلافت کی حقانیت کی تھی کیونکہ قرآن کے معجزانہ بیان میں صاف طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ" (مائدہ۔ ۵۴) ترجمہ:۔ "اے ایمان والو

جو تم میں سے پھر جائے (مرتد ہو جائے) اپنے دین سے تو اللہ ایسی قوم (جماعت) کو لائے گا جن سے وہ محبت کریگا اور وہ اس سے محبت کریں گے۔ مومنوں کے لئے وہ نرم، کافروں کے لئے سخت ہوں گے۔ راہِ خدا میں جہاد کرینگے اور ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اللہ کشائش والا جاننے والا ہے۔"

اس آیت کی روشنی میں صاف پتہ چلتا ہے کہ صدیق اکبرؓ اور صحابہؓ نے مرتدین سے جو جہاد کیا وہ صحیح تھا اور آپ حق پر تھے اور شریعت کے کسی جزو کے منکر کے خلاف جہاد واجب ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں ایک دلیل ان لوگوں کے خلاف بھی موجود ہے جو نعوذ باللہ صدیق اکبرؓ ہی کو مرتد قرار دیتے ہیں عقلی و شرعی دونوں صورتوں میں اگر ایسا ممکن ہوتا تو پھر یقیناً کسی ایسے مومن گروہ یا جماعت کا آنا نصِ قرآنی کی رو سے ضروری تھا جو غلبہ حاصل کرتی اور حضرت ابوبکرؓ اور ان کے ساتھیوں کو شکست دے کر اور ان سے جہاد کر کے اسلام و ایمان کا پرچم بلند کرتی۔ لیکن تاریخ کا بیان اس کے بالکل برعکس ہے اور کسی مومن گروہ نے آپ کے خلاف جہاد نہیں کیا اور جن بھی مرتدین اور مانعین سے آپ نے جنگ کی اس میں غلبہ حاصل کیا۔ اور محض خدا کی مدد کے ذریعے بے سروسامانی کے باوجود اپنی کامیابی کے یقین کے ساتھ آپ نے تمام مخالف طاقتوں کا مقابلہ کیا اور سال بھر کی قلیل مدت میں آپ نے جزیرۂ عرب کو تمام مرتدین، مدعیانِ نبوت، معطلینِ شریعت اور مانعینِ زکوٰۃ کے فتنوں سے پاک کر دیا۔ یہ بات یقیناً نصِّ قرآنی اور تاریخ کی روشنی میں صحیح ہے اور خلیفۂ رسول اللہؐ کی خلافت پر اجماعِ امت کے بعد ایک اور زندہ و متحرک دلیل ہے۔

مرتدین سے جہاد کی شرطیں بھی وہی ہیں جو صدیق اکبرؓ نے واضح کی ہیں اور جن کا اشارہ قرآن پاک میں ملتا ہے۔ یعنی یہ کہ مرتد کو توبہ کی مہلت دی جائے گی۔ صحیح ترین فقہی مذہب یہی ہے کہ مرتد کی توبہ قبول کی جائے گی اور اسے سوچنے اور رجوع کرنے کی مہلت بھی دی جائے گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (بقرہ - ۲۱۷)

ترجمہ:- "اور جو تم میں سے اپنے دین سے پھر گیا اور اس حالت میں مرا کہ وہ کافر ہو تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہو جائیں گے اور وہ آگ والے ہونگے اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

آیت میں یہ تصریح کہ "اس حالت میں مرے کہ وہ کافر ہو" اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اگر وہ کفر سے توبہ کر لے تو اس کی توبہ مقبول ہوگی اور وہ کفر سے اسلام میں داخل ہو سکتا ہے اور آگ سے بچ سکتا ہے۔ اس آیت کی روشنی میں فقہائے امت نے بحثیں کی ہیں جن کا خلاصہ یہی ہے کہ اکثریت کے نزدیک مرتد کی توبہ قبول ہوگی اور اس کو مہلت بھی دی جائے گی، اور یہ قول اسلام کی عدالت اور جہنم سے بچا کر سلامتی میں داخل کرنے کی اسکی صلاحیت اور قرآن میں توبہ و مغفرت کے عام اصولوں کے موافق بھی ہے اور صدیق اکبرؓ کے عمل سے بھی ثابت ہے۔ آپ نے مرتدین کے تمام گروہوں کے پاس جب فوج بھیجی تھی تو توبہ کی شروط اس طرح واضح طور پر لکھ کر ارسال کی تھیں۔

"میں تمہارے پاس یہ فوج رہا ہوں اور میں نے یہ حکم دیا ہے کہ کسی سے جنگ اس وقت تک نہ کی جائے جب تک اس کو خدا کی دعوت نہ دی جائے، جس نے اس دعوت کو قبول کیا، اسلام کا اقرار کیا اور ارتداد سے باز آیا اور عمل صالح کیا اس کی توبہ قبول کی جائے گی اور اس کی مدد کی جائے گی۔" (تاریخ طبری ۳ - ۲۵۱)

اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب کسی نے بھی توبہ کی اور دین کی طرف رجوع کیا صدیق اکبرؓ نے

اور آپ کے سپہ سالاروں نے اس کی توبہ قبول کی اور اسلام کا دروازہ اس کے لئے کھولے رکھا، بلکہ یوں کہئیے کہ اسلام کی دعوت ہی کے لئے آپ نے جہاد کیا تاکہ وہ لوگ دوبارہ اسلام کے کلی نظام میں داخل ہو جائیں۔ صدیق اکبرؓ کے اکثر خطوط اور احکام میں یہ جملہ بھی ملتا ہے کہ "اسلام کے سوا ان سے اور کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی" جو صاف اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اور دوسری طرف اس حقیقت کا اعلان بھی ہے کہ دین میں تجزیہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک کل ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط طریقے پر مربوط ہے، اور یہ ناممکن ہے کہ ادھورا اسلام قبول کیا جائے۔ نماز قبول کر لی جائے اور زکوٰۃ نہیں، توبہ کی قبولیت اور اسلام میں داخل ہو جانے کی دعوت اتنی عام تھی کہ غور کیجئے مشہور مدعیۂ نبوت سجاح بنت الحارث بن سوید بن عقفان التمیمیہ نے جب دعوائے نبوت چھوڑ کر دوبارہ اسلام قبول کر لیا تو طبری کی روایت میں ہے کہ "اس کا اسلام اچھا ہو گیا تھا" (تاریخ طبری ۳-۲۷۵) ابن اثیر نے اپنی ایک روایت میں مزید یہ تصریح بھی کی ہے کہ "وہ تغلب میں تھی تا آنکہ حضرت معاویہؓ نے عام الجماعۃ میں اسے بصرہ منتقل کیا، بنی تغلب کا اسلام اچھا ہو گیا تھا۔ اور سجاح بھی مسلمان ہو کر اچھی مسلمان بن گئی تھی۔ بصرہ میں اس کا انتقال ہوا اور سعرہ بن جندب والی (گورنر) بصرہ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی" (الکامل ۲-۲۵۸)

مختصر یہ کہ کسی علوم بالضرورہ اور منصوص اسلامی عقیدے کا انکار یا دعویٰ جیسے خدا یا نبی کا انکار یا اُلوہیت و نبوت کا دعویٰ کرنے والا یا شریعت کے جملہ احکام کو معطل کرنے اور نہ ماننے والا یا شریعت کے کسی واجب یا حرام چیز کی حرمت یا حلت کا دعویدار اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور اسلامی حکومت وقت پر اس کے خلاف جہاد اس صورت میں واجب ہو جاتا ہے جب کہ وہ مہلت کے باوجود اسلام کی طرف رجوع نہ کرے اور توبہ نہ کرے۔

آخر الذکر دو گروہوں کے ساتھ اسلامی حکومت اور علماء کا رویّہ

اگر اسلامی حکومت قائم ہو اور اسلامی حاکم (خلیفہ) اسلامی اصولوں کی بنیاد پر حکومت کرتا ہو اور اسلامی شوریٰ کا نظام قائم ہو تو آخر الذکر دونوں گروہوں کا وجود ہی نہ ہو کیونکہ اسلامی نظام میں اسلامی تفکیر اور خصوصاً اسلامی قانون سے متعلق اُمور قرآن وحدیث و فقہ کے افاضل، مجتہدینِ امت اور قاضی (جج) ہی بیان کریں گے اور جب تک ان میں شروطِ اجتہاد نہ پائی جائیں یا کم از کم وہ اسلامی علوم سے خاطر خواہ آراستہ نہ ہوں ان سے خالص اسلامی قانونی مسائل میں کوئی مشورہ ہی نہ لیا جائے گا۔ چاہے وہ بدنیتی اور عدم اخلاص سے یہ کام کرنا چاہیں اور چاہے حسنِ نیت اور اخلاص سے ——— اور یہ کوئی ظلم وستم نہ ہو گا اور نہ اسلامی تفکیر کو علماء و فقہاء کے گروہ میں محصور کر دینے والی تہمت اس پر صادق آئے گی بلکہ یہ خالص ایک علمی عقلی بات ہو گی۔ آج بھی دنیا کی بڑی سے بڑی جمہوری اور عوامی حکومتیں جو عوام کے نام اور حریت کے اقدار پر قائم ہیں جب کوئی قانونی مسئلہ سوچتی ہیں تو سب سے پہلے قانون کے ماہرین، ججوں اور وکیلوں کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔ آپ نے کبھی یہ نہ سنا ہو گا کہ کسی جمہوری ملک میں جب قانونِ فوجداری بننے لگا تو عوامی حقوق اور فہم انسانی میں برابری وغیرہ کے نعروں اور دعووں کے پیش نظر ججوں اور وکیلوں کے بجائے شاعروں سے مدد مانگی گئی خواہ وہ غالب، میر، اقبال، ٹیگور، شکسپیر، ورجل، ہومر، ہیوگو اور فردوسی جیسے استادانِ سخن ہی کیوں نہ ہوں یا جب قانونِ دیوانی کی تشکیل کا وقت آیا تو ڈاکٹروں کو اس کام کی دعوت دی گئی چاہے وہ بقراط، جالینوس، ابن سینا اور ابن نفیس جیسے حکماء ہی کیوں نہ ہوں یا اقتصادی نظریات اور مسائل کیلئے کوئی شخص آدم سمتھ، مل، کینز وغیرہ کی کتابیں چاہے وہ تنقیدی حیثیت ہی سے ہوں پڑھنے کے بجائے سائنسدانوں

علوم پڑھنا شروع کردے چاہے وہ گلیلو، کوپرنیک، نیوٹن، رائنسٹائن ہی کیوں نہ ہوں۔

مختصر یہ کہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہر علم و فن کے کچھ شرطیں ہوتی ہیں اور طویل عرصہ ان علوم میں گذارنے کے بعد بھی انسان ان پر پوری طرح قادر نہیں ہو پاتا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی بھی علم میں بغیر صحیح معلومات کے دخل اندازی کرے یا یہ دعویٰ کردے کہ جنھوں نے اپنی عمریں کسی موضوع یا علم میں گذاری ہیں وہ اس کو صحیح نہیں سمجھتے اور میں اس کو صحیح سمجھتا ہوں۔ اس قسم کا دعویٰ کسی بھی علمی اور تحقیقی موضوع میں کرنے والے کو پاگل ہی تصور کیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اگر کوئی ڈاکٹر انجینیرنگ میں سارے انجینیروں سے زیادہ، یا اس کے برعکس کوئی انجینیر ڈاکٹری میں سارے اسپیشلسٹ ڈاکٹروں سے زیادہ معلومات اور صحیح نتیجے، نقشے اور امراض کی تشخیص کا مدعی ہو جائے تو یقیناً عقل و حواس کی موجودگی میں کوئی شخص اس کے اس دعوے کو صحیح ماننا تو دور کی بات ہے سننا بھی گوارا نہیں کریگا۔

بہر حال کیونکہ خلیفہ اسلامی خود بھی مجتہد ہوتا ہے اور علماء و فقہاء اس کی مجلس شوریٰ میں ہوتے ہیں اس لئے کسی بھی فقہی اور قانونی مسئلے میں انھیں کی رائے اور مشورہ لیا جائے گا اور جن کے پاس ان موضوعات میں اجتہاد کی صلاحیت نہ ہوگی یا غیر متعلق ہوں گے ان سے کسی قسم کا نہ مشورہ کیا جائے گا اور نہ ان کو دین کے بارے میں اندازے اور تخمینے سے گفتگو کرنے کی اجازت ہوگی اور اس طرح یہ دونوں گروہ صحیح اسلامی حکومت کی موجودگی میں پائے ہی نہیں جائیں گے۔

اسلام علماء و فقہاء کے طبقہ کے لئے مخصوص نہیں

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک اہم نقطہ واضح کردوں۔ وہ یہ کہ اس قسم کے جملے "اسلام کسی خاص طبقے یا گروہ کے لئے مخصوص نہیں" یا "اسلام صرف علماء و فقہاء کی میراث نہیں ہے۔" اکثر سننے میں آتے ہیں اور یہ ایک حیثیت سے صحیح بھی ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ اسلام میں یہ تفریق نہیں کہ خواص کے لئے کچھ خاص احکام ہوں اور عوام کے لئے کچھ دوسرے احکام یا علماء و فقہاء اور بزرگ خدا اور بندوں کے درمیان ایسا واسطہ ہوں کہ ان کے بغیر انسان دعا نہ کرسکتا ہو اور جنت کا ٹکٹ نہ حاصل کرسکتا ہو۔ خدا بھلا کرے فقہاء کا، ان میں کے ایک شہرۂ آفاق فقیہ امام سرخسیؒ نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جن لوگوں کی گواہی قبول نہ ہوگی ان میں ایک "وہ شخص بھی ہے جو الہام کو علم میں حجت مانتا ہو کیونکہ وہ اس بنیاد پر کسی کے خلاف گواہی دے سکتا ہے" (المبسوط۔ سرخسی) سبحان اللہ یعنی اسلام میں الہام، باطن وغیرہ کے نام پر علماء کو اپنی من مانی کرنے کی اجازت نہیں ہے اور حجت صرف کتاب و سنت کے ظاہری اقوال ہیں جن کی روشنی میں استنباط و اجتہاد کرنے کے وہ لوگ مجاز ہیں جو اسکی صلاحیت رکھتے ہوں اور جب اس کی ضرورت ہو۔ اسی لئے اسلام میں یہ نہیں ہے کہ عوام کے لئے پانچ نمازیں ہوں اور علماء کے لئے تین یا عوام شریعت پر چلنے کے مکلف ہوں اور خواص اس کے مکلف نہ ہوں بلکہ شریعت کے نام پر شریعت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی انھیں اجازت ہو۔ یا دینی تعلیم اور علوم سے کسی کو یہ کہہ کر باز رکھا جائے کہ تم عالم کے بیٹے نہیں ہو، یا تم فلاں ذات سے تعلق رکھتے ہو اور علم شریعت نہیں سیکھ سکتے ــــ مطلب یہ ہوا کہ عمل کا دائرہ اسلام میں سب کے لئے برابر ہے اور علم حاصل کرنے کی ترغیب ہر ایک کو دی گئی ہے اور اس کا دروازہ ہر ذات اور ہر قبیلے اور ہر قوم کے لئے کھلا ہوا ہے۔ لیکن اگر اس کا مطلب کوئی یہ نکالنا چاہے کہ علماء و فقہاء کے علاوہ سب کو اسلام کی ترجمانی، اجتہاد، فتویٰ اور تعلیم و تدریس کا حق ہے اور بغیر عربی زبان جانے اور بلا علم حاصل کئے وہ متفق علیہ مسائل کو چھوڑ کر مختلف فیہ اور علمی مسائل میں مشورہ دینے اور لوگوں کو ورغلانے کا حق رکھتا ہے تو یہ ایک غلط اور

قصان دہ اور نامعقول بات ہے اور اس سے فلاں ہے معدا
ور فتنے متحقق ہیں۔ ہر مسلمان کو دین پر عمل کرنے کا نہ صرف
ق ہے بلکہ یہ اس پر فرض ہے اور اگر تحقیقی علم نہیں رکھتا
و علماء سے رہنمائی حاصل کرنے کے بعد وہ شریعت پر عمل
کرنے کا مکلف ہے۔ لیکن اسلام کی ترجمانی، تدریس، افتاء،
قضاء یہ سب وہ مناصب ہیں جن کے لئے کچھ شروط، اصول،
ضوابط اور قواعد ہیں جب تک انسان ان کا حامل نہ ہو
شرعی و عقلی طور پر اسے ان پر فائز نہیں کیا جا سکتا مثال
کے طور پر کسی شخص کو سورۂ فاتحہ اچھی طرح یاد نہ ہو تو اسکو
امامت کے لئے کیسے آگے بڑھایا جا سکتا ہے؟ یا کسی کو فقہ
پر عبور نہ ہو اور فتویٰ دینے کا وہ اپنے آپ کو مجاز سمجھنے لگے،
حدیث کی صحت، حسن و قبح اور ضعیف و موضوع کا نیز
قرآن کے ناسخ و منسوخ، خاص و عام، مطلق و مقید اور دوسرے
فنی پہلوؤں کا مطلق علم نہ ہو اور بلا تکلف تقریریں کرنے
لگے اور وعظ کی خدمات انجام دینے لگے، یا تفقہ فی الدین
کی بنیادی شرط نہ ہو اور دین میں صرف اپنے آپ کو
حق پر اور دوسروں کو باطل پر تصور کرنے لگے تو ان سب
مذکرہ بالا صورتوں میں صرف اس کی عقل کا فتور و قصور
ثابت ہوگا۔ علماء و فقہاء و محققین و مجتہدین کی اس طرح نہ
شان گھٹ سکتی ہے اور نہ ان کے علمی و تحقیقی کارناموں اور
اسلام کی حفاظت و دفاع اور تبلیغ و اشاعت کی عظیم الشان
مثالوں اور شاندار کوششوں پر پانی پھیرا جا سکتا ہے اور
نہ اسلام کی ترجمانی کا شرعی و فقہی حق ان سے چھینا جا سکتا
اور نہ کسی دوسرے کو دیا جا سکتا ہے۔

علمائے امت کا کام

جیسا کہ بیان کیا جا چکا اگر صحیح اسلامی حکومت قائم
ہو تو اول الذکر دونوں گروہوں کو حق کی طرف واپس لانے
کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور زبان و قلم سے آگے بڑھ کر
اس معاملے میں شمشیر و سناں استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ
کیا جائے اور آخر الذکر دونوں گروہ وجود ہی میں نہ آئیں۔
اور اگر کسی طرح پیدا ہو بھی جائیں تو بہت جلد ان کا اثر ختم ہو
جائے لیکن جب خلیفہ موجود نہ ہو، یا صحیح اسلامی حکومت قائم
نہ ہو یا جہاں اسلامی اکثریت ہی نہ ہو۔ الغرض یہ کہ کسی بھی
وجہ سے دین و شریعت کو نقصان پہنچانے والے یہ گروہ
نمودار ہوں تو اس صورت حال میں امت کے علماء، فقہاء،
اور شریعت کے محافظین کا یہ فریضہ ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح
اسلامی عقیدے کی اشاعت کریں اور دین میں اصولی اور
بنیادی عقائد، توحید، نبوت وغیرہ کی واضح تشریح کریں اور شریعت
کے کلی احکام اور دائمی ضرورت اور شریعت کے کسی حکم کے
انکار سے پوری شریعت کے انکار کی کیفیت کو کھول کر بیان
کریں تاکہ امت اول الذکر دو گروہوں کے شر سے محفوظ ہو جائے
اور یہ بات اس پر عقلاً اور شرعاً علم الیقین کے درجہ تک واضح
ہو جائے کہ اسلام آخری دین ہے اور کمال دین اور اتمام نعمت
کے بعد اب نہ کوئی دوسرا دین نازل ہو سکتا ہے نہ کوئی دوسرا
رسولؐ اور نہ کوئی دوسری شریعت۔

نیز علماء کو آخر الذکر دو گروہوں کے نقصان سے امت
کو بچانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ زندگی کے نئے سے نئے
مسائل کے حل اور علاج کے لئے شریعت کے منصوص احکام
کی عدم موجودگی میں قیاس و استنباط و اجتہاد کے ذریعے شریعت
کی حفاظت و بقا اور جدت، تازگی اور ارتقاء کا سامان بہم
پہنچائیں جو الحمد للہ اہل علم و اجتہاد پوری کوشش و محنت
کے ساتھ تمام دنیا میں کر رہے ہیں۔ جس کے لئے وہ یقیناً امت
کی طرف سے مشکور اور خدا کی طرف سے ماجور ہونگے۔ کیونکہ
کسی بھی زندہ اور پائندہ شریعت کی علامت یہی ہے کہ تا
قیامت کسی بھی موجودہ یا متوقع ضرورت، مشکل یا مسئلہ کا
حل پیش کرنے سے وہ عاجز نہ ہو۔ اگر خدانخواستہ کسی مشکل کا
حل شریعت کی روشنی میں کوئی نہ کر سکے تو شریعت کے عجز و
قصور کی دلیل نہیں بلکہ اس شخص کے جمود و رجعیت یا بے قید
آزادی کی دلیل ہے۔ شریعت مطہرہ زندہ اور منور شریعت
ہے اور خالق انسان و کائنات کی اتاری ہوئی ہے اس لئے
تاقیامت انسان کی ہر ترقی اور کائنات کی ہر تجلی کا ساتھ

دینے کی صلاحیت رکھتی ہے اور جس طرح سورج کی روشنی اور حرارت کی اہمیت اور ضرورت کسی بھی سائنسی دور میں کم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح شریعت کی روشنی تا قیامت ہر دور میں انسانیت کی صحیح رہنمائی کرتی رہے گی اور اس کی حیثیت مینارۂ نور کی رہے گی جو دوسروں کو راہِ مستقیم دکھلاتا ہے۔ علمائے فقہ و شریعت کا کام یہ ہے کہ شریعت و فقہ کے استدلالی اصولوں اور عصرِ حاضر کے علمی طریقوں کے امتزاج کے ساتھ ان گروہوں پر نصوصِ الٰہیہ کی قطعیت، احکامِ الٰہیہ کی فرضیت، حدودِ الٰہیہ کا وجوب اور شریعتِ الٰہیہ کی فوقیت ثابت کر دیں۔ متشککین کے اعتراض و اقوال اگر حسنِ نیت اور اخلاص کے ساتھ ہوں گے تو وہ عقل و منطق اور دین و شریعت کی اس حجتِ بالغہ کو سن کو دور ہو جائیں گے اور ساتھ ہی ساتھ حیران و پریشان عوام بھی شریعتِ حقّہ کی تمام خوبیوں، ہر زمانے کا ساتھ دینے والی صلاحیت، عدل و عدالت دونوں سے متصف ہونے کی خصوصیت اور تمام انسانی قوانین پر فوقیت کا اندازہ خود صرف عقائدی اور تعبدی طور پر ہی نہیں بلکہ عقلی و علمی طور پر بھی کر لیں گے۔ اور بیسویں صدی کی سائنسی دنیا میں اور علم و تحقیق کے ماحول میں شاید دین اسلامی اور شریعتِ الٰہیہ کی یہ سب سے بڑی، پائیدار اور نفع بخش خدمت ہو۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

خودرَو یا خودرُو؟

ایک لغوی ولسانی بحث

میں ایک چھوٹا اُردو خواں ہوں شعر و سخن سے دلچسپی ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ کسی لفظ اور کسی مسئلے میں اگر تردد ہوتا ہے تو طبیعت میں اُلجھن ہوتی ہے اور کتنی لغتیں اور کتنی آدمیوں سے پوچھے بغیر آرام نہیں ملتا ـــــ تجلی دیکھتا ہوں اور آپ کی کاوشیں زیر مطالعہ رہتی ہیں (برائے استفادہ) فیضی کی تنقید میں ایک بہت عام لفظ "خودرُو" کو آپ نے "خودرَو" بفتح را بتایا ہے، جو صحیح نہیں۔ اُس کا امر رُو ہے۔ خود کے ساتھ رو لگانے سے فاعل بنتا ہے۔ خودرَو ــ خود لگنے والا" رَو کا قرینہ سمجھ میں نہیں آیا۔

رُستنی ـ زمین سے اُگنے والی چیزیں۔ گھاس وغیرہ اُردو کا کوئی لغت جامع نہیں۔ بیان اللسان المصنفہ سجاد میرٹھی (ابھی مالیگاؤں آئے تھے) مشہور عربی الفاظ سے محروم ہے۔ مُعیر۔ لوٹانے والا۔ حالانکہ مُعیر پر رکھنے والا بھی ہے۔ جیسے نظیری نے باندھا ہے۔ باشد سخن سیم و گہر نزد مُعیر پاک بر۔ مرکوز کا لفظ نہیں۔ الغرض یہ کمی ہے۔ اُمید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

جواب:۔

آپ نے جوابی خط نہیں بھیجا ورنہ ڈاک ہی سے جواب عرض کر دیتا۔ غالباً آپ خود یہ چاہتے ہوں گے خط شائع ہو اور جواب تجلی ہی میں ملے۔ میں آپ کی خواہش پوری کر رہا ہوں۔ میرا ایک مقصد آپ کے خط کی اشاعت سے یہ بھی ہے کہ اس کے جواب سے آپ کو بھی اور دوسرے حضرات کو بھی یہ محسوس ہو جائے کہ اعتراض کرنے سے قبل مسئلہ کی واجبی تحقیق کر لینی ضروری ہے۔ واجبی تحقیق کے بغیر محض اٹکل سے اعتراض کر ڈالنا عموماً اپنے ہی دامن کا داغ بن جاتا ہے۔ نیز خط یا مضمون لکھنے میں ذہن کو چاق چوبند رکھنا چاہئے تاکہ بے ربط جملے قلم سے نہ نکلیں اور پڑھنے والا انقباض کا شکار نہ ہو۔

آنجناب نے اگر یہ تصور فرمایا تھا کہ خودرَو (بفتح را) غلط ہے اور خودرُو (بضم را) درست ہے تو اس کے لئے پہلے مناسب تحقیق کر لیتے پھر اپنے خیال کی تائید میں دلیل مل گئی ہوتی تو بے تکلف اعتراض کر ڈالتے مگر آپ نے تحقیق نہیں کی اور محض قیاسی گھوڑے دوڑا دئے حالانکہ زبان و لغت میں کورا قیاس کام نہیں دیتا۔ سند و شہادت کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور بعض اور نزاکتیں بھی ملحوظ رکھنی ہوتی ہیں۔

آپ کی یہ عادت اچھی ہے کہ کسی مسئلے میں تردد ہو تو دوسروں سے پوچھ کر اپنی تشفی کر لیں مگر زیر معاملہ میں آپ نے سوال پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اعتراض کر ڈالا اور قطعی فیصلہ دیدیا کہ "خودرَو" صحیح نہیں ہے حالانکہ قطعی فیصلہ دینے اور طالب علمانہ استفسار کرنے میں فرق ہے۔ بھلا ایسے طالب علم کو کون پسند کرے گا جو اچانک استاذی کی مسند پر جا بیٹھے اور بجائے سوال کے فیصلے دینے لگے۔

اعتراض کے معاً بعد آپ نے بلا کسی تقریب کے اُردو ڈکشنری کی بات شروع کردی ہے حالانکہ جس لفظ پر گفتگو ہے اس کا تعلق اُردو سے نہیں فارسی سے۔ پھر فوراً ہی بلا فصل آپ نے بیانُ اللسان کا تذکرہ چھیڑ دیا حالانکہ یہ نہ اُردو لغت ہے نہ فارسی بلکہ عربی زبان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا تذکرہ چھیڑتے ہی آپ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ مشہور عربی الفاظ سے محروم ہے۔ یہ اظہار خیال آپ کے اصلِ موضوعِ خط سے کوئی ربط نہیں رکھتا۔ حالانکہ خط کو مربوط ہونا چاہیئے۔ خیر اس کے متصل بعد آپ نے تحریر فرمایا:۔

"مُعیر۔ لوٹانے والا۔ حالانکہ معیر پرکھنے والا بھی ہے"!

آپ کے خط میں اس فقرے کو پڑھنے والا آپ کا مفہوم یہ سمجھے گا کہ بیان اللسان میں لفظ مُعیر آیا تو ہے مگر اسکے بس ایک ہی معنی لکھے ہیں۔ "لوٹانے والا" دوسرے معنی نہیں لکھے یعنی پرکھنے والا۔

حالانکہ بیان اللسان میں لفظ مُعیر "معر" سے آیا ہی نہیں ہے۔ کم سے کم مجھے تو نظر نہیں آیا۔ مزید یہ کہ نظیر میں آپ نے نظیری کا فارسی کلام پیش کیا حالانکہ بحث عربی لفظ کی ہے۔ نظیر بھی کلام عرب ہی سے موزوں ہوتی۔ اور میں کہتا ہوں نظیر کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ضرورت تو اس وقت ہوتی جب ہمارے مابین لفظ معیر کے معنی زیر بحث ہوتے۔ بحالتِ موجودہ آپ نے بالکل بے محل اور غیر ضروری طور پر یہ سطور حوالۂ قلم کر دیں۔

مزید آپ نے تحریر فرمایا کہ "مرکوز کا لفظ نہیں"۔ حالانکہ "مرکوز" مشتقات میں سے ہے اور مصادر کے جملہ مشتقات لغت میں نہیں ہوا کرتے۔ دنیا کا کوئی کسی بھی زبان کا لغت ایسا نہیں جو تمام مصادر کے ساتھ اس کے تمام مشتقات کو بھی سمیٹے ہوئے ہو۔ اشتقاق تو علم الصرف کا موضوع ہے نہ کہ علم اللغت کا۔ بیان اللسان میں آپ میم کی فہرست دیکھیں تو لفظ "مرکوز" ملجائے گا اور را کی فہرست دیکھیں تو لفظ رَکز اور رِکاز دونوں مل جائیں گے۔ ان میں ہی سے کسی مصدر سے آپ لفظ "مرکوز" بنائیں گے اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ لفظ مرکوز چونکہ بیانُ اللسان میں نہیں اس لئے یہ لغت ناقص ہے۔

اب میں آپ کو بتاؤں کہ لفظ "مُعیر" کے معاملہ میں بھی آپ کو ایسے ہی مغالطے کا شکار ہونا پڑا ہے۔ بیانُ اللسان میں حرف عین کی فہرست ملاحظہ فرمائیں۔ وہاں آپ کو لفظ عِیَار ملے گا جس کے متعدد معانی دیئے گئے ہیں۔

"بچائی۔ گھریز۔ ناپ یا وزن کے جانچنے کا معیار۔
کسوٹی۔ دراہم و دنانیر میں چاندی سونے کا جزو"۔

اسی سے مُعیر اسم فاعل ہے۔ آپ دیکھ لیجئے "لوٹنے" کے معنی تو نہیں دیئے گئے۔ پتا نہیں آپ نے یہ معنی کہاں سے نقل کیے۔ ہاں جانچنے پرکھنے کے معنی ضرور دیئے گئے جن پر خود آنجناب زور دیا ہے۔ یہ وہی "مرکوز" والی بات ہوئی کہ یہ لفظ بے شک لغت کے صفحات میں نہیں آیا لیکن اس کا مصدر اور مادّہ شاملِ لغت ہے۔ اسی طرح معیر کا مصدر آپ کے سامنے ہے۔ پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لفظ معیر کا سراغ بیان اللسان میں نہیں ملتا۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ بیانُ اللسان یا دوسری ڈکشنریاں کمی اور خامی سے پاک ہیں۔ جی نہیں۔ میرا تو خیال ہے دنیا میں کسی بھی زبان کی کوئی ڈکشنری ایسی نہ ہوگی جس میں کوئی نہ کوئی لفظ شامل ہونے سے رہ نہ گیا ہو لیکن اس خامی اور کمی کا اطلاق مشتقات پر نہیں کرنا چاہیئے۔ اسم فاعل، اسم مفعول، اسم ظرف، اسم آلہ ان سب کو کوئی بھی لغت نویس جمع نہیں کرتا کیونکہ یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس کا جوڑ صرفی قواعد سے ہے نہ کہ قواعدِ لغت سے۔ اصل چیز ہے فعل کا مصدر یا مادّہ یا پھر اشیاء کے نام۔ مثلاً جِذْع درخت کے تنے کو کہتے ہیں یا المانیا کا مطلب ہے جرمن۔ یا کَبِد کے معنی ہیں جگر

ان میں سے کوئی لفظ اگر عربی لغت میں رہ گیا ہے تو یہ کمی ہے۔ یہ اسماء کی مثال ہوئی۔ افعال کے مشتقات میں سے کبھی کوئی مشتق "اسم" کی حیثیت لے لیتا ہے۔ جیسے حفظ سے مِحفَظَة۔ اس کے معنی ہیں جزدان۔ اگر لغت میں صرف حفظ شامل ہوا لیکن محفظة شامل نہیں ہوا تو اسے کمی کہیں گے کیونکہ بغیر تصریح کے طالب علم کی پہنچ اس بات تک نہیں ہو سکتی کہ محفظہ جزدان کو کہتے ہیں۔ یا جیسے لفظ مُحفِظَة۔ اس کے معنی ہیں ایسا معاملہ جو اشتعال انگیز ہو۔ لغت نگار کا فرض ہے کہ وہ لفظ حفظ کے بعد یہ وضاحت بھی کرے کہ یہی مصدر جب باب افعال سے آتا ہے (احفاظ) تو اس کے معنی تاؤ دلانے کے آتے ہیں اور اسی سے مُحفِظة بنتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس وضاحت کے بغیر کوئی طالب علم احفاظ اور مُحفظہ کے معانی نہ جان سکے گا۔

اس کے برخلاف کوئی لغت نگار لفظ ارتکاز تو دیدے مگر مرتکز نہ دے یا عیار دیدے مگر معیر نہ دے یا ترکز دیدے مگر مرکوز نہ دے یا طاعة دیدے مگر مطیع نہ دے تو اسے کمی اور خامی نہیں کہیں گے کیونکہ ہر طالب علم خود یہ مشتقات نکال لے گا اور ان کا صحیح و مستعمل مفہوم بھی سمجھ جائے گا۔

یہ معروضات بظاہر طوالت اختیار کر گئیں لیکن انکا مقصود یہ احساس دلانا ہے کہ علوم و فنون بچوں کا کھیل نہیں۔ ان کے معاملہ میں بیدار مغزی، احتیاط اور بالغ نظری کا دامن پکڑے رہنا چاہئے۔ جہاں تک اصل بحث کا تعلق ہے اس کے بارے میں بھی کچھ سُن لیجئے۔

فارسی میں "اُگنے" کے لئے صرف رُستن ہی نہیں آتا روئیدن بھی آتا ہے اور اسی کا چلن نسبتاً زیادہ ہے۔ کلامِ نظیری کی تمثیل پیش کرکے آپنے تأثر دیا کہ فارسی میں آپ کو اچھی خاصی نظر ہے لیکن حیرت ہوئی کہ آپ "رو" کو رستن سے مشتق مان رہے ہیں حالانکہ یہ روئیدن سے مشتق ہے۔ رستن سے کلام فارسی میں ماضی مطلق رُست اور اسم مفعول رُستہ تو مستعمل ہے باقی مشتقات مستعمل نہیں ہیں۔

نہ رستن کا کوئی صیغۂ حال ہے، نہ امر۔ نہ [illegible] فاعل۔ اس کے برخلاف روئیدگی اور صیغۂ حال می روید [illegible] اور مفعول روئیدہ اور اسم فاعل قیاسی رویندہ اور اسم فاعل سماعی خودرو سبھی مستعمل ہیں۔ آپنے آخر کس دلیل یا قرینے سے یہ تصور فرمالیا کہ خودرو کا رو رستن سے صیغۂ امر ہے۔ مزید یہ کہ فارسی میں ہمیشہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ مصدر کے پہلے حرف پر جو حرکت ہو وہی اس کے صیغۂ امر اور اسم فاعل کے پہلے حرف پر ہو۔ دیکھئے شُدن کے پہلے حرف شین پر پیش ہے لیکن اس کے امر شو کے حرف اول پر فتح آتا ہے اور اس کے اسم فاعل شونده کا شین بھی مفتوح ہے۔ لہٰذا یہ بھی ایک کمزور قیاس ہوا کہ رو اگر رستن کا امر ہو تو اس کی رَا پر پیش ہی ہونا چاہئے۔

ان گوشوں کے علاوہ آپ یہ بھی فراموش کر گئے [illegible] عربی فارسی میں سماعی الفاظ بہت ہیں جن کا تعلق قیاس سے بالکل نہیں ہوتا۔ گفتگو فارسی میں ہے اس لئے مثالیں فارسی امثلہ دوں گا۔ درخشیدن کا اسم فاعل قیاسی تو درخشندہ ہے لیکن اسم فاعل سماعی درخشاں۔ دانستن کا اسم فاعل قیاسی دانندہ ہے مگر اسم فاعل سماعی دانا۔ چکیدن کا اسم فاعل قیاسی چکندہ ہے مگر اسم فاعل سماعی چکاں [illegible] طپاں۔ خنداں۔ چماں۔ خاموش۔ خواہاں۔ جویاں۔ جنباں یہ سب اسم فاعل سماعی ہیں۔ اسی طرح روئیدن [illegible] خودرو اسم فاعل سماعی ہے۔ بہتیرے فارسی مصادر ایسے ہیں جن کا صیغۂ امر اہل زبان میں مستعمل نہیں [illegible] تراویدن۔ ترکیدن۔ توانستن۔ خلیدن۔ رستن۔ رشتن۔ زاریدن۔ ژولیدن وغیرہ۔ پھر ان میں بعض وہ ہیں جن کا اسم فاعل بھی مستعمل نہیں جیسے ترکیدن۔ خلیدن۔ اور بعض کا اسم فاعل مستعمل۔ جیسے توانستن سے اسم فاعل قیاسی تواننده اور اسم فاعل سماعی توانا اور رستن سے اسم فاعل سماعی [illegible] اور زاریدن سے اسم فاعل سماعی زار۔ گویا تین [illegible] ہو گئیں۔ ایک وہ کہ مصدر کا نہ امر مستعمل ہے نہ اسم [illegible]

دوسری وہ کہ امر مستعمل نہیں مگر اسم فاعل قیاسی اور سماعی دونوں مستعمل ہیں اور تیسری وہ کہ اسم فاعل قیاسی نہیں آتا صرف سماعی آتا ہے۔

روئیدن دوسری قسم میں داخل ہے۔ صیغۂ امر مستعمل نہیں۔ اسم فاعل قیاسی بھی آتا ہے (روئندہ) اور سماعی بھی (خودرَو) اس کے برخلاف رُستن قسم اول میں داخل ہے کہ نہ امر آتا ہے نہ اسم فاعل۔

اب جب کہ خودرَو کا معاملہ سماعی ٹھیرا تو ایسی کسی قیاس بازی کا اس میں کوئی دخل نہ ہوگا جیسی آپ نے فرمائی ہے۔ سماعی اوزان والفاظ کا تعین تو محض زبان کا کلام کرتا ہے۔ آپ نظیری جیسے شعراء کے کلام پر اس حد تک نظر رکھتے ہیں کہ بوقت ضرورت برجستہ اس سے نظائر بھی لاسکتے ہیں تو آپ کے لئے یہ آسان ہونا چاہئیے کہ اہل فارس اساتذہ کی تحریروں سے ایسی کوئی نظیر ڈھونڈ لائیں جس میں خودرَو کا لفظ راکے پیش کے ساتھ استعمال کیا گیا ہو۔ میں چونکہ فارسی پر عبور نہیں رکھتا اور لیل ونہار اردو عربی سے سر مارنے میں کٹ رہے ہیں اس لئے ذہن کسی ایسے فارسی نمونے کی طرف منتقل نہیں ہوا جسے پیش کر کے میں ثابت کرسکوں کہ خودرو کی را مفتوح ہے مضموم نہیں لیکن بہ پورا اطمینان ہے کہ بچپن میں جتنی فارسی کتابیں پڑھی ہیں ان میں جہاں کہیں خودرو کا لفظ آیا ہے فتح را کے ساتھ آیا ہے۔ اس وقت دو حوالے آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

(۱) میرے سامنے جامع اردو لغات کا تاج پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی کا چھپا ہوا جیبی سائز نسخہ ہے۔ اس کے صفحہ ۳۰۲ پر خودرَو کا لفظ بفتح را موجود ہے۔

(۲) فرہنگ عامرہ۔ مرتبہ محمد عبداللہ خاں خویشگی۔ تیسرا ایڈیشن۔ شائع کردہ مکتبہ اشاعت اردو۔ دہلی۔ صفحہ ۲۱۰ پر یہ عبارت درج ہے:-

"خودرُستہ، خودرو (خُد رُسْ تہٗ) (خُدرَو) جو بلا بوئے آپ اگ آئے۔"

میں نے کسی حرکت یا شوشے کا اضافہ اپنی طرف سے نہیں کیا۔ جوں کا توں نقل کیا ہے۔ ملاحظہ کر لیجئے خودرو کی را پر فتح ہے یا نہیں۔

اگر قیاس سے کام لیا جائے تو بے شک روئیدن سے رُو بننا چاہئیے۔ چنانچہ فرہنگ عامرہ میں صـ۲۵۱ پر "رُو" کے ایک معنی "اُگنے والا" بھی رقم ہیں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے لفظ رُو بطور اسم فاعل فارسی میں مستعمل ہے نہیں بلکہ چہرے کے معنی میں کثیر الاستعمال ہے جیسے خوب رو۔ رو برو۔ روبقبلہ۔ روشناس۔ رونما۔ رو پوش۔ روگردان۔ روبصحت۔ روسیاہ وغیرہ۔ کبھی کبھی سببیت کے لئے بھی استعمال ہو جاتا ہے۔ جیسے بروئے حدیث فلاں حکم ثابت است۔ بہرحال جب روئیدن سے اسم فاعل ترکیبی بنائیں گے تو خودرَو بنائیں گے اور اسی کو اسم فاعل سماعی بھی کہیں گے۔ آنجناب کا فارسی مطالعہ اگر کافی ہے تو فارسی کی کسی انشاء یا لغت سے ایسی کوئی شہادت لائیے جس سے واضح ہو کہ خودرو کی را پر پیش درست ہے فتح درست نہیں۔

قادیانی فرقہ دائرۂ اسلام سے قطعاً خارج ہے

دارالعلوم دیوبند کا اعلان

مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ایک بیان میں کہا ہے کہ تقسیم ملک سے برسہا برس پہلے باتفاق علماء برّ صغیر ختم نبوّت کے بنیادی اور قطعی اسلامی عقیدے سے انکار پر قادیانی فرقہ کو مرتد اور خارج از اسلام قرار دے چکا ہے۔ انگریز کے پیدا کردہ اس جھوٹے نبی اور اس کے ذریعہ مذہب حق اسلام کے برخلاف مذہبی رنگ کی اس ذلیل ترین اور خطرناک بین الاقوامی سازش کا آج بحمد اللہ دنیائے اسلام نے طویل مہلتِ اصلاح دینے کے بعد پردہ چاک کر دیا ہے اور ممالک اسلامیہ کی ۳۲ اسلامی تنظیموں کے سربراہوں کی کانفرنس (منعقدہ اپریل ۷۴ء جدہ) نے بالاتفاق یہ صحیح ترین اور تاریخی اعلان کیا کہ قادیانی فرقہ غیر مشروط طور پر خاتم الانبیا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدسہ پر ختم نبوت کو نہ ماننے اور انبیاء علیہم السلام کی توہین کرنے کی وجہ سے قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے۔ عالمِ اسلام کے اس متفقہ اور تاریخی اعلانِ حق نے اہلِ حق کو نہ صرف فرحت بخشی ہے بلکہ قادیانیوں کے مرتد ہونے کے بارے میں قرآن و حدیث پر مبنی اہل حق کے دینی موقف کو عظیم مضبوطی عطا کی ہے۔ عالم اسلام کے اس متفقہ فیصلے کے بعد پاکستان کے علماء حق اور عامۃ المسلمین مستحقِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے قادیانی فرقہ کے ارتداد کے بارے میں اپنے اور تمام مسلمانانِ عالم کے موقف حق کی حکومتی سطح پر تائید و توثیق حاصل کرنے میں پہل کی ہے توقع ہے کہ دیگر ممالک اسلامیہ کے علماء و عامۃ المسلمین بھی فتنۂ قادیانیت کے بالکلیہ انسداد کیلئے اسلامی حمیت کے تحت ہر ممکن تقویت و تائید بہم پہنچانے میں دریغ نہ کر کے عند اللہ ماجور اور عند المسلمین مشکور رہیں۔

بلاشبہ عالمِ اسلام کا یہ کلیہ فیصلہ اور اس کی تائید و توثیق قادیانی فرقہ کی تلبیس کاریوں سے مسلمانانِ عالم کو بچانے کا ایک بہترین ذریعہ ثابت ہوگا اس لئے عموماً تمام علماء اور مسلمانانِ ہند اور خصوصاً علماء دیوبند اسلام کے تحفظ کے اس بین الاقوامی فیصلہ اور اقدام کرنے والوں کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ خاتم الانبیاء کے لائے ہوئے اس آخری دین کو زیادہ سے زیادہ غیبی نصرت و تائید مرحمت فرمائے۔ آمین

(دعوت ۱۲ ستمبر ۷۴ء)

ایک مبارک اقدام، ایک صحیح فیصلہ

(ندوۃ العلماء لکھنؤ کا اعلان)

قادیانیت کا مسئلہ گزشتہ نوے سال سے ملّتِ اسلامیہ اور امّتِ محمدیؐ کے لئے ایک تشویشناک اور پریشان کن مسئلہ بنا ہوا تھا۔ مدعی نبوّت مرزا غلام احمد کی تحریک کے خطرناک رجحانات اور اسلام و نبوت محمدیؐ کے خلاف بغاوت اور برہنہ سازشوں کی گرفت گزشتہ پون صدی میں امت کے سوادِ اعظم کے ممتاز علماء اور مفکرین کرتے رہے اس میں سرِ فہرست مولانا محمد علی مونگیری، مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ ڈاکٹر محمد اقبالؒ، مولانا محمد علیؒ، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ وغیرہ ہیں۔

قادیانیت نے جس نقاب کے ساتھ ملت اسلامیہ میں نفوذ کیا تھا اور جس حکمت کے ساتھ اپنے آپ کو ملّتِ اسلامیہ کا جزو بتایا تھا اس نے ان کے بارے میں عام مسلمانوں میں شدید غلط فہمی پیدا کر دی تھی۔ قادیانیت (جس کے پس پشت وہ سامراجی طاقتیں کام کر رہی تھیں جو مسلمانوں اور عالم اسلام کو منتشر و پراگندہ کمزور و پامال کرنا چاہتی تھیں) نے اس طرح پروپگنڈہ کر رکھا تھا کہ وہ اسلام کی تبلیغ اور یورپ وافریقہ میں اشاعتِ اسلام کی ایک سرگرم و فعال تنظیم ہے۔ ان کے اس غلط پروپیگنڈہ کا شکار ملک و بیرونِ ملک کی بڑی تعداد ہوئی۔ مگر اس مسئلہ نے پاکستان میں دوبار ۱۹۵۳ء میں اور امسال ۱۹۷۴ء میں جو رخ اختیار کیا اس نے پورے عالم اسلام کو چونکا دیا۔ قادیانیت کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنے والوں نے اس تحریک کے خطرناک مضمرات کو محسوس کر کے اس بات کا اعلان کیا کہ قادیانی حضرات ان ہی کے عقیدہ اور لٹریچر کی بنیاد پر ملت اسلامیہ کا جزو نہیں ہیں بلکہ ایک مستقل ملت ہیں جس کا کوئی رشتہ اسلام اور نبوّت محمدیؐ سے نہیں ہے۔ ان کی ملت کے سوادِ اعظم سے وابستگی صرف دنیوی مفاد حاصل کرنے کے لئے ہے۔ عالم اسلام کی نمائندہ تنظیم رابطۂ عالم اسلامی نے بھی اپنی ایک قرارداد کے ذریعہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ پاکستان میں اس سلسلہ میں بڑے محتاط طریقہ سے اور قوم کی منتخب مقننہ کے اراکین پر مشتمل ایک کمیشن کے ذریعہ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ تحریک قادیانیت کے موجودہ سربراہ کا بیان لیا اور جمہوری طریقہ سے اپنی نیشنل اسمبلی کے ذریعہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔ یہ فیصلہ ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔ اسے نہ تو غیر اسلامی کہا جا سکتا ہے اور نہ غیر اخلاقی۔ جن حضرات کی قادیانی تحریک کے قیام اور اس کے موجودہ پس منظر اور آئندہ عزائم پر گہری نظر نہیں وہ اپنی کم علمی یا لاعلمی کی بناء پر جو اس پر تنقید کر رہے ہیں انھیں چاہئے کہ وہ قادیانیت کا تفصیلی مطالعہ کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ قادیانیت کا غیر جانبدارانہ مطالعہ انھیں اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کرے گا۔

ہم اس ملک کی دینی، تعلیمی، سماجی تنظیموں اور اداروں سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس فیصلہ کی تائید اور اسے عین انصاف و رواداری قرار دینے میں ایسے بیانات شائع کریں تاکہ برصغیر اور دنیا کے عوام و خواص کو یہ بات واضح ہو جائے کہ مشرق و مغرب اور دنیا کے ہر خطّہ کے مسلمانوں کی یہ متفقہ آواز بھی اور اسے وہ عین حق و صواب سمجھتے ہیں ؛ (تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ راگست و ۱۰ رستمبر ۱۹۷۴ء)

حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادی مدظلہٗ اور کثیر المناقب جناب محمد عثمان فارقلیط سابق ایڈیٹر الجمعیۃ سے ادارۂ تجلّی کی فدویانہ اور دردمندانہ التجا ہے کہ وہ قادیانیت کے لئے نرم گوشے کو بالائے طاق رکھدیں اور یقین فرمالیں کہ قادیانیوں کا خارج از اسلام ہونا دو رائے کا متحمل نہیں۔

ملّا ابن العرب مکّی

مسجد سے مےخانے تک

یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں تو رمضان کے بعد ہی پہنچ رہا ہے مگر مرتب یہ رمضان ہی میں ہوا تھا اور رمضان میں مُلّا عموماً جنس نایاب بن کر رہ جاتا ہے۔ اب کی بھی وہ ہاتھ نہیں آیا اور مجبوراً یہ تیرہ سال پرانا "عذرنامہ" ہدیہ خاطرت کیا جا رہا ہے اس کی اشاعت اپریل ۱۹۶۱ء میں ہوئی تھی۔ آپ پڑھ بھی چکے ہوں تو یاد کیا دھرا ہے۔ یاد بھی ہو تو ثواب کی نیت سے پھر پڑھ ڈالئے۔ (ادارہ)

تاریخ نوشت ۴ مارچ یعنی کہ ۲۶ رمضان المبارک

ایڈیٹر تجلی اپنی بہن یعنی عاجز کی زوجہ ـــــ نسیمہ پر غرا رہے تھے :-

" آخر یہ مردود ہے کہاں ؟ - جب بلانے کو بھیجتا ہوں تم کہا یہی ہوتے نہیں "۔

" سچ بھیا "۔ بیگم نے ڈرے سہمے لہجے میں یقین دلایا۔ " ایسا ہی اتفاق ہو رہا ہے کہ جب بھی آپ نے دفتر سے آدمی بھیجا وہ گھر میں تھے ہی نہیں "۔

" اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ روزے بھی نہیں رکھ رہا ہے روزے رکھنے والا کوئی آدمی صبح آٹھ بجے بستر کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا "۔

" روزے تو رکھ رہے ہیں اسی لئے لکھنا بھی بند کر رکھا ہے۔ دن میں قلم لے کے بیٹھتے ہیں مگر کئی کئی کاغذ کاٹ

پھاڑ کے اٹھ جاتے ہیں۔ سحری کے بعد کبھی تو سو جاتے ہیں اور کبھی باہر چلے جاتے ہیں پھر دوپہر کو سو جاتے ہیں "۔

" مت بکو ـــــ " بہن کے بھیا جھلائے۔ وہ شاید بہن کے چہرے سے بھانپ گئے تھے کہ ٹیپ ریکارڈ بج رہا ہے ـــــ " مارچ آدھا ہونے کو آیا پہلے بھی اسی کی وجہ سے کئی بار پرچہ لیٹ ہوا ہے۔ اب کی بھی اسی کی بکواس باقی ہے ورنہ پرچہ مکمل ہو چکا ہے ـــــ تمہاری بھی مت ماری گئی ہے اسے بجائے سمجھانے کے طرح دیتی ہو "۔

" ہائے بھیا آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے وہ میرے بس میں ہوں ـــــ بہت سمجھاتی ہوں، مگر وہ... وہ آپ جانتے ہی ہیں ایران طوران کی ہانک دیتے ہیں "۔

" بیہودہ کہیں کا ـــ سقیا پال ہوتے کہ آتے مگر لڑکپن نہیں گیا "۔

" اس فقرے پر بھیا کی بہن کا چہرہ ذرا کشیدہ ہو گیا۔

سامنھ بنا کر بولی۔
"خیر بھیا ہاں تو ابھی تک ان کا ایک بھی سفید نہیں ہوا"۔
"ہاں ہاں وہ تو دودھ پیتا بچہ ہے۔ آئے تو کہہ دینا یا تو
نک اپنا یکواس نامہ کاتب کے حوالے کر دے ورنہ
ت بری طرح پیش آؤں گا"۔
یہ کہہ کر وہ پیر پٹختے چلے گئے۔ اب میں غسل خانے سے
ہوا اور دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ واقعی وہ چلے
گئے ہیں یا ٹھیر کر آہٹ لے رہے ہیں۔ ویسے ان جیسے آدمی
اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن جوہر کا دل کتنا
دور سڑک پر افتاں وخیزاں چلے جا رہے تھے۔ افتاں
یزاں اس لئے کہ روزوں میں ان کا بھی حال کچھ کم پتلا
یں ہوتا۔ ایک دفعہ تو ترس بھی آیا اور جی چاہا کہ پکار کر
ئی موقعہ کا شعر پڑھوں، مگر شعر کہاں دھرے ہیں۔
روں کے فیض سے ذوق شعری کا یہ عالم ہے کہ نظم ونثر کا
ہی سمجھ سے بالا ہو گیا ہے۔
کچھ بھی ہو اپنی بیگم آجکل بہت اچھی جا رہی تھیں —
ہری پر گرتے ہوئے میں نے حوصلہ افزائی کی :۔
"ہزاروں برس جیو بیگم تم اللہ قسم اب تو بہت حسین
تی جا رہی ہو"۔
"آپ کو شرم آنی چاہئیے"۔ وہ برے سے لہجے میں بولی۔
"ضرور آئے گی .... سچ کہتا ہوں جب تم آپ جناب
بولتی ہو تو بہت شرم آتی ہے"۔
"بس رہنے دو .... آخر یہ بچپنا کب جائے گا"۔
"ہائیں .... کیا کہا بچپنا" مجھے تاؤ آگیا۔ "تم تو ایسے
رہی ہو جیسے شوہر میں نہیں تم ہو"!
"ختم کیجئے" ان کی بیزاری عروج پر پہونچ گئی "اب
آپ کے لئے اپنی عاقبت برباد نہیں کروں گی۔ بھیا
صاف صاف کہدوں گی کہ یہ گھر ہی میں ہوتے ہیں مگر
شرکے آدمی سے جھوٹ کہلوا دیتے ہیں"۔
"بس بس" میں نے ٹوکا "کیا آج کے اخبار میں
ئی دنگے کی خبریں زیادہ ہیں؟"

"جہنم میں گیا اخبار — روزے آخر اور لوگ بھی تو
رکھتے ہیں، تمہارا ہی روزہ دنیا سے نرالا کیوں ہے کہ چار
ورقلی بھی نہیں لکھ سکتے —"
"آگئیں آپ سے تم پر .... کیا کہا ورقلی ...."
"ارے اور کیا .... مہینے میں ساٹھ آٹھ صفحے ہی تو
لکھتے ہو —"
"اُف .... یہ تم کہہ رہی ہو .... میرے اللہ زمین
پھٹ کیوں نہیں جاتی — لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و
نام ہے .... دوسرا مصرعہ کیا تھا؟"
اُن کے ہونٹوں پر تبسم آیا مگر پی گئیں۔
"مصرعے کسی اور سے پوچھنا۔ آخر لکھ لکھا کے جان
کیوں نہیں چھڑاتے"۔
"ایسے کہہ رہی ہو جیسے مضمون لکھنا اور ناک سنکتے میں کوئی
فرق ہی نہیں۔ کبھی کڑک مرغی دیکھی ہے تم نے؟"
اس نے جواب نہیں دیا۔ بس ناخوشگوار انداز میں
مجھے دیکھتی رہی۔
"فرض کرو تم کسی کڑک مرغی سے ایک لاکھ مرتبہ کہو کہ
نیک بخت انڈا دیدے۔ خدا کے لئے دیدے — تو کیا وہ
دیدے گی؟"
"یہ گندی مثالیں اپنے پاس رکھو۔ کونسا ادق مضمون
لکھنا ہے۔ الا بلا کچھ گھسیٹ ڈالو"۔
"خوب داد دے رہی ہو۔ الا بلا کیا کوڑا کباڑ کہو —
اینٹ پتھر کہو۔ واہ رے واہ۔ تبھی تو کہتے ہیں کہ کوئی کسی کا ساتھ
دیتا ہے۔ کہ سارے کی میں تایا بھی .... تو یہ ...."
"آپ تو کہتے تھے بھیا سوکھ کے چھوارہ بن گیا ہے
پھر یہ شعر کہاں سے آ رہے ہیں"؟
"شتر گربہ — یہ نہیں تم کبھی آپ آخر کیا مذاق
ہے!"
"مذاق وذاق میں نہیں جانتی۔ تمہاری وجہ سے مجھے
بھیا کی جلی کٹی سننی پڑتی ہیں۔ یا تو ڈھنگ سے کام کرو یا
استعفا دیدو"۔

"تو یوں کہو آج لڑنے ہی کا تہیہ ہے ـــ سچ کہتا ہوں بیگم اگر اتفاق سے تم شوہر ہو گئی ہوتیں تو تجھے عادت ہی میں خودکشی کر لینی پڑتی ـــ اچھا مجھے تو لکچر پلاتی ہو اپنے بھیا سے کیوں نہیں کہتیں ایک فتویٰ میرے لئے بھی سہی"۔

"کیسا فتویٰ؟"

"سفید رنگ کا فتویٰ۔ خوب بھولی بن رہی ہو، کیا میں نے پچھلے جمعہ کو تمہیں کہا تھا کہ اپنے بھیا سے فتویٰ دلوا کر ایک روزہ معاف کرا دو دفتر کا دفتر لکھ مارونگا"

"تمہیں تو خدا کی بھی شرم نہیں" وہ تبسم کو ہونٹوں ہی ہونٹوں میں گھونٹ کر بولی

"ارے وا ـــ تمہارے بھائی صاحب ہر مہینے سو سو گز کے فتوے لکھتے رہیں تو کوئی شرم کی بات نہیں اور میرے لئے ایک سطری فتویٰ بھی گویا کہ۔۔۔۔ جی ہاں ۔۔۔۔۔ گویا کہ۔۔۔۔"

"ہٹو تم سے کون مغز مارے ـــ اچھا دن میں نہیں لکھ سکتے تو رات میں کیوں نہیں لکھتے ـــ تراویح کے بعد ایک دو دن مٹرگشتی نہ سہی"۔

"ہوں تو اب آئی ہو مطلب پر۔ یوں کہو نا میری رات کی تفریح تمہیں کھٹک رہی ہے۔ زہر دید و مجھے ـــ دن بھر روزہ رکھوں اور رات کو کاغذ قلم سے سر ماروں یہی منشا ہے نا تمہارا؟"

"ارے تو تم اس طرح کہہ رہے ہو جیسے رات کو لکھنا پہاڑ کاٹنے کے مرادف ہے۔ خیر تم سو جاؤ۔ میں تو صاف صاف کہہ دوں گی بھیا سے کہ یہ تراویح کے بعد سے سحری تک گھر سے باہر رہتے ہیں معلوم نہیں کہاں جاتے ہیں"۔

"ٹھیک ہے یہ بھی کہہ دینا کہ چوری کرنے جاتے ہیں۔ ناچ دیکھنے جاتے ہیں ـــ حد ہو گئی گویا سالے نہ ہوئے جلاد ہو گئے کہ پھانسی چڑھا دیں گے"۔

"پیچھے تو خوب تیزی دکھاتے ہو۔ سامنے کیا ہو جاتا ہے" "در در گردہ ہو جاتا ہے ـــ بس تم چپ جاؤ ـــ آج تم نے اپنے شوہر کی غیرت کو للکارا ہے۔ دیکھنا اب کیسا ڈٹ کے سامنا کرتا ہوں"۔

پھر میں چادر سے منہ لپیٹ کے سو گیا ـــ لیکن شاید زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک سر کی طرف سے ایک بھونچال نما خواب بڑے زور شور سے طلوع ہوا۔ رمضان کے خواب عموماً سوء ہاضمہ کا نتیجہ ہوتے ہیں ـــ صوفی وہاب علی کا مقولہ ہے کہ سحری میں کم سے کم اتنا تو کھا کہ حقے کے دھوئیں کو حلق سے نیچے اترنے کا راستہ نہ مل سکے۔ صوفی زمرد علی کا تو معمول ہے کہ سحری میں دو خوراک یک مشت کھاتے ہیں، اور ان کا دعویٰ ہے کہ جب تک ظہر کے وقت تک کھٹی ڈکاریں نہ آتی رہیں سحری کا مفہوم ہی پورا نہیں ہوتا۔

لیکن عاجز کا معاملہ جداگانہ ہے۔ عاجز نے تو فقہی ترتیب یوں دے رکھی ہے کہ حقہ فرض۔ پان واجب۔ چائے مستحب اور کھانا مباح۔ پوری سحری خلائی راکٹ کی رفتار سے حقہ پیتا ہوں اور مولانا روم کا یہ برمحل مصرعہ برزبان رہتا ہے

بشنو از نے چوں حکایت می کند

پھر بھلا خواب پریشاں کہاں سے آتا۔ وہ دراصل خواب نہیں تھا، بلکہ ایڈیٹر تجلی کی سنجیدگی قلابازی کھا گئی تھی۔ انھیں شاید کسی سے معلوم ہو گیا تھا کہ ملاّ لمبی تانے پڑا ہے۔ بس خود ہی اٹھے چلے آئے اور شریفوں کی طرح بیدار کرنے کے عوض بھرا لوٹا مجھ خستہ حال کے سر پر انڈھا سوچ لیجئے کیا حال ہوا ہوگا۔ نہ سہی زیادہ جاڑا مگر یہ افتاد نومبر میں بھی پڑے تو طبیعت صاف کر دینے کے لئے از بسکہ کافی ہے۔

"ک ک کون ہے۔۔۔۔ کیا ہے" میں ہڑبڑا کے اٹھا اور سسکیاں لیتے ہوئے دہاڑا۔ خواب میں برقیلی قسم کی کڑکدار آواز آئی:۔

"اٹھو!"

اور میرے فرشتے کوچ کر گئے۔ یہ اسی ظالم کی آواز تھی جو سالا ہونے کے باوجود میری سات پشتوں تک کا بہنوئی ثابت ہو رہا ہے۔ حضرت پاس والی کرسی پر براجمان تھے اور نسیمہ — میری والا گہر بیگم دور چارپائی پر بیٹھیں اس بے تعلقی سے ترکاری کاٹ رہی تھیں جیسے ان کے شوہر پر دن دہاڑے مارا جانے والا شبخون رائی برابر بھی اہمیت نہ رکھتا ہو۔

"آ... آپ..."

"ہاں میں — ابھی کہہ دو ملا گھر پر نہیں ہے —"

"نہیں تو... لاحول ولا قوۃ — آپ سے یہ کس نے کہا... یا نہ..."

"بس بس بکواس نہیں۔ میں پوچھتا ہوں تمہارا گدھا پن آخر کب ختم ہوگا —"

"رمضان کے بعد... اور میرا مطلب یہ ہے کہ گدھے مضمون نہیں لکھتے — نہ انہیں دفنانے کیلئے غسل دیا جاتا ہے —"

"میں تمہیں پانی کے ٹب میں اوندھا لٹکا دوں گا — اپنے وطیرے ٹھیک کر دو ملا نہیں تو سچ کہتا ہوں وہ گت بنا دوں گا کہ مزاج درست ہو جائے گا۔"

"وہ تو ہو گیا" میں نے چادر سمیٹ کر بھیگا ہوا سر اور منہ پونچھتے ہوئے کہا "اب شام تک نمونیہ ہو جانا یقینی ہے"

"کوئی پروا نہیں — تازہ شمارے کی ڈائری تو میں تمہاری لاش سے بھی لکھوا کے چھوڑوں گا۔"

"باپ رے۔ آپ ذرا محسوس نہیں فرماتے کہ میری موت ن... ن نسیمہ کے لئے کیا معنی ...."

"فضول باتیں مت کرو — یہ بتاؤ روز رات کو کہاں جاتے ہو؟"

میری نگاہ بے اختیار بیگم کی طرف اٹھ گئی۔ اتنا تاؤ آ رہا تھا کہ ریوالور نصیب ہوتا تو بے تکان فائر جھونک دیتا۔ ظاہر ہے انہی بھائی کی لاڈلی نے کان بھرے ہونگے بس خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا اور عزم بالجزم کر لیا کہ ذرا بھیا جان رخصت ہوں تو ان لاڈلی بیگم کو بھی سمجھوں۔

"ادھر کیا دیکھ رہے ہو — میں پوچھتا ہوں افطار سے سحری تک کہاں رہتے ہو؟"

"جی... پرسوں چوبرجی کی مسجد میں شبینہ تھا... کل مرزا چراغ حسن کے یہاں ختم خواجگان کی محفل تھی..."

"اور آج کی رات تمہارے مزار پر عرس ہوگا؟ — نالائق کہیں کے۔ مجھے معلوم ہوا ہے تم مولوی رحیم الدین کے لڑکے کو رات رات بھر شطرنج کھلوا رہے ہو —"

"تو کیا وہ دودھ پیتا بچہ ہے" میں بے ساختہ تڑخا "خبیث خود تو مجھے کھینچ کھانچ کے لے جاتا ہے.... مگر حول ولا قوۃ شطرنج کون مردود کھیلتا ہے —"

انھوں نے بڑی ناخوشگوار نظروں سے گھورا پھر مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ بعض مرتبہ بڑی ڈری لگتی ہے — ایسے مسکرائینگے جیسے کھا جائینگے۔ کڑوے لہجے میں کہنے لگے:

"صوفی ذرمین شکایت کر رہے تھے کہ ان کی درگاہ سے برابر چادریں چوری ہو رہی ہیں —"

"چادریں — یعنی کہ چادریں — کیا مطلب؟"

"تم چادر کا مطلب نہیں سمجھتے؟"

"اس وقت تو میں اپنا بھی مطلب نہیں سمجھتا۔ قسم ہے جناب آپ کو تو جو کبھی چڑھا دینا ہے بس چڑھ دوڑتے ہیں آ جاتے ہیں۔ صوفی ذرمین کی درگاہ سے اگر مُردوں کے کفن بھی چوری ہو جائیں تو آخر مجھ بدنصیب کا اس سے کیا واسطہ؟"

"ہو سکتا ہے چور کوئی اور رہا ہو مگر اسکیم تمہارے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ بڑی ذلیل حرکت ہے۔"

کمال کرتے ہیں آپ۔ اس صوفی کے بچے سے دریافت تو کیا ہوتا کہ وہ کس بنیاد پر الزام تراشی کر رہا ہے۔ وہ تو یہ بھی ثابت نہیں کر سکتا کہ چادریں چوری ہی ہوئی ہیں۔"

"وہ نہ کر سکے مگر میں کر سکتا ہوں — وہ لفنگا نقیرا تمہارے ملنے جلنے والوں میں ہے۔ کل ہی اسے نئے سبز رنگ کے تہبند میں دیکھا گیا ہے۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے — نقیرا سے اول تو میرا

ارانہ نہیں۔ محض معمولی الیک سلیک ہے"۔

"جھوٹ کہتے ہو۔ کیا یہ وہی فقیر انہیں ہے جسے تم نے
مصنوعی ڈاڑھی لگا کر درگاہ بلبل شاہ کے سجادے سے
ھڑا دیا تھا؟"

"ارر.... آپ کو کیا معلوم؟"

"کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟" — ان کی نکیلی نظریں
جھے اپنی ہڈیوں کے گودے میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"نہ خیر غلط تو نہیں — لیکن چادروں کا معاملہ
لگ ہے۔ فقیرا نے تو نیا کرتہ بھی پہنا تھا اب وہ صوفی کا
بچہ کہا رہے گا کہ یہ کرتا بھی اسی کی درگاہ سے چوری ہوا ہے۔"
کہہ کیا دیگا۔ وہ تو کہہ ہی رہا ہے کہ چڑھاوے کے
پیسے اور کپڑے بھی چوری ہوئے ہیں"۔
خون لگ گیا ہے اس کے منہ کو۔ خدا کے لئے آپ
س مکار کے معاملہ میں نہ بولئے۔ میں نپٹ لوں گا"۔

"میری بلا سے اس نے پولیس میں رپورٹ درج
رادی ہے....."

"اوہ ... تو یہ بات ہے — آپ چاہے مجھے گولی
ردیں مگر اس صوفی کے بچے کی عاقبت ضرور برباد کر کے
ہوں گا"۔

"ختم کرو۔ مجھے یقین ہے تمہاری موت کسی صوفی
ی کے ہاتھ سے لکھی ہے"۔

"ناممکن" میں تاؤ میں بھر گیا "کسی صوفی کے ہاتھ
سے مرنے سے پہلے میں کسی خارش زدہ کتے کے معدے میں
رجانا پسند کروں گا"۔

"لاحاصل ڈینگیں۔ صوفی درحقیقت بہت رسوخ کے
ادمی ہیں۔ ہتھے چڑھ گیا تو تمہیں کچا چبا جائیں گے"۔

"چبا کے تو دیکھیں۔ پیٹ میں وہ مروڑ اٹھے گا کہ
گل کتے کی طرح بھونکتے پھریں گے"۔

"استغفر اللہ — بڑی گھٹیا باتیں کرتے ہو۔ خیر
مجھے تمہارے واہیات قصوں سے کوئی سروکار نہیں۔ اگر
کوئی تمہیں پھانسی پر بھی لٹکا دے گا تو میرے کانوں پر
جوں تک نہیں رینگے گی"۔

"منظور ہے۔ بجا! آپ ان معاملات سے بے تعلق
ہو جائیں پھر میں دیکھوں گا کہ کون کسے پھانسی پر لٹکاتا ہے
آپ نہیں جانتے یہ صوفی اپنے گھر شراب اور افیون کا
غیر قانونی کاروبار کرتا ہے"۔

"کرتا ہو گا — تم ڈائری کب دے رہے ہو؟"

"ڈ ڈائری تو بس.... کل دے دوں گا"۔

"ٹھیک ہے۔ کل شام تک کاتب تک پہنچ جائے
نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا"۔

وہ چلے گئے تو مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ چغلخوری کے
سلسلہ میں بیگم کو بھی سمجھانا ہے۔ البتہ مولوی رحیم الدین جو
ان کے خلیا سسر تھے ان کے بارے میں ضرور طنز کیا:۔

"سن لیا تم نے۔ وہ تمہارے خلیا سسر کیا فرماتے
ہیں....."

"غلط کیا فرماتے ہیں۔ آپ ہی نے میاں اچھن کو شطرنج
کی چاٹ لگائی ہو گی"۔

"سبحان اللہ۔ تمہارے خیال میں وہ لوگ گٹھلیوں
چلتا ہے جیسے میں گود میں لے کر شطرنج کھلاؤں گا — اپنی
حالت سدھارو بیگم! تم نے ازدواجی آداب کو بالکل طاق
میں رکھ دیا ہے"۔

"برا تو مانئے مت.... کل خالہ امتل کی پڑوسن
کہہ رہی تھیں کہ ان کے میاں کو آپ نے وہابی بنا دیا ہے"۔

"کون میاں — شیخ کلن؟"

"جی ہاں"

"تو پوچھا ہوتا شیخ کلن کے سینگ نکل آئے ہیں کیا؟"

"سینگ نکل آتے تو ان کے کنبے والوں کو اتنا غم
نہ ہوتا مگر وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے یہاں
کا کوئی فرد مزاروں پر سجدے کرنے اور چڑھاوے چڑھانے
سے انکار کر دے۔ اصلی اہل سنت والجماعت ہیں وہ
لوگ"۔

یہ کہتے ہوئے بیگم نے دوپٹہ کا کونا منہ میں دبایا —

شاید وہ ہنسی روک رہی تھیں۔

"گھٹ گھٹ کے مت ہنسو بیگم۔ میں اس وقت پلصراط پر کھڑا ہوں۔ بتاؤ کل تک ڈائری کیسے لکھی جائیگی؟"

"کیا مشکل ہے قلم اٹھائیے لکھتے چلے جائیے"۔

"مشکل تو یہ بھی نہیں ہے کہ میں کوہِ قاف کی چوٹی سے بحرالکاہل میں چھلانگ لگادوں ․․․ کاش تم حقہ پیا کرتیں بیگم تب تمہیں پتا چلتا کہ ترکاری کاٹنے میں اور دنے میں مضمون لکھنے میں کیا فرق ہے"۔

"آخر بھیا بھی تو حقہ پیتے ہیں"۔

"ان کے سر پر کالے دیو کا سایہ ہے۔ وہ دن بھر نوکروں پر حکم چلاتے رہتے ہیں"۔

"اجی جائیے بھی۔ آپنے ہمت ہی توڑ ڈالی ہے ورنہ․․․"

"نہیں بیگم یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ فرض کرو دماغ پر غیر معمولی بوجھ پڑ جانے سے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں تو کیا تم میری ایسی لاش پسند کرسکوگی جو قبرستان تک حقہ حقہ پکارتی جائے۔ میرا دعویٰ ہے بیگم میرے بعد تمہارے بھیا کو مجھ جیسا مسکین بہنوئی کبھی نہ مل سکے گا"۔

انھوں نے برا سا منھ بنایا ــــ پھر چھیڑتے ہوئے لہجے میں بولیں:ــ

"آپ تو کہتے تھے ڈٹ کے سامنا کروں گا ــــ اور کوئی پانی الٹ دیتا تو زمین و آسمان ایک کر دیتے"۔

"موڈ کی بات ہے جناب ــــ ویسے تمہارے بھیا ہی آج آپے سے باہر کہاں ہوئے ورنہ ساری شیخی خاک میں ملا دیتا"۔

کافی دیر مجھے صوفی درمین کے بارے میں غور کرنا پڑا پھر نیند آگئی۔ ظہر کے وقت اٹھا تو یاد آیا کہ کل مضمون دینے کا وعدہ ہے۔ معاذ اللہ جانے کس رو میں وعدہ کر بیٹھا تھا ورنہ لکھنا اپنے بس کی بات ہی کب تھی۔ کیفیت تو واقعتہً یہ تھی کہ پورے رمضان جب بھی دن میں قلم کاغذ لیکے بیٹھا یہی معلوم ہوا کہ کھوپڑی میں یتیم خانہ آباد ہے۔ ماتھے پر شکنیں ڈال کر زیادہ زور ڈالتا تو ایسا لگتا کہ بھیجا معدے میں اتر جائے گا۔ دل کی دھڑکن اور مرغ کی ککڑوں کوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اسی لئے دفتر اور اہل دفتر سے منہ چھپائے پھرتا تھا۔ ایک دو بار خود ایڈیٹر تجلی آدھمکے تو سعادت مند بیگم نے ہدایت کے مطابق پہلے ہی مجھے مطلع کر دیا۔ پھر انھیں اندر بلایا۔ ان کی عادت ہے پہلے اذن چاہتے ہیں پھر اجازت مل جانے ہی پر قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ بارہا ان کی اس عادت پر میں نے شکوہ کیا تھا کہ آپ غیریت برتتے ہیں۔ اس بدنصیب بہنوئی کے گھر میں داخل ہونے کے لئے استیذان کے تکلف کی کیا ضرورت ہے جیسے آپنے غلام زادہ بنا چھوڑا ہے۔ لیکن وہ لکیر کے فقیر نہیں ملنے اور میں نے صبر کی سل سینے پر رکھ لی۔ مگر واہ رے نیرنگی زمانہ ان کی یہی عادت اس بار میرے حق میں کیسی نعمت ثابت ہو رہی تھی۔ ایک دن سویا ہوا تھا کہ بیگم نے انگوٹھا ہلا کے اطلاع دی وہ آرہے ہیں۔ بس پھر کیا تھا ہرن کی طرح کلانچ بھر کے اندر کی دوہری کوٹھری میں جا سمایا۔ غلطی یہ ہوئی کہ جوتے اٹھانا بھول گیا۔ ان کی نظر نے سب سے پہلے یہی کمزوری پکڑی۔

"تم تو کہہ رہی ہو نسیمہ وہ باہر گیا ہے مگر یہ جوتے․․․؟"

"جی ․․․․ وہ چپل پہنے پہنے چلے گئے ہیں․․․"

مگر انھیں یقین نہیں آیا اور کوٹھری میں گھسے چلے آئے۔ اگر وہ بھی میری طرح ننگے پیروں چپکے چپکے آتے تو شاید میں کتے کی موت مارا جاتا۔ لیکن غنیمت ہے وہ جاسوسی ناول نہیں پڑھتے۔ یا پڑھتے ہوں گے تو ان سے کچھ سیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ادھر انھوں نے کوٹھری میں قدم رکھا اور ادھر میں مصیبت کا مارا چھلاوے کی طرح ایندھن کی کوٹھری میں جا گھسا۔ وہ بھانپ تو شاید گئے تھے لیکن ایندھن کی تنگ و تاریک کوٹھری میں گھسنا ان جیسے نستعلیق آدمی کے لئے مشکل ہی تھا۔ اس طرح مجھے اس شاعر کے بال بچوں کو دعائے خیر دینے کا موقع ملا جس نے کہا تھا:۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

آپ کہہ سکتے ہیں کہ تم نالائق تراویح کے بعد کیوں نہ
نقرہ کھیر کے بیٹھ گئے اور مضمون کا پاپ کاٹا۔ مگر یہ بھی آپ کو
بر ہے کہ اب کی پہلے روز سے ہی منشی چشمک علی کے یہاں
نطرنج کا اکھاڑہ جم رہا تھا۔ یہ تو خبر نہیں کہ اہلِ دل روزہ
فطار تے ہی ڈٹ جاتے تھے یا تراویح پڑھ کر طبلِ جنگ
بجاتا تھا۔ میں بہرحال تراویح سے فارغ ہو کر جب کبھی پہنچا
زن بازار گرم پایا ہے اور صوفی طبریز، خواجہ شبّن، مرزا
سکین اور اچھن میاں تو بار و نظر آتے ہیں۔ پھر کچھ دیر
ب دو چار شوقین اور کبھی آجاتے اور وہ گھمسان کا رن
ٹتا کہ الامان والحفیظ۔

پہلا ہی روزہ تھا اور دوسری تراویح پڑھ کر میں
موچ رہا تھا کہ کاغذ قلم سے سر مارنے بیٹھ جاؤں گا۔ اچانک
بیاں اچھن مسجد کے دروازے ہی پر مل گئے۔

"چچا میاں آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ وہاں رن پہ رن
رہا ہے اور آپ یہاں تراویح پڑھ رہے ہیں"۔

"ابے پاگل ہوا ہے — کہاں رن پڑ رہا ہے"۔

"اجی وہیں منشی چشمک صاحب کے یہاں۔ دلی کے
دو رستم کھلاڑی آئے ہوئے ہیں۔ منشی صاحب کو دو
میں پلا دی ہیں"۔

"تو کیا روزہ کھولتے ہی بیٹھ گئے تھے؟"

"جی ہاں۔ دلی والے کل پرسوں چلے جائیں گے۔
ن کی خاطر......"

بس بس سُن لیا — جاؤ کہہ دینا چچا رمضان میں
طرنج نہیں کھیلتا"۔

"ہائے چچا جان اللہ قسم ناک کٹ جائے گی — دلی
الے مذاق اڑا رہے ہیں کہ دیوبند میں شطرنج کوئی نہیں جانتا
اجہ شبّن صاحب نے کہا تھا کہ چچا کو لئے بغیر مت آنا"۔

"ارے بھاگ — مجھے ضروری کام ہے .... تو نہ
س جاؤ"۔

وہ اپنا سا منہ لئے واپس ہو گیا۔ لیکن ابھی میں نے
او تکیے سے ٹیک لگا کے حقے کی نے منہ سے لگائی ہی تھی

کہ کڑکے دار آواز آئی۔

"اماں ملا صاحب سو گئے کیا؟"

یہ خواجہ شبن کے سوا کوئی نہ تھا۔ مجبوراً اٹھ کے دروازے
پر گیا۔ وہ چھوٹتے ہی پل پڑے۔

"اماں کیا واہیات ہے۔ بھتیجے کا بھی خیال نہ کیا
—— لاحول ولا قوۃ تم جیسا نخرے باز دیکھنے میں نہیں آیا۔
چلو"۔

"مگر میں ......"

"کیا یار نخرے دکھاتے ہو —— خبر بھی ہے دلی والوں
نے تیسری مات پہ پلی پلائی ہے"۔

وہ لمبے ڈیل ڈول کے آدمی تھے ایک ہی جھونک
میں کئی گز کھینچ کے لے گئے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ جانا پڑا۔ پھر
دلی والوں سے دو دو ہاتھ ہوئے۔ ظالم سچ مچ پرانے
گھاگ تھے۔ سحری تک تین بازیاں لڑیں۔ ایک انھیں ملی
ایک میں نے کی۔ تیسری برابر اٹھی۔ یہ بھی ہم دیوبندیوں کی
شکست ہی تھی۔ منشی چشمک علی چاہتے تھے کہ چاہے بے
سحری کا روزہ رکھنا پڑے مگر دلی والوں پر مات چڑھائے
بغیر اٹھا نہ جائے۔ مگر میں پیشاب کے بہانے اٹھ کر بھاگ آیا
اور معلوم نہیں منشی صاحب نے سحری کھائی یا غم کھا کھا کے
پیٹ بھرا۔ انھیں اپنی شطرنج پہ ہمیشہ ناز رہا ہے۔ وہ یہ
برداشت نہیں کر سکتے کہ انھیں باہر کا کھلاڑی ہرا جائے۔

اگلے روز انھوں نے عصر ہی کے وقت مجھے بازار
میں پکڑ لیا۔

"آج یار ذرا جلدی آجاؤ" ان کی آواز میں بے حد
سوز تھا "قسم قرآن کی دلی والوں کو نہ ہرایا تو لعنت ہے
ہماری زندگی پر"۔

"مگر قبلہ یہ رمضان ہے — عبادت کا مہینہ...."

"بس آگئے وہابیت پر..... یہ نہ بحث مت شروع
کرو۔ امام شافعی کے یہاں تو شطرنج جائز ہے"۔

"مگر آپ تو حنفی ہیں؟"

"ہونے دو۔ ضرورت کے وقت دوسرے اماموں

بھی مان لیتے ہیں۔ آخر دوسرے امام بھی تو اللہ والے تھے"۔

میں کچھ کہنے والا ہی تھا کہ صوفی طبرنیز بھی آٹکرائے:
"اخاہ آپ حضرات ہیں" انھوں نے بڑے تپاک سے کہا" ملا صاحب والذرات تو آپ نے کمال کر دیا، گھوڑوں سے مات دے گئے"۔

"آہستہ —— جناب یہ بازار ہے۔" میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا وہ کچھ خفیف سے ہو گئے۔

"خیر خیر انشاء اللہ ذرات کو ملاقات ہوگی" یہ کہہ کر چھمن حلوائی کی دکان پر چڑھ گئے۔

"تو کیسے پہونچ رہے ہو؟" منشی صاحب نے پوچھا۔

"بس تراویح کے بعد ——"

"اماں کیا ایک روز تراویح ملتوی نہیں کر سکتے۔ تاریخ نوروز کی ہے دلی والے کل چلے جائیں گے"۔

"مجبوری ہے منشی صاحب۔ میری بیوی اپنا ایک شہزادہ کو میرے پیچھے لگائے رکھتی ہے"۔

"ہٹاؤ یار تم بھی جورو کے غلام ہی رہے —— یہ بھی کوئی بات ہے —— خیر جامع مسجد میں جو پڑھ لینا وہاں آدھ گھنٹہ پہلے ختم ہو جاتی ہے"۔

"یہ بھی ناممکن ہے۔ بیگم کا آرڈر ہے کہ محلہ کی مسجد کے علاوہ کہیں نہیں پڑھ سکتے"۔

کیا حماقت ہے۔ یار تمہاری بیوی ہے یا نانی اماں۔ لاحول ولا قوۃ ——"

"یہی آفت ہے منشی صاحب۔ شادی کیا کی ان ہی کا پاؤں گردن پر رکھ لیا۔ آپ فکر نہ کیجئے ساڑھے نو تک پہونچ جاؤں گا ——"

پھر ایسا ہی کرنا پڑا۔ اچھن میاں آج بھی مسجد کے دروازے ہی پر پہرہ دے رہے تھے۔ میں جھلا گیا۔

"کیا مصیبت ہے۔ ارے تم چلو میں چائے پی کر آرہا ہوں"۔

"چچا جان چائے تو وہاں بھی تیار رہے۔ افطاری بھی بہت سی آپ کے لئے سجی رکھی ہے"۔

"ابے چچا کے بھتیجے تو کیوں میری جان کا لاگو ہوا ہے۔ جا کہہ دینا نہیں آتے ——"

"اللہ قسم چچا جان دیر نہ کیجئے۔ منشی صاحب کا زین پٹ گیا ہے"۔

"میں تیرے کان گدی میں لگا دوں گا —— بھاگ یہاں سے"۔

وہ منہ لٹکائے واپس آگیا۔ مگر کیا حاصل کچھ دیر بعد خواجہ شبن چڑھ آئے۔ بیگم ان کی آواز سن کے چونکیں پھر دبی آواز میں مجھ سے گویا ہوئیں:-

"کیا قصہ ہے —— کل بھی یہ تمہیں لے گئے تھے؟"

"ہاں ...... ارے بڑی مصیبت ہے۔ وہ شیخ دلاور کا بڑا لڑکا ہے نا اسے چڑھ گئی ہے کہ دوسری شادی کروں گا۔ اسی قضیے میں سمجھانے بجھانے کی خاطر مجھے کھینچا جا رہا ہے ——"

بیگم نے ناخوشگوار نظروں سے مجھے گھورا۔

"رمضان میں تو سچ بول لیا کیجئے ——"

"ہائیں ...... تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں"۔

"میری بلا سے —— جائیے وہ انتظار کر رہے ہیں"۔

میں باہر آیا۔ خواجہ شبن پھٹ پڑنے والے تھے کہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انھیں چپ کیا اور دروازے سے ہٹا کر سڑک پر لایا۔

"یار پٹواؤ گے تم —— میں تو خود ہی آرہا تھا"۔

"میرا ٹھینگا آرہے تھے۔ اماں کیا اسی کو یارانہ کہتے ہیں۔ منشی جی دو مات کھائے بیٹھے ہیں اور تم یہاں بیوی کی دم سے بندھے دوستی کا نام بدنام کر رہے ہو"۔

"چلو بابا چلو۔ میں آج خود بھی ایک درجن ماتیں کھاؤں گا جب تم لوگوں کو چین آئے گا ——"

"کھا کے تو دیکھو۔ چھرا اتار دوں گا تمہارے پیٹ میں یار دلی والے اگر جیت کے چلے گئے تو ہم کس کی ماں کو ماں کہیں گے"۔

"میری بیوی کو کہہ لیا کرنا مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا"۔
آج بھی سحری تک جما رہا۔ دلی والے شاید بلینڈنگ کی چربی کھا کے آئے تھے۔ ایک ہی بازی میں تین بج گئے اور نتیجہ پھر بھی صفر رہا۔ بازی جوں کی توں اٹھ گئی۔

لیکن معلوم ہوا دلی والے ابھی جا نہیں رہے ہیں عید تک جمیں گے۔ اب تو ظاہر ہے میرے لئے گلو خلاصی کی کوئی صورت تھی ہی نہیں۔ ہار جیت روز ہی ہوتی مگر اکثر کا پلّہ بھاری رہتا۔ کیونکہ میرے پہنچنے سے قبل ہی یاران طریقت دو تین مات کھا چکے ہوتے۔ بڑی مشکل سے دسویں روزے کو گیارہویں تراویح پڑھ کر میں نے اسکور پورا کیا اور دو ماتیں چڑھا دیں۔ اب میں مطمئن تھا کہ کم سے کم کل جان بچی رہے گی اور تجلی کا پاپ کاٹ سکوں گا۔ مگر ستارہ ہی گردش میں ہو تو کون کیا کر سکتا ہے۔ گیارہویں روزے کی شام کو ملنشی چشمک سے اور بے اختیار لپٹ گئے۔

"جگ جگ جیو ملّا۔ تمہارے دم سے عزت رہ گئی ــــــ بھئی کیا چالیں چلنے ہو قسم قرآن کی"۔

"شکریہ۔ مگر قبلہ آج سے میں رخصت چاہتا ہوں"۔

"ارے وا ــــــ خبر بھی ہے دلی والے آج صوفی رمضان کو لا رہے ہیں"۔

"کیا مطلب؟ صوفی رمضان تو کبھی کا لنگوٹ کھول چکے"۔

"کھول تو چکے مگر وہ ان دلی والوں کے رشتہ دار ہیں ان کے اصرار پر پھر میدان میں اتر رہے ہیں"۔

"اترنے دو۔ آپ سب لوگ نپٹتے رہیئے گا"۔

"کیا باتیں کرتے ہو ــــــ ان سے تمہارے سوا کون لڑے گا"۔

"میرا تو وارنٹ نکل چکا ہے ملنشی صاحب۔ سپاہی روز کنڈی کھٹکھٹاتا ہے"۔

"وارنٹ" وہ چونک کے ایک قدم پیچھے ہٹے۔

"جی ہاں وارنٹ۔ ایڈیٹر تجلی کو جانتے ہیں آپ آنریری مجسٹریٹ ہے پکّا"۔

"استغفراللہ۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ اماں ہٹاؤ رمضان میں کہیں فالتو کام ہوتے ہیں"۔

"آپ نے مسجد سے میخانے تک پڑھا ہے کبھی"؟

"کہاں فرصت ملتی ہے۔ ایک دفعہ پڑھا تھا الٹا سیدھا معلوم نہیں کیا لکھتے ہو"۔

"بجا ہے۔ مگر تنخواہ اسی کی ملتی ہے"۔

"کیوں جھوٹ بولتے ہو ــــــ ہم نے تو ایک دفعہ اپنا مضمون رسالہ طوفانِ ادب کو بھیجا تھا اس نے مفت بھی نہیں چھاپا ــــــ"

"بدذوق ہوگا اس کا ایڈیٹر۔ ختم کیجئے میں آج نہ آ سکوں گا"۔

"کیسے نہیں آسکوگے۔ خواجہ شبّن کہہ رہے تھے اگر ملّا نے بیحرمتی کی تو چھرا مار دوں گا"۔

"مار لینے دو میں فوراً یہ شعر پڑھ دوں گا:۔

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ جگر میں نہیں پسلی میں ماریں گے"۔

"میرا جگر سینے ہی میں تشریف فرما ہے جبھی تو دلّی والوں کو ناک چنے چبوا دیئے ہیں"۔

"قسم قرآن کی اچھا نہیں ہوگا اگر تم نے پیٹھ دکھائی ہاں نہیں تو"۔

تراویح کے بعد خواجہ شبن مسجد کے دروازے ہی پر مل گئے۔ موڈ بڑا سخت تھا۔

"بہت فضول آدمی ہو تم ملّا۔ کیا ستانے میں مزا آتا ہے"۔

بھائی صاحب ستانا نہیں میری آفت آئی ہوئی ہے۔ دن میں روزہ نہیں لکھنے دیتا۔ رات میں شطرنج سے چھٹی نہیں۔ بتاؤ تجلی کا پیٹ کیسے بھر دوں"۔

"جو لکھے ہیں ڈالو تجلی کو۔ اماں کیا رمضان روز روز آتا ہے۔ چلو صوفی رمضان کب کے آئے بیٹھے ہیں"۔

"تو تم لوگ نبٹو نا"۔

"نبٹ کیا نبٹیں۔ سات بجے سے ابتک فقط دو ڈھائی گھنٹے میں انھوں نے پانچ ماتیں پلادی ہیں ـــــ صوفی طیر نے کو پیلی دی۔ منشی جی کو مہرہ بڑھا کے کھلایا اور مات دیدی۔ اماں غضب کی چالیں چلتے ہیں"۔

"میں کیا کرلوں گا۔ میری عزت بھی خاک میں ملوا دوگے"۔

"دیکھا جائے گا۔ جب یاروں کی نہیں تو تمہاری بھی نہیں"۔

پھر درویش بجان درویش جانا پڑا۔ صوفی رمضان سچ مچ بڑے بانکے کھلاڑی تھے۔ انگریز کے زمانے میں ایک ریاست سے شطرنج ہی کی تنخواہ پاتے رہے ہیں دور دور شہرہ تھا۔ سحری تک دو بازیاں کھیلیں۔ ایک برابر اٹھی ایک وہ جیت گئے۔ برابر بھی اتفاقاً ہی اٹھی انھیں ایک بات پر جھلاّہٹ آگئی اور اوٹ پٹانگ چال چل گئے ورنہ جیت وہی رہے تھے۔

اگلے روز دوپہر میں منشی چشمک علی نے مجھے گھر بلا بھیجا۔ وہاں خواجہ شبن اور صوفی طیر بھی تھے۔ تینوں کے چہرے لٹکے ہوئے تھے اور سوچ بچار اس بات پر ہو رہی تھی کہ جب آخری مہرہ ـــــ ملاّ بھی پٹ گیا تو اب کیا ہوگا۔ صوفی طیر کہنے لگے:۔

"میں نے تو آج کمرخ شاہ کے مزار پر جلیبیوں کی تھال بھجوائی ہے"۔

خواجہ شبن بولے ـــــ "میں نے بھی بقائی درگاہ میں چادر بھجوادی ہے۔ حلقے کا بھی انتظام کرایا ہے"۔

"مجھے کس لئے یاد فرمایا گیا ہے؟" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا:۔

"تمہی بتاؤ کیا کیا جائے۔ صوفی رمضان کی جیت دراصل دلی والوں کی جیت ہے"۔

"اجی ہٹائیے بھی۔ کیا آپ نے یہ سمجھا ہے وہ روز ہی جیتیں گے؟"

ان کے مایوس چہروں پر امید کی لہر دوڑ گئی۔

"کیا تمہیں توقع ہے مات نکال لوگے؟"

"توقع کس چڑیا کا نام ہے۔ سو فیصدی مات نکالوں گا بس اس کا لحاظ رکھئے کہ اگر میرے اور صوفی رمضان کے درمیان کچھ تیز گفتگو آجائے تو آپ لوگ دخل نہ دیجئے گا"۔

"کیوں یعنی کیا مطلب"؟

"مطلب کچھ بھی نہیں بس کہہ دیا"۔

"ارے تو کیا جھگڑا کروگے؟" منشی جی خوفزدہ آواز میں بولے۔

"ایک خاص حد تک ـــــ ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آئے گی"۔

"اس سے کیا فائدہ؟"

"آپ کو جیتنے سے مطلب ہے نا۔ بس دیکھ لیجئے گا"۔

دراصل صوفی رمضان کی کمزوری میں نے رات ہی بھانپ لی تھی۔ معمولی سی جھلاّہٹ میں وہ بہک گئے تھے۔ رات آئی۔ بازی جمی۔ اتفاق یہ تھا کہ وہ دونوں دلی والے آج کہیں اٹک گئے تھے۔ شاید انھیں یقین تھا کہ صوفی صاحب اکیلے ہی سب کی کھال کھینچ لیں گے۔ اول تو میں نے سنجیدگی سے کوشش کی کہ انھیں مات دیدوں لیکن ہار گیا۔ پھر مجبوراً استاد رحمۃ اللہ علیہ کی پالیسی پر عمل پیرا ہونا پڑا۔

دوسری بازی میں انھوں نے فرزیں چلا تو میں نے کھوٹ سے گھوڑا اٹھا کے جو تھے گھر پہ اسے مار دیا۔ وہ گھبرا کے بولے:۔

"ارے ارے کیا کرتے ہو۔ یہ گھوڑا ہے فیل نہیں"

"واہ صاحب گھوڑا کہاں ہے فیل ہے"۔

"ارے واہ ـ دیکھئے نا گھوڑا ہے۔ فیل تو وہ دونوں آپ کے رکھے ہیں"۔

"اوہ ..... ہاں میں سمجھا فیل ہے۔ لاحول ولا قوۃ"۔

پھر چند چالوں کے بعد میں نے فیل سے دُہائی گھر پر ان کا رخ اڑا دیا۔ اب کی وہ بھنا گئے۔

"عجیب آدمی ہیں آپ بھی۔ اب کی فیل کو گھوڑا بنا رہے ہیں"۔

"کیا ...... فیل کیسا — فیل تو وہ رکھا ہے"۔ میں نے گھوڑے کی طرف اشارہ کیا۔

"توبہ توبہ۔ آپ کی نظر موٹی ہے کیا — رُخ رکھ دیجئے"۔

"کیوں رکھدوں صاحب۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اب کی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے"۔

"استغفراللہ — اجی جناب آپ چشمہ اتار کے دیکھئے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی"۔

ان کی آواز سلگ رہی تھی۔ میں نے بڑے اطمینان سے چشمہ اتارا اور فیل کو اس انداز سے دیکھا جیسے دوربین لگا رکھی ہو۔

"مجھے تو اب بھی یہ گھوڑا ہی نظر آرہا ہے ......"

"لاحول ولا قوۃ"۔ انھوں نے "حول" کے لام کو جھڑکی کے انداز میں ادا کیا اور دیگر حاضرین کی طرف بھڑک کے "دیکھ رہے ہیں آپ لوگ انھیں مہروں تک کی پہچان نہیں"۔

"معاف کیجئے گا صوفی صاحب" میں نے بڑی نرمی سے کہا "معلوم ہوتا ہے بتقاضائے عمر آپ کی بینائی کمزور ہوگئی ہے۔ غور سے دیکھ لیجئے یہ گھوڑا ہی ہے"۔

اب تو وہ بالکل ہی آپے سے باہر ہوگئے۔ اندیشہ تھا کہ بساط پٹخ کر بھاگ کھڑے ہوں لیکن میں نے کھٹ سے ان کا رخ اسی خانے میں رکھ دیا جس میں پٹا تھا اور فیل کو اسی جگہ رکھتے ہوئے ندامت کے ساتھ عرض کیا

"معافی چاہوں گا صوفی صاحب مجھ سے ہی واقعی چوک ہوگئی۔ یہ کمبخت فیل اور گھوڑے ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ قصور ان گدھوں کا ہے جو مہرے بنانے وقت فیل کی سونڈ نظر انداز کر جاتے ہیں"۔

وہ اٹھتے اٹھتے رہ گئے۔ بازی آگے بڑھی۔ لیکن نپٹتے ہوئے دماغ کی گرمی ان کے بس سے باہر تھی۔ جھلا جھلا کے چالیں چلتے رہے اور آپ ہی اپنے گرد جال بن لیا۔ نتیجہ یہ کہ ہار گئے۔ اب تو پارہ اور بھی چڑھا۔ نئی بازی جمانے ہوئے کڑے لہجے میں فرمایا:۔

"اگر اب کی آپ نے میاں ملا ایسی کوئی حرکت کی تو فوراً مات مان لی جائے گی"۔

"یہ تو زیادتی ہے صوفی صاحب" منشی چشمک لجاجت سے بولے "ملا صاحب نے تو اپنا قصور مان لیا تھا۔ بھول چوک تو خدا بھی معاف کرتا ہے"۔

"کرتا ہوگا معاف۔ یہ کوئی تماشہ ہے کہ فیلے گھوڑا اور گھوڑے کا فیلا"۔

"نہیں نہیں صاحب"۔ میں نے کہا "اب تو آنکھیں مل مل کے دیکھوں گا۔ مگر ذرا آپ بھی دیکھ بھال کے چلئے گا"۔

"کیوں میں نے کونسی چال بے دیکھے بھالے چلی" وہ غرائے۔

"یہ مطلب نہیں۔ غرض یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ اونچے کھلاڑی ہیں۔ بعض چالیں آپ کے شایانِ شان نہیں ہوتیں"۔

"خیر خیر آپ کھیلئے"۔ وہ بیزاری سے بولے، اس طرح مہرہ چلا جیسے رہپٹ مار رہے ہوں۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ پچھلی مات اتارنے کے لئے وہ اور بھی طرارے میں بھر گئے تھے۔ یہی انھیں چاروں خانے چت گرانے کا موجب ہوا۔

دوسری مات کھا کر ان کے بڈھے چہرے پر بڑے ہی دردناک احساسات جھلکنے لگے۔ اب ڈھائی بج رہے تھے۔ وہ تیسری کے لئے مہرے جمانے لگے۔

"اب اجازت چاہوں گا صوفی صاحب سحری کا وقت ہونے والا ہے"۔

"اجی ایک اور ہو جائے —" صوفی صاحب

مرار کیا "ابھی تو کافی وقت ہے"۔
"نہیں حضرت مجھے سحری کھانی ہی نہیں پکانی بھی
ہے۔ بیوی آجکل مکمّل ترکِ موالات کے موڈ میں ہے"۔
ہارے جواری کو بڑی مایوسی ہوتی ہے، جب جیتنے
لا جیبیں پُر کر کے نو دو گیارہ ہونے لگے صوفی صاحب
لبس نہیں چلا ورنہ میری ٹانگ پکڑ کے کھیلنے پر مجبور کرتے
"اچھا تو پھر کل رہے گی" انھوں نے فیصلہ کن
داز میں فرمایا۔
"جی ہاں ضرور رہے گی"، منشی چشمک چہکے۔
"نہیں، جناب میں کل نہ آسکوں گا بیچ ضروری
م اٹکے پڑے ہیں"۔
"یہ تو کوئی شریفانہ طریقہ نہ ہوا" صوفی صاحب
ہمی کے ساتھ بولے "ہار جیت کا فیصلہ تین دن سے
میں نہیں ہوا کرتا ——"
"ہار تو آپ کی ہو چکی صوفی صاحب۔ میں کل سے
وٹ کھول رہا ہوں"۔
"کیا واہیات ہے"۔ وہ کھسیا گئے "آپ نے کبھی
ریقوں میں شطرنج کھیلی ہے؟"
"شریف تو میرے سائے سے بھاگتے ہیں صوفی
حب۔ زندگی میں صرف ایک بار شریف آدمی سے
ے ساتھ بازی لڑائی تھی وہی آج تک پچھتا رہا
ہے"۔
"کیا مطلب؟ یعنی کہ آپ .... یعنی کہ ..."
صوفی صاحب فرطِ غضب میں اپنا مافی الضمیر
ادا نہ کر سکے۔ منشی چشمک علی کی رگِ اخلاق پھڑک
ہی۔ خواجہ شبن کو بھی صوفی صاحب پر ترس آگیا۔
نوں ہی نے مجھے مجبور کیا کہ کل پھر لڑے گی۔ بادلِ ناخواستہ
نے مان لیا۔
اگلے دن نیا شگوفہ کھلا۔ میں اور خواجہ شبن باتیں کرتے
ادھر سے گزر رہے تھے کہ دونوں دلی والے کھوانی حلوائی
دوکان پر نظر آئے۔ انھوں نے سیر بھر گرم جلیبیاں لیں

اور ایک پڑے سے بھگونے میں رکھ کر پٹھان پورے کی
طرف روانہ ہو گئے۔۔
دیکھا آپ نے —" میں نے خواجہ شبن سے کہا۔
"میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں آج ان لوگوں کا روزہ
نہیں ہے"۔
"نہ ہو گا۔ آخر مسافر ہیں نا"۔
"کیسے مسافر۔ یہ تو عید تک کے قیام کا ارادہ کر چکے
ہیں۔ پھر صوفی رمضان بھی مسافر ہیں کیا؟"
"تو ان کے بارے میں کیا معلوم؟"
"ان جلیبیوں میں یقیناً ان کا بھی حصہ ہے۔
یقین نہ آئے تو چلئے تحقیق کریں گے"۔
"مگر روزہ نہ ہونے سے جلیبیوں کا کیا تعلق ہے۔
یعنی کہ جلیبیاں ہی کیوں اور کچھ ......"
"آپ نہیں جانتے یہ اساتذۂ فن کا خاص نسخہ ہے
دماغ کے لئے جلیبیوں کے شیرے سے بڑھ کر کوئی ٹانک
نہیں —— چلئے چلیں"۔
ہم صوفی رمضان کے گھر پہنچے۔ غور طلب یہ تھا
کر بیرونِ کن یہ حال کیونکر معلوم ہو۔ اتنے میں ایک چھ سات
سال کا بچہ گیند اچھالتا ہوا گھر سے برآمد ہوا۔ میں نے
اس کی گیند اچک لی۔ وہ جھٹ سے چھیننے کے لئے آگے
بڑھا۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا گیا۔ جب دروازے
سے اتنا فاصلہ ہو گیا کہ بول چال کی آواز گھر میں جانے کا
خطرہ نہ رہا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے پوچھا۔
"تمہارا کیا نام ہے بیٹا؟"
"پپّو ..... لاؤ ہماری گیند ....."
"ہاں ہاں گیند دیں گے۔ مگر پہلے یہ بتاؤ تمہارے
دادے کیا کر رہے ہیں؟"
"حقّہ پی رہے ہیں۔ لاؤ ہماری گیند"۔
"شاباش۔ لو یہ گیند —— مگر ہاں وہ جو دو آدمی
تمہارے گھر ابھی ابھی آئے ہوں گے کیا وہ بھی حقّہ
پیتے ہیں؟"

"وہ تو بیڑی پی رہے ہیں — لاؤ ہماری گیند۔"
گیند دیکھ ہم لوگ لوٹ آئے۔ خواجہ شبن منھ پھاڑ کے بولے:۔
"اماں کمال ہے یہ صوفی بدمعاش روزہ بھی نہیں رکھتا۔"
"رکھتا ہے — ضرور رکھتا ہوگا — مگر آج وہ تیاری کر رہے ہیں۔"
"تیاری کی ایسی تیسی۔ تیاری کا کیا مطلب؟"
"یہ مطلب کہ آج وہ جلیبیاں کھائیں گے۔ خمیرہ مروارید کھائیں گے۔ دو بار غسل کریں گے۔ نصف گھنٹہ چت لیٹ کر دھنیے کا آدھا پاؤ تیل کھپائیں گے۔"
"دھت تیری کی یہ بھی کوئی بات ہوئی۔"
"یہ شاہی نسخہ ہے شبن صاحب۔ کھوپڑی میں ہنڈے جلنے لگتے ہیں۔"
"اماں تم بھی کر دنا تیاری۔ قسم خدا کی رات تو کمال کر دیا تم نے، کیا سچ مچ گھوڑے فیلے میں دھوکا لگا تھا؟"
"وہ تو آج بھی لگے گا شبن صاحب مگر آج بادشاہ اور فرزیں کی باری ہے۔"
"ارے... کیا بات؟" ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔
"سنائیے! — آدمی ستاروں کی چال سے مجبور ہے شبن صاحب!"
رات کو حسب معمول پھر اکھاڑہ جما۔ صوفی رمضان کی بے آب دگیاہ چندیا آج کندن کی طرح دمک رہی تھی صاف میز پہ رکھ کے جب وہ فرش پہ بیٹھے ہیں تو کمرہ روغنِ دھنیہ کی لہک سے مہکتا چلا گیا۔
کھیل کے دوران میں نے اچانک ایک آنکھ ہاتھ سے ملتے ہوئے کہا:۔
"اُفوہ..... معلوم ہوتا ہے آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے..... ذرا دیکھئے گا صوفی صاحب!"
انھوں نے چونک کر نظر اوپر کی۔ میں نے آنکھ پھڑ پھڑائی۔ وہ پل بھر گھورتے رہے۔ پھر جھنجھلا کے بولے۔
"اجی ہوگا کچھ، چال چلئے۔"
"واہ صاحب — یہاں تو آنکھ کھٹک رہی ہے آپ کہتے ہیں چال چلئے — منشی صاحب ذرا آپ دیکھئے گا آنکھ کچھ نظر آتا ہے کیا؟"
منشی صاحب جھکے۔ پھر باری باری اور بھی لوگ سعی لاحاصل کرتے رہے۔ وہاں کچھ ہوتا تو نظر آتا۔ میں کراہتا رہا۔ آخرکار تڑخ کے بولا۔
"آپ سب کی نگاہ موٹی ہے۔ منشی صاحب ذرا آئینہ لائیے، میں خود دیکھ لوں گا۔"
"آئینہ...... یار آئینہ تو گھر میں نہ جانے کہاں پڑا ہوگا۔ دیکھئے میں کوشش......"
"اچھا ٹھہرئیے — کام یوں بھی چل جائے گا۔"
یہ کہہ کر میں بجلی کا لیمپ اٹھا کر صوفی صاحب کی چندیا کے برابر لایا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے آنکھ کو پھیلا کر چندیا پر گردن جھکا دی۔ پل بھر کو تو سب متحیر سے رہے مگر جب صاف ظاہر ہوگیا کہ صوفی صاحب کی چمکتی ہوئی چندیا بطور آئینے کے استعمال ہو رہی ہے تو قہقہوں اور دہاڑوں کا طوفان اٹھ گیا۔ قہقہے خواجہ شبن اور منشی چیتمک وغیرہ کے تھے اور دہاڑیں ظاہر ہے صوفی صاحب اور دلی والوں کی رہی ہوں گی۔
"بڑے نامعقول ہیں آپ میاں ملا۔" یہ صوفی صاحب کی للکار تھی۔
"واہ صاحب یہ بھی کوئی بات ہوئی" یہ دلی والے بولے تھے۔
"ارے... کیا ہوا؟" میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا "کس بات پہ شور مچا رہے ہیں آپ لوگ — یہ دیکھئے —" میں نے چٹکی میں پکڑا ہوا ٹھینگا صوفی صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "آنکھ سے دماغ میں چڑھا جا رہا تھا بدمعاش —"

پھر کچھ دیر تو تو میں میں کے بعد کھیل چالو ہوا تو صوفی صاحب باوجود سعیِ تحمل کے آپے سے باہر ہو چکے تھے۔ نتیجہ وہی ہوا یعنی بری طرح ہارے۔

اب کہاں تک یہ رزم نامہ دہراؤں۔ مختصر یہ کہ ساری راتیں تو کانگھ کی فوجیں لڑانے میں صرف ہو چکی تھیں اب کل تک ڈائری لکھ کر دینی تھی۔ عام حالات میں ایڈیٹر تجلی فقط ڈانٹ پھٹکار تک ہی رہ جاتیں تو رہ جائیں لیکن خاص حالات میں وہ واقعتہً بری طرح پیش آتے ہیں، دو دفعہ اس کا تلخ تجربہ کر چکا ہوں جس کی تفصیل کسی اور موقعہ پر عرض کروں گا۔ فی الحال تو تیسری بار کے تجربے سے بچنے کی فکر تھی۔ رات کو حقہ بھر کے بیٹھا تھا تنے میں سیٹھ شمشاد کا نوکر آدھمکا۔

"سیٹھ جی نے آپ کو یاد کیا ہے"۔

"بہت اچھا کیا ہے۔ کہنا وہ کبھی آپ کو یاد کرتا ہے۔ فقط والسلام"۔

"جی ۔۔۔۔ جی وہ تو اسی وقت یاد کر رہے ہیں"۔

"ہاں ہاں کہہ دینا ملا بھی آپ کو اسی وقت یاد کر رہا ہے"۔

"ارے صاحب انھوں نے کہا تھا ساتھ لیکے آنا"۔

"کیا مصیبت ہے۔ دیکھ فتن۔ کہہ دینا ملا صاحب سہارنپور گئے ہوئے ہیں، کل آئیں گے تو مل لیں گے ... م مگر ..... ستیاناس۔ ارے یہ مت کہہ دینا کہ کل مل لیں گے۔ یوں کہنا کہ ان کے گھر پہ کہہ آیا ہوں کہ آئیں تو سیٹھ صاحب سے مل لیں"۔

"مگر وہاں تو سیٹھ جی کے مہمان بھی آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ شعر پڑھے جا رہے ہیں"۔

"اُف توبہ ..... ارے مائی ڈیر کہنا وہ گھر پہ ملے نہیں۔ کان کھول کے سن لو میاں فتن! مجھے آج بے حد ضروری کام ہے۔ مگر یہ بھی مناسب نہیں کہ سیٹھ صاحب کی بات ٹھکرائی جائے۔ بس یہی کہنا کہ ملے نہیں ... اگر نہ کہا تو میں بہت برا آدمی ہوں ـــــ"

وہ بیچارا ہکا بکا رہ گیا۔

"اچھا صاحب میں آپ کی سب باتیں دہرا دوں گا"

"یا خدایا .... ارے دہرانے کے بچے .... باتیں مت دہرانا۔ بس یہ کہہ دینا کہ ملے نہیں"۔

وہ ہاتھوں کو اس طرح الٹتا پلٹتا چلا گیا جیسے میری سیدھی سی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہو۔ ایک گھنٹہ میں اسی الجھن میں رہا کہ جانے وہ گڑھا کیا جا کہے گا۔ پھر بمشکل موڈ درست کیا اور لکھنے بیٹھا سحری تک محض چند سطریں لکھی گئیں۔ میری ذہنی حالت اس بچے سے مختلف نہیں تھی جو اسکول سے ایک دن غیر حاضر رہ کر ذہنی طور پر تین دن غیر حاضر رہتا ہے۔

"میں کل پردیس جا رہا ہوں بیگم" سحری کھاتے ہوئے میں نے بصد حسرت و یاس کہا "صرف پانچ سطریں لکھی گئی ہیں"۔

"دن میں ایک دو صفحہ اور لکھ کر کاتب کے حوالے کر دیجئے گا پھر رات کو لکھئے گا"۔

"مشکل ہے۔ کاش کسی امام نے شطرنج کی طرح ایک آدھ روزہ صاف کرنے کا بھی جواز رکھا ہوتا یہ امام بڑے ہی خشک ہوتے ہیں"۔

صبح بعد نماز حسب معمول سو گیا اور بارہ بجے اٹھ کر ارادہ کیا کہ قلم چلاؤں۔ مگر خدا گواہ ہے بارہ بجے سے ایک بجے تک ذہن یہی فیصلہ نہ کر سکا کہ جیب کے دونوں قلموں میں سے کونسا قلم نکالوں۔ پھر فیصلے کے بغیر ہی اکتا کر جیب پہ ہاتھ ڈالا تو دونوں ہی قلم سوکھے پڑے تھے۔ واردات ڈھونڈی معلوم ہوا صبح دونوں صاحبزادیوں نے ایک چڑیا پکڑی تھی اس کے پر رنگنے میں ساری روشنائی کام آ چکی ہے۔ اپنا قلم بیگم نے پیش کیا مگر مردانہ ہاتھوں میں کہیں زنانے قلم چلتے ہیں۔ بہت کوشش کی مگر دو چار نہایت تھرڈ کلاس فقروں کے سوا کچھ بھی نہ لکھ سکا۔ اتنے میں ظہر کی اذان ہو گئی۔

نماز سے فارغ ہوکر بازار سے دادات لایا اور تین سے پانچ تک ڈٹ کے لکھا — جی ہاں ڈٹ کے — مگر کیا لکھا اس کا اندازہ اس سے کیجیئے کہ عصر کی اذان پر جب بیگم خوش ہوتی ہوئیں میرے قریب آئیں کہ ماشاءاللہ دو گھنٹے میں کافی لکھ لیا ہوگا تو میں بیٹھے ہی بیٹھے کوہ قاف کی نیلم پری سے جادو کے طوطے کی کہانی سن رہا تھا۔

"ارے آپ تو سو رہے ہیں ....."

میں نے بڑبڑا کے آنکھیں کھولیں۔ انھوں نے سامنے رکھے ہوئے صفحے پر نظریں ڈال کر برا سا منھ بنایا۔

"تو یہ .... یہ تو ٹوٹی پھوٹی سطریں ہیں — لکھا ہوا کہاں ہے؟"

"لکھا ہوا — بس یہی لکھا ہے ....."

"یہ لکھا ہے؟ — یوں کہیئے رات جو پانچ سطریں لکھی تھیں انھیں کیڑوں مکوڑوں میں تبدیل کر دیا ہے"۔

"یہ بھی ایک آرٹ ہے بیگم — اور اب تم میرا ہولڈ ول باندھ دو۔ رمضان میں افطار سے نصف گھنٹہ قبل سفر کرنا بھی آرٹ کی نہایت اعلیٰ قسم ہے"۔

اور اے ناظرین تجلی! اب یہ آفت زدہ ملاّ عین رمضان میں پردیس کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔ لوٹنا نصیب ہوگیا اور ایڈیٹر تجلی نے زندہ بھی چھوڑ دیا تو خیر آئندہ قلمی ملاقات ہوجائے گی ورنہ بغلیں بجا بجا کے گانے پھیرے گا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(مُلاّ زندہ صحبت باقی)

●

خریدار حضرات خطوط میں اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں تاکہ ان کی ہدایات و فرمائشات پر فوری توجہ دی جا سکے — منیجر تجلی

بادۂ عرفان ○ قرآن پر ظلم ○ انکشاف

بادۂ عرفان

حمد و نعت وغیرہ پر مشتمل حفیظ بنارسی کا مجموعۂ کلام ○ طباعت کتابت اور کاغذ سب بہتر صفحات ۹۷ - قیمت مجلد پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ: پروفیسر حفیظ بنارسی۔ ملکی محلہ۔ آرہ۔

حفیظ بنارسی بہت شہرت یافتہ نہیں تو بالکل گمنام بھی نہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں کے مجموعے "دستِ خشاں" پر بہار اردو اکیڈمی انعام دے چکی ہے۔

پیشِ نظر مجموعے پر مولانا ابوالحسن علی ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی اور علیم مسرور جیسے حضرات کی تقریظیں موجود ہیں۔ سبھی نے اسے سراہا ہے اور بجا طور پر ہمت افزائی کی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ حفیظ صاحب ایک صحیح العقیدہ، اعتدال پسند مسلمان ہیں۔ فکر کا صحت مند رخ اور اظہار و بیان کی متانت اور زبان کی سلاست ان کے اشعار کا جزو لازم سمجھئے۔ سادگی حقیقت نگاری اور خوش فکری سے وہ ہر صاحبِ ذوق کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

کچھ نمونے :-

ہے کشادہ سب کی خاطر اس کا دربارِ کرم
عام ہے سب کے لئے فیضانِ رب العالمین
جنت الفردوس کے وارث وہی ہوں گے حفیظ
با جو دل سے تابع فرمانِ رب العالمین

وائے لالہ گل ہو کہ پیرزۂ مہر و تنور
ہی ہے سب میں نہاں لا الٰہ الا اللہ
ایغِ بادۂ عرفاں، چراغِ راہِ ہدیٰ
کلیدِ بابِ جناں لا الٰہ الا اللہ!

بندوں کو بھی سفاکی پہ جن کی شرم آتی تھی
انہیں کو مظہرِ آدابِ انساں کر دیا تو نے
وہ جن کی جاہلیت کا زمانے بھر میں شہرہ تھا
انہیں کو علم و دانش کا نگہباں کر دیا تو نے

جہاں دہشت کا پہرہ تھا جہاں وحشت برستی تھی
اسی وادی کو رشکِ صد گلستاں کر دیا تو نے

پھر حد سے بڑھ گئی ہیں زمانے کی الجھنیں
پھر مانگتی ہے زلفِ جہاں شانۂ رسولؐ

سادگی و پرکاری کا حسین امتزاج پیش کرنے والے ایسے اشعار حفیظ صاحب کے یہاں خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ لیکن ضرورت ہے کہ وہ اپنے فن کو سنوارنے اور نکھارنے پر مزید توجہ صرف کریں۔ ابھی ان میں پختگی نہیں آئی ہے اور انفرادیت کی کوئی چھاپ نہیں ملتی۔ اظہارِ خیال میں ندرت اور مضمون آفرینی میں بانکپن نہیں۔ بہتیرے اشعار سپاٹ ہیں اور نو مشقی کا تاثر دیتے ہیں۔ زبان کا رکھ رکھاؤ بھی معیارِ بلند تک نہیں پہنچا۔

ہو نہیں سکتا ادا اس کے کرم کا شکریہ
اس قدر ہم سب پہ ہیں احسانِ رب العالمین

احسان بصیغۂ واحد کہا تھا تو "ہے" نظم کرنا چاہئے تھا "ہیں" جمع کا متقاضی ہے یعنی "احسانات"۔

حمد اس کی ہمیشہ سے ہے جس کی ذات — حمد اسکی نہیں جس کی خاطر حمات

دوسرا مصرعہ مشاقی کے بجائے اناڑی پن کا مظہر ہے۔

عرش کی رونق فرش کی زینت صلی اللہ علیہ وسلم

یہ کیا کہہ دیا۔ مبالغہ شاعری کا حسن سہی لیکن معاملہ جب اللہ اور رسولؐ کا ہو تو عقائد صحیحہ کا لحاظ ضرور رکھنا چاہئے "عرش کی رونق" اللہ جل جلالہ ہے نہ کہ رسول اللہؐ۔ یہ مضمون بہتیرے شاعر باندھتے آئے ہیں لیکن کسی صحیح العقیدہ شاعر کو تو تقلیدِ جامد کی راہ اختیار نہیں کرنی چاہئے۔ اچھا ہوگا کہ اس طرح کی فاسد مبالغہ آرائیاں بریلوی مکتبِ فکر کے لئے چھوڑ دی جائیں۔

واہ رے امانت واہ رے صداقت صلی اللہ علیہ وسلم

"واہ" کی آہ نہ صرف دب گئی بلکہ قتل ہو گئی۔ حیرت ہے حفیظ صاحب کے مذاقِ شعری نے یہ قتلِ ناحق کیسے گوارا کر لیا۔

⁂

صلح و وفا ہو جنگ و جدل ہو خواہ وہ کوئی بزمِ عمل ہو
آپ نے کی ہے سب کی صدارت صلی اللہ علیہ وسلم

ایک ہی شعر میں اتنے متعدد الفاظ کا غلط استعمال کم ہی ملے گا۔ صلح کے ساتھ "وفا" محض تک بندی ہے "بزمِ عمل" بھی برمحل استعمال نہیں ہوا۔ "صدارت" کا بھی موقع نہیں تھا صدارت سے بہتر تو "قیادت" ہی رہتا۔

خار کے بدلے پھول کی بارش واہ رے انکی شانِ نوازش

"پھول کی بارش" غلط زبان ہے۔ بارش کے لفظ میں برسنے والی شئے کا تعدد آپ سے آپ شامل ہے "پھولوں کی بارش" کہنا چاہئے تھا۔ پھر مقابلتہً "خار" بھی غلط ہی ہوتا۔ دونوں الفاظ بصیغۂ جمع ہی جزوِ شعر بنتے تو لطف آتا۔

ساقیِ کوثر مالکِ جنت صلی اللہ علیہ وسلم

"مالکِ جنت" کہنے کے گناہِ کبیرہ پر حفیظ صاحب سو بار استغفار پڑھیں تو ان کے حق میں مفید ہوگا۔ تعجب ہوتا ہے کہ جس ملت کے پاس قرآن جیسی کتابِ مبین موجود ہے اس میں اس طرح کی فاسد خیالی گھس آئے۔ بناہ بخدا یا در کھئے جنت، دوزخ، میزان، قضا و قدر سب کا مالک اللہ اور صرف اللہ ہے۔ اس نے کبھی کسی کی طرف اپنی ملکیت منتقل نہیں کی۔ اگر رسول اللہ جنت کے مالک ہوتے تو بھلا حشر کے دن شفاعت کی زحمت کیوں فرماتے۔ شفاعت اور وہ بھی اللہ کی اجازت مل جانے کے بعد صریح دلیل ہے اس حقیقت ثابتہ کی کہ جنت ان کی ملک نہیں۔ مالک اپنے مملوکہ علاقہ میں کسی کو داخل کرنا چاہے تو وہ کسی کی بارگاہ میں سفارش و شفاعت کی پریشانی کیوں اٹھائے گا۔ ہر وہ مسلمان جو اس طرح کے غلو میں مبتلا ہے مرنے سے قبل توبہ کرے تو توحید کا آئینہ سلامت رہ جائے گا ورنہ آخرت کے عذاب سے چھٹکارا مشکل ہے۔ اللہ ہر گناہ معاف کر دیتا ہے لیکن یہ گناہ معاف نہیں کرتا کہ اسکی شانِ مالکیت کو بٹہ لگایا جائے۔

اللہ کے نامِ پاک سے مشتق ہے اسمِ نام
محمود ہے خدا تو محمد ہیں مصطفےٰ

⁂

غیر محتاط اور منطقی باتیں۔

اللہ کے جتنا نوے نام حدیث میں آئے ہیں ان میں تو "محمود" ہے نہیں۔ حمید بے شک ہے۔ لیکن یہ طرزِ فکر یہی اپنی جگہ فساد سے خالی نہیں کہ خدا کے نام پاک کو مصدر اور حضورؐ کے نام کو اس کا مشتق بنایا جائے۔ اس سے جزئیت کا اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ وہی جزئیت جس کی ایک شکل نصرانیوں میں بطورِ "ابن اللہ" پائی جاتی ہے۔ خدا لغوی معنوں میں بلا شبہ محمود ہے اور حضورؐ تو محمد ہیں ہی مگر اس مصادری یکسانیت در مماثلت کو دامنِ توحید کا داغ نہیں بنانا چاہیئے۔ نام محمدؐ کسی خدائی نام کا مشتق نہیں بلکہ لغت عربی کے ایک مصدر کا مشتق ہے۔ بات اس سے آگے نہیں بڑھنی چاہیئے ورنہ "احمد بے میم" والا منتر کا نہ جانے کہاں چل نکلے گا۔ العیاذ باللہ

یہ اک عالم ہے ممنونِ کرم تیری ہدایت کا
کچھ اتنا جادۂ ہستی کو آساں کر دیا تو نے

پہلے مصرعہ میں "یہ" حشو ہے اس کے بغیر ہی مصرعہ درست ہوتا۔ معنوی خامی یہ ہے کہ ہدایت اور جادۂ ہستی کی آسانی میں کوئی مناسبت نہیں۔ مسلمان بن کر زندگی گذارنا بہت ہی مشکل ہے۔ شاعر اپنا مافی الضمیر صحیح طور پر بیان نہیں کر سکے۔

وہ تیرہ و تار دنیا کہ رشک آئے فرشتوں کو
طہارت کی بلندی پر جسے انسان کر دیا تو نے

دوسرے مصرعہ میں حفیظ صاحب کے کہنے کا منشا تھا۔ اس کی قدرتِ بیان کا افلاس اور شدتِ اظہار کا خبط نمایاں ہے۔

تری تعلیم نے [illegible] کو حرم ٹھیرایا
غمِ دوراں کو بھی ہجر وغمِ جاں کر دیا تو نے

"غمِ جاں" یہاں مہمل ہے "غمِ جاناں" کا محل تھا۔

شق ہوا مہتاب لوٹ آیا فلک پر آفتاب
دیکھیے اعجازِ فرمانِ محمد مصطفےٰ

آفتاب لوٹ آنے کی روایت صحیح نہیں ہے۔ شق القمر کا معجزہ غنیمت روایات سے ثابت ہے لیکن معجزات کے سلسلہ میں "فرمان" کا لفظ بجائے خود غلط ہے۔ فرمان اللہ کا ہوتا تھا۔ معجزات کسی بھی نبی کے اپنے فرمان کا حاصل نہیں ہوا کرتے۔

السلام اے نور بخشِ بزمِ امکاں السلام

یہ پیرایہ بھی غلو سے خالی نہیں۔ بزمِ امکاں کا نور تو اللہ کی ذات واجب الوجود ہے۔ قرآن کی نصِ صریح ہے۔ اللہ نور السموات والارض۔ پھر کیا عقیدتِ رسول میں قرآن سے بھی معارضہ اور مکابرہ جائز ہو سکتا ہے۔

تو چراغِ فرش بھی ہے عرش کی قندیل بھی

وہی "عرش کی رونق" والی بات۔ خدا ان روایات گھڑنے والوں کو شاید ہی معاف کرے جنھوں نے اللہ کی بارگاہِ عرش پر بھی رسول اللہؐ کو بٹھانے کی سعی مکروہ کی ہے۔ آخر کیوں قرآن کو بھول جاتے ہیں لوگ۔ حیرت ثم حیرت ثم حیرت

شعلۂ جوالہ میں بھی مثلِ گل خنداں رہا

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی منقبت کا ایک مصرعہ ہے حفیظ صاحب شاید اتفاق سے شعلۂ جوالہ اور آتشِ نمرود کا فرق بھول گئے۔ شعلۂ جوالہ اس شعلہ کو کہتے ہیں جو گردا گرد پھرے۔ وہ ایک "مختصر سی آگ" سے عبارت ہے جو متحرک ہوتی ہے اور دائرہ یا گھیرا بناتی ہے۔ حضرت ابراہیم جس آگ میں ڈالے گئے وہ تو الاؤ اور بھٹی کے مانند تھی۔

"شعلۂ جوالہ میں" بہ اعتبار محاورہ بھی غلط ہے۔ شعلۂ جوالہ ظرف کے طور پر استعمال نہیں ہوتا۔ جہنم، بھٹی، تنور، الاؤ وغیرہ کی طرح اس میں ظرفیت متصور نہیں۔

محمد مصطفےٰ کی سعی اور ناکام ہو جاتی
خدا خانے نہ بنتے تو صنم خانے کہاں جاتے

یہ خالص شاعرانہ نوع کی شاعری ہے جس کی سطح تو خوشنما ہوتی ہے مگر اندر بھس بھرا ہوتا ہے۔ بھلا کیا بات ہوئی کہ خدا خانے نہ بنتے تو صنم خانے کہاں جاتے ---! صنم خانوں کو کہیں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی انھیں تو اپنے قیامِ مستقل کے لئے ساری ہی دنیا خالی ملتی --- اگر

تھوڑی سی منطقی دلکشی پیدا ہو سکتی تھی تو یوں کہنے سے ہو سکتی تھی کہ "اگر سارے عالم میں "خدا خانے" بن جاتے تو بچارے صنم خانے کہاں جاتے" یہ ایسا ہی ہوتا جیسے شکیل بدایونی کا مشہور مصرعہ ہے ؏

اگر دنیا چمن ہوتی تو ویرانے کہاں جاتے

نہ پوچھ ان کا مقدر ہے کس قدر بیدار
حفیظ جن کو مدینہ میں نیند آئی ہے

شاعر کی مراد غالباً یہ ہے کہ جو لوگ مدینے میں دفن ہوئے وہ بڑے خوش نصیب ہیں۔ لیکن "نیند آئی ہے" یہاں ذم کا شبہ پیدا کر رہا ہے خوابِ غفلت کی طرف خیال جاتا ہے۔ الفاظ کچھ اور ہوتے تو بات بنتی۔

ہر لحۂ سحر کے لئے تیار رہو ؛ دنیا سے گزر کے لئے تیار رہو

موت کے لمحے کو "سحر" سے تعبیر کرنا درست نہیں۔ محاورے میں اسے "شامِ زندگی" بولتے ہیں۔

ختمِ کتاب پر بعض شعراء کے قطعات تاریخ دیئے گئے ہیں جن کا عنوان ہے۔

"قطعات تاریخ انطباع"

لفظ "انطباع" قمر سنبھلی کے مصرعہ میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ہمارا خیال ہے "طبع" درست ہوتا۔ عربی میں "انطباع" عموماً ڈھلنے اور بھر جانے کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ اردو میں اس کا استعمال ہی نہیں۔ کوئی یوں نہیں بولتا ہے کہ فلاں کتاب فلاں ادارے کی منطبعہ ہے۔ یا فلاں شخص فلاں کتاب کا منطبع ہے۔ مطبوعہ، طابع، طباعت یہی الفاظ مروّج اور مانوس ہیں۔ باب انفعال اس مصدر میں اردو کی حد تک شاذ ہے۔

آرزو نہ خمار کے نعت حفیظ

یہ شاہ محمد قائم رضوی قتیل کا مصرعہ ہے۔ بھلا "خمار کے" کیا چیز ؟

تبصرہ کا حاصل یہ ہے کہ حفیظ بنارسی اگرچہ برے شاعر نہیں ہیں لیکن ابھی انھیں صفِ اول کے شعراء کا کلام بغور پڑھکر اس سے کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے ان کا یہ مجموعہ کسی نہ کسی حلقے میں قبولیت حاصل کرے گا۔

قرآن پر ظلم

مصنف :- مولانا امام علی صاحب قاسمی رائپوری ○ ناشر :- مدرسہ رئیس العلوم اہل السنۃ والجماعۃ حنفی۔ رائے پور کھنسی۔ ضلع لکھیم پور کھیری ○ صفحات ۳۲۔ قیمت پچاس پیسے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے چند نمونوں کے ذریعہ یہ دکھایا ہے کہ بریلوی مکتبِ فکر کے امام مولانا احمد رضا صاحب اور مولوی نعیم الدین صاحب نے قرآن کے ترجمہ و تفسیر میں کیسے کیسے گل کھلائے ہیں۔

ہمیں کبھی کبھی بڑا تعجب ہوتا ہے کہ یا اللہ کیا قرآن پر ایمان کا دعویٰ کرنے والا کوئی گروہ اتنا کج فکر اور مریض العقل بھی ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بشریت پر ناک منہ چڑھائے اور انھیں عالم الغیب اور حاضر و ناظر قرار دے۔ یہ تو بدعقلی کی انتہا ہے جسے مالیخولیا ہی کہہ سکتے ہیں۔ نصرانیوں کے یہاں یہ بدعقلی "ابن اللہ" کے عنوان سے جلوہ گر ہوئی مگر ان کے بارے میں یہ صبر تھا کہ کوئی محفوظ آسمانی صحیفہ ان کے پاس نہیں۔ چند مجروح صحیفے لئے پھرتے ہیں جن کا پایہ استناد خود ان کے اہلِ تحقیق کے نزدیک دائرہ یقین سے خارج ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں کیسے صبر کریں جبکہ قرآن جوں کا توں محفوظ ہے اور بے شمار احادیثِ صحیحہ بھی انھیں روشنی دکھا رہی ہیں۔

اللہ کے بھید اللہ ہی جانے۔ وہ بندوں کے لئے عبرت سامان مہیا کرتا ہے کہ ہدایت و گمراہی سب ہمارے ہی ہاتھ میں ہے۔ ہم اچھے خاصے عقلمندوں کی مت مار سکتے ہیں اور ان کے اذہان و قلوب کو کباڑی کی دکان بنا سکتے ہیں۔

بہرحال اس کتابچے میں فاضل مصنف نے چند عبرت آموز نمونے پیش کئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ بریلوی فرقہ

اِن وحدیث کے ساتھ کیسا سلوک ہے ۔

بریلویوں میں مقبول ایک کتاب " میلاد گوہر" بھی ہے
ں کے کچھ اشعار زیرِ تبصرہ کتاب کے توسط سے ہمارے
طرین بھی گوش گذار کرلیں ۔

میم سے تونے چھپایا راز کو اپنے تمام
اے احد احمد کی صورت میں نہاں تو ہی تو تھا
لوگ کہتے ہیں کہ رخ پر تھی پڑی ان کے نقاب
شکل احمد میں مگر دیکھا عیاں تو ہی تو تھا

ادب سے زباں تھام کر رہ گیا میں
حبیبِ خدا کو خدا کہتے کہتے

تھی کہ سرکار تشریف لائے　　دو عالم کے سرکار تشریف لائے
یا کو بھی عزت ہو عرشِ علا کی　　دکھا جاؤ بندوں کو صورت خدا کی

ان شعروں کا کہنے والا اور انہیں پسند کرنے والا
سلمان ہو سکتا ہے تو دنیا نوٹ کرے کہ ہم اپنے مسلمان
ہونے سے انکار کرتے ہیں ۔ شرک اور اتنا ننگا ۔ حماقت اور اتنی
ن ابد عقلی اور ایسی منطق ۔

لکشاف

تصنیف :۔ مولانا عبدالجلیل صاحب فاضل
دیوبند ○ ادارہ حنفیہ دیوبند ۔ یو ۔ پی ۔ صفحات
۲۷۲ ۔ لکھائی چھپائی معمولی ۔ قیمت چھ روپے

بریلوی مکتبِ فکر کے ایک مناظر و متکلم ارشد القادری
کی کتاب زلزلہ پر ہم نے دسمبر ۱۹۶۰ء میں تبصرہ کیا تھا ۔ یہ
مرہ چونکہ بحیثیت مجموعی کتاب کے حق میں جاتا تھا اس لئے بریلوی
قلم نے اسے بڑی شہرت دی اور زلزلہ کے جدید ایڈیشن میں بھی
ے شامل کر دیا ۔
یہ کتاب الکشاف اسی زلزلہ کا رد ہے اور اس میں یہ
ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ صاحب زلزلہ نے علمائے
دیوبند کی عبارات پر جو بھی اعتراض کئے ہیں سب فاسد و
باطل ہیں ۔

کتاب کو ہم نے شروع سے آخر تک پڑھا ضرور مگر بڑی
ذہنی کوفت برداشت کرتے ہوئے ۔ کوفت کا آغاز کتاب
کا ٹائٹل ہی دیکھ کر ہو گیا تھا ۔ عبدالجلیل صاحب دارالعلوم
کے ایک نوجوان فارغ التحصیل ہیں دارالافتاء میں فتویٰ نگاری
کی مشق کرتے ہیں ، یعنی بقول غالب ۔

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت " گیا " اور بود " تھا "

ان کے ساتھ مولانا اور مفتی دونوں ہی القاب
جوڑ دینا تقریباً ایسا ہی ہے جیسے سرکس میں بانس کی ٹانگیں
لگا کر کسی پستہ قد مسخرے کو طویل القامت بنا دیا جاتا ہے ۔ دیوبند
کے اساتذہ سوچیں یہ کیسا مذاق ہے اور ثقہ الفاظ کی مٹی پلید
کرنا خوش ذوقی کے کس قبیل سے تعلق رکھتا ہے ۔

بہرحال ہمارا وجدان ایسی خفیف حرکتوں پر بہت گھٹتا
ہے ۔ مزید کوفت یہ دیکھ کر ہوئی کہ عزیز مصنف طرزِ فکر اور
طرزِ تحریر دونوں ہی اعتبار سے کچے ہیں ۔ نقد و نظر کھیل تو نہیں
ہے ۔ وہ ابھی دو چار سال اور مشقِ تحریر میں لگے رہتے تب اس
میدان میں اترنا کچھ زیب دیتا ۔ بحالتِ موجودہ کوئی بھی
سلیم الطبع اور ذی فہم قاری ان کی کتاب سے سوائے پراگندہ
خیالی اور تخیکے کچھ بھی حاصل نہ کر سکے گا ۔ بلکہ حسنِ انشاء کا ذوق
رکھنے والے تو شاید دس پانچ ورق سے زیادہ پڑھ ہی نہ سکیں

ہم اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ غیر ضروری سمجھتے ہیں ۔ البتہ
چند نکات پر اس غرض سے گفتگو کریں گے کہ ہمارے اس خیال
کے کچھ شواہد لوگوں کے سامنے آئیں جسے ہم متعدد بار تجلی کے
صفحات میں ظاہر کر چکے ہیں یعنی معتقدات کا غلو صرف بریلویوں
تک محدود نہیں بلکہ ہمارے حلقۂ دیوبند میں بھی یہ کسی نہ کسی
حد تک موجود اور نمو پذیر ہے ۔
" الکشاف " کے آغاز میں حلقۂ دیوبند کے تین نمائندوں کی

تقریظیں موجود ہیں (۱) محترم مولانا حامد الانصاری غازی (۲) محترم مفتی احمد علی سعید۔ (۳) محترم مفتی ظفیر الدین صاحب

ان تینوں حضرات نے کتاب کو سراہا ہے اور اسے جہل کے بالمقابل علم سے تعبیر کیا ہے۔ اب ہم جو کچھ عرض کریں گے اس کا روئے سخن ان اساتذہ ہی کی طرف ہوگا نہ کہ عزیز مصنف کی طرف۔ عزیز مصنف تو ابھی "کے آمادی دکے بہر تدی" کے گہوارے میں پرورش پا رہے ہیں اور ان کا علمی سرمایہ پختگی و پڑنگی بالکل ابتدائی منزل میں ہے۔

کشف و کرامت محض افسانہ نہیں ہیں بلکہ ان کی ایک حقیقت ہے۔ یہ بات دیوبندیوں اور بریلویوں کے مابین نزاعی نہیں متفق علیہ ہے۔ اس کے باوجود انکشاف کے مصنف نے بیسیوں صفحات اسی متفق علیہ بات کے اثبات میں صرف کر ڈالے ہیں۔ اہل فہم اندازہ فرمائیں کہ ایسی تحصیل حاصل خوش مذاقی قارئین کے لئے کس قدر کوفت کا باعث ہوگی۔

مصنف نے ایک کتاب "اصطلاحات صوفیہ" کا ذکر بار بار کیا ہے اور اس کے اقتباسات بھی دیئے ہیں لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ یہ ہے کس بزرگ کی تصنیف۔ ص۳۴ پر انھوں نے حاشیہ کا نمبر دیکر شاید اس کی وضاحت کرنی چاہی تھی مگر حاشیہ میں نمبر کے بعد کچھ بھی تحریر نہیں محض بیاض ہی بیاض ہے اس طرح یہ راز راز ہی رہ گیا کہ اس کتاب کے مصنف کون ہیں جب مصنف ہی کا علم نہیں تو اس کا پایۂ استناد جیسا کچھ بھی ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔

خیر۔ یہ کتاب مصنف کے نزدیک بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور اس کے مندرجات انھوں نے بڑی عقیدت اور وثوق کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ کشف کی تعریف و حقیقت کی وضاحت انھوں نے اس کتاب (اصطلاحات صوفیہ) کے درج ذیل اقتباسات سے کی۔ ان میں سے ہر ایک پر ہمیں گفتگو کرنی ہے۔ پہلا اقتباس یہ ہے۔

"پوشیدہ باتوں کا معلوم کرنا کشف ہے۔ اس کی دو قسم ہے۔ کشفِ صغریٰ۔ کشفِ کبریٰ۔ کشفِ صغریٰ کو کشف کونی بھی کہتے ہیں۔ یعنی سالک اپنی قلبی توجہ سے زمین و آسمان، ملائکہ، ارواح اہلِ قبور، عرش، کرسی، لوحِ محفوظ۔ الغرض دونوں جہان کا حال معلوم کرلے۔ اس کشف میں غلطی بھی ہو جاتی ہے (انکشاف ص۳۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ فقط بریلویوں ہی کے نزدیک نہیں دیوبندیوں کے نزدیک بھی سالک کی قلبی توجہ کی زد اور حیطۂ عمل سے عرش، کرسی اور لوحِ محفوظ بھی باہر نہیں ہیں۔ وہ دونوں جہان کا حال صرف معلوم ہی نہیں کرتا مشاہدہ بھی کرتا ہے۔

ہم اساتذۂ دیوبند سے دریافت کرتے ہیں کہ قرآن و سنت میں اس کی کیا بنیاد ہے؟ کوئی آیت یا حدیث ایسی پیش فرمائیے جس سے اس دعوے اور رائے کی تصدیق ہو سکے آپ فلاں صوفی اور فلاں شیخ اور فلاں عالم کا قول اٹھا کر لائیں گے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ عقائد کے لئے نص قطعی چاہیئے اور ایسے غامض ترین عقائد کے لئے تو اور بھی واضح اور قطعی ثبوت کی ضرورت ہے۔ ہم نہیں مانتے کہ کوئی قطب یا ابدال یا سالک عرش، کرسی اور لوحِ محفوظ کے مغیبات کا بھی مشاہدہ اپنے قلب کی توجہ سے کر سکتا ہے کشف اپنی جگہ ایک حقیقت سہی لیکن اس کی یہ وسعت و ہمہ گیری محتاجِ دلیل ہے۔

دوسرا اقتباس یہ ہے:۔

"کشفِ کبریٰ۔ اس کو کشفِ الٰہی بھی کہتے ہیں یعنی ذاتِ حق سبحانہ کا مشاہدہ اور معائنہ ہو جانا! اور جملہ حجابات اور اعتبارات کا اٹھ جانا اور نورِ بصیرت سے خلق کو عینِ حق، حق کو عینِ خلق دیکھنا سالک کا مقصودِ اصلی یہی کشف ہے اور پہلا مفید ضرور ہے لیکن سالک کو مشغول نہ ہونا چاہئے (انکشاف ص۳۶)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک سالک اسی اینٹ اور پتھر کی دنیا میں کشف کے زور سے ذاتِ خداوندی کا مشاہدہ

اور معائنہ بھی نہ صرف کرسکتا ہے بلکہ یہی اس کا مقصود اصلی ہوتا ہے۔

حالانکہ مسلم شریف میں قوی راویوں کے توسط سے ہم اللہ کے رسول کا یہ ارشاد اپنے سر کی آنکھوں سے پڑھتے ہیں کہ واعلموا انکم لن تروا ربکم حتی تموتوا۔ اس کے علاوہ حدیث احسان میں بھی صراحت ہے کہ خدائے تعالیٰ کو اس دنیا میں ہرگز نہیں دیکھا جاسکتا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بطور ایک اصول کے ارشاد فرماتے ہیں۔ لان البصر فی الدنیا خلق للفناء فلم یقدر علی رؤیۃ الباقی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حالانکہ نبی تھے لیکن انھیں دیدار کی درخواست میں اللہ نے فیصلہ سنا دیا لن ترانی پھر تخلی ذات کی ایک جھلک کو بھی وہ برداشت نہ کرسکے اور ہوش و حواس نے جواب دے دیا تو یہ راہِ طریقت و تصوف کے سالک آخر کونسی مٹی سے بنے ہیں اور کس مخلوق سے تعلق رکھتے ہیں کہ ذاتِ حق تعالیٰ کا مشاہدہ و معائنہ بھی فرما لیتے ہیں۔

پھر یہ خلق کو عین حق اور حق کو عین خلق دیکھنا کیا بے غبار باتیں ہیں۔ کیا قرآن و حدیث سے بھی اس کی دلیل ملتی ہے۔ کیا التباس یا حلول یا وحدۃ الوجود کی بھول بھلیاں میں بھٹکنا اور بھٹکانا بھی دین و شریعت کی کوئی مفید خدمت ہے۔ بندے اور آقا کے درمیان سے حجاب اٹھ جائیں اسے شاعری تو کہہ سکتے ہیں حقائق کی ترجمانی نہیں کہہ سکتے۔ انکشاف کے مصنف تو ابھی بچے ہیں "علمائے راسخین" ارشاد فرمائیں کہ یہ کیا واقعی حلقۂ دیوبند کی ترجمانی ہے یا اس روایتی تصوف کی گل کاری ہے جس کا مدار دلائل شرعیہ سے زیادہ تخیلات پر ہے۔

---

¹ "کرامات الاولیاء" سے مزید یہ ارشاد نقل ہوا۔ "زندہ اور مردہ اولیاء کے لئے کرامت کا ثبوت درست ہے اس لئے کہ ولی اپنی ولایت سے معزول نہیں ہوتے جیسا کہ نبی موت کے بعد بھی نبی ہی رہتے ہیں۔"

ہم آجتک یہ نہیں سمجھ سکے کہ نبوت کی طرح ولایت ایک عہدہ اور منصب کس دلیل سے بنا لیا گیا ہے۔ نبوت منصب ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو عطا کرتا ہے لئے کوئی شخص اپنی سعی و جہد سے نبی نہیں بن سکتا اس کے ولایت کا منصب ہونا قرآن و حدیث سے تو ثابت نہیں چنا بھی اللہ کا بندہ تقویٰ اور طاعت کی راہ اختیار کرکے ولی سکتا ہے۔ ولی کا مطلب ہے وہ شخص جو ایمان میں پختہ ہو شریعت پر ذوق و شوق سے عمل کرتا رہے۔ خود قرآن میں ا کی تعریف یہ بیان ہوئی ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْ (یونس) ولی کہتے ہیں حامی، دوست، مددگار کو۔ قرآن میں اولیاء اللہ آیا ہے وہیں اولیاء الشیطٰن بھی آیا ہے۔ تفصیلات سے ظاہر ہے کہ ولایت کے مختلف مراتب و مدارج ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن وہ کوئی دینی منصب نہیں ہے جس عزل و نصب کے الفاظ وابستہ کئے جائیں۔ نیکی، بھلائی، خوش اطاعت، خداترسی، حبِ رسول، تواضع، اخلاق، خوف آخرت وغیرہ سب اوصاف ہیں مناصب نہیں، اسی طرح ولایت وصف ہے نہ کہ عہدہ۔ ہر بندے کے لئے دروازہ کھلا ہوا ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کرکے اللہ کا ولی بن جائے۔ خود انبیاء علیہم السلام نبی ہونے کے ساتھ ساتھ ولی بھی یقیناً تھے۔ کیونکہ ولی ہونے کا مطلب ہے مومن کامل ہونا۔ نیک ہونا متقی ہونا۔ ابو حنیفہ، مالک، ابن مبارک، ابوبکر صدیق، عمر فاروق یہ سب بہ فرق مراتب اولیاء ہی ہوتے ہیں۔

پھر یہ کیا بات ہے کہ ولایت کو نبوت ہی کی طرح ایک منصب مان لیا گیا اور یہ بحث شروع کر دی گئی کہ نبی کی طرح ولی بھی موت کے بعد معزول نہیں ہوتا۔ صاف ظاہر ہے کہ جو شخص زندگی میں انسان تھا مرنے کے بعد اسے انسان ہی کہیں گے۔ جانور مرے تو کسی اور نوع میں تبدیل نہیں ہو جائے گا۔ برا آدمی مرے تو یہی سمجھیں گے کہ برائی اس کے ساتھ چمٹی رہی۔ نیک آدمی مرے تو نیکی تو ہیں

---

¹ خوب سمجھ لو تم مرتے دم تک اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتے ² کیونکہ قوت بینائی دنیا میں فنا کے لئے پیدا کی گئی ہے اس لئے وہ اس ذات والا صفات کو دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتی جو غیر فانی ہے ³ جو لوگ کہ ایمان لائے اور ڈرتے رہے۔

را نہیں کریں گے ۔ عزل ونصب کا اس معاملہ میں کیا دخل ۔
ں کون کہتا ہے کہ نیک آدمی مرنے کے بعد بھی نیکی سے معزول
ہیں ہوا۔ اس طرح کا انداز بیان صرف مناصب کے بارے
ں اختیار کیا جا سکتا ہے اور ولایت کوئی منصب نہیں ہے
یہ ایک فساد انگیز اور غیر شرعی طرز فکر ہے کہ ولی بعد
ردن بھی اپنی ولایت سے معزول نہیں ہوتا ۔

امام غزالی کی ایک کتاب سے اہل قبور کی انواع میں سے
یک نوع کا حال یہ نقل کیا گیا ۔

" پہلی قسم اس کے اندر انبیاء ، اولیاء ہیں اور ان
کے اندر بہت سے اختیارات رہتے ہیں ۔ ان
میں سے بعض زمین میں قیامت تک رہتے ہیں"
(الکشاف صفہ ۹۹)

نار سطور بعد :-

" ان میں سے اولیاء بھی ہیں جو یوم البعث یوم الدین تک
باقی رہتے ہیں جیسا کہ زید کی روایت میں ہے کہ وہ
عرش کے زیر سایہ خوانِ نعمتِ الٰہی سے غذا حاصل
کرتے ہیں"۔ (رر)

موت اور دفن کے بعد بھی انبیاء و اولیاء منعم اختیارات
ے مالک ہیں یہ دعویٰ اور عقیدہ صوفیاء و مشائخ میں خواہ کتنا
ی عام ہو لیکن کیا قرآن و سنت سے بھی اسے ثابت کیا
سکتا ہے ؟ ۔

موت جسموں پر طاری ہوتی ہے روحوں پر نہیں ۔ روحیں
ـــ خواہ مومن کی ہوں یا کافر کی سبھی جسم سے جدا ہو کر ان
مکانوں پر پہونچ جاتی ہیں جو اللہ نے ان کے لئے مقرر کر دیا ہے
مسئلہ اختلافی نہیں) ۔ لہذا انبیاء و اولیاء کے لئے قیامت تک
قی رہنے کا جو دعویٰ مذکورہ سطور میں کیا گیا ہے اس کا تعلق خالی
ارواح سے تو ہو نہیں سکتا اجسام ہی سے ہو سکتا ہے ۔ احادیث
ں صرف انبیاء علیہم السلام کے بارے میں تو آیا ہے کہ ان کے
سموں کو مٹی نہیں کھاتی لیکن اور کسی کے بارے میں ایسا نہیں آیا
ٹی کا جسم کو نہ کھانا اگرچہ ایک خصوصیت ہے لیکن اس خصوصیت

کا لازمی مطلب یہ کیسے ہو گیا کہ انبیاء بعد مردن ایسے اختیارات
کے مالک ہوتے ہیں جن کے اثر و نفاذ و ظہور و وضوح کا تعلق
ہماری دنیا سے ہے ۔ ایسا عقیدہ نہ قرآن نے تعلیم کیا نہ رسولؐ نے
انبیاء جب تک زندہ رہے ان میں وہ صلاحیتیں بھی کارفرما رہیں
جو اللہ نے عطا کی تھیں ۔ جیسے جو بھی صلاحیت دی جن حیات ہی
سے اس کا تعلق تھا ۔ مرنے کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ وہ سب
صلاحیتیں ان میں باقی رہ جائیں ۔ قرآن و حدیث اسکی تائید
نہیں کرتے ۔ قیاس اس کا مؤید نہیں ۔ ضرورت اس کی
متقاضی نہیں ۔

رہے اولیاء تو جیسا کہ ہم عرض کر آئے ولی تو ہر متقی مومن
کو کہتے ہیں ۔ صحابہ سے لے کر آج تک لاکھوں نیک بندے ہوئے
ہیں ۔ ان سب کے بارے میں یہ خیال قائم کرنا کہ انھیں کچھ اختیارات
ملے ہوئے ہیں ان میں سے بعض قیامت تک زمین پر رہنے والے
ہیں عجیب و غریب خیال ہے ۔ کوئی قابل فہم مصداق ہی نہیں بنتا
اس خیال کا ۔ اگر فرض کیجئے کہ بعض اولیاء کے اجسام ان کی قبروں
میں خاک نہیں ہوئے بلکہ جوں کے توں موجود ہیں اور یہ بھی فرض
کر لیجئے کہ ان کی خارج شدہ روحیں پھر سے ان کے جسموں میں
داخل ہو گئی ہیں تو اس سے کیا فائدہ ہوا ۔ اس نوع کی قبوری زندگی
آخر یہ معنی کیسے رکھتی ہے کہ اس میں مافوق الفطرت صلاحیتیں بھی
ہوں اور یہ ہم دنیا والوں کے کسی کام بھی آسکے ۔ ایسی زندگی پر تو
اس زندگی کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا جو ہم دنیا والوں میں معروف
ہے ۔ یہ کہنا کہ بعض اولیاء بعث یوم الدین یعنی قیامت تک
زمین میں باقی رہتے ہیں دور از کار اور بے بنیاد شاعری ہے خواہ
اس کی نسبت امام غزالی ہی کی طرف ہو ۔

دوسرے اقتباس میں یزید کی روایت کے حوالے سے کہا گیا
ہے کہ وہ یعنی اولیاء عرش کے زیر سایہ خوانِ نعم الٰہی سے غذا حاصل
کرتے ہیں ۔ ہم کہتے ہیں کہ اول تو اس طرح کی روایات حجت ہی نہیں
علم روایت کے اصول و قواعد تو ہمارے یہاں بفضلہ تعالیٰ مدون
مرتب شکل میں موجود ہیں ۔ ان میں تو ایسا کوئی ضابطہ بیان
نہیں ہوا کہ معاملات غیب میں کوئی غیر نبی ایک خیال ظاہر کرے
تو اسے دلیل راہ بنا لیا جائے ۔ پھر چلئے اس روایت کو مان بھی لیں

تو اس سے زیر بحث دنیاوی زندگی کا کیا تعلق ہوا۔

عرش ہماری دنیا کا کوئی حصہ تو نہیں وہ ورارالورار ایک مقام ہے۔ اولیاء اللہ کی روحیں بغیر جسم کے یا جسم سمیت اگر اس کے زیر سایہ غذا حاصل کر رہی ہیں تو اس کا یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ یہ اولیاء اللہ زمین پر باقی موجود ہیں ——— شہداء کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انھیں مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں مگر شریعت میں یہ زندگی دنیاوی زندگی نہیں انی گئی۔ چنانچہ شہداء کا ترکہ بھی بٹا۔ ان کی بیواؤں سے نکاح بھی کئے گئے اور تمام ہی وہ احکام جاری ہوئے جو مردوں پر جاری ہوتے ہیں ——— اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا سے بالاتر کسی جہان و مکان میں اگر کچھ ہستیاں کسی بھی شکل میں رزق اور غذا پا رہی ہوں تو انھیں دنیاوی زندگی سے متصف نہیں کہا جا سکتا اور ان پر دنیاوی بقا کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

بریلوی مکتب فکر عموماً یہی عقیدہ رکھتا ہے کہ اولیاء اللہ مرتے نہیں بس پردہ فرما لیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ ان کا خانہ زاد عقیدہ نہیں بلکہ اس تصوف کا آوردہ ہے جس پر مصنف انکشاف کے دعوے کے مطابق حلقۂ دیوبند بھی آمنا و صدقنا کہتا ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ عقیدہ فی الحقیقت شرک کا زرخیز تخم ہے۔ قطعاً طبعزاد اور بے بنیاد۔ قرآن اس سے پاک ہے اور احادیث صحیحہ اس کی سرمو تائید نہیں کرتیں علم باطن اور علم طریقت کی تحسین و تعظیم کا یہ مطلب تو نہیں کہ صوفیائے سلف کے ہر خیال و رائے پر سر تسلیم خم کر دیا جائے انکشاف کے نوجوان مصنف کو تو ملزم قرار دینا بیکار ہے ان کے پختہ ذہن پر غزالی اور سبکی جیسے نام آسمان بن کر چھا سکتے ہیں لیکن الزام ان اساتذہ پر ہے جنھوں نے انکشاف کی تحسین فرمائی ہے۔ کیا وہ بھی مرعوبیت کے اسی بوسیدہ تخت پر متمکن ہیں جہاں محض چند نام کابوس بنکر دل و دماغ پر سوار ہو سکتے ہیں۔

مزید ہمیں کچھ نہیں عرض کرنا۔ ہاں عزیز مصنف کی ایک سعادت مندانہ سادہ لوحی کا مختصر سا تذکرہ بھی کر دیں۔ کتاب کے خاتمہ پر انھوں نے علمائے دیوبند کے کارنامے بھی گنوائے ہیں اور ان میں ایک کارنامہ یہ بھی شمار کرایا ہے کہ علمائے دیوبند نے قادیانی، شیعی، رضاخوانی، غیر مقلدین اور جماعت اسلامی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔

گویا ہمارے کمسن عزیز کو آجتک یہ بھی خبر نہیں کہ جماعت اسلامی کے خلاف حلقۂ دیوبند سے جس طرح کی تحریریں شائع ہوئی ہیں انھوں نے اس حلقے کی نیک نامی کو داغدار اور علم و تفقہ کو اچھا خاصہ رسوا ہی کیا ہے نہ کہ نیک نام اور جماعت اسلامی کے خلاف بعض علمائے دیوبند کی معاندانہ بلکہ قاتلانہ روش کو کارنامہ قرار دینا تقریباً ایسا ہی ہے جیسے نادر و چنگیز اور ہٹلر و اسٹالن کی سفاکیوں پر داد تحسین کے ڈونگرے برسانا عزیز مصنف تحقیق کر کے دیکھیں علمائے دیوبند کی روش جماعت اسلامی کے سلسلہ میں ٹھیک وہی ہے جو بریلویوں کی علمائے دیوبند کے سلسلہ میں ہے۔

بہرحال مناسب ہوتا اگر کوئی سنجیدہ اور ذمہ دار بزرگ اس کتاب کی تصنیف میں عزیز مصنف کی نگرانی اور رہنمائی کرتے۔ بصورت موجودہ یہ کتاب وقیع نہیں کہی جا سکتی۔

---

27 DEC 1974
ماہنامہ
تجلّی
دیوبند
خدا کی راہ میں خرچ کرنا
دراصل خرچ کرنا نہیں بلکہ جمع کرنا ہے
ایڈیٹر: عامر
تاریکیوں میں ایک چراغ
1|50

احوالِ واقعی

پچھلا نومبر کا پرچہ آپ کو ۸؍ نومبر تک ملجانا چاہیئے
لیکن وہ ۲۰؍ نومبر سے ۲۳؍ نومبر تک سپرد ڈاک ہوا۔
یہ ہوئی کہ دفتر کا پورا عملہ نومبر کے پہلے ہی ہفتے میں
کتبہ تجلی کا اسٹال قائم کرنے کے لئے جماعت اسلامی
ند کے پانچویں آل انڈیا اجتماع (منعقدہ دہلی) چلا گیا۔
اپسی ۱۶ تک ہوئی۔ تیار شدہ پرچہ اس کے بعد ہی پوسٹ
ہو سکا۔ زیر دست شمارہ پریس تو ٹھیک ہی وقت پر جا رہا
ہے لیکن بجلی کا رویہ کیا رہے گا یہ نہیں کہا جا سکتا۔ توقع تو
ہے کہ اسے دسمبر کے پہلے عشرے میں حوالۂ ڈاک کیا جا سکیگا۔

اس شمارے کے بہت کافی صفحات "قادیانیت"
کے تجزیہ و تحلیل میں صرف ہو گئے ہیں اور آگے کو کچھ مدت
ک شاید ایسا ہی ہوگا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ پاکستان
یں ہزیمت پا جانے کے بعد اب قادیانیت کی پناہ گاہ اپنا
ندوستان ہی ہو سکتا ہے اور جب محترم مولانا عبد الماجد
یا بادی اور جناب محمد عثمان فارقلیط جیسے بزرگ ازراہِ
ط فہمی اس کے سر پر دست شفقت رکھے ہوئے ہوں تو
ت زیادہ اندیشہ ہے کہ اس فاسد و باطل آئیڈیالوجی
ا زہر ہمارے سادہ لوح اور کم علم بھائیوں کے ذہنوں میں
چھ نہ کچھ سرایت کر ہی جائے لہذا ہمارا فریضہ ہو جاتا ہے
دلائل کی روشنی ڈال کر اپنے بھائیوں کو گمراہی سے بچانے
سرگرم کوشش کریں۔ امید ہے کہ جو اکثر و بیشتر حضرات
دیانیت کے فساد کاملہ پر پہلے ہی سے یقین رکھتے ہیں
بھی تجلی کے صفحات میں ایسی معلومات ضرور پائیں گے
ان کے علم کو بڑھائیں گی اور مطالعہ میں صرف ہونے
لے اوقات ضائع نہیں جائیں گے۔

اگلے شمارے میں

تجلی کے مخصوص کالموں کو باقی رکھتے ہوئے اولاً
تو فارقلیط صاحب کے مضمون کا بقیہ جائزہ مکمل کیا جائے گا۔
نیز طلاقِ ثلٰثہ کی بحث بھی چند صفحات لے گی۔ ثانیاً
مولانا علی میاں مدظلہٗ کا ایک وقیع مضمون "قادیانیت"
اشاعت پذیر ہوگا۔ اس سے آپ کو بعض مفید معلومات
کے ساتھ ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمۃ کے خیالات کا بھی پتہ چلیگا۔
ثالثاً ہم چاہتے ہیں کہ قادیانی فنکار جن مخصوص دلائل سے
اپنے فکرِ باطل کو سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں اُتارنے
کی کوشش کرتے رہتے ہیں ان کا علمی و منطقی تجزیہ تجلی کے صفحات
میں آجائے تاکہ کوئی بھی مسلمان قادیانیت کے ظاہر فریب
استدلال کے پھندوں میں نہ پھنسنے پائے۔ اگر صفحات نے
گنجائش دی تو یہ سلسلہ اگلے ہی شمارے سے شروع کر دیا جائے
گا۔ اس سلسلے کو انشاء اللہ خواص و عوام دونوں مفید اور
دلچسپ پائیں گے۔ واللہ المستعان۔

کہانی نمبر

ملّا ابن العرب مکی بڑی تلاش کے بعد گرفتار تو ہوگیا
ہے مگر ذہنی انفلوئنزا کا شکار ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ افاقے
کے بھی آثار ہیں۔ امید کی جا رہی ہے کہ کہانی نمبر کے لئے وہ
ایک ایسی شاہکار داستان پیش کرے گا جو انتہائی دلچسپ اور
پُرکشش ہونے کے ساتھ ساتھ اس خشک اور پیچیدہ گتھی کو
بھی سلجھائے گی کہ کونسا تصوف واقعۃً اسلامی ہے اور کونسا
غیر اسلامی۔ احباب دعا فرمائیں کہ کم سے کم اس داستان
کی تکمیل تک اللہ اسے ملک الموت کی دست برد سے محفوظ
رکھے۔ آمین۔

جناب محمد عثمان فارقلیط کے ارشادات کا جائزہ

آغازِ سخن

قادیانی فرقہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ نہیں بلکہ کافر گروہوں میں سے ایک گروہ ہے یہ بات مدت ہوئی علمائے امت قطعی طور پر ثابت اور واضح کر چکے لیکن کچھ مسلمان پہلے بھی ایسے رہے ہیں اور آج بھی ایسے ہیں جنھیں اس فیصلہ پر اطمینان نہیں۔ ان ہی حضرات کی ترجمانی اور نمائندگی کرتے ہوئے روزنامہ الجمعیۃ کے سابق ایڈیٹر محمد عثمان فارقلیط صاحب نے اپنا ایک مضمون ماہنامہ شبستان میں شائع کرایا ہے۔ انھوں نے مضمون کے ابتدائی نوٹ میں یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ میرے اپنے خیالات نہیں بلکہ مسلمانوں کے دانشور طبقے کے خیالات ہیں اور انھیں اس غرض سے اشاعت کے لئے دیا جا رہا ہے تاکہ علمائے اہلِ سنت ان پر غور فرمائیں اور محققانہ انداز میں ایسا جواب دیں جس سے تشکیک اور شبہات کا گرد و غبار دھل جائے۔

عجیب بات یہ ہے کہ مضمون ایک ایسے جریدے میں شائع کرایا گیا ہے جس کا علمائے اہلِ سنت کی نظر سے گذرنا محال نہیں تو بعید از قیاس ضرور ہے۔ شبستان ایک عمومی دلچسپی کا پرچہ ہے نہ کہ کوئی علمی و تحقیقی جریدہ۔

دوسری عجیب بات یہ ہے کہ مضمون کا لب و لہجہ اور اسٹائل انتہائی جارحانہ اور جذباتی ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ جناب فارقلیط صاحب دوسروں کے خیالات بیان نہیں کر رہے بلکہ ان کے اپنے جذبات و رجحانات ان میں پوری طرح شامل ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو خیالات کا اظہار اس قدر اشتعال انگیز اور شعلہ ریز پیرائے میں نہ کیا جاتا۔

تیسری عجیب بات یہ ہے کہ ان خیالات کو انھوں نے دانشوروں سے منسوب فرمایا ہے۔ حالانکہ خیالات اس مجموعے میں دانش اور علم و خبر کا سایہ تک نظر نہیں آتا۔ اگر محترم فارقلیط صاحب قادیانیت کی بے کم و کاست حقیقت اور فتوائے کفر کے علمی و عقلی وجوہ سے واقف ہوتے تو وہ ہرگز اس کی ضرورت نہ سمجھتے کہ علماء کو جواب کی دعوت دیں بلکہ خود ہی ان نام نہاد دانشوروں سے کہتے کہ زبان

...و لنے سے پہلے موضوع کا کچھ مطالعہ کر لو۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ دانشور اور صاحب فہم وہ ہے ...کسی موضوع پر گرم گفتگو سے پہلے اس موضوع کے تمام ...پہلوؤں کا کم سے کم اتنا مطالعہ تو کر لے کہ ضروری گوشوں ...سے واقف ہو سکے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں — اور قارئین بھی ...ہی دیکھیں گے کہ محترم فارقلیط صاحب کے دانشوروں نے ...اعتراض و احتجاج کی شکل میں جو کہا ہے وہ نامعقولیت، ...بے خبری اور فضول گوئی کا شاہکار ہے۔ ان حضرات کے اپنے ...ہی الفاظ و بیان سے صاف واضح ہو رہا ہے کہ نہ تو انھوں ...نے قادیانی لٹریچر کا مطالعہ کیا حالانکہ نبوت کے دعویدار ...مرزا غلام احمد کی کم و بیش سو تصانیف لائبریریوں میں ...موجود ہیں جن میں سے چند بھی پڑھ لی جاتیں تو یہ جان ...لیتے کہ مرزا غلام احمد کے دعاوی کیا تھے، عقائد کیا تھے، ...دعومات کیا تھے۔ مگر ان دانشوروں نے اس کی زحمت ...نہیں اٹھائی۔ نہ انھوں نے علم الحدیث سے کوئی واقفیت ...حاصل کی حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسئلہ ...حدیث ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ نہ انھوں نے قرآن کو دیکھا ...حالانکہ احادیثِ رسولؐ کا سرچشمہ قرآن سے بڑھ کر ...کوئی نہیں۔

مختصر یہ کہ خود فارقلیط صاحب اگر مسئلہ کی حقیقت اور ...متعلقہ گوشوں کے نشیب و فراز سے واقف ہوتے تو ...ممکن تھا کہ ان لوگوں کو "دانشور" کا بھاری بھرکم ...خطاب دیتے جنھیں اپنی ذمہ داریوں کا مطلق احساس ...نہیں ہے۔ جو علم و خبر سے بالکل بیگانہ اور معقولیت سے ...بالکل بیزار ہیں۔ لہٰذا اس کے سوا کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ ...ہمارے بہت ہی محترم بزرگ جناب فارقلیط صاحب نے ...دانشوروں کی آڑ لے کر اپنے ہی افکار و خیالات کے گل بوٹے ...کاغذ پر بکھیر دیے ہیں۔ محاورے میں اسی کا نام ہے دوسروں ...کے کاندھے پر بندوق چلانا۔ ہم اپنے بزرگ سے معافی چاہیں ...گے اگر ہمارا روئے خطاب بجائے دانشوروں کے خود ...ان کی طرف ہو جائے۔ مقصود بہر حال ان شبہات و وساوس کا دفعیہ ہے جو اس مضمون میں پیش کئے گئے ہیں اور یہ مقصود انشاء اللہ براہ راست خطاب سے بھی حاصل ہو ہی جائے گا۔

سب سے پہلے یہ سطور لکھی گئی ہیں:۔

" خلافت کے دور میں جب یہ سوال اٹھا کہ مسلمان کس کو کہنا اور سمجھنا چاہیئے یا ایک مسلمان کی تعریف (ڈیفی نیشن) کیا ہے؟ تو بڑی بحثوں کے بعد طے پایا کہ مسلمان وہ ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا اور سمجھتا ہے۔ اس بات پر اکثر علماء نے اتفاق کیا (حضرت مولانا عبدالماجد مدظلہٗ ایڈیٹر صدق جدید لکھنؤ سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔"

کوئی بتائے اِس عبارت میں "خلافت" سے کیا مراد ہے؟ ہر مسلمان جانتا ہے کہ جب ہم مسلمانوں میں "دورِ خلافت" کے الفاظ بولے جاتے ہیں تو عموماً ان کا مطلب ہوتا ہے خلافتِ راشدہ کا زمانہ۔ اگر دانشوروں کا اشارہ اسی زمانے کی طرف ہو تو اس سے بڑھ کر مضحکہ خیز بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ خلافتِ راشدہ کا حال تو یہ رہا کہ اگر کچھ مسلمان اپنی زکوٰۃ خلافت کے بیت المال میں جمع کرنے سے انکار کر دیتے ہیں تو پہلے خلیفۂ راشد سیدنا ابوبکر صدیقؓ علانیہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ واجب القتل ہیں ان سے جہاد کیا جائے گا۔ بعض صحابہؓ عرض کرتے ہیں کہ یا امیرالمومنین یہ لوگ بہرحال مسلمان ہیں۔ انھوں نے اسلام سے پھر جانے کا اعلان نہیں کیا۔ یہ صرف زکوٰۃ کے سلسلہ میں انحراف کر رہے ہیں۔ ان پر چڑھائی کا جواز کیا ہوگا۔ اس پر ابوبکر صدیقؓ پلٹ کر انھیں سمجھاتے ہیں کہ یہ محض زکوٰۃ سے انحراف نہیں بلکہ دین سے انحراف ہے۔ شریعت سے بغاوت ہے۔ یہ لوگ باوجود دعوۂ اسلام کے ارتداد و زندقہ کی راہ چل نکلے ہیں لہٰذا ان پر چڑھائی جائز ہوگی۔ خلیفۂ اول کی یہ تفہیم کارگر ہوتی ہے۔ اختلاف کرنے والے صحابہؓ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ابوبکرؓ ٹھیک فرما رہے ہیں اور طبلِ جنگ بجا دیا جاتا ہے۔ یہ ہے خلافت کے دور کی نظیر۔ لہٰذا گمان کرنا پڑتا

ہے کہ دانشوروں کا اشارہ اس دور کی طرف نہیں ہو سکتا بلکہ اس خلافتِ عثمانیہ کی طرف ہو سکتا ہے جس کا سقوط ابھی انگریز کے دور میں ہوا ہے۔ چلئے اسی دور پر نظر ڈال لیجئے۔ علم و تحقیق کے بالکل ابتدائی قاعدوں میں یہ بات شامل ہے کہ کوئی دعویٰ اگر کسی واقعے کی بنیاد پر کیا جائے تو اس واقعے کو تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔ مگر یہ کیسے دانشور ہیں جو نہ تو یہ بتاتے ہیں کہ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں۔ نہ یہ بتاتے ہیں کہ کس مقام پر واقعہ پیش آیا۔ نہ یہ بتاتے ہیں کہ ایسی کوئی مجلس کب کہاں کس نے ترتیب دی تھی جس میں مسلمان کی تعریف زیرِ بحث آئی ہو۔ کون کون علماء اس میں شریک تھے۔ کیا الفاظ ان کے تاریخ نے ریکارڈ کئے۔ یہ سب کچھ گول مول رکھ کر حوالہ بس مولانا دریابادی کا دیا جاتا ہے۔ حوالہ کا انداز ایسا ہے جیسے مولانا دریابادی خود اس مجلس میں شریک رہے ہوں۔

کیا اسی خوش گپی کا نام دانشوری ہے؟

سب جانتے ہیں کہ ہند و پاک کے ممتاز اور معروف مسلمانوں میں ــــ کم سے کم اہلِ سنت کی حد تک تنہا مولانا دریابادی ہیں جو قادیانیت کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں اور آج تک ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی ہے کہ قادیانیوں کو خارج از اسلام قرار دینا کیوں معقول ہے۔ انھیں گواہ بنا کر کھڑا کرنا ایسے قضیے میں یوں بھی ایک جانبدارانہ گواہی ہے مگر چلئے وہی گواہی دیں لیکن منکشف تو ہو کہ دانشوروں کے اشارہ کردہ واقعے کی تفصیل کیا ہے۔ تفصیل ہمارے فارقلیط صاحب کو بھی شاید معلوم نہیں ورنہ قلم ان کے ہاتھ میں تھا بیان ضرور کرتے۔

(۶) حق یہ ہے کہ بہت ہی نامعقول دعوے سے مضمون کا آغاز کیا گیا ہے۔ یہ تعریف (ڈیفی نیشن) تو دراصل "ہندو" کی ہے کہ جو خود کو ہندو کہے وہ ہندو ہے۔ ہر باخبر جانتا ہے کہ ہندوؤں میں بے شمار لوگ ایشور پر یقین نہیں رکھتے۔ بے شمار مورتی پوجا سے بیزار ہیں، کروڑوں مورتی پوجا کے شائق، ہزاروں قسم کی اصولی و اعتقادی اختلافات تضاد و تصادم کی حد تک ان میں پائے جاتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک ہندو ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو ہندو کہتا ہے۔

لیکن مسلمانوں کا یہ حال کیسے ہو سکتا ہے جب کہ دورِ رسالت ہی میں منافقین کی خاصی ریل پیل تھی جو زبانی دعوۂ اسلام کرتے تھے لیکن اسلام نے انھیں بدترین کافر قرار دیا اور قرآن کی دسیوں آیات آج بھی ہانکے پکارے اعلان کر رہی ہیں کہ اسلام میں زبانی دعوے کوئی چیز نہیں۔ بنیادی نظریات و عقائد فیصلہ کن اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ شخص یا گروہ مسلمان نہیں ہو سکتا جو عقائد و نظریات کے رُخ پر اسلام کے اساسی ضابطوں سے منحرف ہو جائے۔ کیا فارقلیط صاحب کے دانشوروں کو یا خود محترم فارقلیط صاحب کو قرآن میں وہ آیات نظر نہیں آئیں جن میں جتا یا گیا ہے کہ منافقین جہنم کا ایندھن ہیں۔ وہ درکِ اسفل میں ڈالے جائیں گے۔ وہ بدترین مجرم ہیں۔ اور کیا فارقلیط صاحب اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ منافق تو کہا ہی اس شخص اور گروہ کو جاتا ہے جو زبان سے خود کو مسلمان کہے لیکن قواعدِ شرعیہ کے اعتبار سے مسلمان نہ ہو۔

ان ابتدائی سطور کے بعد تقریباً ایک کالم میں فارقلیط صاحب نے جو بات کہی ہے وہ اگرچہ نہایت معقول اور منصفانہ ہے مگر اسی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جس قادیانی گروہ کی حمایت کا علم انھوں نے اٹھایا ہے اس کے لٹریچر کا ایک چوتھائی بھی انھوں نے نہیں پڑھا اور وہ پہاڑ جیسے حقائق ان کی نظر سے پوشیدہ رہے جنھیں کوئی بھی محقق بہ آسانی آنکھیں کھول کر دیکھ سکتا ہے۔

وہ فرماتے ہیں:-

"ایک بنیادی اصول جس پر سب کا اتفاق ہے یہ ہے کہ اگر قائل کے قول میں الجھن ہو تو اس کے قول کا مطلب اسی سے دریافت کیا جائے۔ اگر وہ اپنے قول کی ایسی تشریح کر دے جس میں کسی کو اختلاف ہی نہ ہو تو معاملہ ختم کر دیا جائے اگر اس تشریح میں اختلاف ہو تو پھر دلائل کیساتھ احسن طریق پر گفتگو کر لی جائے۔ ایسی بات نہ ہو کہ ہم دوسروں پر غلط الزام اور اتہام لگائیں اور پھر شور بلند کریں کہ وہ اپنے خیال اور عقیدہ کی رو سے کافر ہے۔"

بالکل معقول اور منصفانہ بات:۔

"ہمارے اسلاف نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ کسی کی بات کی ایسی توجیہ کرنا جو قائل کو منظور نہ ہو باطل ہے۔"

یہ بھی بجا اور برحق۔ لیکن اس کے بعد جو یہ فرمایا گیا۔

"پس قادیانی حضرات سے ہی پوچھو کہ مرزا صاحب نے خاتم النبیین کی کیا تشریح کی ہے' ان پر دعویٰ نبوت کا الزام لگانا اور ان کی تکفیر کرنا ایک ایسا طریقہ ہے جو تمام مسلمانوں کو کافر بنا دیتا ہے۔ قائل کو یہ حق دینا چاہئیے کہ وہ خود اپنے قول کے معنی اور اس کی تشریح بتائے۔"

تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارقلیط صاحب اور ان کے دانشور واقعات وحقائق سے اس درجہ بے خبر ہیں جیسے کوئی صحرائی باشندہ یہ تک نہ جانتا ہو کہ ہمارا زمانہ بیل گاڑی اور اونٹ گاڑی کے عہد سے نکل کر موٹر اور ہوائی جہاز اور خلائی راکٹوں کے عہد میں پہنچ گیا ہے۔

بے خبری اور ایسی زبردست معصومیت اور اس قدر بے پایاں! ارے ہمارے بہت ہی محترم بزرگ! آپ تو جہاندیدہ صحافی ہیں۔ آپ بھی اگر بے خبری اور غفلت کا ایسا ریکارڈ قائم کریں گے تو بتائیے علم وخبر اور عقل و دانش کو کس کے دامن میں پناہ ملے گی؟

آپ اب تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ جس طرح بریلوی حضرات مولانا محمد قاسمؒ' مولانا اشرف علیؒ اور بعض دیگر علمائے دیوبند کی کچھ عبارتوں سے بطور خود مطالب اخذ کر کے ان پر فتوے داغ دیتے ہیں ایسا ہی سلوک قادیانیوں کے ساتھ بھی کیا گیا ہے۔ ان پر بھی علمائے اہل سنت نے اپنے طور پر کچھ الزامات عائد کئے اور وہ بیچارے ان الزامات کی تردید کئے چلے جا رہے ہیں مگر علماء سنتے ہی نہیں اور برابر ان کے کفر پر مصر ہیں۔

اگر واقعی ایسا ہوتا تو آپ کا اور آپ کے دانشوروں کا احتجاج معقول ہوتا لیکن ہم ابھی چند اقتباسات کے ذریعہ آپ کو آگاہ کریں گے کہ ایسی کوئی بات یہاں نہیں پائی جاتی بلکہ اس کے برخلاف یہاں علماءِ حق نے کفر کا فتویٰ ٹھیک ان تصریحات اور مزعومات پر دیا ہے جنھیں خود قادیانی حضرات نہ صرف زبان وقلم سے دہراتے چلے جا رہے ہیں بلکہ ان کی طرف مخلوق کو دعوت دیتے ہیں اور جو ان کی دعوت قبول نہ کرے اسے کافر اور کمینہ اور بدذات اور حرام زادہ تک قرار دے ڈالتے ہیں۔

اس سے قبل کہ ہم آگے بڑھیں ایک نکتہ کی وضاحت کر دیں۔ اس جائزے میں ہم اس موضوع پر بحث نہیں کریں گے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کی بعثت کا عقیدہ رکھنا کفر ہے یا نہیں اور اگر کوئی شخص دعوۂ نبوت لے کر اٹھے تو اسے سچا ماننا آدمی کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے یا نہیں کرتا۔ اس موضوع پر بحث ہم اس وقت کرتے جب گفتگو کسی قادیانی سے ہوتی۔ فارقلیط صاحب اور ان کے دانشور نہیں کہہ رہے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعوۂ نبوت برحق ہے۔ یا وہ واقعی مسیح موعود ہیں۔۔۔ یا رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی انبیاء کی بعثت کا عقیدہ اسلامی عقیدہ ہے۔ اس کے بجائے ان کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ ایسے تمام عقائد ودعاوی کو وہ بھی موجب کفر ہی سمجھتے ہیں لیکن ان کا خیال یہ ہے مرزا غلام احمد نے فی الحقیقت

دعوۂ نبوت نہیں کیا۔ یا کیا تو ایسی تاویلات کے ساتھ جن میں یہ گنجائش ہے کہ ان کی اچھی تعبیر کی جاسکے۔ لہٰذا ان پر کفر کا فتویٰ عائد کرنا ظلم ہے۔ یہی خیال ہے جس کا اظہار ان سطور سے ہو رہا ہے جو ابھی ہم نے نقل کیں۔ لہٰذا ہم دستاویزی شہادتوں کے ذریعہ صرف یہ ثابت کریں گے کہ قادیانیوں پر کسی من گھڑت الزام کی بنیاد پر فتویٰ کفر عائد نہیں کیا گیا۔ علماءِ حق نے ذرہ برابر ظلم نہیں کیا۔ انھوں نے قادیانی مدعیِ نبوت کے کسی بھی قول سے اپنے طور پر کوئی معنی اخذ نہیں کئے بلکہ مدعیِ نبوت اور اس کے مستند جانشین ڈنکے کی چوٹ دن دہاڑے تکرار و اصرار کے ساتھ برابر ان عقائد و مزعومات کی گردان کئے چلے جا رہے ہیں جن کے کفر و طغیان ہونے پر علمائے اسلام کے کسی بھی حلقے اور طبقے کو کسی بھی زمانے اور کسی بھی ملک میں اختلاف اور شک نہیں رہا ہے۔ جو خود فارقلیط صاحب کے نزدیک بھی عین کفر ہیں۔ حتیٰ کہ ابھی جب پاکستان کی متعلقہ کمیٹی نے مستند قادیانی بزرگوں کو اس کا موقعہ دیا کہ وہ خود اپنی زبان سے اپنے عقائد کا اظہار کرسکیں تاکہ یہ شکایت نہ رہے کہ ہمارے عقائد کی غلط ترجمانی کر کے فیصلہ دیڈالا گیا تو انھوں نے بھی ٹھیک وہی عقائد ظاہر کئے جنھیں کسی بھی نرم سے نرم تاویل کے ذریعہ اسلام سے نہیں جوڑا جاسکتا تھا۔ اسی لئے کمیٹی مجبور ہو گئی کہ وہی فیصلہ دے جس کا تقاضا یہ عقائد کر رہے ہیں اور کسی ایک بھی ممبر کو ایسی گنجائش نہ مل سکی کہ اس فیصلے کیخلاف ووٹ ڈالے۔

فارقلیط صاحب کے مضمون میں جن نکات پر خالص جذباتی انداز میں زورِ قلم صرف کیا گیا ہے وہ درجِ ذیل ہیں :-

(۱) مرزا غلام احمد کا دعوۂ نبوت۔

(۲) قیامت سے قبل حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی دنیا میں تشریف آوری۔

یہ دونوں ہی نکات ایسے تھے کہ فارقلیط صاحب اور ان کے دانشوروں کو اگر اپنی ذمہ داری اور آخرت کی بازپرس کا بھی احساس ہوتا تو زبان کھولنے سے قبل وہ کم سے کم اتنا تو کر ہی لیتے کہ پہلے نکتہ کے سلسلہ میں مرزا غلام احمد کی ایک دو آخری تصانیف اپنی چشم مبارک سے دیکھ لیں یا ان کے صاحب زادے اور خلیفۂ اول مرزا بشیر الدین محمود کی "حقیقت النبوۃ" ملاحظہ فرمالیں اور دوسرے نکتے کے سلسلے میں قرآن و حدیث پر نظر ڈال لیں یا اتنی قابلیت اور فرصت نہ ہو تو یہ تحقیق [illegible] کہ چودہ سو سالوں میں جو ہزاروں محدثین، مفسرین، متکلمین مجتہدین اور اصولیین گذرے ہیں انھوں نے اس مسئلہ میں کیا کہا ہے۔ کن ماخذ کی بنیاد پر کہا ہے، کن دلائل کو اختیار فرمایا ہے۔

یہ ضروری زحمت اگر وہ اٹھا لیتے تو بے خبری اور ہرزہ سرائی کا وہ طوفان اٹھانے کی ضرورت نہ پڑتی جو شرم و متانت سے بے نیاز ہو کر اٹھا دیا گیا ہے اور جس کی روشنی میں ہر باخبر اور معقولیت پسند آدمی ایک ہی نتیجہ اخذ کرسکتا ہے یہ کہ دانشوری اب جہالتِ فاحشہ اور حماقتِ عریاں کا نام رکھ لیا گیا ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ مغفل پن کا مظاہرہ کرے اتنا ہی بڑا دانش ور کہلائے اور جتنی زیادہ زباں درازی کا کھیل دکھلائے اتنا ہی زیادہ روشن فکر سمجھا جائے۔

کوئی حمید دلوائی یا چھاگلا اس طرح کی دانشوری کا کرتب دکھلاتا تو ہمیں نہ رنج ہوتا نہ تعجب۔ مگر عثمان فارقلیط جیسا اچھا مسلمان اور حساس و فہیم صحافی اس گھٹیا سطح پر اتر آیا ہے اس سے بڑا دکھ پہنچا اور تعجب بھی ہوا۔ بہرحال ہم وہ خدمت ضرور انجام دیں گے جس کی دعوت موصوف نے دی ہے اور بحث و استدلال کے معروف ضوابط کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر ہر نکتے پر تحقیقی مواد پیش کریں گے۔ جن لوگوں نے یہ طے کر لیا ہو کہ ہم فقط اپنی کہے جائیں گے کسی اور کی نہیں سنیں گے

انھیں تو دنیا کا کوئی بھی محقق اور ناقد ان کی جگہ سے نہیں ہلا سکتا مگر جو لوگ واقعۃً صداقت کے جویا ہوں اور معقولیت انھیں اپیل کر سکے وہ انشاء اللہ پوری طرح مطمئن ہو جائیں گے کہ علمائے اہلِ سنت کا موقف سو فی صدی انصاف و معقولیت پر مبنی ہے اور فارقلیط صاحب نے جن خیالات کو ثبتِ قرطاس فرمایا ہے وہ جہلِ محض اور کورچی کج بحثی کے سوا کسی شئے کے مظہر نہیں۔

فارقلیط صاحب نے اپنی ابتدائی ہی سطور میں حربِ عقائد پر واویلا کیا ہے اور پھر ان فتووں کا تذکرہ فرمایا ہے جو بریلوی علماء اکثر علماء کے خلاف داغتے رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ قادیانیوں کی تکفیر بھی اسی قبیل کی ایک چیز ہے اور پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینا ایک غلط قسم کی فرقہ وارانہ ذہنیت کے مظاہرے کے سوا کچھ نہیں۔

محترم فارقلیط صاحب کا خیال یہ ہے کہ بے دریغ کفر کا فتویٰ جھاڑ دینے کی جو وبا ہمارے یہاں مدت سے عام ہے یہ قادیانیوں کی تکفیر بھی اسی وبا کی ایک نمود ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:-

> "آج کل حربِ عقائد کا فتنہ ہر چہار سو بپا ہے' تکفیر کی توپیں بڑی آزادی سے داغی جا رہی ہیں توپچیوں کو مطلق پروا نہیں کہ کون کون ان کا نشانہ بن رہا ہے۔ قادیانیت کا فتنہ کھینچ کر پاکستان سے ہندوستان لایا گیا ہے اور بے بصیرت لوگ بالواسطہ اس کی اشاعت میں مدد دے رہے ہیں۔"

ہم ان سے عرض کریں گے کہ اس اظہار خیال میں آپ نے ہوشمندی اور عدل پسندی سے کام نہیں لیا۔ تمثیل میں آپ نے شدومد سے مجدد بریلوی کے تکفیری فتاویٰ کا ذکر کیا ہے اور عوام کو یہ تأثر دینا چاہا ہے کہ قادیانیوں کے خلاف علماءِ اہلِ سنت کا زیرِ بحث فتویٰ بھی ایسے ہی فتاویٰ میں سے ایک ہے۔ حیرت ہے کہ آپ جیسا ذی بصیرت دو بالکل مختلف چیزوں کا فرق محسوس نہ کر سکا حالانکہ یہ فرق باریک نہیں تھا۔

مجدد بریلوی یا کسی اور قبوری بزرگ نے علمائے دیوبند یا علمائے اہلِ حدیث کے خلاف جو فتوے دیئے ہیں ان کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ ان علماء کی بعض عبارات سے اپنے طور پر ایک مطلب اخذ کرتے ہیں اور اس پر کفر و ضلالت کا فتویٰ دے ڈالتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی ایک عبارت سے یہ اخذ کیا کہ "خدا جھوٹ بولتا ہے" یا یہ اخذ کیا کہ انبیاء و اولیاء کو "چمار" کہہ دینے میں کوئی بے ادبی نہیں۔ یا مثلاً مولانا اشرف علیؒ کے بعض فقروں کا مطلب انھوں نے یہ نکالا کہ اللہ کے رسولؐ کا مرتبہ ہم سے بس اتنا ہی زیادہ ہے جتنا بڑے بھائی کا۔ یا یہ نکالا کہ شیطان کا علم حضورؐ کے علم سے زیادہ ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ اس طرح کا ہر عقیدہ و خیال فاسد ہے جس کی توقع کسی بھی مسلمان سے نہیں کی جا سکتی۔ اس پر کفر و گمراہی کا فتویٰ صادر کرنا بھی فی نفسہٖ غلط نہیں ہے۔ خود علمائے دیوبند بھی ایسی واہی باتوں کو کفر و ضلالت ہی کے خانے میں رکھتے ہیں۔ لیکن غلطی یہ ہے کہ مذکورہ علماء کی عبارات کا یہ مطلب تھا ہی نہیں۔ وہ بار بار کہہ رہے ہیں کہ ہمارا منشاء تم غلط سمجھ رہے ہو مگر بریلوی حضرات ان کی تشریحات کو سنتے ہی نہیں اور برابر فتووں کی گردان کئے چلے جا رہے ہیں۔ ایسی روش کو یقیناً نامعقول کہیں گے اور یہ صریح طور پر اُس اصولِ انصاف کے خلاف ہے جس کا ذکر آپ نے بھی فرمایا ہے یعنی توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ [1]

اس کے برعکس قادیانی مسئلہ یوں ہے کہ مرزا غلام احمد نے پہلے کچھ مدت تک مجدد اور مصلح ہونے کا دعویٰ کیا' پھر یہ دعویٰ دعوۂ نبوت میں تبدیل ہوا لیکن تھوڑے سے تحفظ اور تاویل کے ساتھ۔ مثلاً ظلی اور بروزی کی قید استعمال کی گئی مگر تیسرے مرحلے میں یہ قید بھی اٹھ گئی اور

---

[1] کسی قول کا ایسا مفہوم نکالنا جسے خود قائل درست نہ سمجھتا ہو۔

صاف صاف کہدیا گیا کہ میں ٹھیک ایسا ہی نبی ہوں جیسے کہ پہلے ہوتے آئے ہیں۔ مجھ پر اسی طرح وحی کا نزول ہوتا ہے جس طرح انبیاءِ سابق پر ہوتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب نے صریح وقطعی الفاظ میں خود کو تمام انبیاء سے افضل قرار دیا اور پورے زور وشور سے کہا کہ جو بھی عظمت ورفعت اور شان والہیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں آئی تھی وہ سب کی سب میرے بھی حصے میں آگئی ہے، بلکہ بعض اعتبارسے میں ان پر بھی فوقیت لے گیا ہوں۔

فرمایا جائے کہ یہ سب کچھ کیا اس کے لئے کافی نہیں کہ علماءِ حق اسے کفر وضلالت قرار دیتے؟ یہ دعوے اور یہ مضامین مرزا صاحب کے کسی مرموز فقرے سے اخذ نہیں کئے گئے تھے۔ نہ ایسا تھا کہ وہ اور ان کے مستند ترجمان ان دعووں کا انکار کرتے ہوں اور یہ کہتے ہوں کہ ہماری طرف غلط باتیں منسوب کی جا رہی ہیں۔ بلکہ وہ تو اصرار کے ساتھ انھیں دہراتے چلے جاتے تھے اور آج بھی مستند قسم کے قادیانی بلا تاویل ان ہی دعووں پر جمے ہوئے ہیں۔ قادیانی مذہب کی بنیاد ہی اس عقیدے پر ہے کہ مرزا غلام احمد نبی ہیں۔ ان کی نبوت کو تسلیم نہ کرنے والا کافر ہی ہے۔ انھیں جس نے نبی نہیں مانا وہ مسلمان نہیں۔ کسی بھی غیر قادیانی کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔ کسی بھی غیر قادیانی کی نمازِ جنازہ بھی جائز نہیں کیونکہ وہ تو کافر ہے اور کافر کے لئے دعائے مغفرت حرام ہے۔ کوئی قادیانی اپنی لڑکی کسی غیر قادیانی کو نہیں دے سکتا کیونکہ اس کے نزدیک تمام غیر قادیانی کافر ہیں۔

اب فارقلیط صاحب اور ان کے دانشور انصاف فرمائیں کہ ایسے گروہ کی تکفیر پر چراغ پا ہونا اور اسے بریلویوں کی تکفیر سے مماثلت دینا کیونکر معقول ہو سکتا ہے۔

اب ہم کچھ ایسے اقتباسات پیش کریں گے جن سے واضح ہوگا کہ مرزا غلام احمد کا دعوۂ نبوت ووضاحت کے کس درجے میں ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ اپنا حاصلِ مطالعہ پیش کیا جائے ہم فارقلیط صاحب سے دریافت فرمائیں گے کہ جس ماہنامہ شبستان میں آپ نے اپنا مضمون شائع کرایا ہے اسی کے ستمبر ۱۹۷۴ء والے شمارے میں قادیانیت کے موضوع پر دو مضمون چھپے ہیں کیا وہ بھی آپ نے پڑھے؟ اور اگر پڑھے تو کیا اس کے بعد بھی آپ اسی خیال پر قائم ہیں کہ مرزا غلام احمد اور ان کی امت کو کافر قرار دینا زیادتی ہے؟

ان دونوں مضامین کے چند مندرجات یہاں دہرائے جائیں تو بات کافی منقح ہو جائے گی۔

(۱) "ایک غلطی کا ازالہ (اشتہار) میں حضرت مسیح موعود نے فرمایا کہ محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار کے الہام میں محمد رسول اللہ سے مراد میں ہوں اور محمد رسول اللہ خدا نے مجھے کہا ہے۔" (اخبار "الفضل" قادیان ج ۲، نمبر ۵:۔ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۱۵ء شبستان ستمبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۱۲۱)

(۲) "اس کے (یعنی نبی کریم کے) لئے چاند گرہن کا نشان ظاہر ہوا اور میرے لئے چاند اور سورج دونوں کا۔ اب کیا تو انکار کریگا۔" (اعجاز احمدی مصنفہ مرزا غلام احمد صفحہ ۷۱)

(۳) ابنِ مریم کے ذکر کو چھوڑو
اس سے بہتر غلام احمد ہے
(دافع البلاء صفحہ ۲۰)

(۴) "میری شان میں ہے وما ینطق عن الھوی یعنی مرزا اپنی خواہش سے نہیں بولتا۔" (اشتہار انعامی پانسو)

(۵) "کل مسلمانوں نے مجھے قبول کر لیا ہے اور میری دعوت کی تصدیق کر لی ہے مگر کنجریوں اور

بدکاروں کی اولاد نے مجھے نہیں مانا۔" (آئینہ کمالات صفحہ ۵۴۸)

(۶) "جو شخص میرا مخالف ہے وہ عیسائی، یہودی، مشرک اور جہنمی ہے۔" (نزول مسیح صفحہ ۴، تذکرہ صفحہ ۲۲۷، تحفۂ گولڑویہ صفحہ ۱۳۱)

(۷) "بلاشبہ ہمارے دشمن بیابانوں کے خنزیر ہو گئے اور ان کی عورتیں کتیوں سے بھی بڑھ گئیں۔" (نجم الہدیٰ صفحہ ۱۰، درثمین صفحہ ۲۹۴)

(۸) "جو شخص ہماری فتح کا قائل نہ ہوگا تو صاف صاف سمجھا جائے گا کہ اس کو ولد الحرام بننے کا شوق ہے۔" (انوار الاسلام صفحہ ۳۰)

محترم فارقلیط اور ان کے دانشور فیصلہ فرمائیں کہ ان عبارتوں میں سے کونسی عبارت اپنے مفہوم و مدعا میں صریح نہیں ہے۔ اور یہ بھی فیصلہ فرمائیں کہ جو مطالب و معانی اور افکار و عقائد ان عبارتوں سے بلا ابہام ظاہر ہو رہے ہیں کیا وہ اس بات کے لئے کافی نہیں کہ مرزا غلام احمد اور اس کے پیرووں کو خارج از اسلام، بدزبان، بدتمیز اور بیہودہ گو قرار دیا جائے۔

ان عبارتوں سے ایک بات تو یہ صاف ظاہر ہے کہ مرزا صاحب خود کو نہ صرف نبی قرار دیتے ہیں بلکہ ابن مریم حضرت عیسیٰؑ سے بڑا نبی تصور کرتے ہیں — دوسری بات یہ ظاہر ہے کہ وہ اپنی نبوت کے منکر کو کافر سمجھتے ہیں تیسری بات یہ ظاہر ہے کہ وہ قرآن میں تحریف کرتے ہیں۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن کا براہِ راست خطاب اُس محمد عربیؐ سے ہے جو چودہ سو سال قبل دنیا سے گزر چکا۔ آج اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں آیات میں خاص طور پر مجھے مخاطب بنایا گیا ہے تو فارقلیط صاحب انصاف فرمائیں کہ اس سے بدتر اور فحش تحریفِ قرآن اور کیا ہوگی۔

پھر یہ نہیں کہ یہ تینوں باتیں صرف ان ہی چند اقتباسات سے ظاہر ہو رہی ہوں۔ یہ تو مرزا صاحب کی تحریروں میں کثرت سے موجود ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ مرزا صاحب حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں جو توہین آمیز رویہ اختیار کرتے ہیں اس کا ایک نمونہ اسی ستمبر والے شبستاں موجود ہے۔

"یسوع کے ہاتھ میں سوائے مکر و فریب کے اور کچھ نہیں تھا پھر افسوس کہ یہ نالائق عیسائی ایسے شخص کو خدا بنا رہے ہیں۔ آپ کا خاندان بھی نہایت پاک و مطہر ہے۔ تین دادیاں اور نانیاں آپ کی زناکار اور کسبی عورتیں تھیں جن کے خون سے آپ کا وجود ظہور پذیر ہوا۔"

(ضمیمہ انجام آتھم صفحہ ۷، نور القرآن نمبر ۲ صفحہ ۱۲)

کیا یہ عبارت اپنے مفہوم و مدعا کے سلسلہ میں ذرا بھی مبہم اور مرموز ہے۔ کیا علماءِ اہل سنت زیادتی کرتے ہیں اگر اس عبارت اور ایسی ہی متعدد عبارتوں کے پیش نظر یہ کہتے ہیں کہ مرزا غلام احمد نے حضرت عیسیٰؑ کی صریح تذلیل و توہین کی ہے۔ پھر ہم دانشورانِ کرام سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک ایسے جلیل القدر پیغمبرؑ کے خلاف بدزبانی اور بیہودہ گوئی کفر نہیں ہے جس کی تکریم و تحسین قرآن نے بہ الفاظِ صریح کی ہو۔ ان صاحب یعنی مرزا صاحب کا حال یہ ہے کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کو یوسف بڑھئی کا بیٹا بتلاتے ہیں۔ (ازالۃ الاوہام صفحہ ۱۲۵، کشتی نوح صفحہ ۱۶) حالانکہ کسی بھی مسلمان کو یاد دلانے کی حاجت نہیں کہ قرآن کی اطلاع کے مطابق حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور اسی لئے ان کا نام ابن مریم رکھا گیا۔ وہ بغیر باپ کے کیونکر پیدا ہوئے اس کی بھی تفصیل قرآن میں موجود ہے۔ تو کیا قرآن کو برملا جھٹلانا اور خدا سے مکابرہ کرنا بھی ایسا جرم نہیں جس کے مرتکب کو گمراہ اور مردود قرار دیا جا سکے۔

فارقلیط صاحب اور ان کے دانشوروں کو اور بعض اور لوگوں کو یہ غلط فہمی کیوں ہوتی ہے کہ مرزا غلام احمد نے صریحاً دعوۂ نبوت نہیں کیا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

ختم نبوت کے منکر نہیں ہیں اس کی وجہ اُس تاریخی صورتِ حال سے بے خبری ہے جس سے واقف ہوئے بغیر اس مسئلے کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ تاریخی صورتِ حال یہ ہے (جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں) کہ مرزا غلام احمد نے دفعتاً اور یکایک دعوۂ نبوت نہیں کیا ہے۔ ابتدا میں وہ صرف ولایت و تجدید اور الہام و کشف کے مدعی تھے اور اعتراف کرتے تھے کہ نبوت اور وحی کا سلسلہ محمد عربی ﷺ پر ختم ہو چکا۔ یہ اعتراف ان کی ابتدائی تحریروں میں جگہ جگہ موجود ہے۔ پھر ایک دور آیا جب ان کے خیالات بدلے اور انھوں نے دبے لفظوں میں اپنے نبی ہونے کا اظہار کیا اور الہام کی جگہ لفظ وحی استعمال فرمانے لگے۔ لیکن ابھی کچھ نہ کچھ تحفظ اور تاویل کے مدارج باقی تھے۔ ابھی وہ اپنی نبوت کو ایک ایسی نبوت قرار دے رہے تھے جو اصل نبوتوں کا سایہ اور پرتو ہے۔ یہ نبوت ان کے بقول رسول اللہ ﷺ کے ختم نبوت کے منافی نہیں تھی۔ اسے مستقل بالذات بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ مگر کچھ دنوں بعد آخر وہ مرحلہ بھی آ ہی گیا جب انھوں نے ساری تاویلات اور تحفظات ختم کر کے برملا اعلان کیا کہ میں ٹھیک ویسا ہی نبی ہوں جیسے کہ پہلے ہوتے آئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم نہیں ہو گیا۔ میری نبوت رسول اللہ کے سوا تمام انبیاء کی نبوت سے افضل و برتر ہے۔ میرا منکر کافر ہے اور مجھ پر ایمان لانا اسی طرح پوری دنیا کا فرض ہے جس طرح مجھ سے قبل رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا ساری دنیا کا فرض تھا۔

اب کھلی بات ہے کہ جن لوگوں نے اس تاریخ کا اور مرزا کی تمام تحریروں کا مطالعہ نہیں کیا انھیں بآسانی کوئی بھی شخص مرزا کی ابتدائی تحریروں کے اقتباس دکھلا کر یہ باور کرا سکتا ہے کہ مرزا تو کہیں بھی نبوت کا دعویٰ نہیں کرتے۔ علماء خواہ مخواہ ان پر الزام عائد کرتے ہیں۔ یا دوسرے مرحلے کی تحریریں دکھلا کر یقین دلا سکتا ہے کہ مرزا نے کسی مستقل نبوت کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ ایک ذیلی اور ظلّی نوع کی نبوت کا اعلان کیا ہے جو اپنی جوہری نوعیت میں ولایت اور تجدید کے ہم معنی ہے۔ وہ فقط ایک مصلح اور مجدد ہونے کے مدعی ہیں نہ کہ حقیقی نبوت کے۔ علماء زبردستی ان کے سر دعوۂ نبوت مڑھ رہے ہیں۔

فارقلیط صاحب کے مضمون سے پیچھے جو اقتباسات ہم نے دیئے ان سے ظاہر ہے کہ موصوف اور ان کے دانشور بھی اسی طرح کے فریب خوردوں میں شامل ہیں۔ انھیں بالکل خبر نہیں کہ مرزا صاحب زینہ بہ زینہ چڑھ کر کہاں پہنچے اور اپنے دعوۂ نبوت میں انھوں نے تاویل و توجیہ کا کوئی تسمہ نہیں لگا رہنے دیا۔ صراحت اور قطعیت کا کوئی پیرایہ ایسا نہیں جو انھوں نے دعوۂ نبوت میں اختیار نہ فرمایا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صرف علماء ہی نے نہیں ڈاکٹر اقبالؒ جیسے جدید تعلیم یافتہ نے انتہائی کرب کے ساتھ اعلان کیا کہ مرزا کا دعوۂ نبوت، نبوتِ محمدی کے خلاف بغاوت ہے، مرزائی ملتِ اسلامیہ کا جزو نہیں ہیں وہ ایک نیا دین لائے ہیں جو سراسر باطل ہے۔ آگے ہم ڈاکٹر اقبال کی تحریر بھی نقل کریں گے۔

بجائے اس کے کہ ہم مرزا صاحب کی کتابوں سے کچھ نقل کریں اور فارقلیط صاحب کے دانشوروں کو اس کی تصدیق کے لئے اِدھر اُدھر لائبریریوں میں دوڑنا پڑے زیادہ آسان اور قابلِ اعتماد راہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کے صاحبزادے مرزا بشیرالدین محمود کی کتاب "حقیقۃ النبوت" سامنے رکھ دیں۔ یہ صاحبزادے مرزا کے خلیفۂ اول بھی ہیں اور ان سے بڑھ کر مرزا کے علوم کا وارث اور عقائد و افکار کا عالم اور نمائندہ و ترجمان کوئی نہیں۔

یہ کتاب خلیفہ صاحب نے کیوں لکھی تھی اسے بھی

گوشگذار کرلیا جائے۔ قادیانیوں ہی میں کچھ لوگ
یسے پیدا ہوئے جن کا خیال تھا کہ مرزا غلام احمد نبی
نہیں ہیں صرف مجدّد ہیں۔ اس خیال کی وجہ شاید مرزا
صاحب کی ابتدائی تحریریں تھیں۔ یہ خیال جب
نھوں نے قائم کرلیا تو مرزا صاحب کے تمام اقوال کو
ھی تاویل کے ذریعہ اسی کے مطابق کرنا چاہا اور ایک
ستقل پارٹی " لاہوری پارٹی " کے نام سے بن گئی۔
س پارٹی کو مرزا کے " خلیفہ برحق " کیسے برداشت
رتے۔ مرزا کے صریح و مستقل دعوۂ نبوت کے بعد
س طرح کی پارٹی کا کوئی جواز ہی نہیں تھا لہٰذا خلیفہ
صاحب نے " حقیقۃ النبوت " کے نام سے کتاب لکھی جس
ے ہمیشہ کے لئے یہ قطعی فیصلہ کر دیا کہ مجددیت یا ظلی و
روزی نبوت کے جتنے بھی دعوے مرزا غلام احمد نے
بتدائً کئے تھے ان سب کو خود موصوف ہی نے مسترد
ور منسوخ فرما دیا تھا اور صاف صاف اعلان کر دیا تھا
ہ میں بلا ریب و شک اور بلا تاویل و توجیہہ نبی ہوں۔
یسا نبی جس پر ایمان لانا ساری مخلوق کا فرض ہے
ور ایمان نہ لانے والا بالیقین کافر ہوگا۔

آئیے " حقیقۃ النبوت " پر نظر ڈالیں۔ فارقلیط
صاحب اور ان کے دانشور بھی اس مطالعاتی سیر میں
مارے شریک ہوجائیں تاکہ ان کی یہ پہاڑ جیسی غلط
ہی رفع ہو جائے کہ علمائے اہلِ سنت نے زبردستی
رزا غلام احمد کے سر دعوۂ نبوت مڑھ دیا ہے اور ان
ے اقوال سے ایسے مطالب نکال لئے ہیں جن پر وہ
اضی نہیں ہیں۔

" حقیقۃ النبوۃ " کی پیشانی ہی پر یہ عبارت تحریر
ہے:—

" مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت و
رسالت براہین قاطعہ کے ساتھ ثابت کی گئی
ہے۔"

عوام بیچارے تو پوری طرح یہ بھی نہیں جانتے کہ
" مسیح موعود " کا کیا مطلب ہے، مسیح کہتے ہیں حضرت عیسیٰ
علیہ السلام کو اور " موعود " کا مطلب یہ ہے کہ وہی عیسیٰؑ
جنھیں دنیا میں بھیجنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس شق پر ہم
آگے مستقل گفتگو کریں گے۔

حقیقۃ النبوۃ کے مصنف مرزا بشیر الدین محمود نے
اس کتاب میں دو چار نہیں بلکہ اکٹھے بیس دلائل غلام احمد
کی نبوت و رسالت پر قائم کئے ہیں اور ان میں سے دلیل
نمبر ۸ یہ ہے کہ خود مرزا غلام احمد نے اپنے آپ کو بلا ریب
الہام نبی اور رسول کہلا ہے۔ کب، کہاں، کن الفاظ میں کہا
ہے اس کی وضاحت کے لئے انھوں نے مرزا صاحب کی
تحریروں سے دس نہیں اکٹھی ۳۹ (ایک کم چالیس)
عبارتیں پیش کر دی ہیں جو واقعتہً دعوۂ نبوت کے لئے
دو اور دو چار کی طرح قطعی اور صریح ہیں۔ ان میں سے کچھ
محترم فارقلیط صاحب اور ان کے دانشورانِ عظام بھی
ملاحظہ فرمالیں۔

(۱) میں خدا کے حکم کے موافق نبی ہوں۔
(۲) میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں
میری جان ہے کہ اسی نے مجھے بھیجا ہے اور اسی نے میرا نام
نبی رکھا ہے۔
(۳) پس اس میں کیا شک ہے کہ میری پیشین گوئیوں کے بعد
دنیا میں زلزلوں اور دوسری آفات کا سلسلہ شروع ہو جا
میری سچائی کے لئے ایک نشان ہے۔ یاد رہے کہ خدا کے
رسول کی خواہ کسی حصۂ زمین میں تکذیب ہو مگر اسکی تکذیب
کے وقت دوسرے مجرم بھی پکڑے جاتے ہیں۔
(۴) ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم رسول و نبی ہیں۔
(۵) خدا نے نہ چاہا کہ اپنے رسول کو بغیر گواہی چھوڑے۔
(۶) خدا تعالیٰ ...... قادیان کو اس طاعون کی خوفناک
تباہی سے محفوظ رکھے گا کیونکہ یہ اس کے رسول کا تختگاہ ہے۔
(۷) سچا خدا وہی ہے جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا۔
(حقیقۃ النبوۃ صہ ۲۱۲ سے صہ ۲۱۴ تک)

مرزا صاحب کی ان عبارتوں کے ساتھ مصنف نے مکمل حوالے بھی دیدیے ہیں۔ فارقلیط صاحب ارشاد فرمائیں کیا ان عبارتوں میں ایک بھی عبارت اپنے مفہوم میں غیر صریح ہے۔ اگر ۳۹ عبارتیں اسی طرح کی موجود ہوں تو کیا پھر بھی کوئی صحیح الدماغ آدمی بقائمی ہوش و حواس یہ ہرزہ سرائی کرسکتا ہے کہ علماءِ اہلِ سنت خواہ مخواہ مرزا غلام احمد پر دعوۂ نبوت کا الزام لگاتے ہیں۔

اور دیکھئے۔ ان عبارات کے علاوہ "حقیقۃ النبوت" میں ۳۹ الہامات ایسے پیش کئے گئے جن میں اللہ نے مرزا صاحب کو نبی اور رسول کہا۔ مصنف جناب مرزا محمود صاحب ایسے ہی دلائل و شواہد کے ہجوم میں رقم طراز ہیں:۔

(۱) آپ (یعنی مرزا غلام احمد صاحب) نبی ہیں اور خدا نے اور اس کے رسول نے اُن ہی الفاظ میں آپ کو نبی کہا ہے جن میں قرآن کریم اور احادیث میں پچھلے نبیوں کو نبی کہا گیا ہے (صفحہ ۷)

(۲) پس اس میں کیا شک ہے کہ حضرت مسیح موعود قرآنِ کریم کے معنوں کی رو سے بھی نبی ہیں اور لغت کے معنوں کی رو سے بھی نبی ہیں۔ (صفحہ ۱۱۶)

(۳) پس شریعتِ اسلام نبی کے جو معنی کرتی ہے اُس معنی کر حضرت صاحب ہرگز مجازی نبی نہیں بلکہ حقیقی نبی ہیں۔ (صفحہ ۱۷۴)

(۴) بلحاظ نبوت ہم بھی مرزا صاحب کو پہلے نبیوں کے مطابق مانتے ہیں۔ (صفحہ ۲۹۲)

تاریخی و تحقیقی صورتِ حال کو مرزا محمود بایں الفاظ پیش کرتے ہیں:۔

(۱) "جن کتب میں آپ نے (مرزا غلام احمد نے) اپنے نبی ہونے سے صریح الفاظ میں انکار کیا ہے اور اپنی نبوت کو جزئی اور ناقص اور محدثوں کی نبوت قرار دیا ہے وہ سب کی سب بلا استثناء ۱۹۰۱ء سے پہلے کی کتب ہیں اور ۱۹۰۱ء کے بعد کی کتب میں سے ایک کتاب میں بھی اپنی نبوت کو جزئی قرار نہیں دیا اور نہ ناقص اور نہ نبوتِ محدثیت" (صفحہ ۱۲۰)

(۲) "۱۹۰۱ء سے پہلے کے حوالے جن میں آپ نے نبی ہونے سے انکار کیا ہے اب منسوخ ہیں اور ان سے حجت پکڑنی غلط ہے۔" (صفحہ ۱۲۱)

(۳) "پہلے بھی (یعنی ۱۹۰۱ء سے پہلے بھی) نبی کے نام سے آپ کو پکارا جاتا تھا لیکن آپ اسکی تاویل کرتے رہتے تھے لیکن جب بار بار الہامات میں آپ کو اللہ تعالیٰ نے نبی و رسول کے نام سے پکارا تو آپ کو معلوم ہوا کہ آپ واقعہ میں نبی ہی ہیں غیر نبی نہیں جیسا کہ پہلے سمجھتے تھے اور نبی کا لفظ جو آپ کے الہامات میں آتا ہے صریح ہے قابلِ تاویل نہیں۔" (صفحہ ۱۲۴)

اب دانشوران محترم سوچیں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں؟ حقیقۃ النبوت کے مصنف نے مرزا صاحب کی نبوت کے ۳۹ دلائل اور ۳۹ الہامات پیش کرنے کے بعد نتیجۃً جو کچھ ارشاد کیا ہے اس کا بھی مشاہدہ فرمالیجئے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اب کس طرح ممکن ہے کہ اس قدر الہامات کی موجودگی میں ہم حضرت مسیح موعود کو غیر نبی قرار دیں اللہ تعالیٰ تو ایک دفعہ نہیں دو دفعہ نہیں بیسیوں اور سیکڑوں دفعہ آپ کو نبی کے نام سے یاد فرماتا ہے اور ہم سب جگہ یہ تاویل کرلیں کہ ان سب الہامات سے مراد اسی قدر ہے کہ آپ نبی نہیں مگر نبیوں کی کوئی صفت آپ میں پائی جاتی ہے۔ کیا اس کی نظیر دنیا میں کسی اور انسان میں بھی ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بار بار نبی کہہ کر پکارتا ہے لیکن درحقیقت وہ نبی نہیں ہوتا۔"

"کیا سب نبیوں کو ہم اس لئے نبی نہیں مانتے

کہ خدا تعالیٰ نے ان کو نبی کہا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہی خدا جس نے موسیٰؑ سے کہا تو نبی ہے تو وہ نبی ہو گیا اور عیسیٰؑ سے کہا کہ تو نبی ہے تو وہ نبی ہو گیا لیکن آج مسیح موعود سے کہتا ہے کہ تو نبی ہے تو وہ نبی نہیں ہوتا۔ اگر نبی بنانے کے لئے کوئی اور لفظ ہوتے ہیں تو انھیں ہمارے سامنے پیش کرو جن سے ہمیں معلوم ہو سکے کہ پہلے نبیوں تو اس طرح نبی کہا جاتا تھا اب وہ نبی ہوتے تھے اور مسیح موعود کو اس کے خلاف کسی اور طرح نبی کہا گیا ہے پس وہ نبی نہیں ہوئے کیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی یقینی وحی کی موجودگی میں کوئی شخص مسیح موعود کی نبوت کا انکار کر سکتا ہے اور جو شخص انکار کرتا ہے اسے ضرور پہلے نبیوں کا بھی انکار کرنا پڑے گا کیونکہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیح کی نبوت جن دلائل اور جن الفاظ سے ثابت ہوتی ہے اُن سے بڑھ کر دلائل اور صاف الفاظ حضرت مسیح موعود کی نبوت کے متعلق موجود ہیں ان کے ہوتے ہوئے اگر مسیح موعود نبی نہیں تو دنیا میں آج تک کبھی کوئی نبی ہوا ہی نہیں۔"

(حقیقۃ النبوۃ صفحہ ۲۰۱ و ۲۰۲)

یہ جتنے اقتباسات پیش خدمت کئے گئے ضرورت ہو تو اتنے ہی اور پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن زیادہ طوالت سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر ان اقتباسات سے بھی فارقلیط صاحب اور ان کے دانشوروں کو یہ اطمینان نہیں ہوا کہ علماء اہلسنت نے قادیانیوں پر کوئی الزام نہیں لگایا بلکہ مرزا غلام احمد نے کھل کر ڈنکے کی چوٹ دعوۂ نبوت کیا ہے تو مزید ہزاروں صفحات کا دفتر بھی انھیں مطمئن نہیں کر سکتا۔

اب ہم دوسرے نکتے کی طرف آتے ہیں یعنی قیامت سے قبل حضرت عیسیٰ ابن مریم کی دنیا میں تشریف آوری۔ قرآن میں بتایا گیا کہ حضرت عیسیٰ نہ تو قتل ہوئے نہ سولی دیئے گئے بلکہ انھیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ قادیانی حضرات اس کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ اسی طرح انتقال فرما چکے جس طرح دوسرے انسان انتقال کرتے ہیں۔ اگر ہماری گفتگو کسی قادیانی سے ہوتی تو یقیناً ہم اس نکتہ پر بھی مدلل بحث کرتے لیکن فارقلیط صاحب کے مضمون میں اس نکتہ کو نہیں چھیڑا گیا اور توقع یہی کی جا سکتی ہے کہ تمام جمہور امت کی طرح وہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہوں گے کہ حضرت عیسیٰؑ زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے لہٰذا اسے اپنے اور فارقلیط صاحب کے مابین متفق علیہ مانتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں اور تفصیلی گفتگو اس نکتہ پر کرنا چاہتے ہیں کہ قیامت سے قبل حضرت عیسیٰؑ کی دنیا میں تشریف آوری کا عقیدہ کیا علمی حیثیت رکھتا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ فارقلیط صاحب نے مطالعۂ و تحقیق کی ادنیٰ زحمت اٹھائے بغیر اس عقیدے کا نہ صرف انکار کیا ہے بلکہ اس کے قائلین کو قادیانیوں ہی کی طرح ختم نبوت کا منکر قرار دے ڈالا ہے اور اس قدر تلخ و تند الفاظ استعمال فرمائے ہیں کہ متانت اور بردباری کو پسینہ آگیا ہے۔ حقِ بحث ادا نہ ہوگا اگر ہم موصوف کی وہ عبارتیں نقل نہ کریں جن سے ان کے مزاجی ٹمپریچر اور جوشِ غضب کا پتا چلتا ہے۔ نیز یہ پتا چلتا ہے کہ ایک بزرگ صحافی اور نیک دل مسلمان ہونے کے باوجود وہ علم الحدیث اور بعض بنیادی معلومات سے کس قدر بے بہرہ ہیں۔

نزولِ عیسیٰؑ کے مسئلہ پر تفصیلی روشنی ڈالنے کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ہمارے عوام اس کی حقیقت سے بہت ہی کم واقف ہیں اور فارقلیط صاحب کا مضمون پڑھکر انھیں یہ باور کرنے میں تأمل نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی واہیاتی اور اساطیری قسم کا عقیدہ ہے جو بعض اور غلط عقائد کی طرح مسلمانوں میں گھس آیا ہے۔

فارقلیط صاحب نے رقم فرمایا ہے:-

"یہ قرآن کی نص قطعی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ پہلے گذر چکے اور ان کے بعد سب سے آخر میں اسلام کے پیغمبر آئیں گے

اگر بقول علمائے اہلِ سنت حضرت عیسیٰؑ حضورؐ کے
بعد آئے تو خاتم النبیین کا تاج ان کے سر پر رکھا
جائے گا اور آنحضرت صلعم کی ختم نبوت کا عقیدہ
غلط ہو جائے گا پس جو شخص بھی حضرت مسیح کو آنحضرتؐ
کے بعد لاتا ہے وہ ختم نبوت کا منکر ہے۔ اگر قادیانی
اس لئے کافر ہیں کہ وہ آنحضرت کے بعد مرزا صاحب
قادیانی کو مسیح موعود اور نبی مانتے ہیں تو ہمارے
علماء بھی کافر قرار پائے کیونکہ وہ بھی حضرت عیسیٰؑ
کو لاکر ختم نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ یہ علماء
حضرت مسیح کو لاکر انھیں نبی بھی مانتے ہیں اور
ان کو صاحبِ وحی بھی مانتے ہیں اور حضرت جبریلؑ کو
وحی لانے والا بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان علماء نے
خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک حقیقی
نبی کو واپس لاکر نبوت کا سارا کاروبار جاری
کردیا۔ پھر بھی وہ ختم نبوت کے منکر نہیں اور
قادیانی ختم نبوت کے منکر قرار پائے۔"

سب سے پہلے جو دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ جن
علماءِ اہلِ سنت پر ہمارے بزرگ اس قدر بگڑ رہے ہیں
ان سے مراد کون لوگ ہیں۔ ان کا مضمون پڑھنے والے
عام قارئین تو کم علمی کے باعث لازماً یہی سمجھے ہوں گے کہ
ہمارے آج کے زمانے میں جو علماء موجود ہیں بس انھوں نے
ہی نزولِ مسیح کا عقیدہ گھڑا ہوگا اور فارقلیط صاحب ان ہی
پر تیر ہو رہے ہیں لیکن حقیقت کیا ہے یہ ہم سے سنئے۔ دورِ
رسالت سے لیکر آج تک کے ہزاروں ہزار محدثین، مفسرین،
مجتہدین، علماء و صلحاء، تابعین اور صحابہؓ وغیرہ سب کے
نزدیک یہ عقیدہ ایک مسلم عقیدہ رہا ہے۔ ماضی کے جن
علماءِ حق اور ائمہ و فقہاء پر امت اعتماد رکھتی ہے ان میں
سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس نے اس عقیدے سے انحراف
کیا ہو اور انحراف کر بھی کیسے سکتا تھا جب کہ یہ عقیدہ تقریباً
ستر احادیث سے بطور تواتر ثابت ہے اور بہت سے صحابہؓ
نے اسے بہ الفاظِ صریح روایت کیا ہے جس کی تفصیل آگے
رہی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ فارقلیط صاحب کے نزدیک ام
کے تمام اگلے پچھلے علماء ایک طرف عقل سے اس در
بے نیاز ہیں کہ نزولِ مسیح کا خلافِ قرآن عقیدہ رکھتے
دوسری طرف وہ بددین بھی ہیں کہ اپنے طور پر ا
عقیدہ گھڑ لیا ہے اور اس پر اصرار کئے چلے جا رہے
ہم نہیں سمجھتے کہ جو شخص اپنے تمام بزرگوں
بارے میں ایسی رائے رکھتا ہو وہ صحیح الدماغ کہلا
گا یا فاتر العقل۔ فارقلیط صاحب بتائیں کہ اگر یہی
کی رائے ہے تو پھر اپنا دین انھوں نے کہاں سے حا
کیا۔ ظاہر ہے قرآن و حدیث ان ہی علماء سے ہم تک
پہنچے ہیں اور اسلام کا پورا دفترِ اصول و عقائد ان
بزرگوں کی عرق ریزیوں سے مرتب ہوا ہے۔
بے عقل، غیر ذمہ دار اور بددین مان لئے جائیں
ہمارے پاؤں تلے کوئی زمین باقی رہ جاتی ہے۔ کاش ہمارے
محترم نے محسوس فرمایا ہوتا کہ ان کا جارحانہ علم کلام
کچھ قتلِ عام کرتا چلا گیا ہے۔

اس اقتباس میں بے علمی کا شاہکار یہ ہے کہ محتر
نے بلا تکلف علماء کی طرف یہ بات منسوب کر دی کہ وہ
صرف نزولِ مسیح کے قائل ہیں بلکہ اس کے بھی قا
ہیں کہ مسیح پر وحی نازل ہوگی اور یہ وحی حضرت جبری
لائیں گے۔ حیرت ہے کہ محترم نے اپنی معلومات کا ما
اور سرچشمہ کونسی لائبریری کو بنایا ہے۔ علمائے حق
جہاں نزولِ مسیح کا عقیدہ بیان کیا ہے وہیں یہ بھی
تشریح کر دی ہے کہ ان پر وحی نازل نہیں ہوگی۔ مثلاً
علامہ تفتازانی کی شہرۂ آفاق کتاب شرح عقائد
نسفی ملاحظہ کر لی جائے جو بنیادی عقائد شرعیہ کے
سلسلہ میں ایک معتبر ترین کتاب مانی جاتی ہے یا علا
آلوسی کی تفسیر روح المعانی جلد ۲۲ دیکھ لی جائے
متأخر تفاسیر میں جامع ترین تفسیر ہے۔

محترم نے مزید فرمایا:۔

"جو لوگ کسی پرانے یا نئے نبی کو لاتے ہیں وہ ختم نبوت کے منکر ہیں اور اپنے ہی فتوے کی رو سے کافر ہیں یعنی قادیانی اور علمائے اہل سنت ختم نبوت کو توڑنے میں شریک ہیں اور دونوں کا درجہ ایک ہے۔"

اس سے بھی یہی ظاہر ہوا کہ جس طرح قادیانی حضرات مرزا غلام احمد کو نبی مان کر کافر ہوئے اسی طرح فارقلیط صاحب کے نزدیک تمام اگلے پچھلے علماء اہل سنت نزول مسیح کا عقیدہ رکھ کر کافر ہوئے۔ کوئی حد ہے اس دراز نفسی کی!

آگے فرماتے ہیں:۔

"کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی دوبارہ آمد کے بارے میں بخاری و مسلم میں بہت سی احادیث آئی ہیں ان کا کیا کیا جائے گا؟ جواب صاف ہے کہ جو حدیث بھی قرآن کے خلاف ہوگی اسے راویوں کا جھوٹ سمجھا جائے گا اور ایسی حدیثوں کو رد کر دینا قرآن کی عظمت کے لئے ضروری ہوگا۔ خود محدثین نے یہ اصول تسلیم کیا ہے کہ قرآن کے خلاف جو بھی حدیث ہوگی وہ رد کر دی جائے گی۔"

گویا ہمارے فارقلیط صاحب نے اب تک بس اتنا ہی سنا ہے کہ صرف بخاری اور مسلم میں کچھ حدیثیں نزولِ مسیح کے بارے میں آگئی ہیں۔ حالانکہ اگر واقعہ یوں ہی ہوتا تب بھی دنیا جانتی ہے کہ یہ دونوں حدیث کی صحیح ترین کتابیں ہیں اور ان کی کسی بھی حدیث کو قوی فنی دلائل کے بغیر رد نہیں کیا جا سکتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ حدیثیں فقط ان دو ہی کتابوں میں نہیں آئی ہیں بلکہ حدیث کی جن چھ کتابوں کو صحاح ستہ (صحیح احادیث کی چھ کتابیں) کہا جاتا ہے ان سب میں اور ان کے علاوہ بہتیری مشہور کتب حدیث میں آئی ہیں۔ ہم جیسے معمولی طالب علم کی نگاہِ تحقیق ان احادیث کے سلسلہ میں جن کتابوں تک پہنچی ہے ان کے نام یہ ہیں:۔

(۱) بخاری (۲) مسلم (۳) ترمذی (۴) ابو داؤد (۵) ابن ماجہ (۶) نسائی (۷) مسند احمد ابن حنبل (۸) سنن سعید بن منصور (۹) کنز العمال (۱۰) مسند عبد بن حمید (۱۱) صحیح ابن حبان (۱۲) مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ (۱۳) صحیح ابن خزیمہ (۱۴) المستدرک للحاکم (۱۵) طحاوی شرح معانی الآثار (۱۶) مشکوٰۃ المصابیح (۱۷) طبرانی (معاجم ثلثہ) (۱۸) سراج المنیر شرح جامع صغیر (۱۹) شرح السنّۃ (للبغوی)

ان کے علاوہ بڑے بڑے علماء کی کتابوں میں یہ نقل ہوتی آئی ہیں جیسے امام بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات زرقانی کی شرح المواہب اللدنیہ سیوطی کی الدر المنثور وغیرہ

پھر یہ نہیں کہ ان کتابوں میں صرف ایک ایک حدیث آکر رہ گئی ہو بلکہ ہر ہر کتاب میں متعدد احادیث ملتی ہیں مثلاً بخاری میں تین (جلد اول ص۳۳۶ و ص۴۹۰) مسلم میں تین (جلد ۲ ص۳۶۶ و ص۳۹۳ و ص۴۰۳) مسند احمد ابن حنبل میں اکدم ۱۷ (جلد اول ص۳۳۶ و ص۳۷۵ جلد دوم ص۲۹ ص۲۱۶ ص۲۱۷ ص۲۹۸ ص۴۱۱ ص۴۳۷ ص۴۹۳ ص۴۹۴ جلد سوم ص۳۴۵ ص۳۶۸ ص۳۸۴۔ جلد چہارم ص۴۲۹ ص۱۸۱ ص۲۸۲۔ جلد پنجم ص۱۳)

اور یہ نہیں کہ یہ احادیث بس ایک دو صحابیوں نے بیان کی ہوں بلکہ ۲۷ صحابہؓ ان کے راوی ہیں جن کے نام یہ ہیں

(۱) حضرت عائشہ صدیقہؓ (۲) حضرت علیؓ (۳) حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ (۴) حضرت عبد اللہؓ ابن مسعودؓ (۵) حضرت عبد اللہؓ ابن عباسؓ (۶) حضرت حسنؓ بن علیؓ (۷) حضرت ابو ہریرہؓ (۸) حضرت ابو سعیدؓ (۹) حضرت انسؓ (۱۰) حضرت عمران بن حصینؓ (۱۱) حضرت حذیفہ بن الیمانؓ (۱۲) حضرت حذیفہ بن اُسید الغفاریؓ (۱۳) حضرت عبد اللہ بن مغفلؓ (۱۴) حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہؓ (۱۵) حضرت عروہ بن رُویمؓ (۱۶) حضرت کعبؓ (۱۷) حضرت ابن کیسانؓ (۱۸) حضرت سفینہؓ مولیٰ رسول اللہؐ (۱۹) حضرت ثوبانؓ

معاذ رسول اللہؓ (۲۰) حضرت سمرۃ بن جندبؓ (۲۱) حضرت جابر بن عبداللہؓ (۲۲) حضرت نواس بن سمعانؓ (۲۳) حضرت عثمان بن ابی العاصؓ (۲۴) حضرت ابو امامۃ الباہلیؓ (۲۵) حضرت اوس بن اوس الثقفیؓ (۲۶) حضرت امّ شریک بن ابیؓ (۲۷) حضرت مجمع بن جاریۃ الانصاریؓ

اگر ہمارے دانشور کتب متذکرہ بالا سے مقابلہ کرکے ہمارے حوالوں کی صحت اور عدم صحت کی جانچ کرنے پر قادر نہ ہوں تو ہم ان کی آسانی کیلئے مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کا نام لئے دیتے ہیں۔ اسمیں سورۂ احزاب کی تفسیر میں (جلد چہارم) مفسر نے ایک ضمیمہ شامل کیا ہے۔ اس ضمیمہ میں انھوں نے نزولِ عیسٰی سے متعلق ۱۴ صحابہ کی ۲۱ روایات اصل مع ترجمہ درج کر دی ہیں۔

یہ اصول بے شک محدثین نے طے کر دیا ہے کہ جو حدیث قرآن کے خلاف ہوگی اس کی یا تو مناسب تاویل کی جائے گی یا اسے چھوڑ دیا جائے گا لیکن یہ طے کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے کہ کہاں واقعتہً خلاف پایا جا رہا ہے اور کہاں ہماری کوتاہ نظری غلط طور پر خلاف محسوس کر رہی ہے۔ فار قلیط صاحب انصاف فرمائیں کہ اگر اعلیٰ درجے کی سائنس کی فلاں دو تھیوریوں میں سائنس کے ماہرین اور اساتذہ کوئی تضاد و اختلاف نہ سمجھتے ہوں لیکن ایک خوانچہ فروش یا جنرل مرچنٹ فقط بچوں کی سائنس کے چند سبق پڑھ کر یہ فیصلہ داغ دے کہ ان دو تھیوریوں کے درمیان اختلاف ہے تو دنیا میں کون ہوشمند ہے جو اس فیصلے کو قابلِ اعتناء سمجھے گا۔ ٹھیک اسی طرح کا مسئلہ یہاں بھی درپیش ہے۔ ایک طرف اعلیٰ درجے کے محدثین اور مفسرین و مجتہدین اور علوم دین کے ائمہ اور اساتذہ بارہ سو برسوں تک اس خیال پر جمے رہے ہیں کہ ختم نبوت اور نزولِ مسیح کے عقیدوں میں ہرگز کوئی تضاد و تخالف نہیں دوسری طرف چودھویں صدی ہجری کے چند ایسے دانشور جنکی بات بات سے جہل اور کج فکری نمایاں۔ بڑے طمطراق سے کہہ رہے ہیں کہ ان دونوں عقیدوں میں تضاد ہے۔ ساری حدیثیں جھوٹی ہیں۔ علماء دل سے گھڑ کر لائے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ دنیا کون آدمی ذہنی توازن کھوئے بغیر یہ تصور کر سکتا کہ ساری امت جھوٹی اور نام نہاد دانشور سچے۔

ہم ابھی آگے چل کر دلائل کے ساتھ بتائیں گے نزولِ مسیح کے عقیدے کا خلافِ قرآن ہونا تو کیا قرآن بجائے خود تقاضا کر رہا ہے کہ قیامت سے قبل حضرت مسیح نازل ہوں مگر ابھی ہم فار قلیط صاحب کی عبارات نقل کرکے ان کی علمی و تحقیقی حیثیت واضح کر منقولہ بالا عبارت کے متصل بعد وہ قرآن اور حدیث میں تخالف کی مثال بہ ایں طور پیش فرماتے ہیں:-

"اس کی مثال میں بخاری کی اس حدیث کو پیش کیا جا سکتا ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ بولے حالانکہ قرآن کریم اعلان کرتا ہے کہ انہ کان صدیقاً نبیا (حضرت ابراہیمؑ سچے نبی تھے) حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے بارے میں مذکور ہے کہ آپ نے حدیث کو رد کرکے قرآن کے اعلان کو تسلیم کیا اور فرمایا کہ بخاری کی حدیث میں جو راوی ہیں اگر ان کے جھوٹے ہونے سے خدا کے مقدس نبی حضرت ابراہیم سچے ثابت ہوں تو راویوں کو جھوٹا قرار دینا ضروری ہے کیونکہ مسلمان ایک نبی کی سچائی کو ماننے کے لئے ہزار راویوں کو جھوٹا قرار دے سکتے ہیں۔ نبی کو جھوٹا کہنا ایمان کے منافی ہے مگر راویوں کو جھوٹا کہنا ایمان میں کوئی ضعف پیدا نہیں کرتا۔"

فار قلیط صاحب کے دانشور بڑے عجیب و غریب ہیں تاریخی خبریں بیان کئے چلے جاتے ہیں مگر حوالہ کوئی نہیں دیتے۔ فلاں بات اگر ابو حنیفہ نے کہی ہے تو آخر کہ

[illegible]ہی ہے معلوم تو ہو۔ میلاد خوانوں کی طرح بس اتنا کہہ دینا [illegible]ہ "راوی کہتا ہے" دانشوری کی کونسی قسم نکلی ہے۔

[illegible]ہم پہلے حضرت ابراہیمؑ کے تین جھوٹ والی حدیث پر گفتگو کرلیں پھر منکشف کریں گے کہ امام ابوحنیفہؒ کی [illegible]رف قول کی نسبت کرکے دانشوروں نے کتنی دلچسپ [illegible]انشوری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

محترم فارقلیط صاحب! پہلے تو یہ سن لیجئے کہ یہ حدیث فقط بخاری ہی میں نہیں آئی بلکہ مسلم میں بھی آئی ہے۔ آپ اہلِ حدیث مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں [illegible]پ سے زیادہ کون اس بات کو جانتا ہوگا کہ قرآن کے [illegible]عد یہ دونوں کتابیں دنیا کی صحیح ترین کتابیں ہیں اور جس حدیث پر یہ دونوں متفق ہو جائیں اسے معتبر ترین قرار [illegible]یا جاتا ہے۔ نیز آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ امام بخاریؒ [illegible]ور امام مسلمؒ دونوں بزرگ کتنے محتاط، متقی، ذی علم، [illegible]ین دار اور فہیم و فرس تھے۔ آپ نے یہ بھی سنا ہوگا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و عقیدت امام بخاریؒ کے [illegible]لب میں اس قدر تھی کہ ہر حدیثِ رسولؐ کو صحیح بخاری میں درج کرنے سے قبل آپ غسل کرکے دو نفل ادا کرتے [illegible]ب قلم اٹھاتے۔ اس کام سے سولہ سال میں فارغ ہوئے پھر جب یہ ارادہ فرمایا کہ جمع کردہ حدیثوں کی ترتیب مضمون کے مطابق کرکے عنوانات (ترجمۃ الباب) قائم کئے جائیں تو رسول اللہؐ کے منبر اور قبر کے درمیان بیٹھ کر یہ کام اس طرح کیا کہ ہر ہر عنوان سے پہلے دو رکعت نفل پڑھتے پھر عنوان لکھتے۔

اسی طرح امام مسلم زہد و اتقاء میں معروف ہیں۔ ان کے اتباعِ سنت کا یہ عالم ہے کہ زندگی بھر کسی کو گالی نہیں دی۔ کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کسی کی غیبت نہیں کی۔ فنِ حدیث میں ان کا پایہ امام بخاریؒ سے کم نہیں۔ بہتیرے اہلِ علم ان کی صحیح مسلم کو بعض وجوہ سے بخاری پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔

ان اوصاف کا تذکرہ کرکے ہم یہ ثابت کرنا نہیں چاہتے کہ ان حضرات سے کسی قسم کی علمی و فکری غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ غلطیاں تو انسان کا مقدر ہیں۔ دونوں ہی حضرات سے بہتیری علمی و فکری خطائیں سرزد ہوئی ہیں مگر کیا یہ بھی تصور کیا جا سکتا ہے کہ انبیاء کی شان اور حدودِ احترام کو یہ دونوں جلیل القدر بزرگ آج کے دانشورانِ کرام کے مقابلے میں کم جانتے ہوں اور جو حدیثیں آج کے دانشوروں کو شانِ ابراہیمی کے سراسر خلاف محسوس ہو رہی ہوں ان کا خلاف ہونا انھیں محسوس نہ ہوا ہو؟

دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو آپ یہ کہیں کہ یہ دونوں بزرگ شانِ نبوت کے فہم سے عاری تھے یا یہ کہیں کہ مذکورہ حدیث کو شانِ نبوت کے خلاف سمجھنا دانشوروں کی غلط فہمی ہے۔

ایک سوال فارقلیط صاحب سے جواب چاہتا ہے۔

جس قرآن میں انہ کان صدیقاً نبیاً آیا ہے اسی قرآن میں یہ واقعہ بھی مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک دن موقعہ پاکر بہت سے بت توڑ ڈالے اور بس ایک بڑے بت کو سالم رہنے دیا۔ کفار نے آکر یہ دیکھا تو پوچھا کہ یہ حرکت کس نے کی۔ حضرت ابراہیمؑ نے جواباً یہ نہیں کہا کہ میں نے کی بلکہ یہ کہا بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ۔ (یہ اس بڑے بت کی حرکت ہے) سورۂ انبیاء۔ آیت ۶۳ پارہ ۱۷۔

صدق کہتے ہیں بیانِ مطابقِ واقعہ کو اور کذب اس کا مقابل ہے یعنی خلافِ واقعہ بیان۔ صداقت یہ تھی کہ بت حضرت ابراہیمؑ نے توڑے تھے۔ جواب میں موصوف نے خلافِ واقعہ بیان دیا۔ یہ اللہ بتا رہا ہے کسی مفسر کا بیان نہیں ہے۔ اور اس خلافِ واقعہ بیان پر لفظ کذب کا اطلاق کوئی امتی نہیں کر رہا ہے بلکہ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں۔

دانشور اگر یہ کہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے طنزاً کہا تھا ان کا مقصود کفار کی تحمیق و تجہیل تھی۔ وہ ان کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ تو ہم کہیں گے کہ مطمئن رہیے مفسرین و محدثین

بھی ایسا ہی کہتے اور سمجھتے ہیں۔ کوئی ایسا نہیں جس نے اسے اس برے مفہوم میں "جھوٹ" قرار دیا ہو جس میں یہ لفظ بہ زبانِ اُردو مستعمل ہے لیکن اس تاویل و تشریح سے بس یہی تو پتا چلتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خلافِ واقعہ بات کیوں کہی۔ یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ خلافِ واقعہ بات انھوں نے کہی ہی نہیں۔ جب کہی اور یقیناً کہی تو اس حدیثِ رسولؐ کو خلافِ قرآن کیسے ٹھیرا دیا گیا جس میں حضرت ابراہیم کی طرف خلاف واقعہ بات یعنی کذب کی نسبت کی گئی ہے۔ جن مفسرین نے اس پہلو پر زور دیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا مذکورہ جواب عام مفہوم میں جھوٹ نہیں تھا انھوں نے بھی یہ نہیں کہا کہ بخاری و مسلم والی حدیثیں غلط ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ ان حدیثوں میں حضرت ابراہیمؑ کے بعض اقوال کی ظاہری حیثیت کے اعتبار سے کذب کا لفظ آیا ہے اور حضرت ابراہیم کے درجۂ بلند کی نسبت سے ایسا کذب بھی چونکہ خلافِ اولیٰ تھا اس لئے حدیث میں اس کو "ذنب" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

امام رازیؒ جیسے بعض اکابر اگرچہ اس تفسیر کو راجح نہیں سمجھتے بلکہ ان کا خیال یہی ہے کہ ان حدیثوں کو صحیح ماننے سے بہتر یہ ہے کہ چند راوی جھوٹے قرار پا جائیں لیکن اس خیال کے مضمرات و عواقب پر غور کیا جائے تو یہ کمزور نظر آتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن میں بہتیرے انبیاء کی کسی نہ کسی زلّت (لغزش) کا ذکر موجود ہے۔ حتیٰ کہ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی بعض ایسے افعال کا ذکر موجود ہے جنھیں اللہ نے غیر پسندیدہ قرار دیا۔ اس کے باوجود اگر اس گروہِ مقدس کا معصوم عن الخطا اور برگزیدہ اور سچا ہونا مسلّم ہے تو وہ حدیثیں جن میں حضرت ابراہیمؑ کے تین کذبات کا ذکر آ گیا ہے (انہ کان صدیقاً نبیاً) کے خلاف کیسے کہی جا سکتی ہیں۔ خصوصاً جب صاف طور پر ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ کذبات ارادۂ گناہ سے خالی تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ بخاری و مسلم کی احادیث کو محض ایک وہم اور ذاتی مذاق کی بنا پر جھٹلا دیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں معاملہ کسی ایک متعین راوی کو جھوٹا قرار دینے کا نہیں بلکہ بارہ راوی پا اعتبار سے ساقط ہو جاتے ہیں۔ یہ بارہ راوی ایسے ہیں جن کے نام صرف ان ہی حدیثوں کی سند میں آئے ہوں بلکہ ان میں سے ہر ایک ایسا ہے جو بہت سی اور صحیح حدیثوں کی اسناد میں موجود ہے۔ ان تمام راویوں کو اسماء الرجال کے اساتذہ نے سچّا اور ثقہ قرار دیا ہے۔ ایسی صورت میں ان تمام حدیثوں کو ردّی کر دینا ہوگا جن کی سند میں ان کا کوئی راوی موجود ہو۔ اس طرح ہماری تحقیق کے مطابق سے کم سے کم ... ایسی حدیثیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جائیں جن کی صحت پر اہلِ علم کا اتفاق ہے اور جن سے کتنے احکامِ شرعی اخذ کئے گئے ہیں۔

بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ کسی حدیث کو اگر آپ اس دلیل سے غیر معتبر قرار دیتے ہیں کہ اس کی سند میں فلاں راوی ضعیف ہے تو اس سے قواعدِ فن میں کوئی خلل نہیں پڑتا کیونکہ راوی آپ نے متعین کر دیا ہے اور اس کے ضعف کا ثبوت بھی ظاہر ہے آپ اسماء الرجال کی کتابوں سے لائے ہوں گے۔ لیکن جب آپ راوی کا تعین کئے بغیر محض ایک خارجی اور قیاسی منطق کی بل پر کسی حدیث کو ردّی کر ڈالتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کی سند کا ہر ہر راوی مشتبہ ہو گیا۔ اب یہ کسی بھی حدیث کی سند میں آئے گا تو اسے غیر معتبر بنا دے گا۔

یہ محض ایک جذباتی اور ظاہر فریب بات ہے کہ ایک نبی کی سچائی کو ماننے کے لئے ہزاروں راویوں کو جھوٹا قرار دیا جا سکتا ہے۔ جھوٹے اور سچے ہر طرح کے راویوں کا حال کتبِ فن میں مندرج ہے۔ جن راویوں کو سچا قرار دیا گیا ہے اور بخاری و مسلم جیسے اساتذہ نے جن کی روایتیں لی ہیں ان میں ہزاروں تو کیا سیکڑوں بھی بلکہ دس پانچ بھی ایسے نہیں جنھیں اسلئے جھٹلانے کی نوبت آئے کہ وہ کسی نبی کی شان کے خلاف روایات بیان کر رہے ہیں۔ واہی روایات جن راویوں نے بیان کی ہیں انھیں تو اہلِ فن پہلے ہی اچھی طرح متعارف کرا

ہیں لہٰذا ایسی روایات کو رد کرنے کے لئے بخاری و مسلم
کے ثقہ راویوں کو جھوٹا قرار دینے کی نوبت کبھی نہیں آسکتی۔

اب ذرا سن لیجئے کہ فارقلیط صاحب نے امام ابو حنیفہؒ
کی طرف بلا سند جس قول کی نسبت کر ڈالی ہے اس کا
جغرافیہ کیا ہے۔ اس جغرافیہ کو اچھی طرح ذہن نشین
کرانے کے لئے ہم موصوف کی کچھ اور سطور نقل کرینگے
وہ فرماتے ہیں:-

"قرآن کے بعد احادیث کا جو سب سے پہلا مجموعہ
عہدِ اول کے مسلمانوں کے سامنے آیا وہ مؤطا
امام مالک کی شکل میں آج بھی موجود ہے اور
حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اسی
موطا امام مالک کو بخاری پر ترجیح دی ہے،
لیکن اس مجموعۂ احادیث میں موعود مسیح اور
نزولِ مسیح اور دجال کے بارے میں ایک بھی
حدیث منقول نہیں۔ حضرت امام مالکؒ کو حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرب زمانی حاصل
ہے اگر ان کو حضرت مسیح کی آمدِ ثانی کے بارے
میں کوئی ایک حدیث بھی نہ مل سکی تو بخاری اور
مسلم کو تین سو سال کے بعد وہ حدیثیں کہاں
سے مل گئیں جن میں ختمی مآب کی حدیث لانبی
بعدی (میرے بعد کوئی نبی) کو غلط ثابت
کرنے کے لئے حضرت عیسیٰؑ کی آمدِ ثانی اور ان
کی نبوت کا ذکر ہے۔ اگر حضرت مسیح کی آمدِ ثانی
سے متعلق ایک حدیث بھی مروی ہوتی تو کیا
امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اسے اپنے مجموعے میں درج
نہ کرتے انھیں تو کوئی ایسی حدیث نہیں پہنچی اور
بخاری اور مسلم کو ڈھائی تین سو سال بعد ایسی
حدیثوں کا انبار مل گیا؟"

ان سطور میں علم و تفقہ کے جو نوادرات ہیں انھیں ہم بعد
میں لیں گے۔ پہلے امام ابو حنیفہؒ کی طرف منسوب قول کا
لطیفہ دیکھ لیجئے۔ ان سطور میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا لب
لباب یہ ہے کہ امام مالکؒ کے زمانے تک تو نزولِ مسیح
کی کوئی بھی حدیث حقیقتہً پائی ہی نہیں جاتی تھی بعد ازاں
جب بخاری و مسلم کا زمانہ آیا تو ایسی حدیثیں گھڑ لی گئیں
اور اسی گھڑے گھڑائے انبار کو بخاری و مسلم نے سر آنکھوں
پر رکھ لیا۔ ہو سکتا ہے دانشوروں کا مافی الضمیر یہ ہو کہ
بخاری و مسلم بھی گھڑنے والوں میں شریک تھے یا یہ کہ گھڑا تو
اور لوگوں نے مگر یہ دونوں بزرگ سادہ لوحی کی بنا پر اس
جعل سازی کو نہیں سمجھ سکے اور بڑے ذوق و شوق سے
اس من گھڑت مواد کو اپنی صحیحین میں داخل کر لیا۔

جو بھی مافی الضمیر ہو وہ جانیں یا ان کا اللہ۔ بہر حال
یہ دعویٰ وہ ضرور کر رہے ہیں کہ عہدِ امام مالکؒ تک نزولِ
مسیح کی حدیثوں کا وجود نہ تھا۔ اب تاریخی حقائق ملاحظہ
فرمائیے۔ امام مالکؒ سنہ ۹۳ھ یا سنہ ۹۵ھ میں پیدا ہوئے
اور وفات سنہ ۱۷۳ھ میں پائی۔ امام ابو حنیفہؒ سنہ ۸۰ھ میں
پیدا ہوئے اور سنہ ۱۵۰ھ میں دنیا سے چل بسے۔ گویا ابو حنیفہؒ
کا انتقال امام مالکؒ سے بھی ۲۳ سال پہلے ہو چکا۔

ادھر امام بخاریؒ سنہ ۱۹۴ھ میں پیدا ہوتے ہیں اور
سنہ ۲۵۶ھ میں انتقال فرماتے ہیں۔ گویا امام بخاریؒ اس وقت
پیدا ہوئے جب امام ابو حنیفہؒ کو رحلت فرمائے ہوئے
۴۴ سال گذر چکے تھے اور اپنی کتاب صحیح بخاری کو انھوں
نے ابو حنیفہؒ کی موت سے تقریباً ستر سال بعد مدون
فرمایا۔

یہ ہے وہ تاریخی صورتِ حال جس سے کسی کو مجالِ
انکار نہیں ہو سکتی۔ اب ذرا فارقلیط صاحب کے ارشادِ
گرامی پر پھر سے نظر ڈال کر آنکھیں حیرت سے ملی جائیں کہ
امام ابو حنیفہؒ کے منہ میں موصوف نے کیسا شاندار فقرہ
ڈالا ہے۔ یعنی ابھی صحیح بخاری کا وجود کیا ہوتا اسکے مصنف
امام بخاریؒ کی پیدائش میں بھی چالیس سال سے زیادہ
باقی ہیں لیکن امام ابو حنیفہؒ فرما رہے ہیں کہ:-

"بخاری کی حدیث میں جو راوی ہیں اگر ان کے

جھوٹے ہونے سے خدا کے مقدس نبی حضرت ابراہیمؑ سچے ثابت ہوں تو راویوں کو جھوٹا قرار دینا ضروری ہے۔"

ہے کوئی جو اس عجوبے کی برابری کا عجوبہ دکھلاسکے۔

تفنن برطرف۔ عموماً ایسے ہی مضحکہ خیز کارنامے سامنے آتے ہیں جب کسی علم و فن سے بے بہرہ حضرات محض اپنے زعم دانشوری میں لاف و گزاف شروع کر دیتے ہیں۔

اب دوسرے پہلوؤں کی طرف آئیے :۔

یہ تو دانشوروں نے کسی سے سن لیا کہ شاہ ولی اللہؒ نے مؤطا امام مالک کو بخاری پر ترجیح دی ہے لیکن یہ توفیق نہیں ہوئی کہ ان ہی شاہ ولی اللہؒ نے اپنی مسوّیٰ میں لعد کیا لکھا ہے یہ بھی دیکھ لیں۔

امام مالکؒ کی مؤطا بخاری و مسلم سے زمانے کے اعتبار سے یقیناً متقدم ہے لیکن اول تو یہ بات معقول نہیں کہ اگر حضرت شاہ ولی اللہ اور بعض اور اکابر اسے بخاری سے زیادہ معتبر سمجھتے ہوں تو ان محققین کی رائے نظر انداز کر دی جائے جو اسے مسلم اور ترمذی سے بعد کا درجہ دیتے ہیں۔

دوسرے اس کا اتنا زیادہ معتبر ہونا دراصل بخاریؒ مسلم جیسے بعد کے ثقہ محدثین ہی کی تصدیق و توثیق کا نتیجہ ہے ورنہ فی نفسہٖ باعتبار فنِ حدیث مؤطا ان کتابوں میں شامل ہے ہی نہیں جنھیں جمہور امت صحاح ستہ کا نام دیتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ صحاح ستہ نام ہے بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ کا۔ مؤطا ان میں نہیں۔

کیوں نہیں۔ یہ تفصیل بھی دانشوروں کو شاہ ولی اللہ کی مسوّیٰ سے معلوم ہو جاتی۔ مؤطا میں کُل ۱۷۲۰ حدیثیں ہیں۔ ان میں مسند و مرفوع احادیث صرف چھ سو ہیں۔ باقی تمام یا تو مراسیل ہیں یا موقوفات یا بلاغات یا تابعین کے اقوال و فتاوی۔[۵۱]

[۵۱] مسوّیٰ کے بعض نسخوں میں ہر ہر قسم کے پورے اعداد و شمار دیئے گئے ہیں

دانشور صاحبان مذکورہ اصطلاحات کی تفصیل بھی سمجھ لیں۔

مراسیل جمع ہے مُرسَل کی۔ حدیثِ مرسل وہ ہے جس کی سند میں اُس صحابی کا نام نہ ذکر کیا گیا ہو جس نے رسول اللہؐ کا کوئی قول یا فعل روایت کیا۔

موقوف حدیث اُس کو کہتے ہیں جس میں صحابی کے اپنے کسی قول و فعل کا ذکر ہو۔ یہ وضاحت نہ ہو کہ وہ صحابی رسول اللہؐ کا ارشاد یا عمل یا حکم بیان کر رہے ہیں۔

یہ دونوں قسمیں حدیثِ صحیح کی تعریف سے خارج ہیں کیونکہ حدیثِ صحیح کی تعریف یہ ہے کہ جس کی پوری سند اول سے آخر تک متصل ہو یعنی کوئی راوی درمیان سے یا شروع آخر سے کم نہ ہو اور رسول اللہؐ کا قول و فعل صحابی کی زبان سے بیان ہو رہا ہو۔ اور اس کے تمام راوی عادل و ضابط ہوں اور کوئی شذوذ یا علت اس میں موجود نہ ہو۔

شذوذ یا علۃ کی تفصیل میں جانا یہاں بے محل ہوگا۔

آپ نے دیکھا کہ مُرسل میں سرے سے اُس صحابی ہی کا ذکر نہیں ہوتا جس سے حدیث چلی ہے اور موقوف میں یہ صراحت نہیں ہوتی کہ یہ حدیثِ رسول ہے لہٰذا ان دونوں کو اساتذۂ فن نے صحت کے زمرے سے ہٹا کر حدیثِ ضعیف کے خانے میں رکھا ہے۔

جب فنی صورتِ حال یہ ہے تو آپ سے آپ ظاہر ہوگیا کہ وہ مؤطا امام مالکؒ خالص فنی اعتبار سے صحیح احادیث کا مجموعہ نہیں کہلا سکتی جس میں دو تہائی کے قریب غیر صحیح روایات جمع ہوں۔ پھر کس لئے وہ بہت معتبر مانی جاتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعد کے کتنے ہی ثقہ محدثین جیسے بخاری و مسلم

---

۶ ہیں لیکن غالباً کتابت کی غلطی سے ان میں گڑبڑ ہوگئی۔ ان کا مجموعہ بجائے ۱۷۲۰ کے ۱۸۰۸ بن جاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ بعض اور مصنفین نے ان اعداد کو جوں کا توں نقل کر لیا اور جوڑ کر نہیں دیکھا کہ مجموعہ اصل تعداد سے بقدر ۸۸ بڑھ جاتا ہے۔

وغیرہ نے اپنے ذرائع سے یہ تصدیق کر دی ہے کہ مؤطا کے مراسیل
اور موقوفات وغیرہ فی الحقیقت قابلِ اعتبار ہیں۔
ان محدثین نے اپنی تحقیق کی روشنی میں ان مراسیل و
موقوفات کو مرفوع و متصل صحیح سندوں سے بیان کیا
اور دنیا کو معلوم ہوا کہ منضبط شدہ فنِ حدیث کے
اعتبار سے مؤطا "صحیح" نہ ہوتے ہوئے بھی عمدہ اور
مستند احادیث کا مجموعہ ہے۔

اب اہلِ انصاف فیصلہ فرمائیں کہ اگر دانشوروں
کے زعم کے مطابق بخاری مسلم اور وہ تمام محدثین جن
کی کتابوں کے نام ہم پیچھے دے آئے ہیں ایسے ہی کم
عقل یا سادہ لوح یا مختل تھے کہ بڑے اطمینان سے
موضوع و طبع زاد احادیث کو صحیح احادیث کے طور پر
بیان کرتے چلے گئے تو اس مؤطا امام مالک ہی کا کیا
اعتبار رہ جاتا ہے جس کی ثقاہت کا مدار ان ہی محدثین
کی توثیق و تصدیق پر ہے۔ یہ محدثین اگر مؤطا کے مراسیل
موقوفات کی ماہرانہ جانچ کے بعد مہرِ تصدیق ثبت نہ
کرتے تو ہمارے فرشتے بھی نہیں جان سکتے تھے کہ مؤطا
کی روایات قابلِ اعتماد ہیں۔ دانشورانِ کرام اسی شاخ
کو کاٹ گئے ہیں جن پر انھوں نے آشیانہ بنایا تھا۔
کیا معقولیت ہو سکتی ہے کہ اگر بخاری و مسلم کو بھی من
گھڑت اور صحیح احادیث میں تمیز نہ ہو تو ان کی تصدیق پر
امام مالک کی وہ روایات صحیح مان لی جائیں جنکی سند
ناقص ہے۔ اس فنی نقص کو اسی یقین نے تو دور کیا ہے
کہ بخاری و مسلم ماہرِ فن تھے۔ حدیث کی جانچ پرکھ کا سلیقہ
رکھتے تھے۔ وہ جن روایات کی تصدیق کریں وہ قابلِ
اعتماد ہی ہوں گی۔

مؤطا امام مالک میں نزولِ مسیح کی احادیث کا نہ
پایا جانا سارے ہی محدثوں کو ملزموں کے کٹھہرے میں
پہنچا دے یہ عجیب و غریب منطق ہے۔ کیا واقعی دانشوروں
نے یہ معیار قائم کیا ہے کہ دوسری تمام کتبِ احادیث کی
صرف وہ روایات صحیح مانی جائیں گی جنھیں مؤطا میں
بھی درج کیا گیا ہو۔ باقی کو چھوڑ دیا جائے گا۔ اگر معیار
قائم کیا ہے تو انھیں معلوم ہونا چاہئیے کہ ان بے شمار دینی
احکام و ہدایات اور اخبار و اطلاعات سے وہ محروم
ہو جائیں گے جن کا شمار علومِ دین میں ہوتا ہے۔ ہزاروں
صحیح احادیث ردّی کرنی ہوں گی۔

اچھا فارقلیط صاحب ایک بات بتائیں۔ قرآن
سے بڑھ کر تو کوئی کتاب معتبر نہیں؟ اس میں کہیں یہ
نہیں آیا کہ نماز روزانہ پانچ وقت فرض ہے نہ یہ آیا کہ مغرب
میں تین اور عشاء میں چار رکعات پڑھو۔ نہ یہ آیا کہ
زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے۔ نہ یہ آیا کہ جمعہ کے دن ظہر کے
وقت میں بجائے چار کے دو رکعات پڑھنی چاہئیں۔ نہ
یہ آیا کہ شبِ معراج میں رسول کریم ﷺ نے سات آسمانوں
کا سفر کیا تھا۔ اور اسی طرح کی بہترین باتیں ہیں جو مسلمات
دین میں شامل ہیں مگر ان کو قرآن نے بیان نہیں کیا بلکہ
ان پر ایمان قرآن سے کمتر درجے کی کتابوں نے دیا۔
مؤطا امام مالک کو آپ کوئی بھی درجہ دیں۔ اس میں کسی
حدیث کا نہ آنا اگر اس حدیث کو رد کرنے کیلئے کافی
ہے تو اسی منطق سے آپ ان تمام عقائد و احکام کو کیوں
رد نہیں کر دیتے جن کا اندراج قرآن میں نہیں ہوا۔ آپ
کا استدلال اس سلسلہ میں یہ ہے:-

> "اگر اسلام کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی
> دوبارہ آمد ایمانیات میں داخل ہوتی اور اسے
> مدارِ نجات قرار دیا جاتا تو قرآن کریم ضرور اس
> عقیدے کا ذکر صراحت کے ساتھ کرتا کیونکہ
> قرآن کا دعویٰ ہے کہ ہدایت کی تمام باتیں اس
> میں آگئی ہیں ان علینا للھدیٰ (ہدایت کا
> راستہ بتانا صرف ہمارا کام ہے) مگر قرآن کریم
> میں حضرت مسیح کی دوبارہ آمد کا کہیں ذکر نہیں،
> اس لئے یہ سمجھنا درست ہوگا کہ کسی نبی کا دوبارہ
> آنا اور وہ بھی خاتم المرسلین کے بعد قطعاً غیر قرآنی

ہے۔ قرآن کریم کی بعض آیات سے کھینچ تان کر
کچھ نکالنا ایمان اور عقیدے سے کچھ تعلق نہیں
رکھتا۔"

اس مسئلہ پر تو تبادلۂ خیال ہم آگے کریں گے کہ قرآن سے کھینچ تان آپ کر رہے ہیں یا علمائے اہلِ سنت۔ یہاں عرض یہ ہے کہ آپ کا یہ علم کلام بالکل غلام احمد پرویز اور دیگر منکرینِ حدیث کا علم کلام ہے جنھوں نے دینی احکام سے جان چھڑانے اور ایک خانہ زاد اپٹوڈیٹ اسلام تیار کرنے کی خاطر احادیث کے حجت ہونے کا انکار کر دیا ہے حالانکہ حدیث کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو وہ نماز تک نہیں پڑھی جا سکتی جو اسلام کی اہم ترین نشانی ہے۔ کیا آپ پانچ وقت کی نماز فرض نہیں مانتے۔ کیا آپ کا اس پر ایمان نہیں ہے کہ جمعہ کی دو رکعتیں فرض ہیں؟ اگر ہے تو کیوں جبکہ قرآن نے اس کی صراحت نہیں کی۔

کیا قرآن ہی نے یہ حکم نہیں دیا کہ اے ایمان والو جس بات سے رسول روکے اس سے رک جاؤ اور جس بات کا حکم دے اسے بجا لاؤ۔ اگر صرف قرآنی صراحتوں ہی کا نام تمام دین ہوتا اور جملہ عقائد کا انحصار قرآن ہی کی تصریحات میں منحصر ہوتا پھر تو اللہ کا یہ حکم بے کار ہی رہا۔ پھر تو اللہ کو بس یہی کہنا چاہئے تھا کہ ہر امر و نہی قرآن میں درج ہے۔ رسول کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نے تمھیں قرآن پہنچا دیا۔ جو کچھ قرآن میں پاؤ اسے ہی کافی سمجھو۔ زائد کی ضرورت نہیں۔

بات مؤطا کی چل رہی تھی۔ مؤطا میں اگر فلاں فلاں موضوع کی حدیث نہیں آئی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ امام مالکؒ نے اپنی ساری زندگی مدینے میں گذار دی اور وہ مسلمان جن کے پاس احادیثِ رسولؐ کا سرمایہ تھا صرف مدینے میں محدود نہیں رہے تھے بلکہ دوسرے شہروں میں پھیل گئے تھے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ کسی ایک یا چند افراد کے پاس تمام احادیث موجود نہیں تھیں۔ کسی کے پاس کچھ ہیں کسی کے پاس کچھ ہیں۔ یہ سرمایہ ابھی بٹا ہوا تھا۔ کتابیں تو بعد میں مرتب ہوئی ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ اُس وقت کے اہلِ مدینہ کے پاس سارے ہی موضوعات کی حدیثیں موجود ہوں اور کیا ضروری ہے کہ اگر موجود بھی ہوں تو امام مالکؒ تک وہ لازماً پہنچیں اور کیا ضروری ہے کہ اگر پہنچیں بھی تو موصوف کو ایسے وسائل لازماً میسر رہے ہوں جن کے ذریعہ وہ ہر راوی کے پوست کندہ حالات سے واقف ہو سکیں۔ ایک شخص ان سے مثلاً نزولِ مسیح کی روایت بیان کرتا ہے۔ وہ اسے نہیں جانتے لہٰذا بھروسہ نہیں کرتے۔

علاوہ ازیں یہ بھی دانشوروں کو معلوم ہونا چاہئے کہ مؤطا میں اصلاً دس ہزار حدیثیں امام مالکؒ نے جمع کی تھیں۔ پھر بعد میں دو ہزار سے کم ہی رہنے دیں باقی کو قلمزد کر دیا۔ کیا بعید ہے کہ ان آٹھ ہزار سے زیادہ قلمزد کردہ روایتوں میں نزولِ مسیح کی روایات بھی ہوں اور امام مالکؒ کو ان کی صحت میں شبہ ہو گیا ہو۔ شبہ ہو جانے کا لازمی مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ واقعتہً وہ حدیثیں من گھڑت تھیں۔

ایک اور بات بھی قابلِ لحاظ ہے۔ مؤطا امام مالکؒ کے سولہ مختلف نسخے ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ کی تصریح کے مطابق تقریباً ایک ہزار آدمیوں نے مؤطا کو امام مالکؒ سے سن کر جمع کیا۔ شاہ عبدالعزیزؒ بستان المحدثین میں یہ صراحت کرتے ہیں کہ بہتیری احادیث ایسی ہیں جو بعض نسخوں میں ہیں اور بعض میں نہیں۔ کتنی ہی ایسی ہیں جو صرف ایک ہی نسخے میں ہیں بقایا میں نہیں۔ اب یہ نسخے اکثر و بیشتر ناپید ہو چکے محض چند پائے جاتے ہیں اور وہ بھی خال خال۔ ہمارے ہند میں تو ایک ہی نسخہ متداول ہے لہٰذا پورے وثوق سے یہ دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ نزولِ مسیح کے بارے میں امام مالکؒ نے کوئی روایت بیان ہی نہ کی ہوگی۔ احتمال بہرحال موجود ہے لہٰذا دعوے کی بنیاد ہی ہل جاتی ہے۔

فارقلیط صاحب اگر اجازت دیں تو ایک خاص علمی نکتہ بھی ہم یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں اس پر غور و فکر شاید مفید ہو۔ امام مالکؒ کے بہت سے اساتذہ اور شیوخ ہیں۔ ان میں ایک بزرگ ہیں محمد بن شہاب الزہریؒ۔ جو حضرات علم حدیث اور فنِ اسماء الرجال سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں ان کے لئے تو یہ نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ لیکن بھلا ہمارے دانشوروں کو ایسے علوم و فنون سے کیا ایسی دلچسپی ہوگی لہٰذا مختصراً ہم انھیں بتادیں کہ یہ امام زہری ان ممتاز تابعین میں ہیں جو حدیث و روایت کا منبع و مخزن تسلیم کئے گئے ہیں۔ حضرت سعید بن المسیب جیسے مشہورِ زمانہ تابعی کے بعد اگر کسی کا درجہ ہے تو امام زہری ہی کا ہے۔ ائمۂ فن کی گواہی ان کے بارے میں یہ ہے کہ ان کے زمانے میں حدیث کے متن اور سند کا حافظ ان سے بڑھ کر کوئی نہیں تھا۔ انھوں نے متعدد صحابہ کو دیکھا اور ان سے روایت کی سعادت بھی ان کے حصہ میں آئی۔ ان کی عظمتِ علمی کتنی مسلم تھی اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ امام ابوحنیفہؒ، امام ابن جُریجؒ، امام سفیان بن عُیینہؒ، امام اوزاعیؒ، امام مالکؒ، امام لیثؒ اور اس سطح کے کتنے ہی اور محدثین ان کے شاگردوں میں تھے۔ بخاری، مسلم، مؤطا امام مالک اور ابوداؤد، ترمذی وغیرہ سبھی کتب حدیث میں ان کی روایت کردہ حدیثوں کی اتنی کثرت ہے کہ شمار مشکل۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنی بستان المحدثین میں مؤطا کے سولہ نسخوں کا ذکر کرتے ہوئے ہر ہر نسخے سے ایک ایک حدیث نقل کی ہے۔ ان میں ہی پانچ حدیثیں امام زہریؒ کی سند سے ہیں۔ غرض امام زہری بحیثیت اسناد حدیث کے مشہورِ زمانہ ہیں اور امام مالکؒ ان کے شاگردوں میں ممتاز تر تسلیم کئے گئے ہیں۔

اب توجہ فرمائیے کہ صحیح بخاری میں جو تین حدیثیں نزولِ عیسیٰؑ کی اطلاع دے رہی ہیں اور جن میں اللہ کا رسولؐ خدا کی قسم کھا کر بیان کر رہا ہے کہ قیامت سے پہلے عیسیٰؑ یقیناً نازل ہوکر رہیں گے وہ تینوں کی تینوں امام ابنِ شہاب زہری ہی سے مروی ہیں۔ اعلیٰ درجے کی سند۔ ایک ایک راوی سونے کی طرح کھرا۔ فارقلیط صاحب کے دانشوران کرام اگر اپنے آپ کو عقلِ کل تصور کرتے ہوئے دو تین بے شمار ثقہ راویوں کے علاوہ امام زہری کو بھی جھوٹا قرار دینے پر تل گئے ہیں تو اس سے قطع نظر کہ اس حرکتِ نازیبا کا نتیجہ احادیث کے اس پورے دفتر کو دریا برد کرنے کی شکل میں نکلے گا جس کی روایت امام زہری کے واسطے سے ہے سوال یہ ہے کہ پھر مؤطا امام مالک ہی کا اعتبار کہاں رہ جاتا ہے جب کہ دانشور صاحبان اسے کلیدی مقام عطا کر رہے ہیں۔ امام زہری اگر جھوٹے تھے تو ان کے شاگرد امام مالکؒ بھی ان روایات کی حد تک تو یقیناً ناقابلِ اعتبار ہی ٹھیرے جو انھوں نے امام زہری کی سند سے مؤطا میں پیش کی ہیں۔ لیکن فی الحقیقت امام مالکؒ کی ساری ہی روایات کا اعتبار جاتا رہا کیونکہ اگر امام مالکؒ کسی ایک جھوٹے کو سچا سمجھنے کی فریب خوردگی میں مبتلا ہو سکتے ہیں تو کیا بعید ہے کہ اور بھی کتنے ہی راوی ایسے ہوں جو فی الحقیقت جھوٹے ہوں مگر امام مالکؒ نے انھیں سچا سمجھ کر ان کی حدیثیں لے لی ہوں۔ کوئی وجہ نہیں کہ فریب خوردگی کا امکان بس امام زہری کی ذات تک محدود رہ جائے۔ سچے اور جھوٹے کی تمیز اگر ان کے معاملہ میں نہ ہو سکی تو دوسروں کے معاملے میں بھی دھوکا کھا جانے کا احتمال بلاشبہ موجود ہے۔

کوئی بھی ذی عقل سمجھ سکتا ہے کہ امام زہری کی سند سے آئی ہوئی بخاری کی تینوں روایات کو جھٹلا کر فارقلیط صاحب کے لئے مؤطا امام مالک کے گن گانے اور اسے حجت بنانے کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہ جاتی ہے

(جاری)

شب قدر کا مسئلہ • قضا ابن قیمی کے دو شعر • رجب کی ۲۷ • مشتبہ بنیادیں • سرکاری سود • قادیانی مسئلہ۔

تجلّی کی ڈاک

شب قدر کا مسئلہ

سوالؑ۔ از منظور انصاری۔ کامٹی۔

ان دنوں "شب برأت" کا مسئلہ زیر بحث ہے۔ اخبار دعوت سہ روزہ مورخہ ۲۲ ستمبر ۷۲ء، تفہیم القرآن جلد چہارم تفسیر سورۂ دخان' اور ماہنامہ تجلی ڈاک نمبر ستمبر ۷۱ء زیر مطالعہ ہے۔ ایک سائل کے جواب میں آپ نے جو کچھ رقم فرمایا ہے اس پر نظر پڑتے ہی مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ آپ کے قلم سے یہ کیسے نکل گیا:—

"شب قدر کا قطعی علم کسی کو نہیں۔ وہ سال کے کسی بھی مہینے اور دن میں ہو سکتی ہے۔"

جب کہ سائل نے اپنے سوال میں لکھا ہے:—

"شب قدر لیلۃ القدر کا فارسی ترجمہ ہے اور یہ رمضان المبارک کی ایک متبرک رات ہے جس کی فضیلت شب برأت سے کہیں زیادہ ہے۔"

اور سائل نے کوئی غلط بات نہیں لکھی ہے۔ خود قرآن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:—

"رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا۔"

پھر سورۂ دخان میں ہے:—

"قسم ہے اس کتاب کی۔ اسے ہم نے ایک مبارک رات میں نازل کیا۔" (سورۂ دخان۔ آیت ۲ و ۳)

اور سورۂ قدر میں فرمایا گیا:—

"اسے ہم نے لیلۃ القدر میں نازل فرمایا۔"

ظاہر ہوا کہ یہ رات رمضان المبارک کی کوئی رات ہے۔ پھر اس سلسلے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں کہ شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔

مولانا مودودی نے لیلۃ القدر کی تفسیر اور سورۂ دخان کی مذکورہ آیات کی تفسیر و تشریح میں بیان فرمایا ہے کہ یہ رات رمضان کی طاق راتوں میں سے کوئی رات ہے اور اکثر مفسرین اور علمائے کرام کا خیال ہے کہ یہ رمضان کی ستائیسویں شب ہے۔

براہِ کرم تجلی میں مفصل جواب سے شب برأت اور
شب قدر کی اصلیت سے آگاہ فرمائیں۔ نوازش
ہوگی۔ والسلام۔

جواب :-

ہمارے تذکرہ معروضے پر حیرت آپ کو اسلئے
ہوئی ہے کہ تفہیم القرآن کا مطالعہ کرکے آپ نے یہ تصور
فرمالیا کہ لیلۃ القدر کے مسئلہ کا ہر پہلو اور گوشہ آپ کے
علم میں آگیا حالانکہ امر واقعہ یہ نہیں ہے۔

ذیل کے فقرے تو آپ تفہیم القرآن تفسیر سورہ
قدر ہی میں دیکھ سکتے ہیں۔

"اب رہا یہ سوال کہ یہ کونسی رات تھی تو اس
میں اتنا اختلاف ہوا ہے کہ قریب قریب ۴۰
مختلف اقوال اس کے بارے میں ملتے ہیں،
لیکن علماء امت کی بڑی اکثریت یہ رائے
رکھتی ہے کہ رمضان کی آخری دس تاریخوں
میں سے کوئی ایک طاق رات شب قدر ہے"

اس سے دو باتیں صاف معلوم ہوئیں۔ ایک
یہ کہ جو متعدد احادیث صاحب تفہیم نے اس مقام پر
نقل کی ہیں وہی اس مسئلہ کا کوئی قطعی فیصلہ کردینے کے
لئے کافی نہیں کیونکہ اگر کافی وافی ہوتیں تو اتنے زیادہ
مختلف اقوال اس باب میں نہ پائے جاتے۔ دوسرے
یہ کہ شب قدر کا رمضان کے آخری عشرے میں ہونا
اگرچہ اکثر علماء کی رائے ہے مگر تمام علماء کی نہیں۔

ان دونوں باتوں کا ادراک کرلینے کے بعد آپ کو
خود سمجھ لینا چاہئیے تھا کہ مسئلہ اتنا سیدھا سادا اور دوٹوک
نہیں ہے اور کچھ اور اہم مواد بھی اس کے بارے میں
ضرور پایا جاتا ہے۔ صاحب تفہیم نے "قریب قریب چالیس"
کے الفاظ لکھے۔ اس قریب قریب کا مطلب یہی ہے کہ
چالیس کا عدد حتمی نہیں بلکہ شمار اس سے آگے بھی جاسکتا
ہے۔ چنانچہ بخاری کے شہرۂ آفاق شارح حافظ ابن حجرؒ
نے اسی مسئلے کے ذیل میں رقم فرمایا ہے کہ ہم نے تحقیق کی تو
پتا چلا کہ اس معاملے میں علماء کے چالیس سے زیادہ مذاہب
ہیں۔

صحیح مسلم کے مشہور شارح امام نوویؒ نے اگرچہ کوئی
عدد تو نہیں دیا لیکن بہتیرے اختلافات نام بنام ذکر
کردئیے ہیں (ملاحظہ ہو جلد اول باب فضل لیلۃ القدر)
ان مختصر صفحات میں اس کی گنجائش نہیں کہ ہم سارے
ہی اقوال نقل کریں مگر آپ کا تحیّر دور کرنے کے لئے ہم
اضافہ کا یہ قولِ مشہور ضرور نقل کریں گے کہ شب قدر
صرف رمضان میں منحصر نہیں بلکہ پورے سال کے کسی
بھی مہینے اور دن میں ہوسکتی ہے۔ صحابی رسول عبداللہ
بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے بعض
اکابر نے ایسا ہی نقل کیا۔ عکرمہؒ اور بعض تابعین بھی یہی رائے
رکھتے تھے۔ مشہور و معروف فقیہ ابن عابدین شامیؒ نے
البحر میں تاتارخانیہ سے یہ بات نقل کی۔

ان المشہور عن الامام (ای ابی حنیفۃ)
انھا تدور فی السنۃ کلھا قد تکون
فی رمضان وقد تکون فی غیرہ (امام
ابوحنیفہ کی یہ رائے مشہور ہے کہ شب قدر گردش
کناں رہتی ہے یعنی تمام کے تمام سال میں
کبھی رمضان میں آپڑتی ہے کبھی اور کسی مہینے
میں)

مشہور رئیس الطائفہ امام طریقت محی الدین ابن عربی
اپنی مشہور عالم کتاب فتوحات مکیہ میں لکھتے ہیں :-

"اختلف الناس فی لیلۃ القدر اعنی فی
زمانھا فمنھم من قال ھی فی السنۃ
کلھا تدور وبہ اقول فانی رأیتھا
فی شعبان وفی شھر ربیع وفی شھر
رمضان واکثر ما رأیتھا فی شھر
رمضان وفی العشر الاخر منہ ورأیتھا
فی العشر الاوسط من رمضان فی غیر لیلۃ

وتیرد فی الوتر منها فانا علیٰ یقین من انها تدور فی السنة فی وتر و شفع من الشهر" (لوگوں نے شبِ قدر کے بارے میں اختلاف کیا ہے یعنی اس بارے میں کہ وہ کب کس زمانے میں ہوا کرتی ہے۔ پس ان اختلاف کرنے والوں میں ایک فریق کی رائے یہ ہے کہ شب قدر پورے سال میں گھومتی پھرتی رہتی ہے اور میں بھی ایسا ہی کہتا ہوں۔ چنانچہ میں نے شب قدر کو شعبان میں بھی دیکھا ہے ماہ ربیع الاول میں بھی اور ماہِ رمضان میں بھی۔ ہاں زیادہ تر ماہِ رمضان میں دیکھا ہے، خصوصاً آخری عشرے میں۔ ویسے کبھی میں نے رمضان کے درمیانی عشرے میں بھی دیکھا ہے (یعنی دس اور بیس رمضان کے درمیان) یہی نہیں کہ طاق ہی رات میں دیکھا ہو جفت راتوں میں بھی دیکھا ہے۔ پس مجھے تو اس کا پورا یقین ہے کہ شب قدر پورے سال کی طاق اور جفت سب راتوں میں گردش کناں رہتی ہے"۔

اب غور فرمایا جائے۔ عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس اور ابوحنیفہ اور ابن عربی جیسے اساطین کے بارے میں یہ تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ان احادیث سے ناواقف ہوں گے جو لیلۃ القدر کے بارے میں آئی ہیں۔ یہ حضرات واقفیت کے باوجود اگر مذکورہ رائے رکھتے ہیں تو ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ احادیث لیلۃ القدر کی تحدید و تعیین میں صریح اور قطعی نہیں ہیں بلکہ متعدد مفاہیم اور تاویلات کی گنجائش ان میں ہے۔ اگر ان کا واحد مفہوم یہی ہوتا کہ لیلۃ القدر صرف رمضان ہی میں ہو سکتی ہے کسی اور مہینے میں نہیں تو یہ حضرات خلافِ حدیث رائے نہیں رکھ سکتے تھے۔

مزید قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ ابن عربی صرف اپنی رائے ہی کا اظہار نہیں فرما رہے ہیں بلکہ اپنا مشاہدہ بھی بیان کر رہے ہیں اور یہ مشاہدہ کشف و الہام کے قبیل سے نہیں ہے کہ اسے مشکوک و مشتبہ کہہ دیا جائے۔ یہ تو عینی مشاہدہ ہے۔ ابن عربی کے بعض خیالات و آراء سے کوئی اختلاف کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ بہرحال طے ہے کہ وہ ایک زبردست زاہد و عابد، متقی اور صالح بزرگ تھے انھیں جھوٹا کہنا حلال نہیں ہو سکتا۔ اپنے جس مشاہدے کا انھوں نے ذکر کیا اس کی تکذیب تو جھٹلانے ہی کے ہم معنی ہو گی جس کا کوئی جواز نہیں۔

یہ بھی معلوم ہے کہ علم اور عدمِ علم جب آمنے سامنے ہوں تو اعتبار علم کا ہو گا۔ زید کہتا ہے میں نے ایک ایسی مچھلی دیکھی جس کے ماتھے سے تیز روشنی خارج ہو رہی تھی۔ دس اور آدمی کہتے ہیں کہ ہم نے تو ایسی کوئی مچھلی نہیں دیکھی۔ طے ہے کہ ان دس آدمیوں کے قول سے زید کی تکذیب نہیں ہوتی اگر زید ثقہ اور معتبر آدمی ہے تو اس کی بات کو تسلیم کرنا ہی ہو گا۔

ٹھیک اسی طرح یہ معاملہ ہے کہ اگر ایک ہزار آدمی یہ کہیں کہ ہم نے رمضان کے علاوہ کبھی شب قدر نہیں دیکھی اور ابن عربی جیسا شیخ و امام خود اپنا بار بار کا مشاہدہ بیان کرتا ہے کہ میں نے اسے شعبان میں بھی دیکھا ہے اور ربیع میں بھی تو ابن عربی کی تصدیق کرنی ہو گی اور اس تصدیق کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ ایک ہزار آدمی جھٹلا دیئے گئے۔

آئیے ذرا استاذ الاساتذہ حضرت شاہ ولی اللہ کا ارشاد بھی دیکھیں۔ وہ مختلف اقوال کی تطبیق و توفیق مندرجہ ذیل طریقے سے کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا:-

"شب قدر دراصل دو ہیں۔ ایک وہ جس کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے یُفْرَقُ کُلُّ اَمْرٍ حَکِیْمٍ اور اسی شب میں پورا قرآن سماءِ اعلیٰ سے سماءِ دنیا پر نازل کیا گیا۔ پھر وہ نجماً نجماً اترتا رہا۔ یہ وہ شب قدر ہے جو پورے سال میں کسی بھی وقت ہو سکتی ہے رمضان ہی کی شرط

نہیں، ہاں زیادہ تر اس کا رمضان ہی میں ہونا متوقع ہے اور اس پر اتفاق ہے کہ جب قرآن نازل ہوا تو یہ ماہِ رمضان ہی میں ہوئی تھی۔

دوسری شب قدر وہ ہے جس میں خاص طور پر روحانیت کا پھیلاؤ ہوتا ہے اور فرشتے زمین کی طرف آتے ہیں۔ اس رات میں مسلمان عبادتیں کرتے ہیں تو ان پر انوار و تجلیات کا انعکاس ہوتا ہے، شیطان دور بھاگتا ہے اور فرشتے قریب آتے ہیں۔ دعائیں اور عبادتیں مقبول ہوتی ہیں۔ یہ وہ شب قدر ہے جو رمضان ہی کے آخری عشرے میں ہوتی ہے کبھی پہلے کبھی بعد میں (یعنی کبھی ۲۱ کو کبھی ۲۳ کو کبھی ۲۵ کو کبھی ۲۷ کو) یہ شب قدر آخری عشرۂ رمضان سے باہر نہیں جاتی۔ پس جن لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ شب قدر پورے سال میں گھومتی پھرتی ہے ان کا روئے سخن پہلی والی شب قدر کی طرف ہوگا اور جن لوگوں نے یہ کہا کہ وہ لازماً رمضان کے آخری ہی عشرے میں ہوتی ہے ان کا روئے سخن دوسری والی شبِ قدر کی طرف ہوگا" (فتح الملہم جلد اول صـ۱۹۴)

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی یہ تطبیق بہت دل لگتی ہے لیکن یہ بہرحال معلوم ہے کہ ابن عابدین یا قاضی خان یا ابوبکر الرازی نے جہاں حنفیہ یا امام ابو حنیفہ کا قول نقل کیا وہاں یہ تصریح نہیں کہ وہ شب قدر کو دو قرار دیکر ایک کے بارے میں یہ قول کرتے ہیں اسلئے ہم نے بھی ضروری نہیں سمجھا کہ اس قول کو اپنے طور پر نقل کرتے ہوئے اس قسم کی صراحت کریں۔ ہمارا پورا جواب (دسمبر ۷۳ء والا) پھر سے پڑھ لیجئے۔ اس میں شب قدر کی علمی و تحقیقی حیثیت کو ہم نے موضوع ہی نہیں بنایا بلکہ فقط ضمناً ایک فقرہ لکھا یا ورنہ ہمارا سارا زور اس بات پر ہے کہ ذیلی و فروعی مسائل میں نزاع و تکرار سے بچا جائے۔ تشدد سے دور بھاگا جائے زیادہ وقت نہ کھپایا جائے۔ ظاہر ہے کہ ضمناً لکھے فقرے میں ہم قولِ ابوحنیفہ ہی کی پیروی کرتے اور ہم نے اصلاً اسے ہم قولِ ابنِ مسعود اور قولِ ابن عباس بھی کہہ سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ابوحنیفہ یا کسی صحابی کی ہر رائے لازماً درست ہو لیکن ان کی آراء پر جرح کرنا بہت وسیع علم والے کر سکتے ہیں۔ ہم جیسے اناڑی کیا کریں گے جب کہ اپنی کم علمی اور کم دانشی ہی کی بنا پر ہم نے تقلید ابوحنیفہ کا دامن پکڑا ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں سید الطائفہ ابن عربیؒ نے بھی شب قدر کو دو قسموں پر منقسم نہیں کیا اور یہ نہیں کہا کہ ایک قسم کی شب قدر کو میں نے غیر رمضان میں بھی دیکھا ہے۔ وہ اور دیگر بے شمار علماء اور محققین اختلاف کی وہ تاویل نہیں کرتے جو شاہ ولی اللہؒ نے کی ہے۔ لہٰذا شاہ صاحب کی تاویل کو نفیس مانتے ہوئے بھی ہم نص کا درجہ نہیں دے سکتے اور ابوحنیفہ یا ابن مسعودؓ وغیرہ کے قول میں اپنی طرف سے تخصیص نہیں کر سکتے۔

آپ تفہیم القرآن تو دیکھ ہی رہے ہیں۔ صاحب تفہیم نے بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں کیا ہے کہ شبِ قدر دو ہیں سورۂ دخان کی تفسیر میں تو وہ صاف لکھتے ہیں کہ جس مبارک رات کا یہاں ذکر ہے وہ وہی ہے جس کا تذکرہ سورۂ قدر میں ہے۔ لیکن ابھی آپ شاہ ولی اللہ کے کلام میں ملاحظہ فرما چکے کہ ان کا خیال اس سے مختلف ہے۔ سورۂ دخان میں جو کہا گیا کہ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ (اس رات میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے) اسی کے بارے میں شاہ صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے جو رات مراد ہے وہ رمضان میں منحصر نہیں بلکہ پورے سال میں گھومتی پھرتی رہتی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ علم الحدیث میں شاہ ولی اللہ دیار ہند میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ درس حدیث کی تمام سندیں انھیں سے جا ملتی ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ حدیث و

قرآن سے بے بہرہ تھے۔ وہی اگر برملا یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ ایک شب قدر ایسی بھی ہے جو رمضان تک محدود نہیں تو ثابت ہو جاتا ہے کہ آیات و احادیث میں اس رائے کی گنجائش موجود ہے۔ پھر حبیب ابن مسعود اور ابن عباس اور عکرمہ اور ابو حنیفہ جیسے اکابر کا منقولہ بالا قول سامنے آتا ہے تو اور بھی یقینی ہو جاتا ہے کہ آیات و احادیث اس باب میں ایک سے زیادہ مفہوم کا احتمال رکھتی ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ اہل علم ان اکابر کی رائے کو مرجوح قرار دیں اور کوئی دوسری رائے پسند فرمائیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس رائے کو خلافِ قرآن و حدیث ٹھیرائیں۔

جس استدلال کو آپ نے حرفِ آخر تصور فرمایا ہے اس پر بھی مزید غور کی ضرورت ہے۔ آپ کا اور بے شمار حضرات کا استدلال یہ ہے کہ اللہ نے سورۂ بقرہ میں فرمایا "ہم نے ماہِ رمضان میں قرآن نازل کیا" پھر سورۂ قدر میں فرمایا کہ "قرآن ہم نے لیلۃ القدر میں نازل فرمایا"۔ اس سے ثابت ہوا کہ لیلۃ القدر رمضان ہی کی کوئی رات ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس بیان واقعہ سے آخر یہ قاعدہ کلیہ کیسے نکل آیا کہ لیلۃ القدر ہمیشہ ماہِ رمضان ہی میں ہوگی۔ آپ اول تو یہ دیکھیں کہ یہ آیات ہر اعتبار سے صریح نہیں ہیں۔ قرآن سب جانتے ہیں کہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتا رہا ہے۔ لہٰذا سورۂ بقرہ کی آیت متعدد معانی کی متحمل ہو گئی۔ ایک یہ کہ قرآن سے مراد آغازِ وحی ہو اور مراد یہ ہو کہ پہلی وحیِ قرآنی ماہِ رمضان میں بھیجی گئی۔ دوسرا یہ کہ رمضان میں پورے قرآن کو لوحِ محفوظ سے سماءِ اعلیٰ کی طرف منتقل کیا گیا۔ تیسرا یہ کہ پورا قرآن سماءِ اعلیٰ سے سماءِ دنیا پر ماہِ رمضان کی ایک مبارک رات میں اتار گیا ہو۔ یقین کے ساتھ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ آیت کا صحیح مصداق کیا ہے۔ پھر بھلا ایسی غامض آیت کو کسی امر ظاہر کے لئے دلیل قطعی کیسے بنایا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں مذکورہ دونوں آیات کو ملانے سے بس اتنا ثابت ہوتا ہے کہ قرآن جس رات میں نازل ہوا وہ شبِ قدر تھی اور ماہِ رمضان میں واقع ہوئی تھی۔ یہ ایسا ہی ایک واقعہ ہے جیسے آپ یوں کہیں کہ زید میرے گھر شوال کی ایک روشن رات میں آیا۔ اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ روشن رات صرف شوال ہی میں آ سکتی ہے کسی اور مہینے میں نہیں۔ اسی طرح استدلال بالا یہ ثابت نہیں کرتا کہ آئندہ ہمیشہ شب قدر رمضان ہی میں آیا کرے گی۔ یہ کوئی ہماری ذہنی اُپج نہیں بلکہ متعدد اکابر نے ایسا ہی کہا ہے اور درایت و منطق سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

رہیں وہ متعدد حدیثیں جن سے پتا چلتا ہے کہ شب قدر کو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کی ہدایت کی گئی ہے تو اسی کے ساتھ وہ حدیث بھی ملحوظ رہنی چاہئے جس میں اللہ کے رسول نے فرمایا ہے کہ مجھے شب قدر کا معین علم دیا گیا تھا مگر پھر بھلا دیا گیا۔[1] اس بھلانے کی حکمت عامہ علمائے کرام یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر تاریخ و مہینہ متعین ہو جاتا تو شب قدر کی تلاش میں کسی کو بھی جد و جہد نہ کرنی پڑتی۔ بحالت موجودہ جد و جہد ضروری ہو گئی۔ علماء کا یہ بیان حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری شرح بخاری میں ذکر کیا ہے اور دیگر متعدد اساتذہ نے بھی۔ اس حکمت کی جلوہ گری سب سے زیادہ اس صورت میں ہوتی ہے جب یہ مان لیا جائے کہ شب قدر سال کے سارے ہی مہینوں اور سارے ہی دنوں میں ہو سکتی ہے۔ دوسرے درجے میں یہ ہے کہ جفت راتوں کو خارج کر دیا جائے۔ اس طرح تلاش کا میدان صرف آدھا سال رہ جائیگا۔ تیسرے درجے میں یہ ہے کہ گیارہ مہینے خارج کر دئیے جائیں۔ اس طرح جستجو فقط ایک ماہِ رمضان میں محدود ہو کر رہ جائے گی چوتھی صورت یہ ہے کہ رمضان کی محض طاق راتیں خاص کر دی جائیں۔ اب گویا میدانِ تلاش آدھا ہی مہینہ رہ گیا۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ طاق و جفت کا فرق تو نہ کیا جائے مگر رمضان کے آخری عشرے کو مخصوص

---

[1] اُرِیتُ ھذہ اللیلۃ ثم اُنسیتُھا۔

کر دیا جائے۔ اس طرح جو وجہ ایک عشرہ میں منحصر ہوجاتی ہے۔ اور چھوٹی صورت وہی ہے جو شائع ذائع ہے یعنی آخری عشرۂ رمضان کی صرف پانچ طاق راتیں۔ اس میں تلاش و جستجو کا دائرہ بہت چھوٹا رہ گیا ہے۔

تفہیم القرآن کی نقل فرمودہ حدیثیں اگر یہ واضح کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ القدر کو آخری عشرۂ رمضان کی طاق راتوں میں تلاش کرنے کی ترغیب دی ہے تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نزولِ قرآن جس شب میں ہوا وہ یقینی طور پر آخری عشرۂ رمضان ہی کی کوئی طاق رات تھی۔ اسی لئے بہت زیادہ اغلب یہ ہوا کہ آئندہ بھی وہ اسی عشرے کی وتر راتوں میں واقع ہو۔ چنانچہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ابن عربی بھی یہی کہتے ہیں کہ زیادہ تر میں نے اس رات کو رمضان کے آخری ہی عشرے میں دیکھا ہے۔ حضورؐ بھی گمانِ غالب ہی کے تحت یہ امید رکھتے تھے کہ یہ رات رمضان کے آخری عشرے اور طاق راتوں میں آئے گی۔ علم یقین اس سلسلہ میں آپ کو بھی حاصل نہیں تھا جیسا کہ خود آپ نے اطلاع دی کہ مجھے شب قدر بتائی گئی تھی مگر پھر بھلادی گئی۔ ایسی کوئی حدیث نہیں جس میں آپ نے یہ فرمایا ہو کہ شب قدر کا یوم معین اگرچہ میں بھول چکا ہوں مگر بہرحال مجھے اللہ نے بتایا ہے کہ وہ رمضان کے آخری عشرے میں ہی ہوگی اس سے باہر نہیں ہوگی۔

اور شاہ ولی اللہ والی تاویل پیشِ نظر رکھی جائے تو ان بحثوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ پھر تو بات صاف ہوجائے گی کہ حضورؐ نے جس شبِ قدر کی تلاش کی ترغیب ماہِ رمضان کے آخری عشرے میں دی وہ اس شبِ قدر سے علیحدہ ہے جو پورے سال میں گردش کناں رہتی ہے۔

ایک اور باریک نکتہ یہاں ذکی و ذہین لوگوں کے لئے لائقِ التفات ہے۔ وہ یہ کہ ظاہراً تو بے شک یہی معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ دخان میں جس رات کا ذکر کیا گیا وہ وہی ہو جسے سورۂ قدر میں لیلۃ القدر کہا گیا ہے۔ چنانچہ صاحب تفہیم نے سورۂ دخان کی تفسیر میں یہی بات قطعیت کے ساتھ کہی بھی ہے اور بے شمار مفسرین بھی یہی کہہ گئے ہیں لیکن ابھی آپ نے دیکھا کہ شاہ ولی اللہؒ کی رائے اس سے مختلف ہے۔ وہ دونوں راتوں کو جدا جدا مانتے ہیں ان کے علاوہ شبیر احمد عثمانی رح کا تفسیری حاشیہ دیکھئے۔ سورۂ دخان میں مذکورہ الفاظ لیلۃٍ مبارکۃٍ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:-

"بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ
وہ شعبان کی پندرہویں رات ہے جسے
شبِ برأۃ کہتے ہیں۔"

ایسی روایات کا موجود ہونا ثابت کرتا ہے کہ جملہ اہلِ علم کے مابین یہ بات قطعی نہیں ہے کہ سورۂ دخان اور سورۂ قدر میں ایک ہی رات کا ذکر ہو — اول الذکر رات شعبان کی پندرہویں رات بھی ہوسکتی ہے جبکہ ثانی الذکر رات رمضان ہی سے مخصوص ہے وہ بھی اس کے آخری عشرہ سے طاق کی قید کے ساتھ۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تفہیم والے ان اقوال کی تاویل کیا کریں گے۔ قرآن نے بتایا کہ قرآن ماہِ رمضان میں نازل کیا گیا۔ دوسری جگہ بتایا کہ لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا۔ لہٰذا تیسری جگہ یہ فرمایا گیا کہ قرآن کو ہم نے ایک مبارک رات میں نازل کیا تو اس سے مراد وہی رات ہوسکتی ہے جس کا ذکر لیلۃ القدر کے لفظ سے سورۂ قدر میں آیا ہے۔

تاویل اس کی یہ ممکن ہے کہ ماہ رمضان میں قرآن نازل ہونے والی آیت کسی ایک مصداق پر قطعیت کے ساتھ دال نہیں ہے۔ ہم ذکر کرچکے کہ اس کے متعدد مصادیق ہوسکتے ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ سورۂ دخان میں تنزیل کا مصداق وہ نہ ہو جو سورۂ قدر میں ہے۔ فرض کیجئے سورۂ دخان میں تنزیل کا مصداق یہ ہو کہ لوحِ محفوظ سے نقل کرکے سماءِ اعلیٰ یا کسی بھی اور مقام پر

اتارا گیا تاکہ وہاں سے نجماً نجماً زمین پر نازل کیا جائے اور سورۂ قدر میں یہ ہو کہ قرآن کو اس شب میں سماءِ اعلیٰ سے سماءِ دنیا پر نازل کیا گیا، یا یہ کہ قرآن کی پہلی تنزیل بصورت وحی بذریعۂ جبرئیل رسول اللہ پر ماہِ رمضان میں ہوئی۔

اس طرح یہ دو الگ الگ باتیں بن جاتی ہیں۔ ایک بہت ہی لطیف قرینہ ان کے الگ الگ ہونے کا یہ بھی ہے کہ دخان میں لیلۃٍ مبارکۃٍ فرمایا گیا اور قدر میں لیلۃ القدر۔ معنًا ان دونوں الفاظ کو خواہ مترادف اور یکساں سمجھ لیا جائے لیکن حرفاً بہرحال الگ الگ ہیں ایک ہی شئے عظمت و شرف والی بھی ہو سکتی ہے اور خیر و برکت والی بھی لہٰذا اس امکان سے تو انکار نہیں کہ ایک ہی رات کو مذکورہ دو الفاظ میں بیان کیا گیا ہو لیکن اسی کے ساتھ یہ امکان بھی ہے کہ خاص طور پر "مبارک" کسی اور رات کو کہا گیا ہو اور عظمت و شرف والی کسی اور رات کو۔ مبارک اسی رات کو کہا گیا ہو جب قرآن لوح محفوظ سے منقول ہو کر کسی تحتانی مقام پر آیا اور عظمت و شرف والی اس رات کو جب وہ دنیا میں اترنا شروع ہوا۔

علاوہ اس کے خود تفہیم میں وضاحت موجود ہے کہ لیلۃ القدر کے لفظ قدر کو بعض مفسرین نے تقدیر کے معنی میں لیا ہے۔ اس رائے کے مطابق کچھ اور زیادہ قرینہ پیدا ہو جاتا ہے کہ مبارک رات کسی اور رات کو کہا گیا ہو اور لیلۃ القدر کسی اور رات کو۔

یہاں ہم تھوڑا سا اضافہ کریں گے۔ لفظ قَدْر سے متعلق اہلِ علم میں تین آراء پائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد عظمت و اکرام والی شب ہے۔ اس کی نظیر قرآن کی یہ آیت ہے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (الحج)

دوسری یہ کہ یہاں قدر ضیق اور تنگی کے معنی میں آیا ہے۔ قرآن میں اس کی نظیر یہ ہے وَقُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ (الفجر) یا وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ (الطلاق) مقصد یہ ہوگا کہ اس رات میں اس قدر فرشتے زمین پر اترتے ہیں کہ گویا دہ زمین تنگ ہو جاتی ہے۔

تیسری یہ کہ قدر یہاں قَدَر (بفتح دال) کے معنی میں ہے یعنی تقدیر اور مراد یہ ہے کہ اس رات میں اس پورے سال کے لئے اللہ تعالیٰ تقدیری احکام کو نفاذ و اجراء کے لئے متعلقہ فرشتوں کے سپرد کرتا ہے یا کوئی اور نامعلوم شکل اختیار فرماتا ہے۔ اس معنی کے لئے سورۂ دخان کی یہ آیت دلیل بنائی گئی فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ۔

جب لفظ قدر کے تین مفاہیم ممکن ہیں تو کیسے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہر مفہوم کے لحاظ سے یہ وہی رات قرار پائے گی جسے دخان میں لیل مبارک سے تعبیر کیا گیا۔ تنگی یا تقدیر کا مفہوم لے کر تو اسے برکت اور عدم برکت سے جوڑنا ہی مشکل ہے۔

بات اگرچہ پھیل گئی لیکن یہ پھیلاؤ ہر شخص کو یہ تو محسوس کرا ہی دے گا کہ شب قدر کا مسئلہ اتنا سادہ، متعین اور دو ٹوک نہیں کہ ایک عام آدمی کوئی ایک تفسیر دیکھ کر قطعی فیصلہ کر سکے۔ خصوصاً شاہ ولی اللہ اور ابن عربی کی تصریحا کے بعد اور دو صحابہ کے علاوہ امام ابو حنیفہ کے قول سے آگاہ ہو جانے کے بعد ہمارے اس فقرے پر حیرت و استعجاب کی کوئی معقول وجہ باقی نہیں رہ جاتی جس پر آپ متعجب ہوئے ہیں۔ آپ کے نزدیک اگر رائے وہی درست ہو جو تفہیم سے ظاہر ہے تو بشوق اسی پر قائم رہئے ہم اسے ترک کا مشورہ نہیں دیں گے۔ نیز جو رائے ہم نے ظاہر کی ہے اس پر بھی ہمیں کچھ زیادہ اصرار نہیں ہے کیونکہ خود امام ابوحنیفہ کی طرف ایک اور بھی رائے منسوب ہے اسے بھی سن لیجئے وہ یہ ہے کہ شب قدر رمضان ہی میں منحصر ہے لیکن اس کے کسی خاص حصے میں نہیں بلکہ پورے مہینے کی کوئی بھی رات ہو سکتی ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عبد اللہ بن عمر کی بھی یہی رائے تھی۔ حتیٰ کہ ایک حدیث مرفوعاً بھی ان سے مروی ہے۔ ابن المنذر اور محاملی اور بعض شافعیہ کی بھی یہی رائے ہے۔ شرح المنہاج میں علامہ سبکی نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ سروجی نے اپنی شرح الہدایۃ میں

امام ابوحنیفہ کی طرف یہ الفاظ منسوب کئے ہیں (انہا تنتقل
فی جمیع رمضان) شب قدر ماہ رمضان کے تمام دنوں
میں بدلتی سالتی رہتی ہے)

خود ابن عربی نے بہت سے لوگوں کی طرف اس
رائے کا انتساب کیا ہے لیکن ان کا خیال ہی نہیں یقین
چونکہ یہ ہے کہ شب قدر پورے سال میں گردش کرتی ہے
اس لئے انھوں نے ان تمام دلائل کا جواب دیا ہے جو
اس کے خلاف پڑتے ہیں۔

بہرحال مختصر وقت اور صفحات میں جو تفصیل آسانی
ممکن تھی پیش کر دی گئی۔ بہتر ہے کہ فی الحال اس بحث کو
لپیٹ ہی کر رکھ دیا جائے۔ ایسی بحثوں میں لطف اسوقت
آتا ہے جب سائل و مسئول دونوں کے سامنے سارا متعلقہ
مواد موجود ہو۔ آپ کے لئے یہ کنج کاوی بہت دشوار ہے
لہذا کیوں بات کو طول دیا جائے۔ فقط والسلام۔

فضا ابن فیضی کے ۲ شعر

سوال ۲: ۔ از خالد نبیل، نظام پور۔

اگست و ستمبر ۷۴ء کے تجلی میں "سفینۂ زرِ گل" پر آپ کا
تبصرہ پڑھا جو دلچسپ بھی ہے اور غیر جانبدارانہ و محققانہ بھی
تاہم دو اشعار تبصرہ سے رہ گئے ہیں ۔

(۱) کھول کر اب عرش کی کھڑکی ادھر بھی دیکھ لے
منتظر ہے پھر تری دنیا پیمبر آئے گا

(۲) اسے ملا نہیں شاید شفیق باپ کا دل
خدا کی ذات میں اپنی صفات بھی رکھ دے

پہلا شعر "ترجمان" دہلی میں دیکھا تھا۔ اسے اطہر
نقوی صاحب نے اسی مجموعۂ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے شاعر
کے دینی شعور کے ثبوت میں پیش کیا ہے! دوسرا بمبئی کے
ایک روزنامہ کی ۱۱ر جولائی ۷۴ء کی اشاعت (تراشہ
ارسالِ خدمت ہے) میں نظر سے گزرا۔ یہ فضا صاحب کی
ایک غزل "تاریخ کربلائے حیات" کا شعر ہے۔ اس کے
بارے میں یقینی طور پر یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مذکورہ مجموعۂ کلام
میں موجود ہے لیکن گمان غالب یہی ہے کہ اسی مجموعہ کا شعر
ہوگا۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ترجمان والے
تبصرہ میں ایک جگہ یہ الفاظ ہیں: ۔

" ان کے دل درد مند نے اس انقلاب کا ماتم
کیا ہے جس نے اخلاقی انحطاط کی رفتار کو تیز تر
کر دیا ہے اور جس سے کرب و بلا کے ایک لامتناہی
دور کا آغاز ہوا ہے۔ چنانچہ فضا کی شاعری بھی
اس "کربلائے حیات کی تاریخ بن گئی ہے"
(ترجمان دہلی یکم ستمبر ۷۳ء ص۱۴، کالم ۲)

خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے۔ یہی الفاظ مذکورہ غزل
کا عنوان بھی ہیں۔ اور عجب نہیں کہ تبصرہ نگار نے اسی غزل
کی بنا پر مندرجہ بالا رائے قائم کی ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ
دوسرا شعر بھی فاضل تبصرہ نگار کی نظر میں قابل داد ہی ہے!
بہرحال شعر خواہ اسی مجموعہ کا ہو خواہ کسی اور مجموعہ کی
زینت بننے والا ہو۔ براہ مہربانی دونوں اشعار پر تبصرہ ضرور
فرمائیے۔ "عرش کی کھڑکی" بھی کچھ کم حیرت انگیز دریافت نہ تھی
جو شاعر نے "پیمبر آئے گا" کی پیشینگوئی کا اضافہ کر کے شعر کو
عجوبہ بنا دیا! دوسرا شعر پڑھ کر کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے
کوئی کمیونسٹ شاعر بول رہا ہو۔ پتا نہیں اطہر نقوی صاحب
نے کیسے لکھ دیا:

" انہوں نے کہیں دینی افکار کا مذاق نہیں اڑایا ہے
بلکہ اس کے برعکس ان کے شعروں میں ان کا دینی
شعور نمایاں ہے" (ایضاً ص۱۴ کالم ۳) فقط

جواب ۲: ۔

آپ کا خط پڑھ کر "سفینۂ زرِ گل" کے اوراق الٹے۔
دوسرا شعر اس میں نہیں ہے حالانکہ وہ غزل موجود ہے جس کا
یہ شعر ہے۔ اس کا مطلب شاید یہ ہوا کہ مجموعہ مرتب کرتے وقت
خود فضا صاحب کو اس شعر کی قباحت محسوس ہو گئی ہے
اور اسی بنا پر اسے غزل سے خارج کر دیا ہے۔ چلئے چھٹی
ہوئی۔

ویسے آپ نے اردو ٹائمز کا جو تراشہ بھیجا ہے وہ جولائی ۴۲ء کا ہے اور مذکورہ غزل کے پانچ شعر اس میں طبع ہوئے ہیں جن میں ایک وہی ہے جس پر آپ تبصرہ چاہتے ہیں۔ پتہ نہیں معاملہ کیا ہے۔ سفینۂ زرگل ۴۳ء میں طبع ہو چکی ہے۔ اگر اس وقت شاعر نے اس شعر کو غزل سے خارج کر دیا تھا تو بعد میں ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ پھر اسے شامل غزل کر کے کہیں چھپوائیں گے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بہت پہلے یہ غزل کہیں اس شعر سمیت چھپی ہے اور اردو ٹائمز نے اس کے کچھ اشعار وہیں سے نقل کر لئے ہیں۔ عنوان بھی غالباً اردو ٹائمز ہی نے منتخب کیا ہے ورنہ کتاب میں تو کوئی عنوان ہی نہیں۔

بہرحال اب یہ شعر پریس میں آ ہی گیا ہے تو ہمارا تبصرہ بھی سن لیجئے کہ یہ شعر کسی تبصرہ کا متحمل ہے ہی نہیں۔ ذہن اور صاحب فکر لوگ کبھی کبھی اپنے افکار کی دنیا میں اتنے گم ہو جاتے ہیں کہ دو اور دو چار تک کا ہوش انہیں باقی نہیں رہتا۔ ایسے عالم بے نام و رنگ میں ان کے زبان و قلم سے ایسے نوادرات بھی کبھی کبھی نکل جاتے ہیں جنھیں علم و منطق کی ترازو میں نہیں تولا جا سکتا۔ مجذوب لوگوں پر قیاس کیجئے۔ عالم جذب کے نکات کس کی سمجھ میں آتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے یہ شعر بھی شاعر نے ربودگی، گم گشتگی اور فلک سیری کے ایک خاص عالم میں کہا ہے۔ اس عالم کی حدود سے باہر آ کر شاید وہ خود بھی اس کا مطلب و منشاء بیان نہ کر سکیں۔ کم سے کم ہماری عقل ناقص میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی صحیح الدماغ آدمی حالت ہوش و حواس میں ایسا شعر کیونکر کہہ سکتا ہے۔

دوسرے شعر کا معاملہ کچھ عجیب ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کتاب پڑھتے پڑھتے وہ ورق نادانستگی میں ہم نے بلا پڑھے الٹ دیا ہے جس میں یہ غزل ہے۔ اگر یہ غزل ہم نے پڑھی ہوتی تو یہ شعر محروم تبصرہ نہ رہتا اور اسی غزل کے ایک اور شعر پر بھی ہم دو چار لفظ کہتے۔

اس قدر بولے گئے ہیں جھوٹ سچ کے نام پر
سچ کبھی میں بولوں تو دنیا کو نہ باور آئے گا

"باور آنا" ہمارے خیال میں خلاف محاورہ ہے۔ فارسی میں باور کردن بولتے اور لکھتے ہیں۔ باور آمدن ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اردو میں یہ لفظ فارسی ہی سے آیا ہے اور باور کرنا یا کرانا استعمال ہوتا ہے۔ باور کے معنی اعتبار اور یقین کے ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ تو "آنا" مستعمل ہے مگر باور کے ساتھ نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے یوں کہنا درست ہے کہ فلاں بات کا یقین ہو گیا مگر یوں کہنا فصیح نہیں کہ ہمیں فلاں بات کا اعتبار ہو گیا یا جیسے محاورہ ہے کہ اسے چپ لگ گئی۔ چپ خاموشی اور سکوت ہی کو کہتے ہیں مگر یوں نہیں بولا جاتا کہ اسے خاموشی لگ گئی یا اسے سکوت لگ گیا۔ بہرحال ضرورت شعری کے عذر سے مصرعۂ ثانی گوارا کر لیا جائے تو کر لیا جائے، روزمرہ سے اس کی مطابقت نہیں ہے۔ ویسے شعر اپنی جگہ خوب ہے۔

جس شعر پر آپ تبصرہ چاہتے ہیں اس پر "ترجمان" میں اگر توصیفی ریمارک ہوا ہے تو تعجب کی بات ہے۔ ترجمان اہل حدیث کا پرچہ ہے اور اہل حدیث بھی اس شعر کو دانۂ انگور کی طرح ہضم کر جائیں تو اسے عجوبہ کہیں گے۔ ہو سکتا ہے ریمارک دینے والے کرم فرما اطہر نقوی صاحب اہل حدیث نہ ہوں اور ترجمان والوں نے تبصرہ بغیر پڑھے ہی شائع کر دیا ہو۔ یا ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی ایسے صاحب ہوں جو رطب و یابس کی تمیز نہ رکھتے ہوں۔

بہرکیف یہ شعر بھی فضا جیسے فہیم شاعر کے شایان شان نہیں۔ عرش کوئی ایسا کمرہ نہیں ہے جس میں خدا منہ چھپا کر بیٹھ رہا ہو اور دنیا کا حال چال دریافت کرنے کے لئے اسے اس کمرے کی کسی کھڑکی سے جھانکنے کی ضرورت ہو۔ العیاذ باللہ۔ شعر میں طنز و طعن، ناز نخرے، چہلیں اور خوش گپیاں سبھی چلتے ہیں۔ واعظوں کی پگڑیاں بھی اچھلتی ہیں اور بادہ و شاہد سے پینگیں بھی بڑھتی ہیں۔ یہ سب روایتاً گوارا ہے اور تاویل حسن کے دروازے کھلے ہوئے ہیں مگر ذات باری تعالیٰ اور عرش عظیم کو بھی

کوئی شاعر اسی روایتی سطح پر کھینچ لائے تو اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جائے گی۔ پہلا مصرعہ نہ صرف باعتبار زبان بچکانا ہے بلکہ باعتبار مفہوم سوقیانہ بھی ہے اور دوسرا مصرعہ خود شاعر کی طرف حسرت ویاس دیکھ رہا ہے کہ آپ ہی میرا مطلب بیان کریں!

قادیانیوں جیسی ساخت رکھنے والے کچھ افراد کسی پیمبر کے منتظر ہوں تو ہوں ورنہ اور تو کہیں ایسے منتظرین کی بھیڑ نظر آتی نہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ قضا صاحب نے کس ترنگ میں یہ شعر کہہ دیا ہے

رجب کی ۲۷ء

سوال[۳۸]:- جمیل احمد، مقام دپوسٹ ماردل وایا فیض پور ضلع جلگاؤں (مہاراشٹر)

عکسی اشرفیہ بہشتی زیور، مدلل و مکمل حصہ چھٹا صفحہ ۶۰ پر رجب کی رسموں کا بیان ہے۔ اس میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تحریر فرماتے ہیں اس کو عام لوگ مریم روزہ کا چاند کہتے ہیں اور اس کی ستائیس تاریخ میں روزہ رکھنے کو اچھا سمجھتے ہیں کہ ایک ہزار روزوں کا ثواب ملتا ہے۔ شرع میں اس کی کوئی قوی اصل نہیں الخ۔

محشی حاشیہ ۱ و ۲ ڈال کر تحریر کرتے ہیں ہزاروں کے ثواب کی قید کے بجز اس تاریخ ۲۷ ماہ رجب کے دوسرے دنوں کے فضائل صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ماہ رجب میں ایک رات ہے۔ اس میں نیک عمل کرنے والوں کو سو سال کی نیکیوں کے برابر ثواب ملتا ہے اور یہ رات رجب کے مہینہ ختم ہونے سے تین دن پہلے آتی ہے۔ تو جو شخص اس رات میں بارہ رکعتیں (اس طرح) ادا کرے کہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور الحمد للہ واللہ اکبر سو مرتبہ پڑھے اور اپنی ذات کے لئے دنیا و آخرت کی جو بھلائی مانگے اور صبح کو روزہ رکھے تو اللہ تعالیٰ اس کی ہر دعا قبول فرماتا ہے سوائے گناہ کی دعا کے (بیہقی)

اب آپ سے سوال یہ ہے کہ کیا حدیث صحیح ہے۔ اس پر عمل کرنا چاہئے یا نہیں۔

(ج) کیا ۲۷ء کی شب میں عید کی طرح مسجد میں جمع ہو کر نفل پڑھ سکتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں ہو

(د) کیا قصۂ معراج ۲۷ء کی شب میں بیان کرنا سلف سے ثابت ہے۔

آپ اپنی دانست میں جو جانتے ہیں وضاحت کے ساتھ تحریر فرمائیں تاکہ ہم کم عمل انسان فائدہ حاصل کر سکیں۔

مشتبہ بنیادیں

سوال[۴]:- (ایضاً) رسالہ رکن دین مؤلفہ مولانا رکن الدین صاحب حنفی نقشبندی مجددی الوری رح اور اس رسالہ کے مآخذ جیسے غنیۃ الطالبین، و رسالہ فضائل الشہور دکبیری وغیرہ کے متعلق آپ اپنے خیالات کا اظہار کریں کہ کیا قابل عمل ہے۔

سرکاری سود

سوال[۵]:- (ایضاً) تجلی جنوری و فروری ۶۴ء میں ایک مضمون تھا کیا سرکاری سود جائز ہے۔ اس میں مفتی عتیق الرحمٰن اور آپ کے تاثرات تھے۔

جنوری سے ابھی تک منتظر تھا کہ آپ ہندوستانی مسلمانوں کو فیصلہ کن رائے سے آگاہ کریں، مگر اگست دسمبر کا شمارہ اس سے خالی تھا۔ اس لئے آپ کو تحریر کر رہا ہوں کہ علمائے وقت کا فتویٰ کیا ہے تحریر کریں۔ فقط۔

جواب[۳]:-

اشرفیہ بہشتی زیور کا جو نسخہ ہمارے پاس ہے اس میں تو ایسا کوئی حاشیہ نہیں۔ مگر یہ نسخہ عکسی نہیں معلوم ہوتا ہے اس کے عکسی نسخہ میں ایسا حاشیہ دیا گیا ہوگا۔

بہرحال بات مولانا اشرف علیؒ ہی کی درست ہے

محشی نے جو بات کہی ہے اس کا ٹھیک مطلب ہی سمجھ میں نہیں آیا۔ "ہزاروں کے ثواب کی قید کے بعد" کا فقرہ اس طرح آیا ہے کہ مدعا ہی عنقا ہو کر رہ گیا پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

سو کی ایک بات یہ ہے کہ دینی عقائد و احکام ہمیشہ بہت ہی مستند ذرائع سے حاصل کرنے چاہئیں۔ اسی طرح کے حواشی کچھ زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتے۔

ہماری تحقیق یہ ہے کہ ایسی بہت کم حدیثیں صحیح ہیں جن میں تھوڑے سے عمل پر بہت زیادہ اجر و ثواب کی بشارت دی گئی ہے "صحیح" کا لفظ فنِ حدیث کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ بہتیرے غیر محقق اور غیر دانشمند حضرات کتنی ہی ایسی احادیث کو بھی صحیح کہہ ڈالتے ہیں جو فی الحقیقت صحیح نہیں ہوتیں۔ علاوہ اس کے کسی حدیث کا بہ اعتبار سند صحیح ہونا ایک فنی مسئلہ ہے جس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس حدیث کا مضمون بھی صحیح و ثابت ہو۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ سند کے اعتبار سے ایک روایت صحیح ہوتی ہے لیکن اس کے متن (اصل عبارت) میں کوئی علت پائی جاتی ہے جس کی بنا پر محققین اسے قبول نہیں کرتے یا اس کی تاویل کرتے ہیں۔

اور بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک روایت سند اور متن دونوں اعتبار سے اصطلاحاً درجۂ صحت کو پہنچی ہوئی ہوتی ہے لیکن جو مضمون اس سے ثابت ہو رہا ہوتا ہے وہ کسی زیادہ مضبوط روایت یا قرآن کی کسی آیت سے ٹکراتا ہے تو اس روایت کو ترک کر دیتے ہیں۔

ان فنی باریکیوں کے علاوہ ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ جن حدیثوں میں تھوڑے عمل پر بہت زیادہ ثواب کی اطلاع پائی جائے ان کی صحت و صداقت اتنی آسانی سے نہیں مان لی جائے گی جتنی آسانی سے دوسری روایات کی مان لی جاتی ہے بلکہ محتاط ترین تنقید کی چھلنیوں سے گزار کر دیکھا جائے گا۔ اگر اس کے بعد بھی وہ علت اور خامی سے پاک ثابت ہوں تو اگرچہ انھیں رد نہیں کیا جائے گا لیکن ان پر کسی عقیدے کی بنیاد نہیں رکھی جائے گی کیونکہ حدیث کی چند مخصوص ترین قسموں کے علاوہ جتنی بھی قسمیں ہیں سب محض ظن اور گمانِ غالب کا فائدہ دیتی ہیں یقین و اذعان کا نہیں اور عقائد کے لئے یقینی و قطعی بنیادیں درکار ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کی جو روایت محشی نے نقل کی وہ اول تو سند کے اعتبار سے قوی نہیں۔ دوسرے اس کے مضمون میں یہ نقص ہے کہ ماہِ رجب کا ذکر کرنے کے بعد اس کی ایک تاریخ (۲۷ ویں شب) بھی معین کر دی گئی ہے۔ حالانکہ تاریخ کا تعین نہ ہوتا تو شائقین کو کم سے کم ایک ماہ تلاش و تجسس کی مشقت اٹھانی پڑتی۔ کوئی بھی انعام مشقت کے بعد ہی ملا کرتا ہے اور بہت بڑے انعامات تو کافی دشوار مراحل کے بعد میسر آتے ہیں۔ پورے مہینے کی راتوں میں ایک خاص رات تلاش کرنا گو کہ دشوار ترین کام نہیں تھا مگر نہ کچھ دشوار اور مشقت طلب ضرور تھا جس کے نتیجے میں کسی بڑے انعام کی توقع خلاف قیاس نہ قرار پاتی لیکن صریح الفاظ میں ایک تاریخ معین کر دی گئی تو یہ معمولی دشواری اور مشقت بھی خارج از بحث ہوئی۔ اب تو ہر شخص کے لئے بالکل آسان ہو گیا کہ ۲۷ ویں شب میں محض بارہ رکعات پڑھے اور دن میں روزہ رکھ لے تو زنا کی بھر سارے ذل دور دھل جائیں اور جنت گویا سامنے آ کھڑی ہو۔

نہیں محترم بھائی۔ جنت اتنی سستی نہیں ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا ہے کہ جنت تو دشواریوں اور آزمائشوں سے گھری ہوئی ہے۔ آپ دیکھیے لیلۃ القدر کی کتنی تعریف قرآن میں آئی ہے۔ یہ رات حضورؐ کو بتا بھی دی گئی تھی مگر پھر بھلا دی گئی۔ اس کا یہی تو مطلب ہوا کہ اللہ کی حکمتِ بالغہ اپنے بندوں سے محنت اور استقلال اور عزم و تحمل کی طالب ہے۔ اس نے جس طرح دنیاوی اشیاء کے سلسلہ میں یہ طریقہ پسند فرمایا ہے کہ بندے جد و جہد کریں تب انھیں سونا اور ہیرے میسر آئیں اسی طرح اُخروی نعمتوں کے سلسلہ میں بھی اسے یہی طریقہ پسند ہے کہ ان کی تقسیم یوں ہی کنکر مٹی کی طرح نہ کر دی جائے بلکہ بندے اپنے خون اور پسینے سے ان کی قیمت ادا کریں۔ امتحان دیں۔ سختیاں جھیلیں۔ کیا یہ بات دقار اور متین آواز بندوں کے کانوں میں نہیں پہنچی؟ —

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا

(کیا تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ جنت میں یوں ہی داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم پر ابھی وہ سختیاں نہیں گذریں جو تم سے پہلے لوگوں پر گذر چکیں۔ ان پر سختیاں اور تکلیفیں آئیں اور جھڑ جھڑا کر رکھ دیئے گئے)

یہ تو سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا۔ پھر آلِ عمران میں ارشاد فرمایا گیا:۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ۔

(کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی تک تمہارے فعل و عمل سے اللہ پر یہ تو ظاہر ہی نہیں ہوا کہ کون تم میں سے کس درجہ مشقت اٹھانے والا اور کس درجہ صبر کرنے والا ہے)

یہ آیات صاف بتاتی ہیں کہ جنت اور آخرت کی بھلائی حت اور غفران و رحمت ایسی سہل الحصول اور گری پڑی نہیں ہیں کہ دو چار ٹکے ادا کئے اور خرید لیں۔ وہ بڑی قیمت ہیں۔ جہاد و تدبیر و ضبط چاہتی ہیں۔ محنت اور قربانی چاہتی قانونِ مشیت میں ایسا کوئی حساب نہیں کہ محض ایک دن ت کرلو، محض ایک شب تسبیحات پڑھو، محض دس ملیں میل ملوا دو یا پچاس سال کے برابر نیکیاں جھولی میں پڑ جائیں ا کوئی وقت معین ہے جس میں ہر دعا لازماً قبول ہو جاتی ہر دعا تو انبیاء تک کی قبول نہیں ہوا کرتی۔ یہ بات محض کہی جا سکتی ہے کہ فلاں فلاں اوقات میں دعا کی یت کا زیادہ امکان ہے۔ یہ آخری درجہ ہے حسنِ توقع نین و قطعیت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اتنا اور سمجھ لیجئے کہ جب ہم منقولہ بالا روایت کو غیر ن کہتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ صحابیٔ رسولؐ حضرت ابن عباسؓ کو جھٹلایا جا رہا ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ اس طرح کے اشتعال انگیز جاہلانہ شوشے کم فہم لوگ بہت چھوڑتے ہیں۔ حالانکہ یہ کوری جہالت و سفاہت ہے۔ ابن عباسؓ ہمارے روبرو کھڑے ہو کر حدیث بیان نہیں کر رہے۔ انھوں نے یہ سب کہا ہوگا اسکی اطلاع ہمیں واسطہ در واسطہ ہو کر پہنچی ہے۔ ان واسطوں ہی کا اصطلاحی نام سند ہے۔ جب اس روایت کو کوئی غیر مستند کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک سند قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں مانتا کہ ابن عباس نے ایسا کیا ہوگا۔

رہی یہ بات کہ اس روایت پر عمل کرنا کیسا ہو تو جواب یہ ہے کہ عمل کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ کسی بھی بہانے نفل نماز پڑھ لینا بہرحال موجبِ ثواب ہے دعا بھی بجائے خود عبادت ہے۔ خوب دعائیں مانگیے اللہ بے شمار دعائیں قبول کرتا ہے۔ کیا خبر کس وقت کس کی کیا دعا قبول ہی کرلے۔

(ج) ہاں ۲۷ ویں شب میں مسجدیں آباد کرنا اور مجتمع ہو کر نفلیں پڑھنا بدعت ہے۔ یہ کام صحابہ نے نہیں کیا اور دورِ صحابہ میں کسی نے اس کی ابتدا کی تو صحابہ ہی نے اس کی بیخ کنی کردی۔ اگر نیت صحیح اور ارادہ رضائے الٰہی کا ہے تو آخر گھر کے کونے میں شب بیداری اور عبادت کیوں نہ ہو۔ جشن اور میلے ٹھیلے والی ذہنیت آخر کیوں ہر معاملہ میں آگے رہے۔ آپ اگر سمجھتے ہیں کہ رجب کی ستائیسویں شب میں عبادت کا بڑا ثواب ہے تو ٹھیک ہے گھر کا مصلیٰ آباد کیجئے۔ مسجد میں قیام و سجدہ فرمانے پر اصرار کیوں جبکہ احادیث اور تعاملِ صحابہ سے ثابت ہے کہ مسجد میں صرف نمازِ فرض کی افضلیت ہے۔ باقی نمازیں گھر میں افضل ہیں۔

(د) سلف سے ثابت نہیں۔ قصۂ معراج ہو واقعاتِ سیرت ہوں۔ نعتِ رسول ہو۔ یہ سب چیزیں اصولاً نہایت مفید و بابرکت ہیں اور اہلِ علم کا فرض ہے

کہ وقتاً فوقتاً عامۃ المسلمین کو ایسی مجالس سے مستفید کرتے رہیں اور غیر مسلمین میں بھی سیرت طیبہ اور اصول اسلام کی تبلیغ و اشاعت کریں۔ لیکن اس کار خیر کو بدعت کے جراثیم سے پاک ہونا چاہئے۔ یہ بدعت ہے کہ اس طرح کے کسی بھی کار خیر کے لئے سال کا ایک یا چند خاص روز معین کر لئے جائیں اور عوام کو یہ تأثر دیا جائے کہ یہ تعیین کوئی شرعی چیز ہے۔ اس میں کچھ زیادہ ثواب ہے۔ قصۂ معراج کا بیان جس طرح ۲۷ رجب کی شب میں کار ثواب ہے۔ اسی طرح اور کبھی ہر تاریخ میں کار ثواب ہے۔ اور اس میں غلط سلط مبالغہ آمیز روایتیں بیان کرنا سخت گناہ کی بات ہے واعظ و مقرر کو بہت احتیاط کرنی چاہئے اور توہم پرستی و عجوبہ پسندی کے اس فاسد مزاج کو غذا نہیں پہنچانی چاہئے جو عوام الناس کی ذہنیت میں پہلے ہی رچا بسا ہے۔ خصوصاً بریلوی مکتبۂ فکر کے ڈسے ہوئے عوام تو سرتاپا توہم ہی بنکر رہ گئے ہیں اور شرک و توحید کی تمیز ہی ان سے اٹھ گئی ہے۔

مشتبہ بنیادیں

جواب[۴] :-

رسالہ رکن دین ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی کیا حیثیت ہے۔ غنیۃ الطالبین سے مراد اگر حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رح کی شہرہ آفاق تصنیف ہے تو اس کے بارے میں ہماری رائے حسب ذیل ہے:

اردو اور فارسی میں اس کے بہت سے ترجمے ہوئے ہیں۔ ہماری محدود علم کی حد تک شاید ہی کوئی ترجمہ ایسا ہو جسے پوری طرح اصل کے مطابق کہا جا سکے۔ بعض تراجم میں فاحش غلطیاں ہیں اور بعض میں لطیف و دقیق۔ ہو سکتا ہے کوئی ترجمہ بحیثیت مجموعی بھروسے کے قابل بھی ہو۔ بہر حال جہاں تک اصل کا تعلق ہے حضرت مصنف کی عظمت کسی بحث کی متحمل نہیں۔ وہ بہت بڑے بزرگ تھے اور علم بھی وافر رکھتے تھے۔ انھوں نے اس کتاب میں علم و آگہی کے بے شمار لعل و جواہر جمع کئے ہیں اور اہل توفیق ان سے فائدہ بھی اٹھاتے رہتے ہیں۔

مگر اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ کوئی غیر نبی معصوم نہیں۔ فکر و نظر کی خطاؤں سے بالاتر نہیں۔ اس کتاب کا بھی حرف حرف حجت نہیں ہے۔ اس میں بھی بہت سی ایسی آراء ہیں جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور بہتیری روایات اسمیں ایسی آگئی ہیں جن کی صحت مسلم نہیں۔ مثلاً ماہِ رجب کے زیر عنوان جو روایات اس میں درج ہوئی ہیں ان پر آنکھ بند کر کے بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

سچ یہ ہے کہ اس طرح کی وقیع کتابوں سے حقیقی فائدہ صرف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو عالم بھی ہوں فقیہ بھی اور غلوئے عقیدت کا شکار نہ ہوں۔ شاہ عبدالقادر ان صالحین میں ہیں جن کے بارے میں مبالغہ آرائی اور افسانہ طرازی کی انتہا کر دی گئی ہے۔ بہت سے لوگ تو انکی اندھی اور جاہلانہ عقیدت میں شرک تک جا پہنچے اور کتنے ہی صوفی نما پیر بزرگانِ خدا نے انھیں ذیلی خدا بنا چھوڑا ____ العیاذ باللہ۔ اسی لئے غیر عالم یا غیر فقیہ یا اندھے عقیدتمند کو ان کی کتاب سے فائدہ کے ساتھ نقصان بھی پہنچے گا اور مار کو تر کے ساتھ وہ زہر بھی پی جائے گا۔

"رکن دین" کے محترم مؤلف نے غنیۃ کو کن امور کے لئے ماخذ اور مبنیٰ بنایا ہے یہ جب تک معلوم نہ ہو کوئی تسلی بخش اظہار رائے نہیں کیا جا سکتا۔

رہیں اور کتابیں تو ان کا بھی کم و بیش یہی حال ہے کہ رطب و یابس دونوں ان میں جمع ہیں۔ اہلِ نظر ان سے موتی بھی چن سکتے ہیں اور کنکر پتھر بھی۔ ہمیں کیا معلوم کس نے کہاں کیا چنا ہے۔ صاف سی بات یہ ہے کہ آپ جیسی سطح کے حضرات مسائل شرعیہ کے لئے بہشتی زیور اور علم الفقہ تک محدود رہیں تو زیادہ بہتر ہے۔ کسی مسئلہ میں ان سے تشفی نہ ہو تو دارالعلوم دیوبند یا کسی اور مستند ادارے یا عالم و مفتی سے دریافت کرلیں۔ مسائل سے ہٹ کر دین کے مزاج

مصالح، بنیادی احکام وعقائد اور رہنما اصولوں کی وضاحت کے لئے ایک طرف اکابر دیوبند یعنی مولانا محمد قاسم، حضرت شیخ الہند، مفتی عزیز الرحمٰن، علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت گنگوہی جیسے سلف کی تحریریں بہترین چیز ہیں دوسری طرف جماعت اسلامی کا لٹریچر اپنا جواب نہیں رکھتا خصوصًا مولانا مودودی کی کتابیں اور ان کی تفہیم قرآن ۔ یہ رہنمائی ہم آپکو بہت ہی اخلاص سے دے رہے ہیں ورنہ ہمارے موجودہ حلقۂ دیوبند میں تو مولانا مودودی کو بدعقیدہ اور گمراہ کہنا فیشن بن چکا ہے حتیٰ کہ کتنے ہی داڑھی مونچھ والے نابالغ بھی اسی فیشن کو اختیار کرکے اکڑتے اور غرّاتے پھرتے ہیں جن کے مونچھ نہیں ہے وہ خیالی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ ان کے غل غپاڑے پر کان دھریں گے تو دل ودماغ کا خانہ خراب ہو جائے گا۔ ان میں ایک عیب یہ پیدا ہو گیا ہے کہ بات تو کہیں گے دل سے گھڑ کر مگر منسوب کر دیں گے اسے حلقۂ دیوبند کی طرف ۔ گویا یہ خود ہی خود دیوبندیت کے نمائندے بھی بن بیٹھے ہیں حالانکہ اسلاف دیوبند کی روحیں ان سے پناہ مانگتی ہیں اور رحمت کے فرشتے ان سے بہت بیزار ہیں۔ ہم نہ دیوبند کے وکیل ہیں نہ بریلویت کے حریف ۔ ہم تو اللہ اور رسولؐ کے نقیب اور ان کے غلام اور حق وصداقت کے وکیل ہیں انشاء اللہ فیصلہ تو آخرت ہی میں ہوگا کہ ہمارے اس دعوے میں کہاں تک سچائی تھی اور کہاں تک خودستائی ۔

والحمد للہ رب العالمین

سرکاری سود

جوابؔ :۔

جتنا کچھ تجلی میں اس موضوع پر آچکا اس سے زیادہ پیش کرنے کی پوزیشن میں فی الحال ہم نہیں ہیں۔ علمائے وقت کسی ایک ڈوری میں تو منسلک ہیں نہیں جو ہم ان کا متفقہ فتویٰ چھاپ دیں۔ ہر ایک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے بیٹھا ہے ۔ آپ کو جس عالم پر بھروسہ ہو اس سے خود استفسار اور استفتاء کرلیں۔ ہم بچارے نہ علامہ ہیں نہ مولانا نہ مفتی نہ شیخ ۔ صحیح پوچھیے تو ہمارا شمار رندانِ خرابات میں ہے ۔ ایک معمولی طالب علم ۔ ایک دنیادار گنا ہگار آدمی ۔ جو کچھ ہماری عقل ناقص میں آیا لکھ چکے ۔ معاملہ سود کا ہے ۔ فتویٰ مفتی صاحب ہی دے سکیں گے ۔

ویسے رائے ہماری وہی ہے جو ظاہر کی جا چکی یعنی قرض دینے کی جو اسکیمیں حکومت نے چلا رکھی ہیں ان سب پر حرمت کا فتویٰ صادر کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے ان کی حقیقت اور اسپرٹ کو سمجھنے کے بعد ہی کوئی قطعی فیصلہ دینا چاہیئے ۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم ۔

قادیانی مسئلہ

سوالؔ :۔ محمد ابراہیم خاں ۔ رحمت اللہ محلہ صراف ۔ بھدرواہ ۔

پاکستان کے لوگوں نے قادیانیوں کیخلاف جو تحریک چلائی ہے اور جس کا فیصلہ انشاء اللہ کل پرسوں تک اسمبلی میں ہونے والا ہے ۔ اس بارہ میں یہاں کے احمدیہ جماعت کے حامیوں میں کافی ہلچل مچ گئی ہے اور انہوں نے ایک احمدیہ مشن کا مبلغ مسمّٰی محمد شریف امینی شاید بمبئی سے منگوایا ہے ۔ اس شخص نے یہاں ایک جلسہ میں وزیر اعظم بھٹو کے خلاف عجیب عجیب بہتان لگائے کہ وہ شراب خور ہے ۔ شملہ میں جب وزیر اعظم پاکستان آئے تو نماز جمعہ تک نہیں پڑھی اور ان کی دختر کے بارے میں بھی نازیبا کلمات کہے کہ فیشن پرست ہے وغیرہ وغیرہ ۔ اس پر غیر احمدی بڑے بگڑے مگر جذبات پر قابو پایا ۔ دوسرے روز پھر اسی مبلغ نے تقریر کرنی تھی مگر سرکاری طور پر اس کو تقریر کرنے کی اجازت نہ مل سکی حالات کو قابو میں رکھا گیا ۔

دو دن بعد پھر لاہوری احمدیہ پارٹی نے جلسہ کیا جس میں مولوی سمیع اللہ لاہوری پارٹی نے تقریر کی ۔ اس نے اپنی تقریر سیرت نبوی کے دائرہ تک ہی محدود رکھی اور کسی قسم کی مخالفت نہیں کی ۔

اب آپ سے عرض ہے کہ آپ ان تقاریر کے بارے

میں اپنی قیمتی رائے اپنے ماہنامہ میں دیکر یہاں کے عوام میں تسلی و تشفی کا سامان بہم پہنچائیں، کیونکہ آپ کا ماہنامہ اس جگہ یعنی بھاردواہ میں اچھی تعداد کے لوگوں میں ہر لعزیز ہے اور بے تابی سے اس کا انتظار رہتا ہے۔ نیز عرض ہے کہ اس معاملہ کو ذرا وضاحت سے بیان کیا جاوے اگرچہ آجکل تمام مسلم و غیر مسلم اخبارات اس معاملہ کو اپنے اپنے خیال کے مطابق اپنے جریدوں میں اہم کالم دیتے ہیں۔

مکرم مولوی محمد شریف امینی نے اپنی تقریر میں کہا کہ اکثریت کو کوئی اختیار نہیں کہ ایسا فیصلہ اقلیت کے بارے میں کرے کہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے اس کے بارے میں بھی اپنا خیال سپردِ قلم فرمادیں۔

جواب :۔

قادیانیت کے بارے میں ہمارے خیالات راز نہیں ہیں۔ جب بھی تجلی میں یہ موضوع زیرِ گفتگو آیا ہے یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ فرقۂ قادیانیہ کوئی مسلم فرقہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا گروہ ہے جس نے ایک نیا دین اختیار کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں شرکت کرنیوالے لوگ بہ اعتبارِ نیت مخلص ہوں۔ وہ یہی تصور رکھتے ہوں کہ ہم اسلام سے خروج نہیں کررہے ہیں بلکہ قرآن وحدیث کا حکم بجالارہے ہیں لیکن علم اور فہم سلیم سے بیگانہ اخلاص کسی مرض کی دوا نہیں۔ ہم زہر کو آبِ حیات تصور کرکے پی جائیں تو ہمارا تصور اسے آبِ حیات نہیں بنادے گا بلکہ زہر اپنا اثر کرے گا۔

جو مبلغ صاحب بھٹو کی شان میں "قصیدہ" پڑھ رہے ہیں، وہ دراصل مسئلہ کو خواہ مخواہ الجھا رہے ہیں۔ بھٹو صاحب شرابی ہوں، کبابی ہوں، کیسے بھی ہوں ان کا پارٹ اس معاملہ میں اس سے زیادہ آخر ہے کیا کہ جس رائے پر ان کے عوام و خواص سب نے مکمل اتفاق کیا۔ اسے انھوں نے مان لیا۔ نہ مانتے تو کرتے کیا۔ جس ہیئتِ اجتماعیہ کے سپرد اس معاملہ کی تحقیق و تفتیش کی گئی تھی۔ اس میں سے کسی ایک نے بھی یہ رائے ظاہر نہیں کی کہ قادیانیوں کو مسلمان ہی مانا جائے۔ جہاں تک تقاضائے انصاف کا تعلق ہے اس ہیئت نے قادیانیوں کے متعدد ذمہ دار ترجمانوں کو اس کا پورا موقعہ دیا کہ وہ اپنا ٹھیک ٹھیک موقف و مسلک واضح کریں اور انھیں یہ شکایت کرنے کا موقع نہ ملے کہ کسی نے ہماری طرف کوئی غلط عقیدہ منسوب کردیا ہے۔ ان ترجمانوں کی وضاحت ہی سے جب یہ محقق ہوگیا کہ قادیانی حضرات بعض ایسے عقائد کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور لگائے رہنے پر مصر ہیں جن کی موجودگی میں قرآن اور حدیث انھیں مسلمان تسلیم نہیں کرتے تو کسی بھی انصاف پسند کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ باقی رہ گیا تھا کہ ان کے خارج از اسلام ہونے کا فیصلہ دیدے اور اس بدترین منافقانہ صورتِ حال کو ختم کردے کہ کچھ لوگ مسلمان نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مسلمان کہتے رہیں اور مسلمانوں والے تمام حقوق حاصل کرتے رہنے کے علاوہ دنیا کو اس فریب میں بھی مبتلا کئے جائیں کہ وہ تبلیغِ اسلام کررہے ہیں۔

پاکستان تو اب بنا ہے۔ اس سے کہیں پہلے اونچے درجے کے علماء و فقہاء فیصلہ دے چکے تھے کہ قادیانیت اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ دلائل سے مزین بہترین کتابیں قیامِ پاکستان سے پہلے ہی بازار میں آچکی تھیں اور اس عہد کے علماء و فقہاء کے جتنے معروف حلقے ہیں وہ سب اس سے متفق رہے ہے کہ قادیانیوں کو مسلمان نہیں مانا جاسکتا۔

خود قادیانی ہمیں مسلمان کہاں مانتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ قدرتی بھی ہے جس زمانے میں کوئی نبی آتا ہے اس زمانے کے ہر آدمی پر ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس نبی کو نبی مانے۔ اگر نہیں مانے گا تو لازماً کافر ہوگا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کو جن لوگوں نے نبی مانا ان کے نقطۂ نظر سے وہ سب لوگ کافر ہونے ہی چاہییں جنھوں نے مرزا کو نبی نہیں مانا۔ چنانچہ مرزا صاحب کے اپنے ارشادات میں اور ان کے جانشینوں کے کلام مبارک میں طرح طرح سے اس رائے کا اظہار کیا بھی گیا ہے کہ مرزا کی نبوت اور ان کی

جمہوریت کا منکر جہنمی ہے۔ بد دین ہے۔ ملعون ہے وغیرہ ذلک۔

ایسی صورت میں کسی بھٹو یا فلاں فلاں کا شرابی ہونا، بدکردار ہونا بے نمازی ہونا آخر نفس واقعہ پر کیا اثر ڈالتا ہے۔ مذکورہ محمد شریف صاحب نے اپنی تقریر میں اور کیا گل افشانیاں کی ہوں گی یہ تو ہمیں کیا معلوم البتہ آخر میں آپ نے ان کا جو ارشاد گرامی نقل کیا اس کے بارے میں عرض ہے کہ اکثریت اور اقلیت آجکی سیاسی اصطلاحیں ہیں جبکہ قادیانیوں کو مسلمان ماننے نہ ماننے کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو خالص قرآن سنت کا مسئلہ ہے۔ اس کا فیصلہ علمِ دین جاننے والے مفتیوں کے ہاتھ میں ہے نہ کہ سیاسی لیڈروں یا ملک کے سربراہوں کے دستِ مبارک میں۔ البتہ اجتماعی اور سیاسی دائروں میں چونکہ حکومت وقت ہی کو اختیارات حاصل ہوا کرتے ہیں اس لئے پاکستانی مسلمانوں نے اپنی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ایک واشگاف سچائی اور مسلم حقیقت کو وہ قانون و آئین کے صفحات میں بھی تسلیم کرلے۔

اس معاملہ کو اس انداز میں پیش کرنا کہ گویا پاکستانی اکثریت نے اپنی اقلیت پر کوئی من مانا فیصلہ ٹھونس دیا ہے، ایک مغالطہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ آپ فی الحقیقت رام پرشاد ہوں اور دعویٰ یہ کریں کہ محمد حسن ہوں۔ عدالت پوری تفتیش و تحقیق کے بعد فیصلہ دے کہ آپ رام پرشاد ہی ہیں محمد حسن نہیں تو کیا اس پر یہ ریمارک درست ہوگا کہ فلاں جج نے ایک آزاد شہری پر اپنا فیصلہ ٹھونس دیا۔ اسے اس کا کوئی حق نہیں تھا۔

فیصلہ تو دراصل خود قادیانیوں نے اپنے بارے میں کیا ہے۔ اسلام کوئی نسلی و قومی مذہب تو ہے نہیں وہ چند بنیادی عقائد سے عبارت ہے۔ جو شخص یا گروہ ان عقائد سے گریزاں ہوگا وہ آپ سے آپ خارج از اسلام ہوجائے گا۔ اب اگر مفتی یا عالم یا مسلمان حکومت اس کے غیر مسلم ہونے کا اعلان کرتی ہے تو یہ ایک امرِ واقعہ کا اعلان ہے نہ کہ کوئی جبری فیصلہ۔ اعلان ضروری ہوا کہ حقوق کی جو خوراک گھوڑوں کے لئے مقرر ہے گدھوں تک نہ پہونچے اور گدھوں کا حصہ گھوڑے نہ چر جائیں۔ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا یہ مطلب نہیں کہ انھیں جینے کا بھی حق نہ رہا۔ استغفر اللہ۔ انھیں وہ تمام تحفظات اور حقوق ملنے ہی چاہئیں جو کسی "اسلامی ملک" میں غیر مسلمین کے لئے طے ہیں۔ پاکستان عملی اعتبار سے کتنا ہی بے راہ رو سہی مگر وہاں کے آئین نے بہرحال اسے اسلامی ریاست قرار دیا ہے اور قادیانیوں کے متعلق پاکستان کا زیر بحث فیصلہ بھی آئین ہی سے تعلق رکھتا ہے ورنہ دائرۂ آئین سے باہر عملی زندگی اور معاشرتی دائرہ میں تو قادیانی پہلے ہی سے خارج از اسلام مانے جاتے رہے ہیں۔ ہمارے ملک کے پڑھے لکھے دینداروں میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے سوا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر عالم ہو جو قادیانیوں کے خارج از اسلام ہونے میں شک رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا استثناء اتنے اہم اور ہمہ گیر مسئلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ خصوصاً جب مولانا دریابادی محض کنایوں اور چٹکلوں سے کام چلاتے ہوں۔ علمی و تحقیقی سطح پر انھوں نے کبھی یہ واضح کرنے کی زحمت نہ اٹھائی ہو کہ قادیانیوں کے حق میں اس قدر رحیم و کریم اور مشفق و فیاض بن جانے کا آخر کیا جواز ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ دلائل کے رُخ سے قادیانیوں کا خارج از اسلام ہونا اتنا ہی اٹل ہے جتنا دو اور دو کا چار ہونا۔

کمیونسٹوں، سوشلسٹوں، یا فلاسفوں کی سمجھ میں اس مسئلہ کی نوعیت نہ آئے تو یہ قابلِ فہم ہے۔ بندر کیا جانے ادرک کا مزا۔ یہ بیچارے اپنی اینٹ اور پتھر کی دنیا سے بلند کسی اڑان کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ انھیں اس کا کیا شعور کہ ایمان بالرسالت کیا ہے۔ مہدی موعود کسے کہتے ہیں اور اسلام نے کیا تعلیم دی ہے۔ لیکن اگر بعض مسلمان بھی قادیانی علم کلام کے چکر میں آجائیں تو یہ بالکل قابلِ فہم نہیں۔ ہماری نصیحت ہے کہ قادیانی حضرات کو

ذہن نشاں کرنے دیجئے۔ ان پر چوٹ پڑی ہے۔ ان کا زخم تازہ ہے۔ وہ چیخیں اور کراہیں گے ضرور۔ آخر تکلیف تو ہونی ہی چاہیئے کہ اتنا پرانا دام فریب ٹوٹ گیا۔ دھوکے کی ٹٹی شعلوں کی نذر ہو گئی۔ منافقت کا تانا بانا بکھر گیا۔ ابھی حادثہ فقط پاکستان میں پیش آیا ہے۔ آگے کو پوری دنیائے اسلام میں یہی ہونا ہے مسلمان کتنے بھی گئے گزرے ہو چکے ہوں مگر وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت کو چیلنج کیا جائے اور ایسے لوگ نبوت کا دعویٰ کریں جن میں کوئی بھی وہ علامت نہ پائی جاتی ہو جسے اللہ کے رسولؐ نے احادیث طیبہ میں بیان فرمایا ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہی ہوگا کہ کسی قادیانی کو حرمین شریفین میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ آئندہ شاید یہ بھی ہو کہ ہر مسلمان حکومت اپنی کتاب آئین مستقل طور پر یہ صراحت ثبت کر دے کہ احمدی فرقہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ نہیں ہے بلکہ ایک خارج از ملت گروہ ہے جس کا حکم تمام معاملات میں وہی ہے جو غیر مسلمین کا ہے۔

مارگ دیپ (ہندی)

اسلام کی بنیادی تعلیمات کو غیر مسلموں تک پہنچانے والا خالص تبلیغی ماہنامہ جسے پڑھے لکھے غیر مسلم حلقوں میں دقت اور پسندیدگی کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے سالانہ چندہ صرف پانچ روپے لیکن اعزازی حیثیت سے آپ پچاس اور سو روپے بھی دے سکتے ہیں۔

تبلیغ دین کے مشن کی اہمیت کا احساس کرنے والے حضرات اپنے زیادہ سے زیادہ مالی تعاون کے ذریعہ ادارے کا ہاتھ بٹائیں۔

ہندی ماہنامہ "مارگ دیپ" روشنی پبلشنگ ہاؤس کے۔ بی روڈ رامپور (یو۔ پی)

غزل

اشہر اعظمی

شوق سے جس کے لئے جان بھی دی دل کے سوا
اس نے کچھ بھی نہ دیا وعدۂ باطل کے سوا

جادۂ شوق میں کام آئی بصیرت اپنی
ہم سفر کوئی نہ تھا تختیِ منزل کے سوا

سرفروشی کی تمنا تھی ہمارے دل میں
سرخرو ہوتے کہاں کوچۂ قاتل کے سوا

آشنا تلخیٔ دوراں سے نہیں جن کا ضمیر
سوچتے کیا وہ کبھی راحت ساحل کے سوا

جب بھی ماحول کی پستی کو مٹانا چاہا
ہمنوا کوئی نہ تھا حوصلۂ دل کے سوا

ہم پہ اشہر یہ کھلا آج بفیضِ حالات
زندگی کچھ نہیں افکار و مسائل کے سوا

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

قادیانی مسئلہ اور اس کا صحیح حل

گذشتہ ماہ مئی کے حادثہ ربوہ پر مسلمانوں میں جو ردِعمل واقع ہوا اور غلام احمدی امت کو امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے الگ کرنے کے لئے پاکستان کے تمام مسلمانوں نے کامل اتحاد و اتفاق کے ساتھ جو جد و جہد شروع کی وہ اگرچہ بالکل ایک فطری امر ہے مگر میں اسکو بروقت نہیں بلکہ بہت بعد از وقت سمجھتا ہوں کیونکہ یہ ردِعمل اُس وقت رونما ہوا ہے جب مسلم معاشرے کے اندر اِس فتنے کو پرورش پانے اور پروان چڑھتے ۸۰ ۔ ۹۰ سال بیت چکے ہیں اور اب اس کے استیصال کے لئے یہ آخری موقع ہمیں ملا ہے جس کو اگر ہم نے کھو دیا تو کچھ بعید نہیں کہ یہ فتنہ ہمیں لے ڈوبے گا۔ لاقدّر اللہ۔

درحقیقت اسلامی نقطۂ نظر سے یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ بہت بڑی بات ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی شخص حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کھلم کھلا نبوّت کا دعویٰ لے کر اٹھے اور اس کی دعوتِ باطل کو اسی مسلم معاشرے میں پھیلنے کا موقع حاصل ہوتا چلا جائے۔ یہ اتنا بڑا گناہِ عظیم ہے کہ اسے ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہ کیا جانا چاہیئے تھا کجا کہ اس کے معاملے میں اس قدر تساہل برتا جاتا کہ وہ صدی کی آٹھ نو دہائیوں تک نہ صرف ہمارے ملک میں، بلکہ دوسرے مسلم اور غیر مسلم ملکوں میں بھی پھیلتا چلا جاتا۔ اس معاملے میں ہم اُس دَور کے لئے تو اللہ جل شانہٗ کے سامنے کچھ عذر پیش بھی کر سکتے ہیں جب کہ ہم پر انگریزی حکومت مسلط تھی اور ہم اُس کے آگے بے بس تھے اور وہ اس فتنے کی آبیاری کر رہی تھی۔ لیکن انگریزوں سے آزاد ہونے کے بعد جب پاکستان کا اقتدار خود مسلمانوں کے ہاتھ میں آگیا۔ اُس وقت ۲۷ سال تک اس فتنے کی آبیاری خود انگریزوں سے بھی بڑھ کر ہمارے مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں ہونا اور اس کو اتنی طاقت پکڑ جانے کا موقع دینا کہ وہ پاکستان کی حکومت پر قابض ہو جانے کا حوصلہ کرنے لگے" ایسا اکبر الکبائر ہے جس پر کوئی عذر ہم اپنے رب کے حضور پیش نہیں کر سکتے۔ اب اگر ہم اِسی پچھلے طرزِ عمل کو جاری رکھتے ہیں تو خدا کے عذاب سے ہمیں کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس لئے میں عام مسلمانوں سے بھی کہتا ہوں کہ جو تحریک انھوں نے اِس فتنہ" غلام احمدیت سے نجات حاصل کرنے کے لئے شروع کی ہے اسے ایک قطعی فیصلے تک پہنچائے بغیر ہرگز نہ چھوڑیں اور ملک کی حکومت اور قومی اسمبلی سے بھی کہتا ہوں کہ وہ خدا کے حضور اپنی جواب دہی کو یاد کریں سیاسی اغراض و مصالح کو بھول جائیں اور پوری ایمانداری کے ساتھ وہ فیصلہ کریں جو عین ان کے دین و ایمان کے مطابق ہے۔

یہ معاملہ جو اس وقت اسمبلی میں زیر بحث ہے اپنے اندر کوئی پیچیدگی نہیں رکھتا بلکہ کھلے آسمان کی طرح صاف اور عیاں ہے جس شخص کو دین کی معمولی واقفیت بھی حاصل

ہو وہ جانتا ہے کہ اسلام میں نبوّت ایک فیصلہ کن چیز ہے اگر نبی سچا ہو اور کوئی اس کو نہ مانے تو کافر۔ اور اگر وہ جھوٹا ہو اور کوئی اسے مان لے تو کافر۔ بہرحال ایک دعوائے نبوت کے بعد یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ اُس کے ماننے والے اور اُس کا انکار کرنے والے ایک امّت میں جمع ہو سکیں۔ نبوّت ایک سنگین دیوار ہے جو دونوں گروہوں کے درمیان ہمیشہ کے لئے حائل ہو جاتی ہے اور انھیں نہیں ملنے دیتی جب تک کہ وہ منہدم نہ ہو جائے۔ ہر نبوت اپنے ماننے والوں کی ایک الگ اُمت بناتی ہے اور نہ ماننے والوں کو قطعی طور پر ان سے جدا کر دیتی ہے۔

یہ تو ہے بجائے خود نبوت کی اُصولی حیثیت۔ لیکن اسلام میں اس امر کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوّت کا دعویٰ لیکر اٹھنے والا کوئی شخص سچا نبی ہو سکے۔ اس لئے کہ قرآنِ حکیم، احادیث صحیحہ اور اجماعِ امّت کی رو سے حضورؐ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ صحابۂ کرامؓ نے حضورؐ کے بعد نبوّت کا دعویٰ کرنے والے کسی شخص سے بھی یہ نہیں پوچھا کہ اس کے نبی ہونے کی دلیل کیا ہے بلکہ بالاتفاق اس کو جھوٹا مدعی قرار دے کر اُس سے اور اُس کے ماننے والوں سے جنگ کی اور اُن کو وہ حقوق بھی نہیں دیئے جو اسلامی قانون میں مسلح بغاوت کرنے والے مسلمانوں یا ذمّیوں کو دیئے جاتے ہیں۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے دَور سے آج تک چودہ سو برس کی مدّت میں ہر زمانے کے مسلمان اس بات پر متفق رہے ہیں اور اس میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا ہے کہ بعثتِ محمدیہ علی صاحبہا السلام کے بعد نبوت کا دعوےٰ کرنے والا ہر شخص جھوٹا ہے، کافر ہے اور اس پر ایمان لانے والا بھی کافر ہے۔ حتیٰ کہ ایسے مدعی سے اُس کی نبوت کی دلیل پوچھنا بھی کفر ہے۔ کیونکہ دلیل پوچھنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ کھلا سمجھ رہا ہے اور اُسے کھلا سمجھنا بجائے خود قرآن و حدیث اور اجماع کی رُو سے کفر ہے۔

اب دیکھئے۔ ایک طرف تو دعوائے نبوّت بعد از خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اسلام کا یہ صریح اور متفق علیہ حکم ہے اور دوسری طرف یہ ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا، اپنی نبوت تسلیم کرنے کی لوگوں کو دعوت دی، نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیا اور ماننے والوں کی ایک الگ اُمت بنائی جس کا کوئی فرد اپنے باپ کا جنازہ بھی نہیں پڑھ سکتا اگر وہ اس نئی نبوت پر ایمان نہ لایا ہو۔ سوال یہ ہے کہ یہ مدعی آخر سچا کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جب یہ سچا نہیں ہے تو اس کے کافر ہونے اور اسکی تصدیق کرنے والے سب لوگوں کے کافر ہونے میں شک کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟ اور اس نئے نبی کی یہ اُمت مسلمانوں ہی کے اندر کا ایک فرقہ کیسے قرار پا سکتی ہے جب کہ وہ اسلام کی سرحد توڑ کر خود اس سے باہر نکل چکی ہے؟

لیکن یہ اس نئی امت اور اس کے بانی مدعیِ نبوت کی انتہائی چالاکی ہے کہ اس نے اسلام کی سرحد سے نکل کر بھی اپنے دین کو اصل اسلام قرار دیا، اسلام ہی کے نام سے اس کی تبلیغ کی اور لاکھوں مسلمانوں کو اس گمراہی میں مبتلا کیا کہ کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے قائل ہوتے ہوئے بھی وہ کافر رہتے ہیں جبتک کہ مرزا غلام احمد کی نبوت کا کلمہ اس کے ساتھ نہ ملائیں۔ اگر یہ لوگ سیدھی طرح اسلام سے نکل کر کسی دوسرے نام سے اپنی الگ اُمت بنا لیتے اور اپنے آپ کو مسلمان نہ کہتے تو اتنا بڑا فتنہ نہ بنتے جتنا بڑا فتنہ وہ اُمّت در اُمّت کی صورت اختیار کرکے بن گئے ہیں۔ وہ اپنے مذہب کا کوئی دوسرا نام رکھ کر اُس کی تبلیغ کرتے تو کسی ایک مسلمان کو بھی اس بات پر آمادہ نہ کر سکتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی چھوڑ کر مرزا غلام احمد کی پیروی قبول کر لے۔ وہ نہ انگریزی حکومت کے دَور

مسلمانوں کے حقوق کا بڑا حصہ ہتھیا سکتے تھے اور نہ
پاکستان قائم ہونے کے بعد انھیں یہ موقع مل سکتا تھا
کہ حکومت کے نظم ونسق اور اس کی مسلح افواج اور اس کے
زیر اثر معاشی زندگی کے ہر شعبے میں پھیلتے اور بڑھتے
چلے جاتے۔ مگر یہ ان کی انتہائی عیاری تھی کہ انھوں نے
مسلمانوں کو کافر قرار دے کر ان سے الگ اپنی امت
بھی منظم کی اور پھر مسلمانوں کی امت میں شامل رہ کر وہ
سرطان کے پھوڑے کی طرح جسدِ ملت میں اپنی جڑیں
بھی پھیلاتے رہے۔ یہ ان کی اسی عیاری کا نتیجہ ہے کہ
انھیں مسلمانوں کا ایک فرقہ سمجھا جاتا رہا، مسلمانوں کو
توڑ توڑ کر وہ اپنی امت میں ملاتے اور اپنی تعداد
بڑھاتے رہے اور ایک منظم طریقے سے پیہم کوشش کر کے
مسلم معاشرے اور حکومت پر اس طرح چھاتے چلے
گئے کہ اب وہ پاکستان کے حکمراں بن جانے
کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

ربوہ کا حادثہ اسی پس منظر میں پیش آیا ہے اور یہ
گویا مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آخری
تنبیہ ہے کہ اگر ان میں کچھ بھی دینی حس باقی ہے تو امتِ
محمدیہ کے اندر امتِ غلام احمدیہ کے پھلنے پھولنے کا ہر
راستہ بند کر دیں۔ ہزار ہزار شکر ہے اس خداوند عظیم
کا کہ اس تنبیہ پر پاکستان کے علماء و مشائخ، سیاسی
لیڈر اور عام مسلمان بھی پوری طرح بیدار ہو گئے اور حکومت
بھی بر وقت اس کی طرف متوجہ ہو گئی جیسا کہ صمدانی
ٹریبونل کے قیام، مسٹر بھٹو کی ۱۳ر جون والی تقریر
اور پوری قومی اسمبلی کے ایک کمیٹی کی صورت میں اس مسئلے
کے حل کی کوشش میں لگ جانے سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس موقع پر میں چند ضروری تجاویز پیش کرتا ہوں
جن سے میرے نزدیک یہ مسئلہ بخوبی حل کیا جا سکتا ہے۔

۱ میری پہلی تجویز یہ ہے کہ پاکستان کے دستور کی دفعہ
۲ میں، جو ریاست کا مذہب اسلام قرار دیتی ہے،
حسب ذیل دو شقوں کا اضافہ کیا جائے:-

(۱) اللہ کی توحید، تمام انبیاء کے بعد محمد صلی اللہ علیہ
کو اللہ کا آخری نبی ماننا، تمام کتبِ الٰہیہ کے
قرآن مجید کو اللہ کی آخری کتاب تسلیم کرنا اور آ
پر ایمان رکھنا اسلام کے لازمی بنیادی عقائد ہیں
جن میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔

(۲) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص نبی
ہونے کا دعویٰ کرے، اور ایسے مدعی کو جو شخص ا
مذہبی پیشوا مانے وہ کافر اور خارج از اسلام ہے
قطع نظر اس سے کہ وہ مدعی خود اپنے آپ کو یا اس
کے پیرو گروہ اس کو ظلی یا بروزی یا امتی یا غیر
تشریعی نبی کہے یا مسیح موعود، مجدد، محدث وغیرہ
ناموں سے یاد کرے۔

۲- میری دوسری تجویز یہ ہے کہ دستور کی دفعہ ۱۰۶ کی شق
(۳) میں جہاں اقلیتوں کا ذکر ہے وہاں بدھ مت
والوں کے بعد "مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروؤں
کا اضافہ کر دیا جائے۔

۳- میری تیسری تجویز یہ ہے کہ دفعہ ۶ شق (۱) کے بعد
حسب ذیل شق (۲) کا اضافہ کر کے بقیہ شقوں کو
ان دونوں شقوں کے مطابق کر دیا جائے۔

"کوئی شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو اور
اس کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد
نبوت کا دعویٰ کرے، یا ایسا دعویٰ کرنے والے
کو اپنا مذہبی پیشوا مانے یا لوگوں کو اسے مذہبی
پیشوا ماننے کی دعوت دے یا اسے نہ ماننے
والوں کو کافر قرار دے وہ بھی خیانتِ عظمیٰ
(HIGH TREASON) کا مرتکب سمجھا
جائے گا۔"

ان ترمیمات سے دستور کی حد تک نئی نبوت کے فتنے کا
کما حقہٗ سدِّباب ہو جاتا ہے۔ میری تجویز کردہ ان دستوری
ترمیمات پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ دستور جیسی دستاویز
میں کسی شخص خاص کا نام لینا مناسب نہیں ہے۔ ہمارا دستور

قرآن سے زیادہ مقدس تو نہیں ہو سکتا۔ اس میں جب ابولہب کا نام لیا گیا ہے تو ہمارے دستور میں مرزا غلام احمد کا نام لینا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ قادیانی مسئلے کو حل کرنے کے لئے اس گروہ کے بانی کا نام لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ قومی اسمبلی ایک قرارداد کے ذریعہ سے حکومت کو حسب ذیل تدابیر جلدی سے جلدی اختیار کرنے کا مشورہ دے۔

(۱) تمام ملازمین حکومت سے ایک ڈیکلریشن فارم پُر کرایا جائے جس میں ہر ملازم یہ واضح کرے کہ وہ مرزا غلام احمد کو اپنا مذہبی پیشوا مانتا ہے یا نہیں۔

(۲) جو شخص غلط ڈیکلیریشن دے اس کی غلط بیانی جس وقت بھی ظاہر ہو اسی وقت اس کو ملازمت سے الگ کر دیا جائے اور اس کے تمام حقوق جو سرکاری ملازمت کی بنا پر اسے حاصل ہوں ساقط کر دیئے جائیں اور اُس کو آئندہ ہر ملازمت کیلئے نااہل قرار دے دیا جائے۔

(۳) رائے دہندوں کی فہرست اور مردم شماری میں پیروانِ مرزا غلام احمد کا خانہ علیحدہ رکھا جائے۔

(۴) شناختی کارڈوں اور پاسپورٹوں میں بھی مرزا غلام احمد کے پیروؤں کے لئے ان کے نام کے ساتھ ان کے مذہب کی تصریح کی جائے۔

(۵) تمام کلیدی اسامیوں سے اس گروہ کے افراد کو ہٹا لیا جائے۔

(۶) سرکاری ملازمتوں میں اس گروہ کے لوگوں کا تناسب ان کی آبادی کے مطابق کر دیا جائے اور تناسب سے بہت زیادہ مناصب اُن کو دیکر مسلمانوں کے ساتھ جو بے انصافی کی جاتی رہی ہے اس کا تدارک کیا جائے۔

(۷) ربوہ کی زمین جن شرائط پر انھیں دی گئی ہے ان پر نظر ثانی کی جائے اور مفادِ عامہ کو ملحوظ رکھ کر از سرِ نو شرائط مقرر کی جائیں۔ نیز اگر یہ ثابت ہو کہ انھوں نے گرانٹ کی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے تو اس گرانٹ کو منسوخ کر دیا جائے۔

(۸) ربوہ کو جسے انھوں نے ریاست در ریاست بنا رکھا ہے کھلا شہر قرار دیا جائے اور وہاں مسلمانوں کو جائداد حاصل کرنے، سکونت اختیار کرنے یا کاروبار کرنے کے پورے مواقع دیئے جائیں۔

ایسی قرارداد پاس ہونے کے بعد اگر حکومت اس پر مستعدی کے ساتھ انتظامی کارروائی کرے تو ملک بہت جلد اُن خطرات سے محفوظ ہو سکتا ہے جو اس فتنے کے ۸۰ — ۹۰ سال تک پروان چڑھتے رہنے سے اب علانیہ رونما ہو رہے ہیں۔

اس کے علاوہ میں وزیر اعظم صاحب سے دو گزارشیں اور کروں گا۔ ایک یہ کہ صمدانی ٹریبونل کی رپورٹ کو بلا کم و کاست شائع کریں۔ دوسرے یہ کہ ختم نبوت کی تحریک پر جو بے جا پابندیاں ملک میں لگائی گئی ہیں، جو گرفتاریاں اس تحریک کو روکنے کے لئے عمل میں لائی گئی ہیں اور پریس کا گلا گھونٹنے کے لئے جو کچھ کیا گیا ہے اس پورے سلسلے کو انھیں فوراً ختم کر دینا چاہئے کیونکہ یہ سب کچھ ان کی ۱۳ رجون والی تقریر کی روح اور معنی کے بالکل خلاف ہے۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْن۔ ترجمان القرآن (لاہور) ستمبر ۷۴ء۔

تازہ پاکستانی قانون کا متن

"جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جو آخری نبی ہیں کے خاتم النبیین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی مفہوم میں یا کسی بھی قسم کا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے وہ آئین یا قانون کی اغراض کے لئے مسلمان نہیں ہے"

(حریت (کراچی) ۹ ستمبر ۷۴ء)

مراسلہ مع جواب

زبان و لغت کی بحثیں

محترم المقام جناب ایڈیٹر صاحب رسالہ تجلی۔

السلام علیکم۔ ہر چند کہ شمیم کرہانی صاحب کا زیر تبصرہ مجموعۂ کلام ان جیسے شاعر کے شایانِ شان نہیں لیکن جناب نے جو ناقدانہ تبصرہ اُن کے مذکورہ کلام پر تجلی ماہ اکتوبر ۶۲ء میں فرمایا ہے اس میں بعض مواقع پر فاحش غلطیاں آپ سے صادر ہوئی ہیں جو آپ جیسے بالغ النظر ادیب کے کسی طرح مناسبِ حال نہیں۔ مثال کے طور پر مقاماتِ ذیل کی نشاندہی کی جاتی ہے:-

(۱) ارضِ ستم پہ شیوۂ دخترکشی ہے عام
ہوتا ہے یہ مقاتلہ دھرتی پہ صبح و شام

اس شعر میں آپ نے لفظ مقاتلہ پر گرفت کی ہے حالانکہ لفظ مقاتلہ میں اگر آپ وسعتِ نظر سے کام لیتے تو یہ تنقید نہ فرماتے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شاعر نے ضرورتِ شعری سے یہ لفظ یہاں استعمال کیا ہے لیکن مقاتلہ کے معنی قتل ہی لیا ہے اور سارے اہلِ علم کو یہ بات معلوم ہے کہ باب مفاعلۃ کا خاصّہ جس طرح مشارکت ہے اُسی طرح اُس کی ایک دوسری خاصیت مجرد کی موافقت بھی ہے جسکے معنی ہی عدم مشارکت اور عدم شرکت کے ہیں کما فی نوادر الاصول شرح فصول۔ بس لفظ مقاتلہ قتل کے معنی میں استعمال کرنا نہ خلاف گرامر ہے اور نہ خلاف لغت۔ دیکھئے فیروز اللغات مقاتلہ بمعنی قتل۔ اس کی نظیر لفظ مغالطہ ہے۔ جو دھوکا بھول چوک کے معنی میں بھی مستعمل ہے چنانچہ آپ نے بھی لفظ مغالطہ کو اسی اخیر معنی میں اپنی تنقید میں استعمال کیا ہے۔

(۲) ع:- رکھتے نہیں یگانہ و دشمن میں امتیاز۔ اس مصرعہ میں آپ نے یہ لغوی غلطی نکالی ہے کہ لفظ یگانہ۔ دوست، اپنا، عزیز، قرابت مند، موافق وغیرہ کے معنی میں نہیں آتا۔ بلکہ اس کا ترجمہ تو صرف یکتا ہے۔ جناب مولانا! آپ نے اپنے غلط پندار اور لاعلمی کی بنا پر یہ فیصلہ فرمایا ہے اسلئے کہ لغت کی کتابیں آپ کے اس قول کی تردید اور کرہانی صاحب کی تائید۔ دیکھئے جامع اللغات، فیروز اللغات، برہان قاطع۔ اسی ضمن میں آپ نے مزید یہ مضحکہ انگیز گلفشانی فرمائی ہے کہ:-

"شاید مغالطہ انھیں شمیم کرہانی صاحب کو لفظ بیگانہ سے ہوا کہ جب بیگانہ کے معنی غیر، دشمن، اجنبی وغیرہ کے ہیں تو یگانہ کے معنی اپنے، خویش، دوست وغیرہ کے ہوں گے۔"

جناب مولانا لغت کی کتابیں اس بات کی صراحت کر رہی ہیں کہ یگانہ و بیگانہ دو متقابل لفظ ہیں یگانہ کے معنی دوست، اپنا وغیرہ کے ہیں اور بیگانہ کے دشمن، اجنبی، غیر کے ہیں اور اس بات کی طرف بھی مشیر ہیں کہ بیگانہ یگانہ سے بنا ہے۔ دیکھئے فیروز اللغات، جامع اللغات، ہاں یہ دوسری بات ہے کہ لفظ یگانہ مختلف المعانی لفظ ہے اس لئے کہ اس کا ایک دوسرا معنی یکتا و بے مثل کے ہیں لیکن یہ لفظ اس دوسرے معنی کے لئے

مخصوص نہیں ہے جیساکہ جناب نے سمجھا اور لکھا ہے۔ اب آپ فرمایئے مغالطے میں کرہانی صاحب مبتلا ہیں یا آپ؟ آپ ہی فیصلہ کیجئے۔

(۳) قتّال روشنی ہے اندھیروں کا ساز باز۔ اس مصرعہ میں آپ نے لفظ قتّال پر یہ گرفت کی ہے کہ قتل سے مبالغہ کا صیغہ قتّال نہیں آتا۔ جناب مولانا اگر سماعی نہیں آتا جیساکہ عربی کتب لغت سے معلوم ہوتا ہے تو قیاسی تو آسکتا ہے جیساکہ المنجد کے مؤلف نے مقدمہ میں لکھا ہے۔ اوزان المبالغة کلها سماعیة ولا تبنی الا من الثلاثی اور جیساکہ نوادر الاصول میں ہے فعّال کا وزن مطرد ہے اور اشہر اوزان مبالغہ میں یہ وزن نمبر اول پر ہے۔ کمافی مقدمۃ المنجد۔ اسی وجہ سے تمام ہی اردو لغات میں قتّال کا ترجمہ صیغہ مبالغہ کا کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو جامع اللغات۔ فرہنگ عامرہ۔ فیروز اللغات۔ سعیدی ڈکشنری وغیرہ۔

مذکورہ بالا سطریں اس لئے تحریر کی گئی ہیں کہ آپکو تنبیہ ہوجائے اور جو قارئین آپ کی تنقید سے غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے ہوں اس کا ازالہ ہوجائے اس لئے اگر اپنے موقر رسالہ تجلی کے کسی گوشے میں اس کو جگہ دے کر چھاپ دیں تو آپ شکریے کے مستحق ہوں گے۔

حکیم محمد انعام الحق الاعظمی غفرلہ۔ مئو ناتھ بھنجن

تجلّی

(۱) یہ بات اصولاً درست ہے کہ باب مفاعلة کا خاصّہ جہاں مشارکت ہے وہاں موافقت بھی ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے کہ ہم اہلِ زبان کا طریقِ استعمال دیکھے بغیر جہاں چاہے مشارکت لے لیں اور جہاں چاہے موافقت۔ زبان و انشاء میں جتنی اہمیت قیاس کی ہے اتنی ہی سماع کی بھی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ زبان بعض مآخذ کو تو باب مفاعلة میں موافقت ہی کے طور پر بولتے ہیں مثلاً مسافرت (یعنی سفر)، معاندت (عناد) منافقت (نفاق)، مگر بعض مآخذ کو مشارکت سے مخصوص رکھتے ہیں جیسے مناظرۃ (فریقین کا ایک دوسرے سے بحث کرنا) مشارکة (ایک دوسرے کا شریک کار ہونا) مباہلة (ایکدوسرے پر لعنت کرنا)

کوئی مقرر بہت مدلل تقریر کرگیا ہو تو آپ یوں نہیں کہہ سکتے کہ اس نے بڑا شاندار مناظرہ کیا۔ اسی طرح کوئی شخص جرمِ قتل میں گرفتار ہوجائے تو یوں نہیں کہا جاتا کہ یہ مقاتلہ کا مجرم ہے۔ حالانکہ "مقاتلہ" اپنے بعض مشتقات میں بمعنی قتل بھی مستعمل ہے جیسے قرآن ہی میں ہے قاتلهم الله انّی یؤفکون۔ یہاں قاتَلَ بمعنی قتل آیا ہے۔ شاید اسی لحاظ سے بعض لغت نگاروں نے مقاتلہ کے معنی "قتل" بھی لکھ دیئے ہیں لیکن زبان کا معاملہ کورا منطق کا معاملہ نہیں ہے دیکھنا یہ پڑے گا کہ لفظ مقاتلہ اپنی مصدری شکل میں بھی بمعنی قتل استعمال ہوتا ہے یا نہیں۔

ہمارے محدود علم کی حد تک اردو میں ایسا استعمال نایاب ہے۔ آپ اگر اردو کے کسی مستند ادیب و شاعر کے یہاں اس کی کوئی نظیر دکھا سکیں تو بے شک آپکا معارضہ درست اور ہمارا اعتراض نادرست لیکن نہ دکھا سکیں تو مجرد قیاس کی بنا پر اس طرح کے قضیوں کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اس سے ہم بھی بے خبر نہیں کہ باب مفاعلة کے بے شمار مصادر اردو میں بطور موافقت ہی مستعمل ہیں جیسے مجاہدہ۔ مکاشفہ۔ مراقبہ۔ معائنہ۔ مرافعہ۔ مطالعہ۔ مبالغہ۔ مغالطہ۔ مگر بہتیرے مصادر بطور مشارکت ہی استعمال ہوتے ہیں جیسے معاہدہ۔ مباہلہ۔ مناظرہ۔ مقابلہ۔ مقاتلہ۔ منازعہ۔ زید اگر تہیّہ کرتا ہے کہ وہ آئندہ رشوت نہیں لے گا تو یوں یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ زید نے آئندہ رشوت نہ لینے کا عہد کیا ہے لیکن یوں نہیں کہا جاسکتا کہ رشوت نہ لینے کا معاہدہ کیا ہے۔ حالانکہ اگر ہر جگہ باب مفاعلة سے موافقت کا مفہوم لینا بجا ہوتا تو اس کہنے میں کوئی خامی نہ ہوتی۔ ثابت ہوا کہ ثانی الذکر قسم کے الفاظ کیلئے

اول الذکر قسم کے الفاظ کو نظیر نہیں بنایا جا سکتا بلکہ اہلِ زبان کا رواج 'عُرف' معمول اور طریق دیکھنا ہوگا۔

رہی "ضرورتِ شعری" — تو اس کے بھی کچھ ـدود وقیود ہیں۔ اول تو یہ بات بجائے خود قدرتِ یان کی کمی پر دلالت کرتی ہے کہ ہم صحیح و معروف زبان میں شعر پورا نہ کر سکیں بلکہ الفاظ میں کھینچ تان کریں۔ قادر الکلام شعراء "ضرورتِ شعری" کے آگے ہتھیار نہیں ڈالا کرتے۔ دوسرے یہ کوئی لامحدود قاعدہ نہیں ہے کہ ضرورتِ شعری کے عذر سے جو چاہے لکھ جائیے۔ محل "چڑیا" کا ہو اور آپ وزن "مرغاب" سے پورا کریں یا محل "چارپائی" کا ہو اور آپ "مرقد" لکھ ڈالیں تو اسے کون جائز مانے گا حالانکہ رقد کے معنی ہیں سونا اور مرقد سونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ مگر یہ لغوی منطق محاورے کے آگے نہیں ٹھہرتی۔ ضرورتِ شعری کے عذر سے چارپائی یا بیڈ روم کو "مرقد" نہیں کہا جا سکتا۔ مرقد تو کم سے کم اردو میں قبر کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔ اسی طرح لفظ مقاتلہ کا استعمال اردو میں صرف ایسی ہی صورتوں میں ممکن ہے جب کوششِ قتل دو طرفہ ہو نہ کہ یک طرفہ۔

(۲) آپ کی یہ گرفت لغوی حیثیت سے درست ہے اور ہم اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہیں۔ اردو اور فارسی لغت اٹھا کر دیکھیے۔ "یگانہ" کے معنی دوست اور رشتہ دار کے ہی لکھے ہیں۔ گو کہ یہ بکثرت "یکتا" ہی کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے مگر ہم سے اعتراض ہیں بہرحال چوک ہوئی۔ یہ چوک کسی "پندار" کا نتیجہ نہیں بلکہ جلد بازی کا ثمرہ سمجھیئے۔ فارسی ہم نے عربی کی طرح نہیں پڑھی اور جتنی پڑھی تھی اسے بھی استعمال کرنے کا موقعہ نصیب نہیں ہوا لہٰذا اس پر گرد کی تہیں چڑھ ہی جانی چاہئیں۔ پندار جس خبیث شے کا نام ہے اس سے تو ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ بہرحال اعترافِ قصور کے ساتھ ہم اس قصور کی معافی بھی شمیم کرہانی صاحب سے طلب کرتے ہیں۔ آپ کے شکرگذار ہیں کہ ہماری صحیح رہنمائی فرمائی۔

(۳) قتال ایک عربی لفظ ہے۔ اس پر گفتگو کرتے ہوئے آپ کو عربی لغات کے حوالے دینے چاہئیں تھے۔ جن لغات کے آپ نے حوالے دیئے ان میں المنجد کے سوا سبھی اردو فارسی لغات ہیں۔ المنجد کے مقدمہ سے جو فقرہ آپ نے نقل کیا اس سے آپ کے استدلال کو کوئی قوت نہیں پہنچتی۔ اس سے بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ مبالغے کے تمام اوزان سماعی ہیں اور فعّال کا وزن بہت زیادہ مشہور و متداول ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک بات کا بھی ہم نے انکار نہیں کیا۔ غور کیجئے تو پہلی بات ہماری ہی تائید میں جاتی ہے۔ ہمارا کہنا یہ تھا کہ "قتل" کے مصدر سے مبالغہ کا صیغہ قتّال نہیں سنا گیا۔

اِس عرض داشت کی تردید اس صورت میں تو ہو جاتی جب آپ کسی عربی لغت یا کلامِ عرب سے نظیر لے آتے کہ دیکھو قتّال برائے مبالغہ استعمال کیا گیا ہے۔ مگر آپ نظیر لانے کے بجائے یہ معارضہ کر رہے ہیں کہ نہ سہی سماعاً۔ قیاساً تو قتل سے قتّال بنا سکتے ہیں۔ یہ تکنیک اصولِ بحث کے اعتبار سے درست نہیں۔

آپ نے جن اردو فارسی لغات کا حوالہ دیا ان میں سوائے فرہنگ عامرہ کے ہمیں اس وقت کوئی اور مہیا نہیں ہو سکی۔ یہ مکتبہ اشاعت اردو۔ جامع مسجد (دہلی) کا شائع کردہ ایڈیشن ہے۔ اس میں تو ہمیں قتّال کے معنی "بہت قتل کرنے والا" ملے نہیں حالانکہ آپ کی تصریح کے مطابق ملنے چاہئیں تھے۔

بہرحال خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ اگر آپ کے نزدیک شمیم کرہانی صاحب ایسے اہلِ زبان کی صف میں شامل ہوں جنھیں بطور مجتہد قبول کیا جا سکتا ہے تو آپ بشوق ان کے قیاس و اجتہاد پر آمنّا و صدقنا کہے جائیں لیکن اوروں پر اپنے حسنِ اعتقاد کی ذمہ داری نہ ڈالیں۔

فقط والسّلام ـــ عامر عثمانی

تبصرے کی آخری قسط

تفسیر ماجدی (جلد دوم)

(۱)

سورۂ توبہ کے ترجمے پر نظر ڈالنے کے بعد اب ہم اس کی تفسیر کا مطالعہ کرتے ہیں۔

(۱) آیت ۳۰ میں اللہ تعالیٰ بیان فرما رہا ہے کہ یہود کہتے ہیں عُزیر ابنُ اللہ ہیں اور عیسائی کہتے ہیں مسیح ابنُ اللہ ہیں۔ یہ سب واہیات باتیں ہیں۔ یہ لوگ پچھلے کافروں کی راہ چل رہے ہیں۔

یہاں فاضل مفسر نے ترجمہ میں ابنُ اللہ کے بعد بریکٹ میں "(خدا کے فرزند مجازی)" کے الفاظ سپردِ قلم فرمائے اور اس کی تشریح ذیلی نوٹ میں یوں کی :-

"عربی میں ابن اور ولد دو الگ الگ مفہوم رکھنے والے لفظ ہیں۔"

پھر فرمایا کہ ابنُ اللہ سے مراد صُلبی یا حقیقی فرزند نہیں بلکہ خدا کا لاڈلا اور چہیتا یا فرزند معنوی و مجازی ہے۔ جیسے قرآن ہی میں ایک دوسری جگہ اہلِ کتاب ہی کی زبان سے استعمال ہوا ہے۔ قَالُوا نَحْنُ اَبْنَاءُ اللہِ وَاَحِبَّاءُہٗ۔ یہاں ابناء اللہ کے کھلے ہوئے معنی یہی مجازی و معنوی اولاد کے ہیں۔ یہود اسی معنی میں حضرت عُزیر کو اپنا مُطاعِ کل اور بارگاہِ حق میں محبوبِ مطلق مانتے تھے۔

گویا ممدوح یہ کہہ رہے ہیں کہ یہودی حضرت عُزیر کو ولد اور فرزند کے معنی میں اللہ کا بیٹا نہیں کہتے تھے بلکہ لاڈلے اور چہیتے کے مفہوم میں ابنُ اللہ کہا کرتے تھے اور یہاں قرآن اسی پر نکیر کر رہا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ویسے تو ممدوح ہر ورق پر کسی نہ کسی تفسیر کی شہادت پیش کرنے کی روش اختیار فرمائے ہوئے ہیں لیکن اس نوٹ میں اپنی رائے کیلئے انھوں نے کوئی بھی نقل پیش نہیں کی حالانکہ ان کی رائے جمہور مفسرین کی رائے سے ٹکرا رہی ہے۔ جمہور مفسرین کی رائے یہ ہے کہ جس طرح نصرانی حضرت عیسیٰؑ کو ٹھیک ولد اور فرزند کے معنی میں ابنُ اللہ کہتے ہیں اسی طرح یہود میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو گئے تھے جو حضرت عزیر کی عند اللہ محبوبیت سے آگے بڑھ کر انھیں خدا کا فرزند کہنے لگے تھے۔ اللہ تعالیٰ یہاں اسی واہی قول پر غصے اور ناراضگی کا اظہار فرما رہا ہے۔ ایسے موقعہ پر بہت ضروری ہو جاتا تھا کہ ممدوح جمہور کی رائے کی تردید اور اپنے خیال کی تائید میں ایک طرف نقل و روایت کی شہادتیں پیش کرتے دوسری طرف دلائلِ عقلیہ حوالۂ قلم فرماتے تاکہ ہم جیسے قارئین فیصلہ کر سکتے کہ جمہور کا خیال کیوں غلط اور ممدوح کا کیوں صحیح ہے۔

جمہور مفسرین کی رائے کے سلسلے میں ہم یہاں صرف ان اردو تفسیروں کی نقل پر اکتفا کریں گے جنھیں تقابلی مطالعے کے لئے سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ شاہ عبد القادرؒ نے "اللہ کا بیٹا" ترجمہ کیا اور اس کی وجہ بھی بتائی کہ کیوں یہود نے انھیں اللہ کا بیٹا کہا تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے بھی یہی ترجمہ کیا اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے تفسیری نوٹ میں رقم فرمایا :-

"روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض یہود کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عُزیر خدا کے بیٹے ہیں لیکن یہ عقیدہ عام یہود کا نہ تھا اور زمانہ مابعد میں تو بعض علماء نے لکھا ہے کہ اب کوئی یہودی اس عقیدے کا

باقی نہ رہا۔ اگر عہدِ نبوی صلعم میں یہود کا کوئی
فرقہ اس کا قائل نہ ہوتا تو ضرور تھا کہ اس
وقت یہود قرآن کی حکایت کی تردید کرتے۔"

مولانا اشرف علیؒ خدا ابیٹا ترجمہ کرکے تفسیر میں لکھتے ہیں:
"مشرکینِ عرب جو ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے
تھے مطلب یہ کہ ان کو تو یہ بھی کافر سمجھتے ہیں
پھر ان ہی کی کفریات بکتے ہیں۔"

یہیں مولانا اشرف علی نے حاشیہ میں تفسیرِ دُرِّ منثور سے حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت بھی چار محدثین کے حوالے سے نقل کی کہ فلاں فلاں یہود رسول اللہ صلعم کی بارگاہ میں آئے اور کہا کہ ہم آپ کی پیروی کیسے کر سکتے ہیں جبکہ آپ نے ہمارے قبلہ کو بھی چھوڑ دیا اور آپ حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا بھی نہیں مانتے۔

مولانا مودودی نے دہی "اللہ کا بیٹا" ترجمہ کرکے حضرت عزیر کے بارے میں لکھا:۔

"بعض یہودیوں نے ان کو ابنُ اللہ تک بنا
دیا۔ یہاں قرآن مجید کے ارشاد کا مقصود
یہ نہیں ہے کہ تمام یہودیوں نے بالاتفاق عزرا
کاہن کو خدا کا بیٹا بنایا ہے بلکہ مقصود یہ
بتانا ہے کہ خدا کے متعلق یہودیوں کے اعتقادات
میں جو خرابی رونما ہوئی وہ اس حد تک ترقی
کر گئی کہ عزرا کو خدا کا بیٹا قرار دینے والے بھی
ان میں پیدا ہو۔"

علامہ آلوسی (صاحب رُوح المعانی) جن کی تفسیر جملہ قدیم مفسرین کے خیالات کی جامع اور مفصّل ترہے وہ بھی ایسی کوئی بات نہیں کہتے جس سے یہ منکشف ہو کہ فلاں یا فلاں مفسر کے نزدیک یہاں "ابن" کے معنی بیٹے کے نہیں لاڈلے اور چہیتے کے ہیں۔

اب معقولات کی طرف آئیے۔

سب سے پہلا فقرہ ہی ممدوح کا سخت قابلِ نظر ہے۔ کس نے کہا کہ عربی میں ابن اور ولد دو الگ الگ مفہوم رکھنے والے لفظ ہیں۔ علی الاطلاق یہ دعویٰ فاحش حد تک غلط ہے۔ کہنا یوں چاہیئے کہ لفظ ابن کبھی فرزند کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کبھی محبوب کے معنی میں اور کبھی ان دونوں سے ہٹ کر۔ نحن ابناء اللہ کی جو مثال ممدوح نے پیش کی ہے بے شک اس میں یہ لفظ محبوب ہی کے معنی میں آیا ہے لیکن کیا اسی قرآن میں اللہ جب "عیسیٰ ابن مریم" فرماتا ہے تو کیا یہاں بھی فقط محبوب کے معنی ہوتے ہیں بیٹے کے نہیں؟ مثلاً جب وہ ابناء بعولتھنّ یا ابناء اخوانھنّ یا ابناء اخواتھنّ کہتا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ سوائے صُلبی اور حقیقی بیٹوں کے اور بھی کچھ مفہوم لے لیا جائے۔ یا مثلاً حضرت موسیٰؑ جب اپنے حقیقی بھائی حضرت ہارونؑ کو اِبنَ اُمَّ کہہ کر خطاب کرتے ہیں تو کیا ابن کے معنی یہاں ولد کے سوا بھی کچھ ہو سکتے ہیں۔

منطقی زبان میں ولد اور ابن کے مابین عام خاص کی نسبت ہے۔ ہر ولد ابن ضرور ہوگا مگر ہر ابن ولد ہو یہ ضروری نہیں۔ ابن کبھی عین ولد بھی ہو سکتا ہے اور کبھی اسے دوسرے مفہوم میں بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ جیسے ابن السبیل (مسافر) ابن حجر (کنیت) لہذا بلا قید یہ دعویٰ کر گذرنا کہ ابن اور ولد الگ الگ مفاہیم کے الفاظ ہیں صریح خطا ہے۔

اس کے بعد یہ پہلو زیرِ غور لائیے کہ نصرانی کس معنی میں حضرت عیسیٰؑ کو ابنُ اللہ کہتے تھے اور کہتے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف لاڈلے اور چہیتے کے مفہوم میں "ابن" نہیں کہتے بلکہ عین بیٹے اور فرزند کے معنی میں ابن کہتے ہیں اور ان کے لئے اُلوہی صفات کے قائل ہیں۔ لہذا جب ایک ہی فقرے میں عطف کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے "ابنُ اللہ" والے قول کا تذکرہ ہوا تو کسی انتہائی قوی دلیل کے بغیر یہ نہیں مانا جا سکتا کہ پہلے ابن کے معنی تو محض لاڈلے کے ہیں اور دوسرے ابن کے معنی بیٹے کے۔

شاید اسی معارضہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ممدوح مفسر نے قولِ نصاریٰ کے آگے بھی بریکیٹ دے کر "خدا کے

فرزند مجازی" والے الفاظ ثبتِ قرطاس فرما دیئے۔ گویا ان کے نزدیک یہاں نصرانیوں پر بھی اللہ تعالیٰ خفگی کا اظہار اس لئے نہیں کر رہا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا فرزند کہتے ہیں بلکہ اس لئے کر رہا ہے کہ وہ انھیں خدا کا لاڈلا اور محبوب مانتے ہیں۔

ممدوح سوچیں کون ان کی اس تفسیر سے اتفاق کرے گا۔ اپنی تفسیر کو تقویت دینے کے لئے انھوں نے مزید ایک نوٹ لکھا ہے جس میں وہ یہ بتلاتے ہیں کہ مسیحیت کی دو گمراہیاں ایک شدید اور دوسری شدید تر الگ الگ ہیں ایک یہ کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا فرزند مجازی قرار دیتے ہیں اور دوسری یہ کہ انھیں فرزند حقیقی یعنی ولد قرار دیتے ہیں پھر ممدوح کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ قرآن نے اول الذکر خیالِ فاسد کے لئے ابن اللّٰہیت کا عنوان قائم کیا ہے یعنی جب قرآن یہ کہتا ہے کہ نصرانیوں نے عیسیٰؑ کو ابنُ اللّٰہ ٹھیرا دیا تو اس کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ خدا کا محبوب اور لاڈلا ٹھیرا دیا۔

اس نکتے کے لئے ممدوح نے کوئی دستاویزی یا فنی شہادت پیش نہیں کی بلکہ صرف اتنا لکھ دیا کہ "ملاحظہ ہو انگریزی تفسیر القرآن۔" ہم نہیں سمجھتے کہ جمہور مفسرین کی رائے کے خلاف رائے پیش کرتے ہوئے اس طرح کے مبہم اور ناقص حوالے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

غور طلب بات یہ بھی ہے کہ کیا حضرت مسیح اللہ کے محبوب نہیں تھے؟ ممدوح نے مُطاعِ کُل اور محبوبِ مطلق کے الفاظ لکھ تو دیئے لیکن یہ نہیں بتایا کہ اِن الفاظ کا ماخذ کیا ہے قرآن میں تو کہیں یہ الفاظ آئے نہیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام یقیناً اللہ کے محبوب رہے ہیں۔ لہٰذا مجرد یہ بات کہ کوئی قوم ایک نبی کو اللہ کا محبوب مانے کفر نہیں ہو سکتی۔ یہاں آیت میں اللہ نے اس قول کو قولِ کفر ٹھیرایا ہے اور بددعا کے وہ سخت محاوراتی الفاظ استعمال کئے جو بدترین کفر کی طرف مشیر ہیں۔ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ (اللہ انھیں غارت کرے) یہ شدید الفاظ اللہ نے قرآن میں بس ایک جگہ اور سورۂ منافقون میں نہایت مردود قسم کے منافقین کے لئے استعمال فرمائے۔ تو کیا یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ حضرت عزیرؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا خاص محبوب کہنا اس درجہ شدید گمراہی اور کفرِ مبین ہو کہ یہ ہولناک فقرہ اللہ جل شانہٗ قائلین کے لئے استعمال کر ڈالے۔ خود ممدوح اگلے حواشی میں یہ وضاحت کرتے ہیں کہ بددعا کا یہ فقرہ سخت بیزاری اور غصہ و نفرت میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم ناچیز کا اور جمہور مفسرین کا خیال تو یہی ہے کہ "ابن" یہاں ولد ہی کے مفہوم میں لایا گیا ہے اور اسی پر اللہ تعالیٰ غضبناک ہیں۔

مزید ایک علمی و استدلالی فریب خوردگی کا نمونہ یہاں نظر آیا۔ ممدوح فرماتے ہیں:۔

"ہمارے بعض قدیم مفسرین بھی اس نکتہ تک پہنچ گئے کہ یہاں ابنیت سے مراد ابنیت نسبی و نسلی نہیں بلکہ لاڈ و پیار والی ابنیت ہے اور یہ بھی کفر ہے۔"

اس کے بعد قرطبی کے حوالے سے ایک عربی فقرہ نقل فرمایا اور اسی فقرے کے لئے "بحر" کا حوالہ بھی دیا۔ اب تفسیر کے عام قارئین تو یہی سمجھیں گے کہ کم سے کم دو قدیم مفسر تو ایسے پائے ہی جاتے ہیں جو ممدوح جیسی رائے رکھتے ہیں۔ وہ بے چارے نہیں جان سکتے کہ عبارت کا صحیح ترجمہ کیا ہے لہٰذا ہمیں بتانا ہوگا کہ عبارت کا مطلب ممدوح نے صحیح نہیں سمجھا ہے۔

تطویل کی معافی۔ ان کا منقولہ فقرہ یہ ہے۔ قال ابن عطیۃ ویقال بعضهم یعتقدها نبوة حنو و رحمة وهذا المعنی ایضا لا یحل ان تطلق النبوة علیه وهو کفر (قرطبی) پھر اسی طویل فقرے کا یہ ٹکڑا نقل کیا گیا۔ یقال ان بعضهم یعتقدها نبوة حنو و رحمة (بحر)

کتابتی اسقام کا اندازہ اس سے کیجئے کہ صحیح لفظ ان فقروں میں بنوّة تھا (با پہلے نون بعد میں) لیکن تینوں جگہ نبوت چھپا (نون پہلے با بعد میں)، ممدوح تفسیر میں جو عبارات نقل کرتے ہیں عموماً ان کا ترجمہ نہیں پیش کرتے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے لہٰذا ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ اگر ترجمہ کریں تو کیا کریں گے۔ جس سیاق میں انھوں نے یہ فقرے نقل کئے ہیں اس سے یہ رونما ہے کہ ان کی دانست میں صاحبِ تفسیر قرطبی اور صاحبِ

بجز نے ان فقروں سے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ آیت مذکورہ میں "ابن" سے مراد حقیقی بیٹا نہیں بلکہ لاڈلا اور چہیتا ہے۔

حیرت ـــ سو بار حیرت ـــ ہم نہیں جانتے کہ ممدوح واقعی اس عبارت کو نہیں سمجھے یا اور کوئی نفسیاتی پیچیدگی ہے۔ یہ عبارت تو ان کی تردید کرنے والی ہے نہ کہ تائید۔

قرطبی نے ابن عطیہ کا قول نقل کیا۔ یہ قول کیا ہے اسے ملاحظہ فرمائیے۔ ابن عطیہ صیغۂ مجہول فرماتے ہیں کہ یہ بات بھی کہی گئی ہے .... !

کیا بات کہی گئی ہے۔ اسے بعد میں دیکھئے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ قدیم مفسرین حسب تفسیر کے ذیل میں بعض اقوال نقل کرتے ہیں تو ان کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ خود وہ ان اقوال کے حامی و مؤید ہیں۔ وہ تو علمی دیانت کے طور پر مختلف اقوال نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور اپنی رائے الگ سے ظاہر کرتے ہیں۔ کسی کا یہ تأثر دینا کہ ابن عطیہ کا قول قرطبی یا بحر میں استدلالاً نقل ہوا ہے بجائے خود غلط ہے۔

اور ابن عطیہ نے جو بات کہی اس پر بھی نگاہِ غور ڈالئے۔ وہ خبر دیتے ہیں:-

> "یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض یہود و نصاریٰ ابنیت سے مراد شفقت و رحمت کا رشتۂ خاص لیتے تھے۔"

بس یہ ہے ابن عطیہ کا قول۔ مراد یہ ہے کہ "جس طرح آج مولانا دریابادی یہ فرما رہے ہیں کہ یہود و نصاریٰ "ابن" کو محبوب اور چہیتے کے مفہوم میں بولتے ہیں اسی طرح پہلے بھی کسی نے ایسا ہی کہا ہے۔" اب اس سے قبل کہ ہم یہ بتائیں کہ خود قرطبی نے ابن عطیہ کے اس قول پر کیا فرمایا ہے ذرا خود ہی حاضر دماغی کے ساتھ سوچ لیجئے کہ یہ قول ممدوح کے دعوے کو رد کر رہا ہے یا ثابت؟ ممدوح کا دعویٰ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ تمام کے تمام "ابن" کا مطلب لاڈلا لیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ موصوف نے یہ دعویٰ بھی کر ڈالا کہ قرآن نے اسی مطلب کو ابن اللہیت سے تعبیر کیا ہے لیکن یہ ابن عطیہ کا قول تو صاف بتا رہا ہے کہ تمام نہیں بلکہ بعض یہود و نصاریٰ "ابن" کے معنی محبوب لیتے تھے۔ کیا دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی نہیں کہ بعض ایسے بھی تھے جو "ابن" کو بیٹے کے مفہوم میں لیتے تھے؟ موجبہ جزئیہ آپ سے آپ سالبہ جزئیہ کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ کسی قضیہ سالبہ جزئیہ سے موجبہ جزئیہ کی تردید نہیں ہوا کرتی۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ کچھ یہود و نصاریٰ کی بنوّۃ (بیٹے پن) کو شفقت و رحمۃ کا کنایہ بناتے تھے علانیہ یہ بتا رہا ہے کہ کچھ یہود و نصاریٰ بنوّۃ کو عین ابنیت اور ولدیت کے مفہوم میں لیتے تھے۔ پس انھیں لوگوں کے تعلق سے آیت بالا میں اللہ نے اظہارِ غیظ و نفرت کیا ہے۔

اب یہ دیکھئے قرطبی نے کیا کہا۔ ان کا ریمارک یہ ہے:

> "یہ معنی بھی ـــ یعنی حضرت عزیرؑ یا حضرت عیسیٰؑ اللہ کے خاص محبوب ہیں اس کا جواز نہیں دیتے کہ ان پر بنوّۃ کا اطلاق کر دیا جائے۔ ایسا اطلاق کفر ہوگا۔"

گویا قرطبی یہ کہہ رہے ہیں کہ "ابن" تو بیٹے ہی کو کہتے ہیں۔ بنوّۃ کا مطلب ہے اولاد ہونا۔ کوئی شخص اگر کسی پیغمبر کو اللہ کا بہت برگزیدہ اور محبوب سمجھتا ہے تو اس کے لئے حلال نہیں کہ اس خیال کا اظہار لفظ "ابن" سے کرے ایسا کرے گا تو مرتکب کفر ہوگا کیونکہ "ابن" سے ولدیت ہی مفہوم ہوتی ہے نہ کہ فقط محبوبیت۔

انصاف کیا جائے۔ اگر بقول ممدوح ابن کے معنی عربی میں ولد کے نہ آتے بلکہ وہ فرزندِ معنوی و مجازی کیلئے مخصوص ہوتا تو ارتکاب کفر کا سوال کہاں سے کھڑا ہو جاتا۔ کفر تو اسی لئے ہوا کہ اپنے پیٹ میں تم جو چاہے معنی چھپائے رہو لفظ ابن تو بہر حال ولد کا مفہوم دے گا کیونکہ عربی میں اس کا زیادہ استعمال اسی صلبی و حقیقی رشتے کے لئے ہے۔

ممدوح نے وھو کفر میں ھو کا مرجع ٹھیک طور پر نہیں سمجھا۔ اس کا مرجع یہ عقیدہ نہیں ہے کہ بعض لوگ کسی نبی کو اللہ کا لاڈلا سمجھتے تھے بلکہ مرجع بعض یہود و نصاریٰ کا یہ طرزِ عمل ہے کہ اس عقیدے کو وہ لفظ "ابن" سے

ظاہر کرتے تھے مراجع کا یہ فرق باریک ضرور ہے مگر محبوب کی کمر جیسا نہیں کہ بغیر خوردبین کے دیکھا ہی نہ جاسکے اس فرق سے نتائج بھی مختلف ہو جاتے ہیں جیسا کہ ہر ذی فہم پر ظاہر ہے۔

پھر قرطبی کے اس ریمارک سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ممدوح نے انھیں خواہ مخواہ اپنا گواہ بنا کر لا کھڑا کیا ہے۔ ان کے فرشتوں کو بھی یہ تصور نہ آیا ہوگا کہ آنے والے زمانے میں کوئی بزرگ مجھے اس دعوے کا گواہ بنا کر قبر سے اٹھائیں گے کہ سورۂ توبہ کی تیسویں آیت میں ابن کے معنی لاڈلے اور چہیتے کے ہیں بیٹے اور فرزند کے نہیں ہیں۔

رہے صاحبِ بحر۔ تو ان بے چاروں کا قصور بس اتنا ہے کہ مفسرینِ قادم کی روش کا اتباع کرتے ہوئے انھوں نے ابن عطیہ کا قول نقل کر دیا۔ اس قصور کی سزا انھیں اتنی سخت تو نہ دینی چاہیئے کہ ایک ایسی رائے ان سے منسوب کر دی جائے جس سے وہ بری ہیں۔ زیادہ طوالت کا ڈر نہ ہوتا تو ہم صاحبِ بحر کی اگلی پچھلی عبارات نقل کر کے اپنے اعتراض کو مزید قوت دیتے لیکن حقِ وضاحت شاید ادا ہو گیا اس لئے قلم یہیں روکتے ہیں۔

---

(۲) آیت ۷۴:۔ ذکر یہ ہو رہا ہے کہ اے پیغمبر کفار و منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آیئے۔ یہ بے ایمان اور جھوٹے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ کفریات بکتے ہیں اور مکر جاتے ہیں۔ صاف قسمیں کھا جاتے ہیں کہ ہم نے فلاں بات نہیں کہی، حالانکہ یہ بات انھوں نے یقیناً کہی ہوتی ہے۔ یہ دعوۂ اسلام کے بعد مرتکب کفر ہو چکے ہیں۔

آخری فقرے کے لئے قرآن کے یہ الفاظ ہیں وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ (اور کافر ہو گئے مسلمان ہو کر) اس فقرے کے ذیل میں ممدوح رقم طراز ہیں:۔

"اس سے فقہاء مفسرین نے استدلال کیا ہے کہ اسلام ایمان کے مرادف ہے اس لئے کہ ٹھیک کفر کے مقابلے میں آیا ہے۔"

اس کے لئے حوالہ صرف "مدارک" کا دیا گیا۔

ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر ایک آیت سے کسی اکا دکا مفسر نے کوئی خاص استدلال کیا ہے تو اس سے قطع نظر کہ وہ استدلال قوی ہے یا ضعیف یہ کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے کہ "فقہاء مفسرین نے استدلال کیا ہے"۔ یہ عام فقرہ تو صریحاً یہ مفہوم رکھتا ہے کہ جتنے بھی فقیہ مفسر ہیں سب یا کم سے کم ان کی کثیر تعداد یہی استدلال کرتی ہے۔ حالانکہ جہاں تک ہمارے محدود مطالعہ کا تعلق ہے یہ استدلال شاذ و نادر کیا گیا ہے اور فی الحقیقت اسے فقیہانہ استدلال کہنا ہی مشکل ہے۔

اشخاص کو چھوڑیئے۔ مدارک یا فلاں تفسیر کے مصنف علیہ الرحمۃ کس پائے کے مفسر اور فقیہ تھے یہ بحث بے لاگ تبصرے میں عموماً رخنہ ڈال دیتی ہے۔ نفسِ استدلال پر نگاہِ نقد ڈالئے کہ اس کے ضعف و قوت کا کیا حال ہے۔

تمام فقہاء اور مفسرین کی دراسرت بالاتفاق یہ ہے کہ ایمان ایک مخفی شے ہے جس کا مسکن و مستقر قلب ہے۔ اور اسلام ایک ظاہر شے ہے جو آدمی کی حرکات سے عبارت ہے۔ ایمان کیفیت ہے اور اسلام کمیت۔ ایمان عقیدہ ہے اور اسلام عمل۔ ان دونوں میں ترادف کی نسبت ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ دو جداگانہ چیزوں کے نام ہیں۔ البتہ فقہاء نے غور و تعمق کے بعد یہ قاعدہ ضرور دریافت کیا کہ جہاں کہیں ایمان اور اسلام دونوں کا ذکر ہوگا وہاں تو لازماً انکا الگ الگ مفہوم لیا جائے گا مگر جہاں کہیں ان میں سے فقط ایک کا ذکر ہوگا وہاں دیکھنا پڑے گا کہ سیاق و سباق اور لسانی قرائن کیا رہنمائی کر رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہاں دونوں ہی مفہوم لئے جاسکیں اور عین ممکن ہے کہ فقط ایک ہی مفہوم لینا ضروری ہو۔

ان میں سے ہر طرح کے استعمال کی مثال قرآن میں موجود ہے لیکن طوالت سے بچنے کے لئے ہم امثال سے صرفِ نظر کر گئے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ ممدوح نے جس استدلال کو تمام

فقہاء مفسرین سے منسوب کر دیا ہے وہ نہ تو تمام فقہاء مفسرین کا استدلال ہے نہ کوئی دلپذیر اور قوی استدلال۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے یہاں نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی اور کسی بھی قاری کو اس سے کیا فائدہ پہنچے گا۔

استدلال کو غیر قوی ہم کیوں کہہ رہے ہیں یہ کوئی باریک بات نہیں۔ اگر یہاں "اسلام کو" "ایمان" کا مرادف مان لیں تو آیت کا مفہوم یہ بنے گا کہ جو لوگ کلمۂ کفر کہہ کر کافر ہو گئے ہیں وہ اس کلمے کے تلفظ سے قبل مومن تھے۔ ان کے قلب میں ایمان جگہ پا چکا تھا اور اب کلمۂ کفر کے نتیجے میں وہ مرتد ہو گئے۔

کیا واقعی یہ مفہوم قابل قبول ہو سکتا ہے؟ ہمارے خیال میں بالکل نہیں ہو سکتا۔ ذکر کافروں اور منافقوں کا ہے کافر تو وہ ہیں جو باپ دادوں سے کافر چلے آ رہے ہیں اور کوئی لمحہ ان پر ایسا نہیں گذرا کہ ایمان کی رمق بھی ان کے سینے میں داخل ہوئی ہو۔ بلکہ یہاں تو خاص طور پر ان کافروں کا ذکر ہے جن کا کفر شدید ہے۔ جو دعوتِ حق کے بالمقابل زعیم وحریف بن کر کھڑے ہوئے ہیں اور ہر طرح کا امکانی نقصان مسلمانوں کو پہنچا رہے ہیں۔ ایسے ہی کافروں کے بارے میں اللہ نے حکم دیا کہ اے پیغمبر ان سے نرمی کا برتاؤ نہ کرو بلکہ تندی اور سخت گیری سے کام لو۔ ان سے لڑو۔ ان کا قلع قمع کر دو۔ اب ظاہر ہے کہ یہ تو وہ لوگ ہو ہی نہیں سکتے جن کے بارے میں اللہ یہ فرما رہا ہو کہ یہ قبولِ اسلام کے بعد کافر ہو گئے لہٰذا صرف منافقین ہی رہ گئے جو اس قولِ باری تعا کا مصداق بن سکتے ہیں۔ آیت کا ابتدائی ٹکڑا بھی اس کے لئے دلیل مبین ہے۔ فرمایا گیا۔ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ (یہ بدقسمت قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے فلاں کلمۂ کفر نہیں کہا حالانکہ یقیناً انھوں نے یہ کلمہ کہا ہے) اب دیکھ لیجئے۔ یہ روش منافقین ہی کی ہو سکتی ہے کہ اپنی مخصوص مجلسوں میں تو کفریات بکیں مسلمانوں کو تباہ کرنے کی اسکیمیں بنائیں اور رسول کو ہلاک کرنے کے منصوبے تراشیں مگر جب کوئی مخبر اس کی خبر مسلمانوں تک پہنچا دے تو یہ اپنے ظاہری دعوۂ اسلام کا بھرم رکھنے کے بھیگی بلی بن کر کہیں کہ خدا کی قسم ہم نے تو ایسی باتیں نہیں کہ یہ وطیرہ ظاہر ہے کہ منافقین ہی کا ہے۔ کفار کو اس کی کیا ضرورت پڑ سکتی ہے کہ اپنے کسی کلمۂ کفر سے مکریں جبکہ وہ علانیہ کفر پر قائم ہیں اور خود کو مسلمان پوز نہیں کرتے

جب طے ہو گیا کہ کَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ کا تعلق منافقین سے ہے تو یہ بھی طے ہو گیا کہ اسلام سے مراد یہاں ایمان ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ دکھاوے کا اسلام مراد ہے جو ان منافقین نے ازراہِ مکاری یا ازراہِ خوف اختیار کیا تھا اگر یہ واقعۃً ایمان لا چکے ہوتے تو ان پر نفاق کا اطلاق ہی کیسے ہوتا اور انھیں زمرۂ منافقین میں کیوں شامل کیا جاتا۔ منافق تو وہی ہے جو فی الحقیقت بے ایمان ہو مگر مصلحۃً اپنے آپ کو مسلمان کہے اور مسلمانوں ہی جیسے بعض افعال اعمال بھی کرتا رہے تاکہ اہلِ ایمان اسے مومن ہی سمجھا کریں۔

خدا ہی جانے کسی مفسر نے یہ خیال کیا سوچ کر ظاہر کر دیا کہ یہاں اسلام ایمان کے مرادف ہے حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں اسلام کو ایمان کے مرادف سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے ورنہ آیت بے معنی ہو جاتی ہے۔ قرآن صریحاً یہ بتا رہا ہے کہ منافقین ظاہراً جو دعوۂ اسلام کرتے تھے اس کا پردہ فاش ہو گیا اور مسلمان جان گئے کہ یہ بہروپئے کافر کے سوا کچھ بھی نہیں۔

تعجب یہ ہے کہ ممدوح مفسر اپنے ترجمے میں خود یہ فقرہ لکھتے ہیں:-

"اور اپنے (ظاہری) اسلام کے بعد کافر ہو گئے"

گویا بریکٹ میں "ظاہری" کا اضافہ کر کے انھوں نے خود ہی جتا دیا کہ اسلام سے مراد یہاں حقیقی اسلام نہیں ہے جسکے پیچھے ایمان ہوا کرتا ہے بلکہ نمائشی اسلام ہے جو ایمان سے خالی ہوتا ہے اور محض دکھاوے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ جب خود وہ اس پر متنبہ اور متوجہ کر رہے ہیں تو آخر اس تفسیری نوٹ کا کیا تک ہے جس پر ہمیں کلام کرنا پڑا ہے۔

یہ بات کہ آیت کا یہ ٹکڑا منافقین سے متعلق ہے

سے بھی ممدوح نے ذیلی نوٹ میں نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ
ی کے مطابق شانِ نزول بھی دی ہے۔ کیا منافقین کے
وب میں بھی ایمان ہوا کرتا ہے۔ یا پلٹ کر یوں کہیئے کہ
یا وہ لوگ منافق بھی کہلا سکتے ہیں جو ایمان لے آئیں ؟

ہم طفلِ مکتب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو یہ رائے
قائم کرنے پر مجبور پاتے ہیں کہ تفسیر ماجدی کے بہتیرے
مقامات جاگتے ہوئے ذہن اور کھلی ہوئی آنکھوں کا ثبوت
یا نہیں کرتے۔ یہ شاید عمر کا تقاضا ہو یا پھر جلد بازی
کا نتیجہ۔

صاحب مدارک کے استدلال کا منطقی سقم بھی دیکھ
لیجئے۔ انھوں نے محض اس دلیل سے اسلام کو ایمان کا مرادف
مانا کہ یہاں وہ "کفر" کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے حالانکہ
کفر کا تقابل حقیقۃً اسلام سے ہے نہ کہ ایمان سے۔ اسلام
کا پتا آدمی کے ظاہری افعال و اقوال سے چلتا ہے اسی طرح
اس کے کفر کا پتا بھی ظاہری افعال و اقوال سے چلتا ہے
اور آیت میں تو صریحاً ظاہری حالت ہی کا ذکر ہے ورنہ
کافر تو یہ لوگ اس وقت بھی تھے جب انھوں نے قول
کفر کیا تھا اور اس قول کی اطلاع مسلمانوں تک نہ پہنچتی
تب بھی یہ عند اللہ کافر ہی ہوتے۔ پس ایسے کفر کے
مقابلے میں لفظِ اسلام کا استعمال تو زبانِ حال سے پکار
پکار کر کہہ رہا ہے کہ ایمان کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔

---

(۴) آیت ۸۶:-

منافقوں کا ذکر چل رہا ہے کہ جب اللہ کی طرف سے
کوئی آیتِ جہاد نازل ہوتی ہے تو ان بدبختوں میں جو
سر اد جہاد کی مقدرت و استطاعت رکھتے ہیں وہ
طرح طرح کے بہانے ملا کر رسول سے رخصت طلب کرتے
ہیں کہ ہمیں گھر بیٹھا رہنے دیجئے۔ یہ بے شرم اس میں خوش
ہیں کہ عورتوں کے ساتھ چپکے رہیں۔

یہاں ایک چوک تو ترجمے کی ہے۔ رَضُوا بِاَنْ
يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ۔ اس کا ترجمہ ممدوح نے یہ کیا:-

"وہ اس پر راضی ہو گئے کہ پیچھے رہ جانے والوں
کے ہمراہ رہ جائیں۔"

اتفاق سے شاہ عبد القادرؒ کے ترجمے میں بھی "پیچھے
رہ جانے والوں" ہی کے الفاظ چھپے ہیں۔ ہمارا خیال
ہے کہ یہ کتابت کا سہو ہو گا۔ لکھا گیا ہو "والیوں" اور
کتابت ہو گیا "والوں"۔

"خوالف" عورتوں کو کہتے ہیں۔ یہ خالف کی
نہیں خالفہ کی جمع ہے۔ فاضل ممدوح خود بھی تفسیر میں
یہی فرماتے ہیں کہ الخوالف سے مراد یہاں عورتیں ہیں۔
پھر کوئی وجہ نہیں کہ ترجمے میں تانیث کا اظہار کرتے
ہوئے "پیچھے رہ جانے والیوں" کے الفاظ نہ لکھے جائیں۔
مولانا اشرف علیؒ نے ترجمہ کیا — "خانہ نشین
عورتیں۔"

شیخ الہندؒ نے "پیچھے رہنے والی عورتوں" کے
الفاظ رقم فرمائے۔

مولانا مودودی نے تحریر فرمایا — "گھر بیٹھنے والیوں"

دوسری گفتگو ایک تفسیری فقرے میں ہے۔ قرآن
نے اہلِ مقدرت کے لئے اولوا الطول کے الفاظ استعمال
فرمائے ہیں۔ اس پر ممدوح کا تفسیری نوٹ یہ ہے:-

"اولوا الطول کے ذکر سے یہ مراد نہیں کہ صرف
اہلِ مقدرت رخصت مانگتے ہیں۔"

عجیب فقرہ ہے۔ ٹھیک منطوقِ کلام کے بارے میں
کہا جا رہا ہے کہ یہ مراد نہیں حالانکہ مراد یہی اور صرف
یہی ہے۔ در اصل یہاں لفظ "صرف" غلط جگہ استعمال
ہوا۔ جو بات ممدوح فرمانا چاہ رہے ہیں اس کے لئے
اس "صرف" کو "یہ مراد" سے قبل ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی
یوں۔

"اولوا الطول کے ذکر سے صرف یہ مراد نہیں کہ۔۔۔"

اس سے یہ مفہوم پیدا ہوتا کہ اہلِ مقدرت کا رخصت
مانگنا تو مراد ہے ہی مگر اس کے علاوہ بھی کچھ مراد ہے۔
"صرف" کو ممدوح نے جس مقام پر رکھ دیا ہے اس سے

تو یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ فقط اہلِ مقدرت ہی رخصت نہیں مانگتے تھے بلکہ غیر اہلِ مقدرت بھی مانگتے تھے۔

زبان کے اس بہت ہی لطیف و نازک سقم کے بعد فقرے کا مزید حصہ بھی دیکھ لیجئے:-

"بلکہ اس سے غیر اہلِ مقدرت پر بھی روشنی
پڑ گئی کہ جب مقدرت والوں کا یہ حال
تھا تو غیر اہلِ مقدرت کا حال ضرور ہی یہ
ہوتا۔"

جو کچھ ممدوح کہنا چاہتے ہیں اس کے لئے مناسب اندازِ بیان فراہم نہیں ہو سکا۔ آیت میں اہلِ مقدرت کا جو حال بیان ہوا ہے وہ صریحاً یہی تو ہے کہ وہ جہاد میں نہ جانے کی رخصت طلب کرتے تھے۔ اب ممدوح کے فقرے کا مطلب یہ بنا کہ جن میں مقدرت نہ تھی وہ تو ضرور ہی رخصت طلب کرتے تھے!۔

یہ وہ مضمون ہے جس سے آیت کا کچھ تعلق نہیں غیر مستطیع اور معذورین کے لئے تو فریضۂ جہاد ہے ہی نہیں انھیں رخصت طلب کرنے کی کیا ضرورت۔ آگے خود قرآن کہہ رہا ہے کہ ضعیفوں اور مریضوں اور ناداروں پر کوئی گناہ نہیں وہ مقدرت ہی نہیں رکھتے۔

یہاں خود ممدوح نے یہ تفسیری نوٹ دیا:-

"یہ سب عذرِ واقعی رکھنے والے لا یکلف
اللہ نفساً الا وسعہا کے قاعدۂ کلیہ کے
تحت میں آجاتے ہیں۔ اس آیت میں صفائی
ان اعراب کی طرف سے پیش ہو گئی جو کوئی
حقیقی عذر رکھتے تھے۔"

اسے اور پچھلے نوٹ کو آمنے سامنے رکھ کر پڑھئے۔ بات گنجلک ہو کر رہ جائے گی۔ یہاں غیر اہلِ مقدرت کے حق میں کلماتِ خیر پر زور ہے اور وہاں ان کے خطاوار ہونے پر۔

ممدوح کا جو کچھ مافی الضمیر ہے وہ ہم سمجھ گئے۔ قصور ان کے فہم میں نہیں ہے بلکہ قلم میں ہے۔ پہلا نوٹ یا تو دینا ہی نہ تھا یا دیا تھا تو منشاء کی وضاحت بہتر الفاظ میں کی جاتی۔ بصورتِ موجودہ سخن فہم قارئین کا وجدان بڑی کھٹک محسوس کرے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ہزار ہزار شکر ہے اس معبودِ برحق کا جس نے تفسیر ماجدی جلد دوم کے اس تبصرے کو تکمیل تک پہنچایا۔ بے شمار حضرات کی رائے ہمارے طرزِ تحریر کے بارے میں اچھی نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم تلخ گفتار بھی ہیں، گستاخ و بے ادب بھی تند خو اور بدمزاج بھی۔ اس خیال کو غلط کہنا مشکل ہے۔ واقعی ہماری ناقدانہ تحریروں اور تبصروں میں ان سارے بُرے خصائل کی پرچھائیاں پائی جاتی ہیں۔ ہم منہ پھٹ ہیں۔ بے سلیقہ ہیں۔ نالائق ہیں مگر ہماری نیت اللہ دیکھ رہا ہے اور یہ چیز تو بندے بھی دیکھ رہے ہیں کہ تردید یا تائید اور حمایت یا مخالفت ہم دلائل کی روشنی میں کرتے ہیں۔ چبا چبا کر بات کرنا ہماری سرشت نہیں۔ محض الزام رکھ کر گذر جانا ہم پسند نہیں کرتے بلکہ شرح و بسط سے برہان و شہادت کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ لاگ لپیٹ ہمارے بس سے باہر ہے اب جو بھی شکایت جسے ہو اس کا تعلق ہمارے اندازِ تحریر ہی سے ہو سکتا ہے نہ کہ مطالب و معانی سے۔ یہ کچھ زیادہ اہم نہیں۔

ابھی صدق جدید میں مولانا دریا بادی کا ایک ایسا نوٹ پڑھنے کو ملا جس میں بڑی حسرت اور مایوسی کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ تفسیر ماجدی کی تیسری جلد چھپنا بحالاتِ موجودہ ممکن نظر نہیں آتا۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ حسرت کی بات یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ اب تک جو دو جلدیں چھپی ہیں ان کا کوئی شایانِ شان ایڈیشن نہ آسکا۔ شکنوں، لغزشوں، خطاؤں اور بیماریوں سے آلودہ بہت سی جلدوں کے مقابلے میں وہ ایک دو جلدیں کہیں بہتر ہیں جنھیں دوا علاج کے ذریعہ صحت مند بنا لیا جائے۔ فقط والسلام

معترضین کیا فرماتے ہیں

تین طلاقوں کی بحث سے نہ جانے کتنے قارئین بہ اصطلاح
بد بور ہو چکے ہوں گے۔ ہم خود اکتاہٹ کا شکار ہیں۔
ہٹ نہ ہوتی اگر عام لوگ عالم فاضل ہوتے اور اُن
نکات کو سمجھنا ان کیلئے سہل ہوتا جنہیں درمیان میں لائے بغیر
ث کی ہی نہیں جا سکتی۔ مگر عوام کبھی عالم فاضل نہیں ہوا
نے اور تجلی بہر حال عوام میں بھی اتنا ہی مقبول ہے جتنا
ت سے خواص میں لہٰذا اچھا تو یہی تھا کہ مکتبی نوع کی
تحقیقی بحثیں اس میں کم سے کم آئیں لیکن اسے کیا کیجئے
ن مسائل ربر کی طرح کھنچتے چلے جاتے ہیں اور ہمارے
انفس منصبی مجبور کرتے ہیں کہ خواہش نہ ہونے کے باوجود
سے دیر تک اُلجھتے رہیں۔

اب مثلاً تین طلاقوں کے مسئلے کو برابر طول دیا جا
ہے۔ گذشتہ ماہ کے احوالِ واقعی میں جس متوقع کتاب
کر آچکا ہے وہ احمد آباد اسلامک ریسرچ سینٹر والوں
چھاپ کر نہ صرف ہمیں بھیجی ہی بلکہ جماعت اسلامی ہند
سالیہ اجتماع میں اسے حتی الوسع شہرت دینے کی کوشش

کی گئی۔ یہ مطلب نہیں کہ اس کوشش کا کوئی تعلق جماعت اسلامی
سے بھی ہے۔ نہیں۔ اجتماع میں اسٹال لگانے والے کتب
خانوں پر اگر میں یا آپ کوئی کتاب پھیلا دیں تو جماعت
بیچاری اس میں کیا کرلے۔ مگر کتاب کا تشہیر پا جانا بہرحال
یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس پر فوری توجہ دیں۔ توجہ دینا
ضروری اس لئے ہے کہ اس میں تجلی کے بعض دلائل و براہین
کو رد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوشش اگرچہ اس درجہ
ناکام ہے کہ جو لوگ ذرا گہری نظر اور بیدار ذہن رکھتے
ہوں وہ خود ہی اس میں اور تجلی کے پیش کردہ مواد میں مقابلہ
موازنہ کرکے اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ تجلی کا موقف
فولاد کی طرح مضبوط ہے اور فریق ثانی کے فرمودات، بات
کی پچ کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتے۔

مگر گہری نظر اور بیدار ذہن کی نعمتیں عام کہاں اس
لئے ہمیں طوعاً و کرہاً اس بحث پر مزید کچھ صفحات کالے کرنے
ہوں گے۔ خدا قارئین تجلی کو صبر جمیل کی توفیق دے اور
ہماری بھی مغفرت فرمائے۔

کتاب کا نام ہے — "ایک مجلس میں تین طلاق" سیمنا کے جو مقالے زندگی کے طلاق نمبر میں شائع ہوئے تھے وہ سب اور ان کے علاوہ مزید دو مقالے اس میں شامل ہیں۔ ان دو مقالوں کو ہم نے پڑھ کر دیکھا اور شکر بھیجا کہ ان میں کوئی ایسا نیا نکتہ نہیں جو باقی مقالات میں نہ آچکا ہو اور ہمیں اس پر بحث کرنی پڑے۔ البتہ مقالات کے بعد "اعتراضات کے جوابات" کا عنوان دے کر روئے سخن تجلی کی طرف پھیر دیا گیا ہے اور سب سے پہلے مدیر زندگی کا وہ مراسلہ زیب اشاعت کیا گیا ہے جس کا تجزیہ ہم تجلی کے دو شماروں میں کر چکے۔ اس مراسلہ کا عنوان خاصا شاعرانہ رکھا گیا۔

"طلاق بندوق کی گولی نہیں ہے"

کاش ہمارے دوست شاعری کو اس خشک علمی مسئلہ میں دخل نہ دیتے۔ بہر حال ہم تو اس مراسلہ کا تجزیہ پیش کر چکے اگر اس کے بعد بھی اس کی کوئی منطقی اور علمی قدر و قیمت باقی رہ گئی ہے تو مزید کچھ کہنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ جو لوگ تجلی نہ پڑھیں اور اسے پڑھیں وہ تو ضرور اس پر سبحان اللہ اور واہ واہ کے ڈونگرے برسا سکتے ہیں لیکن تجلی کے ذی فہم قارئین سے قطعاً امید نہیں کہ وہ محترم مدیر زندگی کے علم کلام کو خراج تحسین ادا کر سکیں گے۔

اس مراسلے کے تعلق سے ہمارے دوستوں نے چند سطریں تجلی کا تجزیہ دیکھنے کے بعد رقم فرمائی ہیں ان پر البتہ کچھ عرض کئے دیتے ہیں۔ انھوں نے رقم فرمایا:۔

> "ایڈیٹر تجلی نے اگست ستمبر ۶۷ء کے شمارے میں مولانا عروج قادری صاحب کے مراسلہ کا جواب دیتے ہوئے حضرت عمرؓ کے ایک فیصلے سے استدلال کو غلط ثابت کرنا چاہا ہے۔ اس سلسلے کی دلچسپ بات موصوف نے یہ تحریر فرمائی ہے کہ "حضرت عمرؓ حاکم وقت تھے نہ کہ قاضی" نیز یہ کہ "ان کا فیصلہ کسی عدالت میں بطور نظیر بھی پیش نہیں ہوتا تھا کیونکہ عدالت میں عدالتی نظائر کام آتے ہیں حکام کے انتظامی یا سیاسی یا اصلاحی اقدامات اور فیصلے کام نہیں آتے۔"

قطع کلام کی معافی۔ اہل فہم یہ غور فرمائیں کہ اس عبارت میں ہمارے جس اصولی معروضے کو نقل کیا گیا ہے وہ صریح طور ایک حسین اور مسلّم معروضہ ہے۔ دنیا کا کوئی ماہر قانون نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے کوئی غلط بات یا غیر سنجیدہ بات عرض کی ہے۔ پھر بھی ہمارے دوست اس کے لئے "ایک دلچسپ بات" کا طنزیہ طرز تعبیر اختیار فرما رہے ہیں۔ یہ طنز انھوں نے جان بوجھ کر کیا ہے تو اس کا نام ہوگا علمی بد مذاقی اور اور اگر بے جانے بوجھے کیا ہے تو اس کا عنوان ہوگا سادہ لوحی۔ بہر صورت وہ اس الزام سے خود کو نہیں بچا سکتے کہ متین دلائل کا متانت کے ساتھ سامنا کرنے کے عوض وہ کھیل کود کے موڈ میں آئے ہوئے ہیں اور محض چٹکلوں سے علمی استدراک کو دھواں دھواں کر دینا چاہتے ہیں۔

بہر حال یہ تحریر فرمانے کے بعد انھوں نے ارشاد کیا:

> "سوال یہ ہے کہ اگر حضرت عمرؓ کے مذکورہ فیصلے کی حیثیت عدالتی نہیں بلکہ سیاسی اقدام کی تھی تو حضرت عمرؓ کے تین یکجائی طلاقوں کو نافذ کرنے کی جو علماء یہ توجیہ کرتے ہیں کہ اس کا نفاذ محض تعزیراً کیا گیا تھا ان کی یہ توجیہ کیوں غلط قرار دی جائے؟ مزید یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت عمر کا فیصلہ عدالتی نہ ہونے کی وجہ سے قابل استدلال نہیں ہے تو صحابہ کے فتوے جن کی حیثیت بھی عدالتی فیصلوں کی نہیں ہے حجت کس طرح بن سکتے ہیں؟"

ہم نے دوستوں کی عبارت تمام و کمال نقل کر دی ہے۔ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں اسے پوری طرح سمجھنے کے لئے قارئین کو تجلی اگست ستمبر کے صفحات میں ہماری گذارشات ملاحظہ فرمانی ہوں گی۔ ان کا ملاحظہ انھیں محسوس کرا دے گا کہ کسی ڈوبنے والے کی طرح ہمارے دوست تنکے کا سہارا لے رہے ہیں۔ کہانی آپ نے بھی سنی ہوگی۔ ایک جاٹ تھا ایک تیلی۔ دونوں زبان کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ تیلی نے کہا "جاٹ رے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ"۔ جاٹ بھڑک اٹھا۔ دانت پیس کر بولا "تیلی رے تیلی تیرے سر پر کولھو"۔

تیلی ہنسا اور بولا" قافیہ تو ملا نہیں"۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جاٹ اور کھاٹ ہم قافیہ ہیں۔ تیلی اور کولھو ہم قافیہ کہاں۔ جوابی گالی دینی تھی تو قافیہ تلاش کرکے لائے ہوتے۔ جاٹ چپ رہنے والوں میں نہیں تھا بر ملا بولا" نہ ملے قافیہ تم تو بوجھ تلے دب گئے۔" یعنی اس نے تیلی کو محسوس کرایا کہ میرے سر پر اگر کھاٹ رکھی گئی تب بھی اس میں بوجھ کہاں لیکن تیرے سر پر کولھو چڑھا دیا گیا تو کچومر ہی نکل جائے گا۔

اس طرح کی کج بحثیاں لوگ زندگی بھر کر سکتے ہیں۔ ہمارے دوست بھی کسی ٹھوس دلیل کو سنجیدگی سے مرکزِ التفات نہ بنائیں تو ہزار برس سلسلۂ گفتگو چل سکتا ہے۔ اندازہ فرمائیے۔ ہم نے دستاویزی دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ تین طلاقوں کو تین ہی ماننے کا مدار حضرت عمرؓ کے کسی ذاتی اجتہاد یا اقدام یا اعلان پر نہیں ہے بلکہ قرآن اور احادیث رسولؐ پر ہے۔ اگست و ستمبر کے تجلی میں ہم نے آٹھ حدیثیں اور ۱۴ صحابہ کے آثار جمع کر دئیے ہیں اور یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ ان کے خلاف کوئی ایک حدیث صریح یا کسی ایک بھی صحابی کا فتویٰ کہیں نہیں پایا جاتا۔ اب ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اپنے آپ کو سب سے بڑا عاشقِ حدیث اور پیروِ قرآن و سنت پوز کرنے والے اہلِ حدیث کرم فرما ساری توجہ اس اہم ترین اعلان پر صرف کرتے اور دنیا کو ضمانت کے ساتھ بتاتے کہ دیکھو فلاں حدیثِ صریح فلاں کتاب میں صحیح سندوں کے ساتھ مروی ہے اور یہ تجلی کی جمع کردہ آٹھ حدیثیں وہ مفہوم نہیں رکھتیں جو تجلی پیش کر رہا ہے۔ لیکن وہ اہم ترین پہلو کو چھوڑ کر ذیلی و ضمنی مباحث میں عامر نالائق کی ٹانگ کھینچنے کا مشغلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

یہ بات کہ حضرت عمرؓ نے تین طلاقوں کے تین ہی ہونے کا جو اعلان کیا تھا وہ سیاسی اقدام تھا یا تعزیری یا اجتہادی صرف اس وقت اہم ہو سکتی ہے جب عامر عثمانی نے یہ موقف اختیار کیا ہو کہ اس مسئلہ پر اجماع اعلانِ عمرؓ کی بنیاد پر ہوا ہے۔ لیکن جب اس نالائق کا یہ موقف ہے ہی نہیں اور وہ دکھلا چکا ہے کہ حضرت عمرؓ کا اعلان کسی نئی بات کا اعلان نہ تھا بلکہ ایک مسلّم شرعی مسئلہ کی یاددہانی تھی۔ انھوں نے عوام کو توجہ دلائی تھی کہ تین یکجائی طلاقیں شرعاً تین ہی ہوتی ہیں اور ہم بحیثیت امیر المومنین اسی شرعی حکم کو لازماً نافذ کرتے رہیں گے۔ کوئی عذر اور تاویل مسموع نہ ہوگی۔ دین و شریعت میں تحریف و تغیّر کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔

رہا وہ فقرہ جو صحابہؓ کے فتووں کے بارے میں دوستوں نے لکھا اور جس پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے تو افسوس کہ وہ خود بھی اس کے مضمرات و ثمرات کا ادراک کرنے سے قاصر رہے۔ دو بالکل مختلف باتوں میں فرق نہ کر سکنے کی یہ بھونڈی مثال ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں حضرت عمرؓ یا کوئی بھی اور صحابی اپنا فتویٰ صادر کرے لیکن دوسرے صحابہ سے اس کی تصدیق نہ ہو سکے تو بے شک یہ فتویٰ پوری امت کے لئے حجت نہیں اور اہلِ علم قرآن و حدیث کی روشنی میں اس سے اختلاف کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن دوسری بات یہ ہے کہ ایک مسئلہ میں ایک دو یا دو چار نہیں، فقیہ صحابہؓ کی عظیم اکثریت ایک سا فتویٰ دے رہی ہو اور قرآن و سنت سے بھی اسی کی تائید نکل رہی ہو اور کسی بھی صحابی کا اختلافی فتویٰ کہیں نہ پایا جاتا ہو تو اسے حجت ماننا ہوگا اور تمام امت اسے حجت مانتی آئی ہے۔ آخر" اجماع" کے حجت ہونے میں مستند علمائے سلف و خلف میں سے کس نے اختلاف کیا ہے اور اجماع کی حقیقت اس کے سوا ہے کیا کہ ثقہ ترین اہلِ علم ایک رائے پر متفق ہو گئے ہوں اور اختلاف کی کوئی آواز ثقہ علماء کے حلقے سے نہ اٹھے۔ ہم نے متنبہ کیا تھا کہ ابن تیمیہ سے قبل کسی ایسے شخص نے اس مسئلہ میں اختلاف نہیں کیا جسے فقاہت اور قانونِ شریعت کے معاملے میں امت امام سمجھتی ہو۔ اسناد جانتی ہو۔ ماہرِ فن تصور کرتی ہو۔ پھر کیوں ہمارے دوستوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ صحابہؓ کے انفرادی فتاویٰ کا معاملہ دوسرا ہے اور اجماعی مسلک کا معاملہ دوسرا۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور

مولانا محفوظ الرحمن فاضل دیوبند نے " اجماع کا غلط دعویٰ" عنوان دے کر تجلی سے اچھا خاصا معارضہ کیا ہے۔ آئیے اس معارضے پر بھی ناقدانہ نظر ڈالیں۔

ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی جانتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مسئلے پر " اجماع " کا دعویٰ کرے تو اس کا منشا یہ ہوا کرتا ہے کہ تمام اساتذۂ فن اس پر متفق ہیں۔ گویا وہ مدعی مسئلے کے دلائل پر گفتگو نہیں کر رہا ہے بلکہ ایک خبر دے رہا ہے۔ ایک تاریخی حقیقت ظاہر کر رہا ہے۔ اب جو لوگ اس کے دعوے کو غلط قرار دینا چاہتے ہوں انھیں صرف یہ کرنا ہے کہ کسی مستند حوالے کے ساتھ کسی استادِ فن کا اختلافی قول پیش کر دیں۔ کسی جانی پہچانی کتاب کا نام لے کر بتا دیں کہ اس کے فلاں صفحے پر فلاں ماہرِ فن کا اختلاف صریح لفظوں میں درج ہے۔ بس دعوے کی تردید ہو جائے گی۔

لیکن ہمارے دوست ایسا نہیں کرتے۔ ان کا تازہ علم کلام ہمارے سامنے ہے۔ اس میں انھوں نے مختلف نوع کے منطقی دلائل کی الٹ پھیر کی ہے حالانکہ یہ غیر متعلق قلم درازی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص دعویٰ کر رہا ہو کہ یزید حضرت معاویہؓ کا لڑکا تھا اور آپ اس تاریخی صداقت کو اس قسم کی منطق سے جھٹلانے لگیں کہ حضرت معاویہؓ تو ایسے تھے اور ویسے تھے لہذا ایسے اچھے صحابی کے نطفے سے یزید جیسا خراب لڑکا پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ بزرگو! یہ طرزِ بحث انتہائی لغو ہے۔ حضرت معاویہ اور یزید کے تاریخی رشتے کو منطقی دلائل سے نہیں صرف تاریخی شواہد سے جھٹلایا جا سکتا ہے۔ آپ کسی مستند تاریخ میں اگر یہ دکھلا سکیں کہ یزید حضرت معاویہؓ کا نہیں بلکہ فلاں صاحب کا فرزند تھا تب تو مدعی کا یہ دعویٰ غلط ہو جائے گا کہ یزید کا ابن معاویہ ہونا متفق علیہ اور اجماعی مسئلہ ہے۔ پچاس روایات اسے ابن معاویہ ثابت کر رہی ہوں مگر بہر حال ایک بھی مضبوط قسم کی روایت اس کے خلاف مل گئی تو کسی نہ کسی درجے میں دو رائے کی گنجائش نکل آئی۔ اسی طرح کوئی ایک حدیثِ صریح و صحیح یا کوئی ایک فتویٰ صحابی یا ابن صدیوں کے کسی ایک مسلّمہ امامِ فن کی رائے آپ کے مسئلے میں اختلافی دکھلا سکیں تو بے شک آ عنوان بجا ہو سکتا ہے کہ اجماع کا دعویٰ غلط ایسی کوئی شہادت پیش کئے بغیر منطقی اور نظری کو طول دینا صاف ظاہر کر رہا ہے کہ صداقت ساتھ نہیں دے رہی ہے اور حقائق کو آپ نکتہ کے انبار میں گم کر دینا چاہتے ہیں۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو یہ بحث ہی فضول ہو جاتی ہے کہ دوستوں نے تجلی کے فلاں معارضے کا ج کیا دیا اور فلاں دلیل کو کس انداز میں رد کیا۔ تاہم کے لئے کہ ان کی یہ کوشش بھی فی نفسہ ناکام ہی ہے ہم وقت آپ کا لیں گے۔

مولانا محفوظ الرحمن صاحب نے تجلی طلاق نمبر سے ہما سات اعتراضات چن کر ہر ایک کا نمبر وار جواب دیئے گئے ہیں۔ مگر انھوں نے ہمارے اعتراضات کی ترجمانی بیدار مغزی اور سلیقے سے کام نہیں لیا۔ حالانکہ ہم جب کسی کے اعتراض کا جواب دیتے ہیں تو اعتراض کو اس صحیح شکل میں معترض کی منشاء کے مطابق نقل کر دیتے اس کے بعد اس کا ناقدانہ تجزیہ کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے دوست ہمارے اعتراض یا معارضے کو ٹھیک ٹھیک بیان کرتے وہ یہ تک زحمت نہیں فرماتے کہ ہمارا کوئی اگر ہماری عبارتوں سے لیا ہے یا ہماری عبارت کا کو ٹکڑا نقل کیا ہے تو ساتھ ساتھ حوالہ بھی دیا دیں کہ تجلی کے شمارے اور کس صفحے سے لیا ہے۔ کتاب کے دس صفحوں میں ا نے ہمارے سات اعتراضات کا جواب لکھا اور ہماری متعدد عبارتیں نقل کیں۔ متعدد مفاہیم ہماری طرف منسوب فرما لیکن بھولے سے فقط ایک جگہ حوالہ ان کے قلم سے نکلا۔ اور وہ بھی ناقص۔ صفحہ ۲۰ پر ہمارا ایک فقرہ نقل کر وہ حوالہ دیتے ہیں " تجلی صفحہ ۴۹ " آگے پیچھے انھوں نے کہا ذکر نہیں کیا ہے کہ لکھتے وقت تجلی کا کونسا شمارہ ان کے پیش نظر

ہے لہٰذا ماہ وسن کی تصریح کے بغیر "تجلّی" لکھ دینا کافی نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جب طلاق کی بحث تین شماروں میں پھیلی ہوئی ہے تو اور بھی ضروری تھا کہ مہینے کی وضاحت کر دی جاتی۔ مگر ضرورت کا لحاظ کرنا تو درکنار دوسرے سے احساس ہی نہیں رکھتے کہ حوالے کی بھی کوئی اہمیت ہے۔ بتائیے اس صورت میں ان لوگوں کو کس قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا جو یہ چاہیں کہ تقابلی مطالعہ کر کے موصوف کی صحتِ نقل کا اطمینان کر سکیں۔ خود ہمیں بیراغ لگانا کہیں کہیں دشوار ہو رہا ہے کہ ہماری طرف منسوب کردہ فلاں مفہوم یا فلاں نقرہ تجلی میں کہاں ہے۔ محترم موصوف کو اگر بحث ونظر کے حدود وقیود سے دلچسپی نہیں تھی تو آخر لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں کودنا ہی کس حکیم نے نسخے میں لکھ دیا تھا۔

اب مثلاً قرآن کی آیت الطّلاقُ مرّتان کی بحث میں ہم نے بہت کچھ لکھا ہے۔ تجلی طلاق نمبر میں بھی اور اس سے قبل والے شمارے (نقد ونظر نمبر) میں بھی۔ اس آیت کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ — " طلاق دو ہیں جن کے بعد رجوع کیا جا سکتا ہے۔" گویا مرّتان کا مطلب ہے اثنتان (دو) دوسرا یہ کہ — " طلاق دو مرتبہ ہیں۔" اونچے اہلِ علم دونوں ہی طرح ترجمہ کرتے آئے ہیں۔ مولانا محفوظ الرحمان نے "پہلا اعتراض" عنوان قائم کر کے اسی آیت سے متعلق ہم پر معارضہ فرمایا ہے۔ اس معارضے کی علمی اور منطقی قدر وقیمت اگر قارئین اچھی طرح سمجھ لیں تو انھیں ادراک ہو جائے گا کہ فریقِ ثانی کس طرح کے لاحاصل اور غیر ذمہ دارانہ علم کلام کے ذریعہ بحث کو طول دیتا جا رہا ہے۔

امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ یکجائی تین طلاق دینا گناہ وبدعت نہیں ہے۔ احناف کا مسلک یہ ہے کہ اگرچہ تینوں یکجائی طلاقیں پڑ ضرور جاتی ہیں لیکن دینے والا گناہگار ہوتا ہے۔ احناف نے اپنے مسلک کے حق میں جو بہت سے دلائل دیئے ہیں ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ اللہ نے الطلاقُ مرّتان فرمایا مرّتان کا مطلب ہے دو بار طلاق دینا۔ یعنی ایک ساتھ دو نہیں بلکہ الگ الگ ایک کے بعد ایک۔ اس طرح معلوم ہوا کہ ایک ساتھ دو طلاق دینا ہدایتِ قرآنی کے خلاف ہے اور جو چیز ہدایتِ قرآنی کے خلاف ہو وہ گناہ نہ ہوگی تو اور کیا ہوگی۔ شوافع اور بعض اور اہلِ علم کہتے ہیں کہ مرّتان سے مراد دو مرتبہ نہیں ہے بلکہ اثنتان ہے یعنی دو طلاق۔ چاہے وہ ایک ساتھ ہوں یا الگ الگ۔

بعض مقالہ نگاروں نے یہ باور کرانا چاہا تھا کہ مرّتان کا واحد مطلب ہے دو مرتبہ طلاق نہ کہ دو طلاق۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ ایسا دعویٰ درست نہیں۔ خود قرآن میں ایسی آیات موجود ہیں جن میں مرّتان اور مرّات کا استعمال صرف تعداد کے لئے کیا گیا ہے یکے بعد دیگرے کے مفہوم میں نہیں کیا گیا اور عربی زبان کے استعمالات میں بھی یہ الفاظ بارہا محض تعداد کے لئے استعمال ہوتے آئے ہیں۔ لہٰذا احناف ہوں یا دیگر اہلِ علم کسی کو بھی یہ حق نہیں پہنچا کہ وہ آیت کا ایک ہی مفہوم قطعی قرار دے کر دوسرے مفہوم کو باطل ٹھیرا دے۔

ہماری عبارتوں کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:-

"آپ کو یقیناً علم ہوگا کہ کتنے ہی بڑے بڑے علمائے سلف نے مرّتان کو یہاں اثنتان کے مرادف بھی کہا ہے یعنی طلاقیں دو ہیں جن کے بعد رجوع ہو سکتا ہے۔" (تجلی نقد ونظر نمبر بابت مارچ واپریل ۱۹۷۳ء)

"بہت سے اہل علم کی اس رائے سے اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ اس رائے کی کوئی گنجائش آیت میں نہیں ہے۔" (حوالۂ مذکور کالم ۲)

"مرّتان یا مرّات کا استعمال عرب میں دونوں ہی طرح ہوتا ہے۔ کبھی اس میں اختلاف اوقات ملحوظ ہوتا ہے اور کبھی بالکل ملحوظ نہیں ہوتا۔" (〃)

"جب آیت کے لفظ مرّتان سے دو مفہوم علمی اعتبار سے ممکن ہیں تو کسی ایک مفہوم کیلئے قطعیت اور نصیت کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے اذا جاء

الاحتمال یبطل الاستدلال تو علم کلام کا بنیادی ضابطہ ہے (صفحہ ۲ کالم ۲)

کوئی بھی شخص ہماری ان صریح معروضات کی موجودگی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم آیت کے کسی ایک مفہوم کو قطعی طور پر صحیح اور دوسرے مفہوم کو غلط قرار دے رہے ہیں۔ اس کے برعکس ہم تو ان حضرات سے کھلا اختلاف کر رہے ہیں جو ایک مفہوم طے کر کے دوسرے مفہوم کو خارج از بحث مانتے ہیں۔

لیکن محترم مولانا محفوظ الرحمان صاحب نے ان تصریحات کی موجودگی ہی میں ہم پر جو الزام عائد کیا ہے وہ یہ ہے کہ علمائے احناف تو اس آیت میں لفظ مرتان سے "دوبار" کا مفہوم لیتے آئے ہیں لیکن:-

"اب مولانا عامر عثمانی صاحب احناف کی ان متفقہ تصریحوں کے خلاف کھڑے ہوئے اور اصرار کر رہے ہیں کہ ان بزرگوں نے جو سمجھا غلط سمجھا۔ یہاں بھی یہ (یعنی مرتان) اثنین ہی کے معنی میں ہے "تذکرتاب ۹۵"

فرمایا جائے کہ کیا یہ الزام درست ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ مولانا موصوف نے نقد و نظر نمبر پڑھا ہوگا اس لئے مذکورہ اقتباسات ان کی نظر سے نہیں گزرے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ بے جان عذر ہے۔ تجلی طلاق نمبر تو بہرحال مولانا نے پڑھا ہی ہے۔ اس کے صفحہ ۶۰ کالم ۱ میں ہم نے جناب شمس پیرزادہ کی طرف رخ کر کے یہ فقرہ لکھا ہے

"پچھلے ماہ ہم واضح کر چکے کہ ہمارے دوست کو قرآن میں وہ آیتیں بہت جلد مل گئیں جن میں لفظ مرتین "دو مرتبہ" کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے مگر وہ آیات بالکل نہیں ملیں جن میں دو مرتبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"

یہ فقرہ پڑھ لینے کے بعد مولانا کو لازماً پچھلے ماہ کا تجلی دیکھ لینا تھا جو نقد و نظر نمبر تھا۔ اگر وہ کہیں کہ یہ شمارہ مجھے میسر نہیں تھا تو ہم عرض کریں گے کہ پھر آپ کو لفظ مرتین کے تعلق سے گفتگو کرنی ہی نہیں چاہئے تھی معقولیت تقاضا کرتی ہے کہ کسی پر کسی مسئلے میں اعتراض کرنا ہو تو اس شخص کی وہ تحریر ضرور دیکھ لی جائے جس میں اس نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا۔ یہ تحریر مہیا نہ ہو تو اعتراض کو پھر پر اٹھا رکھا جائے۔ مگر نقد و نظر نمبر بھی تلاش نہ کر سکے اور الزام بھی عائد فرما دیا۔

لطف یہ ہے کہ ابھی جو فقرہ ہم نے طلاق نمبر [illegible] کیا اس سے بھی ہر شخص یہ نتیجہ بہرحال اخذ کر سکتا [illegible] ہم آیت کے لفظ مرتان کا کوئی واحد مفہوم طے نہ [illegible] بلکہ دونوں ہی مفہوموں کی گنجائش مانتے ہیں۔ علاوہ طلاق نمبر کے صفحہ ۸ پر ہم نے کچھ دلائل پیش کر کے [illegible] کیا تھا:-

"کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ لفظ مرتین کو اثنتین کے مفہوم میں بولنا اہل زبان کے یہاں جانی پہچانی بات تھی۔ یہ بالکل ضروری نہیں کہ جب مرتین کہا جائے تو اس سے لازماً مراد یہ ہو کہ دو واقعے الگ الگ مجلسوں میں پیش آئے"

یہ عبارت بھی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ہم زیر بحث قرآنی کے کسی ایک مطلب کو لازماً غلط اور دوسر[illegible] کو لازماً صحیح قرار دینے والوں میں نہیں بلکہ اس پر اص[illegible] کرنے والوں میں ہیں کہ دونوں ہی مفہوموں کی گنجائش [illegible] ایک ہی مفہوم کو قطعی قرار نہیں دینا چاہئے۔

ان تصریحات کے باوجود مولانائے محترم کا یہ [illegible] عائد کرنا کہ عامر عثمانی نے ایک ہی مفہوم کو [illegible] مفہوم مان کر دوسرا مفہوم لینے والوں کو غلط [illegible] قرار دے دیا آخر دیانت، سخن فہمی اور عدل [illegible] ہے۔

مزید عنایت یہ فرمائی گئی کہ جو جرم ہم نے نہیں [illegible] اسے مسلم قرار دے کر اس کی وجہ بھی مولانا نے اپنے [illegible] کو بتا دی۔ یہ کہ چوٹی کے علمائے احناف آیت کا جو [illegible] لے رہے تھے وہ چونکہ فریق مخالف کے حق میں جا [illegible] اس لئے عامر عثمانی نے اسے غلط قرار دیا اور دوسرے مفہ[illegible] بیڑہ اٹھایا۔

مولانا اگر حنفی اور فاضل دیوبند نہ ہوتے تو ہمیں ان
کے اس ارشاد پر تعجب نہ ہوتا لیکن ان میں چونکہ دونوں
ہی اوصاف جمع ہیں اس لئے تعجب ہوا کہ یہ وہ کیا کہہ
رہے ہیں۔ چوٹی کے علمائے احناف نے جہاں آیت کے
الفاظ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ "مرتان کا مطلب
دو مرتبہ" ہے وہیں انھوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس
مطلب کی رو سے اکھٹی دو یا تین طلاقیں دینا گناہ تو بیشک
قرار پاتا ہے مگر یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ طلاقیں
واقع ہی نہ ہوں۔ جب یہ وضاحت کر دی گئی تو علمائے
احناف کا استدلال ان لوگوں کے حق میں کیسے چلا گیا جو یہ
رائے رکھتے ہیں کہ طلاقیں پڑتی ہی نہیں۔ حنفی ہونے کی
حیثیت سے مولانا کو اپنے چوٹی کے علماء سلف سے اتنا
بدگمان تو نہ ہونا چاہیئے کہ ان بزرگوں کا توازنِ ذہنی ہی
مشتبہ ہو جائے۔ مولانا کا مطلب تو یہ ہوا کہ علماء احناف
ان یکجائی طلاقوں کے واقع ہو جانے کی رائے رکھتے
ہوئے بھی آیت کا ایک ایسا مفہوم لے رہے ہیں جو ان کی اس
رائے کے خلاف ہے اور انھیں شعور نہیں کہ اس تضاد
کا احساس کر سکیں۔ اگر واقعی چوٹی کے علماء احناف کا حال
یہی ہے تو کوئی جواز نہیں کہ مولانا موصوف خواہ مخواہ اپنے
اوپر حنفیت کا اتہام لئے جائیں۔ انھیں کسی ایسے مکتب
فکر سے وابستہ ہونا چاہیئے جس کے بارے میں انھیں اطمینان
ہو کہ فہم و دراست کا زیادہ بہتر سرمایہ اس کے یہاں
موجود ہے۔

منطق کے سلسلہ میں بھی ہمیں مولانا موصوف سے
مایوسی کا تحفہ ملا۔ ہم نے طلاق نمبر میں امام ابن تیمیہؒ کے
ایک منطقی استدلال پر مفصل محاکمہ کیا تھا جو ص۵۳ سے
ص۵۸ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ہم نے ایک بات یہ
بھی کہی تھی کہ طلاق میں تعددِ عمل مقصود نہیں۔ اس کے
لئے ہم نے دلائل و نظائر پیش کئے تھے۔ ظاہر ہے یہ ایک
باریک منطقی بحث تھی اس پر باریکی ہی سے غور ہونا چاہیئے
تھا لیکن مولانائے موصوف نے باریکی اور دقتِ نظر کو
بالائے طاق رکھ کر ہماری تردید شروع فرما دی۔ وہ فرماتے
ہیں:—

"اگر یہی بات صحیح ہے تو آخر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ
ایک طلاق طہر کی حالت میں دینا طریقۂ سنت
اور امرِ محمود ہے اور اگر تین طلاق بیک کلمہ یا
ایک ہی طلاق بحالتِ حیض دی جائے تو معصیت
اور گناہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب طلاق میں تعددِ
عمل مقصود نہیں تو سنت اور بدعت کا کیا سوال؟" (صفحہ ۳۷)

یہ معارضہ بڑا سطحی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اللہ کو زن و
شوہر کے درمیان بقائے تعلق مطلوب ہے، نہ کہ انقطاعِ تعلق
مجبوری کی حالت میں طلاق دینا جائز تو کر دیا گیا لیکن
خوشگوار نہیں مانا گیا۔ اللہ کو جو کچھ مطلوب و مقصود ہے
اسے اس نے فرض یا واجب قرار دیا ہے۔ نماز روزہ حج
قربانی زکوٰۃ صلہ رحمی عدل شرافت طہارت یہ ساری
چیزیں اللہ کو مطلوب ہیں لہذا انھیں صرف "جائز" کے
درجے میں نہیں رکھا گیا بلکہ لازم کیا گیا۔ کسی فعل کو جواز تک
محدود رکھنا معنی ہی یہ رکھتا ہے کہ اللہ آپ سے اس کا مطالبہ
نہیں کرتا۔ اسے مقصد قرار نہیں دیتا۔ اس لحاظ سے یہ
بات بالکل صاف ہے کہ طلاق ان امور میں نہیں جنھیں اللہ
کا مقصود و مطلوب قرار دیا جا سکے۔ اب رہا یہ کہ طلاق کے
کسی طریقے کو موجبِ گناہ اور کسی کو خالی از گناہ کیوں قرار
دیا گیا تو اس کا بھی جواب صاف ہے کہ اللہ آپ کا خیرخواہ
ہے اور آپ کی بیویوں کا بھی۔ وہ چاہتا ہے کہ جب بقائے
تعلق کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور آپ طلاق دینے پر
آمادہ ہو ہی جائیں تو اس کا ایسا طریق اختیار کریں جو
آپ کے اور زوجہ کے حق میں مفید ہو سکتا ہو جس پر پچھتانا
نہ پڑے۔ اس کا یہ مطلب آخر کیسے نکل آیا کہ طلاق میں تعددِ
عمل مقصود ہے؟

اسی پہلے اعتراض کے ذیل میں مولانا نے اور بھی

بہت سی سطریں لکھی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ آیت الطلاق مرتان کی موجودگی میں اکٹھی دو طلاقیں نہیں پڑنی چاہئیں اس پر ہم بس اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ آپ چاہئے لاکھ بار اس طرز فکر کی گرد ان کرتے چلے جائیں مگر چاروں امام تو یہی کہتے اور سمجھتے آئے ہیں کہ اس آیت سے طلاقوں کے وقوع کا انکار نہیں ہوتا۔ اگر وہ غلطی پر تھے تو ہمیں اس پر کوئی شرمندگی نہیں کہ ہم سے بھی یہی غلطی صادر ہو رہی ہے آپ کو مبارک ہو کہ قرآن فہمی اور تفقہ میں آپ چاروں ائمہ سے بھی بڑھ گئے۔ اہل حدیث اس طرح کے پندار میں مبتلا ہوں تو حیرتناک نہیں لیکن تقلید کا قلادہ گردن میں ڈالنے والا ایک فاضل دار العلوم بھی پندار و خود بینی کے اس اونچے اہرام پر چڑھ جائے تو اسے تحیر خیز ہی کہیں گے۔

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

(جاری)

صفائی معاملات جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس کتاب میں مولانا اشرف علیؒ نے معاملات کی صفائی کے شرعی طور طریق بیان فرماتے ہیں۔ بڑے کام کا رسالہ ہے۔ قیمت صرف ۶۰ پیسے۔

معجزہ کیا ہے؟ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کی ایک فکر انگیز تصنیف۔ معجزے کے تمام پہلوؤں پر علم و تفقہ کی روشنی میں گفتگو۔ قیمت مجلد ـــــ ڈھائی روپے۔ ۲/۵۰

شہدائے بدر شہدائے بدر کے مختصر حالات و کوائف۔ ـــــ ایک روپیہ ۱/-

فنِ اسماء الرجال از مولانا تقی الدین مظاہری علم الحدیث کا مدار راویوں کے حالات پر ہے اور ان حالات کو سمجھنا فن اسماء الرجال پر منحصر ہے۔ لہٰذا احادیث رسولؐ سے دلچسپی رکھنے والے تمام ہی مسلمانوں کے لئے یہ کتاب بنیادی فوائد کی حامل ہے۔ قیمت ـــــ ایک روپیہ ۲۵ پیسے ۱/۲۵

ہفت روزہ عزائم (لکھنؤ) کا خاص نمبر

جدوجہد آزادی کی تاریخ۔ نتائج کیا نکلے۔ ہم کہاں پہنچے۔ ان تمام امور پر نہایت وقیع و دلچسپ اور مبصرانہ مضامین۔ نظم و نثر دونوں معیاری اور دلکش۔ یہ ضخیم نمبر آپ کے مطالعہ کی چیز ہے۔ قیمت۔ پانچ روپے ۲۵ پیسے۔ ۵/۲۵

(پہلی فرصت میں طلب فرمائیں ورنہ ختم بھی ہو سکتا ہے)

تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ تمیمی نجدی

آپ جانتے ہی ہیں کہ بدعتی حضرات اپنے سوا تمام مسلمانوں کو "وہابی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ دراصل محمد بن عبد الوہابؒ کے نام نامی کی طرف نسبت ہے اور اس نسبت کو گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر آپ سچائی کے متلاشی ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ فرما کر حقیقت سے آگاہ ہوں کہ محمد بن عبد الوہابؒ کس قدر سنت کے شیدائی بدعت کے دشمن اور دین و ملت کے خیر خواہ تھے انگریز نے اور بدعتیوں نے انھیں بدنام کیا اور بدعتی لوگوں نے اس بدنامی میں چار چاند لگائے۔ اس کتاب کے مصنف "قطر" کے محکمہ شرعیہ کے قاضی احمد بن حجر ہیں اور ترجمہ صفی الرحمن الاعظمی نے کیا ہے۔ ترجمہ کے علاوہ فاضل مترجم نے بیش قیمت نوٹ بھی حواشی پر بڑھائے ہیں۔

قیمت ـــــ ساڑھے چار روپے۔ ۴/۵۰

جمالِ مصطفٰے درد قریشی کی نعتوں کا دلکش مجموعہ قیمت ـــــ ایک روپیہ ۱/-

دین و شریعت اردو ایڈیشن۔ قیمت مجلد ۴/۲۵ انگریزی ایڈیشن ۱۵/-

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یوپی)

جماعتِ اسلامی ہند کا پانچواں کل ہند اجتماع

ہمیں ۱۹۶۰ء میں بھی جماعت اسلامی کے آل انڈیا
جتماع منعقدہ دہلی میں شرکت کی سعادت نصیب
ہوئی تھی مگر کہاں وہ اجتماع اور کہاں نومبر ۷۴ء میں
منعقد ہونے والا حالیہ اجتماع۔ ایسا ہی سمجھ لیجیے جیسے
س سال کا ایک دبلا پتلا بچہ اٹھارہ سال کا ایک
ت مند جوان بن جائے۔ کشیدہ قامت، وجیہہ
شگفتہ رو۔ زیادہ صحیح اور نفیس مثال قرآن میں ملتی ہے
لِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ
فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ
إِذْنِ رَبِّهَا۔

خوشا ایام! ایک ننھا سا نرم و نازک پودا بڑے
ی ناسازگار اور مایوس کن موسم میں اللہ کے ایک ناتواں
ے نے لگایا تھا۔ زمین سنگلاخ، بادِ صرصر طوفان
اٹھاتی ہوئی۔ مگر اس دیوانے کا جنون اسے اپنے دل و جگر
خون دیتا رہا۔ دیتا رہا۔ بجلیاں کوند رہی تھیں۔ ریت
ڑ رہی تھی۔ تماشائی قہقہے لگا رہے تھے مگر دیوانہ ہر شے
سے بے پروا پودے کی جڑوں میں اپنی رگوں کا لہو نچوڑ رہا
تھا۔ اور پھر بوڑھے آسمان نے دیکھا کہ پودے نے اپنی جڑیں
زمین میں پیوست کر دی ہیں، کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں، سبزی
گہری ہوتی جارہی ہے۔

رفتہ رفتہ یہ پودا چھوٹا سا درخت بنا، تنے سے
شاخیں پھوٹیں، شاخوں نے پتوں کو جنم دیا اور اسی چھوٹے
سے درخت کو ۱۹۶۰ء میں ہم نے دہلی کے رام لیلا گراؤنڈ میں
دیکھا تھا۔ آج یہ درخت تناور ہو چکا ہے۔ دور تک سایہ
ڈالتا ہوا۔ آندھیاں مایوس ہو چکی ہیں کہ اب شاید یہ تر اکھڑ
سکے۔ کدالیں اور تیشے تھک گئے ہیں کہ وہ زمین میں جتنے
جتنے گہرے اترے جڑیں اس سے بھی گہری جا پہنچیں۔
اب آیت قرآنی کا حسین ترین مفہوم بھی دیکھیے۔

"پاکیزہ اور ستھری بات ایک ایسے پاکیزہ اور
ستھرے درخت کی مانند ہے جس کی جڑ
بہت مضبوط ہو اور شاخیں زمین کی کثافت
سے دور فضائے آسمانی میں پھیلی ہوئی ہوں

یہ درخت اپنے پروردگار حقیقی کے فضل وکرم سے
ہمیشہ ہر وقت اپنے ثمرات و فوائد سے
دنیا کو نوازنے پر آمادہ ہے"۔

تو یہ ہے جماعت اسلامی۔ اور آگے بھی قرآن ہی کے
عجیب وغریب کلام سے بزم خیال کو تھوڑا سا نور دیجئے۔

یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ
فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَیُضِلُّ اللّٰہُ
الظّٰلِمِیْنَ۔

اللہ تعالیٰ ایک ثابت ومحکم قول کی بنیاد پر اہل ایمان کو دنیا اور آخرت دونوں میں ثبات واستقلال عطا فرماتا ہے اور ظالموں کو بھٹکا دیتا ہے۔

شاید بے محل نہ ہوگا اگر یہاں کچھ تفسیر بھی اسی دیوانے کی زبان سے سن لیں جس نے پودا لگایا تھا:۔

"یعنی دنیا میں ان کو اس کلمہ کی وجہ سے ایک
پائیدار نقطۂ نظر، ایک مستحکم نظام فکر اور
ایک جامع نظریۂ حیات ملتا ہے جو ہر عقدے
کو حل کرنے اور ہر گتھی کو سلجھانے کے لئے
شاہ کلید کا حکم رکھتا ہے۔ سیرت کی مضبوطی
اور اخلاق کی استواری نصیب ہوتی ہے جسے
زمانے کی گردشیں متزلزل نہیں کرسکتیں ۔
زندگی کے ایسے ٹھوس اصول ملتے ہیں جو ایک
طرف ان کے قلب کو سکون اور دماغ کو
اطمینان بخشتے ہیں اور دوسری طرف انھیں
سعی وعمل کی راہوں میں بھٹکنے، ٹھوکریں کھانے
اور تلون کا شکار ہونے سے بچاتے ہیں"۔

(تفہیم القرآن جلد ۲ ص ۴۸۶ سورۂ ابراہیم)

کیسا ہے یہ قرآن جو ہر آن ایسا ہی تر وتازہ نظر آتا ہے جیسے ابھی اترا ہو۔

عجیب یہ نہیں کہ مسلسل تین روز تک جماعت اسلامی کا اجتماع نہایت شان وشوکت، وقار وشکوہ اور حسن وتجمل کے ساتھ چلتا رہا۔ عجیب یہ ہے کہ خود غرضی، مفاد پرستی تن آسانی اور حقوق طلبی سے لبالب دنیا میں ایک گروہ یہ صدا لگاتا ہوا میدان حیات میں اتر آیا ہے کہ اے لوگو! ہمارے دامن میں پروردگار کے بخشے ہوئے کچھ ہیرے موتی ہیں انھیں آگے بڑھ کر لے لو۔ ہمارے پاس ایک نسخۂ کیمیا ہے جسے استعمال کرکے تم ہر طرح کی کامرانیوں سے دوچار ہوسکتے ہو۔ ہم تم سے قیمت نہیں مانگتے۔ صدا لگانے کی مزدوری بھی نہیں مانگتے، خراج تحسین اور جاہ واقتدار بھی نہیں مانگتے، اپنی امارت وسیادت کے بھی طالب نہیں ہیں، تم گھوڑے پر سوار ہو تو ہم تمہاری لگام پکڑ کر چلیں گے تم اختیار واقتدار کی مسند پر بیٹھ کر اس نسخۂ کیمیا کو عام کرو ہم تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائیں گے۔ تمہاری چوکیداری اور چپراس گیری کریں گے۔

جی ہاں یہی ہو جماعت اسلامی کی حقیقت اور تحریک اقامت دین کا واحد مفہوم۔ یہ گروہ جس نے وطن کے دار السلطنت میں تین دن تک ایک بے مثال اجتماعیت اور ایک قابل رشک نظم وضبط کا تاریخی مظاہرہ کیا اس لئے گھر سے نہیں آیا ہے کہ اپنی قوت کی نمائش کرکے کرسی والوں کی کرسیاں چھلینے۔ حزب مخالف بن کر حزب اقتدار کی نیندیں حرام کرے اور عوام کو کسی اندھے بہرے انقلاب کی طرف ہنکالے جائے نہ اس لئے آگے آیا ہے کہ گردن اکڑا اکڑا کر لاف وگزاف کرے الانتقام کا نعرہ لگائے اور حقوق حقوق کی چیخ پکار سے آسمان سر پر اٹھالے۔ یہ تو ان لوگوں کا گروہ ہے جو ظلم وطغیان کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں اپنے لہو سے چراغ جلانے نکلے ہیں۔ جو اپنے ہم وطنوں کو یہ آگاہی دینے نکلے ہیں کہ جس راہ پر تم منہ اٹھائے چلے جارہے ہو وہ دفعتاً ایک ہولناک الاؤ میں تمہیں جھونک دے گی۔ تم ہمارے بھائی ہو کیونکہ ہم سب کے ماں باپ ایک ہی ہیں۔ تمہارے لئے ہمارے سینوں میں محبت ہے۔ پیار ہے۔ تمہیں ہم سدا بہار باغوں میں ہنستا کھیلتا دیکھنا چاہتے ہیں۔

اجتماع میں پڑھا جانے والا ہر مقالہ اور کی جانے والی

ہر تقریر بہ نگاہِ غور دیکھ جائیے۔ آپ کہیں نہیں پائیں گے کہ جماعت اسلامی برادرانِ وطن سے کچھ مانگ رہی ہو۔ حالانکہ قانونِ عدل کی رو سے جائز حقوق کی مانگ بھی کوئی بری بات نہیں مگر جس وقت پوری دنیا کو یہ بتانا مقصود ہو کہ مسلمان کسے کہتے ہیں اس وقت جماعت اسلامی کا فرض وہی تھا جو اس نے خلوص اور سلیقہ سے ادا کیا اس نے دنیا کو یہ بنیادی بات بتائی کہ امتِ مسلمہ بنیادی جاہ و اقتدار کی بندر بانٹ کے لئے برپا نہیں ہوئی — دنیاوی تعیشات اور مناصب اس کا نشانہ نہیں ہیں وہ تو ایک خدا پرست امت ہے جو بندگانِ خدا کو دینِ خدا و ندی کی روشنی سے بہرہ ور کرنا چاہتی ہے جس کا فرض منصبی ہے امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور جو مخلوقِ خدا کی خیر خواہی میں جان تک کی بازی لگا دینے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھتی۔

ہمیں یقین ہے خود ارکین جماعت کو بھی اس اجتماع کی اس قدر شاندار کامیابی کا تصور پہلے سے نہیں ہوگا۔ اس کا معمولی سا قرینہ یہی سمجھ لیجئے کہ مہمانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ اندازہ کر کے جتنے طعامی پاس اس نے چھپوائے تھے وہ پہلے ہی دن کم پڑ گئے اور اس بنا پر نظم میں تھوڑا سا خلل بھی آیا۔ خدا کی چشمِ کرم متوجہ تھی۔ غالباً اٹھارہ ملکوں کی نمائندگی کرنے والے تقریباً ۳۵ مہمان اس طرح کھنچے چلے آئے جیسے اسی دن کے وہ عرصہ سے منتظر رہے ہوں۔ کیسی عجیب ہے نظریاتی ہم آہنگی۔ فقیروں کے غریب خانے پر ارب پتی چلے آ رہے ہیں۔ اندازہ یہ بھی ہوا کہ یہ آنے والے محض سیّاح نہیں تھے، دیدہ ور اور صاحبِ بصیرت بھی تھے۔ ان کی تقریریں بڑی متوازن اور جچی تلی رہیں۔ جذباتی خروش کے بجائے انھوں نے تدبر اور بالغ نظری کا ثبوت دیا۔

ہم تفصیلی منظر نگاری کیا کریں۔ سخن دراز ہو جائیگا پچاس ہزار سے بھی زیادہ کا مجمع ٹھوس اور متین تقریر تحریر کو اس توجہ، صبر و سکون اور انہماک کے ساتھ سنتا چلا جائے اسے تو ادراتِ ہی میں سے سمجھئے۔ خدا کا خاص فضل ہم اسے بھی سمجھتے ہیں کہ تمام اوقات میں نہ تو بجلی نے دغا دی نہ لاؤڈ اسپیکروں نے غمزہ دکھایا۔ ظاہراً خراجِ تحسین ٹھیکیداروں اور جماعت اسلامی کے کارپردازوں کو بھی ضرور جائے گا مگر خدا کا فضل اصل کار فرما ہے خدا نہیں چاہتا تو بڑی بڑی پُرکار مشینیں بھی لوہے کے جامد ڈھیر سے زیادہ کچھ نہیں رہتیں۔

انگریزی اخباروں — حتیٰ کہ ریڈیو نے بھی اپنی کسی نہ کسی حد تک حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا — بقولِ جگر:-

شرما گئے لجا گئے دامن بچا گئے
اے عشق مرحبا وہ یہاں تک تو آ گئے

حکومت کی روش پہلے جو کچھ بھی رہی ہو اب شاید اس کے حلقے میں بھی کچھ لوگ یہ سوچنے لگے ہیں کہ غور سے دیکھو تو یہ سودائی آخر چاہتے کیا ہیں۔ ان کا نشانہ کیا ہے یہ کیا سمجھتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس اجتماع کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ خود ہمیں بھی اپنے طول و عرض کا کچھ اندازہ ہو گیا اور دوسروں کو بھی پتا چل گیا کہ ایک چیز بہر حال موجود ہے جسے ہم پسند کریں یا نہ کریں خواہی نخواہی اسکے وجود کو تو ماننا ہی ہوگا۔

جمعیۃ علمائے ہند کی روش بقول بعض دلچسپ رہی مگر بقول ہمارے وہ قابلِ رحم پوزیشن میں آگئی ہے یہ اجمال وہ ہے جس کی تفصیل نہ ہی کی جائے تو اچھا ہے لڑنے جھگڑنے سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں۔ کینہ اور عناد ہمارا شیوہ نہیں، جمعیۃ والے بھی ہمارے دینی بھائی ہیں وہ اب بھی حقائق کا ادراک کر کے بھلمانسوں جیسی روش اختیار کرلیں تو پچھلی رنجشیں سب لفظ۔ گزشتہ یاں آنکی

انھیں مبارک ۔ پارلیمنٹ کی جتنی کرسیاں وہ لے سکیں لے لیں۔ جماعت اسلامی کبھی ان سے حصہ نہیں مانگے گی نہ طعن کرے گی۔ مگر قرآن وسنت کی کھلی کھلی نصوص نے جو ذمہ داریاں امت مسلمہ پر ڈالی ہیں ان کی بجاآوری میں جماعت اسلامی اور جمعیۃ علماء دوش بدوش کام کریں تو آخر کون اس میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ دنیا کے مفادات اتنے گراں تو نہیں کہ آدمی بہشت کی نعمتوں سے بالکل ہی منہ پھیر لے کیا اب جمعیۃ علماء والوں کو بہشت پر یقین نہیں رہا ہے ؟ ۔

بڑا سخت دور تھا جب جماعت اسلامی کے اردگرد قہر ودہشت کی دیویاں ننگا ناچ ناچ رہی تھیں اور درِ زنداں کھلا ہوا تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ سخت دور وہ ہوسکتا ہے جب دنیا اپنی نعمتوں کے خوان سجا کر جماعتِ اسلامی کو دعوت کام ودہن سے نوازنے لگے اور دیوانوں کے پھٹے لباس خلعت فاخرہ میں تبدیل ہوجائیں۔

تحدیث نعمت سے غافل ہونا یقیناً جرم ہے۔ بے شک اللہ نے ہمیں ۔۔ یعنی ہم سب مسلمانوں کو ایک اچھا دن دکھایا ہے۔ صحافت کی زبان میں اسے عظیم کامیابی بھی کہا جاسکتا ہے۔ شکر ہزار بار شکر لیکن یہیں سے جماعت اسلامی کے لئے ایک نئی آزمائش کا بھی آغاز ہوگیا۔ فراست مومنانہ کی آزمائش !

طاقت ذرہ ذرہ بدرجہ ہلاکو بھی پیدا کرتی ہے اور عمر فاروق بھی۔ بارود کا ایک ڈھیر اپنے ہی گھر کی چھت بھی اڑا سکتا ہے اور راہِ منزل کے پہاڑ بھی کاٹ سکتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اجتماعیت کے تازہ کامیاب مظاہرے نے جماعت اسلامی کی طرف ایک معنوی طاقت کو مرکوز کیا ہے۔ مگر اس طاقت کی غور وپرداخت، اضافے کی فکر صحیح استعمال کے ذریعہ اس کی افادیت کو عوام وخواص کے دلوں میں اتارنا، عجب اور پندار میں مبتلا نہ ہونا، پہلے سے بڑھ کر اپنا احتساب، خود اعتمادی کو نخوت کے زہر سے دور رکھنے کی سعی، خدا کی بارگاہ میں پہلے سے زیادہ الحاح وزاری اور اپنے نصب العین کی نزاکتوں اور لطافتوں پر کڑی نظر یہ سب آزمائش کے پہلو ہیں۔ لکھنے والا کسی بھی درجے میں اس لائق نہیں کہ اپنے سے کہیں بہتر دوستوں کو نصیحت کرسکے۔ لیکن ہر نصیحت کا مخاطب وہ خود سب سے پہلے ہے دوسرے بعد میں۔ اے اللہ! تو اپنے کمزور بندوں کو صراط مستقیم پر ثابت قدم رکھنا اور شدید آزمائشوں سے انھیں بچانا۔ تیری ہی نصرت سب کچھ ہے۔ تو ہی سب سے بڑھ کر رحیم وکریم ہے اور تمام تعریفوں کا واحد مستحق۔ تعالی اللہ الملک القدوس۔ تعز من تشآء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شیئ قدیر۔

رحِ انتخاب

اسلامی نظامِ زندگی میں لوگوں کے باہمی معاملات میں عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا فرض ہے۔ اسلام نے مالک اور ملازم، آجر اور اجیر، خریدار اور فروخت کنندہ اور مال پیدا کرنے والے (PRODUCER) اور صارف (CONSUMER) کے باہمی تعلقات کو نظم وضبط کا پابند رکھنے کے لئے نہایت دور رس اور منصفانہ قواعد وضوابط وضع کئے ہیں۔ یہاں تک کہ ہر حق دار اپنا حق لیتا ہے اور کوئی فرد یا گروہ کسی دوسرے فرد یا گروہ کے حقوق پامال کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

نظامِ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ قومی دولت کو بڑھانے اور اسے غیر نفع بخش مصارف میں ضائع ہونے سے بچانے کو فرض قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اسلام قوم کی قوتوں اور دولت اور افراد قوم کی کوششوں کو شراب نوشی، لہو ولعب، رنگ ورامش اور دیگر ظاہری اور باطنی فواحش میں ضائع ہونے سے بچاتا ہے۔ جو قومی قوتیں اور دولت ان فضول اور باعثِ فتنہ وفساد کاموں میں ضائع ہونے سے بچا کر ان کا رخ قومی پیداوار میں اضافہ کرنے کی طرف موڑ دیتا ہے۔

وہ قوم جو اپنے دن کا آغاز اس طرح کرتی ہے کہ صبح سویرے اٹھ کر وضو کرکے نماز ادا کرتی ہے اور وہ خوش مزاج اور چاق وچوبند ہوتی ہے۔ لامحالہ اس کی قومی پیداوار اس قوم کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوگی جو اپنی نصف شب یا اس کا بیشتر حصہ فسق وفجور وشہوت پرستی اور لہو ولعب میں گذار کر جب صبح بادلِ ناخواستہ نیند سے بیدار ہوتی ہے اور اپنے کاموں پر جاتی ہے تو وہ بدمزاج کسل مند اور کم ہمت ہوتی ہے۔

اسلامی نظام اپنی فطرت ومزاج کے اعتبار سے ایسا ہے کہ اگر اسے پورے طور پر نافذ کردیا جائے تو جس معاشرے میں اسے نافذ کیا جائے گا اس کی قومی دولت میں اضافہ ہوگا اور اس میں بے کار افراد اور فقراء کی تعداد کم ہوجائے قومی دولت میں اضافہ ہو اور اس کے مالدار لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرنے میں صحیح راہ اختیار کریں تو اس میں معاشی مسائل آسانی سے حل ہوجاتے ہیں بلکہ یہ مسائل کبھی پیدا ہی نہیں ہوتے اور اگر ہوں تو ایسی صورت اختیار نہیں کرتے کہ معاشرے کے لئے ایک مستقل خطرہ بن جائیں۔ جیسا کہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ معاشروں میں ہو رہا ہے وہاں بہت سے انقلابات آتے ہیں اور حق وناحق تباہی وبربادی کا باعث ہوتے ہیں پھر سرمایہ داری اور جاگیرداری کے ظالمانہ نظام کی کوکھ سے ایسے نظام جنم لیتے ہیں جو ان نظاموں سے زیادہ ظالمانہ اور باعثِ فتنہ وفساد ہوتے ہیں۔ یہ ہیں نقاب پوش اور بے نقاب کمیونزم یا اشتمالیت کے نظام جو پرانے افلاس کا علاج نئے افلاس سے کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو وہ تبدیلی لاتے ہیں یہ ہے کہ وہ فقر وغربت کو ساری قوم پر یکساں طور پر ٹھونس دیتے ہیں۔ سوا اس چھوٹے سے گروہ کے جو ہیئت حاکمہ کے ارکان، فنکار (EXPERTS) اور ملک میں رائج نظام کے پشت پناہ ماہرین پر مشتمل ہوتا ہے۔

اسلام افلاس کا تعاقب مختلف قوانین واحکا

کے ذریعہ کرتا ہے اور غرباء کو مالدار بنانے کے لئے مختلف وسائل بروئے کار لاتا ہے اگر اسلامی حکومت میں کچھ فقراء غرباء رہ جائیں تو وہ کسی صورت میں ایک طبقہ نہیں قرار دے دیئے جاتے جسے طبقۂ فقراء کہتے ہیں۔ طبقاتی تقسیم کی شرط یہ ہے کہ وہ قانون اور روایات کی مدد سے نسلاً بعد نسلٍ چلتی رہتی ہے مگر اسلام کے قوانین اور مختلف زمانوں میں اس کے ماننے والوں کی قائم کردہ روایات معاشرے کے کسی خاص گروہ پر فقر و غربت کو اس طرح ٹھونس نہیں دیتیں کہ بیٹے اور پوتے اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں پائیں اسلامی سوسائٹی میں فقر و غربت کوئی دائمی اور مستقل چیز نہیں بلکہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک فرد سے دوسرے فرد کو منتقل ہوتی رہتی ہے۔ کبھی چشم ظاہر بیں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور بالآخر بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ فقراء بھی تو آخر افراد ہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جو افراد آج فقیر ہوں کل غنی بن جائیں کیونکہ اسلامی معاشرے میں منصفانہ مواقع اور جائز چیزوں کے حصول کی تمنا کے دروازے سب کے لئے کھلے رہتے ہیں۔ ان یکونوا فقراء یغنیھم اللہ من فضلہ (سورۃ النور) "اگر وہ فقیر ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں اپنے فضل سے امیر کر دے گا۔" اور سیجعل اللہ بعد عسرٍ یسراً (الطلاق ۷) "اللہ تعالیٰ عنقریب بدحالی کے بعد خوشحالی کر دے گا۔"

اسلامی سوسائٹی میں افلاس کے سبب مفلس کی عزت و احترام میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور نہ اس کے حقوق پامال کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ اسلام نے اپنے افرادِ معاشرہ کو یہ تعلیم دی ہے جن میں خود فقراء بھی ہیں کہ معاشرے میں عزت و احترام کا معیار دولت و ثروت اور دیگر منقولہ و غیر منقولہ جائداد یا سیم و زر نہیں بلکہ علم و ایمان، تقویٰ اور اعمالِ صالح ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (الحجرات ۱۳)

"بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے۔" قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (الزمر ۹)

"کیا برابر ہیں جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے۔" یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (المجادلہ ۱۱) "اللہ تعالیٰ تم میں سے اہلِ ایمان اور اہلِ علم کے درجات بلند کر دے گا۔" وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِیْٓءُ "اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے وہ اور بدکار برابر نہیں"

رنگ رنگ کے پھول

وقتاً فوقتاً کچھ اشعار آپ سے آپ یادداشت کی سطح پر ابھر آتے ہیں اور خشک ترین مصروفیات کی بے رنگی میں قوسِ قزح انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ یہ بھی فطرت ہی کی ایک پیاس ہے۔ آئیے آپ بھی آج اس خلوت کے شریک بن جائیں۔ جس شاعر کا نام یاد آگیا ہے وہ لکھ دیا گیا۔ جس کا نہیں یاد آیا اس کے لئے دلی دعائیں۔ (مدیر)

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے
کبھی آ کے منظرِ عام پر کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے — جگر

گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ
سُن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے — جگر

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بیتاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو — اصغر گونڈوی

وہی بے چینیاں رہتی ہیں دوری ہو کہ نزدیکی
نہیں معلوم اس بیتاب دل کا مدعا کیا ہے — آرزو لکھنوی

خرد نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں — اقبال

بقدرِ پیمانہ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا — جمیل مظہری

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہرِ ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ — حافظ

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا — اصغر

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے — اصغر

لباس زہد ہو پھر کاش نذرِ آتشِ صہبا
کہاں کھوئی ہوئی ہے جرأتِ رندانہ برسوں سے — نامعلوم

خزاں کے ساتھ بہت دور مجھ کو جانا ہے
نہ انتظار کر اے محفلِ بہار مرا — روش

صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن
صیاد کا گھر لٹتا ہوا دیکھ رہا ہوں — نامعلوم

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است — حافظ

دعا دیتی ہیں راہیں آج تک مجھ آبلہ پا کو
مرے قدموں کی گل کاری بیاباں سے چمن تک ہے — بحر؟ سلطانپوری

تو رحیم ہے تو کریم ہے مری لغزشوں پہ نظر نہ کر
تری خو عطا مری خو خطا نہ وہ تجھ میں کم نہ یہ مجھ میں کم — نامعلوم

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است — نامعلوم

نہ دے بشارت بادِ بہار اے صیاد
چمن سے کیا انھیں جو بال و پر نہیں رکھتے — تاجور

شمع نظر خیال کے انجم جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں — فیض

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر — سیماب

ز نقص تشنہ لبی داں بہ عقلِ خویش مناز
دلت فریب گر از جلوۂ سراب نہ خورد — عرفی

سید رفیع الدین احمد قادری قمر

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مدظلہ

تو مفسر ہے کلام اللہ کی آیات کا ترجماں ہے تو حبیبِ حق کے ارشادات کا

تیرا مسلک اتباعِ سنتِ خیر المبیں تیرے ارشادات ہیں سامانِ تسکین و یقیں

حامیِ دینِ مبین و ہادیِ شرعِ متیں صاحبِ علم الیقین و فائزِ حق الیقیں

واقفِ اسرارِ دینِ احمدِ مختار ہے اس لئے دینِ محمد کا علمبردار ہے

تو سپر ہے حملۂ باطل کی قوت کے لئے زلزلہ ہے تو بنائے شرک و بدعت کیلئے

لرزہ براندام ہیں افکارِ باطل مرحبا جانبِ حق دل نظر آتے ہیں مائل مرحبا

اس زمانے میں خدا کے دین کی حجت ہے تو اور مسلمانوں کے حق میں آیۂ رحمت ہے تو

تونے سوتوں کو جگایا حق کی خدمت کیلئے اور کمربستہ کیا ہم کو شریعت کیلئے

تیرے اخلاصِ عمل کی ہر طرف اک دھوم ہے تیرا ایمان و یقیں مشہور ہے معلوم ہے

امتیازِ حق و باطل نور و ظلمت تجھ سے ہے اور دلوں میں روشنیِ دینِ فطرت تجھ سے ہے

سارے اسرار و معانی آشکارا کر دیئے سب عمل سے اور زبانی آشکارا کر دیئے

نرم ہے اور مہرباں ہے مومنوں کے واسطے سخت ہے فولاد سے بھی دشمنوں کے واسطے

دل میں تیرے حق تعالیٰ کی محبت ہے، شعار سر میں سودا اتباعِ مصطفیٰ کا ہے مزید

دین کی تجدید وابستہ ہے تیری ذات سے رسم و راہِ فقر قائم ہے تری عادات سے

تو مجدد ہے محدث ہے فقیہ العصر ہے ہر مسلماں کے لئے تو باعثِ صد فخر ہے

گیتیِ تاریک میں تو نے اجالا کر دیا عالمِ باطل میں حق کا بول بالا کر دیا

اس زمانے میں قمر پر بھی ترا احسان ہے
تیرے پرتو سے منور اس کا بھی ایمان ہے

ملا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

اچھا تو یہی ہے کہ اسے پڑھنے سے پہلے آپ اکتوبر ۷۶ء کا تجلی تازہ کرلیں۔ سیٹھ اور ان کی بیوی کے جغرافیہ سے باخبر رہیں گے۔ لیکن کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو بہر حال یہ کہانی بھی اپنی جگہ پوری ہی ہے گذشتہ سے پیوستہ نہیں کہی جاسکتی۔

ان کا اصل نام کیا رہا ہوگا یہ مجھے یاد نہیں۔ مجھے کیا شاید اوروں کو بھی یاد نہ ہو۔ میرا تو خیال ہے وہ خود بھی بھول چکے ہوں گے۔ اب وہ اپنے موجودہ نام پر اس طرح مطمئن ہیں جیسے بچپن ہی سے یہی نام چلا آرہا ہو۔ پہلے پہل وہ اس نام پر بے حد برافروختہ ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک صاحب پر تو انھوں نے استنجے کا ڈلا کھینچ مارا تھا۔ مگر جتنا جتنا وہ چڑھے اتنا ہی اتنا یہ نام قبولِ عام حاصل کرتا چلا گیا۔ آخر کار انھیں صبر کرنا پڑا۔ صبر کرتے کرتے اب وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ اب تو وہ خود بھی اپنے منھ سے اسے دہرانے میں مضائقہ نہیں سمجھتے۔ مثلاً ایک روز میرے ساتھ بازار جا رہے تھے۔ میرے ایک شناسا راستے میں مل گئے۔ وہ ان سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے ان کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا۔ آپکی تعریف؟ میں جواب دینے ہی والا تھا کہ موصوف جھٹ سے بول پڑے خاکسار کو حافظ پجاما کہتے ہیں!

یہ نام دراصل ایک تاریخی قسم کے حادثے کی دین تھا۔ کئی سال ہوئے وہ ماہ رمضان میں ایک مسجد میں تراویح پڑھ رہے تھے۔ آواز دل کش ہے مگر بھولتے بہت ہیں۔ سامع لقمہ دے تو موڈ بگڑ جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو سلام کے بعد تیزم تازی بھی ہو جاتی ہے۔ بہر حال انیسواں پارہ چل رہا تھا جب سورۃ الفرقان کی اس آخری آیت پر پہنچے فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا تو دفعتاً انکی زبان سے نکلا فَسَوْفَ يَكُونُ پجاما اور غڑاپ سے رکوع میں۔

سامع بیچارہ کیا کرتا۔ اول تو اس طرح کی نادر غلطی زندگی میں پہلی بار اس کی سماعت پر طلوع ہوئی تھی۔ دوسرے حافظ صاحب ٹوکنے کا موقع دیئے بغیر رکوع میں غوطہ لگا گئے تھے۔

سلام کے بعد اچھا خاصا غدر برپا ہو گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن۔ لوگ انھیں حافظ پجاما کہتے ہیں۔ اگلے روز میں نے علیحدگی میں ان سے پوچھا تھا۔

"اے مردود یہ تم نے قرآن میں پجاما کہاں سے گھسیڑ دیا؟"

"یار کیا بتائیں" وہ بڑی معصومیت سے بولے تھے۔

"کل جب ہم مسجد کے غسل خانے میں نہا رہے تھے تو کوئی خبیث دیوار پر لٹکا ہوا پاجامہ کھینچ کر لے گیا۔ بالکل نیا تھا۔ باہر نکل کر پکڑتے تو کیسے پکڑتے۔ تراویح تہمد باندھ کر پڑھانی پڑی کیونکہ بچارے سارے دھوبی کے گئے ہوئے تھے۔ اسی بچارے کا خیال بار بار دماغ میں آرہا تھا کہ خدا غارت کرے چرخے کی زبان کو لزاما کا قافیہ پجاما زبان سے نکل گیا۔ ہمیں تو پتا بھی نہ چلا ہم کیا پڑھ گئے ہیں بعد میں احساس ہوا۔"

"اب کون تم سے تراویح پڑھوائے گا۔ ڈوب کے مرو ہو۔"

"نہ پڑھوائے۔ بڑے خزانے بخش رہے ہیں نا لوگ۔ مدراس اور میسور کی طرف تو حافظ کو سیکڑوں ہزاروں روپے مل جاتے ہیں۔ یہاں اُلٹا حساب ہے قرآن بھی مفت سناؤ اور بک بک جھک جھک بھی سنو۔"

تو یہ تھے حافظ پجاما۔

اب سُنیئے ناشتہ کے انتظار میں مَیں حقہ گڑگڑا رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے ہانک لگائی۔

"ملّا صاحاب!"

میں نے جواب دینے کے بجائے زوجہ کی طرف دیکھا جو چولھے پر فراٰئی پن میں کبوتر کے انڈے توڑ رہی تھی۔ کبوتر کے بجائے اگر چڑیا کے بھی میسر آ جاتے تو آج وہی زہر مار کرنے پڑتے کیونکہ مرغیاں سب کی سب تین دن سے ہڑتال پر تھیں۔ زوجہ کے ماتھے پر دو تین شکنیں نظر آئیں۔ جواباً اس نے میری طرف دیکھا۔ اتنے میں پھر آواز آئی:-

"ملّا صاحاب"

"مر گئے ملا صاحب۔" میں بڑبڑاتا ہوا اٹھا۔ اندازہ پوری طرح ہو گیا تھا کہ حافظ پجاما کے سوا کوئی نہیں دروازے پر پہنچا تو وہ تیسری بار صدا لگانے کے لئے پر تول رہے تھے۔

"سلاما لیکم" میں نے مردہ سے لہجے میں خیر مقدم کیا۔

"یار کمال کرتے ہو۔ اب تک سو رہے تھے کیا؟"

"تمھاری بلا سے۔ یہ بتاؤ سویرے سویرے کیا آفت آئی۔"

"تمھیں سیٹھ صاحب نے یاد فرمایا ہے۔"

"فرمایا ہوگا۔ میں آٹھ بجے سے پہلے سو کر نہیں اٹھتا۔ ابھی ساڑھے سات بجے ہیں۔"

"تو پھر ہم بیٹھک میں بیٹھے جاتے ہیں۔ چائے وغیرہ بھجوا دو۔ آٹھ بجے چلے چلنا۔"

"میں نے مدّت ہوئی اپنے گھر سے چائے جیسی لغویات ختم کر دی ہیں۔ کیا کچھ روشنی ڈال سکو گے سیٹھ صاحب نے صبح ہی صبح کیوں یاد فرمایا ہے؟"

"ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ بس حکم ملا ہے کہ فوراً بلا لاؤ۔"

"اور آپ صبح ہی صبح انھیں کہاں دستیاب ہو گئے تھے؟" میں نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے انھیں گھورا۔

"تو یار خفا کیوں ہوتے ہو۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے ہماری بیوی ہٹلر کی خالہ ہے۔ رات خواہ مخواہ لڑ بیٹھی تھی چولھا بھی نہیں جلایا۔ اب صبح چائے بھی نہیں پکائی۔ ہم نے سوچا سیٹھ صاحب کے یہاں پی لیں گے۔ وہاں پہنچے تو انھوں نے اِدھر دوڑا دیا۔"

"مگر تمھارے چہرے سے تو نہیں ظاہر ہوتا کہ رات فاقہ کیا ہوگا۔"

"فاقے کی نوبت نہیں آئی۔ باسی روٹیاں موجود تھیں وہ سو گئی تو ہم باورچی خانے میں گھس گئے تھے۔"

"چلو بیٹھک میں بیٹھو میں چائے بھجواتا ہوں۔"

"ماشاءاللہ۔ مگر یار انڈا ونڈا ابھی بھجوانا۔ پراٹھا بنواؤ گے تو دیر لگے گی۔ توس اور مکھن سے بھی کام چل جائیگا۔"

"لعنت ہے تم پر۔ چلو بس چائے بھی سیٹھ ہی کے یہاں پییں گے۔"

"ایسی بھی کیا بے مروّتی۔ یار وہاں تو پینی ہی ہے۔ تمھاری زوجہ کے ہاتھ کی چائے ہمیں بہت خوش ذائقہ لگتی ہے۔"

"زوجہ اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔"

"مت جھوٹ بولو۔ ابھی کواڑ کی ریخ سے ہمیں اسکی پرچھائیں نظر آئی تھی۔"

"پرچھائیاں ناشتے نہیں تیار کرتیں۔ کیا کہا پرچھائیں
اے مردود اب تم تانکا جھانکی بھی کرنے لگے ہو۔"
"تمھارے سر کی قسم۔ وہ تو بس اتفاق سے ریخ
سامنے آگئی تھی۔"
"ریخ سے تو صحن نظر آ سکتا ہے۔ زوجہ تو باورچی خانے
میں ہے۔"
"ہے نا۔ معلوم ہوتا ہے پراٹھا بنا رہی ہے کیسی سوندھی
سوندھی خوشبو آ رہی ہے۔"
"منھ دھو رکھو۔ ہم لوگ عرصے سے چوہوں کے آچار
کا ناشتہ کر رہے ہیں۔"
"کچھ بھی ہو۔ ہم تو تمھارے دوست ہیں۔ جو تم کھاؤگے
وہی ہم بھی کھالیں گے۔"
"تم جیسے دوستوں نے میری مٹی پلید کرکے رکھ دی ہے
چلو مرو بیٹھک میں۔"
انڈے کبوتر کے بھی بس دو ہی تھے۔ زوجہ نے دونوں
کا آملیٹ پلیٹ میں اُلٹ کر میری طرف بڑھا دیا۔
"لیجئے ٹرے میں رکھ لیجئے میں چائے بھی دیتی ہوں۔"
یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف بالکل نہیں دیکھا۔ چہرے
پر سنجیدگی کی آندھیاں چل رہی تھیں۔
"آدھا آملیٹ تم اپنے لئے لو۔۔۔ آج تو شاید
باسی روٹی بھی نہیں ہے۔" مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔
"آپ میری فکر نہ کیجئے۔ جائیے لے جائیے۔"
لے جانے کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ حافظ بچا ما نے
ٹرے دیکھ کر برا سا منھ بنایا۔
"یار توس مکھن کچھ بھی نہیں!"
"غنیمت سمجھو جو کچھ بھی ہے۔ تم جیسے احباب میری
گھریلو زندگی تباہ کرکے چھوڑیں گے۔"
"خواہ مخواہ کی باتیں مت کیا کرو۔ ہماری زوجہ
ڈھنگ کی ہوتی تو تمھیں روز حلوے پراٹھے کھلایا کرتے۔"
یہ کہتے کہتے انھوں نے سارا آملیٹ ایک ہی چمچے میں
صاف کر دیا۔

کچھ دیر بعد ہم عنایت منزل کے ہال کمرے میں بیٹھے ہوئے
تھے۔ سیٹھ عنایت کے چہرے پر کچھ فکر مندی سی تھی اور مسنر
عنایت یعنی زیبا غوثیہ بھی خاموش ہی تھیں۔ حافظ بچا ما ان
غیر ضروری تفصیلات سے بے نیاز ناشتے کی پلیٹوں سے
دو دو ہاتھ کر رہے تھے۔
"تمھیں ایک زحمت دینی ہے صاحب زادے" سیٹھ
صاحب نے دفعتاً فرمایا "آج ہی کٹورے شاہ کی درگاہ تک
جانا ہے۔"
"آپ کے حکم سے میں نے کبھی سرتابی نہیں کی۔ قطب شمال
تک بھی دوڑا چلا جاؤں گا۔"
"جانتا ہوں سعادت مند ہو۔ در اصل میں خود جاتا
مگر مجبوری پیش آگئی ہے۔"
"فرمائیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"
"مزار شریف پر چادر چڑھانی ہے اور کچھ نذرانہ
سجادے صاحب کے حوالے کرنا ہے۔"
"اللہ اکبر۔ یہ کام آپ صوفی طیرا ابابیل سے
بھی لے سکتے ہیں وہ تو آپ کے جانثاروں میں ہیں۔"
"یقیناً ہیں، لیکن وہ اتفاق سے ہری پور گئے ہوئے
ہیں جن اُتارنے۔"
"آجائیں گے لوٹ کر۔ آج ہی کیا جلدی ہے؟"
"جلدی ہی تو ہے۔ صوفی مہتاب نے زائچہ کھینچ کر
بتایا ہے کہ آج میرے ستارے شاندار ہیں۔ آج کی تاریخ
ختم ہوتے ہی عقرب برج نہم میں داخل ہو جائیگا۔"
"ہو جایا کرے۔ میرا دعویٰ ہے کہ صوفی مہتاب
علم نجوم کی ابجد بھی نہیں جانتے۔ عقرب جس دن برج
نہم میں داخل ہو گیا قیامت آجائے گی۔ ابھی تو وہ
برج ششم میں بھی داخل نہیں ہوا نہم کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔"
"بکواس نہیں۔ تم کیا جانو علم نجوم۔"
"مجھے حیرت ہے آپ اتنے اسمارٹ ہو کر علم نجوم پر
اعتماد رکھتے ہیں۔"

"یہ ایک الگ بحث ہے کہ میں اعتماد رکھتا ہوں یا نہیں رکھتا مگر تمھیں یاد ہوگا اسمگلنگ کے سلسلے میں کس بری طرح میں پھنس گیا تھا۔ صوفی مہتاب ہی تو تھے جن کے مشورے سے کٹورے شاہ کی درگاہ میں چادر چڑھائی تھی۔ پھر دیکھ لو کس حیرت ناک طریقے پر ساری بلا ٹلتی چلی گئی۔"

"تو کیا خدانخواستہ پھر کوئی بلا نازل ہوگئی ہے؟"

"بلا تو نہیں مگر ایک چکر پھنس گیا ہے۔ وہ تم نے دیکھا ہوگا سلفر اسٹریٹ اور نیو کالونی کے کراس پر ایک پلاٹ خالی پڑا ہے۔ اس کی خریداری کے سلسلے میں سیٹھ نعمانی سے مقابلہ چل رہا ہے۔"

"بھلا اس پلاٹ کا آپ کیا کریں گے؟"

"سنیما ہال کے لئے لاجواب جگہ ہے۔ قیمت بھی یاد ہے نہیں۔ بس تین لاکھ میں ہاتھ آجاتی اگر نعمانی بیچ میں نہ کود پڑا ہوتا۔"

"تین لاکھ" میں حیران رہ گیا "وہ تو بہت تھوڑی سی جگہ ہے۔"

"سنیما ہال کے لئے کافی ہوگی۔ مقابلہ بازی کی بنا پر پانچ لاکھ تک بات جا پہنچی ہے۔ میں تو دس لاکھ کی بھی پروا نہ کرتا مگر کارپوریشن کے کچھ آفیسران نعمانی کا پارٹ لے رہے ہیں۔ بظاہر وہی کامیاب ہوتا نظر آرہا ہے۔ میں نے جس آفیسر سے سودا کیا تھا وہ سور کا بچہ ہارٹ فیل کر گیا۔ اب کوئی بھی شکل کامیابی کی باقی نہیں رہی۔"

"تو کیا آپ کو یقین ہے کہ کٹورے شاہ کی درگاہ آپ کے لئے کوئی معجزہ ظہور میں لائے گی۔"

"پہلے بھی اس نے معجزے ہی کو جنم دیا تھا۔ آزما لینے میں کیا حرج ہے۔"

"ایسی صورت میں چادر آپ خود چڑھائیں۔ مجھے یا کسی کو بھیجنا مناسب نہ ہوگا۔"

"میرا بھی ایسا ہی خیال تھا لیکن صوفی مہتاب نے میرا عذر سنکر یہ منظور کرلیا ہے کہ وہ ایک وظیفہ پڑھ کر اس کمی کی تلافی کردیں گے۔ چادر بہرصورت آج ہی چڑھنی ہے۔"

"خود آپ کو آخر کیا عذر پیش آگیا؟"

"بات یہ ہے آج ہی وزیر زراعت کے ایک قریبی رشتہ دار آرہے ہیں ان سے ملنا ہے۔ ان کا کارپوریشن میں بڑا اثر ہے۔ کیا بعید ہے کہ اونٹ کسی کروٹ بیٹھ ہی جائے۔ روحانی تدابیر کے ساتھ ساتھ ظاہری تدابیر بھی تو ہونی ہی چاہئیں۔"

"آپ کی مرضی۔ مجھے کس وقت جانا ہوگا؟"

"بس ابھی۔ میری امپالا لیتے جاؤ۔ یہ تمھاری زوبی بھی تمھارے ساتھ جائیں گی۔"

"جی" میں اچھل پڑا۔

"ارے بھئی یہ کئی دن سے اپنی خالہ کے یہاں جانے کو کہہ رہی ہیں۔ تم رام گاؤں سے گنگا پور کی طرف مڑ جانا۔ وہیں تو رہتی ہیں ان کی خالہ۔ انھیں وہاں اتار دینا پھر واپسی میں ساتھ لیتے آنا۔"

"آپ خواہ مخواہ ان سے کہہ رہے ہیں۔" زوبی ناخوشگوار سے لہجے میں بولی "یہ مجھے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔"

"کیوں بھئی" سیٹھ نے مستفسرانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"محترمہ کا خیال درست ہے۔ میرے لئے یہ بڑا دشوار مسئلہ ہے۔"

"کس قسم کی دشواری؟" سیٹھ برا سا منہ بنا کر غرائے

"آپ نہیں سمجھتے۔ میری زوجہ کو اگر پتا چل گیا کہ میں نے میلوں کا سفر کسی نامحرم کے ساتھ کیا ہے تو وہ زمین آسمان ایک کردے گی۔"

"میری جوتی بھی ان کے ساتھ نہیں جاسکتی۔" زیبا دفعتاً بھڑک اٹھی۔ اس کے چہرے پر طیش کی بجلیاں کوندنے لگی تھیں

"بہت ہی بدتمیز ہو تم ملا۔ آخر شائستگی کب سیکھو گے۔ الدم جانور۔" سیٹھ کو بھی طرارہ آگیا تھا۔

"آپ کا حکم ہو تو ہم چلے جائیں ملا کی جگہ" حافظ بیچارے نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"بکواس مت کرو۔" سیٹھ نے ایسے انداز میں کہا

افظ پچا ماننے گالی بکڈی ہو۔

"حرج تو کچھ نہیں۔ آپ میری جگہ انھیں بھیج دیں۔"

زارش کی۔

"اے مسٹر! تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو۔" زیبا دفعتاً

ٹ پڑی "تم جیسے ہزاروں گلیوں میں جوتے چٹخاتے

ہیں۔ آئے بڑے لاٹ صاحب۔"

"یہ تو پاگل ہے ــــ ڈارلنگ تم برداشت کرو۔

ں میں خود تمھیں لے کر جاؤں گا۔" سیٹھ نے بیوی کو

ی۔

"نہیں۔ میں آج ہی جاؤں گی انھیں کے ساتھ جاؤنگی۔

یہ کیسے نہیں لے جاتے۔"

"ٹھیک ہے تم جاکر کپڑے بدل لو۔ یہ ضرور تمھیں لے جائیگا

ں ماردوں گا۔" سیٹھ نے پہلے بیوی کی طرف پھر میری

یکھا۔

ہ بی تیز قدموں سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اب میں نے

ـ

یائی ڈیر سیٹھ صاحب! کیا واقعی آپ سٹھیا گئے ہیں۔"

"تم سمجھنے کی کوشش کرو فرزند" انھوں نے مشفقانہ اندا

ے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دبی آواز میں کہا "کل بھی میں نے

ھانے کی کوشش کی تھی کہ میں اس کا صرف شوہر ہوں۔

ـ دوست بھی چاہیئے۔ آج بھی سمجھاتا ہوں کہ احمق

۔ تمھاری شرافت پر مجھے بھروسہ ہے۔ تم کتنی کا لو

ئی نہ کوئی لفنگا تمھاری جگہ لے لے گا۔ کیا تمھیں زوبی

یمیت پر ترس نہیں آتا؟"

آپ کچھ بھی کہیں۔ تنہا میرے ساتھ ان کا جانا ٹھیک

انظ صاحب کو بھی ساتھ لئے لیتے ہیں۔"

مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ یہ بھی اپنے ہی آدمی ہیں گو کہ

ے گاؤدی ہیں۔"

انظ پچا ما ایسے نیاز مندانہ انداز میں مسکرائے جیسے

کا خطاب خلعت فاخرہ کے ہم معنی ہو۔ پھر کچھ دیر

مپالا کی ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ حافظ صاحب

میرے برابر کی سیٹ پر اور زوبی پیچھے۔ زوبی نے بہت

معمولی قسم کا لباس پہنا تھا۔ چہرہ بھی میک اپ سے بے نیاز

تھا۔ بالوں میں کنگھی بھی بس برائے نام ہی کی گئی تھی۔ چہرے

پر تاؤ کے اثرات تھے۔ گاڑی اسٹارٹ ہونے سے قبل اعلیٰ

درجے کے ٹیری کاٹ کا ایک سبز رنگ کا تھان اور ایک ایک

کلو مٹھائی کے بیس ڈبے گاڑی میں رکھ دیئے گئے۔ ساتھ ہی

سو روپے کا نوٹ بھی سیٹھ نے مجھے پکڑا دیا تھا کہ سامان کیساتھ

یہ بھی کٹورہ شاہ کے سجادے کو دیدوں۔

گاڑی جب شہر کی راہوں سے گذر کر رام گاؤں والی

نیم سنسان سڑک پر نکل آئی تو زوبی کی آواز سنائی دی ـــ

"اتنا تیز مت چلاؤ۔ کیا گاڑی اُلٹو گے۔"

میں نے عقب نما آئینہ کا زاویہ بدلا۔ اب زوبی کا

چہرہ سامنے تھا۔

"کیا ہز ہائنس کا غصہ اُتر گیا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"تم اپنی کہو۔ بڑے لاٹ صاحب بنے تھے کہ ساتھ نہیں لے

جائیں گے۔" اب اس کے چہرے پر تبسم کھیل رہا تھا۔ پھر

دفعتاً اس نے ایک بچکانہ حرکت کی۔ زبان ہونٹوں کے درمیان

لاکر مجھے آئینے میں منہ چڑا دیا۔

"کتنا گھٹیا جوڑا بدلا ہے تم نے۔ تمھاری خالہ کیا

سوچیں گی۔ آج تو ایوننگ ان پرازیل بھی نہیں لگائی۔"

"تم سے مطلب۔ میری خالہ بہت غریب ہیں۔ میرے

پاس اس سے گھٹیا جوڑا نہیں تھا ورنہ وہ بدل کر جاتی۔ تم بہت

بدتمیز ہو۔ اگر پہلے ہی ساتھ لے چلنے پر تیار ہو جاتے تو کون سی

تمھاری شان میں فرق آجاتا۔"

"میں اب بھی زبردست خطرہ مول لیکر تمھیں ساتھ

لے چل رہا ہوں۔ اگر میری زوجہ کو علم ہو گیا تو سمجھ لو کہ بس حشر

برپا ہو جائے گا۔"

"انھیں تو میں خود جاکر بتاؤں گی۔ تم نے ابھی تک ان

سے مجھے نہیں ملوایا۔ کل میں خود پہنچوں گی۔ ریحانہ آپا کہہ رہی

تھیں کہ ملا کی بیوی بڑی شاندار ہے۔ الٹرا اسمارٹ۔"

"مگر اس حد تک بھی نہیں کہ...... کہ......"

"ہاں ہاں کہو رک کیوں گئے۔"
"بس کیا کہوں تم بہت بھولی ہو۔ پتا نہیں سکنڈ ایر تک کیسے پہنچی ہو گی۔"
"پھر تو ہیں۔ ایک تم ہی تو ہو نا دنیا میں عقل مند۔ بیہودہ کہیں کے۔"
"ارے یار تم سیٹھانی صاحبہ کو غصہ کیوں دلاتے ہو۔"
دفعتاً حافظ صاحب بولے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گردن موڑ کر پیچھے نگاہ ڈال لیتے تھے۔
"اے حافظ جی ـــ خبردار جو مجھے سیٹھانی کہا" زوبی بھنا گئی۔
"ا ۔۔۔ اچھا معاف کر دیجئے۔" حافظ صاحب بوکھلا گئے "آپ بتا دیں وہی کہہ دیا کروں گا۔"
"ضرورت ہی کیا ہے کہنے کی۔ میں آپ سے تو گفتگو نہیں کر رہی"
گنگا پور صرف بیس میل تھا۔ وہاں زوبی کو اُتار کر ہم رجولی کی طرف چل دیئے جہاں کٹو رے شاہ کی درگاہ ہے۔ چلتے وقت زوبی نے کہا تھا۔
"ایسا نہ ہو میں یہاں منتظر رہوں اور تم اُدھر ہی سے اُدھر غائب ہو جاؤ۔"
"ممکن تو یہ بھی ہے محترمہ! ـ کٹورے شاہ بڑے جلالی مشہور ہیں۔ ہو سکتا ہے مجھ سے آداب کی کوئی غلطی ہو جائے اور آتشِ جلال میں بھسم کر دیا جاؤں۔"
"ارے جاؤ۔ تم فضول باتیں بہت کرتے ہو۔ اچھا اس میں کیا حرج ہے اگر میں بھی تمھارے ساتھ درگاہ دیکھ آؤں۔ ابا میاں سے بھی اس درگاہ کی تعریف سنی ہے۔"
"سیٹھ صاحب کی اجازت کے بغیر میں تمھیں وہاں نہیں لے جا سکتا۔"
پھر میں نے جواب سُنے بغیر گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔
رجولی کا فاصلہ یہاں سے تیس میل ہو گا۔ گاڑی پُر فضا مناظر سے گذرتی جا رہی تھی کہ یکایک حافظ بچا ما

بولے:۔
"یار ٹیری کاٹ کی چادریں مزاروں پر کون چڑھاتا ہے۔ یہ تھان کم سے کم تین چار سو کا تو ضرور ہو گا۔"
"اچھا تو پھر ؟"
"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ گاڑھے یا معمولی لٹھے کا تھان خرید لیا جائے۔ ٹیری کاٹ ہم تم بانٹ لیں۔"
یہ کہتے ہوئے حافظ صاحب نے ایک ہاتھ پچھلی سیٹ کی طرف بڑھایا اور مٹھائی کا ایک ڈبہ اُٹھا لیا۔
"ہائیں ہائیں یہ کیا کرتے ہو۔" میں غرایا۔
"سچی بات ہے بھوک لگ رہی ہے۔" یہ کہتے کہتے انھوں نے ڈبہ کھول ڈالا اور ایک گلاب جامن منہ میں رکھ گئے۔
"کیا خباثت ہے۔ ارے ہیضہ ہو جائیگا خبیث یہ نذر کی مٹھائی ہے۔" میں چیخا۔
"بہت ہوا ہیضہ۔ پیارے ہم نے تو مزاروں کے چراغوں سے تیل چرا چرا کر گھر میں جلایا ہے کچھ بھی نہیں بگڑا۔"
"ملعون چوری اور سینہ زوری۔ جہنم میں جلے گا۔ فرشتے جوتے جوتے مار کر چندیا گنجی کر دیں گے۔"
"پھر ہم اکیلے ہی کیوں جلیں تم بھی جلو۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے ایک گلاب جامن میرے منہ میں ٹھونس دی۔
میرے ہاتھ اسٹیرنگ پر تھے۔ گاڑی ایک تنگ راستے پر چل رہی تھی۔ گلاب جامن پھسل کر میرے حلق تک پہنچی اور حلق سے معدے میں۔
"ہو گیا کام تمام ـــ خبیث لاؤ اور دو۔ جہاں ناس وہاں سوا ستیا ناس۔" میں کراہا۔
چند ہی منٹوں میں ڈبہ صاف ہو گیا۔
"ابھی اُنیس ڈبے باقی ہیں" حافظ صاحب بولے
"یار سوچو تو بارہ روپے کلو سے اُنیس کلو کتنے کی ہوئی۔ باپ رے باپ دوسو اٹھائیس روپے کی۔"
"ارے تو ملعون ہمیں کیا۔ ہمارے باپ کے گھر سے کیا جا رہا ہے۔"

"بھئی سوچو - کم سے کم تین سو کا ٹیری کاٹ - اتنے کی مٹھائی - سولقد - اب کون سے سیٹھ جی عالم الغیب ہیں۔"

"ابے ابے ---- کیا دماغ خراب ہو گیا ہے بے ایمانی سکھا رہا ہے مجھ زاہد شب زندہ دار کو۔"

"سیٹھ جی بڑے ایماندار دھرے ہیں۔ کروڑ پتی کوئی ایمانداری سے تو بننے سے رہا۔"

"ابے ابلیس تو حافظ ہے یا ابوجہل۔ میری بھی آخرت برباد کرائے گا۔ چل ایک ڈبہ اور اٹھا۔ یہ گناہِ کبیرہ بھی آج تو نے کرا ہی دیا۔"

حافظ نے تعمیل میں دیر نہیں کی۔ مٹھائی بڑی شاندار تھی۔ ہو سکتا ہے سولہ روپے کلو کی رہی ہو۔ پھر خدا غارت کرے اس شیطان کو برا بہیٹی پڑھاتا رہا کہ ٹیری کاٹ کی چادریں مزاروں پر نہیں چڑھتیں۔ لے انصاف والو میں بھی آدمی ہی ہوں۔ آدم کو شیطان نے بہکا کر خشک گیہوں کھلا دیا تھا تو ٹیری کاٹ کا اتنا شاندار تھان کئی من گیہوں سے کم تو نہیں ہو سکتا۔ حافظ کی رائے یہ تھی کہ رڑجولی کے بازار سے معمولی لٹھا یا گاڑھا خرید لیں گے۔ میری سمجھ میں یہ آیا کہ اس تکلف کی بھی کیا ضرورت۔ کیوں خواہ مخواہ پیسے برباد کئے۔ سیٹھ جی سے کہدیں گے چڑھا آئے چادر۔

"رڑجولی میں میرا ایک دوست ہے" حافظ نے کہا "مٹھائی تو اس کے ذریعہ بیچ لیں گے۔ ٹیری کاٹ گھر لیتے چلیں گے۔"

"اور وہ جو تمھاری سیٹھانی جی واپسی میں ساتھ چلیں گی۔ کیا وہ نہیں دیکھیں گی کہ تھان ساتھ لوٹ آیا ہے۔"

"ارے ہاں ---- اچھا تو پھر ایسا کریں۔ میں تھان لے کر بس کے ذریعہ جھمن پور کی طرف سے گھر لوٹ جاؤں گا۔ تم سیٹھانی جی کو لیتے جانا۔ یار بڑے چلتا پرزہ ہو۔ سیٹھ جی کو کیا گھول کر پلا رکھا ہے۔"

"اے حافظ بچا ما۔ اپنے کام سے کام رکھو۔"

"اللہ قسم ایسی حسین ہے کہ بس دیکھو تو دیکھے ہی جاؤ۔"

مٹھائی حافظ کے دوست ہی نے چھ روپے کلو کے حساب سے خرید لی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ دام چند روز بعد دینے کا وعدہ کیا ہو۔ میں اس خباثت پر آمادہ نہ ہوتا اگر میرے علم میں یہ بات نہ ہوتی کہ کٹورے شاہ کی درگاہ کا سجادہ پکا چار سو بیس ہے۔ نشیات کا تاجر ہے۔ اسمگلنگ بھی کرتا ہے۔ اور بھی خدا جانے کیا کیا کرتا ہوگا۔

حافظ صاحب حسب قرارداد ٹیری کاٹ لیکر بس اسٹینڈ چلے گئے۔ میں گنگا پور لوٹا۔

زرو بی مجھے اکیلا دیکھ کر حیرت سے بولی۔

"حافظ جی کہاں گئے؟"

"رڑجولی میں ایک دوست کے یہاں رہ گئے۔ چلو بیٹھو" میرا خیال تھا وہ ادبدا کے آگے بیٹھے گی مگر وہ پچھلی سیٹ پر چلی گئی۔

"بہت بہت شکریہ" میں نے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کس بات کا شکریہ؟"

"آپ نے اپنی صحیح جگہ سنبھالی۔"

"اب اتنی احمق بھی نہیں کہ موقع محل نہ دیکھوں خالہ کے گھر کا کوئی نہ کوئی فرد کہیں نہ کہیں سے ہمیں اس وقت ضرور دیکھ رہا ہوگا۔"

"او ہو اس وقت تو کافی عقلمند معلوم ہو رہی ہیں۔"

"اب اسٹارٹ کرو۔ خواہ مخواہ غصہ دلاتے رہتے ہو۔"

میں سوچ رہا تھا کیسا دھوکا اس گھات ہوا ہے مجھ ناہنجار سے اسیٹھ کو مجھ پر کس قدر اعتماد ہے اور زرو بی مجھے کتنا بھلا آدمی سمجھتی ہے۔ ایسی کمینہ حرکت تو کوئی شرابی کبابی بھی نہ کرے گا۔

گاڑی بہت ہی پُر فضا مناظر سے گذر رہی تھی۔

"منھ میں قفل ڈال لیا ہے کیا؟ زرو بی جھنجھلا کر بولی۔

"آں ---- ہاں شروع کیجئے کوئی موضوع۔"

"میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ جو اللہ والے مر کر قبر میں چلے جاتے ہیں وہ دنیا والوں کی مدد کیسے کرتے ہیں۔"

"یہ سمجھ سے بالاتر باتیں ہیں۔ اور کوئی موضوع چھیڑو۔"

"ابامیاں کہتے ہیں کہ غوث الاعظم پیرانِ پیر دستگیر ساری دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی تم نے تو قرآن پڑھا ہوگا۔ کیا اس میں ایسا ہی لکھا ہے۔"

"ہمارے والے قرآن میں تو ایسا نہیں لکھا مگر صوفیوں کا ایک الگ قرآن ہے۔ وہ لکھا ہوا نہیں ہے سینہ بسینہ چل رہا ہے۔"

"یہ میں نہیں مانتی۔ ابامیاں نے تو کبھی دوسرے قرآن کا ذکر نہیں کیا۔"

"نہ کیا ہوگا۔ تم ایسی بور باتیں مت کرو۔ رومانس کا خون ہوتا ہے۔"

"یہ منھ اور مسور کی دال۔ تم کیا جانو رومانس۔"

"اچھا صاحب ــــ آپ ہی رومانس کی واحد عالمہ فاضلہ ہیں۔ تحریکِ اقامتِ دین کا نام سنا ہے آپ نے کبھی؟"

"یاد تو پڑتا ہے کہ سنا ہے ــــ ارے ہاں بہت دن ہوئے ابامیاں کسی سے کہہ رہے تھے کہ کوئی بڑے میاں ہیں مولوی مودودی۔ انھوں نے اس نام سے اپنی فرم کھول رکھی ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے تھے ــــ اور جماعتِ اسلامی کا نام سنا ہے کبھی؟"

"کئی بار سنا ہے۔ شاید یہ جماعت اللہ و رسولؐ کو نہیں مانتی۔"

"یہ بھی تمھارے ابامیاں ہی نے بتایا ہوگا۔"

"وہی کیا اور لوگ بھی کہتے ہیں۔"

"تم مانتی ہو اللہ رسول کو؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جان قربان ان پاک ناموں پر۔ کاش تم مجھے کچھ پڑھا دیا کرتے۔ مجھے کچھ بھی خبر نہیں کہ اللہ رسول کیا کہتے ہیں۔" اسکی آواز میں یک طرح کا تاسف بھی تھا اور حسرت بھی۔

"اگر اللہ رسول یہ کہیں کہ تم پردہ کیا کرو تو بتاؤ تمھارا رویہ کیا ہوگا؟"

"بس بے وقوف نہ بناؤ۔ یہ مولویت تو جماعتِ اسلامی گھارتی ہوگی۔"

"کیسی بھولی ہو۔ کیا تمھارے خاندان میں کسی نے پردہ نہیں کیا؟"

"امی کے علاوہ سبھی پردہ دار ہیں ــــ گڈ گارڈ۔ ہاں بات تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ ہمارے خاندان میں کوئی بھی جماعتِ اسلامی کو نہیں مانتا۔ اچھا تو کیا سچ مچ اللہ رسول پردے کو کہتے ہیں؟"

"صرف پردے ہی کو نہیں وہ اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں ہم دونوں اس وقت مجرم ہیں۔ ہمیں ایک میل بھی تنہا سفر نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"واہ اس میں کیا برائی ہوئی؟"

"جان بوجھ کر انجان مت بنو۔ تمھارے دل میں آخر یہ خیال کیوں پیدا ہوا تھا کہ خالہ کے گھر کا کوئی فرد تمھیں اگلی سیٹ پر نہ دیکھ لے؟"

وہ چند ثانیے خاموش رہی عقب نما آئینے میں اس کے چہرے پر اتار چڑھاؤ کے آثار نظر آ رہے تھے۔ پھر دبی زبان سے بولی:۔

"تم بہت اچھے آدمی ہو۔ میرا خیال ہے پردہ بُرے لوگوں سے ہوتا ہوگا۔"

"ماتھے پر کسی کے بھی کچھ نہیں لکھا ہوتا محترمہ زروبی! میں بالکل اچھا آدمی نہیں ہوں۔ تم اگر میری اصلیت کو جان جاؤ تو نہ جانے کس قدر لعنتیں بھیجو۔"

"خیر یہ تو میں نہیں مانتی۔"

"بے شمار عورتیں اسی بھولپن میں ماری جاتی ہیں۔ یہ موضوع بڑا دل خراش ہے۔ تمھاری عمر تو بارہ سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔"

"اتنا احمق مت سمجھو۔ میں نے اسکول کالج میں اچھی بری نظریں خوب دیکھی ہیں۔ شرافت اور کمینگی میں تمیز کا سلیقہ رکھتی ہوں۔"

"بچی ہو ــــ تم کچھ نہیں جانتیں ــــ کچھ نہیں جانتیں۔"

میرا لہجہ خاصا جذباتی ہوگیا تھا۔

"اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو کوشش کرو کہ میں کچھ جان جاؤں۔ کیا مجھ سے تمھیں کوئی ہمدردی نہیں ہے؟"

"ہمدردی ہو بھی تو میں تمھارے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔ میری عافیت اسی میں ہے کہ تم سے دور ہی دور رہوں۔"

"اتنی زیادہ نفرت ہے مجھ سے!" وہ کسی معصوم بچے کی طرح شکایت کر رہی تھی۔

"پاگل لڑکی ـــــ تم سے نفرت کون کرسکتا ہے تم سے اسی لئے تو دُور بھاگنا چاہتا ہوں کہ تم سے نفرت نہیں کی جاسکتی۔"

"ایسی اُلٹی سیدھی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ پتہ نہیں کیوں تمھاری ہر بات مجھے اچھی لگتی ہے چاہے سمجھ میں بھی نہ آئے۔"

"یہ اور بھی خراب ہے۔ تمھیں کیسے سمجھاؤں۔ اچھا اب گفتگو ختم۔ سفر تمام ہو رہا ہے۔"

سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ ہم عنایت منزل پہنچ گئے۔ سیٹھ ہمارے منتظر ہی تھے۔

"ہلو ڈارلنگ۔ سفر تو خوشگوار رہا؟ کچھ بجھی بجھی نظر آرہی ہو۔"

"نہیں تو۔ بس یوں ہی ذرا تھکن سی ہوگئی ہے۔"

"اور آپ کہئے سب کام ٹھیک ٹھاک کر آئے؟" سیٹھ جی نے مجھے مخاطب کیا۔

"بالکل۔ سجادے صاحب نے آپ کو سلام کہا ہے۔ بڑی اچھی طرح پیش آئے۔ خلیق آدمی ہیں۔"

"کیوں نہ ہوں۔ اولیاء کے خادم ہیں۔ اور وہ حافظ بجاما کہاں گئے؟"

"وہیں رہ گئے ایک دوست کے گھر۔ شاید کل لوٹینگے۔"

"مرنے دو۔ عجیب لپٹو آدمی ہے۔ زوبی سے رشتہ داری نہ ہوتی تو میں اسے یہاں گھسنے بھی نہ دیتا۔"

"آپ کہئے وزیر زراعت کے رشتہ دار صاحب سے ملاقات ہوئی؟"

"ہوئی مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ پتا چلا کہ وہ خود آج کل ایک اسکینڈل میں ملوث ہیں۔ ان کی وجہ سے وزیر زراعت کی بھی رسوائی کا اندیشہ ہے۔ پرسوں پلاٹ کا فیصلہ ہو جائے گا۔ بظاہر تو اپنا کوئی چانس نہیں نظر آتا۔ نعمانی کے مقابلے میں یہ شکست میرے لئے بڑی تکلیف دہ ہوگی۔"

"چھوڑیئے بھی شکست و فتح تو چلتی ہی رہتی ہے۔"

"شکست اب بھی میں نہیں مانتا۔ کیا تمھیں توقع نہیں کہ پہلے کی طرح اب کی بھی کوئی کرامت ظہور میں آئے گی صوفی مہتاب نے آج بھی یقین دلایا ہے کہ درگاہ کا چڑھاوا بے کار نہیں جاسکتا۔ اولیاء اللہ اپنے نیازمندوں کو مایوس نہیں کرتے۔"

"خدا بہتر جانے۔"

اگلا دن مجھ پر بڑا قیامت کا گذرا۔ دل دھک دھک کئے چلا جارہا تھا۔ میں نے خود کو بہت سمجھایا کہ اے بدبخت دل تو ہمیشہ ہی دھک دھک کرتا ہے پھک پھک کی توقع اس سے کون کرسکتا ہے لیکن دماغ میں تو جیسے آندھیاں اٹھ رہی تھیں کیا ہوگا جب سیٹھ کو پتا چلے گا کہ انھیں دھوکا دیا گیا ہے۔ ناکامی کی ساری ذمہ داری وہ مجھ پر ہی ڈالیں گے۔ میری مت کیسی ماری گئی تھی کہ حافظ بجاما کے بہکائے میں آگیا۔ لعنت ہے مجھ پر۔

رات کو جب زوجہ سوگئی میں پلنگ سے اٹھا۔ وضو کی۔ دوسرے کمرے میں مصلیٰ بچھایا اور نفلوں پر نفلیں شروع کردیں۔ یاد نہیں کتنی پڑھی ہوں گی۔ جب تھک گیا تو یوں دعا کی:۔

> "اے رب العٰلمین۔ تو سارے جہانوں کا رب ہے۔ کافروں کا بھی اور گناہگاروں کا بھی۔ میں روسیاہ پکا گناہگار ہوں مگر کافر تو نہیں ہوں۔ میں تیرے پاؤں پڑتا ہوں سیٹھ کو سنیما کے لئے پلاٹ دلادے۔ تیری قدرت سے کچھ بعید نہیں۔ تو نے نوح کی کشتی کو طوفان سے نکالا تھا۔ میں ملعون حافظ بجاما کے بہکائے میں آگیا۔ آخر تیرے نبی آدم بھی تو بچہ ہوں۔ وہ شیطان کے جھانسے میں آگئے تھے۔ تو نے انھیں معاف کردیا۔ مجھے بھی معاف کردے۔

اگر سیٹھ کو پلاٹ مل گیا تو انھیں اس کی پروا نہ ہوگی کہ ... گدھر گیا۔ اللہ قسم سا انھیں تو میں خود ہی بتادوں گا کہ یہ کٹورے شاہ کی کرامت نہیں ہے۔ وہ تیرے بجائے قبروں سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں پلاٹ دلادے۔ میری بے ایمانی کی سزا جو بھی تو دے گا پھر دے لیجو۔ میں تیرے در پر بھکاری بن کر آیا ہوں۔ میں تیرے سوا کسی کو ذرہ برابر مختار نہیں سمجھتا۔ میں تیری رحمت کا واسطہ دیتا ہوں۔ مجھے چاہے دوزخ میں ڈال دینا مگر سینما کا پلاٹ سیٹھ عنایت کو ضرور دلوادے۔"

آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ میری آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ ...وس ہو رہا تھا جیسے دل پگھل کر بہہ جائے گا۔ شاید ایک ...ے تک میں اسی طرح گڑگڑاتا رہا۔ زبان رکنے ہی کا نام نہیں ...ر رہی تھی۔ یہ تک ہوش نہیں تھا کہ میری آواز اچھی خاصی ...ند ہو گئی ہے۔ ہوش اس وقت آیا جب رخ موڑنے پر دیکھا ...زوجہ در سے ٹیک لگائے تصویر بنی کھڑی ہے۔ ظاہر ہے ...نے دعا بالجہر کا کچھ نہ کچھ حصہ سن ہی لیا ہوگا۔

"کیسے مانوں کہ یہ آپ ہی ہیں!" وہ ڈرامائی اسٹائل میں ...ں۔

"اب تو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہوں جو چاہے کہہ لو تمھیں ...نا نہیں چاہیئے تھا۔" میں بوکھلا گیا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے میری بہت بڑی غلط فہمی دور ہو گئی ...کچھ دنوں سے یہ سمجھنے لگی تھی کہ صوفیوں کی صحبت نے آپ کے ...ملدوں میں کچھ نہ کچھ بگاڑ ضرور پیدا کر دیا ہے۔"

"شکریہ۔ مگر تم یہ نہیں پوچھوگی کہ سینما کے پلاٹ ...کیا قصہ ہے۔"

"میری بلا سے۔ میں جانتی ہوں آپ متقی پرہیزگار ...یں ہیں۔ آپ بڑی بیجا حرکتیں کرتے پھرتے ہیں۔ مگر ...بندہ ہی کیا جو ہر پھر کر اپنے خدا ہی کے قدموں میں ...ر نہ رکھ دے۔ چلئے سو جائیے۔ دعا انشاء اللہ بے کار ...یں جائے گی۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ بس جا کے لیٹ ہی گیا۔

پھر اپنے رب کا شکر کس زبان سے ادا کروں۔ عصر کا وقت تھا کہ سیٹھ عنایت کی امپالا غریب خانے پر رکی۔ زوبی بھی ہمراہ تھی۔ ایسے دل کش لباس میں کہ بس غزل کا سراپا۔ ہارن سنکر میں ڈرتا ڈرتا باہر آیا۔

"آؤ آؤ ___" سیٹھ نے دور ہی سے اپنے برابر کی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ زوبی پچھلی سیٹ پر تھی۔ ان کا لہجہ کھنک رہا تھا۔

"سلام علیکم۔ تشریف لائیے نا۔" میں نے اخلاقاً کہا۔

"نہیں۔ ہم بس تمھیں لینے آئے ہیں۔ دعوت تو تمھارے یہاں بھی ضرور کھانی ہے مگر کسی اور دن۔ آؤ بس جلدی۔"

میں اگلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ گاڑی چل دی۔

"کیا کہا تھا ہم نے عزیزم۔ اولیاء اللہ اپنے نیازمندوں کو مایوس نہیں کرتے۔ ارے کیا پانسہ پلٹا ہے مزا آگیا۔ نعمانی تو عرصے تک اپنے زخم چاٹتا رہے گا۔"

"مبارک باد قبول فرمائیے۔ کیا قطعی فیصلہ ہو گیا؟"

"بالکل قطعی۔ جانتے ہو کیا چکر پڑا۔ صبح اچانک درگا پرشاد جی پلین سے آپہنچے۔ سیدھے میرے یہاں آئے۔ اندازہ کرو یہ کوئی معمولی بات ہے۔ ان کے اثرات بے پناہ ہیں۔ اب دیکھ لو چند گھنٹوں میں سارا معاملہ الٹ گیا۔ پلاٹ اب میرا ہے نعمانی پخیاں کھا رہا ہے۔"

گاڑی شہر کی سب سے بڑی مٹھائی کی دکان پر رکی۔ سیٹھ نے آرڈر دیا۔

"ایک ایک کلو کے سو ڈبے دو گھنٹے میں کوٹھی پہنچ جائیں۔"

پھر کچھ دیر بعد ہم صوفی صاحب کے در دولت پر تھے۔ زوبی گاڑی ہی میں بیٹھی رہی۔ میں اور سیٹھ صوفی صاحب سے ملے۔ سیٹھ نے سو سو کے پانچ نوٹ بڑی عقیدتمندی کے ساتھ ان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ حقیر سا نذرانہ قبول فرمائیے۔ پلاٹ مل گیا ہے۔"

"وہ تو یقیناً ملتا۔ رات ہی مراقبے میں ہمیں بشارت مل گئی تھی۔ قطب الاولیاء نے بڑی محبت سے آپ کی نذر قبول فرمائی ہے۔"

صوفی صاحب کے چہرے پر نور برس رہا تھا۔

"قطب الاولیاء سے آپ کی کیا مراد ہے؟" میں نے خواہ مخواہ سوال کیا۔ صوفی صاحب نے ماتھے پر بل ڈال کر مجھے گھورا اور ناخوشگوار لہجے میں بولے:۔

"گدھے تک جانتے ہیں کہ قطبیت کا مرکز آج کل رجولی ہے۔"

"گدھے یقیناً جانتے ہوں گے۔ مجھے اپنے آدمی ہونے پر ندامت ہے صوفی صاحب!"

"تمھیں ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ پرلے سرے کے وہابی ہو۔"

"نہیں صوفی صاحب یہ بات نہیں" سیٹھ نے معذرت آمیز انداز میں بیچ بچاؤ کیا "یہ تو اپنے ہی ہم مشربوں میں ہیں۔ آپ کے بڑے مداح ہیں۔ اب اجازت چاہوں گا۔ تھوڑی سی مٹھائی بچوں کے لئے پہنچے گی قبول کر لیجئے گا۔"

یہ کہہ کر انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے گاڑی تک لے گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میرے اور صوفی کے درمیان بات بڑھے۔ آخر کار مغرب تک ہم عنایت منزل پہنچ گئے۔

"زوبی ڈارلنگ تم بتاؤ ملا کو کیا انعام دیا جائے؟" سیٹھ پھولے نہیں سما رہے تھے۔

"انھوں نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔" زوبی طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"غریب کا دل کیوں توڑتی ہو۔ اگر یہ آمادہ نہ ہوجاتا تو ٹھیک وقت پر چادر شاید ہی چڑھ سکتی۔ یہ بھی مولویوں کے خاندان سے ہے کچھ نہ کچھ برکت اس کے ہاتھ کی بھی شامل ہوئی ہوگی۔"

"پھر دے ڈالئے دس بیس ہزار۔ یا چلئے ایک کار دے دیجئے۔ بیچارے پیدل پھرتے ہیں۔"

"کاروں کی اس کے لئے کیا کمی۔ اپنی گاڑیاں گھس ہیں۔ یہ تو بیوقوف ہے۔ میں اسے ایکسپورٹ امپورٹ شاندار بزنس کرا سکتا ہوں۔ کیوں برخوردار ہو تیار؟" ا نے بڑی بے تکلفی سے میرے شانوں پر ہاتھ رکھدیئے۔

"ہر معاملے میں آپ بزنس کیوں لے دوڑتے ہیں۔" بولا۔ "یہ خوشی کا موقعہ ہے ضرورت ہے کہ نماز شکرانہ پڑ جائے۔"

"ارے ہاں بات تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ میں ا نوکر کے ہاتھ صوفی مہتاب کو کہلا بھیجتا ہوں وہ میری طرف پڑھ دیں گے۔ کیا سمجھتے ہو میں اپنے نماز روزے کی زکوٰۃ ا انھیں کو دیتا ہوں۔ وہ اسے غرباء تک پہنچا دیتے ہیں۔"

"بڑے بھلے آدمی ہیں۔ شاید انھوں نے آپ سے یہ کہا ہوگا کہ محترمہ زیبا صاحبہ کے بھی نماز روزے کی زک انھی کو دی جائے۔"

"وہ نہ کہتے جب بھی میں دیتا۔ آخر مرنے کے بعد کی تو کچھ فکر رکھنی ہی چاہیئے۔ زوبی کے سلسلے میں انھوں نے ب تھا کہ عورتوں کی زکوٰۃ دگنی ہوتی ہے۔"

"ماشاء اللہ۔ اور دلیل یہ دی ہوگی کہ عورتوں کا ح وراثت میں چونکہ آدھا ہے اس لئے ان کے نماز روزے زکوٰۃ دگنی کیسے نہ ہو۔"

"میاں ہم ان سے حجت نہیں کرتے جو دلیل وہ دلیل پکی ہو پڑے۔ کیا سمجھتے ہو وہ مدرسہ عرفان العلوم کے فارغ التح ہیں۔ ہر طرح کے مسائل سے پوری طرح واقف ہیں۔"

"کیا بوریت شروع کر دی آپ لوگوں نے" زوبی ہوئے لہجے میں بولی "آج کی شاندار کامیابی کی خوشی میں کیوں نہ دیکھی جائے۔"

"ضرور ضرور" سیٹھ بولے "مگر ڈارلنگ تو مجھے ایک میٹنگ میں شرکت کرنی ہے۔ تم ہو آؤ۔"

"میں اکیلی؟"

"واہ اکیلی کیوں۔ یہ جو ہے۔" انھوں نے میری طرف

"نہیں جناب والا۔ مجھے خود بعد عشاء ایک جلسہ

کی صدارت کرنی ہے۔" میرا لہجہ کھرا تھا۔
"آپ بار بار ان سے میری توہین کرتے ہیں" زوبی منہ بسور کر بولی "ان کے ساتھ تو میں قیامت تک نہیں جاؤنگی۔"
"کیا مصیبت ہے۔ تم دونوں کس قدر لڑتے ہو۔"
اب کھانا کھایا گیا۔ میں کشمکش میں مبتلا تھا کہ اصل ماجرا اسی وقت بیان کروں یا نہ کروں کشمکش نہ ہوتی اگر حافظ پچاما تھان سمیت واپس آگئے ہوتے۔ تھان اور سو روپے کا نوٹ میں سیٹھ کے آگے رکھ دیتا۔ اس صورت میں وہ اور جو چاہے سوچتے مگر یہ نہ سوچتے کہ میری حرکتِ ناشائستہ کا محرک مالی انتفاع رہا ہوگا۔ فی الحال وہ سبھی کچھ سوچ سکتے تھے۔
"ہائیں ہائیں۔ یہ کیا کرتے ہو" دفعتاً سیٹھ دہاڑے زوبی زور سے ہنسی۔ میں کٹ کر رہ گیا۔ دراصل خیالات کی غرقابی میں روٹی کا نوالہ میں نے شوربے کے بجائے پاس رکھے ہوئے پانی کے گلاس میں ڈبو لیا تھا۔
"میاں تم تو چڑیا گھر میں رکھے جانے کے قابل ہو۔" سیٹھ نے بھی زوبی کے قہقہے کا ساتھ دیا۔ "آخر کس دنیا میں کھوئے ہوئے ہو۔"
"انھیں شاید آپ کی کامیابی سے صدمہ پہنچا ہے۔" زوبی نے مصرعہ لگایا۔
"کیوں بھئی؟" سیٹھ نے مجھے گھورا۔
"مجھے اس وقت حافظ پچاما کی یاد ستا رہی ہے۔ انھیں کٹوڑے شاہ کی قبر نے سموچا نگل لیا تھا۔"
"لاحول ولاقوۃ۔ کس بودم کا ذکر کیا۔ چلو کھانا کھاؤ۔" کھانے کے بعد میں نے رخصت چاہی۔
"واقعی جا رہے ہو؟" سیٹھ نے برا سا منہ بنا کر پوچھا۔
"کیا کروں۔ میلاد کی صدارت کرنی ہے۔"
"جھوٹے۔ مکار دنیا بھر کے۔" زوبی کڑوے لہجے میں بولی۔
میں دُم دبا کر نکل ہی آیا۔ نہ نکلتا تو بات بڑھتی۔
اب میں کئی دن سے حافظ پچاما کو ڈھونڈ رہا ہوں وہ نہیں مل رہے ہیں۔ ان سے ٹیری کاٹ کا تھان لئے بغیر سیٹھ عنایت اللہ کو کیسے بتاؤں کہ میں کیا کر کے بیٹھا ہوں۔ اللہ میری مدد فرمائے۔

بظاہر ایک کہانی
لیکن
فی الحقیقت سچائیوں کی ایک
مربوط لڑی
بے انتہا دلچسپ
معنی خیز
سبق آموز

مُلّا ابن العرب مکی
کے
نکیلے قلم سے

ماہِ اشاعت کا اعلان جلد
کیا جائے گا

حیات عبدالحئی مولانا علی میاں کے خامۂ زرنگار سے ایک ممتاز عالم دین اور خادم ملت کی ایک ایمان افروز سوانح۔ قیمت مجلد ۱۳/۷۵

مکتوبات مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی کے خطوط تمام اہل علم میں ایمان و معرفت اور شریعت و طریقت کا گنجینہ سمجھے گئے ہیں سلیس اردو ترجمہ کی صورت میں انھیں پڑھئے
قیمت مجلد جلد اول — پندرہ روپے ۱۵/-
جلد دوم — اٹھارہ روپے ۱۸/-
جلد سوم — پندرہ روپے ۱۵/-

احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت از مولانا تقی امینی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے شریعت کے احکام زمانہ کے تقاضوں اور تغیر پذیر حالتوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ تمام مواد حوالوں سے آراستہ۔ قیمت غیر مجلد — ۸/۷۵

بدعت کیا ہے؟ بدعات کے رد میں چار لاجواب مقالے ذہن کو روشنی اور قلب کو نورانیت دینے والے۔ قیمت مجلد — ساڑھے چھ روپے۔

تفسیر رشیدی مولانا رشید احمد گنگوہی کے قلم سے بیس آیات قرآنیہ کی قابل مطالعہ تفسیر عارفانہ اور محققانہ۔ قیمت — ڈھائی روپے ۲/۵۰

انفاس عیسیٰ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی حنفی کی تصنیفات سے تصوف و شریعت، اخلاق، اصلاح معاشرہ اور دیگر بیشمار موضوعات پر دین و دانش کی روشنی میں دلچسپ اور روح پرور۔ قیمت ۲۵/-

تجارتی سود تاریخی اور فقہی نقطۂ نظر سے جدید و قدیم دونوں علوم کی روشنی میں تجارتی سود پر گفتگو۔ زبان سلیس، اسلوب شگفتہ دلائل قوی، مواد محققانہ۔ قیمت — آٹھ روپے۔

مدارج سلوک ڈاکٹر میر ولی الدین کی مفید کتاب۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اس کا مطالعہ آپ کے لئے مفید ہوگا۔ قیمت — ساڑھے چھ روپے ۶/۵۰

وحدۃ الوجود اہل معرفت کے مشہور مسلک وحدۃ الوجود پر محققانہ گفتگو۔ حضرت مجدد الف ثانی کا بیان اور اس کے اسرار۔ مجلد — ۳/۱۲

مکاتیب گیلانی مولانا مناظر احسن گیلانی کے قابل قدر خطوط کا مجموعہ۔ معقول و منقول کا خزانہ۔ قیمت مجلد پلاسٹک — دس روپے۔

فضائل نماز شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی مشہور کتاب۔ عکسی طباعت کیساتھ
قیمت — ایک روپیہ ۷۵ پیسے ۱/۷۵

فتاویٰ عبدالحئی مولانا عبدالحئی کا مشہور مجموعہ فتاویٰ ایک جلد میں مکمل نظر ثانی کے بعد۔ قیمت — بیس روپے ۲۰/-

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ مولانا منظور نعمانی کی مقبول کتاب۔ اس میں وہ عام فہم زبان میں قرآنی مطالب بیان کرتے ہیں۔
قیمت — چھ روپے پچاس پیسے ۶/۵۰

آداب زیارت قبور شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا محمد سلطان کے فرمودات۔
قیمت — ۶۵ پیسے۔

معارف سلیمان نمبر مولانا سید سلیمان ندوی کے احوال و کوائف اور تذکرہ و تعارف پر یہ نمبر بڑا شاندار ہے۔ قیمت — پانچ روپے

الحج مولانا اشرف علی کے خلیفہ شاہ مسیح اللہ کی نادر تصنیف۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔
قیمت — دو روپیہ۔

(ہر قسم کی کتابیں اس پتہ سے طلب فرمائیں)

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

ِرآن اور تعمیر سیرت — تعلیماتِ قرآنی کا نچوڑ تصوف اور ادب صالح کا دلکش مجموعہ
ٹر میر ولی الدین کے قلم سے ۔ قیمت ۔ ۵۰/۷

ئزہ تراجم قرآنی — دنیا میں کب اور کس زبان میں قرآن کے تراجم ہوئے ۔ اس کی
قیق و تفصیل مترجمین اور شارحین کے نام ۔ بہت عمدہ
رِ معلومات افزا کتاب ہے ۔ قیمت ــــ چھ روپے ۔ ۶/

نیۃ الطالبین (اردو) — مصنفہ ۔ شیخ عبد القادر جیلانیؒ ۔ قیمت ۔ مجلد ــــ تیس روپے ۔ ۳۰/

ریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات — قاہرہ کے ایک فاضل بیرسٹر
د اللہ عنان کی تالیف نئے اسلوب میں تاریخ اسلام کے
منی واقع پر علم و تحقیق کی روشنی ۔ ساڑھے سات روپے ۷/۵۰

سلام اور ترقی — مولانا اشرف علیؒ کے احادیث سے لبریز ارشادات ۔ قیمت ۔ ۶۰ پیسے

ذکرہ مولانا عبد اللطیف نعمانیؒ — ملک و ملت کی ایک ممتاز شخصیت مولانا
د اللطیف نعمانیؒ شیخ الحدیث مفتاح العلوم مئو ـــ
۱۳۹۰ھ کی دینی ، علمی ، سیاسی اور مجاہدانہ زندگی کے زندہ
دید کارنامے اور اہلِ علم و رہنمایانِ ملک و ملت کے
اجہائے عقیدت ۔ قیمت ــــ پانچ روپے ۔ ۵/

یخ الفخری — تاریخ اسلامی کی ایک مشہور اور مستند کتاب کا ترجمہ اردو ، فارسی اور فرنچ
نوں میں بھی ہو چکا ہے ۔ آپ کی خدمت میں اردو
بہ حاضر ہے ۔ قیمت ـــ ۱۳/۷۵

توباتِ خواجہ معصوم سرہندیؒ — معارف و اسرار ہدایات و نصائح اور
ت و لطائف سے لبریز خطوط اردو لباس میں مطالعہ
بہترین چیز ۔ قیمت ــــ چھ روپے ۔ ۶/

مناجاتِ مقبول (کرمیمی) عکسی — مولانا اشرف علیؒ کی مقبول عام اور مفید ترین
کتاب پرانے اور نئے اضافوں کے ساتھ ۔
قیمت ۔ چھ روپے ۔ ۶/ (مجلد سات روپے)

آنکھوں کی ٹھنڈک — اللہ کے سوا کوئی حاضر و ناظر نہیں جو مسلمان اس غلط خیال کا شکار ہیں
کہ رسول اللہ ﷺ بھی حاضر و ناظر ہیں ۔ ان کے خیال کی مدلل تردید
قرآن و حدیث کے روشن دلائل ۔ فقہاء و مجتہدین کے مستند
حوالے ۔ قیمت مجلد ــــ آٹھ روپے ۔ ۸/

رمضان کیا ہے ؟ — مولانا محمد عبد اللہ دہلویؒ کے رشحاتِ قلم ۔ رمضان کے موضوع پر خوب تر کتاب ۔
قیمت مجلد ــــ تین روپے ۔ ۳/

تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہدِ سلف میں — جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے شاندار ماضی میں دین کی تبلیغ و تعلیم کیلئے ہر ممکن کوشش
کی مسجدیں ، راستے ، بازار کہیں بھی ہوں مسلمان بنے رہے ۔
دنیا کے کاروبار نے انھیں دین سے غافل نہیں کیا ۔
از :۔ قاضی اطہر مبارک پوری ۔
قیمت ــــ ڈیڑھ روپیہ

التشرف — تصوف کی معرفت میں مولانا اشرف علیؒ کی معروف کتاب ۔ قیمت ـــ سولہ روپے ۔ ۱۶/

امتِ مسلمہ کی رہنمائی حضرت عمرؓ کی تعلیمات میں — مولانا تقی امینی کی ایک تازہ تصنیف انفرادی و اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں
میں حضرت عمرؓ کے اصلاحی فرمودات و اقدامات ، دور رس
حکمتوں سے لبریز ۔ قیمت ــــ دو روپے ۔

سفرِ مصر و حجاز — امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کے قلم سے ایک بصیرت افروز معلومات
افزا سفرنامہ ۔ قیمت ـــ ڈھائی روپے ۔ ۲/۵۰

صحت کا توازن...
جاڑوں میں ماءاللحم خاص کا استعمال
قوت و توانائی بخشتا ہے۔ اس کے صحت بخش
اجزا آپ کے رگ و پٹھوں میں سرایت
ہوکر نئی جان ڈالتے اور چستی پیدا کرتے ہیں۔
ماءاللحم خاص
غذائیت اور توانائی سے بھرپور بہترین ٹانک
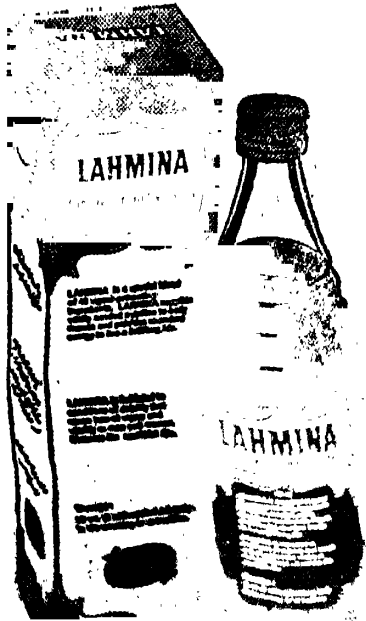
Monthly TAJALLY DEOBAND U.P. تجلی REGD. NO. L